اعظم حسین پبلیشر نے باہتمام سید محمد رضی منیجر سرفراز قومی پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ ادب لکھنؤ سے شائع کیا

آئین ادب

قواعد

(۱) "ادب" ہر انگریزی مہینے کی آخری تاریخ کو شایع ہوتا ہے۔

(۲) دوسرے ماہ کی دس تاریخ تک اگر پرچہ نہ پہونچے تو دفتر "ادب" کو اطلاع دینا چاہیے ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

(۳) "ادب" کا حجم کم از کم چار جزو ہوگا۔

(۴) عمومی قیمت پیشگی چار روپیہ سالانہ مع محصولڈاک اور خصوصی حسب حیثیت ششماہی ۲ روپیہ۔

(۵) قیمت نمونہ ۶ /

(۶) منی آرڈر کے ذریعے سے قیمت ارسال فرمائیں یا ویلو کی اجازت دیں۔ مگر صورت اوّل میں خریداروں کو کفایت اور دفتر رسالہ کو آسانی ہوگی۔

(۷) چھ ماہ سے کم کے لیئے رسالہ کا اجرا نہ ہوگا۔

(۸) جواب طلب امور کے لئے جواب کا خرچ طالب جواب کے ذمے۔

(۹) خط و کتابت میں اپنے نمبر خریداری سے ضرور مطلع فرمائیں۔

(۱۰) معاملات مالی کے متعلق خط و کتابت مینیجر "ادب" لکھنؤ سے فرمائیں۔

(نوٹ) صفحات لوح کے لئے نرخ اشتہار خط و کتابت سے طے ہوگا۔ ہر اشتہار کا معاوضہ پیشگی آنا چاہیے۔

ضوابط

(۱) "ادب" میں علمی اور ادبی مضامین شایع ہونگے۔

(۲) جس مضمون میں معمولی ادبی نقائص ہونگے وہ باجازت مصنف درست کرکے شایع ہونگے مگر جس مضمون میں زیادہ اغلاط و عیوب ہونگے وہ ایک آنہ کا ٹکٹ لگانے پر واپس کردیا جائیگا ورنہ داخل دفتر ہوگا۔

(۳) جن مضامین میں ایسے ابیات سے بحث ہوگی یا عیوب کا شائبہ ہوگا وہ اس رسالہ میں درج نہ ہونگے۔

(۴) بعض خیالات اگرچہ مدیر کی رائے کے موافق نہ ہوں مگر شایع ہوسکتے ہیں۔ اور اگر کوئی اُن کا جواب سنجیدگی سے دینا چاہے تو وہ بھی درج ہوسکتے ہیں۔

(۵) مراسلات حتی الامکان خوشخط ہوں۔

(۶) مضامین کے متعلق خط و کتابت بنام مدیر ادب متصل چوراہا یحیی گنج لکھنؤ ہونا چاہیے۔

نرخنامہ اشتہارات

مدت اشاعت	[illegible] صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
ایک سال کے لئے	[illegible]	[illegible]	[illegible]
چھ ماہ کے لئے	[illegible]	[illegible]	[illegible]
تین ماہ کے لئے	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ایک ماہ کے لئے	[illegible]	[illegible]	[illegible]

دفتر ادب متصل چوراہا یحیی گنج لکھنؤ

فہرست مضامین

جلد ۱ | بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۶

بزمِ ادب

آج کل ہندوستان کے نسوانی طبقہ میں آزادی کی اُمنگیں نہایت شدت سے پیدا ہوگئی ہیں مردوں کی اطاعت کے آونچے کانوں سے علیحدہ کردینے کی کوششیں پورے شدومد سے جاری ہیں اُٹھی شرم وحجاب کا گھونگھٹ اُلٹ کر صنفی حقوق کے مطالبہ میں سرگرمیاں دکھلائی جانے لگی ہیں نسوانی حقوق کے تحفظ کے لئے انجمنیں بن رہی ہیں، تحریروں اور تقریروں کا بازار گرم ہے۔ ایسا کیوں ہورہا ہے؟ اسکی تمام تر وجہ یہ ہے کہ مردوں نے عورتوں کے جسمانی اور روحانی ارتقا کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کرلیں۔ اُن کو صحیح معنوں میں شریکِ زندگی بنانے سے گریز کرنے لگے۔ اُن کے جاہل رکھنے ہی کو عفت وعصمت کی بقا کا ضامن سمجھ لیا۔ علم وشائستگی کے زیوروں سے اُن کا آراستہ ہونا غیر فطری مساوات کے ادعا کا پیش خیمہ قرار دے دیا۔ اس غیر منصفانہ سلوک کا یہ ردعمل ہونا ہی چاہیے تھا کہ عورتیں مردوں کے موجودہ جابرانہ اقتدار کی عمارت گرانا اور اُن کے تفوق وسیادت کے مسلمہ نظریہ میں رخنے ڈالنا شروع کردیں۔

کاشکہ یہ نسوانی جدوجہد حدود اعتدال سے متجاوز نہ ہوتی۔ اس کا منشا صرف جائز حقوق کا حاصل کرلینا ہوتا لیکن موجودہ نسوانی تحریکیں جس نوعیت سے جاری ہیں اور انھیں جن طریقوں سے پروان چڑھایا جارہا ہے وہ صاف بتلا رہی ہیں کہ ہماری پڑھی لکھی بہنوں نے یہ طے کرلیا ہے کہ "چراغ خانہ" بننے سے "شمع انجمن" بن جانا زیادہ اچھا ہے۔ وہ اب ایک گھر کا اُجالا ہو کر رہنا نہیں چاہتیں، اُنکی خواہش ہے کہ وہ ہر محفل کی رونق بنیں۔ امور خانہ داری کا انصرام اُنکے انتظامی ذوق کے ظرف کے مناسب نہیں۔ سیاست کی پیچیدگیوں میں نسائیت کا دامن اُلجھا دینا اُن کے نزدیک ضروری ہے۔

ہمارے لئے پہلی صورت جتنی دل شکن تھی اتنی ہی یہ دوسری صورت تکلیف دہ ہے عورتوں کی سابقہ جہالت جتنی بربادکن تھی اتنی ہی اُن کی یہ روش پریشان کن ہے۔

یقیناً عورتوں کو تعلیم کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مردوں کو لیکن تعلیم کی نوعیت صنفی تفرقوں کے لحاظ سے لازماً بدل جائیگی۔ مردوں کے لئے وہی تعلیم مناسب ہوسکتی ہے جو اُنھیں ایسے حربوں سے مسلح کردے جو ایک مرد کے فرائض ادا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اسی طرح عورتوں کے لئے وہی تعلیم موزوں ہے جو اُنھیں "حقیقی نسائیت" کے خوشنما زیوروں سے آراستہ کردے۔

ہندوستانی عورتوں نے اگر مغربی بہنوں کی تائید میں شرم و حیا کے زیور اُتار کر رکھ دیئے اور نسائیت کی لطیف خصوصیات سے بالکل قطع تعلق کرلیا تو پھر یہ انسانیت کا عظیم الشان نقصان ہوگا۔ مرد اگر اب بھی سمجھیں اور عورتوں کو اپنا برابر کا شریک و سہیم صدق دل سے بنائیں تعلیم و شائستگی کی روشنی کا اُنھیں منصفانہ حصہ دیں، غیر ضروری قید و بند کے طوق و سلاسل کی زحمتوں میں اُنھیں مبتلا نہ کریں تو اس تمام جد و جہد میں اعتدال پیدا، اور افراط پسندی کا رجحان عورتوں سے دُور ہوسکتا ہے۔

گزشتہ پرچے میں محترمی مسعود حسن صاحب رضوی مدیر "آثار ادبیہ" نے "شیخ چندا حسینی" کے سال وفات سے متعلق شعر میں صحیح مادۂ تاریخ دریافت کرنے کی ناظرین کرام سے خواہش فرمائی تھی۔ چنانچہ جناب مولانا عدیل اختر صاحب ممتاز الافاضل نے پشاور سے اس کا حل یوں تحریر فرمایا ہے۔

"ہیں ولی چندا حسینی با کمال　　　ہے رخِ چندا میں تاریخِ وصال

رخِ چندا کے ساتھ کمال کے اعداد کا اضافہ کیا جائے تو ۹۴۹ ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سنہ ۹۱۶ء سے ۳۳ سال بعد انتقال کرنے والے یوسف عادل شاہ کے ہمعصر اور ہم عہد رہے ہوں بعض تخرجے یا اضافے اس انداز کے ہوتے ہیں جن کی طرف شعر میں لطیف اشارہ ہی ہوتا ہے"

ہم نے بھی غور کیا یہی حل زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ولایت صفی پوری مرحوم

۲

(جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر بی اے)

میں نے پچھلا مضمون ولایت کے بعض اشعار جن میں واردات عشق کی صورت گری ہے درج کر کے ناتمام چھوڑ دیا تھا، وہیں سے آغاز کرتا ہوں۔

ذیل کا شعر مضمون کے لحاظ سے نہ تو نیا ہے نہ بہت بلند، مگر انداز بیاں نے اسی میں عجب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ؎

شب وصل است ویار ماہروئے من درآغوشم   بہ حشر انداز یارب جلوۂ خورشید خاور را

دوسرے مصرع کے انوکھے اسلوب نے شعر کو کیا سے کیا کر دیا۔ اب صرف یہ مطلب نہیں رہا کہ سحر نہ ہو بلکہ اس ماہ دو ہفتہ (معشوق) سے آغوش خالی ہونے پر جلوۂ خورشید بالکل پھیکا نظر آئے گا لہذا دعا کرتے ہیں کہ یارب اسے حشر کے لئے اٹھا رکھ۔

ایک غزل میں ولایت نے بتایا ہے کہ مشرب رندانہ کس کو کہتے ہیں۔ یہ شعر دراصل تصوف کے تحت میں لکھنا چاہیے تھے، مگر ولایت کی شاعری میں جو سراسر عشق و حقیقت ہے یہ امتیاز بیکار ہے، زبان رندوں کی ہے مگر خیالات ایک عارف کامل کے ہیں۔ ؎

اے شیخ پاک، شرب مئے کشیدن است   در بزم بے خودی رخ محبوب دیدن است

رنگیں ترانہ گفتن و معشوق یافتن — رسوا شدن بہ عشق و ملامت کشیدن است

از محتسب گریختن و روے تافتن — پندے کہ پیرِ میکدہ گوید شنیدن است

از دستِ خویش خونِ دلِ خویش ریختن — واندر رہوائے دوست چو بسمل تپیدن است

آویختن بدامنِ معشوق دستِ شوق — دیوانگی گزیدن و داماں دریدن است

سود و زیاں نہ دیدن و سرمایہ سوختن — آسودگی فروختن و غم خریدن است

در کنجِ عافیت ز جہاں بے خبر شدن — وز خویش و آشنا چو ولایت بریدن است

اِن سات شعروں میں پورا فلسفۂ عشق و تصوف نظم ہے اور اُسی رندانہ جوش و خروش و سرستی کے ساتھ جو کلام حافظ کی خصوصیت ہے۔

آپ نے عشق کے بیان میں سیکڑوں شعر سُنے ہونگے کہ دل خون ہوا اور ایک قطرۂ اشک بن کر مژہ سے ٹپک پڑا، مگر ولایت کا علو تخئیل ملاحظہ فرمائیے۔ کہتے ہیں کہ جس طرح شراب نَو کو خُم میں رکھ کر پختہ کرتے ہیں خونابِ دل کو شیشۂ دل میں بھرے ہوئے ہوں اور اُبلنے نہیں دیتا، شراب میں کہنہ ہو کر جوش پیدا ہوتا ہے اور ظرف سے باہر نکل پڑتی ہے۔ خونابِ دل کا ہر قطرہ ابھی سے طوفان بدامن ہے۔ کیونکہ اسکا خمیر عشق ہے جس میں قرار کو دخل نہیں اور چاہتا ہے کہ مژگاں پر "بانداز چکیدن" سرنگوں ہو یا دامن کو تختۂ گلزار بنادے مگر ضبط کا حکم ہے کہ اس بادۂ سرجوش کو اُس وقت تک مژگاں سے ناآشنا رکھو۔ جب تک بے اختیارانہ کف در دہاں موج کی طرح آنکھوں کے بند توڑ کر نہ نکل جائے۔

درخُم کنند پختہ ولایت شرابِ نَو — ماپختہ می کنیم بدل خونِ ناب را

عاشق کو سراسر اضطراب و مرقع سوز و گداز ہونا چاہیے، جہاں یہ درجہ حاصل ہوا امتیاز حسن و محبت مٹا، اب جو حالت عاشق کی ہے وہی معشوق کی، نہ اُسے چین نہ اُسے قرار، وصل ہو کہ ہجر۔ دیکھئے اس حقیقت کو کس انداز سے بیان کرتے ہیں۔

آہ از وصل چہ راحت کہ چو پروانہ و شمع — من اگر سوختہ ام تو بگداز آمدہ

گوشۂ بود و منِ خستہ، چہ اُفتاد ترا — کہ غمم آگیں بہ نہاں خانۂ راز آمدہ

ہندوستان کے لسان الغیب

ولایت صفی پوری مرحوم

۲

(جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر بی اے)

میں نے پچھلا مضمون ولایت کے بعض اشعار جن میں واردات عشق کی صورت گری ہے درج کر کے ناتمام چھوڑ دیا تھا، وہیں سے آغاز کرتا ہوں۔

ذیل کا شعر مضمون کے لحاظ سے نہ تو نیا ہے نہ بہت بلند، مگر انداز بیاں نے اسی میں عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ؎

شب وصل است و یار ماہر وئے من در آغوشم ۔۔۔ بہ حشر انداز یارب جلوۂ خورشید خاور را

دوسرے مصرع کے انوکھے اسلوب نے شعر کو کیا سے کیا کر دیا۔ اب صرف یہ مطلب نہیں رہا کہ سحر نہ ہو بلکہ اس ماہ دو ہفتہ (معشوق) سے آغوش خالی ہونے پر جلوۂ خورشید بالکل پھیکا نظر آئے گا لہٰذا دعا کرتے ہیں کہ یارب اسے حشر کے لئے اُٹھا رکھ۔

ایک غزل میں ولایت نے بتایا ہے کہ مشرب رندانہ کس کو کہتے ہیں۔ یہ شعر دراصل تصوف کے تحت میں لکھنا چاہیے تھے، مگر ولایت کی شاعری میں جو سراسر عشق و حقیقت ہے یہ امتیاز بیکار ہے، زبان رندوں کی ہے مگر خیالات ایک عارف کامل کے ہیں۔ ؎

اے شیخ پاک، شرب ما می کشیدن است ۔۔۔ در بزم بے خودی رخ محبوب دیدن است

رنگیں ترانہ گفتن و معشوق یافتن — رسوا شدن بہ عشق و ملامت کشیدن است
از محتسب گریختن و در روے تافتن — پندے کہ پیر میکدہ گوید شنیدن است
از دست خویش خون دل خویش ریختن — و اندر رہواے دوست چو بسمل تپیدن است
آویختن بدامن معشوق دست شوق — دیوانگی گزیدن و دامان دریدن است
سود و زیاں نہ دیدن و سرمایہ سوختن — آسودگی فروختن و غم خریدن است
در کنج عافیت ز جہاں بے خبر شدن — وز خویش و آشنا چو ولایت بریدن است

اِن سات شعروں میں پورا فلسفۂ عشق و تصوف نظم ہے اور اسی رندانہ جوش و خروش و مستی کے ساتھ جو کلام حافظ کی خصوصیت ہے۔

آپ نے عشق کے بیان میں سیکڑوں شعر سُنے ہونگے کہ دل خون ہوا اور ایک قطرۂ اشک بن کر مژہ سے ٹپک پڑا، مگر ولایت کا علو تخئیل ملاحظہ فرمائیے۔ کہتے ہیں کہ جس طرح شراب نو کو خُم میں رکھ کر پختہ کرتے ہیں خوناب دل کو شیشۂ دل میں بھرے ہوئے ہوں اور اُبلنے نہیں دیتا، شراب میں کہنہ ہو کر جوش پیدا ہوتا ہے اور ظرف سے باہر نکل پڑتی ہے۔ خوناب دل کا ہر قطرہ ابھی سے طوفان بدامن ہے۔ کیونکہ اسکا خمیر عشق ہے جس میں قرار کو دخل نہیں اور چاہتا ہے کہ مژگاں پر "باندازِ چکیدن" سرنگوں ہو یا دامن کو تختۂ گلزار بنا دے مگر ضبط کا حکم ہے کہ اس بادۂ سرجوش کو اُس وقت تک مژگاں سے ناآشنا رکھو۔ جب تک بے اختیارانہ کف در دہاں موج کی طرح آنکھوں کے بند توڑ کر نہ نکل جائے! ؎

درخُم کنند پختہ ولایت شراب نو — ما پختہ می کنیم بدل خون ناب را

عاشق کو سراسر اضطراب و مرقع سوز و گداز ہونا چاہیے، جہاں یہ درجہ حاصل ہوا امتیاز حسن و محبت مٹا، اب جو حالت عاشق کی ہے وہی معشوق کی، نہ اُسے چین نہ اُسے قرار، وصل ہو کہ ہجر، دیکھئے اس حقیقت کو کس انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ؎

آہ ز وصل چہ راحت کہ چو پروانہ و شمع — من اگر سوختہ ام تو بگداز آمدہ
گوشۂ بود و من خستہ، چہ اُفتاد ترا — کہ غم آگیں بہ نہاں خانۂ راز آمدہ

کبھی یوں بھی ہوتا ہے۔ ؎

گہے از حیلہ برخیزد زپہلو | گہے از غمزہ میجوید بہانہ

اور کبھی یوں ؎

بہ یک غمزہ مرا از خود ربودی | بہ یک عشوہ مرا دیوانہ کردی

اس غزل کے دو شعر اور سن لیجیے۔ موضوع سے الگ ہیں تو ہوں! ؎

شراب عشق در پیمانہ کردی | بہ یک پیمانہ ام مستانہ کردی

بہ محفل شمع گشتی، گل بہ گلشن | ستم بر بلبل و پروانہ کردی

فلسفہ | ولایت کا فلسفہ وہی ہے جو حافظ شیراز کا، اور لطف یہ ہے کہ شعریت کہیں فوت نہیں ہوئی ہے۔

انسان کی سعی یہ ہونا چاہیے کہ شادی و غم سے بے نیاز اور "نفس مطمئنہ" کے گرامی خطاب کا مستحق ہو جائے۔ عقل اس منزل کی رہنما نہیں ہو سکتی، اسکا سہرہ عشق کے سر ہے۔ ؎

دامن بلوث عقل نیالودہ ایم ما | فارغ ز فکر شادی و غم بودہ ایم ما

نکتہ:۔ لفظ فکر کے اضافہ سے کس قدر ترقی ہوئی۔ صرف شادی و غم سے فارغ نہیں ہیں بلکہ اسکی فکر سے بھی فارغ ہیں۔ فکر خود باعث اندوہ ہے)

اسی خیال کو ایک دوسرے شعر میں اس طرح ادا کیا ہے۔ ؎

ولایت عشق بازاں را دماغے می شود پیدا | ز دنیا و ز مافیہا فراغے می شود پیدا

جہاں کسی عمل میں خود غرضی شامل ہوئی اُس سے نیکی زائل ہو جاتی ہے۔ ؎

زاہد بیا و سجدہ در ابروے یار کن | برطاق نہ خیال عذاب و ثواب را

جو کچھ ہے نیک و بد اعمال کا نتیجہ ہے۔ قسمت کو الزام دینا ابلہی ہے۔ ؎

میکنی فریادہا از گردش اختر چرا | سخت نادانی نمی بینی بہ خیر و شر چرا

صائب کے رنگ میں فرماتے ہیں۔ ؎

منال از تیرگی از گردش اختر شود پیدا — کہ چوں تاریک تر شد باز روشن تر شود پیدا

دیوان میں فلسفیانہ اشعار کی معقول تعداد ہے، میں نے چند نمونے پیش کر دیئے فرصت ہوئی تو ایک مستقل مضمون ولایت کی فلسفیانہ شاعری پر لکھونگا۔

پند و موعظہ ایسے اشعار بھی بہت ہیں فی الحال ان سے بھی قطع نظر کرتا ہوں۔

فلسفۂ اخلاق اس موضوع کو بھی فی الحال اٹھائے رکھتا ہوں۔ مگر اس سلسلہ میں اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ علما اور واعظین ریاکار کی خوب خوب پردہ دری کی ہے مثلاً ؎

برو بدیر مغان و ببیں خرابیہا — کہ مفتیاں بچہ حال اند مستمند آنجا
بیا بہ بتکدہ و صنع حق تماشا کن — مرو بہ کعبہ کہ زہاد مسکر اند آنجا

محتسب کا عجب قماش سے مضحکہ اڑایا ہے۔ ؎

خرقہ سوزیم و بنوشیم شراب گلگوں — محتسب کرد طواف در کاشانۂ ما

روزمرہ و محاورہ حافظ کی طرح ولایت اس کے بھی بادشاہ ہیں۔ مجھے فارسی پر عبور نہیں، البتہ اساتذہ کا کلام دیکھا ہے اور کان کچھ نہ کچھ سدھ گئے ہیں، اسلاف خاک پاک اصفہان سے تھے شاید اسکا بھی اثر ہو۔ ولایت کے دیوان میں مشکل سے ایک دو شعر نکلیں گے جن میں ہندیت پائی جائے۔ ورنہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک خالص ایرانی اہل زبان، وہ بھی شیرازی یا اصفہانی اپنے کمالات شاعری دکھا رہا ہے۔ جو شعر اس مضمون میں یا اس سے پیشتر کے مضمون میں درج کئے جا چکے یا آئندہ درج ہونگے، زبان و بیان کی خوبیوں سے مالا مال ہیں۔ یہاں پر کچھ اور اضافہ کئے جاتے ہیں ؎

ہر چند عذر آرم و گویم کہ جرم چیست — کم می کند حواس و فزوں می کشد مرا
گفتم کہ جاں سپرد ولایت بجور تو — گفتا بلے ہنوز نیاسودہ ایم ما
از کعبہ بروں رفتم احرام ہوسہا را — مستانہ دعا گفتم پیران کلیسا را
فتادہ اند بغفلت زہر چہ ہست و بود — بحیرتم کہ چہ مستی گرفت مستاں را
گر شیخ عشق ورزد، عذرش بنہ کہ ارزد — جوشے بود نہانی ہر پیر و ہر جواں را

دلے دارم بخوں آغشتہ از آلودہ دامانی　　بیا دستگیری کن کہ پایم رفت در گلہا
بجنت بے را چہ کنم ورنہ بہ پا مردیٔ عشق　　ترک سر گویم و گیرم رہِ فرمانِ ترا
گر خطائے رود از دست ولآیت دریاب　　چشم دارد ز تو لائے تو احسانِ ترا
قصۂ دیر و حرم ہر دو برفت از یادم　　بر سرِ کوچۂ دلدار مقام است مرا
از رخ دوست عجب نورِ بہشتی پیدا است　　باش و بنگر کہ صبح است نہ شام است اینجا
از خود و بگزشتیم پے یارِ خود آ را　　دادیم ز کف سود و خریدیم زیاں را
ناخن فکرِ منِ خستہ چو از کار بماند　　گرہ از کارِ فرو بستہ کشودند مرا

ولآیت کا کلام روزمرہ و محاورات و مصطلحات سے لبریز ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر الف کی ردیف سے (وہ بھی پوری نہیں) نقل کر دیئے۔

خوشنوائی | حافظ کی طرح ولآیت کے اشعار میں بھی موسیقیت پائی جاتی ہے۔ مولانا شبلی کلام حافظ پر تبصرہ کرتے ہوئے شعر العجم میں فرماتے ہیں کہ

"خواجہ صاحب کے کلام میں یہ وصف مختلف اسباب سے پیدا ہوتا ہے، اکثر وہ غزلوں کی بحریں ایسی رکھتے ہیں جو موسیقی سے مناسبت رکھتی ہیں، شعروں کے ارکان اور اُن کے ٹکڑے ایسے لاتے ہیں جو تال اور سم کا کام دیتے ہیں، اسی غرض کے لئے اکثر ہم وزن الفاظ کا پے در پے آنا مدد دیتا ہے اور گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ بار بار تان آکر ٹوٹتی ہے۔ مثلاً ؎

چو در دست ست رودے خوش، بزن مطرب سرودے خوش
کہ دست افشاں غزل خوانیم، و پا کوباں سر اندازیم"

اس روشنی میں ولآیت کا یہ شعر پڑھیے۔ ؎

از کعبہ بروں رفتم احرام ہوسہا را　　مستانہ دعا گفتم پیرانِ کلیسا را

معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص پر حال طاری ہے اور اس عالم بیخودی میں ہاتھ مٹکا رہا اور گردن ہلا رہا ہے اور "مستانہ دعا گفتم" پر پاؤں سے تال دیتا ہے۔

مزید مثالوں سے درگزر کرتا ہوں کیونکہ قریب قریب جتنے شعر درج ہوئے اس وصف سے آراستہ ہیں۔ صرف ایک پوری غزل سُن لیجیے جو سرور ومستی و ترنم میں ڈوبی ہوئی ہے اور مطالب و معانی کے لحاظ سے بھی لاجواب ہے۔ حالانکہ بحر ایسی ہے جس میں کھٹکا پیدا کرنا تو درکنار عام شاعر موزوں بھی نہیں کر سکتے۔ ولایت نے یہ کمال کیا ہے کہ صنائع لفظی کے اضافہ کے ساتھ کہی ہے:-

کعبۂ جمال او، جلوۂ خدا اینست	کیش برہمن اینست، دیں پارسا اینست
گر بطاق آں ابرو، فوت شد نماز تو	سر بزیر تیغش نہ، سجدۂ قضا اینست
با قضا درآویزد، فتنہ ہا برانگیزد	خون پارسا ریزد، غمزۂ ادا اینست
ترک مدعا کردن، جان و دل فدا کردن	صورت فنا اینست، معنئ بقا اینست
خون دل فرو خوردن، مردن و جفا بردن	شرط عاشقی اینست، شان مبتلا اینست
دل میل بیہوشی، ہمنفس بخاموشی	جاں بخود فراموشی، بین کہ انتہا اینست
دیدہ خوں ہمی بارد، دل بہ بیدلی دارد	ضبط بے قراری چند، راز برملا اینست
از بلا نہ ترسیدن، وز جفا نہ رنجیدن	گر تو عشق او داری، شیوۂ وفا اینست
کشتۂ ولایت را، زندہ کن بہ یک ایما	ہمچناں بکش بازش، جائے مرحبا اینست

اسی سلسلہ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ولایت کا کلام بھی حافظ کی طرح صنائع لفظی سے مالا مال ہے اور صنائع اُسی بے تکلفی سے نظم ہوئے ہیں۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے برتنے میں کوئی اہتمام کیا گیا ہے۔ صنائع عموماً وہی ہیں جو روانی و خوش آہنگی میں معین ہوتے ہیں چنانچہ مندرجہ بالا غزل میں ترصیع، لف ونشر مرتب، اشتقاق، تجنیس، تقابل وغیرہ جا بجا نمایاں ہیں۔ صنائع کا استعمال اب ایک فضول سی بات سمجھی جاتی ہے اور کوئی دلچسپی نہیں لیتا لہٰذا اس پر وضاحت سے لکھنا بیکار ہے۔

بندش کی چستی اسکی مثالیں بھی علیحدہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ آپ ولایت کے کسی شعر کی بندش سُست نہ پائیں گے۔ لفظوں کی دروبست کا یہ حال ہے کہ ایک لفظ ادھر اُدھر

ہو جائے یا بدل دیا جائے تو شعر فرد نہیں دیتا اور مطلب کے اعتبار سے پست ہو جاتا ہے۔ میں نے جانچ لیا، ناظرین بھی اگر چاہیں تو امتحان کریں۔

شوخی و ظرافت بھی ولایت کے کلام میں خاصی ہے۔ اسکی مثالیں اس مختصر انتخاب میں جا بجا موجود ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

تسلسل مضامین حافظ کی طرح نہ معلوم کتنی غزلیں پوری پوری ایک ہی مضمون میں ہیں۔ کئی درج ہو چکیں۔ یہاں ایک غزل نقل کر کے اسی سے تصوف کے عنوانوں کو ربط دے دونگا۔ جس پہ خامہ فرسائی کے لئے اور مباحث کو مختصر کر دیا یا چھوڑ دیا مثلاً تخئیل و محاکات، تشبیہ، استعارہ وغیرہ وغیرہ۔ فرماتے ہیں ؎

دوش دیدم در کلیسا پارسائے پاکباز ۔۔۔ سجّاش در دست و بر پیشانیش داغِ نماز
روز کعبہ یک طرف کردہ، بہ رنگِ برہمن ۔۔۔ سر بہ پائے بُت نہادہ با صد الحاح و نیاز
ساعتے چوں در گزشت، از بت پرستی سر بتافت ۔۔۔ سوئے مسجد رفت چوں پاکاں بصد سوز و گداز
شب گزشت و تا سحر بر خاک می مالید رو ۔۔۔ زار می نالید از مستی بخلوت گاہِ راز
صبح پرسیدم کہ شیخا ایں چہ حالت بودہ است ۔۔۔ عاقلاں را باید اندر دیر و کعبہ امتیاز
راست فرما کافری یا در حقیقت مسلمی ۔۔۔ حق پرستاں را ز کفر و شرک باید احتراز
گفت، دانم محرمِ اسرارِ حق بیناں نہ ۔۔۔ دوش بر روے دلِ مستم درے کردند باز
چوں حجاب از پیشِ من برخاست آئینہ شدم ۔۔۔ معنیٔ دیدم بصورت، ہم حقیقت در مجاز
تا ندیدم جز خدا در کعبہ و در بتکدہ ۔۔۔ روے داد از حق پرستی حالتے پر سوز و ساز
اے ولایت راز ما افشا مکن، خاموش باش ۔۔۔ ایں سوالت را جوابے بود اے جویائے راز

تصوّف کیا ہے مجھے اس موضوع پر کچھ لکھتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کوچے سے نابلد ہوں۔ مگر تصوف اور فلسفہ میں مماثلت ضرور ہے اور جہاں تک اس مسئلہ کے علمی پہلو کا تعلق ہے چند کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اگر عالم بے عمل ہو سکتا ہے تو صوفی بے سلوک بھی سہی۔ معذرت میں عرفی کا

یہ شعر کافی ہے۔ ؎

منکر منتواں گشت اگر دم زنم از عشق ۔۔۔ کیں نشہ بمن نیست اگر با دگرے ہست

سب قوال سے قطع نظر کر کے ایک حکایت درج کرتا ہوں جس سے تصوف کے معنی روشن ہونگے۔

ایک فقیر کی ایک بادشاہ سے بہت ملاقات تھی۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے اُس سے کہا کہ مجھ سے کچھ مانگ، فقیر نے جواب دیا کہ اپنے غلاموں کے غلام سے کیا مانگوں؟۔ بادشاہ نے کہا یہ کیا؟ ۔ فقیر بولا کہ میرے دو بندے ہیں اور وہ دونوں تیرے خدا ہیں، ایک حرص اور دوسرے اُمید۔ جب تو ان دونوں سے آزاد ہو تو میں تجھ سے کچھ طلب کروں"۔

حاصل یہ ہوا کہ خدا کی یاد میں دنیا وما فیہا سے بے نیاز ہونے اور ما سوی اللہ کو بھول جانے کا نام تصوف ہے۔

شریعت کی طرح طریقت یا تصوف بھی دو اجزا سے مرکب ہے، علم اور عمل۔ عقائد میں جن مسائل سے بحث کی جاتی ہے ان میں ذات وصفات باری کے متعلق جو مسائل ہیں تصوف میں بھی انھیں سے بحث ہوتی ہے لیکن تصوف میں ان عقائد کی حقیقت دوسری طرح بیان کی جاتی ہے۔ یہی حصہ تصوف کا علمی حصہ ہے۔ اِس میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے یہ ہے کہ اس میں علم وادراک کا طریقہ عام طریقے سے مختلف ہے۔ تمام حکما اور علما کے نزدیک ادراک کا ذریعہ حواس ظاہری و باطنی یعنی حافظہ، تخیل، حس مشترک وغیرہ ہیں لیکن ارباب تصوف کے نزدیک ان وسائل کے سوا ادراک کا اور ذریعہ بھی ہے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ مجاہدہ، ریاضت، مراقبہ اور تصفیہ قلب سے ایک اور حاسہ پیدا ہوتا ہے جس سے ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو حواس ظاہری و باطنی سے معلوم نہیں ہوتیں۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔ ؎

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک ۔۔۔ نقشہا بینی بروں از آب و خاک

پنج حسے ہست جز ایں پنج حس ۔۔۔ آں چو زر سرخ وایں حسہا چو مس

شریعت اور علم الاخلاق میں جن احکام کی تعلیم دی جاتی ہے مثلاً صبر، رضا، توکل، استغنا، قناعت

وغیرہ وغیرہ ان پر انسان عمل کرتا ہے تو اس بنا پر کہ شریعت نے اسکی تعلیم دی ہے اور شریعت کی سزا یعنی عذاب قیامت کی مستوجب ہے لیکن تصوّف میں ایک حالت طاری ہوتی ہے جس سے خود بخود اخلاق پیدا ہوتے ہیں صوفی دل پر جبر کر کے صبر اختیار نہیں کرتا بلکہ طبعاً اس سے صبر سرزد ہوتا ہے۔ وہ نماز اس لئے نہیں پڑھتا کہ نہ پڑھونگا تو دوزخ میں جاؤں گا بلکہ اس لئے پڑھتا ہے کہ نہ پڑھنا اُسکے اختیار میں نہیں۔ یہ تصوف کا عملی حصّہ ہے۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ وؔلایت نے تصوف کے کیا کیا رموز و نکات بیان کئے ہیں۔

ریاضت و مجاہدہ سے تصفیۂ قلب حاصل ہوتا ہے جس سے مختلف مدارج سلوک طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اسکے بعد اہل سلوک پر طرح طرح کی کیفیتیں طاری ہوتی ہیں اور معرفت کے منازل طے کرتے رہتے ہیں۔ کبھی غیبت ہے کبھی حضوری۔ کبھی سُکر طاری ہے کبھی صحو، کبھی مقام فنا میں ہیں کبھی منزل بقا میں، کبھی مقام اُنس میں ہیں کبھی مقام ہیبت میں، وغیرہ وغیرہ۔

پھر بھی ہر شخص کامیاب نہیں ہوتا۔ چنانچہ وؔلایت فرماتے ہیں۔ ؎

از بلند و پست منزل ہر کسے آگاہ نیست　　تا حریم معرفت ہر سالکے را راہ نیست

ذرا غافل ہوا اور برسوں کی محنت خاک میں مل گئی۔ ہر قدم پر خطرہ ہے اور منزل ایسی کٹھن ہے کہ ؎

بے دل پرخون جان سر بکف ہرگز مرو　　اندراں وادی کہ لیلیٰ کار مجنوں می کند

صفائے قلب حاصل ہونے پر مادی حجاب آنکھوں کے آگے سے اُٹھ جاتے ہیں اور دل آئینۂ جہان بن جاتا ہے۔

گرچہ آئینہ و جام است اسکندر و جم　　نیک بنگر کہ ہم آنست و ہم اینست اینجا

طریق سلوک میں طرح طرح کی دشواریاں اور مصائب اُٹھا کر دل درد آشنا ہو جاتا ہے۔ ؎

درخم کنند پختہ وؔلایت شراب نو　　ما پختہ می کنیم بدل خون ناب را

آہ از دل بیہوش معتدل آید چو نسیم　　گرچہ ہنگامۂ آتش نفساں است اینجا

جیسا پہلی قسط کی ابتدا میں عرض کر چکا ہوں وؔلایت مرحوم نے سو برس کے قریب عمر پائی۔ اتنا سن آنے پر قویٰ اور طبیعت میں انحطاط و اضمحلال پیدا ہونا لابد ہے شگفتگی و زندہ دلی مفقود ہو جاتی ہے،

مگر میں نے اُن کو ہمیشہ مسکراتے ہی دیکھا۔ اُن کی پوری شاعری اور اُن کے واقعات زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن پر ہر وقت ایک سرور کا عالم طاری رہتا تھا۔ ؎

بحیرتم کہ چہ مستی گرفت مستاں را فتادہ اند بغفلت زہر چہ ہست و بود

استفہام محض بلاغت کے لیے ہے۔ یہ مستی عرفاں ہے جو حال و مستقبل سے بے پروا کر دیتی ہے۔

عشق و محبت بھی تصوف کی ایک منزل اور اعلیٰ منزل ہے۔ عشق کامل ہو کر معشوق سے بھی بے نیاز کر دیتا ہے اور وہاں پہونچا دیتا ہے جسکو اصطلاح صوفیہ میں مقام تمکین کہتے ہیں۔ ؎

بود گر عشق کامل نیست حاجت با تکاپویت کہ مجنوں می کشد از دشت سوئے خویش لیلیٰ را

ترک خواہشات و لذات کے بغیر صورت مقصود نظر نہیں آتی۔ یا زبان صوفیہ میں یوں کہیے کہ اپنے سے غیبت حق سے حضوری ہے۔ ؎

گر بزنی آتشے دامن مقصود را محرم جاناں شوی دست گریباں شوی

فنا کا صحیح مفہوم یہی ہے۔

اصطلاح صوفیہ میں ایک مقام ہیبت ہے جس میں تجلی کا تقاضا جلال کے ساتھ ہوتا ہے اس منزل میں سالک نزول آفات و بلا کا متمنی رہتا ہے یہ در اصل فنا کا ایک رُخ ہے۔ اسکے برعکس مقام اُنس ہے جس میں تجلی کا تقاضا جمال کے ساتھ ہوتا ہے یہ در اصل مقام بقا ہے۔ ولایت منزل ہیبت کی مصوری کرتے ہیں۔ ؎

پوشیدہ بخاکستر ما ہست شرر ہا جاں سوخت بیک جلوۂ دیدار ولیکن

تصوف میں ایک مقام جمع و تفرقہ ہے۔ جمع کا تعلق اوصاف باری سے ہے اور تفرقہ کا افعال کے فرق سے۔ ذات ایک ہے افعال متفرق ہیں۔ جمع توحید کا علم ہے اور تفرقہ احکام کا۔ اصول کا علم جمع ہے، فروع کا علم تفرقہ۔ تفرقہ سے مراد کسب ہے اور جمع سے مجاہدہ و مشاہدہ۔ جمع کا تعلق دل سے ہے اور تفرقہ کا ذکر با لسان سے۔ تفرقہ جدائی ہے اور جمع وصل۔

جس وقت صوفی اس حجاب سے گزرتا ہے۔ تو ؎

قصۂ دیر و حرم ہر دو برفت از یادم   بر سر کوچۂ دلدار مقام است اینجا

منزلِ تمکین کے برعکس منزلِ تلوین ہے جس میں ایک حال سے دوسرے حال میں تغیر ہوتا ہے۔ تمکین درجۂ کمال اور منتہیوں کی قرارگاہ ہے۔ تلوین ابتدائی درجہ ہے۔ تلوین مقام موسیٰ تھا، تمکین درجۂ محمد مصطفیٰ۔ ایک کو برق طور نے بیہوش کر دیا۔ دوسرے مکہ سے تا قاب قوسین عین تجلّی میں تھے مگر تغیر رونما نہیں ہوا۔

ولایت نے ایک ایسی صورت دکھائی ہے جو تمکین و تلوین کے بین بین ہے مجھے اس کا اصطلاحی نام نہیں معلوم، مگر بلند پایہ صوفی شاعروں نے اسکا احساس اور تذکرہ کیا ہے۔

گر حسن تو دیوانۂ خود کرد دلم را   آوارہ کند عشق منت در طلبِ ما

حضرت آسی غازیپوری مرحوم کا مشہور مطلع ہے۔

وصل ہو پر دل میں اب تک وہی غم پیچیدہ ہے   بلبلا ہے عین دریا میں مگر نمدیدہ ہے

کسی کا مشہور شعر ہے۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را   ہر زماں از غیب جانے دیگر است

غالباً ان اشعار میں یہ رمز ہے کہ ذات باری سے کامل اتصال ناممکن ہے عبد و معبود کا فرق مراتب بلند ترین درجۂ معرفت پر پہونچ کر بھی قائم رہتا ہے۔ ولایت مرحوم کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ جلوۂ حسن نے عاشق کو جب اپنی ذات سے بیگانہ کیا تو پھر اپنی جستجو شروع ہوئی۔

عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ اس کیفیت کے لئے مجھے کتب تصوف میں کوئی خاص اصطلاح نہیں ملی۔ قریب تر لفظ تلوین تھا جس سے مطلب ادا نہیں ہوتا کیونکہ ان اشعار میں دو متضاد کیفیتیں دکھائی ہیں جو یکے بعد دیگرے پے بہ پے آتی ہیں۔ تلوین میں پہلی حالت عود نہیں کرتی تغیر قائم رہتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اسکے بعد معرفت کے کسی دوسرے درجہ مثلاً صحو یا سکر میں منتقل ہو جائے مگر نقل کردہ اشعار میں دونوں متضاد کیفیتوں کے نقوش پہلو بہ پہلو ملتے ہیں۔ نیز یہ کیفیتیں متواتر ایک دوسرے کی جگہ لیتی رہتی ہیں۔

اسی قبیل کا میر کا یہ شعر ہے۔ ؎

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا

ذیل کے شعر میں منزل فنا کا ذکر ہے۔ مناسب ہوگا کہ پہلے فنا و بقا سے حضرات صوفیہ کا جو مطلب ہے واضح کر دیا جائے۔ اوصاف بشریت سے علیحدہ ہونا اور شہوات و لذات کو ترک کرنا درجۂ فنا ہے۔ کوچۂ فنا میں نہ محبت ہے نہ عداوت، اسی طرح بقا میں جمع و تفرقہ نہیں۔ فنا سے مراد ذات کا گم اور اپنے وجود کا نیست ہونا نہیں ہے بلکہ غیر کے ذکر کی فنا مقصود ہے اور بقا سے مراد ذکر خدا کی بقا ہے۔

اخلاص عبودیت کا نام بقا ہے۔ انسانیت کے تعلقات سے کنارہ کرنا فنا ہے۔ جو فنا کو خدا کی ذات میں فنا ہو جانا یا بقا کو خدا کی ذات سے متحد ہو کر باقی رہنا جانتا ہے غلطی پر ہے۔ یہ زندیق اور نصاری کا مذہب ہے۔ ہاں تو شعر سُنیے۔ ؎

دراں وادی کہ شورِ عشق لیلیٰ را کند مجنوں — غبارِ کارواں ہا شو کہ آں محمل شود پیدا

اسرار حقیقت پر عبور حاصل کرنے کا ذریعہ بیرونی اشیاء کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ ریاضت و مجاہدہ سے دل کو تجلیات کا سرچشمہ بنانا چاہیے۔ ؎

ز صورتہا ے بے معنی حذر کن گر خدا خواہی — کہ اسرار حقیقت از بطونِ دل شود پیدا

تصوف نیز مابعد الطبیعات کا ایک زبردست مسئلہ یہ ہے کہ انسان میں شاہد و مشہود کا اجتماع ہو گیا ہے۔ ؎

کردۂ خود را ز نادانی حجابِ دل چرا — چوں خودی مطلوب طالب گشتۂ حائل چرا

مجاہدہ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ سالک ملامت خلق بطیب خاطر برداشت کرے۔ ؎

بادۂ عشق بخور مست بہر کوچۂ گرد — شرم بگزار و صراحی سر بازار طلب

بگزر از کعبہ و برخیز و بہ میخانہ برو — رشتۂ سبحہ زہم بگسل و زنار طلب

جس طرح ہر علم و فن کے حصول میں ایک معلم کی ضرورت ہوتی ہے سلوک میں بھی بغیر مرشد و رہبر کامل نہ چاہیئے [illegible] ؎

نہ کشایند درے بے مددِ پیر مغاں — رو بہ میخانہ و مفتاح ز خمار طلب

اُسی کے ساتھ خیال کی یکسوئی شرط ہے۔

تا شبِ قدر شود ہر شبِ تاریک ترا شب ہمہ شب ز خدا دیدۂ بیدار طلب

بغیر ترکِ خودی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔

گر تمناست ترا آیت کہ شوی محرمِ راز در خرابات برو ساغرِ سرشار طلب

مسئلہ جبر و اختیار اہلِ سلوک میں محلِ نزاع ہے کوئی کہتا ہے کہ انسان فاعل مختار ہے، کوئی کہتا ہے کہ قطعی مجبور ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ایک حد تک مجبور ہے اور ایک حد تک مختار۔ ولایت کا مسلک حافظ کی طرح جبریہ معلوم ہوتا ہے۔

گہ می کشد بہ ناز و گہے زندہ می کند مرگ و حیاتِ ما ہمہ در اختیار اوست

انسان عالم اکبر ہے فرماتے ہیں۔

خورشید شرارے ز دلِ پر شررِ ماست طوفاں کہ شنیدی نَمے از چشمِ ترِ ماست

اہلِ صوفیہ میں طہارت و پاکی دل سے ہے۔

اے شیخ بدیں زہد دلِ پاک نداری نظارۂ و پاکی ہمہ وقفِ نظرِ ماست

عشق باعثِ تخلیقِ عالم ہے۔

بہ جوش آورد عشقِ ما جہاں را تعالی اللہ ز ما ہست آنچہ بر ماست

فنا و بقا۔

ترکِ ہستی کن کہ فارغ میشوی از نیستی گر بقا خواہی حصولش بے فنا فی اللہ نیست

منزل قرب۔

ما غمِ ہجر نداریم کہ دلبر بر ماست در رہِ عشق نہ ترسیم کہ خود رہبرِ ماست

جمع و تفرقہ کا امتیاز۔

مئے نابے کہ ازو یافتہ منصور نہ مے بہ دل افروزئ ساقی ہمہ در ساغرِ ماست

انسان مظہرِ انوار ہے۔

از دلِ من جلوہ گر شد صورتِ زیبائے او منظرِ خورشیدِ معنی، مشرقِ جانِ من است

توحید ~ اے حسن تو افسانہ و با ایں ہمہ شہرت — بوے سر زلفِ تو صبا ہم نشنیدست

خودی کا حجاب ~ با دیدۂ خود بیں نتواں کرد نظارہ — آں نور دل افروز کہ بیرون و درون است

حقیقت مستی ~ مستیم از شراب میکدہ نیست — جاں بہ بوے توُ مست در بدن است

شوق ریاضت ~ مستی و ذوق مے گلرنگ چہ داند — آں را کہ ریاضت سبب رنج و خمار است

حقیقت عبادت ~ مسجد معنی پرستاں آستانے دیگر است — سجدہ را جز خاک پیشانی نشانے دیگر است

حقیقت روح ~ بر سر بالیں بنار و جانِ آسائش طلب — آنکہ جاناں را کند بیتاب جانے دیگر است

دلیل و حجت باری جان جسم میں موجود ہے مگر دکھائی نہیں دیتی نہ تعین کر سکتے ہیں کہ کس جگہ ہے۔ اسی طرح خدا نظر نہیں آتا مگر دل گواہی دیتا ہے کہ ہے ~

اے ناتمام عشق چہ پرسی مقام دوست — در سینہ است و کس ننماید وراں کجاست

جذب عشق ~ عشق چوں اعجاز پنہاں را بااظہار آورد — لیلیٰ محمل نشیں را سوے کہسار آورد

محاضرہ و مکاشفہ ~ یا رب آں ہنگام روزی کن ولایت کہ عشق — بیخود و سرمستش اندر بزم دیدار آورد

حقیقت عشق ~ اے ولایت ہمہ داغم ز نظر بازی خویش — دل سودا زدہ و مست و خرابم دادند

مستی عشق و عرفاں ~ محبت گرچہ پوشیدہ شود افسانہ می گردد — کہ میکش گرچہ پنہاں میکشد مستانہ می گردد

ترکِ خودی و استغناء ~ چوں بہ فرمانِ قضا قطع تمنا کردم — با غمِ دوری و با حسرتِ دیدار چہ کار

منزل سکوت و حیرت۔ کسی عارف کا قول ہے کہ محبت کا سرمایہ حیرت ہے کیونکہ حیرت اور اک چگونگی ہے اور اسی کا نام توحید ہے۔ مشاہدہ میں تحیر کی زیادتی رفعت مرتبہ کی دلیل ہے۔ ~

غیر خاموشی بیانِ عشق نیست — معنیِ دیگر ز خاموشاں مپرس

وحدت وجود ~ بمعنی چوں نظر کردم بہ ہر صورت ترا دیدم — کشادم بر جہانے چشم چوں چشم از جہاں بستم

فنائے بقا ~ شرطِ عشق است و لا آیت بہ دلداریِ دوست — خاک رہ گردم و آں ہم ہمہ برباد کنم

غیبت و حضوری ~ چوں ز خود رفتم خدائی یافتم — از خدا جوئی رہائی یافتم

گم شدم در خود کہ آخر نیستم — با جہانش آشنائی یافتم

انسان کی معراج کمال و وصال یہ ہے ؎

خوش آں نفس کہ مرا با خود آشنا سازند | زکعبہ فارغ و بیگانہ از خدا سازند

اس مطلع کے بعد پوری غزل نقل کرنے پر مجبور ہوں۔ ؎

سبو کشان خرابات کز ریا دوراند | گماں مبر کہ بہ پیران پارسا سازند
نصیب بوالہوساں نیست عشق شاہد | کجا دلے کہ بدیں درد بے دوا سازند
بہ خاکساری ایں قوم زینہار مبیں | کہ سائلان در یار کیمیا سازند
بلائے مشکل دوری ولایت آساں نیست | شبے میا و کزاں ماہرو جدا سازند

(اس غزل میں ردیف کا تنوع معانی بھی قابل ملاحظہ ہے)

منزل توفیق ؎

دوش وقت سحر از خود برבودند مرا | روے خورشید دل افروز نمودند مرا

منزل تمکیں ؎

سلوک عشق را حاجت بہ جنبش نیست از تمکیں | بپائے بیخودی طے می کنم ہر لحظہ منزل ہا

کنہ ذات باری ناممکن ہے۔ ؎

اندیشہ را گذر بسر کوے یار نیست | از پا فتاد ہر کہ سر جستجو گرفت

لولاک لما خلقت الافلاک! ؎

در ازل موجود بودی ہمچو انوار آمدی | واز ابد مقصود ہستی تا با ظہار آمدی

(کاش اس وقت ولایت موجود ہوتے اور میں اُن کے ہاتھ چوم لیتا۔ ذات سرور کائنات کو اوصاف ربوبیت سے متصف کر کے صرف "تا با ظہار آمدی" سے عبد اور معبود حادث اور قدیم کا فرق دکھا دیا۔ خیر البشر صاحب قاب قوسین او ادنیٰ اور ذات صمدیت میں بس اتنا ہی فصل ہے۔ اس سے بہتر نعت میری نظر سے نہیں گزری جو حقیقت اور شریعت کی اس قدر ہم دوش ہو۔) ؎

خلوت لاہوت را شاہد تو بودی مرحبا | تا شدی از خود بہتی و بہر اسرار آمدی

روشن از نورِ تو شد چوں وز نورانی و کون　　با جمالِ شمع آسا در شبِ تار آمدی
ما ببازارِ عمل جنسِ گنہ آوردہ ایم　　تو متاعِ کاسدِ ما را خریدار آمدی
یارِ ولایت را بہ اعجازِ تکلم زندہ کن　　تازہ شد جانِ مسیحا تا بگفتار آمدی

ایضاً

خود شاہدِ خلوتکدۂ قدس تو بودی　　ہم خود ز پسِ پردۂ کن جلوہ نمودی
در بزمِ ظہور آمدی و با رخِ پر نور　　ہنگامۂ شوقِ دلِ عشاق فزودی
موجود شد از تو ہمہ اشکال کہ بینند　　در دیدۂ صاحب نظران عینِ وجودی

ایک اور غزل سُن لیجئے اور میں اس لذیذ حکایت کو ختم کردوں۔ ؎

ناظرِ یار بلکہ منظورم　　من نظر باز و رند مشہورم
جلوۂ دیدہ ام بہ حُسنِ بتاں　　گر نہ رفتم بہ کعبہ معذورم
می زنم نعرۂ انا المنصور　　ہاں بدارم بکش کہ منصورم
ملکِ معنی است زیر فرمانم　　رشکِ جمشید و رشکِ فغفورم
حسن و عشق است در دل و جانم　　مظہرِ نار و مظہرِ نورم
صنعتِ گل بود در اہلِ سخن　　رنگ نزدیک و نکہتِ دُورم
اے ولایت حذر کن از رندی　　یار با شیخ گفت من حورم

شاید میرا دعویٰ بے بنیاد نہ سمجھا جائے کہ ولایت نے ہندوستان میں وہی نغمہ سرائی کی جو بلبل شیراز نے ایران میں۔ خود فرماتے ہیں۔ ؎

چو بلبل است ولایت بہند نغمہ سرا
ز کاملانِ سخن روزگار خالی نیست
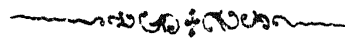
سلطان محمد تغلق عادل شاہ

—گزشتہ سے پیوستہ—

(۲)

مسٹر کے۔ ایم۔ مشیر احمد علوی بی اے۔ علیگ

اس واقعے سے یہ پتا چلتا ہے کہ سلطان محمد تغلق کی عمر اس وقت (یکم شعبان ۷۲۱ھ) م ۱۳۲۱ء میں اٹھائیس برس سے کسی طرح کم نہ تھی۔

ہم اس موقع پر یہ بھی لکھ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جونا کے کیا معنی ہیں۔ ہم کو یہ بتحقیق معلوم ہوا ہے کہ جونا کے معنی آفتاب کے ہیں جس طرح آج کل خورشید، نجم، کوکب، قمر، وغیرہ نام کے تخلص رکھے جاتے ہیں اسی طرح ترکوں میں بھی اس صدی میں اسی قسم کے نام رکھے جاتے تھے۔

بقیہ حاشیہ اندرپرست (گزشتہ سے پیوستہ) اگرچہ اب مجھ کو اس شہر کے آثار دریافت کرنے پر بھی معلوم نہ ہو سکے۔ لیکن ایک دوست کا خیال ہے کہ آثار الصنادید میں جو مقبرہ موجود ہے وہ درست ہے یعنی شاہجہان آباد کے جنوبی جانب دلّی دروازہ تھا۔ باہر جو زمین افتادہ ہے وہ کسی زمانے میں اندرپت کی زمین تھی۔ چنانچہ اب بھی وہ حصہ اندرپت کہلاتا ہے۔ مگر خاص اندرپت کی آبادی اب مفقود ہے۔ اس افتادہ زمین پر اب زراعت ہوتی ہے اور وہاں کے زمیندار پرانے قلعے میں بستے ہیں۔ اور یہی سب سے پہلا شہر ہے جو یہاں آباد ہوا۔ اسکے بعد اور آبادیاں مختلف اوقات میں ہوئیں اس امر میں بہت اختلاف ہے کہ اندرپت (جو بعد میں اندرپرست ہوا) کس طرح دہلی بنا۔ کہتے ہیں کہ راجہ دہلو والی قنوج نے اپنے نام پر اندرپت میں ایک محلہ آباد کیا اور اسکا نام دہلو رکھا۔ چنانچہ اُسی وقت سے اس شہر کا نام بھی دہلی پڑ گیا۔

جواہر الحروف، مرأت آفتاب نما، نزہتہ القلوب، تاریخ فرشتہ، مہاتم، لب التواریخ، مہابھارت، خلاصۃ التواریخ، دیس کہانی، پوتھی اندرپرست آثار الصنادید، تاریخ دہلی۔ ۱۲

سلطان کی تعلیم و تربیت سلطان محمد کی ابتدائی زندگی باوجود تحقیق و تدقیق کے بھی معلوم نہ ہوئی۔ بہرحال یہ مسلم ہے کہ ابتدائی زندگی میں اس کو مذہبی تعلیم سے کافی باخبر بنا دیا گیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ مروجہ علوم درسیہ پر بھی اُسے کافی عبور حاصل تھا۔ تعلیم و تربیت میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ تھی، علوم مروجہ کی تعلیم تو قتلغ ملک خاں سے (جو بعد میں دکن کا حاکم مقرر کیا گیا) حاصل کی۔ اور علم حدیث، علم فقہ، علم کلام کی تعلیم قاضی عضدالدین سے پائی۔ اور یہی وجہ ہے کہ سلطان محمد انتہائی روشن خیال اور متدین بادشاہ قرون وسطیٰ میں گزرا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت شیخ بہاءالدین ذکریا، حضرت فخرالدین عراقی، حضرت شیخ کمال الدین یمینی، مولانا علم الدین نبیرۂ حضرت بہاءالدین ذکریا کے حضور میں زانوے ادب تہ کیا۔ اور انھیں بابرکت بزرگوں کی حاشیہ نشینی کا نتیجہ تھا کہ سلطان محمد کو علم دین میں غلو اور تصوف کی چاشنی حاصل ہوگئی تھی۔ تیراندازی، شہسواری، اور نبرد آزمائی تو گویا اسکی گھٹی میں پڑی تھی۔

شہزادگی محمد تغلق کی شہزادگی کا زمانہ چند ماہ سے زائد نہ تھا کیونکہ ملک میں تمام بدنظمی پھیلی ہوئی تھی اس لئے سلطان غیاث نے سنہ جلوس کے دوسرے ہی عشرے میں محمد تغلق کے سر پر چتر شاہی لگا کر ورنگل اور تلنگانہ کی مہم پر روانہ کیا اور ملک تمر، تیمور، ملک تگین، ملک کافور مہردار، ملک بیرم خاں، نامور امراے دربار کو ولیعہد کے جلو میں دکن بھیجا۔

ولی عہد نے نہایت تزک و احتشام سے سفر کیا اور دیوگڑھ پہونچا۔ یہاں کے عمال اور لشکری اسکے ہمراہ ہوے اور وہ تلنگانہ کی مہم پر روانہ ہوگیا۔ یہاں کا راجہ لدر دیو فرار ہوگیا محمد تغلق ورنگل پہونچا اور قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ چند منتخب افسروں کو تلنگانہ کی غارت گری پر مامور کیا۔

عساکر شاہی کو اس مہم میں مال غنیمت بہت حاصل ہوا۔ اب برسات کا موسم آگیا اور فوج میں وبا پھیل گئی جس کی وجہ سے فوج کا بہت کافی حصہ ضایع ہوگیا۔ اِس موقع پر فتنہ پرداز افراد نے متوحش اور بے بنیاد خبریں من گھڑت شایع کرنا شروع کیں۔ گو دلّی سے روزانہ شاہی ڈاک آتی تھی، جو یہاں ہفتے میں دو بار ضرور مل جایا کرتی تھی لیکن خدا معلوم کس طرح شاہزادے کے مقتدر ندیموں (شیخ زادہ دمشقی اور عبید شاعر) نے یہ خبر مشہور کردی کہ سلطان غیاث کا کسی حادثے سے

انتقال ہوگیا ہے اور بجائے اُسکے کوئی دوسرا شخص تخت سلطنت پر متمکن ہے۔

نیز اُن عمائدین سلطنت نے جو ولیعہد کے ہمرکاب تھے۔ یہ غلط بیانی کی کہ ولیعہد تم سب کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اس خبر کو سُن کر وہ لوگ فوج سے علیحدہ ہوگئے۔ عساکر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ ولی عہد مجبوراً دیوگڑھ چلا گیا۔ دُشمنوں نے قلعے سے نکل کر فوج کا سرحد تک تعاقب کیا۔

اِس عرصے میں دارالخلافہ سے شقہ عالی ملا، جس سے ظل اللہ کی خیریت دریافت ہوئی۔ ولی عہد کی پریشانی رفع ہوئی۔ ملک تمر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ ملک تگین کی کھال کھچوا کر مرہٹوں نے ولی عہد کی خدمت میں بھیج دی اور عبید شاعر، ملک کافور مہردار، ملک بیرم خاں گرفتار ہوکر حاضر دربار کیے گئے۔ ولی عہد نے سب کو پابجولاں سلطان غیاث کی خدمت میں روانہ کردیا، جہاں وہ سب اس سنگین سازش کے جرم میں زندہ درگور کردیے گئے۔

ولی عہد بھی مجبوراً دارالخلافہ میں واپس آیا لیکن چار مہینے کے مختصر قیام کے بعد اُلغ خاں کو دوبارہ سلطان غیاث نے ایک جرار لشکر کے ساتھ تلنگانہ کی مہم پر روانہ کیا۔

ولیعہد دیوگڑھ کی راہ سے ورنگل روانہ ہوا اور شہر بیدر کے حصار کو جو راجہ ورنگل کے قبضے میں تھا فتح کیا۔ اسی کے ساتھ اس راہ میں اور جس قدر قلعے ملے اُن کو بھی زیر کیا اور اپنے خاص معتمدین کو ان کی حکومت تفویض کی۔ خود ورنگل پہونچ کر حصار (گلی) کا محاصرہ کرلیا۔ قلعہ فتح ہوگیا اور راجہ لدّر دیو مع اہل و عیال کے گرفتار رہوا۔ مال غنیمت کے ہمراہ ملک بیدار (قدر خاں) اور خواجہ حاجی نائب عرض ممالک ولیعہد سے فتح نامہ لے کر دارالخلافہ میں پہونچے۔

اس خوشی میں تغلق آباد اور سیری میں قبہ بندی ہوئی اور ہر طرح کے طبل بجے۔ ورنگل کا نام

لہ قلعہ علائی (دہلی علائی) کو شک سیری اور قصر ہزار ستون سلطان علاءالدین خلجی کے تعمیر کردہ ہیں۔ سلطان نے جب سنہ ۷۰۳ھ مطابق سنہ ۱۳۰۳ء میں چتوڑ کے تاریخی قلعے کو فتح کرکے مسمار کیا۔ ایک کثیر فوج کو ورنگل بھیجا تو دہلی خالی تھی۔ مغلوں نے ایک لاکھ بیس ہزار (فوج) سواروں سے دلّی کو آگھیرا، بالآخر بہت لڑائیوں کے بعد سلطان کو فتح ہوئی۔ تو اس خوشی میں بادشاہ نے اس قلعے کو تعمیر کیا۔ اس مقام پر سیری نام ایک گاؤں تھا۔ اس وجہ سے اس کو قلعہ سیری کہتے ہیں۔

بدل کر سلطان پور رکھا گیا۔ اب سارا تلنگانہ فتح ہو چکا تھا۔ ورنگل سے ولیعہد ایک لشکر لے کر جاجنگر[1] گیا۔ وہاں سے چالیس زنجیر فیل وصول کرکے تلنگانہ چلا آیا۔ اور ہاتھیوں کو پیشکش سلطانی کے لئے بھیجا۔ اسی سال مغلوں نے سرحد پر حملہ کیا تھا لیکن مع اپنے دو سرداروں کے اسیر ہو کر دہلی بھیج دیے گئے۔ اسی سال سلطان غیاث نے تغلق آباد کو اپنا پایہ تخت بنلیا اور اعیان سلطنت و مشیر مملکت یہیں آباد ہوے۔

اب سلطان غیاث کا خورشید خسروی اوج کمال پر پہونچ چکا تھا۔ دکن مغلوب تھا۔ گجرات و ملتان کے حکمران سطوت نادری کے حضور میں سرنگوں تھے۔ مغلوں کا واجبی استیصال ہو چکا تھا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ (۲۲) شیر شاہ کے وقت تک یہ کوشک سیری کے نام سے مشہور تھا۔ یہ قلعہ بیدر بنا یا گیا تھا دیواریں پختہ چونے پتھر اور اینٹ سے مضبوط بنائی گئی تھیں۔ اس قلعے میں سات دروازے تھے مغلوں سے دوبارہ جنگ ہوئی اور آٹھ ہزار سر مغلوں۔ کے اس قلعے کی شہر پناہ میں اینٹوں کی طرح چن دیے گئے۔ یہ قلعہ اب بالکل منہدم ہو گیا ہے۔ اس جگہ شاہ آباد نام کا ایک قریہ آباد ہے۔ اسی سال اس قلعے میں بادشاہ نے ایک محل بنوایا جس میں ہزار ستون لگائے اسی سبب سے اس کو قصر ہزار ستون کہنے لگے مغلوں سے پھر جنگ چھڑی تو بہت سے مغل اسیر ہو کر دہلی آئے سلطان نے بجذبۂ انتقام اُن کو اسی قصر کے سامنے ہاتھیوں سے کچلوا کر اُن کے سروں کا ڈھیر قلعے کے سامنے (دھڑ جدا کرکے) لگوا دیا۔ کہتے ہیں کہ صدہا سال تک اُن کا نشان باقی رہا جب راجہ بلال دیو والی کرناٹک پر فتح ہوئی اور ملک نائب و خواجہ حاجی م ۱۳۱۱ء سنہ ۷۱۱ھ میں وہاں کی فتوحات لیکر آئے تو ۳۱۲ ہاتھی ۲۰ ہزار گھوڑے اور ۹۶ من سونا (طلاے خالص) اور موتی و بیش قیمت جواہرات کے صدہا صندوق اسی قصر میں سلطان کے سامنے پیش کئے گئے۔ اور جب سلطان غیاث نے ناصر الدین خسرو شاہ سرواری پر فتح حاصل کی تو اسی قصر میں آکر سلطان قطب الدین اور اُسکے بھائیوں، اولاد خلفا سے رسم تعزیت ادا کی۔

(آثار الصنادید، تاریخ فرشتہ، واقعات دار الحکومت، فیروز شاہی ضیاء الدین برنی تاریخ شیخ عبد الحق۔ مرأت آفتاب نما۔ تاریخ علائی۔ خزائن الفتوح۔ خلاصۃ التواریخ۔ تزک تیموری۔ آئین اکبری مختلف رسائل (مخطوطات خانقاہ درد او رنگ آباد)

[1] جاجنگر اڑیسہ کا دار الحکومت تھا۔ اب ایک قصبہ ہے جسکو جاجپور کہتے ہیں۔

شاہان مالوہ، امیر احمد علوی ...

ہندوستان میں کوئی فوجی قوت سلطان کے مقابل نہ تھی کہ ۷۲۴ھ میں سلطان نے عنانِ خیال شرقی ممالک کی طرف موڑی۔ یہاں پر یہ بھی لکھدینا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اُلغ خاں سے کیا مراد ہے؟ اُلغ ترکی لفظ ہے اور اسکے معنی کسی حد تک بڑے امیر کبیر کے ہوتے ہیں۔ اکثر مشاہیر کے اسمائے گرامی کے ساتھ یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے تغلقوں، خلجیوں اور غلاموں کے عہد میں وزیر اعظم الغ خاں کے خطاب سے مخاطب کیا جاتا تھا لیکن خاندان سادات اور ما بعد عہد میں الغ خاں کے بجائے مسند عالی، خان جہاں، خانِ اعظم، حضرت اعلیٰ، اور خان خاناں وغیرہ وغیرہ الفاظ استعمال کیے جانے لگے۔

بہرحال ہمارا مقصد اصلی لفظ اُلغ کی تصریح تھا تو اُلغ کے معنی کبیر "گریٹ" کے ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

نائب السلطنۃ ہونا سلطان غیاث کو اپنے سعید بیٹے کی عزت افزائی منظور ہوئی تو ورنگل سے الغ خاں کو طلب کیا اور ممالک محروسہ کی نیابت اور جملہ امور سلطنت تفویض کیے۔ خود بنفس نفیس شرقی ممالک کی طرف روانہ ہوگیا۔ غیاث نے اپنی زندگی کے تمام مدارج و مراحل اسی شرقی ملک میں گزار دیے۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس عرصے میں محمد تغلق نے بہ حیثیت نائب السلطنۃ کیا کیا۔ اس سوال کے جواب میں تاریخی صفحات یقیناً خاموش ہیں۔

بہرحال یہ مسلم ہے کہ محمد تغلق کے حسنِ انتظام کی بدولت کسی جگہ ملک میں کوئی جدید بغاوت رونما نہیں ہوئی۔ سلطان فتح و نصرت کے پرچم اڑاتا ہوا دار الخلافۃ واپس آرہا تھا۔ جب نائب السلطنۃ کو اقبال مند سلطان کے آنے کی اطلاع ملی تو فوراً جشن کا انتظام اعلیٰ پیمانے پر کیا اور ایک گاؤں میں ایک بنگلہ استقبال کے لئے تیار کیا۔ لیکن جو مقدر تھا وہ ہو کر رہا۔

باعظمت شہنشاہ ۲۴ ربیع الاول ۷۲۵ھ م ۹ رفروری ۱۳۲۵ء روز یکشنبہ کو چار برس اور چند مہینوں کی حکومت کے بعد دنیا سے رخصت ہوگیا۔

اس واقعے پر مختلف مورخین (ما سبق و ما بعد) نے جو عجیب و غریب حاشیہ آرائیاں کی ہیں اور رائی کا پہاڑ بنا کر عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے ایک جدید سوانگ کھڑا کیا ہے اُسکے متعلق ہم بہت کچھ مقدمے میں تحریر کر چکے ہیں اور انشاء اللہ تفصیلی حاشیے میں بھی اس مسئلے پر کافی روشنی ڈالیں گے۔ (باقی - باقی)

مرثیہ میں شجاعت

(جناب اعجاز آلہ آبادی)

مرثیہ کی بدقسمتی کہیے یا زمانے کی کوتاہ بینی سمجھیے کہ کچھ لوگوں کو یہ بدگمانی ہے کہ مرثیہ نے صبر و رضا کی تلقین کر کے تمام قوم میں پست ہمتی کے ایک زبردست عنصر کا اضافہ کر دیا۔ ان کے خیال میں مرثیہ کا نصب العین محض گریہ و زاری تک محدود ہے جو میدانِ عمل میں لوگوں کو بزدل بناتا ہے۔ بیشک وہ ظلم و جور کے بازار میں انسان کو اس معنی میں تبردل بناتا ہے کہ اسکے ہاتھ کو دلازاری سے روک دیتا ہے اور خون ناحق سے دامن تر کرنے سے ڈراتا ہے لیکن یہ غلط ہے کہ وہ کار خیر میں جری ہونے سے مانع ہوتا ہے یا مظلوموں کی حمایت میں جان دینے سے باز رکھتا ہے۔ اگر مرثیہ کو غور سے پڑھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ انسانی جذبات کو جس قدر مرثیہ اُبھار کر مردانگی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اُردو ادب میں کوئی دوسری ایسی چیز نہیں ہے جو اُسکے نصف بھی اس اہم فرض کو ادا کرتی ہے۔ اب ایک سوال یہ جاتا ہے کہ آخر اس گریہ و زاری کے کیا معنی ہیں۔ جب مرثیہ میں غالب عنصر اسی کا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ وہ اسکے خلاف مردانگی کی طرف دلوں کو اُبھارے۔ یہ سچ ہے کہ اس میں یہ عنصر زیادہ ہے لیکن اس میں بھی ایک قابل غور نکتہ یہ ہے کہ رونا رُلانا محض اسی لئے ہے کہ مردانگی اور شجاعت کا خون کیا گیا۔ بہادری کی داد نہ ملی طرح طرح سے بزدلی اور نامردی کی اشاعت کی گئی۔ اسکا رونا نہیں کہ میدان کربلا میں جانبازی کیوں دکھائی گئی اور شیرانہ حملے کیوں کئے گئے۔

آج ہم اس مضمون میں مختلف عنوان سے مرثیے کے ان جذبات کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرینگے جو انسان کی طبیعت کو مردانگی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مرثیہ میں شجاعت کے لئے سب سے زبردست موقع رجز کا ہوتا ہے جہاں جوش مردانگی کی چلتی پھرتی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی

ہے لیکن انکے علاوہ بھی بہت سے مقامات مثلاً ہنگام وغا، مکالمہ، وغیرہ ملتے ہیں جن سے وہ جذبات پیدا ہوتے ہیں جو مردانگی کی جان ہیں، بیجا نہ ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ بہت کم ایسے مقام مرثیے میں ہیں جن سے بہادری کی بو نہ آتی ہو۔ بیان میں، تمہیدمیں، سراپا میں یہاں تک کہ عبرت اور نصیحت میں بھی نہاں ہیں۔ بلکہ صاف صاف شجاعت اور بہادری کے جذبات نظر آتے ہیں۔ یہ تو بہت دشوار ہے کہ ہر استاد کے کلام کو اس مضمون میں ثبوت کے لئے پیش کیا جائے۔ لہذا فی الحال ہم زیادہ تر میر انیس کے کلام کے مختلف پہلو اس ضمن میں دکھاتے ہیں جن سے اُمید کافی ہے کہ آپ کو اطمینان کلی حاصل ہو جائے۔

رجز | سب سے پہلے ہم دو چار ایسے مواقع پیش کرتے ہیں جہاں رجز خوانی سے جذبات کو برانگیختہ کیا گیا ہے۔ حضرت عباسؓ امام حسین علیہ السلام کی مختصر سی فوج کے سپہ سالار ہیں۔ قریب قریب ساری فوج کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ بڑی مشکل سے حضرت امام حسینؑ نے حضرت عباس کو میدان جنگ کے لئے رخصت دی ہے۔ جب آپ تشریف لائے ہیں تو دشمنوں سے جو گفتگو کی ہے وہ ملاحظہ کے قابل ہے۔ ؎

نعرہ یہ تھا کہ ہم دُرِ دریائے نور ہیں		دُنیا کے جتنے عیب ہیں سب ہم سے دُور ہیں
خیبر کشا کے قلب و جگر کے سرور ہیں		جرّار ہیں، سخی ہیں، ولی ہیں، غیور ہیں
اپنا چلن کھلا ہوا سب عاقلوں پہ ہے
اب تک ہماری ضرب کا سکّہ دلوں پہ ہے

جب معرکہ میں جم گئے ہیں پاؤں گاڑ کے		دم میں قدم اُکھاڑ دیئے ہیں پہاڑ کے
روکی ہے تیغ کفر کی بستی اُجاڑ کے		پٹکا ہے گھر سے حق کے بتوں کو اُکھاڑ کے
بڑھ کر درود فوج ملک مدح خواں ہوئی
جب ہم گئے تو کعبہ کے اندر اذاں ہوئی

جنگ آزما ہیں صف شکن و قلعہ گیر ہیں		صولت میں دبدبہ میں عدیم النظیر ہیں
دُنیا کے بادشاہ ہیں گردوں سریر ہیں		اس اوج پر حسین کے در کے فقیر ہیں
رتبہ پہ فخر ہے نہ شجاعت پہ ناز ہے
گر ہے تو بس غلامیِ حضرت پہ ناز ہے

کیا کیا لڑے ہیں خیبر و بدر و تبوک میں　　یہ ہاتھ پیاس میں نہ رکے ہیں نہ بھوک میں
شہرہ ہے اپنی جود و سخا کا ملوک میں　　حاتم سے بھی سخی ہیں سوا ہم سلوک میں
بگڑے ہیں جب تو خون کے دریا بہائے ہیں
سر دے دیا ہے بات پہ جس وقت آئے ہیں

تب شمر نے کہا کہ فصاحت سے کیا حصول　　بیعت اٹھیں تو صلح ہمیں بھی نہیں قبول
غازی پکارا او نجس و مرتد و جہول　　لیجو نہ منہ سے نام جگر گوشۂ رسول
سمجھا ہے کیا امام عراق و حجاز کو
گدی سے کھینچ لونگا زبان دراز کو

تو کیا ہے، اور کیا ہے ترا وہ امیر شام　　کرتے ہیں بادشاہ کہیں بیعت غلام
تو بھی نمک حرام ہے وہ بھی نمک حرام　　او بے ادب یزید کجا اور کجا امام
دوزخ سے دور رہتے ہیں ساکن بہشت کے
کعبہ کبھی جھکا نہیں آگے کنشت کے

ایک ایک بند کے ہر ہر مصرع سے بلکہ ہر ہر فقرے سے طبیعت میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ انتہا ہے بد مذاقی سے بھی اگر کوئی کام لے تو بھی مجبور ہو کر اقرار کرنا پڑیگا کہ اس کلام میں شجاعت کا دریا موج زن ہے۔

دو ایک مقامات اسی قسم کے اور ملاحظہ ہوں۔

عون و محمد حضرت امام حسین ع کے بھانجے ہیں۔ دونوں معرکہ آرائی کے لئے ایک جم غفیر کے سامنے جاتے ہیں۔ لوگوں کو ان کے حسن و جمال، شوکت و صولت پر حیرت ہوتی ہے عمر سعد پوچھتا ہے کہ آپ لوگ کس کے نور چشم ہیں۔ انکا جواب ملاحظہ ہو۔ ہر جملہ انسان کی طبیعت میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے

ناگاہ یہ بڑھ کر پسر سعد پکارا　　اے شیر دلو نام و نسب کیا ہے تمھارا
تلواریں پکڑ کر یہ پکارے وہ دل آرا　　خالق نے ہمارے لئے دنیا کو سنوارا
خورشید زمیں تاج سر عرش بریں ہیں
پہلا یہ شرف ہے کہ غلام شہ دیں ہیں

دادا ہی شہنشاہ دوعالم کا مددگار سردار جہاں فخر عرب جعفر طیار
وہ شقۂ طراز علم احمد مختار آلودہ رہی خون میں جس شیر کی تلوار
ہاتھوں کے عوض حق سے سر دست لیے ہیں
اللہ نے پران کو زمرد کے دیے ہیں

نانا اسد اللہ مددگار دوعالم دیندار منودار جہاندار دوعالم
سلطانِ قضا منتظم کار دوعالم سرتاج فلک جیفۂ دستار دوعالم
سب امر اہم عقل کی میزان میں تُلتے تھے
عقدے وہ ہٹے حل جو کسی سے نہ کُھلتے تھے

بازوے نبی دست خدا نفس پیمبر طیب وزکی طاہر و پاکیزہ و اطہر
لشکر شکن و بت شکن و فاتح خیبر سرتاج عجم میر عرب حیدر صفدر
اصنام سے کیا خانہ حق پاک کیا ہے
گہوارے میں اژدر کا دہن چاک کیا ہے

وہ رعب کہ شیروں کو بھی عبرت ہوئی جس سے وہ حکم کہ خورشید کو رجعت ہوئی جس سے
وہ زور کہ ایمان کو قوت ہوئی جس سے وہ ضرب بنا کفر کی غارت ہوئی جس سے
دیکھے اسے آگاہ جو حیدر سے نہیں ہے
بہتر کوئی شاہد درِ خیبر سے نہیں ہے

کانپا کیا روم و عرب اک تیغ دو سر سے گزری سر مرحب سے تو عنتر کی کمر سے
دیندار وں کو امن ملی نے دیا فتنہ و شر سے ضرب اسکی نہ رو کی گئی جبریل کے پر سے
کیا کیا نہ بدل جائیگا کیا کیا نہ مٹے گا
پر حشر تک اس ضرب کا سکہ نہ مٹے گا

اللہ رے اوج و شرف و عزت و مقدار — دشمن کو بھی تھا فضل سے جس کے نہیں انکار
خالق کا ولی احمدِ مرسل کا مددگار — خاک کفِ پا سرمۂ چشمِ اُولُوا الابصار
پاتے ہیں اشارے میں شفا کور و کر اس سے
بینا ہے وہی جس کو ہے چشمِ نظر اس سے

ہم دونوں تو اسے ہیں اسی فیض رساں کے — فرزند ہیں ہمشیر شہ کون و مکاں کے
دکھلائینگے جوہر تمہیں تیغ دو زباں کے — بڑھ بڑھ کے اُلٹ دینگے پرے فوج گراں کے
تم یہ نہ سمجھنا کہ ید اللہ نہیں ہیں
ہم شیر تو ہیں گر اسد اللہ نہیں ہیں

ایک موقع اور ملاحظہ ہو۔ وہ وقت ہے کہ امام حسینؑ کے اعزا و اصحاب سب قتل ہو چکے ہیں آپ یکہ و تنہا میدان جنگ میں ایک زبردست فوج سے مقابلے کے لئے تشریف لائے ہیں لیکن ایسے روح فرسا مصائب پر بھی دشمن کے سامنے جو الفاظ آپ کی زبان سے نکلتے ہیں ان میں شجاعت اور بہادری کی بے نظیر شان نظر آتی ہے۔ غم و الم کا ذکر جانے دیجیے۔ اردو ادب میں کیا کسی معرکہ آرائی میں بھی کسی زبردست سے زبردست سپاہی کی ایسی کوئی تقریر پیش کی جا سکتی ہے جس سے اتنی یا اسکے عشرِ عشیر بھی ہمت افزائی اور مردانگی پیدا ہو سکے۔؟

پہلے تو حضرت امام حسینؑ نے بہ حیثیت امام کے لوگوں کو کچھ نصیحت کی ہے لیکن جنکے دل پتھر سے زیادہ سخت اور بے حس ہوں ان پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ پسر سعد نے ایک نہ سنی۔

تب امام نے فرمایا کہ ؎

میں دیر سے آمادہ ہوں تلوار کو تولے — کہدے کہ علم فوج صفیں باندھ کے کھولے
ماروں انھیں چھوٹیں کہیں کچھ دل کے پھپھولے — سر تن سے اُڑا دوں کوئی اب مُنہ سے نہ بولے
آرام سفر کر گیا راحت نہیں باقی
بڑھتا ہوں کہ بس اب کوئی حجت نہیں باقی

یہ فوج ہے کیا آگ کا دریا ہو تو جھیلیں
کیا ڈر انھیں بچپن میں جو تلواروں سے کھیلیں
الٹیں صفت کاہ اگر کوہ کو ریلیں
کوفہ تو ہے کیا شام کو اور روم کو لے لیں
چاہیں تو زمیں کے ابھی ساتوں طبق اٹھیں
یوں الٹیں کہ جس طرح ہوا سے ورق اٹھیں

کہتے ہیں جسے اہل زمیں گنبد گرداں
نہ ورقے ہیں اک جزو کتاب شہ مرداں
ہم آج ہیں عالم میں قضا فہم و قدرداں
حق بین و حق آگاہ و سخن سنج و ہنرداں
کس امر میں تقلید محمدؐ نہیں کرتے
فاقوں میں سوال فقرا رد نہیں کرتے

اللہ نے کونین کی شاہی ہمیں دی ہے
امداد رسولوں کی مرے باپ نے کی ہے
مجھ میں بھی وہی دل وہی شوکت وہی جی ہے
سر برسے ہیں جب تیغ علی میان سے لی ہے
سر تن سے کٹے جب تو مہم جنگ کی سر ہے
مر جائے یہ عزت یہ بہادر کی ظفر ہے

ہم دولت دنیا کبھی گھر میں نہیں رکھتے
توقیر زر و مال نظر میں نہیں رکھتے
رکھتے ہیں قدم خیر بس شر میں نہیں رکھتے
کچھ اور بجز تیغ کمر میں نہیں رکھتے
نذر رہ معبود تن و سر ہے ہمارا
زیور ہے یہی اور یہی زر ہے ہمارا

شہر اسکی تب و تاب سے ویرانے ہوئے ہیں
جب چمکی ہے یہ دیو بھی دیوانے ہوئے ہیں
منہ وہ ہے کہ تلواروں میں دندانے ہوئے ہیں
لوہا وہ کہ جبریل جسے مانے ہوئے ہیں
کر دیتی ہے شب دشمن ایماں کے دلوں کو
چڑھ آتی ہے تپ اسکے شراروں سے جنوں کو

[illegible] کے ہوے ہیں — جانبر جو ہوے بھاگ کے یا ہٹ کے ہوے ہیں

[illegible] لٹکے ہوے ہیں — اب تک پر جبریل امیں لٹکے ہوے ہیں

باعث یہ نہ ہوتا تو پھر آرام نہ لیتے

تھا خاتمہ گر ہاتھ علیؑ تھام نہ لیتے

مشہور جہاں عمرو علی کی ہے لڑائی — زور اس کا کہ یہ دیو نے قوت نہیں پائی

خندق کے ادھر آتے ہی تلوار جو کھائی — گویا تھی مہینوں سے تن و سر میں جدائی

لاشہ کا ادھر ڈھیر سرِ نحس ادھر تھا

خندق کو جو دیکھا تو لہو تا بہ کمر تھا

کب میان سے شمشیر دوسری نہیں ہم نے — لڑنے میں کبھی منہ پہ سپر لی نہیں ہم نے

جب تک کہ زمین خون سے بھر لی نہیں ہم نے — کچھ اپنے سر و تن کی خبر لی نہیں ہم نے

شمشیر و سپر بعد ظفر کھولتے ہیں ہم

جب صاف ہو میداں تو کمر کھولتے ہیں ہم

پیغام قضا تیغ ید اللہ کو جانو — ہمتائے علی فاطمہ کے ماہ کو مانو

بینائی ہو تو کوہِ گراں کاہ کو جانو — عاجز نہ کبھی بندۂ اللہ کو جانو

انگشت سے حلقے کو مروڑا ہے علی نے

خیبر کا در اک ہاتھ سے توڑا ہے علی نے

(باقی آئندہ)

ایک عالمانہ مضمون کی حقیقت

نوٹ ۔ یہ مضمون شروع نومبر میں مدیر "نگار" کی خدمت میں بغرض اشاعت بھیجا گیا تھا اُنھوں نے وعدہ کیا تھا کہ مضمون یقیناً شایع ہوگا۔ یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ دسمبر کے پرچے میں تو اسکا شایع ہونا مشکل ہے لیکن میں کوشش کرونگا۔ دسمبر، جنوری، فروری، تین ماہ کے پرچے شایع ہوے لیکن مضمون نہ چھپا۔ تقاضا کرنے پر اُنھوں نے جواب دیا کہ جب تک کیفی صاحب کا جاری مضمون ختم نہ ہوجائے آپ کے مضمون کی اشاعت بے محل ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ کب تک کیفی صاحب کے جاری مضمون کے ختم ہوجانے کی اُمید رکھوں۔ جواب ملا کہ غالباً جون تک ختم ہوجائے۔ لیکن کیفی صاحب کا مضمون مسلسل نہیں شایع ہوتا۔ بلکہ درمیان میں ملتوی بھی ہوجاتا ہے لہذا میں یہ مضمون "ادب" کے پرچے میں بغرض اشاعت بھیجتا ہوں۔ میں نے مضمون سابق کی کوئی نقل نہیں رکھی تھی بلکہ کچھ مختصر سے نوٹ تھے اُنھیں سے یہ مضمون دوبارہ لکھا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اسکے اور پہلے مضمون کے الفاظ میں کچھ کمی و بیشی ہوگئی ہو"

"نگار" ماہ ستمبر سنہ ۲۹ء میں اڈیٹر صاحب نے اعلان کیا تھا کہ "آیندہ ماہ میں ایک عالمانہ مضمون مولانا کیفی چریاکوٹی کا مومن کی شاعری پر شائع ہوگا" ہم اس مضمون کے دیکھنے کے بہت مشتاق تھے ۔ چنانچہ اکتوبر سے دسمبر تک تین قسطوں میں وہ مضمون شایع ہوا اور ابھی باقی بھی ہے ۔ ہم اس وقت صرف اُس کی پہلی قسط پر نظر ڈالتے ہیں۔

فاضل مضمون نگار نے مضمون نویسی اس قدر آسان کردی کہ اب سکول کے چھوٹے درجے کے لڑکے بھی عالمانہ مضمون بہت کم وقت میں آسانی سے تیار کرسکتے ہیں ۔ یعنی اس مضمون کو علامہ صاحب

نے اس طور سے ترتیب دیا ہے کہ کتاب "بحرالفصاحت" مؤلفہ حکیم نجم الغنی صاحب نجمی رامپوری کو اٹھا لیا ہے اور علوم معانی و بیان و بدیع کے جن جن مسائل کی تحت میں مومن کے شعر شامل ہیں آ گئے ہیں۔ ان کو انھیں مسائل کے تحت میں مسلسل نقل کرتے چلے گئے ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ حکیم صاحب نے ہر مسئلے کو سمجھ کے لکھا ہے اور علامہ صاحب انھیں صحیح نقل نہیں کر سکے اور اختصار کرنے میں بعض مسئلے بالکل مہمل ہو گئے ہیں اور بعض چیستاں بن کر رہ گئے ہیں۔

اس مضمون میں مختلف مسائل کے تحت میں علامہ صاحب کا کچھ حصہ منتخب کردہ ہوتا تو کہنے کے لئے ہو جاتا کہ بالکل نقل نہیں ہے کچھ حصہ ان کا بھی ہے لیکن افسوس ہے کہ ہم نے دو گھنٹے تک محنت کر کے کتاب بحرالفصاحت سے مقابلہ کیا مگر ایک شعر بھی ایسا نہ نکلا جو علامہ صاحب کا منتخب کردہ ہوتا۔ ہاں ایسے دو چار شعر ہیں جو بحرالفصاحت میں ہیں اور علامہ صاحب نے ان کو نقل نہیں کیا حالانکہ وہ بہت ضروری اور اہم مسائل کے متعلق ہیں اور بعض تو ایسے ہیں جن کے نہ لکھنے سے علامہ صاحب کا مضمون اکثر جگہ غلط ہو گیا

لطف یہ ہے کہ شایع شدہ مضمون میں بحرالفصاحت کا نام تک نہیں آیا ہے۔ کیفی صاحب نے اپنے مضمون میں اس کتاب کا نام بالکل ہی حذف کر دیا ہے۔ کیفی صاحب نے اگر اس کتاب سے مدد لی تھی تو ان کا اس صورت میں فرض تھا کہ وہ اس امر کا تذکرہ فرما دیتے۔ جس شخص کی تمام محنت ہو اسکے نام کا ذکر تک نہ کرنا ادبی خوش ظرفی کے منافی ہے۔ مدد لینے کا مفہوم اتنا وسیع فرض نہیں کیا جا سکتا کہ اصل کام کرنے والے کی تمام محنت پر پردہ ڈال دیا جائے اور اس کی تحقیقات اپنے نام سے پیش کر دی جائیں۔

بہرحال صاحبان نظر کی نگاہ میں یہ طرز عمل کسی نہج سے پسندیدہ نہیں قرار پا سکتا۔ زیر بحث عالمانہ مضمون کی تمام غلطیوں کے ظاہر کرنے کی نہ ہمیں فرصت ہے

اور نہ صفحاتِ "ادب" میں گنجائش۔ لہذا چند موٹی موٹی غلطیوں کے درج کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اُن سے اندازہ ہو جائیگا کہ مضمون کس پایہ کا ہے۔

---

(۱) علامہ صاحب نے استعارہ غیر متعارف کی مثال میں یہ شعر لکھا ہے ؎

دشمنِ مومن رہے یہ بُت سدا   مجھ سے میرے نام نے یہ کیا کیا

استعارہ غیر متعارف استعارہ کی کوئی قسم نہیں ہے۔ غلطی نقل کرنے میں علامہ صاحب سے یہ ہوئی کہ صاحب بحر الفصاحت نے استعارہ کے بیان میں فرد کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک متعارف اور ایک غیر متعارف۔ غیر متعارف کی سرخی جلی قلم سے لکھ کر اُسکی تعریف بتائی ہے اور اسی سلسلے میں اس امر کو ثابت کیا ہے کہ استعارہ میں مشبہ کو بالکل مشبہ بہ فرض کر لیتے ہیں۔ اس کی مثال میں شعر مذکور لائے ہیں۔ (یعنی اس شعر میں حسینانِ جہاں کو بالکل بُت فرض کر لیا گیا ہے حسینانِ جہاں مشبہ یعنی مستعار لہ ہے اور بت مشبہ بہ یعنی مستعار منہ ہے) علامہ صاحب نے غیر متعارف کی سرخی دیکھی پورا صفحہ نہیں پڑھا۔ اس پر بھی نظر نہیں پڑی کہ متعارف اور غیر متعارف کس چیز کی قسمیں ہیں۔ چونکہ استعارے کے بیان میں یہ بحث تھی لہذا سمجھے کہ غیر متعارف بھی استعارے کی کوئی قسم ہے اور اسی کے تحت میں یہ شعر ہے لہذا اُسے استعارہ غیر متعارف کی مثال میں لکھ دیا۔

(۲) مستعار لہ اور مستعار منہ حسی کی مثال میں علامہ صاحب نے یہ شعر لکھ دیا ہے۔

اے غارتِ جان و جانِ مومن   اے آفتِ خانمانِ مومن

ظاہر ہے کہ اس شعر میں معشوق مستعار لہ ہے جو حسی ہے لیکن غارت جان و جان و آفت یہ جتنے مستعار منہ ہیں وہ سب عقلی ہیں۔ اور صاحب بحر الفصاحت نے مستعار لہ حسی و مستعار منہ عقلی کی مثال میں اس شعر کو لکھا بھی ہے لیکن نقل کرنے میں علامہ صاحب سے یہ غلطی ہوئی کہ بحر الفصاحت میں پہلے مستعار لہ و مستعار منہ دونوں حسی کی مثالیں ہیں۔ اُسکے بعد مستعار لہ حسی و مستعار منہ عقلی

کی مثالیں ہیں علامہ صاحب نے دوسرے عنوان پر نظر نہیں ڈالی اور یہ سمجھے کہ یہ سب مثالیں مستعار لہٗ و مستعار منہ حسّی کی ہیں لہٰذا اُسی کی مثال میں شعر لکھ دیا۔ حالانکہ جان و آفت وغیرہ کو ایک بچہ بھی حسّی نہ کہیگا کیونکہ یہ حواس خمسہ ظاہری یعنی باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ سے محسوس ہونے والی چیزیں نہیں ہیں لیکن علامہ صاحب کی یہ انتہائی قابلیت ہے کہ وہ جان کو بھی حسّی سمجھتے ہیں

(۳) صاحب بحر الفصاحت نے وجہ جامع کے بیان میں لکھا ہے کہ بعض وجہ جامع ایسی ہوتی ہے کہ بہت جلد سمجھ میں آجاتی ہے اور جس استعارے میں ایسی وجہ جامع ہوتی ہے اُس کو استعارہ عامیہ یا مبتذلہ کہتے ہیں اُس کی مثال میں مومن کا یہ شعر لکھا ہے۔

جس کے در پر میں کروں لولوے شہوار نثار   دُرِ نایاب تو کیا خاک سے بھی مُنہ نہ بھرے

مطلب مصنف کا یہ ہے کہ شاعر نے اپنے اشعار کا استعارہ لولوے شہوار سے کیا ہے اور وجہ جامع اس میں بیش قیمت ہونا ہے جو بہت جلد سمجھ میں آجاتی ہے۔

علامہ صاحب نے وجہ جامع کی سُرخی دیکھی، پورا صفحہ نہیں پڑھا اور اپنے مضمون میں محض وجہ جامع لکھ کر شعر مذکور تحریر کر دیا جس سے تحریر بالکل مہمل ہو گئی کیونکہ کوئی نہ کوئی وجہ جامع تو ہر اُس شعر میں ہوگی جس میں کسی قسم کا استعارہ ہو علم بیان کا لکھنے والا اس وجہ جامع کو بتاتا ہے۔ خالی وجہ جامع کا لکھ دینا دانشمندی کے خلاف ہے ۔ شاید علامہ صاحب کو یہ نہیں معلوم کہ تشبیہ میں جو وجہ شبہ کہلاتی ہے وہی استعارے میں وجہ جامع کہلاتی ہے۔ اگر یہ جانتے تو جس طرح وجہ شبہ متعدد۔ وجہ شبہ واحد حسّی۔ وجہ شبہ پوشیدہ کی مثالیں نقل کی تھیں۔ یہاں بھی کتاب میں دیکھ کر وجہ جامع قریب الفہم لکھ دیتے۔ یہ بالکل ویسی ہی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص خالی وجہ شبہ لکھ کر اُس کی مثال میں کوئی شعر لکھ دے۔ اور تصریح وجہ شبہ کی نہ کرے۔ مسائل کے اختصار کرنے میں بوجہ نادا قفیت اس طرح کا اہمال اکثر جگہ اس مضمون میں آگیا ہے۔ ہم نے بہ نظر اختصار اس قسم کی غلطی کی صرف یہی ایک مثال لکھی ہے۔

(۴) صنعت جمع و تفریق کی مثال میں علامہ صاحب نے یہ شعر لکھا ہے۔

کیا قیامت ہے مجھی کو سب برا کہنے کو ہیں ۔۔۔ دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ

اس شعر میں صنعت جمع و تفریق نہیں ہے بلکہ صنعت جمع و تقسیم ہے یعنی دوسرے مصرعہ میں سب لوگوں کو برا کہنے والے کے حکم میں جمع کیا ہے اور پہلے مصرعہ میں اس کی تقسیم کی ہے کہ دوست ملامت کرتے ہیں اور غیر گلہ کرتے ہیں۔ اور صاحب بحر الفصاحت نے اس شعر کو صنعت جمع و تقسیم میں لکھا بھی ہے۔ علامہ صاحب سے نقل کرنے میں یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے کتاب میں صنعت جمع و تفریق کا عنوان دیکھا اور وہاں پر نظر نہیں ڈالی جہاں سے صنعت جمع و تقسیم کی مثالیں شروع ہوئی ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھے کہ یہ سب شعر صنعت جمع و تفریق کی مثال میں ہیں اور اسی صنعت میں فوراً شعر مذکور نقل کر دیا۔

(۵) علم معانی میں مسند الیہ کے حالات کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک وہ حالات جو مقتضائے ظاہر حال کے موافق ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ حالات جو مقتضائے ظاہر حال کے خلاف ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کی ایک شکل التفات ہوتی ہے یعنی شخص واحد کو منجملہ طرق ثلاثہ یعنی تکلم و خطاب و غیبت کے یاد کر کے ان تینوں طریقوں میں سے کسی دوسرے طریق پر یاد کرتے ہیں لیکن التفات کسی مسلسل نظم میں ہوتا ہے۔ غزلیں اس قاعدے سے اس لئے خارج ہو جاتی ہیں کہ وہ مسلسل نہیں ہوتیں اور ان میں مخاطب ایک ہی شخص نہیں ہوتا اسی سے کسی بیت میں خطاب ہوتا ہے کسی میں غیبت کسی میں تکلم۔ غرض یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر ایک جدا گانہ مستقل معنی رکھتا ہے۔ اسی لئے اس کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں وہ التفات ہے جو علم معانی کی اصطلاح میں قرار دیا گیا ہے۔ اسی کی مثال میں صاحب بحر الفصاحت نے مومن کی ایک غزل لکھ دی ہے جس سے غرض ان کی یہ ہے کہ یہ بات سمجھ میں آ جائے کہ غزلوں میں جو التفات ہوتا ہے وہ علم معانی کی اصطلاح التفات سے خارج ہے۔ علامہ صاحب نے غزلوں کے التفات کو بھی علم معانی کے اصطلاح التفات میں داخل سمجھا ہے۔ چنانچہ وہی غزل جو صاحب بحر الفصاحت نے اس کی مثال میں لکھی ہے کہ غزلیں التفات سے خارج ہوتی ہیں

آپ نے علم معانی کے مسئلہ التفات کے تحت میں نقل کی ہے۔ حضرت لکھتے ہیں۔

(۵) ایک غزل میں خطاب تکلم غیبت اور تکلم دونوں۔

غیر کو سینہ کہے سے سیمبر دکھلا دیا ۔۔۔ تم نے کیا کچھ کس کو اتنی بات پر دکھلا دیا

زرد منہ دکھلا دیا غم کا اثر دکھلا دیا ۔۔۔ آج ہم نے اس کو اپنا روز زر دکھلا دیا

صبح سے تعریف ہے صبر و سکون غیر کی ۔۔۔ کس نے شب مجھ کو تڑپتے پیش در دکھلا دیا

موت کے صدقے کہ وہ مرنے پر آئے لاش پر ۔۔۔ جو نہ دیکھا تھا تماشہ عمر بھر دکھلا دیا

پہلے شعر میں خطاب، دوسرے تیسرے میں تکلم ہے۔ چوتھے میں تکلم اور غیبت دونوں۔ (یہ عبارت بھی بحر الفصاحت کی نقل کی ہے ورنہ علامہ صاحب خطاب و تکلم و غیبت سے بھی واقف نہیں معلوم ہوتے۔ چنانچہ آئندہ اسکی تصدیق ہوجائیگی)

(۶) علامہ صاحب خطاب سے غیبت کی طرف التفات کی مثال میں لکھتے ہیں۔

مومن اب ختم کر دعا پہ سخن ۔۔۔ تا کجا لا فہائے طولانی

اب تصدیق ہوگئی کہ علامہ صاحب خطاب و غیبت کے معنی نہیں سمجھتے کیونکہ اس شعر میں خطاب ہی ہے غیبت کی طرف التفات نہیں ہوا لیکن غلطی علامہ صاحب سے نقل کرنے میں یہ ہوئی کہ صاحب بحر الفصاحت نے اس مسئلے کے تحت میں دو شعر مومن کے لکھے ہیں۔ اس شعر میں مومن مخاطب ہے۔ دوسرے شعر میں غائب فرض کر لیا گیا ہے۔ علامہ صاحب چونکہ خطاب و غیبت کو نہیں سمجھے لہذا صرف ایک شعر لکھا، دوسرا نہیں لکھا جس سے مثال غلط ہوگئی۔ اس سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے جو اشعار بحر الفصاحت کے نقل کرنے میں چھوڑ دیے ہیں ان کا ترک کتنا بامحل تھا۔

ایک نقاد۔ از الٰہ آباد

بہو کی ماننی

(دیسی کے قلم سے)

لالہ ہنس راج رام نگر کے اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگوں میں سے تھے۔ گاؤں گراؤں، نوکر، چاکر، آدمی، پرجا، سب کچھ بھگوان کا دیا موجود تھا۔ خود چار ہل کی کھیتی کرتے۔ گھر پر دودھ کو گائیں متعدد بھینسیں پال رکھی تھیں۔ سواری کے لئے گھوڑا بھی تھا، اور شادی بیاہ میں جانے کے لئے فینس بھی۔ جوان بیٹا مل راج اتنا نیک کہ باوجود ایف۔ اے۔ تک پڑھنے کے محض اُن کی خوشی کے لئے پڑھنا لکھنا چھوڑ بڑھاپے کا سہارا بنا اور کھیتی اور زمینداری میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔ لالہ جی بھی جھٹ پٹ بہو ڈھونڈھ لائے۔ اور گو ابھی کنیا تیرہ ہی برس کی تھی لیکن پُرانی ریت رسم کی پابندی میں گونا بھی کرالائے۔ کہتے گھر خالی گلدان کی طرح سونا تھا۔ اب جا کر "سوبھ" دیتا ہے۔

ابھی سال بھر بھی نہ ہوا تھا کہ للائن کو پوتا ہونے کے لئے تیرتھ، یاترا کی ترغیب دینے لگے اور خود دیوی دیوتاؤں کو پرشاد چڑھانے لگے۔ تمنا تھی کہ کسی طرح ایک پوتا ہو جائے لیکن شیوجی کسی سوچ میں تھے اُنھوں نے جو کچھ لالہ جی کا دل دبی زبان کہہ رہا تھا نہ سُنا۔ لالہ جی کی یہ حالت کہ خواہش و تمنا بڑھتی ہی جاتی۔ بیوی سے شکایت کرنے لگتے "بھگوان کے نہ تو کان ہیں اور نہ آنکھ۔ وہ نہ سنتا ہے اور نہ اسے دکھائی دیتا ہے!"

وہ اس مادرانہ لہجہ میں جو چالیس سے اوپر والی بیویوں کا دستور ہے ڈانٹتیں "تم بھی اب سٹھیا گئے ہو۔ ابھی ملوا اور بہو دونوں بالک ہیں۔ دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے۔ تم چاہتے ہو

ہتھیلی پر سرسوں جمے۔ ابھی کے دن گونے کو ہوے۔ اور اس طرح کی اول فول تم پر یا تما کے بارے میں بکنے لگے!

لالہ جی ایسے وقت غصہ ہو کر نیچے کی منہ سے لگی ہوئی نے کھڑی کر دیتے اور ذرا بلند آواز میں بولتے "تو آج سے آٹھ برس بعد کوئی بالک ہوا بھی تو ہمارے کس کام کا؟ یگ دیوتا ہیں کہ تاک لگائے بیٹھے ہیں۔ جب ہم نہ ہوے تو پھر کیا مزہ؟ وہ کسے "بابو!" پکاریگا؟ ملوا اور بہو تو اسے ہماری طرح پال چکے!" پھر باہر اٹھ کر چلے جاتے اور کسی نہ کسی آدمی پر کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھ کر اس طرح برس پڑتے۔ گویا دل کی ہانڈی میں بخارات بھرے پڑے تھے۔ کسی نہ کسی بھاپ نکلنے کے لئے اٹھنا ہی چاہیے تھا۔ یا یہ کہ سارے نوکر چاکر سب کے سب سازش کر کے ان کے پوتے کو ان کی گود تک پہونچنے سے روکے ہوے تھے۔

پھر چھڑی اٹھا گاؤں میں گھومنے نکل جاتے۔ وہاں بازار سے بہو کے لئے تھوڑا سا سیندور کچھ سرمہ، ایک کپی میں سر میں لگانے کا تیل، کاٹھ کی دو تین کنگھیاں اور ٹکلیوں سے بھری ایک ڈبیا خرید لاتے اور یہ سب نذر اس طرح خاموشی سے گذاری جاتی گویا خوشامد ہو رہی ہے کہ آس ٹوٹے اور پوتا کھلانے کو کسی طرح مل ہی جائے! وہ لجا کر پرنام کرنے کو پاؤں کی طرف جھکتی اور تحفوں کے ساتھ ان کا اشیرباد لیتی۔ گھونگھٹ نکالے، بدن چرائے ساری چیزیں اپنی بانس والی پٹاری میں لے جا کر رکھ دیتی۔

ملراج جب کھیت کھلیان سے واپس آتا اور شب کی تنہائیوں میں میاں بیوی گھر بھر کے سو جانے کے بعد اکٹھا ہوتے تو گھنٹوں "بابوجی" کے تحائف دکھائے جاتے اور دونوں اُن کے دل میں چھپے ہوے ارمان پر خوب ہنستے اور ایک دوسرے پر فقرے کستے۔ لیکن اپنے دل میں بھی وہی شوق لئے ہوے سو رہتے!

ٹھیک اسی زمانے میں جب کہ سرسوں کے کھیت پھولے ہوے تھے۔ ارہر لگی ہوئی تھی

اور اوکھ پیری جارہی تھی" اوما دیوی نے شیو جی کو بوڑھے لالہ کی حالت کی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے اُن کے نہال اُمید پر دنیا بنانے والی اپنی ایک پھونک ماری۔ لالہ جی کی تمنا بر آئی گھر میں بہار آئی۔ بہو کے پیٹ میں بچہ رہا اور تمام وہ مدارج جلدی جلدی طے ہونے لگے جو دیکھنے والوں کے لئے خواہ کتنے ہی خوش کن ہوں برداشت کرنے والی کے لئے یقینی تباہ کن ہوتے ہیں۔

لالہ جی تو زچہ خانہ کے اہتمامات میں خوش خوش مشغول ہو گئے لیکن بہو کے دم پر آ بنی چودہ برس کی لڑکی، نہ پیٹ بھر کھایا، نہ جی بھر سویا جاتا۔ اُٹھتی ہے تو چکر آتا ہے بیٹھتی ہے تو درد ہوتا ہے لیٹتی ہے تو کروٹ نہیں لے سکتی۔ نہ چہرے پر وہ آب و تاب ہی اور نہ آنکھوں میں وہ دل کشی خیر کسی طرح کراہ کراہ کے وہ زمانہ بھی گزر ہی گیا اور لالہ جی کی تمنا پوری ہو گئی۔ لیکن ہندوستانی آب ہوا اور صدیوں کی نسلی کمزوریاں۔ رنگ لائیں اور کمسن ماں زندگی بھر کے لئے ایک تنہ ڈھانچہ بن کر رہ گئی۔ گاؤں کے ویدجی نے لاکھ لاکھ جتن کئے لیکن ان کے سب "بھسم" بیکار ثابت ہوئے اور بہو ایک نیم مردہ سی چیز رہ ہی گئی۔

لالہ جی غریب کے یہ نہ سمجھ میں آتا کہ وہ اپنے ارمانوں کے بر آنے کی خوشی کریں یا اس بگڑے ہوئے نقشے کا افسوس۔ ان کی حالت بالکل اُس بچے کی تھی جو لالچ کی وجہ سے حصہ ملنے سے پہلے برفی کی ڈلی ہانڈی سے اُچک لے لیکن جلدی میں پوری ہانڈی ہی گرا دے! وہ کبھی اس لعل سے بچے کو دیکھتے جو ان کے گھر کا اُجالا بنا تھا، اور کبھی اس نیم مردہ بہو کو جو بہار کو خزاں بنائے دیتی تھی! مگر پھر بھی بہو لڑکے اور پوتے ہی کے لئے پیاری ہوتی ہے۔ یہ دونوں تو اچھے تھے، خوش تھے، کھیلتے کھاتے تھے۔ بہو کی صورت بگڑی بلا سے! ان کا دُکھ تو بس اُسکی جان ہی پر کیوں نہ بن جائے۔ یہ بھی خوش تھے۔ اور اب جو ہاٹ بازار سے گھومتے گھماتے آتے تو سرمہ اور مسی نہ لاتے بلکہ جھنجھنے لاتے۔ بانسری لاتے، اور کھلونے لاتے۔ اب انھیں سیندور اور کنگھی سے کیا غرض؟ وہ سب چیزیں بھی تو اُسی دن کے لئے تھیں۔

لیکن بہو تو اپنی حالت پر ضرور ہی غور کرتی۔ اپنی چمکتی دمکتی صورت کی جگہ پچکے ہوئے گال دیکھتی۔ بھرے بھرے بازوؤں کے عوض جھکی ہوئی کمر دیکھتی اور آہ کر کے دل تھام لیتی۔ پھر جب دیکھتی وہ

مدن ہی پر جھکا پڑتا - لالہ جی تھے تو، للائن تھیں تو - اور تو اور، خود پتی بھی! - بس اب بہو اُسی وقت یاد آتی جب راج دلارے مدن کو دودھ پلانا ہوتا - جیسے گھر میں گئو اور بھینسیں پلی تھیں ایک یہ بھی تھی جب وقت آیا، مدن کو دیا، اور یہ بھی دُوہ لی گئی -

طبیعت کی کبیدگی نے مزاج میں چڑچڑا پن اور بات بات پر غصہ بھی بڑھا دیا - اُٹھتے بیٹھتے ساس سسر کو طعنے تھے، یا مل راج سے تُو تُو مَیں مَیں - غذا سے لاپروائی کپڑوں سے نفرت - اگر کسی وقت دو چار نوالہ چاول کھا لیا تو دن رات کے لئے کافی ہیں - ایک ساری جو ہفتہ بھر پہلے پہن لی - تو اُترنے ہی نہیں آتی میلی چکٹ ہو گئی جسم سے بو آنے لگی لیکن کون بدلے کس کے لئے؟ صورت آئینے میں دیکھ سکتی تھی - "اُن کی" نظر بدل چکی تھی - ظاہر ظاہر اب بھی مل راج ہنس بول لیتے تھے لیکن کیا وہ بدلی ہوئی نگاہیں نہ پہچانتی تھی - اس نے انھیں نینوں کو کسی وقت خوشی سے چمکتے ہوئے، کسی وقت استعجاب سے پھیلتے ہوئے اور تنہائیوں میں اکثر سُرخ ہوتے دیکھا تھا - اب وہی دیدے تھے کہ اُس کے سامنے ہر وقت صاف صاف دُھلے ہوئے کٹوروں کی طرح رکھے رہتے تھے - ہاں اگر ان میں کبھی کوئی کیفیت پیدا بھی ہوتی تھی تو وہ تاریکی اور سیاہی غصہ اور نفرت کی ہوتی - ان میں اب پچھلے پریم کے لگاوٹ کے انداز کہاں؟

اسی کو سوختی، اسی میں گھلتی، اسی میں اپنے کو کوستی کاٹتی - اور موقع موقع سے ساس کی آنکھ بچا کر جس طرح مدن کو پیار کرتی اُسی طرح مارتی بھی - غصہ اس کا تھا کہ یہ پیدا بھی ہوا تو اسے ادھ موا کر کے - سمجھی تھی جگر پارہ ہو گا لیکن وہ تو سانپ کا بچہ نکلا - ماں ہی کو چوٹ دے گیا! -

---

مدن پانچ برس کا ہو چکا تھا - لالہ جی کی خواہش تھی کوئی کام کیا جائے - اس لئے اتنی کم سنی ہی میں جنیو کی رسم کی سوجھی - دن تاریخ رکھ کر ساری برادری میں بلاوا بھیجا - ایک ایک کر کے لوگ آنے لگے - لالہ سیتارام لالہ جی کے بھائی بھی اپنی بیٹیا منورما سمیت آئے - پندرہ برس کی جوان کنیا اسی سال مڈل کا امتحان پاس کیا تھا - بڑی شوخ چنچل اور سُندر تھی - چندرما کی طرح چمکتا ہوا چہرہ -

ان میں سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، بالکل اس طرح جیسے کنول میں بھونرا۔ چندن کی کلائیاں اور ہاتھ پاؤں۔ نازک پتلی کمر جیسے پھول کے نیچے کی ٹہنی۔ ٹانگیں کیلے کے تنے کی سی سڈول اور خوشنما۔ ان سب پر آفت سیاہ گھنے بڑے بڑے بال کمر سے نیچے تک چوٹی ویسی ہی لٹکتی تھی جیسے صندل کی شاخ میں ناگن! پھر اداؤں میں پھاگن کی سی مدہوشی بھی اور چیت کی جگر سوزی بھی۔ گھبرایا بھی تھی اور ساون کی گھٹائیں بھی۔ غرض عورت کیا تھی ایک کسی ہوئی تلوار تھی۔ جو دلوں کا خون اس صفائی سے چاٹ لیتی کہ آنکھ نہ جھپکے اور کام تمام ہو۔

مل راج اور اسکی بیوی سے ملنے کی تمنا دل میں لئے نہ معلوم کب سے بیٹھی تھی۔ لاہور اور رپارہ بنکی کا فاصلہ تھوڑا نہ تھا، جہاں باپ نوکر تھا وہیں پر پیدا ہوئی۔ وہیں پلی۔ بڑھی۔ پڑھی۔ ماں کے مرنے پر گھر کا کام کاج بھی سنبھالنا پڑا۔ عزیزوں سے، اپنوں سے کیسے ملاقات ہوتی۔ مدن کے جنیو میں بلاوے کا جو خط پہونچا تو مچل مچل کر لالہ سیتارام کو راضی کیا اور چچا، چچی، بھائی، بھاوج سے ملنے آئی۔ راہ بھر یہی سوچتی آئی بھاوج کو یوں تنگ کرونگی، یوں چھیڑوں گی، اس طرح بناؤں گی۔ یہاں جو پہونچی تو صورت دیکھتے ہی دل پھیکا پڑ گیا۔ پانچ برس کی بیمار نہ چہرے پر رونق نہ آنکھوں میں چمک۔ نہ ہونٹوں پہ مسکراہٹ اور نہ زبان پر کوئی خوشی کی بات۔ پھر بھی چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ انھوں نے جھڑک دیا وہ غصہ سے بل کھا کر رہ گئی لیکن دل میں میل آ گیا۔ ادھر مل راج سے جو ملی تو صاف دل۔ سیدھا سادھا ہنس مکھ جوان۔ خواہ مخواہ ہمدردی شروع ہوئی اور دو ہی ایک دن میں بھاوج سے چشمک بھی۔ اور خفیہ خفیہ یہ کوشش، کہ بھاوج سے زیادہ میری باتوں میں انھیں مزہ آئے۔ میرے ہی پاس زیادہ اٹھیں بیٹھیں۔ بھاوج جلیں اور خوب جلیں۔ میری جوتی سے۔ ڈائن سی صورت، اس پر یہ دماغ کہ سیدھے منھ بات نہیں! تب تو سہی کہ میں بھیا کا دل ان سے پھیر دوں!

لیکن اس دل کے پھیرنے میں کچھ زیادہ کاوش کی ضرورت نہ تھی۔ وہ پہلے ہی سے پھرا پڑا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ دونوں کو فطرت کے اس اصول کا خیال نہ رہا کہ جوان عورت مرد کا ایک دوسرے کے پاس بیٹھنا درانحالیکہ ایک ہمدردی کا متلاشی ہو اور دوسرا مرہم رکھنے کے لئے تیار۔ بالکل ویسا ہی ہے

جیسے آگ کے قریب ہی سوکھی لکڑی کا ڈھیر کرنا منورما اور مل راج دونوں کے ہاں آہستہ آہستہ آگ
سلگنے لگی۔ اس طرح نہیں کہ محسوس ہو بلکہ اس طرح کی آہستگی سے کہ سوائے بہو کی حاسد آنکھوں کے خود ان کے
دل بھی نہ پہچان سکے! اور سچ تو یہ ہے کہ منورما نے کوئی صورت اپنی قدر بڑھانے اور مل راج کے
دل میں جگہ کرنے کی اٹھا بھی نہ رکھی۔ اس نے پندرہ دن کے اندر مل راج کے لئے کئی تکیوں کے غلاف
اچھے سے اچھے ڈیزائن کے بنا ڈالے۔ کئی بار اپنے کنول سے ہاتھوں سے اچھے اچھے بھوجن پکا کر کھلائے۔
طرح طرح کے حلوے، چٹنی، مربے بنا ڈالے۔ اور لالہ جی اور للائن کی کچھ اس طرح خدمت کی کہ ان کی
زبان پر بھی منورما کا لفظ اسی طرح پیار سے آنے لگا جیسے مدن کا آتا تھا۔ جب دیکھیے میاں بیوی بیٹھے ہوئے
اس کی تعریفیں کر رہے ہیں اور اس گھر میں رہنے والی دوسری جوان عورت سے اس کا مقابلہ کر رہے
ہیں۔ جب اس طرح کے سوکھے درختوں میں محبت کی نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگیں تو مل راج کے تو ابھی بہار
کے دن تھے۔ اس کے دل میں ایک سے نفرت اور دوسری سے محبت کیوں نہ بڑھے! بڑھی اور خوب بڑھی۔
اس طرح بڑھی کہ مل راج باوجود اپنی نیکی، سیدھے پن اور دیہاتی پن کے اس آگ کو محسوس کرنے لگا۔
لیکن قبل اس کے کہ وہ کسی قسم کا کوئی فیصلہ کر سکے لالہ سیتا رام نے واپس جانے کی تیاری شروع کر دی۔
مل راج نے دبی زبان ماں سے انھیں روکنے کے لئے کہا۔ للائن نے جب دیور سے یہ پیغام کہا تو انھوں
نے نوکری کا عذر پیش کیا۔ بڑی رد و کد رہی۔ بالآخر اس پر فیصلہ ہوا کہ وہ تو چلے جائیں مگر منورما ایک
مہینہ اور یہیں رہے۔ پھر سیتا رام آکر لے جائیں گے۔ سب سے دوبارہ ملاقات بھی ہو جائیگی اور چہیتی بھتیجی
تھوڑے دنوں اور کلیجے سے لگی بیٹھی رہیگی۔

ان بوڑھوں میں سے بھلا کون جانتا تھا کہ یہ اپنے گھر میں آگ لگانے کے سامان ہیں اور بھڑکتے
ہوئے شعلوں پر تیل چھڑکنا ہے؟ مدن خوش تھا۔ مل راج خوش تھا۔ منورما خوش تھی۔ خود وہ دونوں
خوش تھے۔ رہی بہو۔ اگر اسکی تیوریاں چڑھی تھیں، اور پیشانی پر شکنیں پڑی تھیں۔ تو یہ کون سی نئی بات
تھی۔ وہ تو ہمیشہ کی ایسی ہی ہے۔ "رسی جل گئی اینٹھن نہ گئی"۔ کوئی کیا کرے! کوئی ڈائن کو دیوی تھوڑے بنا سکتا ہے۔

ایک دن صبح سویرے منورما مل راج سے پوچھنے آئی کہ "آج کیا بھوجن کیجیے گا۔ آپ کے لئے کون سی چیز پکا دوں؟" مل راج تو یہ کہہ کر کہ "تم نے یہ اپنے سر کیوں خواہ مخواہ کا جھگڑا لیا ہے؟" کچھ خوش خوش سوچنے لگے۔ مگر بہو نے پیچ و تاب کھا کر کہا "میری سوکن بننے کا ارمان ہے اور کیوں؟" منورما کا چہرہ بالکل بیری کے رنگ کا ہو گیا چپکی اُٹھی اور چولھے کے پاس جا کر بیٹھ رہی۔ مگر مل راج بیحد خفا ہوا غصہ اس کا کہ جس زخم کے اندمال کے لئے نہ معلوم کن کن وقتوں سے دل ہی دل میں مرہم تیار ہو رہے تھے آج اس عورت نے اپنے تیز ناخنوں سے اسے بُری طرح کرید دیا۔ انگور کے ٹانکے ٹوٹ گئے۔ ناسور کی تکلیف پیدا ہو گئی۔ بالکل چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح پلٹ پڑا اور جو کچھ مُنہ میں آیا بیوی کو کہہ گیا۔ مگر وہ بھی کیا چپ رہنے والی تھی۔ ایک تو نسوانی فطرت، پھر اس پر پانچ برس سے طعن و تشنیع کی مشق چڑھی ہوئی تھی۔ چوٹ پر چوٹ دیتی گئی۔ اور جب یہ مردوں کی طرح اس کی قینچی کی سی چلتی ہوئی زبان کی تاب نہ لا سکے اور پاؤں پٹکتے باہر چلے تو بولی "بڑے تاؤ میں باہر تو جا رہے ہو پر اتنا سنتے جاؤ کہ آج تو پریم ہی پریم ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے ملو بھیا کی رٹ ہے۔ بھوجن بھی ہے، حلوا بھی ہے، پان بھی ہے اور حقہ بھی۔ لیکن یہ سب دو ہی دن کی بات ہے۔ میں جب جانوں جب بیاہ ہونے پر بھی یہی حالت رہے۔ اسی طرح چوکا ہو، اسی طرح تکیہ کا غلاف سلے۔ اسی طرح رومال کاڑھے جائیں۔ اُس وقت سب کچھ بھول جائیے گا۔ بس وہی یاد رہیگا جو مانگ میں سیندور بھریگا اور اگنی کی بھنور گھومیگا!"

اس آخری وار کا مل راج کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ بھاگا اور بے تحاشا بھاگا۔ ماں کسی کام کے لئے پکارتی رہی اس نے اعتنا نہ کی۔ باہر لالہ جی پوتے کے ساتھ کسی کھیل میں مشغول تھے۔ ان کی نظر بچا کر لمبے لمبے قدم رکھتا آبادی سے نکل گیا۔ دیہاتی زندگی فطرت و قدرت کے مناظر کو اپنوں سے زیادہ عزیز بنا دیتی ہے۔ لہلہاتے کھیت جھومتے درخت، چھلکتے تالاب، اور بہتے ہوئے نالوں میں کیا نہیں۔ جوانی کی اُمنگیں بھی ہیں۔ معشوق کی مست خرامی بھی۔ مدھ بھرے کاسے بھی ہیں۔ اور عاشق کا ہر وقت رِسنے والا دلی ناسور بھی۔ ہاں صرف دیکھنے والی نظر چاہیے۔ سو وہ مل راج کے پاس موجود تھی۔ وہ یہی دیکھتا، یہی سوچتا ایک مٹر کے کھیت کے کنارے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر مینڈھ کے

قریب کی گھانس نوچتا رہا۔ پھر درختوں میں سے نرم نرم پتیاں توڑیں اور انھیں چبانا شروع کیا۔ بالکل نیم کی پتیوں کا مزہ تھا۔ جلدی سے تھوک دیں۔ غور سے درختوں کو دیکھا کہ کہیں کیڑا تو نہیں لگا۔ یا ٹھنڈ تو نہیں مار گئی۔ کوئی خرابی نہ تھی۔ تھوڑی سی پتیاں دوسرے درختوں سے پھر توڑیں۔ مگر جب کچلا تو وہ بھی "گرج" سی محسوس ہوئیں۔ تھوک دیں۔ اُٹھا اور ارہر کے کھیت میں پہونچا۔ موٹی موٹی پھلیاں چن کر توڑیں۔ اُن سے دانے نکالے اور انھیں چبایا۔ وہی کڑواپن بس طبیعت جھلا گئی۔ دو تین درخت نوچ کر پھینک دیے۔ جب تھوڑا سا نقصان کر چکا تو کچھ تسکین ہوئی اور آگے بڑھا۔ گنے کٹ چکے تھے۔ پھر بھی ایک کھیت باقی رہ گیا تھا۔ ایک گنا توڑا، پتیاں اور چھلکے علیحدہ کئے۔ گھٹنے پر رکھ کر اسے دو ٹکڑے کیا۔ جڑ کی طرف والا حصّہ دانت سے ایک پور تک چھیلا، پھر اسے کاٹ کر کھایا۔ بالکل اُتنا ہی کڑوا معلوم ہوا جیسے چرپتے کا رس۔ کلّی کر دی "اوکھ" کو گھما کر دور پھینکا اور وہیں مینڈھ پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دماغ میں اسی مشین سی چل رہی تھی بس ایک ہی آواز آتی "کل جب منورما کا بیاہ ہو جائیگا، کل جب منورما کا بیاہ ہو جائے گا، کل جب منورما کا بیاہ ہو جائیگا!" ایسا جان پڑتا جیسے کہیں سر کے پیچھے بولنے والے فلم کا انجن لگا ہوا ہے۔ اور اسکی ڈائن بیوی دانت نکالے پوری سوتیا ڈاہ سے اس فقرے کی بار بار تکرار کر رہی ہے۔ جی چاہتا کان میں اُنگلیاں دے کر کسی طرف بھاگ جائے۔ مٹر، ارہر، اوکھ سے دل بہلاتا۔ مگر ان میں بھی اُسی ڈائن کی باتوں کی کڑواہٹ آگئی۔ کیا کرے دل دُکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں مرچیں سی لگی تھیں خشک سسکیاں آرہی تھیں مگر آنسو نہ نکلتا تھا۔ گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے دل پکڑے پھر اُٹھا۔ سامنے برگد کا درخت تھا، جوگیوں کی طرح جٹا لٹکائے ہوئے سیکڑوں گھری چڑیوں کے بسیرے کی جگہ۔ تنے سے لپٹ گیا اور بیساختہ مُنہ سے نکل گیا "بابا بابا لو! اگیت پوتا اُٹھا لو!" پھر بروہ تھام کر اوپر چڑھ گیا اور ایک چوڑی شاخ پر سیدھا سیدھا لیٹ گیا۔ جانو جیسے جلتے دل پہ کسی نے پھاہا رکھ دیا۔ پیڑ پر نہ لیٹا تھا ماں کی گود میں تھا۔ وہی اطمینان وہی خنکی وہی سکھ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے دیر تک رویا کیا، پھر وہیں تھک کر سو رہا!۔

دو گھنٹے بعد ایک چھوٹی سی چڑیا آکر قریب والی شاخ پر بیٹھی۔ تھوڑی دیر گردن ٹیڑھی کر کے اُسے جھانک جھانک کر دیکھتی رہی۔ پر کھجا کھجا کر سونچا کی۔ پھر ہمت کر کے پھدک کر اس کے جسم پر آ رہی۔ سینے پر اور بغلوں میں اپنے لئے غذا تلاش کرتی رہی۔ کوئی چیز نہ ملی۔ کھلتا اور بند ہوتا ہوا مُنہ دکھائی دیا۔ اور قریب آئی۔ شاید اس گڈھے میں کچھ ملے۔ لعابِ دہن ہونٹوں کے کناروں میں بھرا تھا۔ پتلی سی چونچ سے ذرا سا اُٹھا کر چکھا۔ اچھا معلوم ہوا، لالچ بڑھا۔ جسارت کر کے ٹھوڑی پر آ رہی۔ سوتے ہوئے انسان کے جسم میں ناخن کی خراش لگی۔ گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ چڑیا تو اُڑ گئی لیکن اُٹھ بیٹھا۔ اپنے کو زمین سے کوئی دس گز کی بلندی پر بیٹھا پایا۔ سخت تعجب ہوا۔ سوچنے لگا یہاں کیونکر پہونچا۔ ایک ایک کر کے ساری باتیں یاد آتی گئیں۔ منورما کی ہنستی بیوی کی جلن۔ اس کا منورما کو "سوکن" کہنا۔ اپنا بیوی کو "ڈائن" کہنا۔ پھر آخری جملہ وہی بس میں ڈوبا ہوا جملہ "کل جب منورما کی شادی ہو جائے گی تب!"

پھر بھی طوفان میں کمی ہو چکی تھی، نہ وہ پہلی سی طغیانی تھی اور نہ وہ جزر و مد! سوچتا ہوا اُترا "سچ کہتی ہے جب منورما کی شادی ہو جائیگی تب؟ ...... اور اگر نہ بھی ہو تو؟ .... چچا کی لڑکی ہے .... میری بہن! .... ہندو دھرم میں یہ کہاں ہے کہ چچا کی بیٹی سے بیاہ ہو .... اور میں کیسے کر سکتا ہوں .... مدن کی ماں؟ .... مگر پریم .... ہر دے نہیں مانتا! ...... ہے رام۔ ہے رام! بڑی کٹھن آ پڑی۔ بڑی بپتا ہے! کیا کروں! کس سے کہوں؟"

انھیں خیالات میں محو درخت سے اُترا۔ اور آہستہ آہستہ گردن نہوڑائے گھر کی طرف چلا۔ ابھی گھر میں قدم نہ رکھا تھا کہ شور اور ہنگامے کی آواز سُنائی دی۔ قدم اور تیز پڑنے لگے۔ اندر داخل ہوتے ہی دیکھا تو "بہو" پر بھوت سوار ہے۔ موسل ہاتھ میں ہے، منھ سے کف جاری ہے۔ مدن زمین پر خاک میں لوٹ رہا ہے۔ ماں پوتے کو بچانے کے لئے جُھکی ہے اور منورما اپنی بھاوج سے چمٹی ہوئی ہے۔ اس نے لپک کر بیوی کے ہاتھ سے موسل چھین کر دور پھینک دیا اور بیٹے کو گود میں اٹھا لیا۔ پھر ڈانٹ کر پوچھا

کیا ہوا؟ یہ کا ہیکا ہنگامہ ہے؟"

ماں نے ہانپتے ہوے کہا "جب سے تم باہر گئے ہو بہو بیٹھی بیٹھی نہ جانے کیا بڑبڑاتی رہی۔ کہ اتنے میں مدن آگیا اور ان سے کسی چیز کے لئے مچل گیا۔ بس برس پڑیں۔ کوسا کاٹا۔ پھر گھر بھر میں گھسیٹتی اور مارتی پھریں۔ جب میں نے اور منو نے ٹوکا تو جانو سچ مچ سر پر بھوت سوار ہو گیا۔ منو کو بری بری گالیاں دیں۔ پھر موسل اٹھا لائیں کہ میں مدن کو مار ڈالونگی اور اپنی بھی جان دیدونگی کہ جس میں تم کو چین آئے۔

للائن اتنا ہی کہنے پائی تھیں کہ بہو چیخ کر بولی "وہ تو جھوٹ کیا کہا۔ آپ کی تو آنکھ پھوٹ گئی ہے۔ آپ کو کب سجھائی دیتا ہے۔ بس" منو! منو!" کی رٹ ہے۔ اس ڈائن نے آپکے راج دلارے کا دل موہ لیا۔ روز روز اچھے اچھے بھوجن ہیں۔ تکیہ کا غلاف ہے۔ رومال ہے، حلوا ہے۔ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہوں۔ نہ سیدھے منہ بات ہے۔ نہ ہنسنا ہے نہ بولنا ہے۔ آپ کی منو جو بڑی بھولی بھالی ننھی نادان ہیں۔ میری سوکن بننا چاہتی ہیں۔ اور آپکے سپتر جو بڑے نیک سیدھے سادھے ہیں یہی دل سے چاہتے ہیں۔ میں کب تک یہ دیکھ دیکھ کر زہر کا گھونٹ پیے بیٹھی رہونگی؟"

منورما نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ للائن ایک ایک کا منہ تعجب سے تکنے لگیں۔ مل راج شیر کی طرح ڈہکا۔ "چپ رہ بدتمیز! ماں جی کا بھی پاس نہیں!"

وہ بولی "پاس کرے میری جوتی۔ مجھے کیا اس پاپی دنیا میں بہت دن رہنا ہے۔ تم اپنی کہو، تم تو میرے مرنے پر بھی اپنی چہیتی کو کلیجہ سے نہیں لگا سکتے! وہ تمہارے کاکا کی لڑکی ہے!"

یہ کہہ اپنے کمرے میں گھس گئی اور دروازہ بند کر کے اسی جنون میں اپنے کپڑوں پر لالٹین سے تیل نکال چھڑک لیا۔ پھر دیا سلائی جلا کر آگ لگالی!

للائن اور مل راج مدن کے منہ دھلانے اور چپ کرانے میں مشغول تھے کہ دفعتہً مٹی کے تیل کی بو ناک میں گئی اور کمرے سے دھواں نکلتے دکھائی دیا۔ دونوں مدن کو اسی طرح چھوڑ کمرے کی طرف دوڑے اور کواڑ پیٹنا شروع کئے "بہو! بہو!۔ کواڑ کھولو! ارے یہ دھواں کیسا ہے؟"

اندر سے ہنسی کی آواز آئی "میں ڈائن ہوں ڈائن۔ اب جل کر چڑیل بنونگی اور آپ کی منو کے

سر پہ سوار ہونگی! اہا۔ اہا۔ اہا۔ اہا..... آہ !!!"

لالہ ہنسراج کسی کھیت میں پانی بھروا رہے تھے کہ خبر پہونچی بہو آگ میں جل کر مر گئی۔ دوڑتے ہوئے گھر پہونچے۔ تو دیکھا کمرے کا دروازہ ٹوٹا ہوا ہے۔ بہو کے جلے ہوئے ڈھانچے پر ایک سپید کپڑا پڑا ہے سرہانے للائن بیٹھی ہوئی بین کر رہی ہیں۔ پائنتی مل راج دونوں گھٹنوں پر سر رکھے گم گم بیٹھا ہے۔ تھوڑی دیر رویا کئے۔ پھر مہری سے ساری روداد پوچھی۔ اسے خاموش رہنے کا حکم دیا۔ بیوی کے پاس گئے اُنھیں چپ کرا کے اُٹھا لائے۔ اسکے بعد بیٹے کے پاس گئے۔ شانہ ہلایا، پکارا، اُس نے چونک کر باپ کی صورت دیکھی۔ خاموش اُٹھا اور سر جھکائے باہر چلا گیا اور وہاں بھی اسی طرح سب سے علیحدہ ایک کمرے میں جا کر بیٹھ رہا۔ لالہ جی نے جب منورما اور مدن کی تلاش کی تو وہ دونوں ایک گوشے میں زمین پر پڑے ہوے ملے۔ گلے میں باہیں تھیں اور گال پر گال۔ رخسار اب تک آنسو سے تر تھے۔ نہ جانے بیہوشی تھی یا نیند۔ بہر حال دونوں غافل تھے۔ حسرت سے دیکھا کئے۔ پھر آہستہ آہستہ دبے پاؤں کھونٹی پر سے ایک چادر اُتارا۔ دونوں کو اُڑھا دیا اور باہر چلے آئے۔

گاؤں کے لوگ آنے لگے۔ ہر ایک سے جھوٹ بولنا پڑا۔ اتفاقیہ جسم میں آگ لگ گئی۔ ہر ایک افسوس ظاہر کرتا رہا۔ شام تک داروغہ جی بھی آ گئے۔ آدمی نیک تھے۔ پھر لالہ ہنس راج سے آدمی کے گھر کی بات تھی۔ رپورٹ میں اتنا لکھ کر کہ اتفاقیہ کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ درشن کرا کے رسم ادا کرنے کی اجازت دے کر چلے گئے۔ دوسرے دن صبح تک اس سے بھی فراغت ہو گئی۔ ہاں یہ البتہ ہوا کہ مل راج نے نہ کھایا، نہ پیا، نہ سویا، نہ بولا۔ اس وقت بھی چپ تھا جب ٹکٹی گھر سے نکالی جا رہی تھی۔ اور اس وقت بھی جب کہ گھی کے چھڑکاؤ کے ساتھ مدن کی ماں کی سوکھی ہڈیوں سے شعلے بھڑک رہے تھے۔

تین دن بعد لالہ سیتا رام بھی لاہور سے آ گئے۔ بھائی سے ساری روداد سُنی۔ منورما کو پاس بُلا کر بٹھایا۔ کچھ اس طرح تجسس اور حسرت بھری نگاہوں سے اُسکی صورت دیکھا کئے کہ وہ رونے لگی۔ اُنھوں نے بن ماں کی بچی کا سر سینے سے لگا لیا۔ آہستہ آہستہ سر پہ ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور خود بھی روتے

جاتے تھے۔ للائن نے جو دوسرے دالان سے یہ حالت دیکھی تو وہاں سے اٹھ کر آئیں بیٹی کا سر باپ کے سینے سے ہٹا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ پھر دیور سے بولیں "تم باہر جاؤ۔ تمھارے بھائی بلا رہے ہیں!"

وہ جو باہر آئے تو دیکھا لالہ جی بیٹھے ہوئے جلدی جلدی حقہ پی رہے ہیں اور پاس ہی مل راج گردن جھکائے بیٹھا ہے۔ کچھ غصہ معلوم ہوا کچھ افسوس پھر بھی بڑے بھائی کے لحاظ سے کچھ بولے نہیں۔ خود بھی انھیں کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئے۔ لالہ جی نے کھانس کر گلا صاف کیا۔ حقے کے کئی کش پھر جلدی جلدی کھینچے اور بولے "اچھا ہوا تم آ گئے میں مدت سے ابھی ہی پوچھنا چاہتا تھا کہ...... بہو نے جو الزام ان پر منو کی پریم کا لگایا تھا وہ سچ ہے یا جھوٹ؟"

مل راج اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ لالہ سیتا رام نے اس پر ذرا ڈانٹ کر کہا "ملو سنتے ہو بھیا کیا پوچھتے ہیں؟ جواب دو!"

مل راج نے سر اٹھا کر بڑی حسرت سے انھیں دیکھا۔ لالہ جی نے پھر پوچھا "بیٹے تم خود ایک لڑکے کے باپ ہو جو بات ہو صاف صاف کہہ دو۔ کیا تم سچ مچ منو سے بہن سے زیادہ پریم کرتے ہو؟"

مل راج نے عجیب درد سے انھیں دیکھا سر ہلا کر ہامی بھری اور دونوں ہاتھ سے منہ چھپا لیا۔

لالہ جی بیساختہ جھلا کر بولے "کاہے رے ہتیارے کوئی چچا کی کنیا سے اس طرح کی پریم کرتا ہے! کیا تیرا اور منو کا بیاہ ہو سکتا ہے۔ سچ مچ یہ کلجگ ہے"

مل راج نے گھٹنے سے سر اٹھایا۔ ایک بار باپ اور چچا کو اس تیور سے دیکھا جس طرح مرد مرد سے آنکھیں ملاتے ہیں۔ پھر جھک کر دونوں کے چرن چھوئے اور گھر میں چلا گیا۔ صحن میں مدن کھیلتا ہوا ملا۔ اسی طرح خاک میں بھرا ہوا زمین سے اٹھا کر کلیجے سے لگا لیا۔ پھر اسے وہیں چھوڑ کر اس جگہ گیا جہاں منورما مرجھائی ہوئی کلی کی طرح اداس بیٹھی ہوئی چھالیا کاٹ رہی تھی۔ انھیں قریب آتے دیکھ کر اس نے اپنے دلی ہیجان سے مجبور ہو کر گھونگھٹ نکال لیا۔ یہ تھوڑی دیر وہیں کھڑا اس کھڑکے کو دیکھتا رہا جسکے کارن آج لالہ جی سے محبت کرنے والے باپ نے اسے ہتیارا کہا۔ پھر اسکے سر پر ہاتھ رکھے چند منٹ خود لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا اور وہ بیٹھی کانپا کی۔ پھر ماں کے پاس گیا اور اس کے پاؤں

آنکھ سے لگا کر گھر سے باہر نکل گیا !۔

مدن اب تیرہ برس کا ہے اور لالہ جی کے بڑھاپے کا سہارا۔ کھیت کھلیان زمینداری سب کچھ اب وہی دیکھتا ہے۔ مل راج دس برس سے لاپتہ ہے۔ ایک بار بس اتنا ہوا کہ خبر ملی کاشی جی سے تھوڑی دُور پر گنگا جی کے کنارے ایک باباجی نے دھونی جمائی ہے' اور یہ بھی سنائی دیا کہ اُن کو آج تک کسی نے باتیں کرتے نہیں سنا اور نہ اکڑوں کے سوا کسی اور طرح بیٹھتے دیکھا۔ لالہ جی نے تفتیش کے لئے آدمی بھیجا وہ لاکر ایک پرزہ دے گیا۔ لکھا تھا۔

"پتا جی۔ میں نے آپ اور مدن کی ماں دونوں کے نزدیک منورما سے پریم کرنے میں پاپ کیا۔ لیکن میں ہردے سے مجبور تھا۔ میں نے اسی پاپ کی اپنے کو یہ سزا دی ہے کہ جوگ لے لیا۔ اب آپ جانیں اور مدن اور منورما۔ ایک انجان بالک ہے اور دوسری ستی استری۔ ہاں میں نے یہ ضرور قسم کھائی ہے کہ میں جنم بھر نہ کسی جانے پہچانے سے ملونگا اور نہ اس مُنہ سے بولونگا جس سے منورما کے لئے پریم کے شبد نہیں نکال سکتا ...... مِلّو۔

اسکے بعد سے پھر پتہ نہ چلا کہ مل راج کہاں گیا یا کیا کر رہا ہے۔ منورما البتہ کئی برس لالہ جی کے یہاں رہی۔ پھر شادی بیاہ ہوگیا۔ اب اُسکے دو تین لڑکے ہیں۔ شوہر محبت کرتا ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو بھی ہو۔ لیکن یہ انوکھی بات ہے کہ اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے سوامی کے لئے نہ کوئی تکیہ کا غلاف سیا اور نہ کبھی کوئی کھانا پکایا۔ اور تیسرے چوتھے مہینے بیٹھے بٹھائے دفعتہً کپڑے پھاڑ ڈالتی ہے۔ سر پر خاک ڈالتی ہے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں اور مُنہ سے بیساختہ قہقہے! اور ان قہقہوں میں بالکل وہی کیفیت ہوتی ہے جو بہو کے اس قہقہے میں تھی جو جلتے وقت اُسکے حلق سے نکل رہے تھے !۔

دردؔ کا صوفیانہ کلام

(جناب محمد سلیم صدیقی صاحب بی۔ اے)

الفت و محبت عشق و عاشقی اُردو شاعری کی جان ہیں۔ بغیر حسن و عشق کی روئداد نظم کئے ہوئے کوئی شاعر شاعر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اور ایسا ہونا کچھ بیجا بھی نہیں۔

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے		انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

کلامِ دردؔ میں محبت و الفت کے مضامین کی کمی نہیں لیکن دردؔ کے نام کے ساتھ ہی یہ شاہراہ معمولی حسن و عشق سے دُور ہوجاتی ہے۔ جہاں حسن مجازی کے بجائے حسن حقیقی کی برق پاشیاں ہیں جہاں حسن کی اعلیٰ نسبت سے عشق بھی باوقعت ہوجاتا ہے۔

میر دردؔ کے معیارِ عشق کا تصور موجودہ دورِ مادیت میں مشکل ہے۔ آج محبت اُس تحریک کا نام ہے جو حُسنِ انسانی سے پیدا ہوتی ہے جس میں حیوانیت و ہوس کو دخل ہوتا ہے یا جسے عشق مجازی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ کل تک عشق مجازی کا پایہ بھی نفسانی خواہشوں سے بلند تر تھا آج شاہدانِ بازاری کا حُسن اور عشوہ سازیاں تجرد پسند شاعروں کے خاص موضوع ہیں کل تک اس عریاں نویسی کو لوگ خارج از تہذیب سمجھتے تھے۔ خلوص جذبات طغرائے امتیاز تھا لیکن یہ وہی مانتے ہیں جو جانتے ہیں۔ آج کے روشن خیال نہیں بلکہ آزاد مزاج شاعر کی دوشیزہ پر جذبات کی بے لوثی کا شبہ گناہ ہے لیکن کل کے سن رسیدہ نہیں بلکہ خدا رسیدہ معشوق پر بدگمانی عین ایمان ہے۔ ان کی اس تنبیہ کے باوجود

بُت پرستی نہیں شعار اپنا		ہم کو ایسا نہ جانیو واللہ (دردؔ)

یورپ کی کورانہ تقلید میں ادب لطیف کے بہانے عریاں نویسی کو رواج دیا جارہا ہے فطرت نگاری کے نام سے فطرت کو بدنام کیا جارہا ہے۔ یہ لوگ کیا جانیں کہ محبت اخلاق کی کسوٹی ہے اور عشق ادب آموز ہے۔

یہ قدما کے عشق و محبت کو غیر فطری کہتے ہیں کیونکہ اس کا فہم ان کی منزل ادراک سے آگے ہے۔

عاشقوں کا وصال ہے کچھ اور   نہ ملیں گو کہ ہجر میں مر جائیں (میر تقی میر)

اُردو شاعروں میں بھی جن لوگوں کا معیار عشق بہت بلند ہے۔ اُن میں خواجہ میر درد کی شخصیت بالخصوص ممتاز نظر آتی ہے خواجہ صاحب ایک صوفی صافی اور عارف باللہ بزرگ تھے۔ اُن سے قبل کتنے ہی صوفی گزر چکے تھے اور اکثر اُس دور میں موجود تھے جو اُردو میں شعر موزوں کرتے تھے۔ اُن کے کلام میں انکے خصائل و عادات کا پرتو ہوتا تھا اور ذاتی خوبیاں نمایاں ہوتی تھیں۔ ایک عرصہ تک صوفیہ کے حلقہ میں شاعری کے وسعت پانے سے اردو میں اعلیٰ اخلاقی مضامین مثل خودداری، استغنا، قناعت، بردباری، صبر و تحمل وغیرہ کے معتدبہ ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ جن اشعار میں عشقیہ خیالات کا اظہار کیا گیا تھا وہ درحقیقت عشق حقیقی کے اعلیٰ جذبات کی تصویریں تھیں اور ان میں کہیں نام کو بھی پستی نہ تھی کیونکہ صوفیہ کے نزدیک بقول درد "عشق مجازی عشق حقیقی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا" بلکہ وہ ایک پردہ ہے جو حقیقت کی نگاہ سے پوشیدہ کر دیتا ہے۔ ایک زنگ ہے جس سے آلودہ ہو کے دل تجلیاتِ عرفان سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس طرح وہ ماحول جس میں اُردو شاعری نے فروغ حاصل کیا۔ عشق حقیقی کی لمعات سے بقعۂ نور ہو رہا تھا۔ روحانیت کی نورانی آتش نے ہوا و ہوس کو جلا کے خاک کر دیا تھا۔ دل سوز و ساز سے معمور تھے۔ پہلو میں شرارے روشن تھے لیکن وہ کسی مجازی شمع رو کے بھڑکائے نہ تھے۔ انکا رخ ملائے اعلیٰ کی طرف تھا نفوس قدسیہ نے ارتقائے باطنی میں درجۂ کمال حاصل کر لیا تھا۔ عقل و خرد کی تنگی اور مجاز کے قید و بند روح کی جولانیوں کو روک سکتے سے عاجز تھے۔ رموز عرفان و تازہ معارف جو دل پر وارد ہوئے وہ کلام مربوط یعنی شعر میں ادا ہوتے گئے۔ اور اُردو کے صحیفے ان اسرار سے مالا مال ہو گئے جو یورپ کے بڑے بڑے سینٹ برسوں مراقبہ کے بعد نہ پا سکے تھے۔

شاعری ہی وہ چیز ہے جس سے ہم انسان کے جہل و علم، زوال و ترقی، ذلت و عظمت کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ جب انسان مدارج ارتقا طے کر لیتا ہے، جب اُسکے قوائے ذہنی تیز ہو جاتے ہیں۔ جب روح حیوانی

قوتوں پر غالب آجاتی ہے ویسے ہی وہ مجاز کے مجسمہ کو حقیقت کی قربانگاہ پر نذر کردیتا ہے۔ اُردو شاعری
کے لئے وہ دور بے مثل گزرا ہے۔ جب میر درد، میر تقی میر اور ولی دکنی سے اولیا اکبار اُردو کے لئے سرگرم کار
تھے کیونکہ جس قدر معنوی ترقی اُس دور میں اُردو کو ہوئی وہ بعد کے کسی دور میں نصیب نہ ہوئی معنوی ترقی کے لحاظ
سے میر درد کی عظمت اور ان کا درجہ اپنے ہمعصروں میں سب سے بلند اور اہم ہے۔ اور بقول آسی "خواجہ میر درد
کے برابر کوئی شاعر سرزمین ہند میں پیدا نہیں ہوا" میر صاحب خود فرماتے ہیں ؎

ہوں قافلہ سالار طریق قدما درد! جوں نقش قدم خلق کو میں راہ نما ہوں!

مولوی عبدالسلام ندوی نے "شعر الہند" میں جہاں صوفیانہ شاعری کے مدارج ارتقائی سے بحث
کی ہے۔ لکھا ہے کہ "جس زمانہ میں اُردو شاعری اُردو شاعری ہوئی خواجہ میر درد نے سب سے پہلے اس زبان کو
صوفیانہ خیالات سے آشنا کیا" کلام درد پر جن جن لوگوں نے اب تک خامہ فرسائی کی ہے وہ ادنیٰ تغیر
لفظی کے ساتھ متذکرہ بالا دعویٰ کے پیش کرنے میں ہم آہنگ ہیں۔ خود میر درد کا دعویٰ بھی یہی ہے۔ ؎

یاں میں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا پھولینگے اس زبان میں گلزار معرفت

یہ دعویٰ یوں صحیح ہے کہ جن باغبانوں نے اس سے قبل گلزار معرفت کی چمنبندی کی تھی اُنکی تخمریزی اور کوشش
کچھ بار آور نہ ہوئیں وہ اپنی قائم کی ہوئی بنیادوں پر کوئی عالی شان عمارت نہ بنا سکے لیکن میر درد نے نہ صرف
اپنے شاگردوں میں یہ ذوق پیدا کر دیا بلکہ خود اپنے ہر کلام سے چمن نظم کو گلزار معرفت و رشک ارم بنا دیا۔ ان کے
متصوفانہ کلام اور خیالات کا اثر بقول مترجم تاریخ ادب اُردو اُنکے ہمعصروں کے کلام میں موجود ہے۔
میر حسن جو خواجہ صاحب کے شاگرد رشید تھے اُنھوں نے ایک مثنوی رموز العارفین مولانا روم کے طرز پر لکھی
جس میں تمثیلات و حکایات سے تصوف کے دقیق مسائل سمجھائے گئے ہیں۔ یہ مثنوی خواجہ صاحب کے خیالات کا
پرتو اور اُنکی فیض صحبت کا اثر ہے۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ارتقائے انسانی کا مدعا یہ ہے کہ انسان جس قدر جلد ہو سکے تمام کثافتوں سے
پاک ہو کے روح مجسم بن جائے اور مقام محمود کے ساکنوں سے جا ملے تصوف اور صرف تصوف ہی اس مشکل کو
آسان کرتا ہے۔ اسی ذریعہ سے انسان فرشتوں پر سبقت لیجاتا ہے اور اسکا علم براہ راست علام الغیوب سے

استفادہ حاصل کرتا ہے فلسفیوں کی بے راہ روی عارفین آلہی کو اس پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم کا کچھ حصہ دُنیا کے سامنے پیش کریں جس میں فلسفہ، خیالات، فلسفہ ربوبیت، عالم وجود اور اسکی ماہیت و حقیقت سے متعلق اصول نہیں ہوتے بلکہ حقائق کا اظہار ہوتا ہے تاکہ لوگ واقف ہو جائیں کہ یہ عالم کیا ہے کیوں ہے ہم یعنی ہمارا نفس کیا ہے اسکا تعلق موجودات سے کیا ہے وہ عبد ہے یا معبود، خالق ہے یا مخلوق۔ زندگی کا کوئی مقصد ہے یا محض اتفاقات سے یہ سارا عالم ظہور پذیر ہوا ہے ساتھ ہی وہ تزکیہ نفس اور تہذیب نفس کے اصول اور طریقے سے عملاً اور قولاً آگاہ کرتے ہیں مصنف شعر الہند نے اپنی کتاب میں فلسفہ اور تصوف کی سُرخی سے دو جداگانہ عنوان قائم کئے ہیں لیکن یہ صوفیانہ شاعری کی حصہ پر بیجا دست اندازی ہے متصوفانہ فلسفہ اور متعارف فلسفہ میں صرف یہ فرق ہے کہ موخر الذکر وجود باری سے منکر ہو سکتا ہے اور اسپر اتفاقانہ یا معاندانہ دلائل لا سکتا ہے اور تصوف میں ذات باری کا اقرار لازمی ہوتا ہے۔ گو کبھی منصور اور بایزید اس اصول کو توڑ دیتے ہیں لیکن عارفین مشاہدہ حق کے بعد عقل سے استدلال کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ پھر اثباتی دلائل فلسفہ تصوف سے کیوں خارج ہوں چنانچہ موجودہ مضمون میں اس قسم کے اشعار کو بھی بار حاصل ہے۔

کلام درد کی خصوصیات کا ذکر ایک خاص عنوان کے ماتحت آئندہ ہوگا لیکن اس موقع پر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ خواجہ صاحب کے نام کی مناسبت سے کلام سراپا درد ہے۔ دیوان کا کوئی شعر لیجئے اُس میں اثر اور درد کا دریا موج زن ملیگا بیشتر تو شعر ایسے ہیں کہ مجبوراً انھیں دردآمیز لہجہ میں پڑھنا ہوتا ہے میر و سودا کے کلام کے متعلق کہا گیا ہے کہ "سودا کا کلام واہ ہے تو میر کا کلام آہ" لیکن اگر سودا کا کلام واہ ہے میر کا آہ ہے تو درد کا کلام ھُو ہے"۔ میر کو اپنی نسبت یہ کہتے تو سُنا ہی ہوگا کہ ؎

مجھکو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے ۔۔۔ درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

میر درد کے یہاں بھی درد ہے اور بقول شخصے معرفت و حقیقت کا رنگ کلام کی پاکیزگی تخئیل کی بلندی درد کی چاشنی، سوز و گداز کا کندن ہر جگہ عیاں ہے تاباں ہے۔ اصل یہ ہے کہ دلِ عاشقانہ صادقانہ نے کلام میں حقیقت کا پہلو زائد روشن کر دیا ہے۔ سامعین کے حواس ظاہری کے بجائے حواس باطنی زائد اثر پذیر ہوتے ہیں۔ دل وہ دل جو مضغہ گوشت نہیں بلکہ مرکز روح ہے تڑپ جاتا ہے۔

میر حسن نے خواجہ صاحب کے کلام کو حافظ شیرازی کے کلام سے بوجہ منتخب روزگار اور جامع صفات ہونے کے نسبت دی ہے۔ کلام ہی پر منحصر نہیں میر درد کو ہر لحاظ سے حافظ ہند کہا جا سکتا ہے۔ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ حافظ کے نشہ میں شراب ناب کو بھی دخل تھا کسی نے سچ کہا ہے کہ ؎

اگرچہ شاعران نغز گفتار ولے با بادہ بعض حریفاں
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم
ز یک جام اند در بزم سخن مست خمار چشم ساقی نیز پیوست
ورائے شاعری چیزے دگر ہست

یہ "چیزے دگر" یا "خمار چشم ساقی" بالفاظ غالب "پارسیوں" کے حصہ میں آئی ہے۔ ہاں اردو زبان میں بعض اہل ہند نے وہ "چیز پائی ہے"۔ فارسی میں اسکی مثال خواجہ حافظ کا کلام ہے۔ اردو میں خواجہ میر درد کا کلام۔ جسے خمار چشم ساقی کا مشاہدہ اپنی نظروں سے کرنا ہے وہ محفل دردؔ میں آئے جہاں ساقی ازل "الست بربکم" کہکر میخواروں کو مخاطب کر رہا ہے اور وہ "قالوا بلیٰ" کہکر شراب معرفت کا جام دست ساقی سے لے کر نوش کرتے ہیں۔ اِس مجلس میں آئے لیکن باادب ہو کر۔ دیکھئے لیکن بے باک نگاہی کو خیرباد کہکر ؎

یاں کھولیو تو سمجھ کے آنکھیں شمع مجلس ہے شعلۂ طور

حسن نیت شرط ہے خمار چشم ساقی ذرہ دیدہ نگاہوں میں نظر آجائے گا شیشۂ دل شراب عرفاں سے معمور اور چشم بصیرت روشن ہو جائیگی۔ ...... شمع حرم کے گرد پروانوں کا اجتماع ہے۔ درمیان میں قبلہ نما صدر نشین ہے محمل لیلیٰ پیش نظر ہے۔ مجنوں کو مرتبۂ کلیم حاصل ہے۔ اک حالت کیف طاری ہے اور یہ الفاظ زبان سوز سے سامعہ نواز ہو رہے ہیں ؎

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا
یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا
اذیت مصیبت ملامت بلائیں ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
کیا مجھ کو داغوں نے سرو چراغاں کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا
تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا
حجاب رخ یار تھے آپ ہی ہم کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا
شب و روز اے دردؔ در پے ہوں اسکے کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

ساقی کی سحرکار کا فرنظریں جس طرح عالم کو عقل و ہوش سے کافر بناتی ہیں اسکی مثال درد کا یہ شعر ہے ؎

پھیلا ہے کفریاں تک کافر ترے سبب سے　　　　شمع حرم بھی دے ہے ماتھے پہ اپنے ٹیکا

صوفیہ کی اصطلاح میں ماسوائے اللہ کے وجود و اثر کا تسلیم کرنا کفر ہے۔ لہذا ہر وہ شے کافر ہے جو بزعم خود موجود ہے۔ کبھی صوفیہ شوخ بیانی سے خدا ہی کو کافر قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ وہی اعتباری چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ اُسی نے دام فریب ہستی یعنی دنیائے نیست کو معرض ظہور میں لاکے حقیقت کی پردہ پوشی کی ہے یہاں تک کہ اعیان و مظاہر جو ذریعۂ معرفت الٰہی ہیں اپنے وجود ظاہری سے بظاہر ذات واحد مطلق کا بطلان کرتے ہیں اس تمام طول طویل مطلب کو کنایہ و استعارہ میں یوں ادا کیا ہے کہ وہ ایک کافر ہے جسکی محبت ہر دل میں گھر کئے ہوئے ہے اس نے سرکشی سے خانۂ خدا پر بھی تسلط کیا ہے۔ یہاں تک کہ شمع حرم جو ضلالت سوز تھی خود قشقہ لگائے ہے۔ یہ از دنیا کی باتیں ہیں یہ عشق کے پردے میں گھاتیں ہیں معشوق اپنی نیرنگی سے عاشق کو دھوکے میں ڈالنا چاہتا تھا۔ عاشق عالم حیرت میں گرفتار اتفاقاً "آہوے رم خوردہ" سے دوچار ہوتا ہے اور اُسکے جذبات یوں الفاظ کی شکل اختیار کرتے ہیں کہ ؎

پھیلا ہے کفریاں تک کافر ترے سبب سے　　　　شمع حرم بھی دے ہے ماتھے پہ اپنے ٹیکا

لیکن یہ شاک ایمان کفر کیا ہے۔ ؎

بت پرستی کفر یاں دل کی گرفتاری ہے درد　　　　چاہیے جسکو لگے اُسکو صنم کہنے لگے

سچ ہے ؎ عشق ازیں بسیار کردست و کند　　　　سبحہ را زنار کردست و کند

طلب صادق ہو تو انسان کو انکاری ہو کر اقراری بنا ہوتا ہے۔ کافر ہو کر ایمان نصیب ہوتا ہے۔ لا الٰہ۔ الا اللہ میں یہی راز مضمر ہے کفر و ایمان یونہی بغلگیر رہتے ہیں۔

"ورائے شاعری" کی ایک مثال یہ شعر ہے۔ ؎

وہ مرے چاہنے کو کیا جانے　　　　یہ سندیسہ سنا دیا کس نے

اثر کے لحاظ سے شعر نہیں نشتر ہے۔ عاشق کے دل و دماغ کا آئینہ ہے جو خیالات عاشق کے دل میں ایسے موقع پر پیدا ہوتے ہیں جبکہ معشوق اُسکے راز سے باوجود اخفائے حال آگاہ ہو گیا ہو اس سے بہتر طریقے سے ادا نہیں ہو سکتے۔

میر درد کا کلام ایسے پاکیزہ اشعار سے پُر ہے جو صوفیانہ شاعری کے لئے زیب عنوان ہیں جو اُردو شاعری کے مطلع و مقطع کے لئے باعث نازش ہیں۔ جو سر دیوان پر بجائے بسم اللہ لکھے جا سکتے ہیں جن کی مثال یہ شعر..... شعر نہیں اسم اعظم ہے ..... جو نظم و نثر کی قیدوں سے بالاتر ہے۔ ؎

اگر بے حجابانہ وہ بُت ملے غرض پھر تو اللہ ہی اللہ ہے

لیکن اس اسم اعظم کی تاثیر اس ایمان پر منحصر ہے۔ لاالٰہ الا اللہ۔ لاموجود الا اللہ۔ لاموثر فی الوجود الا اللہ شعر کا حُسن تصوف و تغزل کی آمیزش سے دوبالا ہو گیا ہے لیکن تغزل کا رنگ بہت ہلکا ہے۔ آب و آئینے بار یک پردہ سے معشوق حقیقی کا پرتو جمال صاف نظر آرہا ہے۔ پہلے مصرعہ میں ایک شرط ہے اور دوسرے میں ایک واقعے کی خبر۔ خبر آئندہ کے متعلق ہے لیکن حسن یقین کے ساتھ اور جس انداز میں خبر دی گئی ہے وہ پتہ دیتے ہیں کہ راوی یا مخبر پر یہ واقعہ گزر چکا ہے وہ خود منزل شہود تک پہونچ گیا ہے اور دوسروں کو دیدار یار کی بشارت دے رہا ہے شعر میں اللہ ہی اللہ ہے کی تکرار سے حیرت و استعجاب پیدا کیا ہے لیکن یہ حیرت حیرت مطلق ہے، جو ذات مطلق سے مخص ہے۔ اللہ ہی اللہ ہے میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ حقیقت سے اظہار حقیقت کرنا علم و عرفان کی آخری منزل ہے۔ جب یقین ذہنی اور لفظی (صورتی) کی تفریق نہیں رہتی وجود اعتباری حقیقت میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس وقت سب سے بڑی دلیل ادراک بے دلیل ہے یعنی خدا کیوں ہے؟ کیونکہ خدا ہے، خدا کیا ہے؟ خود خدا ہے لیکن یہ کب۔ ؎

اگر بے حجابانہ وہ بُت ملے غرض پھر تو اللہ ہی اللہ ہے

مسائل تصوف جس کثرت سے میر درد نے نظم کئے ہیں اُن کا عشر عشیر بھی دوسرے شعرا کے یہاں نہیں ہے یہی نہیں کہ ایک مضمون کو کئی کئی طریقوں پر باندھا ہے بلکہ یہ تغیرات تصوف کے دقیق مسائل کی گرہ کشائی کرتے ہیں۔ ان میں شاعرانہ خوبیوں کا خیال رکھا ہے جس سے کلام میں حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ اکثر پوری پوری غزلیں معرفت کے بیاں سے مالامال ہیں۔ غزل عموماً چھ سات بیت سے زائد کی نہیں ہوتی۔ تعداد کی یہ کمی درد کے اعلیٰ ذوق کا پتہ دیتی ہے۔ کلام سارے کا سارا آمد ہے۔ بھرتی کا کوئی شعر نہیں۔

ایک موقع پر عشق صادق کی کاوشوں اور سختیوں کا ذکر کرتے ہیں کہ ؎

مجھ کو تجھ سے جو کچھ محبت ہے　　یہ محبت نہیں ہے آفت ہے
لوگ کہتے ہیں عاشقی جس کو　　میں جو دیکھا بڑی مصیبت ہے

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر کرتی ہے۔ عبارت کی صفائی قابل داد۔ دونوں شعروں کا مضمون ایک ہے، اثر بھی ایک ہے، لیکن انداز بیان کس قدر مختلف ہے۔

مآل زندگی کو کن زوردار لیکن سادے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ لب و لہجہ سے یاس ٹپک رہا ہے۔ سہل ممتنع اسی کا نام ہے؟ ؎

تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے　　جس لئے آئے تھے سو ہم کر چلے

انسان کو شمع سے کس قدر پاکیزہ اور سچی تشبیہ دی ہے۔ چشم تر اور دامن تر کے ٹکڑے غضب کے ہیں۔ ؎

شمع کے مانند ہم اِس بزم میں　　چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

مرد مومن کے لئے مایوس ہونا ایمان کی خرابی کا ثبوت ہے۔ ایمان کے لئے شعلۂ دل کا استعارہ لانا دردؔ سے اہل دل کا کام ہے۔ شعر میں لفظ یاس جس کی ضو ایمان ہے قابل غور ہے۔ ؎

شعلۂ دل کو ہر گھڑی لے دم یاس مت بجھا　　اپنی بساط میں تو یاں ایک یہی چراغ ہے

معرفت آلٰہی کا حصول بذریعۂ عقل محال ہے کیونکہ اوّل تو سے ہی پرے منزلِ ادراک سے اپنا مسکن ہے دوسرے یہ کہ معرفت باری بغیر ترک خودی حاصل ہونا معلوم اور عقل کی حالت یہ ہے کہ ؎

باہر نہ آسکی تو قید خودی سے اپنی　　اے عقل بے حقیقت دیکھا شعور تیرا

اسی مضمون کو الفاظ بدل کر کس قدرت سے نظم کرتے ہیں کہ ؎

یا رب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں　　دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

پھر معقولیت پسندوں کو جو دلائل کے ذریعہ سے خدا کی ہستی ثابت کرنا چاہتے ہیں مشورہ دیا ہے کہ ؎

گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا حصول　　دل سے اٹھا غلاف اگر تو اٹھا سکے

کیونکہ ذات باری کے اقرار سے جو فائدے ہیں وہ بغیر عارفیت حاصل نہیں ہوتے۔ دوسرے یہ کہ اُن کے نزدیک ؎

بند احکام عقل میں رہنا　　یہ بھی اک نوع کی حماقت ہے

اسی لئے بقول اقبال مرشد کامل کی یہ تعلیم ہے کہ ؎ ہرچند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش ؎
یہ وہ منزل ہے کہ جہاں عقل و علم سب سرفگندہ ہیں یہیں کملی والے کی برتری اور فلسفیوں کی ابتری ظاہر
ہوتی ہے۔ سچ ہے۔ ؎

جو فلسفیوں سے حل ہوا جو نکتہ وروں سے کھل نہ سکا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

یہ چند اشارے کیا تھے جو پائے حق کے دل پر جو پردے پڑے تھے انھیں اٹھا دینا تھا لیکن اسکے لئے مرشد کامل
کی ضرورت ہے۔ اسی وجہ سے تو کہا تھا کہ ؎ دل سے اٹھا غلاف اگر تو اٹھا سکے ؎ یہ غلاف زنگ خودی ہے،
جو شیشۂ دل پر لگ گیا ہے، اسکا علاج خود فراموشی ہے۔ صرف یاد خدا سے کام نہیں بنتا کہ ؎

غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

لیکن وہ کون باہمت ہے کہ جس کے نقش قدم پر چل کے اس کٹھن منزل کو طے کیا جائے۔ صرف شراب ہمہ اوست
سے بیخودی اس مرحلہ میں مدد کر سکتی ہے۔ ؎

طریق ذکر تو ہے دردؔ یاد عالم کو
طرح بتایئے کچھ اپنے تئیں بھلانے کی

یہ امر مسلمہ ہے کہ عاشق کا وجود عشق سے ہے۔ عشق کے سوز و ساز کے لئے ہجر لازم ہے۔ وصل معشوق عاشق
کے لئے پیام فنا ہے۔ عشق وہ آزار ہے جو عاشق کے ہر مرض کا علاج ہے بقول اقبال ؎

ہوں وہ بیمار جو ہو فکر مداوا مجھ کو
درد چپکے سے یہ کہتا ہے کہ درماں ہوں میں

درد ہجر عشق کے وجود کا ضامن ہے وصل معشوق یا قرب الٰہی عاشق کی ہستی کو ختم کر دیتا ہے تاہم
طلب صادق رکھنے والے کب ان قوتوں کو خطرے میں لاتے ہیں۔ دردؔ نے ایسے والہ و شیدا کی سرگزشت
زبان سوز سے شمع و پروانہ کے استعارہ میں بیان کی ہے۔ ساتھ ہی خود پروانہ کی ہست و بود کو چند مصرعوں
میں پیش کیا ہے۔ ؎

کاش تا شمع نہ ہوتا گزر پروانہ
تم نے کیا قہر کیا بال و پر پروانہ

شمع کے صدقے تو ہوتے ابھی دیکھا تھا ہے
پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثر پروانہ

شمع تو جل بجھی اور صبح نمودار ہوئی
پوچھوں اے دردؔ میں کس سے خبر پروانہ

مرزا اکڑو

(جناب سید آفاق حسین صاحب رضوی)

کچھ دن کی بات ہے لکھنؤ کے محلہ سیر بخارا میں ایک صاحب مرزا بیدار بیگ رہتے تھے زمانے نے اُنکے حالات کو دیکھتے ہوئے اُن کا نام مرزا اکڑو رکھ چھوڑا تھا۔ باپ بیچارے تیچہ بندی پر گزر اوقات کر گئے۔ دادا نواب کرمان علی خاں کے یہاں باورچی کے مددگار تھے۔ پردادا نواب فغفور الدولہ کے یہاں بٹیروں کو دانہ دینے پر مامور تھے۔ کہیں سے میر مچھلی کے بھی عزیز بن بیٹھے تھے جس کو اکثر اپنی بیراکی کی سند میں پیش کیا کرتے تھے۔ بغدادی قاعدہ کے پہلے صفحے تک پڑھے تھے اور کہاں تک لکھے تھے یہ کسی طرح نہ معلوم ہو سکا۔ بڑی تحقیق کے بعد اتنا پتہ چلا کہ مرزا چار برس تک بغدادی قاعدہ پڑھا کئے تھے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سننے میں آیا کہ کبھی کسی نے انکو پہلا ورق اُلٹتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن اگر کسی نے پوچھ دیا کہ کیوں میاں لڑکے ابھی تک پہلی ہی سطر پڑھ رہے ہو تو فوراً جواب دیتے تھے کہ جی نہیں پڑھ تو خدا معلوم کیا کیا گیا ہوں مگر یہ میرا اصول ہے کہ جب پڑھنے بیٹھتا ہوں تو آموختہ ضرور دوہراتا ہوں۔ لکھنے کے متعلق کوشش بہت کی مگر کسی طرح نہ معلوم ہو سکا۔ مہینے میں ایک دفعہ پنشن لیتے وقت دستخط کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ مگر مرزا ہمیشہ یہ کہکر ٹال دیا کرتے تھے کہ میاں کیوں قلم دوات کا جھگڑا کرو گے۔ نہ معلوم قلم کیسا ہو، روشنائی کیسی ہو پھر کہیں کاغذ کی خرابی سے قلم ٹھیک چلے یا نہ چلے۔ یہ کمبخت لندنی کاغذ کچھ ایسا چلا ہے کہ جب تک روشنائی اپنے ٹھیک رنگ پر نہو اور قلم کی نوک پلک بالکل درست ہو اُس وقت تک ٹھیک لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اب اتنی فرصت کس کو ہے جو سات روپلی کے لئے دو گھنٹے اسکی درستی میں لگائے اور پھر بدنامی مول لے۔ سنتر کام ہیں لاؤ جلدی سے انگوٹھے کا نشان لگا دوں۔ یہ کہکر انگوٹھے کا نشان لگاتے اور روپیہ لے کر چل دیتے تھے۔

نواب رفیع الدولہ فہیم کے مکان کی پشت پر ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی اُسی میں رہتے تھے۔ ایک چھٹیل مرغی اور دو نر کبوتر جو انھیں نواب صاحب کا عطیہ تھا ان کی بھی ڈھابلیاں اسی کوٹھری میں تھیں۔ فن کبوتربازی میں مہارت تو کافی تھی مگر یہ اتفاق کہ اپنے کبوتروں کو ہمیشہ جوڑا ہی سمجھا کیے اور ان کے انڈے نہ دینے کا ہمیشہ افسوس ہی رہا۔ نوکری کو وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ سات روپیہ ماہوار ان کے پردادا کی پنشن چلی آتی تھی۔ اُسی پر دارمدار تھا۔ قناعت اور توکل عطیہ الٰہی تھا جس سے ہر وقت مگن رہتے تھے۔ کسی نے اگر ذرا بھی اپنی مفلسی کی شکایت کی تو فوراً کہتے کہ مجھے دیکھو سات کی آمد اور چار جانیں، آخر کیا میں کھاتا نہیں ہوں، پیتا نہیں ہوں، کیا نہیں کرتا ہوں۔ بھائی دل ہے غنی تو کیا ہے کمی۔

مزاج میں ذرا غصہ اور شان ضرورت سے زیادہ رکھتے تھے پھر بھی ایسے آدمی تھے کہ شہر کا کیا بچہ کیا بوڑھا۔ کیا غریب کیا رئیس، کیا عالم کیا جاہل سب ان سے اچھی طرح واقف تھے۔ کہیں کسی طرح کی روک ٹوک نہ تھی۔ ہر مجمع اور ہر جلسے میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ چنانچہ انھیں صحبتوں کی وجہ سے مرزا کی معلومات بہت وسیع ہو گئی تھیں۔ ہر فن اور ہر علم کے موجودہ اور قدیم مشہور لوگوں کے ناموں سے مرزا صاحب کے کان ضرور آشنا تھے۔ مگر آخر عمر تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کون کس لئے مشہور رہے۔ مرزا کی نازک مزاجی اور زبانی زور دل لگی باز اہل شہر کے ہاتھوں ہر وقت اپنے بھرپور شباب پر رہتا تھا۔ ورنہ حقیقت پوچھو تو اُن میں اور ایک نا سمجھ بچے میں جو ایک فرضی نام "جُوجُو" سے اپنی انتہائی ضد پر بھی سہم جاتا ہے کوئی فرق نہ تھا۔

اپنے خاندانی ہونے پر بھی اکثر فخریہ لہجے میں قصیدہ خوانی کیا کرتے تھے۔ ادھر کوئی بات نکلی، اُدھر شجرہ کھلنے لگتا تھا۔ یہیں تک اکتفا نہ تھی بلکہ جتنی چیزیں بھی اُن سے تعلق رکھتی تھیں۔ قریب قریب سب کا شجرہ نوک زبان تھا۔ اپنے زمانے کے ایک وضعدار آدمی تھے۔ گزی کا پردے دار لمبا کرتا۔ اُسی کی قالب نما ٹوپی، گاڑھے کا ذرا ڈھیلی مُہری کا پائجامہ، کچھ چرحھویں اور بوٹ کے درمیان کا جوتا۔ گردن سے نیچے پٹے، ہاتھ میں بانس کا ڈنڈا جو چوب دستی کے نام سے موسوم تھا، مرتے مر گئے مگر زندگی بھر نہ اپنی پوشاک بدلی، نہ وضعداری میں کوئی فرق آنے دیا۔ کیا جاڑا کیا گرمی کیا برسات، سال کے بارہ مہینے ایک طرح سے گزار دیتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ اب وضعدار لوگ کہاں صرف ایک مرزا کا دم رہ گیا ہے جو

اس کو نباہ رہا ہے۔ اسکے بعد اللہ کا نام ہے۔ یہ کوئی وضعداری سی وضعداری ہے ہر مہینے کپڑے بدلے جارہے ہیں۔ ہر ہفتے حجامت بن رہی ہے کہیں وضعداری یوں قائم رہ سکتی ہے۔ جب جی چاہے دو ٹوپیاں ایک ساتھ سلوا دیکھو کچھ نہ کچھ فرق ضرور نکلیگا۔ وضعداری تو وہی کہ جو کپڑے ایک دفعہ پہن لئے وہ بس جامۂ ہستی کے ساتھ اُترے۔

مرزا صاحب کی خود تصنیف چوب دستی بھی عجیب نوعیت رکھتی تھی۔ ایک پھٹا ہوا کھوکھلا بانس جگہ جگہ باندھ سے بندھا ہوا۔ اوپر سے ٹول کا غلاف چڑھا ہوا۔ اُس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ زندگی بھر کبھی ٹیک کر نہیں چلے۔ کہیں ذراسی ٹھیس لگ گئی تو بوسے پر بوسے لے ڈالے۔ نہ معلوم کیونکر کسی سورہ کی ایک آیت یاد کر بیٹھے تھے جسکو اکثر اپنی عربی دانی اور نمازی ہونے کے ثبوت میں پیش کیا کرتے تھے۔ دن میں کئی دفعہ پڑھ کر چوب دستی پر دم کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شامت اعمال سے کسی صاحب کا دھکا آپ کی چوب دستی کے لگ گیا۔ پھر کیا تھا آؤ تو جاؤ کہاں۔ آپے سے باہر ہو گئے بھویں تان کے، ناک چڑھا کے بولے "اندھے دیکھ کے نہیں چلتا۔ بڑوں بڑوں کو دیکھا ہے۔ پہچان کے باتیں کیا کر۔ اوقات سے رہ۔ جانتا نہیں کہ اسکی نسل عصائے عیسیٰ سے ملتی ہے۔ دیکھ مردود ابھی سینے ہی پر دکھائے دیتا ہوں۔ کھڑا رہ، میں نہیں جو تجھ کو دنیا کے اُس پار نہ پہونچا دوں۔" غرض کچھ نہ پوچھیے۔ مخاطب کا پتہ نہیں مگر مرزا ہیں کہ گرمائے چلے جاتے ہیں غصہ کا یہ عالم کہ بجائے آستینیں چڑھانے کے پائجامے کی مُہریاں چڑھائے رکھے دیتے ہیں مُنہ سے کف جاری ہے۔ کبھی جوتا اُتارتے ہیں کبھی پہنتے ہیں۔ کبھی کرتے کے دامن پائجامے کے اندر کرتے ہیں کبھی باہر۔ ٹوپی کبھی کسی رُخ رکھتے ہیں کبھی کسی رُخ۔ مونچھیں ہیں کہ بٹے ڈالتے ہیں غرض جب تک ورد اور لفظوں کا سرمایہ اُنکے ذہن میں رہتا غصہ کا یہی عالم رہتا تھا۔ چاہے گفتگو میں کوئی ربط ہو یا نہ ہو۔ جملے برمحل ہوں یا نہ ہوں مگر زبان قینچی کی طرح چلے ہی جاتی تھی۔ ادھر یہ سرمایہ ختم ہوا اُدھر غصہ غائب۔ حافظے کا یہ عالم کہ ابکھڑے سوچ رہے ہیں کہ آخر ہم کیوں خفا تھے اور کس سے خفا تھے۔ حالانکہ بقول مرزا صاحب (یہ وہ حافظہ ہے جو اپنے سال بھر کے سِن کا کُل حال بغیر سانس لئے شروع سے آخر تک حرف حرف بتا سکتا ہے۔) مرزا اسی

غوطہ میں کھڑے تھے کہ ایک شخص جو ان کی طبیعت سے خوب واقف تھا اور تھوڑی بہت بے تکلفی بھی تھی، اودھر آنکلا۔ جب قریب آیا تو کہنے لگے کہ بھئی کیا بتائیں وقت کی بات حالانکہ میرے حافظہ کی کوئی خطا نہیں، یہ مجھی کو اس وقت کچھ ہو گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت میں یہاں کیوں کھڑا ہوں۔ وہ بولا کچھ نہیں، میں نے آواز دی تھی۔ اسی لئے آپ کھڑے ہو گئے ہونگے۔ ہاں آواز ذرا فاصلے سے دی تھی۔ کہئے گھر چل رہے ہیں۔ مجھے بھی اُسی طرف جانا ہے۔

گھر پہونچ کر مرزا نے مرغی اور کبوتروں کو چارہ پانی دیا اور نخاس چل کھڑے ہوے۔ آندھی آئے پانی برسے مگر مرزا کا مرغے کی تلاش میں روزانہ نخاس جانا نہایت ضروری تھا لیکن زندگی بھر مرغی کا جوڑا نہ ملا سکے۔ بلا مبالغہ ہزاروں ہی مرغے تو دیکھے ہونگے لیکن کبھی کوئی نظر پر نہ چڑھا۔ ایک دفعہ ایک مرغ کو دُور سے دیکھتے ہی کہنے لگے کہ ہاں شاید یہ کچھ اُس تک پہونچ سکے۔ جلدی سے مجمع کو چیرتے پھاڑتے پہونچے کچھ اور لوگ بھی دیکھ رہے تھے مگر آپ نے جلدی سے لے دیکھنا شروع کر دیا دیکھتے ہی دیکھتے ہی لگے ناک بھویں چڑھانے۔ چپکے چپکے کہنے لگے کہاں وہ اور کہاں یہ' چہ پدی چہ پدی کا شوربہ۔ لو بھائی لو اپنا مرغا لعنت ہے اس نخاس پر مدتوں سے آرہا ہوں مگر آج تک کوئی ایسا بھی ملا کہ اُس سے اُنیس ہی ہوتا تم لوگوں کے مارے ناک میں دم ہے! ادھر اُدھر سے جہاں کہیں بھی بدنسلے سے بدنسلا مرغا ملا اور نخاس میں لے بیٹھے۔ مفت میں شہر کو بھی بدنام کرتے ہو۔ اگر کوئی باہر کا شریف آدمی آئے تو تم کو کیا تھوکے گا اور کیا نخاس کو کہیگا۔ نہ ہوئی شاہی جو اس وقت تم سب کو بتا دیتا۔

مرزا کی قابلیت تو جیسی تھی ویسی تھی مگر ہر علم اور ہر فن کا دعویٰ ضرور تھا۔ علمی حیثیت سے اپنے کو کسی سے کم سرمایہ دار نہیں سمجھتے تھے۔ مشکل سے مشکل مسئلوں پر اس طرح رائے دیتے تھے کہ بقراط وقت معلوم ہوتے تھے۔ اگر کسی نے ان کی بقراطیت پر اعتراض کر دیا تو معترض کو چھوڑ کر گڑے مُردے اُکھاڑنے لگتے تھے۔

ایک دن کی بات ہے کہ قاضی میر دیانت علی کے مکان پر کچھ لوگ بیٹھے تھے اور یہ شعر؎

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

معرضِ بحث میں تھا کہ مرزا آپہونچے۔ اُن کا آنا تھا کہ لوگوں کے رُخ اُن کی طرف پھر گئے۔ اور یہ بحث

مسئلہ میں اُن کی بھی رائے لی جانے لگی۔ مرزا اکڑ اکڑ کر ذرا اُستادانہ شان لیے ہوئے مطلب بتا ہی رہے تھے کہ ایک صاحب نے اُن کی رائے سے اختلاف کر دیا۔ اب آؤ تو جاؤ کہاں۔ شروع سے آخر تک جو کچھ اُن کے مُنہ میں آیا سبھی کو کہہ ڈالا۔ کبھی ارجن کی خبر لے لی۔ کبھی بھیم کو لے ڈالا۔ کبھی سہراب کے چیتھڑے اُڑا ڈالے۔ کبھی حافظ کو اندھا بنا ڈالا۔ کبھی تان سین پر آ رہے اور رستم کی تو شامت ہی آ گئی۔ رستم، رستم، بڑے نام، بڑے نام۔ ارے میاں طفل مکتب۔ اگر اس وقت ہوتا تو بیس برس تک پڑھاتا۔ پھر بھی اللہ چاہتا تو پہلے ہی صفحے پر دکھائی دیتا۔ میاں ابھی بچے ہو، کچھ دن اور کھاؤ پیو۔ خدا کی شان۔ اس قابلیت پر یہ جرأت۔ مرزا ابھی زوروں ہی پر تھے کہ ایک صاحب نے کچھ سعدی کے متعلق پوچھ دیا۔ کہنے لگے اجی لونڈا تھا لونڈا۔ کل کی بات ہے ربا جائے گا تا پھرتا تھا کسی ہم ایسے نے خدا ترسی کی تو ایک آدھ پیسہ لے بھاگا۔ آج سنیے تو بڑے نام۔ ٹاپے والی گلی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا، کفن تک کو پیسہ پاس نہ تھا، وہ تو کہیے میں پہونچ گیا نہیں تو چیل کوؤں کے کام آ جاتا۔ ایک صاحب بولے کہ اچھا مرزا صاحب فردوسی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جو اتنا بڑا شاہنامہ لکھ گیا۔ مرزا صاحب اپنی بہادری کے سلسلے میں چونکہ رستم اور سہراب سے عقیدت رکھتے تھے اس لئے شاہنامہ اور فردوسی سے بھی کچھ کچھ واقف تھے۔ مگر غصے کی جھانجھ میں نہ اردوسی کو دیکھتے تھے نہ فردوسی کو۔ کہنے لگے بھیا بس رہنے دو میرے محلّے کا ایک ایک لونڈا ایسی ایسی غزلیں کہتا ہے کہ میاں فردوسی کے پورے دیوان پر بھاری ہوتی ہے۔ کہنے لگے شاہنامہ شاہنامہ اجی اس میں ہے کیا۔ فلاں فلاں بادشاہ تھے، یہ وہاں رہتے تھے۔ وہ یہاں فلاں کی شادی فلاں کے ساتھ ہوئی۔ فلاں اور فلاں سے لڑائی ہوئی۔ فلاں مارا گیا۔ الحمدللہ خیر صلاح۔ اتنی سی بات اور پچیس تیس برس۔ لو دیکھو میں نے تو چند ہی منٹ میں تمھارے سامنے کھڑے ہی کھڑے کہہ دی۔ اتنے میں ایک صاحب اُٹھے اور مرزا کی بہت زوردار الفاظ میں تائید کی اور مجمع سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ باتیں صرف سُننے اور یاد رکھنے ہی کے لئے نہیں ہیں ان پر بار بار غور کیجیے اور مزے لیجیے۔ ایسے لوگ ہوتے کہاں ہیں۔ یہ آپ حضرات کی خوش قسمتی ہے کہ مرزا صاحب کا سا وسیع النظر آدمی اس زمانے میں پیدا ہوا۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ موقع کو غنیمت سمجھ کر کچھ اور مستفید ہو لوں۔ کیا عرض کروں مرزا صاحب اگر زحمت نہ ہو

تو کچھ عرفی کے متعلق بھی اظہار خیال کر دیجیے کہ آخر یہ شخص کیسا تھا۔ اجی لاحول ولا قوۃ، کیسا تھا انڈے بیچتا تھا اور کیسا تھا۔ عرفی عرفی ابھی کل کی بات ہے ہمارے یہاں انڈے بیچنے لایا کرتا تھا۔ کچھ دنوں سے ادھر پورب کی طرف چلا گیا تو نہ جانے کیا بن بیٹھا۔ میاں اگر کبھی تمھاری نظر پڑے تو ذرا مجھکو بھی بتانا۔ سارا شجرہ کھول کے رکھ دونگا۔ اے میاں یہ سب کے سب یوں ہی ہیں۔ ہاں اور سنیے ایک صاحب ادھر پچھاں کی طرف کوئی ارسطو نامے گزرے ہیں۔ بڑے زور بڑے شور۔ جہاں جائیے انکی سینک کھڑی ہے۔ نام سنا نہیں کہ تھرا گئے۔ آج کل ہوتے تو گنو کے اکھاڑے کا ایک پٹھا ہی کافی تھا پچھے واللہ چھکے۔ یہ اگلے زمانے کے لوگ بھی خوب تھے جس کو سن پایا کہ ہاں یہ کاغذ کو سیاہ کرلیتا ہے۔ لگے تعریفوں کے پل باندھنے۔ وہ کیا جانے کچھ کا لہنے والا، میاں اس مرتبے پر پہونچنے کے لئے سیکڑوں من گھی کھانے کی ضرورت ہے۔ واللہ تمھارے سر کی قسم سیروں تو میں کلاک کے ریشے اور ڈھیروں چراغ کا کاجل کھا گیا ہوں جب جا کے کہیں یہ دن نصیب ہوا ہے۔ تو یہ تو بڑا بول تو نہیں بولتا مگر جس سے جی چاہے مقابلہ کروا لو۔ اب بھی اللہ کے دیے سے وہ مرغی اور کبوتر پال رکھے ہیں کہ ایک کے یہاں نہ نکلیں گے۔

غرض ایک صاحب نے جب دیکھا کہ مرزا کا زور کسی طرح کم نہیں ہوتا تو وہ اٹھے، مرزا کا ہاتھ پکڑا اور باتیں کرتے کرتے گھر سے باہر نکل آئے۔ کہنے لگے کہ مرزا صاحب آپ بھی خوب ہیں، کس جاہل کے منہ لگتے ہیں۔ کہاں آپ اور کہاں وہ۔ آپ کی شان تو اس سے کہیں بالاتر ہے۔ کوئی نسبت ہوتی تو گفتگو کی جاتی۔ ایسے لوگوں سے کچھ کہنا اپنی ہی توہین کرنا ہے۔ کچھ بھی گہرے ہوتے تو ان کو ٹٹولا جاتا۔ کہ آخر کتنے پانی میں ہیں۔ میں تو یہی دیکھ کر خاموش ہو رہا ورنہ کہیں یہ ممکن تھا کہ میں اور آپ کا ساتھ نہ دیتا۔ ایک جاہل کی بات کا اتنا اثر معلوم نہیں کہ آپ اس وقت کس خیال میں تھے ورنہ مجھ کو تو آپ سے یہ امید نہ تھی۔ مرزا صاحب تھوڑی دیر تو یہ سب سنتے رہے آخر نہ رہا گیا کہنے لگے کہ بس میاں بس تم سب کو دیکھ لیا۔ وقت پر کچھ نہ بولے اب چلے ہو باتیں بنانے۔ یہاں تو عزت پر آ بنی تھی۔ اگر ذرا بھی میں خاموش رہ گیا ہوتا تو کل کو تم ہی سب سے کہتے پھرتے کہ مرزا سوا کبوتر اور مرغی پالنے کے جانتا ہی کیا ہے۔ وہ تو کہو خیریت گزری، اگر بچا نے ذرا بھی پلٹ کر جواب دے دیا ہوتا تو مرزا پھر سینے ہی پر دکھائی دیتا۔ اور ہاں یہ تم نے کتنے

پانی میں کیا کہا۔ مرزا کو خالی خشکی ہی کا شیر نہ سمجھنا جہاں جی چاہے اڑا دیکھو۔ اللہ چاہے تو ہر جگہ زمین ہی دیکھنا پڑے گی۔ خدا نہ کرے کہ اس کو کبھی پانی میں قدم رکھنا پڑے ورنہ یہ جتنے بھی میاں مٹھو بنے بیٹھے ہیں سب کے لنگوٹ ہاتھ ہی میں دکھائی دینگے۔ میں تو کہتا ہوں کہ بھئی ہوگا کیوں کسی کا بھرم کھولیں جو جس حال میں خوش ہے خوش ہی رہنے دوں۔ مگر اب قرائن کچھ اور کہتے ہیں۔ آج کو تم نے یہ کہہ دیا۔ کل کو کوئی دوسرا کچھ کہہ بیٹھے تو پھر آخر اسکا نتیجہ کیا ہوگا۔ لو اور سنو خوب یاد آیا۔ آج کئی دن کی بات ہے، میاں تجھ جو بھی کچھ الجھ پڑے تھے راجہ کی رانی تو تم نے بھی سنی ہوگی۔ ان کے باپ ایک ایسی کے رانا گیا ہو گئے کہ لگے مرزا کے منہ لگنے۔ یہاں بھلا کس کی دال گلنے والی اور پھر جہاں عزت کا معاملہ ہو۔ پچاسوں ہی تو سنا ڈالیں۔ تاؤ میں آکر دریا تک پہنچ ہی گیا تھا کہ لوگ سمجھا بجھا کر صاحبزادہ کو واپس لے آئے نہیں تو سب کی قلعی کھل جاتی۔ مگر بکرے کی ماں کب تک خیر منائیگی کسی نہ کسی دن یہی ہونا ہے۔

مرزا کی پیراکی کے زور نہ پوچھیے۔ جہاں دیکھے رجز خوانیاں ہو رہی ہیں۔ کبھی گومتی کو روندے رکھے دیتے ہیں، کبھی گنگا کو منجھائے ڈالتے ہیں۔ کبھی سمندر کو گھنگھولے پھینکے دیتے ہیں۔ غرض کہ وہ کمالات حاصل ہیں جو صرف سننے ہی میں آتے ہیں دیکھتے میں تو کبھی حوض کے پاس بھی نہ دکھائی دیے۔ ایک مرتبہ ہمت کر کے شیخ ولی کے حوض میں پیر دھونے بیٹھے تھے۔ حوض میں کچھ مچھلیاں بھی پڑی تھیں۔ جب کوئی مچھلی ان کو اپنی طرف آتی دکھائی دیتی تو جلدی سے پیر پانی سے باہر نکال لیتے۔ ایک دفعہ ایک مچھلی کی دم آپ کے پیر میں لگ گئی اچھل پڑے۔ فوراً پیر نکال حوض سے دور کھڑے ہو گئے۔ شیخ ولی صاحب کا نوکر مرزا صاحب کی اس ادا پر بے اختیار ہنس پڑا مگر مرزا کے فرضی زور کے رعب نے اسکی ہنسی قائم نہ رہنے دی۔ مرزا کو جاتے ہوئے دیکھ کر فوراً ہاتھ جوڑ کر بولا کہ حضور خیر تو ہے۔ کیا سبب ہوا۔ ابھی تو آپ تشریف لائے اور ابھی چلے۔ مرزا کہنے لگے کہ کچھ نہیں۔ پیر دھونے آیا تھا مگر بھئی حوض میں پیر دھونا مجھے کچھ اپنی شان سے پست معلوم ہوتا ہے۔ کئی دفعہ ارادہ کر کے رہ گیا مگر اب دریا ہی پہ دھوؤنگا۔ یہ کہہ کر مرزا گھر کی طرف چل دیے۔ راستے میں ملے میر فیض ان کی صورت دیکھ کر ان کو دل لگی کی سوجھی اور ان کے پیچھے ہو لیے۔

مرزا کا معمول تھا کہ جب اپنی کوٹھری میں جاتے تو اندر سے کنڈی ضرور لگا لیتے تھے جیسے ہی مرزا کوٹھری کے اندر گئے اور دروازہ بند کر کے کنڈی لگانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میر فیض نے دروازے کی چوکھٹ پر اپنا ڈنڈا زور سے پٹک دیا۔ مرزا کی ڈر کے مارے جان سوکھ گئی گھگھی بندھ گئی۔ کنڈی ہاتھ سے چھوٹ گئی اور بھڑ بھڑا کر زمین پر آ رہے۔ میر فیض نے جب گرنے کی آواز سنی تو کچھ دیر رک کر مرزا کو آواز دی اور دروازہ کھول دیا۔ دیکھا تو مرزا صاحب اوندھے پڑے ہیں۔ چہرے سے وحشت نمایاں ہے۔ آواز کچھ کہہ رہی ہے۔ رنگ زرد ہو گیا ہے۔ غرض عجب عالم ہے۔ مگر میر فیض کو دیکھ کر مرزا کے دم میں دم آیا۔ کچھ دیر ٹھہر کر کہنے لگے کہ بھئی خوب ہوا تم بول دیے ورنہ غضب ہو جاتا۔ چوب دستی تک اٹھالی تھی۔ مجھے بھی تعجب تھا کہ مرزا کا مکان اور چور۔ بڑی خیریت ہوئی۔ خدا تمھاری عمر دراز کرے۔ واللہ تم اس وقت بال بال بچے۔ کیا بتاؤں جیسے ہی گھر میں قدم رکھا اس زور سے پیر میں موچ آگئی کہ کسی طرح نہ ٹھہر سکا آخر لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا کمبخت پیر کی موچ بھی غضب ہوتی ہے۔ اس وقت تو وہ تکلیف ہوئی کہ خدا ہی یاد آگیا۔ مگر میاں یہ تکلیف اس وقت بڑا کام دے گئی۔ ایک سید کی جان تو بچی۔ جاؤ جلدی سے درگاہ جاؤ۔ اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو پانچ پیسے کی کھٹیاں ضرور چڑھا دینا۔

غرض مرزا صاحب کی تمام زندگی ایسے ہی کارناموں کی غیر متناہی داستان تھی صفحات "ادب" میں اُن کی تفصیل کی گنجایش نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ مرزا جب تک جیے یوں ہی آن پر جان دیا کئے۔

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

رُباعی فرخ بنارسی

اب ناز بھی تیرا ناز رہنے کا نہیں　　کوئی خاص امتیاز رہنے کا نہیں
ہوتے جاتے ہیں عام جلوے تیرے　　سرمایۂ راز راز رہنے کا نہیں

غزلیات

جناب آرزو لکھنوی

جاتے کہاں ہیں آپ نظر دل سے موڑ کے
تصویر نکلی پڑتی ہے آئینہ توڑ کے

ٹوٹا ہی بند آب رُکے خاک سیلِ اشک
پچھتا رہا ہوں آبلۂ دل کو پھوڑ کے

پردہ عبث ہے دیدۂ بے امتیاز سے
آیا ہوں جلوہ گاہ میں آنکھوں کو پھوڑ کے

طاقت کہاں نفس میں کہ روکے جنوں کا جوش
دیوانہ بھاگا جاتا ہے زنجیر توڑ کے

اللہ رے زورِ ناز کہ نازک سی انگلیاں
دل مجھ سے چھین لے گئیں پنجہ مروڑ کے

نالاں خود اپنے دل سے ہوں یاں کوئی کیا کہوں
جیسے بٹھا گیا ہے کوئی پاؤں توڑ کے

حرصِ حصولِ جاہ کی شانِ فنا ہے اور
رکھ دیں پھلے درخت کو جس طرح جھنجھوڑ کے

کیا جانے ٹپکے آنکھ سے کس وقت خونِ دل
آنسو گرا رہا ہوں جگہ چھوڑ چھوڑ کے

شیشہ ہے دل کا چور تو کیا غم ہے آرزو
منہ انکا دیکھ لیتا ہوں ٹکڑوں کو جوڑ کے

جناب سید کاظم صاحب نشتر

ازل سے تا ابد جس کا بیاں ہے
وہ اس دل کی دو حرفی داستاں ہے

فلک پر ہے جو خونابہ شفق کا
وہ میرا ایک اشکِ خونچکاں ہے

نیستاں میں لگی ہے خود بخود آگ
الٰہی، نے میں کیا سوزِ نہاں ہے!

غریبی میں اسیری کی کہانی
شکستِ تارِ سازِ مطرباں ہے

تہیدستی میں مفلس کی جوانی
شبِ سرما میں ماہِ ضوفشاں ہے

ضعیفی میں جوانی کی ترنگیں
چراغِ صبحِ صادق کا دھواں ہے

حبابِ بحر ہے یہ زندگانی
نشاطِ کار اک موجِ رواں ہے

عجب ہے منظرِ گورِ غریباں
جدھر دیکھو اُدھر نیند کا سماں ہے

کہا حسرت نے ٹھنڈی سانس بھر کر
یہ اشکِ نشترِ یادِ رفتگاں ہے

جناب عزیز لکھنوی

اصولِ بندگی جانِ ادا قاتل سمجھتے ہیں
نہ سر کو سر سمجھتے ہیں نہ دل کو دل سمجھتے ہیں

تری کوشش ہم اے دل سعیِ لاحاصل سمجھتے ہیں
سرِ منزل تجھے بیگانۂ منزل سمجھتے ہیں

کریں کیا اُن سے شکوہ جو کسی کے دل جلانے کو
فروغِ گرمیِ ہنگامۂ محفل سمجھتے ہیں

جُھکانا آستاں پر سر کوئی مشکل نہیں لیکن
جبینِ بندگی کو ہم کب اس قابل سمجھتے ہیں

اگر دوزخ میں تجھ کو جھونک دیں احسان ہے اُنکا
دلِ سوزاں تجھے ہم بھی اسی قابل سمجھتے ہیں

لبِ اعجاز پرور ہاں یہی ہنگام جنبش ہے
مریضِ غم کا بچنا چارہ گر مشکل سمجھتے ہیں

ارادہ ہو تو دل مضبوط رکھ اے ڈوبنے والے
جب ایسا وقت ہو دھارے کو بھی ساحل سمجھتے ہیں

وفا کی حد دکھا کر جلنے والے دل خدا حافظ
تجھے بھی اک چراغِ کشتۂ منزل سمجھتے ہیں

کلیجا شق ہو دنیا دیکھ لے حالت اگر میری
یہ عالم ہو کہ وہ بھی رحم کے قابل سمجھتے ہیں

جنھیں معلوم ہے تیری نگاہِ ناز کا عالم
وہ اپنے ضبط کے دعوٰں کو خود باطل سمجھتے ہیں

عزیز افکارِ دنیا اور مشاغل شعر گوئی کے
اِحبّا کی محبت ہے جو اس قابل سمجھتے ہیں

جناب مانیؔ جائسی

ہاں مری موت بھی اک نوبتِ حیرانی ہے
بند ہے آنکھ کہ جلووں کی فراوانی ہے

چاہتی ہے کہ کرے غم کا مداوا غم سے
کس قدر عربدہ جو فطرتِ انسانی ہے

نفسِ اوّلِ الفت تھا دلیلِ مقصود
میں ہوں واماندۂ منزل یہ گراں جانی ہے

حدِ احساس سے اب ہے متجاوز غمِ دل
باش دشواریِ منزل کہ یہ آسانی ہے

کس کے دم سے ہے نمودِ اثرِ جلوۂ برق
کس کا آئینہ مری سوختہ سامانی ہے

بس ہوں ورنہ جبر کہ ہو قطع سلسلۂ غم
موت وقفہ سہی لیکن کوئی امکانی ہے

ماسویٰ اللہ ہیں دل بھی سہی لیکن مانیؔ
ماسوا کو ہے فنا۔ دل بھی کہیں فانی ہے

جناب فراق گورکھپوری بی اے

ابکے بھی یونہی اے جنوں کٹ گئے دن بہار کے
سینے میں پڑ کے رہ گئے داغ فراقِ یار کے

آنکھوں کو ملتے ناز سے لیتے ہوئے جمہائیاں
دیکھنے والے آئے ہیں کشتۂ انتظار کے

گو ترے رونے والے کی حسرتِ دل نکل گئی
راز مگر نہیں کھلے گریۂ زار زار کے

حال تو پوچھ لو ذرا۔ بام سے مسکرا کے کچھ
دیکھنے والے آئے ہیں طور کے جلوہ زار کے

تم کو میں جانتا ہوں آہ کیا ہوا امید زندگی
زندگی بھی تمھیں ہوا اور تم نہیں اعتبار کے

اوروں کو دے کے جام مے اب تو نہ آنکھیں پھیر لے
دیکھنے والے ہم بھی تھے نرگس پُر خمار کے

دشتِ عدم تک اے جنوں پہونچنے پائے ہم کہ دم میں اب
ہم نے اجل کو دے دیا جامۂ تن اُتار کے

سوئے فلک وہ ساقیا یاس بھری نظر تری
جب چلے دورِ آخری ساغرِ خوشگوار کے

پوچھو نہ رات بزم میں دیکھ گئے جو انقلاب
دیکھنے والے اے فراق گردشِ چشمِ یار کے

جناب للن صاحب رضی لکھنوی

رہی ہے عہدِ محبت میں ایک خو میری
کبھی زبان تک آئی نہ آرزو میری

تمھیں کہو دلِ عالم کو کس نے تڑپایا
یہ گفتگو تھی تمھاری کہ گفتگو میری

وہ دن بھی یاد ہیں جذبِ محبت ایک تھا جب
مجھے تلاش تری تجھ کو جستجو میری

نفس زباں دل و جاں چشم و روح محوِ خیال
نماز ہوتی ہے ہر وقت بے وضو میری

اسیرِ دل نہ ہو کیوں حرفِ آرزو میرا
گدا دبائی تو ہے کمبخت آبرو میری

زمانہ کہتا ہے لبیک میری باتوں پہ
ترے کلام سے ملتی ہے گفتگو میری

میری نظر سے حسینوں کا حُسن حسن ہوا
وہ خار ہوں کہ گلوں میں بسی ہے بو میری

تری تلاش میں طے ہو چکی بساطِ خیال
کہاں یہ ختم ہو دیکھوں یہ جستجو میری

جہاں میں کیوں غمِ دوست عزیز رضی
ازل سے درد نوازی رہی ہے خو میری

آثارِ ادبیہ

(جناب پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے)

ذیل میں مایوس کا کچھ کلام ایک پرانی بیاض سے نقل کیا جاتا ہے۔ انکی زبان اس قدر صاف ہے کہ یہ زمانۂ حال کے آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن اسی بیاض میں ان کا ایک طولانی نامۂ منظوم بھی ہے جو آیندہ پیش کیا جائیگا۔ اسکے آخر میں کاتب نے لکھا ہے "تمام شد، بتاریخ ۱۴ اگست ۱۸۲۱ء مطابق ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۳۹ھ۔" اس سے ظاہر ہے کہ مایوس کو گزرے ہوئے ایک صدی سے زیادہ زمانہ ہو چکا ہے۔ مایوس کا نام اس بیاض میں کہیں اعظم علی، کہیں اعظم علی خاں اور کہیں رضا علی لکھا ہے۔ بعض جگہ اعظم علی خاں اور رضا علی کے نام سے چند شعر لکھے ہوئے ہیں۔ مگر ان کا تخلص نہیں لکھا گیا ہے۔ بہرحال ذیل میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ نقل مطابق اصل ہے۔ "ادیب"

اعظم علی مایوس

جلد آ تیری انتظاری ہے ۔۔۔ دیکھ یاں تو نفس ہماری ہے

اعظم علی خاں

سیرِ چمن کو کل جو مرا رشکِ گل گیا ۔۔۔ بس دیکھتے ہی اس کے درِ باغ کھل گیا
بس رہ گیا وہ گور میں پھیلا کے دستِ شوق ۔۔۔ عاشق کے جب مزار پہ پڑھنے وہ قل گیا

رضا علی متخلص بہ مایوس

جگہ اس بت نے بتلائی جو آکر میرے مدفن کو ۔۔۔ زمیں نے کھول کر آغوش ڈھانکا اپنے دامن کو

رضا علی

گر سامنے آنکھوں کے مرا یار نہ ہووے ۔۔۔ پھر مرگ سے اپنی مجھے انکار نہ ہووے
جس روز نہیں جاتا ہوں گھر اسکے میں اک بار ۔۔۔ یہ ڈر مجھے رہتا ہے کہ بیزار نہ ہووے
یارب تری بخشش سے یہی مجھکو دعا ہے ۔۔۔ رسوائی مری کوچہ و بازار نہ ہووے

از اعظم علی خاں میاں مآیوس تخلص

رشتۂ الفت اگر عاشق سے دلبر توڑ دے وہ سر اپنا سنگِ غم سے پھر نہ کیونکر توڑ دے

وہ قدِ موزوں سوار آوے چمن میں تو صبا اُسکے چابک کے لئے شاخِ صنوبر توڑ دے

ہم سے گر سنگیں دلی کرنے لگے وہ رشکِ گل کیوں نہ میری سخت جانی نوکِ خنجر توڑ دے

.... میرا اگر گزرے ادھر .... صفِ انبوہِ محشر توڑ دے

ہووے گر آنکھوں سے اپنی دور وہ رشکِ قمر کیوں نہ سیلِ اشک اپنا اپنا ہی گھر توڑ دے

ہر رگِ گل .... تنِ نازک پہ ہوگی اک خلش گل کوئی اُس کو نہ بہر زیبِ بستر توڑ دے

اس قدر حاصل ہوا ہے مجھ کو اب زورِ جنوں ہر رگ و پے میری وقتِ فصد نشتر توڑ دے

ہے سنا میں نے یہ کل کہتا تھا سب سے ماہ وش ق ایسے عاشق سے کوئی الفت نہ کیونکر توڑ دے

بھیج کر خط ہر گھڑی دیتا ہے تکلیف جواب آج کوئی اس کا بازوے کبوتر توڑ دے

ماہ گر دیکھے کہیں اس بادشاہِ حسن کو جائے گوہر اختر .... بہر افسر توڑ دے

اس زمیں میں اور بھی مآیوس لکھ دو چار شعر تا نہ پھر تیری غزل کے کوئی ممبر توڑ دے (؟)

شانہ گر اُسکا کوئی موئے معنبر توڑ دے (؟) پھر صبا کیونکر نہ زلفِ سنبلِ تر توڑ دے

جوششِ دل سے اگر قطرہ نکالوں اشک کا وہ نظر بازوں کے دل سے قدرِ گوہر توڑ دے

گر خیاباں پر کرے وہ رشکِ گل قصدِ خرام تو دلِ قمری سے پریشان صنوبر توڑ دے

خاک سے میری اُگیں تب غنچۂ گل بعدِ مرگ گر کہیں تیرِ نگہ سے دل کو ہنس کر توڑ دے

ہو نہ نور افروزِ محفل اس کا گر ماہِ جبیں عاشقِ مضطر نہ کیونکر سر سے ساغر توڑ دے

گر رقم کوئی کرے حالِ شکستہ کو مرے پہلے پائے خامہ ہر اک تارِ سطر توڑ دے

پہونچے سب ساحل پہ مجھکو دیکھ تنہا بادِ تند وائے قسمت بیچ میں دریا کے لنگر توڑ دے

گر دکھائے عاشقِ شیدا ترا زورِ جنوں ایک ٹکر سے وہیں سدِ سکندر توڑ دے

کیا سبب ہے اسکے دل میں کچھ اثر ہوتا نہیں آہ میں مایوس گر کھینچوں تو پتھر توڑ دے

منشی ولایت علی خان صاحب ولایت صفی پوری مرحوم —
وفات سنہ ۱۹۲۸ع

فہرست مضامین

جلد ۱ بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء نمبر ۷

معلوم ہوا ہے کہ اس مرتبہ ہندوستانی اکاڈیمی کے شعبۂ اُردو نے حصۂ نظم کا انعام لکھنؤ کے مایۂ ناز مرثیہ گو شاعر جناب سیّد خورشید حسن صاحب عروج عرف دولہا صاحب دام ظلہم کی خدمت میں پیش کیا ہے اور حصۂ نثر کے ادبی شعبہ کے لئے کتاب "المبین" کے مصنف کو چنا ہے۔

سال گزشتہ کی طرح نظم کا انعام یقیناً صحیح محل پر پہونچا ہے۔ جناب دولہا صاحب کے مراثی موجودہ زمانہ میں شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ اُن کی زبان میں میر انیس کی فصاحت اور شیریں بیانی کے آثار خصوصیت سے ملتے ہیں۔ حصۂ نظم کا انعام تجویز کرنے کے لئے جو کمیٹی مقرر ہوئی تھی وہ اپنے اس فیصلہ پر یقیناً قابل مبارکباد ہے۔ اُس نے سال گزشتہ کی طرح اپنے حسن ذوق و معیار انتخاب کی بلندی کا ثبوت امسال بھی دیا۔ لیکن ہمیں اس کا افسوس ہے کہ نثر کے ادبی شعبہ کا انعام تقسیم کرنے والوں نے اپنی ادب فہمی کو پھر شکوک کا آماجگاہ بنا دیا۔ سال گزشتہ کی طرح امسال بھی اس کمیٹی کی نظر صحیح کتاب پر نہ پڑی۔ جس کتاب کو انعام کے لئے منتخب کیا گیا وہ قطعاً اس عزت افزائی کی مستحق نہ تھی۔

مولانا سید سلیمان اشرف صاحب بہاری استاد علوم دینیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا یوں علمی حیثیت سے جو پایہ بھی ہو لیکن اُنکی کتاب "المبین" اغلاط سے پُر ہے۔ قدم قدم پر غیر رواداری اور فن سے ناواقفیت کے آثار ملتے ہیں۔ ایک محقق کا قلم جس احتیاط کے ساتھ اُٹھنا چاہیے اُسکا پوری کتاب میں کہیں نشان نہیں ہے۔ عربی زبان کا عجمی زبانوں سے مقابلہ کرتے ہوئے تکلیف دہ خطابت کی عجیب و غریب نمایش کی ہے۔ استدلال سے یک لخت قطع تعلق کر لیا ہے۔

جناب ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی پی ایچ، ڈی، پروفیسر عربی الہ آباد یونیورسٹی نے جو فاضلانہ اور محققانہ مضمون اس کتاب پر ریویو کرتے ہوئے مارچ کے "معارف" اعظم گڑھ میں لکھا ہے وہ ہمارے اس خیال کی واضح دلیل ہے۔ اُس مضمون کے مطالعہ سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف المبین کو اس موضوع پر قلم اُٹھانے کا کہاں تک حق تھا۔

سال گزشتہ تو خیر انتخاب کا موقع انھیں کتابوں میں تھا جو مصنفین کی طرف سے اکاڈیمی میں اِس مقابلے کے لئے بھیجی جاتیں لیکن اِس مرتبہ دائرۂ انتخاب کافی وسیع تھا۔ اُن تمام کتابوں میں سے جو اِس تین سال کے عرصہ میں چھپی ہیں انعام کے لئے بہترین کتاب کے منتخب کرنے کا حق کمیٹی کو حاصل تھا۔ خواہ وہ کتابیں اکاڈیمی کو مصنفین کی طرف سے بھیجی گئی ہوں یا نہ بھیجی گئی ہوں۔

اِس صورت میں کمیٹی کے ممبروں کا یہ فرض تھا کہ وہ اس قسم کے تمام ادبی جواہر کو پرکھتے اور پھر رائے دیتے۔ لیکن شاید ایسا نہیں ہو سکا اور اس وجہ سے اکاڈیمی کے شعبۂ نثر کا فیصلہ غلط ہوا۔

"المبین" سے کہیں اچھی کتابیں خود ہماری نظر میں موجود ہیں جنھیں اکاڈیمی کے شرائط کے ماتحت بآسانی انعام کے لئے منتخب کیا جا سکتا تھا۔ حیات جلیل، نور اللغات، پنجاب میں اردو، اور ہماری شاعری اُس کتاب پر نمایاں برتری رکھتی تھیں۔ ان کتابوں کے مصنفین نے اپنے اپنے حدود میں دادِ تحقیق دی ہے۔ جو کچھ لکھا ہے فن سے آشنا ہو کر لکھا ہے۔ موضوع سے باخبر ہو کر لکھا ہے تصنیف و تالیف کے ذمہ دارانہ فرائض ادا کئے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ آخر ان کتابوں کو کمیٹی نے کیونکر نظر انداز کیا اور انعام کے لئے المبین کو چن لیا۔ اُس کمیٹی کے ممبروں کو جس کے متعلق اتنا اہم ادبی کام سپرد کیا گیا ہو ذرا زیادہ باخبر، وسیع النظر، دقیقہ سنج، اور محتاط ہونا چاہیے تھا۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے جناب مولانا سید سلیمان ندوی صاحب مدیر "معارف اعظم گڈھ" بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے لیکن مارچ کے معارف کے ایک شذرہ میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔ "ہم نے خود یہ کتاب نہیں دیکھی ہے۔ مگر اس تبصرہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اس میں اشتقاق کبیر پر بحث ہو گی۔ نیز عربی میں دوسری زبانوں کے جو لفظ ہیں اُن کو عربی ثابت کیا گیا ہو۔"

کیا ہم جناب مولانا صاحب سے اس سلسلہ میں یہ پوچھ سکتے ہیں کہ آیا اس نوٹ کے تحریر کے بعد انھیں المبین کے مطالعہ کا موقع مل گیا تھا۔ اور اگر اس کتاب کے مطالعے کا انھیں موقع نہیں ملا تھا جس کا ہمیں قوی اندیشہ ہے تو انھوں نے کمیٹی کے اُس جلسہ میں جس میں انعام کے لئے "المبین" کا انتخاب ہوا ہے کیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔

بہر حال معاملہ جو کچھ بھی ہو یہ فیصلہ نہایت غلط ہوا۔ اور اس سے اکاڈیمی کی شہرت کو سخت

صدمہ پہونچنے کا اندیشہ ہے۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حصۂ نثر کی کمیٹی میں قریب قریب تمام وہی افراد تھے جو گزشتہ سال کی اس کمیٹی میں تھے۔ ہم اکاڈیمی کے ذمہ دار کارکنوں سے اسکی گزارش کرینگے کہ وہ حصۂ نثر کی کمیٹی کے افراد منتخب کرنے میں اب ذرا زیادہ احتیاط سے کام لیں۔ اس قسم کے غلط فیصلے اکاڈیمی کی طرف سے اگر دو ایک سال اور ہوتے رہے تو اُس کے ان انعامات کی اہمیت جاتی رہیگی اور وہ منشا کبھی پورا نہیں ہوسکیگا جو اِن انعامات کے تعین سے تھا۔

ہمارے بزرگ جناب سید احمد علی صاحب خان بہادر پٹنہ کے اُن رؤسا میں سے ہیں، جنھیں علم و ادب کا صحیح ذوق ہے۔ خصوصیت سے فن تاریخ گوئی میں آپ کو پورا ملکہ حاصل ہے۔ تھوڑی سی فکر میں آپ اچھی سے اچھی تاریخ کہہ دیتے ہیں۔ ناممکن تھا کہ ادب آپ کی اس بزرگانہ عنایت سے محروم رہے۔ چنانچہ آپ نے "ادب" اور ناچیز مدیر "ادب" کی ستایش میں بھی ایک پُر معنی تاریخ ارسال فرمائی ہے۔

جہاں تک مدیر کی ذات کا تعلق ہے وہ ان ستائشوں کا کسی حیثیت سے مستحق نہیں جناب خان بہادر صاحب کا یہ بزرگانہ حسن ظن ہے کہ وہ اپنے چھوٹوں کو اس عزت افزائی کے قابل سمجھتے ہیں۔ ہم اس تاریخ کو صفحات "ادب" میں جگہ نہ دیتے لیکن چونکہ جناب محترم کی یہ ستائش ہم اپنے حق میں دعائیں سمجھتے ہیں۔ اس لئے اسے درج کئے دیتے ہیں۔ وہو ہذا

شدم مستفیض از ادب دوش و گفتم — بود ایں جریدہ گران قدر و نایاب
مصفا چو آبِ حیات است ہر فصل — تو گوئی گلستان سعدیست ہر باب
مدیرش کہ اعظم حسین است نامش — مضامین او چوں لآلیِ خوش آب
چہ زیبا مجلہ نمودہ است اجرا — کہ افزائد ادراک و آموزد آداب

پئے سال آغاز انشاد کردم

ریاض ادب از ادب باد شاداب

۱۳۴۹

آج کل عام نگاہوں میں وہی ادبی رسالہ کامیاب ہے جو اپنے صفحات کے ذریعے سے اُن زنانی تصویروں کو عام کرے جن کی دلربایانہ ادائیں دعوتِ نظر کا کافی سامان رکھتی ہوں۔ ہمارے بہت سے ناظرین کا تقاضا ہے کہ "ادب" بھی اس عام رجحان کی پیروی کرے یعنی حُسن کے مقابلوں میں شریک ہونے والی دوشیزوں اور اسٹیج کی رونق بڑھانے والی شوخ وشنگ لعبتوں کی حسین وجمیل تصویروں سے اُس کا دامن بھی تہی نہ ہو۔ بدقسمتی سے "ادب" کا نقطۂ نظر دوسرا ہے۔ وہ تصویریں شایع کرنے سے گریزاں نہیں ہے لیکن اُن تصویروں کو ادب سے کچھ تعلق تو ہو۔ ہم پہلے بھی اس نقطۂ نظر کے ماتحت کچھ تصویریں شایع کر چکے ہیں۔ اب بھی اسی قسم کی ایک تصویر یعنی حضرت ولایت صفی پوری مرحوم کا فوٹو شایع کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ عام نگاہوں کو اس فوٹو میں کچھ خاص کشش نظر نہ آئے گی۔ لیکن یہ ایک ایسے ادبی بزرگ کا فوٹو ہے جو ہر طرح قابلِ عزت تھے۔ اِس لئے اس کی اشاعت ہمارا فرض ہے۔ موصوف اپنے مذہبی خیالات کی وجہ سے تصویر نہیں کھچواتے تھے۔ تمام عمر میں صرف یہی ایک تصویر لی جا سکی، وہ بھی موصوف کی لاعلمی میں۔ ہم اپنے محترم جناب سید اشرف علی صاحب ڈپٹی کلکٹر کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے ہمیں یہ فوٹو عنایت فرما کر ہمیں اسکی اشاعت کا موقع دیا۔

ہمیں اسکا احساس ہے کہ ہماری وہ تمام کوششیں جنکا مقصد صرف مردوں کی علمی و اخلاقی تربیت ہے اپنی منفعت بخشی کے لحاظ سے ادھوری ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کو اس تربیت کی اُتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ مردوں کو۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے اپنا ادبی لائحۂ عمل مرتب کرتے وقت طبقۂ نسواں کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ برابر ایسے مضامین شایع کریں جن سے عورتوں کو اپنے فرائض کا احساس ہو اور وہ مردوں سے اپنے حق جائز طور سے مانگ سکیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام ہماری پڑھی لکھی بہنیں ہی خوب کر سکتی ہیں۔ اُنھیں کی سنجیدہ تحریریں اس موضوع میں زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ اسی لئے ہم نے خواہش کی تھی کہ تعلیم یافتہ بہنیں اس معاملہ میں ہمارا ہاتھ بٹائیں اور وقتاً فوقتاً صنفِ نسواں کی بہبود سے تعلق رکھنے والے مختلف معاشرتی و تمدنی مضامین "ادب" کے لئے لکھیں۔ اس سلسلہ میں صرف ایک مفید مضمون "ہمارا حصہ" موصول ہوا تھا جسے ہم نے شایع بھی کر دیا لیکن پھر کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ کیا ہماری بہنوں کو "آپ بیتی" پرائی زبانوں ہی سے سُننے کا شوق ہے؟

قطیسفان

(طاق کسریٰ)

(جناب سید اطہر حسین صاحب جعفری - از بھوپال)

شاہان ساسانیہ کا پایہ تخت قطیسفان جسکا سنگ بنیاد ۲۲۶ء میں رکھا گیا تھا غالباً خسرو (کسریٰ) اول کے عہد میں اوج ترقی پر پہونچا جس نے ۵۴۰ء میں اہل انطاکیہ کو اُن کے وطن سے بلا کر اس شہر کے ایک مخصوص محلہ میں آباد کیا تھا - ایوان کسریٰ جسکی تعمیر ۵۵۰ء میں شروع ہوئی تھی یا تو اسی بادشاہ کے زمانہ میں تکمیل کو پہونچ گیا تھا یا یہ کہ ہنوز تعمیر کا سلسلہ جاری تھا -

قدیم اور یورپائی مورخین کو صفحۂ ہستی سے مٹے ہوئے قصر ابیض واقع قطیسفان اور ایوان کسریٰ میں جو جانب جنوب ایک میل کے فاصلے پر تھا گونہ اشتباہ واقع ہوا ہے - چونکہ اس مضمون میں ہم کو محض طاق کسری کا حال لکھنا ہے - اس لئے ان ہر دو عمارات کے محل وقوع کی بحث میں پڑنا ہمارے موضوع کے خلاف ہوگا -

دریائی راستہ سے قصبہ کوت[1] سے ۷۰ میل جانب شمال، اور بغداد سے ۳۴ میل جانب جنوب دجلہ کے بائیں کنارے پر ایوان کسریٰ کے آثار موجود ہیں - اس مقام کے قریب دریائے دجلہ اس بُری طرح چکر کھا کر بہتا ہے کہ کئی گھنٹہ کی مسلسل کشتی رانی کے بعد ایسے مقام پر پہونچنا نصیب ہوتا ہے جہاں کشتی بآسانی ٹھہر سکے اور جہاں سے ایک لق و دق میدان کے وسط میں پہ میلوں سے نظر آنے والا بوسیدہ مگر عظیم الشان خرابہ صاف دکھائی دینے لگتا ہے -

زمانہ کی دستبرد سے اس وقت تک جو حصہ اس عمارت کا بچ سکا ہے وہ محض شمالی رو کار اور رقبۂ ایوان کا تقریباً نصف حصہ ہے - ٹھیک جانب مشرق اصل عمارت کا سامنے والا رخ

[1] Ctesiphon لے Kut

۲۸۴ فٹ لمبا تھا۔ اور ایک ۸۴ فٹ چوڑی اور ۱۰۰ فٹ زمین سے بلند قوس نما محراب کے ذریعے سے دو برابر حصوں میں منقسم تھا۔ اِس قبہ (طاق) کے دونوں پہلوؤں کی دیواریں گاؤدُم ہیں جن کی چوڑائی بنیاد کے قریب تقریباً ۲۰ فٹ ہے اور گھٹتے گھٹتے چوٹی پر جاکر نصف کے قریب رہ گئی ہے۔

اِس عمارت کی کسی اینٹ پر بھی سماری (Cuneiform) یا ایرانی کتابہ کا نشان نہیں پایا جاتا۔ مقدم الذکر کے نہ پائے جانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس عمارت کی تعمیر میں دوسری قدیم عمارتوں کا ملبہ کام میں نہیں لایا گیا جیسا کہ قرون مابعد میں عام رواج تھا۔

اس قبہ کے ہر بازو کی عمارت سہ منزلہ ہے اور ہر منزل کے آگے اینٹوں کا چوڑا چھجا نکلا ہوا ہے۔ نیچے کی منزل میں ساڑھے تین (یعنی تین مسلّم اور ایک بیرونی جانب نیم) در ہیں۔ ہر در کی محراب ہلالی ہے اور دوہرے نیم قد ستونوں پر قائم ہے۔ ان دروں میں سے صرف ایوان کی طرف سے دوسرا در کھلا ہوا ہے جس میں سے ایوان سے ملحق کمروں میں جانے کا راستہ ہے باقی در چُنے ہوئے ہیں۔ ہر در کی محراب کے اوپر پھر تین تین چھوٹی چھوٹی محرابیں ہیں۔ جن میں سے درمیانی مقابلتہً زیادہ وسیع ہے۔ ان چھوٹی محرابوں میں سے بھی ہر ایک حسب معمول چھوٹے چھوٹے دوہرے نیم قد ستون پر قائم ہے۔

دوسری منزل پتلے ستونوں کے ذریعہ سے پانچ دروں میں منقسم ہے۔ اور اسی وجہ سے اس منزل کے ہر در کی چوڑائی نیچے والی منزل کے در کی چوڑائی سے مقابلتہً کم ہے اِس لئے کہ اس میں صرف ساڑھے تین ہی در ہیں۔ اس اوپر اور نیچے کے دروں کی چوڑائی کے اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ اوپر کا ہر ستون ٹھیک نیچے کے ہر ستون کی سیدھ میں نہیں پڑا۔ یہ دوسری منزل بھی دوہرے درجے کی ہے۔ نیچے کے حصہ کے ہر در میں دوہری ڈاٹیں ہیں جو نازک ستونوں پر قائم ہیں۔ اسی طرح اوپر والے حصے کے ہر در میں تین تین، ڈاٹیں ہیں جو ستونوں پر نہیں بلکہ سانچے کی اصل دیوار پر قائم ہیں۔ سب سے اوپر والی یعنی تیسری منزل کے دروں اور دوسری منزل کے دروں کی چوڑائی میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ دیوار کے اس سرے سے اُس سرے تک مسلسل تیرہ ڈاٹیں ستونوں پہ قائم ہیں اور بس۔

عمارت کی یہ طرح اُس رومی طرز تعمیر کی یادگار ہے جسمیں ایک ہی قطار میں دوہرے ستون ہوتے تھے اور عمارت دو خاص منزلوں میں منقسم ہوتی تھی جبکا سب سے اوپر کا حصہ نیچے والے کے

مقابلے میں بہت ہی مختصر ہوا کرتا تھا۔ اِس تعمیر میں ستونوں کے فاصلہ کی پابندی نہیں کی گئی یعنی اوپر کے درجے کے ستونوں کا فاصلہ نیچے کے درجے کے ستونوں کے فاصلے سے مختلف واقع ہوا ہے، ممکن ہے کہ یہ نقص نقشہ بنانے والے کی کمی استعداد کی وجہ سے پیدا ہوا ہو۔ جیسے شاید یہ خوف رہا ہو کہ اگر نیچے کی منزل کی طرح اوپر کی منزلوں میں بھی ساڑھے تین تین در رکھے گئے تو یہ دقت پیش آئیگی کہ وسطی بڑی ڈاٹ کے گوشہ میں خلا واقع ہو جائیگا۔

قیاس ہے کہ ان ڈاٹوں میں اور ستونوں میں سنگ مرمر کی اینٹیں جڑی گئی ہونگی جس سے روکار نہایت ہی شاندار نظر آتا ہوگا۔ بعض قدیم مورخین کا یہ بھی خیال ہے کہ عمارت کے بعض حصوں میں چاندی اور دھات کے پتر اور کم قیمت والے پتھر جڑے تھے۔ بہرحال چاندی ار پتھر یا دھات نہ بھی سہی لیکن اس میں تو شبہ نہیں کہ چاندی ار پلاسٹر ضرور کیا گیا ہوگا۔ جسکی آب و تاب ان دونوں چیزوں سے کم نہ رہی ہوگی۔

انھیں بھاری ستونوں اور محرابوں والی دونوں پہلوؤں کی عمارتوں کے درمیان عظیم الشان ایوان واقع تھا جسکی بلندی اور چوڑائی دونوں زردشتی مذہب کی بنیاد پر جو اُس زمانہ میں ایران کا رسمی (Official) مذہب تھا مشرق کی جانب رکھی گئی تھیں۔ اسی ایوان میں وہ مشہور زمانہ قالین آویزاں تھا جسکی تعریف و توصیف طبری ایسے زبردست عربی مورخ نے بھی نہایت ہی شاندار الفاظ میں کی ہے۔ قالین پر ایک باغ بنا ہوا تھا:- فرش سونے کے تار، دبکا اور روشیں اور پٹریاں چاندی کے تاروں کی تھیں۔ سبزہ کے میدان میں نگینہائے زمرد جڑے تھے اور چشمے سچے موتیوں سے پُر تھے۔ درخت، میوے اور پھول الماس اور دوسرے بیش قیمت جواہرات کے تھے۔ اسکا طول ۷۰ ذراع (ہاتھ) اور عرض ۶۰ ذراع تھا۔ ناظرین مضمون سے استدعا ہے کہ اس قالین کو مدنظر رکھ کر تھوڑی دیر کے لئے ذہن میں اس سماں کا خاکہ کھینچیں جبکہ "بادشاہ اپنے شاہانہ کر و فر کے ساتھ دیوان عام میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوگا۔ ہزارہا شمعہائے کافوری کی شعاعوں کا عکس بادشاہ کے مکلل تاج، شمشیر اور پٹکے پر پڑ رہا ہوگا۔ دروں اور دیواروں کے زرق برق پردے اور اُن صدہا درباریوں کی سنہری وردیاں جو تخت شاہی کے اردگرد مودب صف بستہ کھڑے ہونگے۔ شمعوں کی کرنوں سے جگمگا رہی ہونگی۔"

اِس ایوان کی اندرونی آرائش کی نوعیت اور خاص کر محراب کی جانب چوبین کڑیوں کے سرّوں کے نکلے رہنے اور اصل گنبد میں سوراخوں کے پائے جانے کے بارہ میں وقتاً فوقتاً عجب خوب قیاسی گھوڑے دوڑائے گئے ہیں کڑیوں کے بارہ میں یہ قیاس ضرور صحیح ہے کہ وہ اصل میں لبنانی عرعر (Cedar) کی لکڑی کی ہیں۔ گنبد کے سوراخوں کے بارہ میں مورخین کو اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ ان کے ذریعہ سے روغنی چراغ ایوان کے اندر لٹکائے جاتے تھے بعض کہتے ہیں کہ انھیں سوراخوں کے مقابل میں اندر کی جانب چھت میں گچ کے ظروف بنے ہوئے تھے جن میں باہر کی طرف سے ان سوراخوں کے ذریعہ چونے کا گارا بھر دیا جاتا تھا جو دیواروں اور گنبد کی چھت پر پلاسٹر کے کام میں آتا تھا۔

ایوان کے دونوں بازوؤں کے کمروں کا تو اب نشان تک نہیں رہا۔ مگر ہاں اس عظیم الشان ایوان کی وہ نادرہ روزگار قبہ کی ڈاٹ اب تک باقی ہے جسکا شمار دنیا کے بہترین آثار قدیمہ میں ہوتا ہے، اتنی زبردست ڈاٹ جس میں کسی قسم کے سہارے کا نام تک نہ ہو۔ آج تک زمانہ کی آنکھوں نے نہیں دیکھی دونوں بازوؤں والی دیواروں میں جو اب گر گرا کر زمین کے برابر ہوگئی ہیں جو اصل فرش سے چند فٹ بلند ہے۔ ۸۴ فٹ کا فاصلہ ہے لیکن ڈاٹ کی اصلی چوڑائی صرف ۷۰ فٹ کے قریب ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے، کہ ۳ انچ موٹی، ۱۲ انچ کی مربع اینٹیں (جو خوب گندھی ہوئی مٹی کی اور پختہ ہیں) دیواروں کے ۴۰ فٹ کی بلندی تک پہونچ جانے کے بعد درجہ بدرجہ تھوڑی تھوڑی آگے کی سمت بڑھا دی گئی ہیں جس سے اوپر پہونچ کر چوڑائی میں کمی واقع ہوگئی۔

ایوان کی یہ ڈاٹ دار چھت بناتے وقت اینٹیں لمبی لمبی اس طرح جڑی گئی ہیں کہ ایک کی سطح دوسری سطح سے ملی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ گارا یا پلاسٹر آف پیرس کی طرح اس درجہ لس دار رہا ہوگا کہ اول سے آخر تک اینٹوں کا ہر حلقہ ایک دوسرے سے چپکا رہا۔ اتنی زبردست ڈاٹ کا لداؤ بھی بہت زیادہ ہوگا اور غالباً دونوں پہلوؤں کے پانچ پانچ حجروں کے اوپر پٹا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے قبہ (ڈاٹ دار چھت) آخر میں بنا ہوگا۔ ابھی سنہ ۱۶۱۶ء تک قبہ کے دونوں طرف کے حجرے گو بوسیدہ حالت میں سہی، لیکن باقی تھے سنہ ۱۸۸۸ء میں عالی شان وکار کے دونوں بازو کھڑے تھے۔ اور قبہ کا جتنا حصہ کہ اب رہ گیا ہے اسکا دو چند باقی تھا۔ ترکوں نے اُسکے ایک بازو کے گرا دیے جانے کا حکم دیا تھا کہ اُسکے ملبہ سے قصبہ سلمان پاک تعمیر کیا جائے جس میں حضرت سلمان فارسی کا مزار ہے۔

شہر پناہ والے قطیسفان کی مختصر تاریخ بھی اس قدیم یادگار کے زائرین کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

مذہب مانویہ کا بانی مانی میدیا کے قدیم دارالسلطنت اکبتانہ میں پیدا ہوا تھا۔ مگر اسکی تعلیم و تربیت اسی قطیسفان میں ہوئی۔ مسیحیت قدیم کے واقفکاروں کو یاد ہوگا کہ جملہ مسیحی جماعتوں میں الحاد کا سب سے بڑا سبب منجملہ دیگر اسباب کے مذہب مانویہ تھا۔ تمام عراق میں گھومنے کے بعد ہند و چین ہوتا ہوا اور اپنے مذہب کی تلقین کرتا ہوا مانی پھر ۲۷۲ء میں قطیسفان واپس آیا۔ جہاں پہونچتے ہی اُسے شاہی کاہنوں کی سخت مخالفت کا سامنا ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے مجمع عام میں سولی دے دی گئی اور لاش کی کھال کھینچ لی گئی۔ اُسکے بعد اُسکے پیروؤں پر مظالم کی باری آئی لیکن باوجود ان موانع کے زردشتیوں اور نسطوری عیسائیوں کے مذہب کے مقابلے میں مانویت عرصہ تک قدم جمائے رہی۔

(۵۹۰ء سے ۶۲۸ء تک)

خسرو ثانی نے انتہائی جد و جہد کے ساتھ ۳۸ سال تک حکومت کی اسی حصار دار شہر قطیسفان سے جس نے کسی حملہ آور کی کبھی کوئی ہستی نہ سمجھی تھی خسرو تین مرتبہ دوسرے ممالک پر حملہ کر چکا تھا۔ اسکے بعد سلطنت بزنطین کے پایۂ تخت قسطنطنیہ کی باری آئی۔ بعد ازاں انطاکیہ اور دمشق فتح ہوا۔ حتیٰ کہ ۶۱۴ء میں یروشلم بھی قبضہ میں آگیا۔ دیگر اموال غنیمت کے ہمراہ مشہور عالم مقدس صلیب بھی خسرو قطیسفان لایا تھا۔

۶۱۶ء میں خسرو پھر دریائے دجلہ کے کنارے سے روانہ ہوا۔ مگر اس مرتبہ مصر کے قصد سے جس کا ایک حصہ اُس نے فتح کر لیا۔ اور قطیسفان کی روز افزوں عظمت میں اضافہ کرنے کے لئے اس پر ایک خراج بھی عائد کیا لیکن ۶۲۳ء میں جب شاہنشاہ ہرقل کی بزنطینی فوج نے بمقام نینوی شکست دی تو اُسی وقت سے خسرو کی طاقت کا زوال شروع ہوا۔ ۶۲۸ء میں خود خسرو کے بیٹے نے اُسے تخت سے اتار کر قتل کر ڈالا۔ ایرانی اور بزنطینی سلطنتوں کی قدیم سرحدیں از سر نو قائم کی گئیں اور پدر کش شاہ کش بادشاہ نے مقدس صلیب کو پھر یروشلم نہایت اہتمام کے ساتھ واپس کر دیا۔

غالباً اسی ایوان کا واقعہ ہے کہ یہی کاوس ثانی اپنے والد کے قتل کے بعد ایک روز تخت شاہی پر بیٹھا ہوا بعض ملکی معاملات کی دیکھ بھال اور اُن کے سرانجام میں مصروف تھا کہ ایک نامہ بر محمد رسول اللہؐ کا خط (بزبان عربی) لئے ہوئے اُسکے سامنے پیش ہوا۔ شاہ نے اُسکے مطالعے کے بعد کہا۔ ہاں یہی

محمد ہیں جن کا نام ہم نے قطیسفان اور اور شہروں میں سُنا ہے۔ اور جن کی نسبت یہ مشہور ہے کہ ایک جدید مذہب کے اعلان سے تمام ممالک میں ہلچل مچا رکھی ہے۔ اُن کا ادعا ہے کہ خدا ایک ہے اور میں اُس کا سچا رسول ہوں۔ یہ وحدانیت کا مسئلہ ایرانیوں کے مذہب کے بالکل خلاف تھا۔ اس لئے وہ یزدان و اہرمن دو خداؤں کے قائل تھے۔ علاوہ بریں عیسائی تثلیث کے قائل تھے۔ اس لئے اس نئے مذہب کی ذات سے ان دونوں مذہبوں کو صدمہ پہونچنے کا اندیشہ تھا۔ خلاصہ کہ ایرانی بادشاہ اُس عربی نامہ بر سے نہایت سرد مہری سے پیش آیا اور خط کو چاک کر کے اسکی طرف پھینک دیا۔ اور اس نئے پیغمبر کی شان میں جس نے (بقول شاہ ایران) عرب کے صحرائی قبائل اور کثیف شہر مدینہ میں ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ چند نا ملائم کلمات بھی استعمال کئے۔ نامہ بر کی واپسی پر جب آنحضرت صلعم کو اپنے نامہ و نامہ بر کی اس بے حرمتی کی اطلاع ہوئی تو دعا کی۔ "پروردگارا! جس طرح اس (کمبخت) نے میرے خط کو چاک کیا ہے تو اسی طرح اسکی سلطنت کو پارہ پارہ کر کے منتشر کر دے"۔

یہ واقعہ ۶۲۸ء کا ہے جب کہ قرون وسطیٰ کا پردۂ ظلمت تمام یورپ پر پڑا ہوا تھا۔ چین میں علم و ادب کا دَور دَورہ تھا۔ اہل ٹوٹنک۔ برطانیہ کے غیر متحد جرگوں کو ابتک اپنا مطیع و منقاد نہ بنا سکے تھے۔ اہل روم کا اثر دُنیا سے زائل ہو رہا تھا۔ اور ان سب کے خلاف مشرق میں محمد صلعم وہ بیج بو رہے تھے جس سے کسی زمانہ میں ایک اعلیٰ درجے کی فصل تیار ہونے والی تھی چنانچہ کچھ دنوں بعد دین محمدی نے نصف دنیا کو اپنے حیطۂ تصرف میں کر لیا۔ اور اب اس مقدس پیغامبر کے مطیعوں کی ایک ایسی زبردست فوج موجود ہے۔ جس کی نظیر سے دُنیا کی تاریخ کے صفحے خالی نظر آئیں گے۔

قدرت خدا سے تھوڑے ہی دنوں کے بعد آنحضرت صلعم کی دُعائے بد قطیسفان اور سلطنت ایران کے حق میں (جسکا وہ کئی صدیوں سے پایۂ تخت ہوتا چلا آیا تھا) حرف بحرف مستجاب ہوئی خاندان ساسانیہ کا آخری فرمانروا یزدجرد پانزدہ سالہ عمر میں تخت نشین ہوا لیکن صرف ۴ سال حکومت کرنے کے بعد اُسے بھاگ کر ایران کے پہاڑوں میں چھپنا پڑا۔ جہاں تقریبًا دس سال کے بعد خود

اس کے ایک غدار پیش خدمت نے اُسے قتل کر ڈالا۔

تقریباً ۶۳۷ء میں اسلامی فوج کے سپہ سالار سعد نے قطیسفان پر آخری حملہ کیا۔ دریا کے دوسری جانب اسلامی لشکر جمع ہوا سعد نے قرآن ہاتھ میں لیکر شہر قطیسفان اور اُسکے عالی شان قصر کی طرف جو دُور سے نظر آرہا تھا اشارہ کیا اور کہا "کیا تو نے یہ قسم نہیں کھائی تھی کہ کبھی منتقل نہ ہوگا"۔ اسکے بعد ایران کے آخری فرمانرواؤں کے مظالم ایک ایک کر کے بیان کئے۔ ادھر سے سعد کے لشکر نے دریا کو عبور کیا۔ ادھر سے ایرانی لشکر مقابلہ کے لئے آیا اور جنگ چھڑ گئی۔ اسلامی فوج کے سردار بآواز بلند سپاہیوں کو جوش میں آ آکر حکم دے رہے تھے کہ اپنے نیزوں کی انیوں سے ایرانیوں کی ایک ایک آنکھ پھوڑ دو۔ چنانچہ ایک اسلامی مُورخ لکھتا ہے کہ جتنے ایرانی قتل سے بچ گئے تھے سب کے سب کانے تھے ختم جنگ کے بعد سعد ایوان کسریٰ اور بیشمار باغوں، چشموں، غلے کے ہرے بھرے کھیتوں، خوبصورت مکانوں اور خوشی و خرمی والے شہر میں داخل ہوا۔ اس فتح کے بعد ہی یہ ایوان مسجد کی شکل میں منتقل کر دیا گیا۔ ایوان کے حجروں میں مسلمانوں کو بہت سی ٹوکریاں ملیں جنھیں دیکھ کر آپس میں کہنے لگے "یہ لیجیے! ہم تو سمجھتے تھے کہ ان میں کوئی کھانے پینے کی چیز ہوگی۔ یہ تو سونے اور چاندی سے پُر نکلیں"۔ علاوہ ازیں ایک بڑی مقدار میں کافور بھی ملا جسے افراط کی وجہ سے نمک سمجھ کر سپاہیوں نے آٹے کے خمیر میں خوب ہی ملایا۔ شاہی ساز و سامان (لباس شاہی، سچے موتیوں کا ہار، مرصع ٹیکا، مرصع زرہ وغیرہ) بھی ہاتھ آیا جسے زیب تن کر کے شاہ ایران نہایت فخر و تکبر کے ساتھ تخت شاہی پر متمکن ہوتا تھا۔ علاوہ بریں وہ مرصع قالین بھی ملا جو ایوان میں آویزاں تھا اور جسکا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ مال غنیمت کا خُمس خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیج دیا گیا اور بقیہ ....۶۰ ہم سپاہیوں کے درمیان بحصہ رسدی تقسیم کر دیا گیا۔ سپاہی کے حصے کی تعداد تقریباً ۱۲۰۰۰ درہم (۴۰۰ پونڈ یا ....۶ روپیہ) تھی۔ اس میں کروڑ پونڈ کی لُوٹ کے ذکر کی چنداں حاجت نہ تھی لیکن محض اس وجہ سے بیان کرنا پڑا کہ زوال کے وقت قطیسفان کی سلطنت کی دولت و ثروت کا اندازہ کیا جا سکے۔

سولھویں اور سترھویں صدی کے درمیان قطیسفان کے گرد والا میدان بیوپارات (مصالحہ جات مثلاً لونگ، الائچی، مرچ وغیرہ) کے سوداگروں کا خیمہ گاہ تھا جہاں ترکستان جانے والے قافلے مرتب کئے جاتے تھے۔

آج اس زمانہ میں بھی محاصرۂ کوت کی تاریخ قطیسفان سے وابستہ ہے۔ اسی ایوان کسریٰ کے منہدم قبّہ کے سایہ میں انگریزی سپاہی مع توپوں کے دم لینے کی غرض سے ٹھہرے تھے۔ اُس شہر کی فصیل کی بوسیدہ دیوار کے نیچے جو کسی زمانہ میں ایک شاندار پایہ تخت تھا۔ برطانوی فوج کے سپاہیوں نے اُس مقام کو جسے کسی زمانہ میں ان کی مقدس صلیب کے مستقر ہونے کا شرف حاصل تھا۔ از سر نو اپنی شجاعت سے محترم بنا کر اپنے خون سے اسکی تطہیر کی تھی۔ وہ زمین جس پر قطیسفان کا ایک زائر قدم رکھتا ہے دو سو سال سے تاریخی اہمیت ہی نہیں رکھتی بلکہ سنہ ۱۹۱۵ء کی ۲۱ تا ۲۶ نومبر کی مصیبت والی تاریخوں نے بھی اُسے قابل احترام بنا دیا ہے جبکہ نارفاک، گورکھا، ڈارسٹ، اور پنجابی پلٹنیں عین اُسی جگہ پڑی تھیں جہاں چوتھی صدی میں شاہنشاہ جولین نے ایک سخت معرکہ کے بعد شکست کھائی تھی۔ یہ وہی مقام ہے جسے صرف ایک مرتبہ شکست کا روز بد دیکھنا پڑا جو شاہنشاہ بزنطیم (Byzantuim) جسٹینین اعظم (Justinian the Great) کے سپہ سالار بلیساریس کو نصیب ہوئی تھی۔ بظاہر اب اُن انگریزی خندقوں کا نشان تک باقی نہیں ہاں اگر ہو بھی تو شاید انھیں لوگوں کے ذہنوں میں جو سنہ ۱۹۱۵-۱۷ء میں یہاں موجود تھے جبکہ یہاں کی خشک زمین پر جَو، گیہوں، گھاس اور پھولوں سے لدی ہوئی گھانس کا فرش بچھا ہوا تھا۔ قطیسفان کا یہ وہ منہدم قبّہ ہے جسے ایک زمانہ دراز کے بعد دوبارہ ایک عالمگیر واقعہ (جنگ عظیم) کے مرکز بننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

اب ایک نہایت ہی اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حیرت انگیز خرابہ کو آیندہ نسلوں کے ملاحظہ کے لئے کیونکر محفوظ رکھا جائے۔ مشرقی روکار کی پشت کا ایک بڑا حصہ مغربی اور شمالی ہواؤں کا جولانگاہ بنا ہوا ہے جن کے تند جھونکوں کے صدمہ سے دیواریں آگے کو جھکا چاہتی ہیں۔ ریت جو ہوا سے اُڑ اُڑ کر دیوار پر پڑتی ہے اور لونا یہ دونوں چیزیں اینٹوں کو کھائے جاتی ہیں اس لئے دیوار دن بدن کمزور ہوتی جاتی ہے۔ جنوبی دیوار دو مقامات پر بُری طرح شق ہو گئی ہے اور شمالی جانب والی دیوار میں دراریں پڑ گئی ہیں۔ اس کا علاج تو انجنیر یا کاریگر ہی تجویز کر سکتے ہیں لیکن اسکے تحفظ کی چند آسان تدبیریں اور بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ مشرقی روکار کی پشت کی جانب زمین پر متعدد لنگر گاڑ دیے جائیں اور کنکریٹ اور سمینٹ سے خوب مستحکم کر دیے جائیں اسکے بعد فولاد کے تاروں کے رسّے لئے جائیں جنکا ایک ایک سرا لنگروں سے بندھا ہو اور دوسرا سرا دیوار سے بستہ ہو۔ اور درازوں پر لوہے کے بند جڑ دیے جائیں۔ دوسری تدبیر یہ ہے کہ اسکی پشت پر ایک نہایت ہی مستحکم مگر دیوار سے بالکل ہی پیوست پشتہ بنا دیا جائے۔ یا یہ کہ نیو کو کھود کر از سر نو اس میں کنکریٹ

اور چونا بھر دیا جائے۔ اس تدبیر سے دیوار پھر نئی ہو جائیگی۔ کیا عجب ہے کہ رسوں سے باندھنے اور پشتہ بنانے کی تجویزوں پر کافی غور کرنے کے بعد ایک تیسری صورت ایسی نکل آئے جس میں مصارف کی بھی کفایت ہو۔

یہ آخری تدبیر غالبًا ایک نئے مصالحے سے بنے ہوئے ایک ڈھالو پشتہ کی شکل اختیار کرے گی۔ جو روکار کے سامنے کے رخ پر زمین سے بارہ فٹ بلند ہوگا۔ اس پشتہ کی نیو نیچے سخت زمین تک کھودی ہوگی جس سے اس عظیم الشان ایوان کی اصل بنیاد دریافت ہو جانے کے علاوہ متعدد مکشوفات کی دستیابی کا موقع بھی ہاتھ آجائے گا۔ اس طویل ڈھالو پشتہ کے علاوہ دیواروں اور قبہ کے شقوق لوہے کے بندوں سے جکڑ دیئے جائیں اور درازیں اینٹ اور سمنٹ سے بھر دی جائیں۔ اب رہا یہ امر کہ جنوبی اور مغربی دیواروں میں بھی اس قسم کے پشتہ کی ضرورت ہے یا نہیں۔ یہ ذرا غور طلب ہے۔

ان دیواروں میں پشتہ بنانے سے مثل روکار کی دیواروں کے اس قدیم یادگار کے بدنما ہو جانے کا احتمال نہیں ہے۔ قبہ کی چھت پر البتہ سمنٹ یا چونے اور ریت کے پلاسٹر کی ضرورت ہے تاکہ آئندہ بارش کا پانی توڑ کر اسے اور بھی خراب کر دے۔

بہرحال اس بے نظیر قدیم یادگار کے تحفظ کے لئے جو ممکن تدبیر بھی اختیار کی جائے۔ اُسکے علاوہ تین باتیں ایسی ہیں جن پر فوراً ہی عملدرآمد ہونا چاہیے۔ اوّل یہ کہ عمارت سے کسی اینٹ کا علیحدہ کرنا یا دیواروں پر کسی دھاردار آلہ سے لکیریں کھینچنا یا اُنھیں کُھرچنا ایک قابل تعزیر جرم قرار دے دیا جائے۔ دوسرے عمارت کے اوپر چڑھنے کی سخت ممانعت کر دی جائے۔ تیسرے اس یادگار کے چاروں طرف پختہ ستونوں اور کانٹے دار تاروں کی ایک مستحکم چار دیواری بنا دی جائے۔ جسمیں اندر جانے کے لئے صرف ایک دروازہ ہو جس پر ہمیشہ ایک دربان مقرر رہے، اور اُسے اس امر کی سخت تاکید رہے کہ اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں کوتاہی نہ کرے۔ ساتھ ہی اسکے ایک تختے پر جلی حروف میں لکھ کر ایک نوٹس لگا دیا جائے جس میں زائرین سے درخواست کی جائے کہ وہ از راہ کرم اس بے نظیر یادگار کو مزید بربادی سے محفوظ رکھیں۔

حقیقت امر یہ ہے کہ عام زوار اور خاص کر عراق کے مقامی حضرات محض اپنی زیارت کی یادگار چھوڑنے کی غرض سے اپنا نام و پتہ نوکیلے پتھر یا چاقو کی نوک سے اس بیدردی سے دیواروں پر لکھتے ہیں کہ ہر یادگار کے ساتھ تقریبًا ایک تودہ چونا یا پلاسٹر کا کھرچ کر زمین پر گر جاتا ہوگا۔ چنانچہ اب ہر سال

پہلے جب میں خود اس یادگار کی زیارت کے لئے گیا تھا تو بعض عربی احباب کی زبان میں بھی کسی اُستاد کا یہ مشہور شعر

پردہ داری میکند بر طاقِ کسریٰ عنکبوت		بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

قبہ کی چھت پر چاقو کی نوک سے لکھ کر ایک خلافِ حرم کا مرتکب ہوا تھا جس کا اب مجھے افسوس ہے۔ اب اپنی حال کی سیاحت کے سلسلہ میں جب میں پھر حضرت سلمان فارسیؓ کی زیارت کے لئے گیا تو اس چودہ سو سالہ یادگار کی زیارت کے قصد سے مدائن کے خرابہ میں آیا۔ جہاں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ایک جرمن ماہر علم مادیات کی زیر نگرانی کھدائی کا کام جاری ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس جانکاہی کا نتیجہ ظاہر ہونے پر تاریخ قدیم کے صفحات میں معلومات کا معتد بہ اضافہ ہو جائے۔ بہ نسبت پیشتر کے طاقِ کسریٰ کی حالت اب بہت زیادہ نازک ہو گئی ہے اور اگر یہی لیل و نہار رہے تو کیا عجب ہے کہ ایک دن بجائے قبہ اور دیواروں کے اینٹ اور چونہ کا انبار نظر آئے۔ اِس کھنڈر کی زیارت سے میرا دل اس درجہ متاثر ہوا کہ باب مدینۃ علم کا یہ مشہور زمانہ قطعہ دیر تک ورد زبان رہا۔

الا یا ساکن القصر المعلّٰی		ستُدفن عن قریبٍ فی التّراب

لنا ملکٌ ینادی کُلَّ یَوْمٍ		لدوا للموت وابنوا للخراب

"یعنی اے بلند بنگلوں اور کوٹھیوں کے رہنے والو۔ تم بہت جلد خاک میں دفن ہو جاؤ گے۔ ہر روز ہمیں ایک فرشتہ آواز دیتا ہے۔ کہ تم مرنے کے لئے پیدا ہوئے ہو اور یہ عمارتیں جو تم نے بنائی ہیں ایک دن ضرور اُجڑ جائینگی۔"

کُلُّ مَن علیہا فانٍ ویبقیٰ وجہ ربّک ذو الجلال والاکرام

خواجہ عزیز الدین عزیز طباطبائی

(گزشتہ سے پیوستہ)

از جناب سید غضنفر علی صاحب زیدی (ادیب)

اب میں پورا وہ قطعہ نقل کرتا ہوں جو خواجہ صاحب نے مولانا شبلی کے قصیدے کی تعریف کرتے ہوئے اسی ردیف و قافیہ میں لکھا ہے۔ ارباب نظر مجھے معاف فرمائیں۔ تمام و کمال اشعار کو نقل کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ اس خیال کی گنجایش باقی نہ رہے کہ چیدہ چیدہ شعر پیش کئے گئے اور قابل اطمینان انداز ہو سکے کہ زبان دانی و شیوا بیانی میں خواجہ صاحب وحید عصر تھے۔ وہ فارسی میں اسی طرح شعر کہتے تھے جس طرح اہل زبان کہتے ہیں۔ اور اہل زبان بھی وہ جو فن شعر میں دستگاہ کامل رکھتے ہوں اور جنھیں مشق سخن کی وجہ سے ہر مضمون کے دلنشین انداز سے ادا کرنے پر ملکہ حاصل ہو گیا ہو۔ محاسن شاعری کے ساتھ یہ قطعہ مکارم اخلاق کا بھی آئینہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ روشن خیالی اور پاس امور دینیہ میں بھی خواجہ صاحب ایک ممتاز ہستی تھے۔

یہ وقت وہ تھا کہ ہندوستان میں سر سید خوب نمودار ہو چکے تھے اور ان کے جدت خیالات کی رفعت نے قدامت پسندوں کی روک ٹوک کو پست کر دیا تھا۔ بڑے بڑے سحر البیان اسپیکر ان کے گرد جمع تھے اور وہ ہر جلسے میں اپنے مقاصد کے اظہار میں دلیر تھے۔ اس وقت مولانا شبلی چاہتے تھے کہ خواجہ صاحب آگرہ کے جلسے میں ان کے اور مولانا حالی کے ہمنوا ہوں اور سر سید کے نامور گروہ میں شامل ہوں۔ خواجہ صاحب نے اس دلفریب منظر کو دیکھتے ہوئے جو خیالات اس قطعہ میں ظاہر کئے ہیں وہ انکے راسخ عقیدے اور سنجیدگی رائے کے شاہد عادل ہیں اور اس خوبصورتی اور خوش سلیقگی سے ان خیالات کو ظاہر کیا ہے کہ طرفین میں سے کوئی فریق ناگوار اثر نہیں لے سکتا۔ لکچراروں اور اسپیکروں کی ستایش سے دوش بدوش یہ اشعار

ایں ہمہ گفت و شنو باشد ازاں و کہ بقوم | دل و دانائی و دیں ماند و دنیا ماند (الخ)

حقیقت و حقانیت سے لبریز ہونے کے ساتھ ساتھ جس قدر دلآویزی لئے ہوئے ہیں اور حسن ارشاد کی دلپذیر تصویر کھینچ رہے ہیں وہ انکی قادر الکلامی کے بہترین نمونہ ہیں جب تک کہ حکیمانہ دماغ اور ذوق سلیم نہ ہو ناممکن ہے کہ ایسے دشوار گزار مراحل طے ہوسکیں۔

اے کہ رائے تو بود روشن و طبع تو بلند — جائے آنست کہ نظمت بہ ثریا ماند
سطر سطرش بسر زلف دلاویز شبیہ — حرف حرفش بخط و خال دلارا ماند
نکتہ ہا ہست بہر نقطہ و ہر نکتہ بود — دلنشیں نقطہ کہ گوئی بہ سویدا ماند
ہست انگارہ دلخواہ ترا ز انگلیون — یا کہ با پارہ ارژند و از استا ماند
قبلۂ پارسیانست ہمانا ہر بیت — کز دلآویزی و خوبی بکلیسا ماند
معنی و لفظ ز مجنوں نشان دل ببرد — کہ بلیلی و بہ خیمۂ لیلیٰ ماند
ہست تمغائے تو منشور ہنر یغما را — نہ چو تمغائے حریفاں کہ بہ یغما ماند
صد چو خورشید دریں بادیہ بے شید افتد — صد چو جمشید دریں خمکدہ شیدا ماند
لقلم ہر کہ دریں عرصہ قدم بردارد — بہ عصا راہ رود لیک بہ اعمیٰ ماند
جادۂ پیش رواں پیروی از تو نہیر — پیشتر رفتہ و حیف است کہ پس وا ماند
سر برافراز کہ ملک سخن از ملک تو شد — بہ سکندر برسد آنچہ ز دارا ماند
چشم دارم کہ کنی کلبۂ تارم روشن — اے کہ با رائے تو خورشید بہ حربا ماند
چشم بد دور بود طرفہ سواد چشم — کز خیالت بہ سیہ خیمۂ لیلیٰ ماند
چاہ کنعاں ز خیال تو بود گر چشم — دل بخلوتکدۂ خواب زلیخا ماند
مگر از دیدۂ مشتاق من آموختہ است — کہ بہ راحت در غمخانہ ماوا ماند
اے کہ مشروط بایں شرط بود آمدنت — کہ فلاں ہمسفر و ہمرہ و ہمپا ماند
ہوش و صبر و خرد از آمدنت باز آید — چوں تو از جا بروی کیست کہ برجا ماند
ہائے رشک ار چہ نبودی بمیاں میگفتم — کہ خدا با تو چہ پنہاں و چہ پیدا ماند
اے خوشا چوں تو حریفے بہ نیے چوں من — بادہ پیما ید و ہم بادیہ پیما ماند
چوں شود از من و تو مجمع بحرین براگ — جام گردد جمن و گنگ بہ مینا ماند

وندراں مجمع بحرین وجودِ من وتو   فاش گوئیم کہ با خضر و بہ موسیٰ ماند

باز می گردم ازیں راہ و بہ مقصد پوئیم   موسیٰ و خضر ہماں بہ کہ ہمیں جا ماند

بزم آرا چو شود فرقۂ روشن رایاں   مہرِ رخشاں خجل از پرتوِ آ را ماند

رنگ نیرنگ فسوں تیرگی کفر و نفاق   ہمہ باطل ز عصا و یدِ بیضا ماند

تشنگاں را بہ ہر ساغر و سیراب کند   لطف ساقی کہ بہ تر دستی سقا ماند

نشاۂ اخروی و نشاۂ دنیاوی را   بہ یکے جرعہ از و نشاۂ د و با لا ماند

گہ گرانمایہ سحابے ز افق بر خیزد   قطرہ ریز آید و ہر قطرہ بد ریا ماند

گہ روان بخش نسیمے بہ چمن آویزد   نفحہ خیز آید و ہر نفحہ طرب زا ماند

گہ ادیبے ز طلاقت بہ مدارا آید   گہ طبیبے ز حذاقت بہ مدا وا ماند

گاہ از علم و عمل سامعہ جو یا گردد   گاہ از دین و دول ناطقہ گو یا ماند

گہ خطیبے ز میاں خیزد و افتد بہ پاے   تا در افتادگی انطائفہ برپا ماند

اشک ہر دیدہ شود سیل و بہ بطحا برسد   آہ ہر خستہ کشد قد و بہ خرما ماند

ایں ہمہ گفت و شنو باشد ازاں و کہ بقوم   دل و دانائی و دیں ماند و دنیا ماند

دین و دل، دولت و دنیا ہمہ توام باشد   پس ہماں بہ کہ ہم اینہا و ہم آنہا ماند

لیک ہر کس کہ بدنیا بفروشد دیں را   بہ یہود او بہ اخوانِ یہود اماند

وانکہ دنیاش بکام است و کشد رو درہم   ناسپاسیت نفور از من و سلویٰ ماند

دین و دنیا ہمہ آنست کہ تا جاں دارید   غمِ امروز و ہم اندیشۂ فردا ماند

ورہمیں مکتب و ملا و ہمیں طفلانند   ہر یک از دانش و از داد معرا ماند

گرہمیں فتویٰ ہمت بود اے سادہ دلاں   نہ فتاوی و نہ مفتی و نہ افتا ماند

گر قضا و قدر ایں گونہ تقاضا دارد   زود باشد کہ نہ قاضی نہ قضا یا ماند

ہیچ ازیں باغ و ازیں راغ نماند ہیہات   لیک و لنعے بدل از بہر دلا سا ماند

گرچہ اسلام غریب است و شما نیز غریب   اے غریباں مگذارید کہ تنہا ماند

آخر از خانہ خرابی خود اندیشہ کنید   مپسندید کہ ایں خانہ بصحرا ماند

دل برآں لعل گرانمایہ چرا خوں نشود — کہ بروخوار تر از خرمہرۂ مینا ماند
یوسف اندر دہن چاہ فتد و اسفاہ — یونس اندر شکمِ حوت دریغا ماند
کعبہ لرزد بخود از حملۂ پیلان تا چند — زیر صد کوہ محن دامنِ بطحا ماند
گر آں طائرِ فرخندہ کند یاز مدد — عزت و حرمت مرغانِ حرم تا ماند
ہای انطائفہ کو طائف بیت الحرم است — دور از قافلہ سرگشتہ بیدا ماند
کوکبِ دولتِ ایں کوکبۂ عز و وقار — حیف کز فوق ثریا بہ ثریٰ وا ماند
عیش از خیرگیِ ایں وقت بماتم ارزد — روز از تیرگی امروز بہ شبہا ماند
اتفاق است کہ شیرازۂ جمعیتِ اوست — ورنہ دشوار کہ ایں نسخہ مجزا ماند
نیک مرد آنکہ رہ و رسم نیاکاں گیرد — ایمنست آنکہ بہ رسم و رہ آبا ماند
یاد آں خطۂ آباد کہ خوانی بغداد — داد ازاں باغ کز و داغ بدلہا ماند
رفت آں عہد و شد آں مہد کہ از زیبائی — خار او با گل و خار اش بدیبا ماند
میتواں گفت جہاں خلعت عباسی یافت — روز روشن کہ کنوں با شبِ یلدا ماند
نیست بے داغ ازیں غصہ و غم ہیچ دلے — گل دریں گلکدہ با لالۂ حمرا ماند
اگر ایں نخل کہن پرورش از نو یابد — برگ و بار ار دو با سدرہ و طوبےٰ ماند
گر ازاں نفحہ کہ از ناف زمیں خاست دگر — نفحۂ گل کند ایں بادیہ بویا ماند
مدد اے کوکبۂ طالع و اے بخت بلند — کہ دگر رایتِ اقبال فلک سا ماند
با چناں بے سر و پائی و چنیں پست و بلند — سر فلک سا و قدم بادیہ فرسا ماند
از زمیں با زبر افلاک رسد ایں کفِ خاک — سیر اگر بر اثرِ سالکِ اسرےٰ ماند
آں زماں ہر دو جہاں روئے بیک قبلہ بود — در نظر چار جہت چار مصلّا ماند
ہاں و ہاں تن زن و بشکن قلم اے معنی سنج — دست و دل چیدۂ انشا و بہ انشا ماند
سخنت از رہِ اعجاز خود آید بہ سخن — گوی ایں طفلک نوزاد بہ عیسےٰ ماند
بندہ شو بندہ گرت خواہشِ آزادی ہاست — رستگاری ست گر ایں سلسلہ برپا ماند
بندہ آنست کہ خرسند بصد بند بود — بندہ آں نیست کہ دلگیر ز موئے ماند

ہست ہر نقش و نگارے بجہاں نقش بر آب | مگر آں نقش کہ بر خاک ز سیما ماند
ما نمانیم و نہ ماند بجہاں ہیچ ز ما | مگر ایں ماند و ماند کہ ہما نا ماند
نے غلط ایں کہ نماند بہ جہاں ہیچ عزیز | ہمہ ماند کہ خدا و ند تعالیٰ ماند
گشت موسوم بہ فریاد غریب ایں اشعار | اسم باشد ز حقیقت بہ مسمےٰ ماند

قیصر نامہ طبع ہو کر شایع ہو چکا ہے مگر اُسکے چند اشعار جو سبب تالیف کتاب میں ہیں اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں - فرماتے ہیں - ؎

کہن آتش پارسی پژمردہ بود | دل و جان گبراں ہم افسردہ بود
نہ آتش بجا و نہ آتشکدہ | درِ دیر را قفل محکم زدہ
من آوردم آں قفل را چوں کلید | درِ بستہ را شد کشادی پدید
نگہ کرد در تیرگی خیرگی | درخشید برقے دراں تیرگی
بہر گوشہ خاکسترے یافتم | زبس کاوفتم اخگرے یافتم
بداں اخگر ایں آتش افروختم | چو افروختم خویش را سوختم
بمن تافت تا آں درخشندہ نور | بگفتار م آورد چوں نخل طور
کنوں فال آتش زبانی زنم | بموسیٰ دم لن ترانی زنم

ان اشعار کی روانی و شیرینی ظاہر ہے کہ کس درجہ فصاحت پر ہے اسی کے ساتھ نظامی کا حُسن تتبع بھی دیکھنے کے لائق ہے کس پاکیزگی سے اس رنگ کو اختیار کیا ہے سخندانان و نکتہ رس اصحاب جانتے ہیں کہ جس زبان میں شعر کہا جائے حسن یہ ہے کہ انداز تخئیل بھی وہی ہو جو اُس زبان سے مناسبت رکھتا ہو - یہ نہ ہو کہ زبان تو امرا القیس کی اختیار کی جاے اور تخئیل میں میاں جرات کی تقلید ہو - خواجہ صاحب کے اشعار سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہندی فارسی کہہ رہا ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا کبھی پپیہے اور کوئل کی آواز ہی اُن کے گوش زد نہیں ہوئی اور ہمیشہ عندلیب و طوطی ہی کے چہچہے سنتے رہے ہیں

ایک دفعہ خواجہ صاحب نے ایک مستی ادیب کا ذکر فرمایا ہے (مجھے اُن کا نام یاد نہیں رہا) کہ وہ ملنے آئے اور دیر تک اُنھیں کے مذاق کے موافق اُن سے باتیں رہیں - اس سلسلے میں بعض ہندوستانی

ادیبوں کا بھی ذکر آیا۔ مگر اُنھوں نے ہر ایک کے ذکر پر سکوت کیا اور کچھ ہاں ہوں کہہ کر رہ گئے۔ اور آخر میں یہ کہا کہ یہاں مولوی فضل حق خیرآبادی خوب کہتے تھے یہ بات میرے ذہن میں رہی مگر مدت مدید تک مولوی صاحب کا کلام میری نظر سے نہ گزرا جس سے میں اس نکتہ کو سمجھ سکتا پھر نواب صدیق حسن خاں کی ایک کتاب میں مولوی صاحب کا ایک قصیدہ میں نے پڑھا اور ذہنی بزرگ کا وہ ارشاد جو خواجہ صاحب نے مجھ سے نقل کیا تھا یاد آیا۔ غور کیا تو یہی بات تھی کہ تخئیل بھی بیان کی مناسبت سے تھی

معاذ اللہ میرا مقصود اس سے ان بزرگوں کی کوئی تنقیص نہیں بلکہ ایک اظہار رائے ہے۔ میر تقی میر مرزا رفیع سودا۔ میر انشاء اللہ خاں اور مصحفی نے متقدمین کے طبقے میں اور منشی مظفر علی اسیر نے متاخرین کے دور میں فارسی میں غزلیں وغیرہ لکھی ہیں مگر کسی میں وہ بات نہیں جو ہونا چاہیے۔ مرزا رفیع سودا نے خود اسے تسلیم کرلیا ہے۔ چنانچہ ایک قطعہ میں لکھتے ہیں۔ ؎

دیار ہند میں دو چار ایسے ہو گزرے   جنھوں نے باز رکھا مضحکے سے اپنے تئیں

چنانچہ خسرو فیضی و آرزو و فقیر   سخن اُنھوں کا مغل کے ہی قابل تحسیں

سچ پوچھیے تو خان آرزو بھی اس اڑہ میں نہیں آتے وہ فارسی کے معلم و مدرس سہی مگر اہلِ زبان دیدے وہ ٹھیٹ کتابی ملا تھے۔ کسی کتاب میں سہواً کاتب نے خم شکنی کی جگہ خم تنکی لکھدیا ہو گا یا تے اور نون کے تین متفرق نقطے مل گئے ہونگے۔ خان ممدوح نے خم تنکی پڑھا اور سمجھ لیا کہ یہ مرادف تنک ظرفی ہے۔ نیا لفظ ملا، فوراً اپنی کتاب "چراغ ہدایت" میں درج کر دیا اور اس شعر سے استشہاد کیا۔ ؎

اے محتسب سنگدل ایں خم شکنی چیست   شرمندہ شو اے بیخرد از روح فلاطوں

حالانکہ اصل مضمون یہ ہے کہ فلاطوں خم نشینی میں مشہور ہے۔ اسی عایت سے میکش محتسب کو خم کے توڑ ڈالنے پر ملامت کرتا ہے کہ اس میں شراب ہی نہیں ہے۔ بلکہ فلاطون کی روح بھی ہے۔ بے عقل خم کو توڑنے میں تجھ کو شرم آنا چاہیے اور حکیم کا پاس و لحاظ رکھنا چاہیے۔

خواجہ حسین مروی کا ۱۳ شعر کا قصیدہ جسکے ہر شعر کا پہلا مصرع جلوس اکبر کی تاریخ ہے اور دوسرا مصرع جہانگیر کی ولادت کی تاریخ۔ اور خواجہ صاحب کا ۷۵ شعر کا قصیدہ جسکے ہر مصرع سے تاریخ جلوس میر محبوب علی خاں شہریار دکن نکلتی ہے۔ اگر پورے پورے نقل کئے جائیں تو طول ہوگا۔ لہذا ہر ایک کے اول کے دس دس شعر اور آخر کے دو دو شعر نقل کرتا ہوں۔ اور میری دانست میں انداز سخن کے متعلق

رائے قائم کرنے کے لئے کافی ہیں۔

خواجہ حسین مروی

لِلّٰہ الحمد از پے جاہ جلال شہریار	گوہر مجد از محیط عدل آمد بر کنار
طائرے از آشیان جاہ و جود آمد فرود	کوکبے از اوج عز و ناز گردید آشکار
گلبنے این گونہ ننمودند بر دور چمن	لالہ زین گونہ نکشود از میان لالہ زار
دایۂ ابر بہار از مہربانیہائے فضل	سبزہ با گل ہم زبان گوہر بہ لولو کردیار
مہر میگویدکہ می زیبدکہ آں مہ پارہ را	از پئے زیب جمال از زہرہ سازم گوشوار
مقدم مولود می افزود زیب شہ اگر	لولوے لالہ فزودے زیب دُر شاہوار
شاد شد دلہا کہ باز از آسمان عدل و داد	یا ز دنیا زندہ شد کز مہر ایام بہار
آں ہلال برج قدر و جود و جاہ آمد برون	واں نہال از روے جان شاہ آمد بہار
شاہ اقلیم وفا سلطان ایوان صفا	شمع جمع بیدلاں کام دل امیدوار
عادل کامل محمد اکبر صاحبقراں	پادشاہ نامدار و کامجوی و کامگار
... ...	... ...
تا بود باقی حساب روزہای ماہ و سال	واں حساب سال و ماہ و روز دوراں نامدار
شاہ ما پایندہ باد و باقی آں شہزادہ ہم	روزہاے بے حساب و سالہاے بیشمار

(تاریخ بدایونی ج ۲ ص ۱۲۱)

خواجہ صاحب

نازم بکلک قادر نقش آفرین را	نقش مراد عہد نشاندہ بجا
دیدی چہ نقش ناز بہ کرسی نشاندہ اند	یا گشتہ نازل آیہ کرسی بصد دعا
گویا نواز تازہ نشیدے بر آورد	زین نقش نو چہ یافت نئے کلک ما نوا
از مشرق شکوہ بزیب و صفا و حسن	طالع شدہ ستارہ چہ نیکو بعہد ما
ہند آسمان عزت و جاہ ست و زین سبب	سر بر زد آفتاب نوے از مطلع صفا
پرگار دہر بود بکامش اگرچہ لیک	حقا کہ حق بمرکز اینک گرفت جا

بارے شدان سادہ نشین کز فلک ملک　　داد از ادب صدا کہ علی عرش استویٰ

باشد باوج مسندِ کالشمس فی النہار　　زاں ہر دو زلف ویش کالیل فی الدجیٰ

گلدام دولت آمد شاید دو گیسوش　　گلیا تنگ دام ظلہما می زنند ہما

گشتہ رواں فزایدلم مژدۂ جلوس　　قربان آں جلوس چہ شد دلنشینِ ما

... .　　... . ...

تا دانہ دانہ تاک ہمی آورد نمو　　تا جرعہ جرعہ آب بجو ریزد از سما

احباب تو مدام ز جام مراد مست　　اعدائے تو بکام ز سر چشمۂ فنا

انصاف بالائے طاعت است۔ خواجہ حسین کی فضیلت تقدم مسلم مگر بتامل نظر کرنے سے ظاہر ہوگا کہ رعایت جلوس و فصاحت کلام و چستی بندش و محاسن سخن کو جس طرح خواجہ صاحب نے ہر شعر میں ملحوظ رکھا ہے اس طرح خواجہ حسین نے اپنے قصیدے کے سنوارنے میں سعی نہیں کی۔ اُن کے ہر شعر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اعداد تاریخ پورا کرنے کی ضرورت شعر کے شستہ و برجستہ ہونے میں مانع آرہی ہے۔ اور خواجہ صاحب کے شعر میں یہ بات نہیں ہے۔ قید تاریخ کے ساتھ حسن کلام میں کہیں فرق نہیں آیا۔

اِس جگہ یہ بات پیش نظر رکھنے کے لائق ہے کہ عہد اکبری قدردانیٔ کمال کے اعتبار سے بے نظیر اور بالخصوص شعرا کے لئے عہد زریں تھا۔ چنانچہ دار السلطنت میں سحر طراز اہل سخن دُور دُور سے آکر جمع ہوگئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں حصول صلہ و تحسین کی اُمیدیں کیا کچھ دل و دماغ میں قوت و تازگی نہ پیدا کرتی ہونگی۔ اور برخلاف اُس عہد کے یہ دور جس میں خواجہ صاحب تھے جیسا ہے پیش نظر ہے۔ صلہ درکنار داد سخن دینے والے بھی نہیں۔ اس زمانے میں اس حسن سے شعر کہنا بیشک دلیل کمال ہے۔

مرزا بیدل جو ہندوستان کے مشہور شعرا میں ہیں اُنھوں نے بھی نواب شکر اللہ خاں کے فرزند میر عنایت اللہ خاں کے جشن شادی کی تہنیت میں دس شعر کا قطعہ جسکے ہر مصرع سے تاریخ نکلتی ہے کہا۔

(قطعہ)

کاشانہ صلائے عیش در داد　　اے دہر طرب مبارکت باد　　۱۱۱۱ھ

رشدِ اقبال دارد امروز　　ہمراہی خان معنی ایجاد

وقتست کہ از نوائے دلہا　　سازِ دوراں رسد بارشاد

عہد گہریست زیورِ جاہ　　حاسد ملعون دوستاں شاد
از فرّۂ او دعاے ایں فیض　　عالم چمنیست عرش بنیاد
جوشید ز دورِ الفتِ اہم　　مطلوب دعاے سرو و شمشاد
یارب ز تنزّلِ فسردن　　ایں گل گرہ خزاں مبنیاد
ہر مصرع ازیں طریق موزوں　　دارد ز شہور سال تعداد
اکنوں بمکاں [1] خاص　　شعرے زدہ مصرعم ندا داد
اوقات سعادتِ دو کوکب　　شیرازۂ الفتِ دو ہمزاد

(تذکرہ شیر خاں ص ۳۳۰)

مرزا صاحب شعر کو خوشنما اور دلچسپ ترکیبوں سے رنگین بنانے میں مشاق ہیں مگر اس قطعہ میں ہر جگہ رہ گئے۔ بہت کھینچ کھینچ کر زبردستی لفظوں کو ایک دوسرے کے پاس بٹھاتے ہیں لیکن کسی کو موزوں جگہ نہیں ملتی۔ اس محنت و مشقت کی داد دینے کے بجاے میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اور ستم ظریفی کی۔ آخری شعر پر جو قطعہ کا سرجوش ہے اعتراض کر دیا کہ

"لفظ ہمزاد در حقِ عروس و داماد طرفہ واقع شدہ۔ صاحب فرہنگ رشیدی گوید ہمزاد توام کہ از یک شکم زادہ باشد۔" (خزانہ عامرہ ص ۱۶۶)

امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے تہنیت جلوس میں سید ناصر علی نصیر نے چودہ شعر کا قصیدہ اسی قید کے ساتھ لکھا ہے کہ ہر مصرع سے تاریخ نکلتی ہے۔ مطلع ہے۔

اے حبیبت آفتاب مطلع اقبال و جاہ　　بار کاب تو دواں صبح و مساایں مہر و ماہ (۱۲۵۸ھ)

در رکاب اگر بار کاب کی جگہ ہوتا تو مطلع مطلع آفتاب ہوتا۔

بحر با لطف و نوالِ تو بسانِ قطرۂ　　کوہ با شانِ معلای تو کم از برگ کاہ
چوں تو سلطانِ صاف دل نادیدہ پیر آسماں　　صبح صادق اور یں معنی ہمی آدم گواہ

بادی النظر میں یہ شعر بھی روانی سے خالی نہیں، مگر سلطان کی جگہ "سلطانے" اور "دریں معنی" کی جگہ "بریں معنی" ہوتا تو اچھا ہوتا۔ چودہ شعروں میں ان تین اشعار سے اچھا اور کوئی شعر نہیں ہے

---

[1] کاغذ کرم خوردہ ہے لفظ پڑھا نہیں گیا۔

بہر کیف سید صاحب مرزا صاحب سے اس وادی میں بڑھے رہے۔

کہا گیا ہے کہ طہماسپ قلی بیگ ترک نے دارا شکوہ کے بزم کدخدائی میں اسی صنعت میں قصیدہ لکھا تھا اور خوب صلہ پایا۔ میں نے بادشاہ نامہ دیکھا مگر طہماسپ قلی بیگ کا نام اور یہ قصیدہ نظر نہ آیا۔ بلکہ دارا شکوہ کے جشن طوی کے موقع پر ابوطالب کلیم کی تاریخ مذکور ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ قصیدہ مقبول و مطبوع نہ ہوا۔

خواجہ صاحب نے جو قصیدہ تہنیت صحت میں لکھا ہے اُسکے شروع میں چھ شعر یہ ہیں۔ ہر شعر سے چار تاریخیں نکلتی ہیں۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

سنہ ۱۰۳۱ھ طرب یابید جن شکر و سپاس داور منان — بخشش یونس زماہی باشد یوسف از احزان

خود از احکام حق آمد بموسیٰ گہ سرآب آب — ز لطف وے با براہیم گہ گلزار شد نیران

بامر اللہ نگو آصف ز رنج جاں نجات او دید — بحمد اللہ بنا گہ رستہ نوح از وطر طوفاں

بہ بیماری بسے گویا تنگہ کردست سوے شہ — بگلشن دیدہ بہر از ایں ہر دم بود حیراں

چمن گر روزگار ایں گل بریں گل آید ن بلبل — زہے باشد فلک ماہ و جہاں تن کی مہ جاں

ہم او شاہی ست دادا نو وہم ماہی سما آرا — ہم او مہریست دل افروز وہم او سایۂ یزداں

چار چار تاریخوں کی قید کے ساتھ حق یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے اس حد تک حسن نظم کے نظام کو قائم رکھا اور یہ اُنھیں کا کام تھا۔ مُلا وحشی یزدی نے اپنی مثنوی ناظر و منظور کی تاریخ تالیف میں ایک مصرع کہا کہا ہے۔ جس سے چار تاریخیں نکلتی ہیں۔ الفاظ نقطہ دار سے۔ الفاظ بے نقطہ سے۔ الفاظ متصل سے۔ الفاظ منفصل سے۔ ؎

کتاب ناظر و منظور ہیں کہ ہست بتلش — ز آسمانِ کمال است آیتے منزل

چو درس دولت و اقبال ہیر سہ بنظام — ازیں کتاب کہ در بیشیا لیست مثل

سنر کہ از پئے تاریخ نظم وے گویم — شدہ بنظام ۹۶۶ درِ درج درس درج دو دل ۹۶۶

اس حسن کا مصرع ظاہر ہے کہ وحشی کے سوا اور کون کہہ سکتا ہے۔

سید رحم رسول بلگرامی بالاتخلص نے اپنے والد بزرگوار سید جمال علی قدس سرہ کی تاریخ وفات میں ۱۲ شعر فرمائے ہیں اور ہر مصرع سے سنہ ۱۲[illegible]ھ تاریخ وفات نکلتی ہے اور حروف منقوطہ وغیر منقوطہ

بھی ۔ مگر بجز اجتماع الفاظ کے اور کچھ نہیں ۔۔۔

مرجع اقبال و ہمت عمدۂ کون و مکاں اسوۂ ملاک سعادت قبلۂ ہر انس و جاں

قدوۂ اقطاب دہر و مجمع ارشاد حق داور امجاد ملت نامدار تقا بلال

صاحب علم و طریقت ہادی مجد و صفا سرور اعظم قفان و پیشوائے امجداں

حاشیہ پر لکھا ہے قفاں مخفف قفّان بالتشدید ۔ مرد امین ۔

ذیل میں خواجہ صاحب کی دو غزلیں درج کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ اُن کے ذوق شاعری کی پاکیزگی اُن کے خیالات کی رفعت کس پایہ کی تھی ۔۔

شب معراج دلہا ہست گیسوے کہ او دارد مقام قاب قوسین آمد ابروے کہ او دارد

اگر فرہاد و شیریں خستۂ آں پیشۂ شیریں وگر لیلی و مجنوں صید آہوے کہ او دارد

بابلے مے آوروند صد چوں سامری ایماں برد از جادوداں ان چشم جادوے کہ او دارد

نہ گل را ہست مے مل را نہ عود کانہ عنبر را بہ رورنگے کہ او دارد بہ موبوے کہ او دارد

مہ مصر ہست داغ از رشک مہتابے کہ من دارم زلیخا کور شد در حسرت خوابے کہ من دارم

دل ست ایں کاں حریف آتش عشقت بود ورنہ جہنم بر نمی تابد تب و تابے کہ من دارم

نہ گلچیں را ابدا مان ست نے در جام ساقی را بیاد دوست در دل آتش و آبے کہ من دارم

ضروری گذارش

مضمون کے پہلے حصہ میں تذکرہ شمع انجمن کا سال تالیف غلط چھپ گیا ۱۲۹۲ء صحیح ہے ۔

اور مصرع تاریخ وصال حضرت مولانا عبد الرزاق صحیح یوں ہے ۔

نور پاکے بود در انوار حق واصل شدہ

سلطان محمد تغلق عادل شاہ

گزشتہ سے پیوستہ

(۳)

مسٹر کے۔ ایم۔ مشیر احمد علوی بی اے۔ علیگ

''فصل دوم''

''باب اوّل''

سلطان محمد تغلق ۱۳۲۵ء

ربیع الاول ۷۲۵ھ کی آٹھویں، اور فروری ۱۳۲۵ء کی بائیسویں تھی۔ جمعرات کے دن مشتری کی ساعت سعد میں سلطان غیاث کے سوم کے بعد تغلق آباد میں جونا خاں (الغ خاں) تخت شاہی پر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اور عمر کے اکتیسویں سال میں سلطان محمد تغلق لقب اختیار کرکے اپنے آقائے ولی نعمت قطب الدین اور شفیق باپ غیاث الدین تغلق کا اکلیل جہانبانی سر پر رکھا خطبہ و سکہ جاری ہوا چہلم کے بعد اٹھارھویں ربیع الثانی (دوسری اپریل) کو دوشنبے کے دن دارالخلافہ دہلی میں شاہانہ عظمت و جبروت کے ساتھ داخل ہوا اور اس جاہ و جلال سے اسکی اورنگ نشینی کی رسم ادا کی گئی کہ سلاطین پیشین کے افسانے فراموش ہوگئے۔ نیز اس حد تک زرپاشی کی گئی کہ معلوم ہوتا تھا گویا حقیقتاً آسمان سے سونے چاندی کا مینہ برس رہا ہے۔ غربا مالا مال ہوگئے۔ امرائے سلطنت کو جاگیریں بٹیں اور خلعتہائے فاخرہ تقسیم کئے گئے۔ علمائے کبار و فضلائے روزگار کے وظائف خزانۂ شاہی سے مقرر ہوئے۔ رفقائے خاص و اراکین دربار کی عزت افزائی مختلف طریقوں سے کی گئی۔ ملک زادہ احمد ایاس کو خواجہ جہاں کا

خطاب ملا۔ علاوہ اس اعزاز کے قلمدان وزارت بھی انھیں کے سپرد ہوا۔

سلطان محمد تغلق نے ہوش سنبھالا تو سلطان علاء الدین کے عدل و آئین جہانداری کی شہرت تھی اور عمر کا بیشتر حصہ اولوالعزم شاہوں کی رفاقت و خدمتگزاری میں صرف ہوا ممکن ہے کہ جب وہ بچہ ہی ہو تو کسی روشن ضمیر نے اُسکو سلطنت و بادشاہت کی بشارت دی ہو۔ اُسکی عقلمندی و مصلحت بینی اس پائے کی تھی کہ ملک کشلو خاں جہاندیدہ آج سے چند سال قبل ہی اُسے خسرو خاں کے بعد سلطنت کے قابل سمجھتا تھا۔ وہ قطب الدین کا مشیر سلطنت تھا اور ادھر خود بھی ملازم تھا اور جاں نثار بھی۔ میدان میں جاں بازی کے جوہر دکھاتا اور نظم و نسق سلطنت میں اپنے بیش قیمت مشوروں سے سلطان کی ہر دلعزیزی حاصل کرتا تھا۔ وہ عنفوان شباب سے فقیروں کا نیاز مند اور علما و فضلا کا خادم تھا خصوصیت سے حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ کا معتقد تھا۔ جب خود مختار شہنشاہ ہوا تو سلطان غیاث کی جمع کی ہوئی دولت جو اُسے تلنگانہ، نونگل اور بنگالہ وغیرہ کی فتوحات سے حاصل کی تھی فقرا و علما کی خاطر و مدارات میں بے دریغ صرف کرنے لگا۔ بادشاہ نے علوم و فنون کی قدردانی کی تو تمام امرائے سلطنت بھی علم دوست ہو گئے تعمیرات کی طرف اسے خاص توجہ تھی حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ کے مزار مبارک کا بہت خوبصورت قبہ آج تک اُس کی اُولوالعزمی و سیرچشمی و فراخ حوصلگی کی یاد تازہ کئے ہوئے ہے۔[1]

[1] آج اس مزار کو بنے ہوئے تقریباً چھ صدیاں گزر چکی ہیں سلطنتیں بنیں بگڑیں۔ دہلی لُٹی اور اُجڑی۔ لیکن سلطان جی کا مقبرہ اسی شان و شوکت سے (نظام الدین غیاث پور میں) موجود اور مرجع خلائق ہے۔ اور کروروں بندگانِ خدا بغیر کسی مذہب و ملت کی قید کے عقیدتمندی و اخلاص سے گوہر ہائے آبدار نثار کرتے ہیں اور اپنی مرادوں اور تمناؤں کو اپنے عقائد کے موافق حاصل کرتے ہیں۔

حضرت سلطان جیؒ نے ارشاد فرمایا تھا کہ میرے مزار پر کوئی روضہ نہ بنایا جائے لیکن مخلص بے ریا مرید یا خدا سلطان محمد نے اس وصیت کی تعمیل میں تامل کیا اور اپنے پیر بھائیوں سے مشورہ کر کے مقبرے کی تعمیر کا حکم صادر کر دیا۔ حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ کے پائیں ہی ابو الحسن امیر خسروؒ کی درگاہ مرجع خلائق ہے۔ اخبار ناخیار کی روایت ہے کہ اٹھارویں ذیقعدہ سنہ ۷۲۵ھ م سنہ ۱۳۲۴ء کو آپ کا وصال ہوا اور اس مقام پر جو یاراں کا چبوترہ کہلاتا تھا مدفون ہوئے۔ آپکے مزار کے سرہانے لوح پر بھی تاریخ وصال کندہ ہے جسکا پہلا مادہ عدیم المثل (صفحہ آئندہ ملاحظہ ہو)

اِس باعظمت شہنشاہ کے اخراجات کی کوئی حد نہ تھی لیکن تعریف تو یہ ہے کہ کبھی خزانے پر ان زرپاشیوں کا بار نہ پڑا۔ ایک ایک دن کا اس کا خرچ بادشاہوں کے سالہا سال کے خرچ کے برابر ہوتا تھا۔ اسکی سخاوت نے حاتم کی مفروضہ سیرت کو ماند کردیا۔ محتاجوں کے لئے محتاج خانے، بیماروں کے لئے شفاخانے اور مسافروں کے واسطے مسافر خانے بنوائے تھے "در داد و دہش نہایت عالی ہمت، تمام خزانہ واخواستے کہ بیک کس انعام کند بخشش تمام عمر حاتم کہ بہ سخاوت مشہور است کمترین عطایاے یک وزہ او بود، در پیش دست عطاے او غنی و فقیر و فہیم و مسافر مسلم و کافر یگانہ و بیگانہ برابر بودہ، تاتارخاں حاکم ستارگاؤں را بہرام خاں خطاب دادہ دریک روز صد فیل و ہزار اسپ و کرو تنگہ زرسرخ بخشید۔ و ملک سنجر بدخشی را ہشتاد لاک تنگہ و ملک الملوک را ہفتاد لاک تنگہ و ملک عزالدین را چہل لاک تنگہ و ملک غزنوی را ہر سال کرور تنگہ میداد[1]۔ مولانا جلال الدین حسام قصیدہ در مدح سلطان آورد چوں مطلع آنرا خواند چند ہزار چہرہ انعام دادہ فرمود کہ زیادہ ازیں نخواند کہ مرا ز عہدہ صلہ آں نمیتوانم برآمد[2]۔"

مگر مصنف خزانہ عامرہ نے تذکرہ جمال الدین دہلوی میں یہ واقعہ اس طرح لکھا ہے کہ "مولانا جمال الدین سلطان محمد تغلق کی مدح میں ایک لاجواب قصیدہ لکھ کر لے گئے جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہانباں را محمد شاہ تغلق ابن تغلق ابن سلطاں را

بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا نے صرف مطلع ہی پڑھا تھا کہ سلطان نے منع کر دیا اور فرمایا کہ میں بقدر اشعار کے صلہ دینے سے معذور ہوں، یہ کہکر اشرفیاں منگوائیں اور حکم دیا کہ مولانا کے قدم سے سر تک اشرفیوں کا انبار لگا دیا جائے۔ اشرفیاں سر تک پہونچی تھیں کہ مولانا کھڑے ہوگئے۔ سلطان کو یہ ادا بہت پسند آئی۔ دوبارہ حکم دیا کہ قد آدم انبار لگا دیا جائے۔ سبحان اللہ! کیا شاعر تھے اور کیسے قدر دان۔ بہر حال پہلے قصے میں جلال الدین حسام نام ہے۔ اور دوسرے میں جمال الدین۔ غالباً یہ دونوں مختلف اشخاص ہیں اس لئے دونوں واقعے نقل کر دیئے گئے[3]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸) اور دوسرا طوطی شکر مقال ہے۔ اس درگاہ میں ہر سال ۱۷ شوال کو بہت ہجوم سے میلہ ہوتا ہے اور موسم بہار میں بسنت بھی خوب ہوتا ہے اور اسکا عموماً التزام رکھا جاتا ہے کہ آپ ہی کا کلام گایا جائے۔ لطف دیکھیے دو دوست عمر بھر جدا نہ ہوے لیکن ایک حضرت سلطان جی میں جگہ پاتے ہیں اور دوسرے دولت آباد میں۔ (امیر حسن سنجری)

[1] تنگہ زمانہ حاضرہ کے سکے کے مطابق ۸ تولہ ۱۰ ماشہ کا ہوتا ہے۔ ۲ اشاہان لودہ۔

[2] خزانہ عامرہ تذکرہ جمال الدین دہلوی۔ ۲۔ (بوساطت حافظ منشی نصیر احمد علوی سلمہٗ اورنگ آبادی)

[3] فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی۔

جملہ مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ اسلام سلطان کو ورثہ میں ملا تھا۔ نماز پنجگانہ کبھی قضا نہ کرتا تھا اور حتی الامکان با جماعت ادا کرتا۔ عمر بھر کبھی روزہ رمضان المبارک قضا نہ ہوئے۔ حرام کاری اور قمار بازی سے کوسوں دور بھاگتا۔ شیریں گفتار ایسا کہ فی الواقع اُس سے مکالمت میں لطف حاصل ہوتا اور اُس کے مُنہ سے پھول جھڑتے معلوم ہوتے تھے۔ اُسکی دلچسپ پر مغز گفتگو سے کبھی دل سیر نہ ہوتا۔ خوشنویس ایسا جس کو اُستادان فن اُستاد تسلیم کرتے تھے۔ عربی و فارسی میں ایسا منشی بے بدل تھا کہ اچھے اچھے دبیر کامل اس پر رشک کرتے۔ فارسی اشعار خود بہت خوب کہتا تھا۔ متقدمین کے اشعار خوب سمجھتا تھا۔ قوت حافظہ اُسکی ایسی عمدہ تھی کہ جو بات ایک بار سُن لیتا مدتوں اُسے یاد رکھتا۔ ہزارہا اشعار زبر تھے کتابیں کی کتابیں اُسے حفظ تھیں۔ شاہنامہ، سکندرنامہ، قصہ مسلم اُسکی نوک زبان تھی۔ منطق، طب، الٰہیات اور طبعیات و ریاضی میں اسکو ید طولےٰ حاصل تھا۔ مرضا کا علاج کرتا۔ تشخیص مرض میں اطبائے وقت سے بحثیں کرتا اور اُن کو قائل کرتا۔ فلسفے کی دقیق بحثوں سے دلچسپی لیتا۔ بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی سے اُس کی صحبت خالی نہ رہتی تھی۔ فرصت کے اوقات میں شاہان عالم کے سوانح حیات سُنتا۔ علم قیافہ میں اسے کمال حاصل تھا۔ ہر شخص کی خصلت و جبلت کو اُسکے چہرے و بشرے سے دریافت کر لیا کرتا تھا۔ نہایت درجہ خلیق متواضع، منکسر المزاج منصف اور شجاع تھا۔ باوجودیکہ میدان جنگ اُسکا گھر تھا اور بمشکل کوئی ایسا سال ہوتا ہوگا جسمیں وہ کسی نہ کسی لڑائی میں شریک نہ ہو۔ پھر بھی وہ آرام کے اوقات میں بزرگوں کے حالات بہت غور و خوض سے سُنتا اور موقع ملتا تو اُن کی خدمات میں حاضری دینا سعادت ابدی تصور کرتا۔ سچ ہے نیت کا پھل ملتا ہے۔ جیسی نیت ویسا ہی پھل۔ چنانچہ اس خوش عقیدہ اور جلیل القدر شہنشاہ کی نیازمندی اور خدا ترسی میدان جنگ میں اُسکے سر پر نصرت و اقبال کے سدا بہار پھول نچھاور کرتی اور حاسدان بد اندیش جو تدبیریں اُسکے نقصان و مضرت کی کرتے وہ خود ہی اُسکا شکار ہو جاتے۔

اُسکے سب سے بڑے معترض برنی کو شکایت ہے کہ سلطان میں کسی حد تک اعتزال کی جھلک آگئی تھی۔ وہ نہایت سخت الفاظ میں سلطان کی فلسفیانہ تحقیقات پر تنقید کرتا ہے اور اُن کی تمام ذمہ داری سعید و عبید پر (جو حاشیہ نشین تھے) ڈالتا ہے، کہ یہی افراد سلطان کو دین حقہ کی راہ راست سے ہٹانے کا باعث تھے

۵ے فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی ۱۲ شمس سراج عفیف مخطوطات ۱۲

انھیں کی وجہ سے وہ اعتزال کی طرف مائل ہوگیا تھا اور اسکا تعصب جاتا رہا۔[۱]

یہ اعتزال کا الزام محمد تغلق پر اس لئے خواہ مخواہ عائد کیا گیا ہے کیونکہ وہ بہت سخت تھا۔ تقدیس عمر، عزیز داری۔ غرضکہ دنیا کی کوئی عزیز سے عزیز شے بھی اسکے غصے اور انصاف سے پناہ میں تھی اُس نے بہت آزادی سے ان ریاکار شیوخ اور دنیا ساز علما و فقرا پہ ہاتھ ڈالا جو دین و مذہب کی آڑ میں خلق اللہ کو دھوکا دیتے تھے یا جنھوں نے غصب و تغلب کیا یا مالیات عامہ میں خرد برد سلطان نے ایسے اشخاص کو سخت سے سخت سزائیں دیں اور اس میں کسی کی رو رعایت نہ کی اور اس کو یہی چاہیے تھا سب سے بڑی وجہ (مولویوں شیوخ اور خصوصیت سے) برنی کے غصے کی یہ تھی کہ سلطان نے اس حکومت کو جو اس سے پیشتر مذہبی افراد کے ہاتھوں میں تھی سلب کر لیا۔ کیونکہ اُسکے نقطہ خیال سے اس مذہبی گروہ کو حکومت سے سروکار نہ تھا اور نہ اُس میں سیاست کی اہلیت ہی تھی۔ اس لئے کہ ایسے ہی نام و نمود کے افراد خلق اللہ کو مختلف النوع مکائد سے پھانسا اور تکلیف پہونچایا کرتے تھے۔ اِس خورشید عالمتاب نے خوش اسلوبی سے سنہ جلوس کے پہلے دو برسوں میں لشکر کو مرتب کیا اور فوج کا جائزہ لیا۔ ممالک ہندوستان (اودھ اور پنجاب، بنگال، بہار) گجرات، مالوہ، تلنگانہ کینیلہ، دھوارسمدر، ملیبار (ملیبار) لکھنوتی۔ چٹ گاؤں (چٹگام) سنارگاؤں اور ترہٹ کو اپنے قبضے میں لانے کی عمدہ تدبیریں سوچیں اور آخرکار قابض بھی ہوا۔ اِسکے عہد میں سب راجہ، رائے، زمیندار، باج گزار اور فرمانبردار تھے۔ خزانے کا پیسہ پیسہ خزانۂ شاہی میں جمع ہوتا تھا کسی سرکش و متمرد کو سر اُٹھانے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ دور دراز صوبجات ہند کا انتظام ایسا ہی عمدہ تھا جیسا کہ دارالسلطنت کے قرب و جوار میں نیر اقبال کے طلوع ہوتے ہی تھوڑے عرصے میں ایسا عمدہ انتظام ہوگیا جو سلاطین ماضیہ کے زمانے میں کبھی نہ ہوا تھا۔

۷۲۵ھ سے ۷۲۷ھ تک سلطان نے حسب ذیل امور سرانجام دئے۔

(۱) ہر محکمے کے آئین و ضوابط مقرر کئے۔

"ہر روز چند حد بست و دو بست حد بست، فرمانش بخط توقیع در دیوان خریطہ وارکان دیوان دیوان طلب احکام توقیع نام شدہ بود، می پرسید و بر حکم آں احکام محدود نفاذ امرا از ولایات و مقطعان و متصرفان اقرب و ابعد اقالیم طلب می شد و در تقصیر دریں حال تغیرات و تشدیدات جاری گشت۔"[۲]

---

[۱] برنی، تاریخ فیروز شاہی ۱۲ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۲

[۲] فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔

(۲) دولت آباد کے قلعے کی تعمیر اور شہر کی درستی و صفائی کی۔

(۳) مابین دہلی و دولت آباد مسافروں کی آسائش کے لئے انتظامات کئے۔

(۴) ملک کے ہر حصے میں عمال و حکام مقرر کئے۔

(۵) ملک کی مال گزاری کی وصولی کے لئے قوانین مرتب کئے۔

"در چند سال اول جلوس سلطان محمد فراخ ممالک دہلی، گجرات، مالوہ، دیوگیر، تلنگانہ، کنبلہ و دھوار سمدر، ملیبار، ترہٹ، لکھنوتی، سنارگاؤں، ست گاؤں، چناں مضبوط شد کہ محلات اقالیم و عرصات مذکورہ باں دوری و بعد مسافت چنانکہ حساب کرد قصبات و دیہا ے میان دو آب می شود- در دیوان وزارت دہلی ہمچناں می شد ...... [1]"

---

[1] فیروز شاہی ضیاء الدین برنی - ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔

قند پارسی

(جناب علی بھر سری مرحوم)

قیمتِ یوسف ببازارت کم از بیگانگی است
منصب شمع اندرونِ بزم تو پروانگی است

بر سر کوے تو اے جانم سرِ دیوانگی است
وین سرِ دیوانگیم از سرِ فرزانگی است

مور دِ لطفم عتابش بر نتابم چوں دمے
با منش جور و عنایت از ابو خانگی است

ساقیا مے دہ چرا ایں گوشہ پردل گشتۂ
با دیہ پیمائی ما از تہی پیمانگی است

ہمچو پروانہ بہ پاے یار خاکستر شدم
با وجود ایں بمن آں شمع را بیگانگی است

مختصر سازید یاراں قصۂ ما پیش یار
ناشنودن حالم از دراز درازا فسانگی است

منع باشد گشتنم در کوے ہم ابدا اقلیک
دشمناں را رفتن اندر بزم او پروانگی است

نیست از مردانگی خود کشتنت در عاشقاں
کشتن قیباں کہ ایں در عاشقی مردانگی است

خسروا دیوانہ کردی سیر دیوان علی
ہر غزل از خامۂ من دفتر دیوانگی است

(ماخوذ از دیوان بے نظیر)

مرثیہ میں شجاعت

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۲)

جناب اعجاز الہ آبادی

اس عنوان یعنی رجز کو اب ہم ترک کرتے ہیں اوّل تو ان مثالوں سے پوری طرح واضح ہو جائیگا کہ ایک ایک لفظ سے بہادری اور مردانگی مترشح ہے۔ دوسرے یہ خیال بھی ہے کہ شاید اعتراض ہو کہ "رجز" ایک مخصوص حصہ ہے۔ اس میں بہادری ہوتی ہی ہے مرثیہ کی کوئی تعریف اس میں نہیں ہے لہذا ہم دوسرے عنوان کو لیتے ہیں اور اسکی دو چار مثالوں سے یہ دکھانے کی کوشش کرینگے کہ یہ حصہ بھی بہادری اور جاں بازی کے جذبات سے خالی نہیں۔ مکالمہ مرثیہ میں کثرت سے آیا ہے کبھی آپس میں دو دوستوں میں گفتگو ہوتی ہے تو کبھی دو دشمنوں میں۔ ہم دونوں صورتوں کو پیش کرینگے۔

حضرت عباسؑ میدان جنگ میں تشریف لے گئے ہیں آپ کی بہادری اور غیض و غضب کی وہ دھاک تھی کہ تمام فوج گھبرا رہی تھی۔ شمر چاہتا تھا کہ کسی صورت سے ان کو اپنی طرف ملالے۔ چنانچہ بہ حیثیت سپہ سالار کے اس نے ساری حیلہ سازی، مکاری، ترغیب، ترکیب صرف کی ہے کہ حضرت عباس امام حسین سے الگ ہو کر یزید کی طرف آجائیں۔ چنانچہ پہلے کچھ لوگوں کو بھیجا ہے کہ فوج کی کثرت سے ڈرائیں۔ ممکن ہے کہ اسی سے کام چل جائے۔ ؎

ناگاہ بڑھ کے چند سواراں خیرہ سر بولے کہاں کا قصد ہے اے مرد نامور

تنہا تو ہو مگر چلے آتے ہو بے خطر دیکھو یہ فوج ہے کہ سمندر ہے موج پر

آمادہ شر یہ یاں کے صغیر و کبیر ہیں

قبضوں میں ہیں کمانیں کمانوں میں تیر ہیں

دریا تلک ہزاروں زرہ پوش ہیں جواں مرحب ہے اپنے وقت کا ایک ایک پہلواں
ہیں گرز سیکڑوں تو ہزاروں ہیں برچھیاں تلواروں کی چمک ہے کہ برقِ شرر فشاں
ان سے کسی کو طاقت جنگ و جدل نہیں
یہ آہنی حصار ہیں فوجوں کے دَل نہیں

ساحل تلک گذر ہو عبث ہے تمھارا دھیاں تدبیر لاکھ کیجیے رستہ مگر کہاں
بیٹھی ہیں گھاٹ گھاٹ سواروں کی چوکیاں کرتے ہو مفت اپنی جوانی کو رائگاں
دیکھو گے سوئے نہر تو خوں میں نہاؤ گے
مشک سکینہ نہر سے بھرنے نہ پاؤ گے

اس وقت ہے یہ حکم بن سعد برملا ہاں سدّ راہ مورچے ہو جائیں جابجا
ساحل تک آنے پائے نہ سقا حسین کا گونجا ادھر یہ سنتے ہی ضرغام کبریا
روباہ بھبکیاں ہیں یہ بیہودہ بکتے ہو
شیر خدا کے شیر کو تم روک سکتے ہو

کعبہ بھی ہے گواہ کہ توڑے علی نے دیر فرزند اُس کے ہم بھی ہیں سمجھو نہ کوئی غیر
بیر العلم میں کود کے ہم نے تو کی ہے سیر ہم وہ بشر ہیں شر سے ڈریں اہل شر کہ خیر
ہاتھوں میں زور فاتح خیبر کا رکھتے ہیں
یہ نہر کیا ہے قصد تو کوثر کا رکھتے ہیں

لشکر اُلٹ دیے ہیں جب اُلٹی ہے آستیں لاشوں سے ہمنے پاٹی ہے خندق کی سرزمیں
تیر و کماں بہت ہیں تو ہوں خوف کچھ نہیں تیر افگنی سے اپنے تو ارجن ہے سہمگیں
رخ ناوک افگنوں کے تو ہمنے پھرائے ہیں
تیروں کو کاٹ کاٹ کے تودے لگائے ہیں

سر کبھی نہ ہم سے ہوئی فوج جو لڑی زد پر ہماری آئے زرہ پوش جس گھڑی
وہ تیغ کی لگائی ہیں چوٹیں کڑی کڑی کر دی ہے تار تار زرہ کی کڑی کڑی
تنہا نہ سمجھو روح علی اپنے ساتھ ہے
مرحب ہو تم تو دست خدا کا یہ ہاتھ ہے

تیغوں کی بجلیوں سے ڈراتے ہو کیا بھلا　　موڑا نہیں ہے منہ کبھی ہم نے دمِ وغا
گر بُت پرست گرز لئے ہیں تو خوف کیا　　ہم وہ ہیں جس نے خانۂ کعبہ کو دی صفا
نامِ صنم مٹا دیا دیں کا چلن ہوا
بارہ برس کے سن میں لقب بت شکن ہوا

یہ روک ٹوک کرتا ہے گر سعد کا پسر　　مل جائیگا تو کاٹوں کا پہلے اُسی کا سر
دریا کے پاسبانوں کو کر دونگا خوں میں تر　　دیکھو گے ایک حملہ میں دم لونگا گھاٹ پر
کیا خوب شیر ہو کے ترائی کو چھوڑ دیں
یہ کیا صفیں ہیں سدِّ سکندر کو توڑ دیں

حق نے اسی گھرانے پہ کی ختم صفدری　　پہونچا ہے ہاتھوں ہاتھ ہمیں زورِ حیدری
کیا کوئی سر اُٹھا کے کرے ہم سے ہمسری　　آگے ہمارے خم ہے سرِ چرخِ چنبری
جوہر دکھائیں گر ابھی تیغِ خوش آب کے
پرزے اُڑائیں ہم ورقِ آفتاب کے

مشہور ہے حنین میں کیسی ہوئی جدال　　جنگِ احد میں خوں سے زمیں ہوگئی تھی لال
روشن ہے جنگ بدر کا بھی شامیو یہ حال　　کیا چمکی ذوالفقار علی صورتِ ہلال
واں کے چراغ کفر کو دم بھر میں گل کیا
خیبر کا در اُکھاڑ کے خندق کا پُل کیا

جھیلے ہمیشہ معرکے سر کیں لڑائیاں　　کیا کیا دکھائیں ہاتھوں کی اپنے صفائیاں
اور نہروان میں پاٹ دیں لاشوں سے کھائیاں　　کی ہیں کہاں کہاں نہیں زور آزمائیاں
ہم لوگ عبدِ خاص ہیں ربِّ جلیل کے
تلوار سے اُڑا دیے پر جبرئیل کے

نیزوں سے ہم کو روک لو تم سب کیا مجال　　رُکتے ہیں شیر بھی کہیں گر آ گیا جلال
جب کھینچ لی نیام سے شمشیرِ بے مثال　　تیغیں ہوئیں جو کند تو ڈھالیں ہوئیں نڈھال
ایسے نہیں ہیں ہم جو رُکیں روک ٹوک پر
گردوں گرے تو روک لیں نیزے کی نوک پر

بالا ہے سب سے اپنے بزرگوں کا مرتبا　　ہے جن کے معجزوں سے عیاں قدرتِ خدا
اعجاز دے دیے پہ روشن یہ ہو گیا　　انگشت پاک سے بھی لیا کام تیغ کا
حاصل تھا یہ کمال رسالت مآب کو
دو ٹکڑے کر دیا سپر ماہتاب کو

جنگِ جمل کو تیغ کی تیزی سے سر کیا　　کعبے میں بت پرستوں کے سر کر دیے جُدا
دریا بہائے خون کے خندق میں جابجا　　جھیلا ہمیں نے جنگ سلاسل کا معرکا
فوجوں کی کیا صفائیاں وقت مصاف کیں
صفین میں صفیں کی صفیں ہم نے صاف کیں

جب شمر نے دیکھا کہ دوسروں سے کام نہیں چلتا تو فوج کے آگے خود بڑھتا ہے اور گفتگو سے تالیف قلب کی کوشش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح سے حضرت عباس کو اپنا کر لے۔ اسکی گفتگو ملاحظہ ہو اور اس کے بعد حضرت عباس کے جواب پر غور کیجیے۔ ہر لفظ سے محبت، حمیت، وفاداری اور شجاعت کی بو آتی ہے۔ ؎

تم چاہتے ہو زیست تو مانو مرا کہا　　بیٹھے بٹھائے مفت نہ ہو غم میں مبتلا
ہے اب بھی مصلحت کہ ہو شبیرؑ سے جُدا　　یہ فصل ہے شباب کی موسم ہے عیش کا
راتیں سرور کی ہیں تو یہ دن ہیں چین کے
کیوں اپنی جان دیتے ہو پیدے حسین کے

بچوں کی آپ کے ابھی عمریں ہیں کیا بھلا　　اس وقت میں تو داغ یتیمی نہ دے خدا
پردیس میں جو رانڈ ہو ماں قہر کی ہے جا　　دم ماریں کیا جو رسّی سے باندھے کوئی گلا
جب ہو ہجوم غم۔ تو خوشی دل سے فوت ہے
سر پر نہ ہو سے باپ تو بچوں کی موت ہے

دانستہ تم تو پیاسوں کے خاطر گنواؤ جان　　کچھ بھی کریں نہ قدر تمھاری شہ زمان
سقا بنایا تم سے جواں کو خدا کی شان　　آؤ ادھر کہ شام کا حاکم ہے مہربان
کیا فخر ہے ہوئے جو علم دار فوج کے
آؤ ابھی ادھر تو ہو سالار فوج کے

ایذائیں واں ہیں پیاس کی فاقوں کی سختیاں   آرام و راحت و طرب و عیش ہے یہاں
دو دن کی بھوک پیاس سے واں سب ہیں نیم جاں   ہیں اس طرف چنے ہوئے نعمت کے خوان پہ خواں

آہ و بکا سے ان کو شب و روز کام ہے
یہاں صبح ہے خوشی کی تو راحت کی شام ہے

کچھ فقر کے سوا نہیں رکھتے شہ زماں   مال و زر و گہر کی نہیں انتہا یہاں
دو تین مرنے والے ہیں واں لاکھ یاں جواں   واں شورِ العطش کا ہے دریا یہاں رواں

واں لشکرِ قلیل کی بھی اب صفائی ہے
اقبال سے یزید کے یاں اک خدائی ہے

حضرت کا جواب :-

یہ سن کے کانپنے لگے عباسؑ نوجواں   فرمایا سامنے سے سرک لے کے اپنی جاں
کیا خوب منہ پہ شیروں کے روباہ بھبکیاں   ہے شرط بڑھ کے کھینچ لوں گدی سے یہ زباں

تیغِ دودم سے کر دوں سر و تن جدا ابھی
گستاخیوں کا تجھ کو چکھا دوں مزا ابھی

مرنے سے کیا تو ہم کو ڈراتا ہے بار بار   مرتے بھی ہیں شہید کہیں اولیوں شعار
تا حشر نام رہتا ہے دنیا میں برقرار   اور وہ علی الخصوص جو ہو شاہ پر نثار

اس مرگ کا تو زندۂ جاوید نام ہے
جنت میں زیرِ سایۂ طوبےٰ مقام ہے

شیطاں تو اپنے وقت کا ہے اے عدوِ دیں   بہکانے سے بھلا ترے بہکیں وہ ہم نہیں
جسکا کہ دستگیر ہو سردارِ مومنیں   اسکا قدم ڈگا ہے رہِ راست سے کہیں

کافی بہشت کے ہیں چمن سیر کے لئے
کعبے سے انحراف کریں دیر کے لئے

نفریں ہے تجھ پہ اور ترے حاکم یزید پر   دنیا کے مال و جاہ پہ بھولا ہے بے خبر
ہے چار دن کا دولت و زر اور یہ کر و فر   دو گز کفن تو ملک ہے کنج لحد ہے گھر
اعمال کے سوا نہیں کچھ مال ساتھ ہے   قارون کا بھی میں کے تلے خالی ہاتھ ہے

حضرت کا ساتھ چھوڑ دوں تونے کہا یہ کیا — ممکن ہے آفتاب کو چھوڑے کبھی ضیا
دشوار ہے کہ شمع سے پروانہ ہو جُدا — سائے کی طرح ساتھ ہے شہ کے یہ با وفا
حبل المتیں سے رشتۂ الفت کو توڑ دوں
دانستہ میں حسینؑ سے آقا کو چھوڑ دوں

تھوڑا تو دل میں سمجھا ہے یہ عُہدۂ علم — مجھ کو یہ اوج و موج ہو اللہ رے کرم
دریا وہ ہو گیا کہ جو قطرے سے بھی تھا کم — اک مور کو بنایا سلیمانِ ذی حشم
ذرہ جو ہو وہ پائے شرف آفتاب کا
یہ خاکسار اور علم بو تراب کا

تجھ کو کمال فوج کی کثرت پہ ہے غرور — کیا ہم کو کم سمجھتا ہے کتنا ہے بے شعور
صف بستہ ہیں ملائکہ شبیر کے حضور — آنے نہ دیں قریب جو دیں حکم دُور دُور
پیرو ہیں اُس کے دست خدا کا جو ہاتھ ہے
ہم تو ہیں اُس کے ساتھ خدا جس کے ساتھ ہے

(باقی آیندہ)

رباعیات رواں

قالب تاریکیوں پہ جب پاتی ہے — کچھ روشنی روح کی اُبھر آتی ہے
اے دورِ زمانہ آہ اے فکر حیات — بجلی اس خاک میں ڈوبی جاتی ہے

فکرِ دلِ دردمند کر لیتا ہوں — فرقِ پست و بلند کر لیتا ہوں
دیکھے نہیں جاتے جب خود اپنے اعمال — میں اپنی آنکھ بند کر لیتا ہوں

بلبل کی نوا پہ رقص کرتا ہوں میں — دامان وفا پہ رقص کرتا ہوں میں
میں نکہتِ گل کا نغمۂ ہستی ہوں — ہر موجِ فنا پہ رقص کرتا ہوں میں

"کامیاب محبّت کا گیت"

مشہور روسی فسانہ نویس ٹرجینیو کا ترجمہ

از نقوی صفی لکھنوی بی۔اے۔علیگ

(۱)

تقریبًا سولھویں صدی کے وسط میں، اٹلی کے مشہور شہر فرارہ میں جو کہ آرچ ڈیوک کے دوران حکومت میں فنون لطیفہ اور شاعری کا مرکز تھا دو نوجوان فیبیو اور مزیو رہتے تھے۔ دونوں ہم عمر اور قریبی رشتہ دار تھے غیر معمولی محبت نے بچپن ہی سے ایک جان دو قالب کر رکھا تھا۔ شاید ہی وہ کبھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے ہوں۔ ان کے ہم مرتبہ ہونے نے اس رشتہ کو مزید مستحکم بنا دیا تھا۔ دونوں ایک قدیم خاندان کی فراد تھے۔ امیر تھے آزاد تھے۔ انکا مذاق طبیعت یکساں تھا۔ مزیو گانے کا دلدادہ، فیبیو مصوری کا عاشق۔ اہل فرارہ کی نظروں میں وہ دو نایاب جواہر تھے۔ ان کا وجود ان کے لئے باعث فخر تھا۔ رنگ و شباہت میں دونوں کے اختلاف تھا، لیکن جمال اور مردانہ حسن میں دونوں برابر ممتاز تھے۔ فیبیو دراز قد تھا، رنگ صاف، بال ملائم اور سنہرے۔ آنکھیں نیلگوں اور بڑی بڑی۔ برخلاف اسکے مزیو کا چہرہ سانولا۔ بال سیاہ۔ اور اسکی سیاہی مائل بھوری آنکھوں میں نہ وہ خوش مزاجی کی چمک تھی اور نہ اسکے لبوں پر فیبیو کا سا مسرت آمیز تبسم۔ اسکی جیٹی بھویں آنکھوں پر جھکی رہتی تھیں۔ فیبیو کی سنہری بھویں خوبصورت، نازک محراب دار تھیں۔ مزیو کی تقریر میں وہ زندہ دلی نہ تھی۔ ان باتوں کے سوا، دونوں دوست افعال و کردار میں بہت زیادہ مشابہ تھے۔ عورتوں کی مہربان نظریں اُن پر پڑتی تھیں اور وہ آداب سخاوت کے مجسمہ تصور کئے جاتے تھے۔ اُسی قصبہ میں ایک لڑکی ولیریا نامے تھی۔ جو سب سے زیادہ خوبصورت سمجھی جاتی تھی۔ لوگوں کو اُسکے دیکھنے کا موقع بہت کم دستیاب ہوتا تھا کیونکہ وہ تنہائی کی زندگی بسر کرتی تھی علاوہ گرجا جانے کے باہر بہت کم نکلتی تھی۔ کبھی کبھی ہوا خوری کے لئے نکل کھڑی ہوتی تھی۔ وہ اپنی بیوہ ماں کے

ساتھ جسکے کوئی اور اولاد نہ تھی اور جسکا تعلق ایک عالی مرتبت خاندان سے تھا رہتی تھی۔ جس سے بھی وہ ملتی تھی اسے اپنا گرویدہ اور مداح بنا کر رہتی تھی۔ اپنی کم سخنی، شرم اور نیک خصائل کے باعث وہ اپنے حسن کی نہ مغلوب ہونے والی طاقت سے بالکل بے خبر تھی۔ اس کا رنگ زردی مائل تھا۔ اسکی آنکھوں سے ایک خاص قسم کی شرم ٹپکتی تھی۔ اس کے ہونٹھ بہت کم متبسم نظر آتے تھے اور وہ بھی ایک خاموش مسکراہٹ کے ساتھ۔ اس کی آواز شاید ہی کسی کے گوش زد ہوتی ہو۔ یہ بات مشہور تھی کہ علی الصباح جب کہ قصبہ میں ہر شے پر نیند غالب ہوتی تھی وہ اپنے کمرے میں نہایت خوش الحانی سے نے کی سُریلی اور دلکش آواز کے مانند پرانے گیت گایا کرتی تھی جو کہ سُننے والوں کو نہایت خوشگوار معلوم ہوتے تھے۔ اگرچہ ولیریا کے چہرے کا رنگ زرد تھا لیکن اُسکی رگوں میں صحت اور تندرستی کا خون موج زن تھا۔ حتیٰ کہ بڈھے جب کبھی اُسے دیکھتے تو اُن کے دماغ میں سب سے پہلے یہ خیال آتا تھا کہ وہ نوجوان کتنا خوش نصیب ہوگا جس کے لئے یہ غنچۂ ناشگفتہ ایک روز کھل کر پھول ہو جائے گا۔

۲

فلیبو اور مزیو نے ولیریا کو ایک دعوت عامہ کے موقع پر جو آرچی ڈیوک کی جانب سے منعقد ہوئی تھی دیکھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ اُس جگہ بیٹھی تھی جو فرارہ کی ممتاز عورتوں کے لئے مخصوص تھی۔ اُس دن فلیبو اور مزیو دونوں اس کی محبت کا شکار ہو گئے۔ چونکہ آپس میں کسی قسم کی پردہ داری نہ تھی۔ فوراً دونوں کو معلوم ہو گیا کہ ایک دوسرے کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ ان دونوں کے درمیان میں یہ طے ہوا کہ ہر ایک اپنی اپنی قسمت آزمائی کرے اور ولیریا جس کو منتخب کرلے دوسرا اُس کے خلاف کوشش نہ کرے۔ چند ہفتہ بعد وہ اپنی نیکنامی کے باعث بیوہ کے مکان میں داخل ہو سکے حالانکہ وہاں کسی کا گزر ہونا آسان نہ تھا۔ اور اُن کو ولیریا سے ملنے کی اجازت بھی مل گئی۔ اس وقت سے یہ یہ دونوں تقریباً روزانہ ولیریا سے ملنے جاتے تھے اور باتیں کرتے تھے۔ محبت کی آگ جذبات کی تیزی روز بروز ان کے دلوں میں بڑھتی گئی۔ ولیریا نے کسی کی جانب ترجیح کا اظہار نہیں کیا۔ دونوں سے یکساں ملنا بظاہر اسکے لیے خوشگوار تھا۔ مزیو کے ساتھ وقت گانے میں گزارتی تھی۔ فلیبو سے زیادہ بیباک تھی اور اُس سے گفتگو زیادہ کرتی تھی۔ آخر کار دونوں اپنی قسمت کے فیصلے کے لئے آمادہ

ہوے - ایک خط ولیریا کو لکھا جسمیں یہ دریافت کیا کہ آیا وہ کس سے شادی کرنا پسند کریگی - ولیریا
نے یہ خط اپنی ماں کو دکھایا اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہا کہ وہ بغیر شادی کئے ہوے زندگی گزارنے پر راضی
ہے - اگر اسکی ماں یہ سمجھتی ہے کہ شادی کا وقت اسکے لئے آگیا ہے اور اسکو شادی کرنا چاہیے - تو
اِن دونوں میں سے جسکو اسکی ماں مناسب سمجھے اسکو قبول کرنے کے لئے وہ تیار ہے - نیک سیرت
بیوہ کا دل بھر آیا - اسکی آنکھوں نے اپنی پیاری بچی کی جُدائی کے خیال پر آنسو بہائے - اسکو ان
امیدواروں سے کوئی معقول وجہ انکار کی نظر نہ آئی - اسکے نزدیک دونوں اسکی لڑکی کے لائق تھے
لیکن وہ اپنے خیال میں فیبیو کو ترجیح دیتی تھی اور سمجھتی تھی کہ ولیریا بھی اُس سے زیادہ مانوس ہے -
چنانچہ دوسرے دن فیبیو کو اپنی خوش قسمتی کی خبر ہوگئی - بدنصیب مزیو کو حسب معاہدہ سوائے سر تسلیم
خم کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا - مگر وہ اپنے دوست اور رقیب کی کامیابی نہ دیکھ سکا - اس نے فوراً
اپنی جائداد کا ایک بہت بڑا حصہ فروخت کر ڈالا اور کئی ہزار روپیہ لیکر مشرق کی جانب بغرض
سیاحت روانہ ہوگیا - چلتے وقت فیبیو سے اس نے کہا کہ وہ اس وقت تک واپسی کا نام نہ لیگا
جب تک کہ اُسکے دل میں ولیریا کی محبت باقی رہیگی - بچپن کے دوست کی مفارقت فیبیو کے لئے
تکلیف دہ ضرور تھی ...... لیکن آنے والی خوشیوں کی اُمید ہر قسم کے خیالات پر غالب آئی اور کامیاب
محبت کے تصورات نے اس کو مدہوش کر دیا - تھوڑے دنوں بعد اسکی شادی کے رسوم ادا کئے
گئے - تب اُسکو معلوم ہوا کہ قدرت نے کیا بیش بہا خزانہ اسے عطا کیا ہے - فرارہ سے تھوڑے فاصلے پر
اسکا ایک محل تھا جسے سایہ دار درخت اپنے آغوش میں لئے ہوے تھے - وہ مع اپنی بیوی اور اُسکی
ماں کے وہاں منتقل ہوگیا - خوشی اور خورمی میں ان کی زندگی کے دن بسر ہونے لگے فیبیو ایک ممتاز
مصور ہوگیا - اب وہ طفل نوآموز نہ تھا حقیقی معنوں میں وہ ایک سچا مصور تھا - ولیریا کی ماں دونوں کو
شادکام دیکھ کر خوش تھی - خواب خوش کی طرح چار سال گزر گئے - ایک چیز کی کمی تھی - صرف ایک شے
کے لئے اُنکے دل رنجیدہ تھے - ان کے کوئی اولاد نہ تھی ..... مگر ناامید نہ تھے - چوتھے سال کا اختتام
ایک مصیبت واقعی اُنکے لئے لایا - ولیریا کی ماں نے چند دن کی بیماری کے بعد سفر آخرت اختیار کیا
ولیریا کی آنکھوں نے آنسو بہانے میں کمی نہ کی - ایک عرصے تک وہ اس رنج میں مبتلا رہی - ایک سال
اور گزرنے پر زمانہ زندگی کو اپنی سابق رفتار پر لے آیا - بالآخر موسم گرما کی ایک پرفضا شام کو مزیو خلاف

اُمید فرار ہ واپس آگیا۔

۳

اس پانچ سال کے وقفہ میں مزیو کے متعلق کچھ نہ سُنا گیا تھا۔گویا کہ صفحۂ ہستی سے اسکا نشان ہی مٹ گیا تھا۔جب فلیبیو اپنے دوست مزیو سے ملا تو اُسکے مُنہ سے ایک ایسی آواز نکلی جس میں خوف بھی تھا اور خوشی بھی اور فوراً اُس کو محل میں آنے کو مدعو کیا۔اسکے باغ میں مکان سے کچھ فاصلے پر ایک بارہ دری تھی اپنے دوست سے وہاں قیام کرنے کی درخواست کی۔مزیو نے اُسے منظور کر لیا اور اُسی دن وہ وہاں مع اپنے ایک گونگے ملایا نوکر کے جسکے چہرے سے ذہانت اور مستعدی کے آثار نمایاں تھے منتقل ہو گیا۔۔۔۔۔اس ملایا نوکر کی زبان کاٹ لی گئی تھی۔

مزیو اپنے ہمراہ متعدد صندوق لایا تھا جو طرح طرح کی بیش بہا چیزوں سے جنھیں اس نے اپنے دوران سفر میں جمع کیا تھا پُر تھے۔ولیریا، مزیو کی واپسی پر بہت خوش ہوئی اور خندہ پیشانی اور متانت سے اس کا استقبال کیا۔مزیو کی ہر بات اسکی شاہد تھی کہ اس نے اپنا وعدہ فلیبیو سے قائم رکھا تھا تمام دن مزیو ملایا کی مدد سے اپنی جائے قیام میں ہر شے کو ترتیب دیتا رہا۔اور ان تمام عجائب و غرائب کو جو اپنے ہمراہ لایا تھا کھولا۔شال، ریشمی پارچہ جات، کامدانی کے مخملی ملبوس، ہتھیار، جام، مینا کاری کی مختلف قسم کی طشتریاں اور پیالے۔گنگا جمنی کے کام کی مرصع کار چیزیں، ہاتھی دانت اور بلور کے کندہ بکس۔ترشی ہوئی بوتلیں۔خوشبویات۔جنگلی جانوروں کی پوستینیں۔نایاب پرندوں کے پر مصالحہ وغیرہ۔

ان چیزوں میں ایک نہایت ہی بیش قیمت موتی کا ہار بھی تھا جسکو شاہ فارس نے ایک بڑی خدمت کے صلے میں مزیو کو عطا کیا تھا۔اس نے اس ہار کو ولیریا کے گلے میں اپنے ہاتھ سے پہنا دیا۔ولیریا اس ہار کا بھاری پن اور اسکی غیر معمولی حدت محسوس کئے ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔۔۔۔۔گویا کہ اس ہار نے اسکے جسم میں ایک آگ لگا دی تھی۔شام کو کھانے کے بعد جب باغ میں گنجان جھاڑیوں کے سایہ میں وہ بیٹھے تو مزیو نے اپنی سرگزشت بیان کرنا شروع کی۔

دُور دراز ممالک، بلند پہاڑی چوٹیاں۔سمندر کے مانند دریا۔ہزاروں برس کے پُرانے درخت۔قوس و قزح کے رنگ کے پھول اور چڑیاں، طرح طرح کی عمارتیں، مندر، شہر اور آدمی

غرضکہ جو جو اُسکے مشاہدے سے گزرا تھا بیان کیا۔ مزیو مشرق سے واقف تھا۔ اس کا گزر فارس میں ہوا تھا اور عرب میں بھی جہاں کے گھوڑے تمام دنیا کے جانوروں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور اصیل مانے گئے ہیں۔ وہ وسط ہند تک بھی ہو آیا تھا جہاں بنی نوع انسان شش اونچے اور جھاڑدار درختوں کے پھوتے پھلتے ہیں۔ اسکی رسائی حدود چین اور تبت تک ہوئی تھی جہاں انکا انسانی خدا جس کو لامائے اعظم کہتے ہیں ایک تنگ جسم خاموش آدمی کے بھیس میں دنیا کو اپنے وجود سے معمور کئے ہوئے ہے۔ ان حیرت انگیز قصوں کو فیبو اور ولیریا دونوں اس طرح سنتے رہے گویا کہ وہ مسحور ہوگئے ہیں۔

مزیو کے رنگ اور شباہت میں بہت کم تغیر پیدا ہوا تھا۔ اسکا چہرہ جو بچپن ہی سے سانولا تھا گرم ممالک کی سیاحت سے اور بھی سیاہ پڑ گیا تھا۔ حلقۂ چشم اُبھر آئے تھے۔ اُسکے بشرے سے اطمینان اور شان و شوکت کا اظہار تو ضرور ہوتا تھا لیکن زندہ دلی کا مطلق نشان نہ تھا جب وہ ان خطرناک واقعات کو بیان کرنے لگا جن کا مقابلہ اُس نے راتوں میں ان جنگلوں میں کیا تھا جو چیتوں اور شیروں کی آواز سے گونجتے تھے۔ یا دن میں ان سنسان اور خاموش راستوں میں جہاں خوفناک سفاک غریب مسافروں کی گھات میں لگے رہتے تھے تاکہ اپنی کالی دیوی کی قربانی کے خاطر ان کو موت کے گھاٹ اُتار سکیں تو اس وقت اُس میں ایک خاص قسم کا تغیر پیدا ہوگیا۔ آواز زیادہ سخت اور جسم کے حرکات ایک باشندۂ اطالیہ سے بالکل مختلف ہوگئے۔ اس نے اپنے نوکر ملایا کی مدد سے جو ایک متعد تابعدار آدمی تھا چند کرتب جو اُس نے ہندوستان کے برہمنوں سے سیکھے تھے اپنے میزبانوں کو دکھلائے۔ مثلاً پہلے ایک پردے کے پیچھے وہ چھپا اور فوراً ہوا میں پالتھی مارے دکھلائی دیا، صرف اُسکی اُنگلیوں کے کنارے نہایت آہستگی کے ساتھ بانس پر ٹکے ہوے تھے۔ یہ دیکھ کر فیبو متحیر ہوا اور ولیریا خوف زدہ سی ہوگئی۔ ...... کیا وہ ایک ساحر نہیں ہے۔ ولیریا نے خیال کیا۔ جب اس نے چند خوفناک اور مہیب سانپ بلانے کی غرض سے جو ایک کپڑے کے نیچے بند تھے بین بجانا شروع کیا۔ ولیریا اور بھی خائف ہوئی۔ اور مزیو سے التجا کی کہ جس قدر ممکن ہو وہ ان نفرت انگیز اور خطرناک شعبدوں کو موقوف کرے۔ رات کو کھانے پر مزیو نے اپنے دوستوں کی تواضع شیراز کی شراب سے کی جو نہایت خوشبودار اور گاڑھی تھی۔ رنگ اس کا سنہرا سبزی مائل تھا۔ اور جب صراحی سے ساغر میں ڈالی جاتی تھی تو ایک عجب طرح کی چمک اُس سے پیدا ہوتی تھی۔ اس کا ذائقہ مغربی شرابوں سے مختلف تھا۔ شیریں اور تیز تھی۔ اگر آہستہ آہستہ قطرہ قطرہ کر کے پی جاتی تھی تو

ایک خوشگوار غنودگی اور سرور اعضا میں پیدا کرتی تھی۔ مزیو نے دو ساغر فیبو اور ولیریا کو پلائے اور ایک خود پیا۔ پی کر سیاپر جھکا اور آہستہ سے کچھ الفاظ لبوں پر جاری ہوئے۔ ساتھ ہی انگلیوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ ولیریا نے اُسے دیکھ لیا لیکن مزیو کی ہر بات نرالی او تعجب انگیز تھی اُس نے صرف یہ خیال کیا کہ شاید ہندوستان میں مزیو نے دوسرا مذہب اختیار کر لیا ہے۔ یا یہ وہاں کا رواج ہے۔ ایک ذرا خاموشی کے بعد ولیریا نے مزیو سے پوچھا کہ آیا سفر میں اُس نے گانے سے دلچسپی قائم رکھی تھی؟ مزیو نے جواب میں ملایا سے ہندوستانی بربط منگایا اور پہلے ایک غمگین ذبجائی پھر قومی گیت گائے لیکن یہ سب ایک اٹلی کے رہنے والے کے لئے تیز اور وحشیانہ تھے۔ تار کی صدا افسردہ اور خفیف تھی لیکن جب مزیو نے آخری گانا شروع کیا تو اُس میں یکایک پورا سوز و گداز پیدا ہوا۔ صدائے بربط اب مترنم اور پرزور تھی۔ ایک مست کر دینے والا نغمہ مضراب کے نیچے سے جاری ہوا۔ اس طرح جاری ہوا کہ جیسے بربط کے بالائی حصہ پر سانپ چکر کرتا ہو ابل کھاتا ہوا لہر لیتا ہوا بڑی نفاست کے ساتھ لپٹ جائے۔ اور ایسا سوز اُس نغمہ میں پیدا تھا۔ ایسی کامیاب مسرت کی آگ اس میں روشن تھی کہ فیبو اور ولیریا اُس سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مزیو کا سر جھکا ہوا تھا اور بربط سے ملا ہوا تھا۔ اسکے رخساروں پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ دونوں ابرو ایک خط مستقیم بنا رہے تھے وہ ان سب سے زیادہ اپنے پیدا کئے ہوئے نغمہ میں ڈوبا ہوا تھا اور ایک عجیب عالم اُس پر طاری تھا۔ بالآخر گانا ختم ہوا اور مزیو خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

فیبو نے فوراً پوچھا "یہ کیا ہے۔ یہ کون گانا ہم کو تم سنا رہے تھے"۔ ولیریا خاموش رہی لیکن وہ اسکے جواب کے انتظار میں گوش بر آواز تھی۔ مزیو نے بربط میز پر رکھ دیا اور آہستگی سے بالوں کو پیچھے جھٹک کر تبسم کے ساتھ کہا "وہ۔ وہ راگ۔ میں نے ایک دفعہ سیلون میں سنا تھا۔ اس گیت کو وہاں کامیاب محبت کا گیت" کہتے ہیں۔ "پھر سناؤ" فیبو نے آہستہ سے درخواست کی۔ مزیو نے کہا "نہیں اب نہیں۔ دیر بھی ہو گئی ہے۔ اب محترم ولیریا کو آرام کرنا چاہیے اور میں بھی تھکا ہوا ہوں"۔

تمام دن مزیو کا ولیریا سے سادگی اور احترام کا برتاؤ رہا جو ایک پرانے دوست کا ہوا کرتا ہے لیکن چلتے وقت اُس نے ایک غیر معمولی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ اور علاوہ ہاتھ زور سے دبانے کے

اُس نے اپنی اُنگلیاں اسکی نازک ہتھیلی میں معنی خیز طریقے سے گڑو دیں اور ساتھ ہی ساتھ ایسی تیز نظروں سے اسکے چہرے کی طرف دیکھا کہ باوجودیکہ وکیریا نے اُس سے آنکھیں نہیں ملائیں پھر بھی اُسکی نظروں کی گرمی کو اُس نے اپنے تمتمائے ہوئے رخساروں پر محسوس کیا۔ وہ کچھ بولی نہیں۔ البتہ اپنا ہاتھ اُسکی گرفت سے جھٹکا دے کر نکال لیا۔ اور جب وہ چلا گیا تو دیر تک دروازے کی جانب دیکھتی رہی۔ اُسے یاد آیا کہ پہلے بھی وہ اُس سے کتنی مرعوب تھی۔ اب اس کو ایک اُلجھن کا احساس ہوا۔ مزبو اپنے جائے قیام کو چلا گیا اور یہ دونوں میاں بیوی نے اپنی خوابگاہ کا رُخ کیا۔

۴

وکیریا کو فوراً ہی نیند نہ آئی خون میں سُستی پیدا کرنے والی حرارت محسوس ہو رہی تھی اور کان کچھ بج سے رہے تھے اور یہ کیفیت اسکے خیال میں شیرازی شراب مزبو کے قصدں اور اس کی موسیقی کی وجہ پیدا ہوئی تھی۔ صبح کے قریب اُس کو نیند آگئی اور ایک عجیب طرح کا خواب دیکھا:۔

اُس نے دیکھا کہ وہ ایک ایسے کمرے میں گئی ہے جس میں اُس نے زندگی بھر میں کبھی نہیں قدم رکھا تھا۔ کمرہ وسیع تھا، چھت نیچی تھی۔ تمام دیوار پر چھوٹی چھوٹی نیلے رنگ کی چمکدار اینٹیں جڑی ہوئی تھیں۔ بیچ بیچ میں اُن کے سنہری لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ سنگ مرمر کے سفید منقش اور نازک ستون تھے۔ چھت بھی سنگ مرمر کی تھی۔ زردی مائل ہلکی گلابی روشنی مثل شیشے کے آرپار ہو رہی تھی اور یہ روشنی ہر طرف سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اور ہر جگہ ہر چیز پر برابر پڑ رہی تھی۔ اس کا اثر مسحور کن تھا۔ وسط صحن میں جسکی زمین نہایت صاف و شفاف تھی۔ کارچوبی تکیے ایک چھوٹے قالین پر رکھے ہوئے تھے۔ اونچے اونچے عجیب الہیئت جانوروں کی ساخت کے آگردان کونوں میں کھڑے ہوئے تھے جن سے معنبر دھواں نکل رہا تھا۔ کسی طرف کوئی کھڑکی نہ تھی۔ ایک دروازہ جس پر ایک مخملی پردہ آویزاں تھا ایک کونے کی طرف تھا۔ اس پر خاموشی طاری تھی اور اس میں کوئی جنبش نہ تھی کہ یکایک آہستہ آہستہ پردہ ہٹا اور مزبو داخل ہوا۔ وکیریا کی طرف دیکھ کر سر جھکایا۔ ہنسا اور ہاتھ پھیلا دیے ...... قوی ہاتھ وکیریا کی پتلی کمر میں حمائل ہو گئے۔ اس کے خشک لبوں نے ایک آگ سی اسکے تمام ...... وہ تکیوں پر پشت کے بل گر پڑی ......

متعدد کوششوں کے بعد خوف زدہ اور نفرت انگیز احساسات کے ساتھ وکیریا بالآخر بیدار ہوئی۔

اب تک وہ ایک حالت اشتباہ میں تھی اُس کو مطلق خبر نہ تھی کہ اُسے ہوا کیا ہے اور وہ کہاں ہے۔ پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھی، چاروں طرف دیکھا، تمام جسم لرزاں تھا۔۔۔۔۔۔ فیبوا سکا شوہر اُسکے پاس لیٹا تھا، وہ سو رہا تھا۔ اسکا چہرہ چاند کی سفید روشنی میں جو کھڑکی سے آرہی تھی ایک مُردے کے چہرے سے بھی زیادہ سفید افسردہ اور غمناک معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنے شوہر کو بیدار کیا۔ فیبو نے اسکے چہرے پر نظر کی اور کہا "خیریت! کیا بات ہے؟" اُس نے ایک دبی ہوئی آواز میں کہا "میں نے میں نے ایک بڑا۔ بڑا وحشت ناک خواب دیکھا ہے"۔ اب تک وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی کہ یکایک بارہ دری کی طرف سے اس وقت نغمہ کی آواز سنائی دی۔ فیبو اور ولیریا نے راگ پہچانا۔ یہ وہی گیت تھا جو رات کو مزیو نے سُنایا تھا۔ جسکو وہ "کامیاب محبت کا گیت" کہتا تھا۔ فیبو نے ولیریا کی طرف بے چینی کے ساتھ دیکھا۔۔۔۔۔۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ مُنہ پھیر لیا دونوں نے دم بخود ہو کر گانے کو اختتام تک سُنا۔ گیت ختم ہوا۔ چاند بادل میں روپوش ہو گیا۔ اور کمرہ میں دفعتاً تاریکی چھا گئی۔ ..... ان دونوں نے کچھ کہے بغیر تکیے پر سر رکھدیا۔ اور ایک کو دوسرے کے سو جانے کی خبر نہ ہوئی۔

(۵)

دوسرے دن مزیو ناشتہ پر آیا۔ وہ خوش تھا۔ ولیریا سے نہایت خندہ پیشانی سے ملا۔ ولیریا نے گھبراہٹ میں اُسکو کچھ جواب نہ دیا۔ اُسکی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ بشاش چہرے اور تیز اور متجسس آنکھوں نے ولیریا کو متحیر کر دیا۔ مزیو کوئی قصہ بیان کرنے والا ہی تھا کہ فیبو بول اُٹھا "میں دیکھتا ہوں کہ تم اپنے نئے مکان میں سو نہ سکے۔ میں نے اور ولیریا نے تم کو گزشتہ شب گیت گاتے ہوئے سُنا تھا"۔ "ہاں۔ تم نے سُنا تھا؟" مزیو نے جواب دیا "کل رات کو میں گا رہا تھا لیکن اس سے قبل میں ایک نیند لے چکا تھا۔ اور ایک حیرت انگیز خواب میں نے دیکھا"۔ ولیریا چونکی تھی فیبو نے پوچھا "کس قسم کا خواب؟" مزیو نے اپنی آنکھیں ولیریا کے چہرے پر سے نہ ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے اپنے کو ایک کشادہ کمرے میں پایا جس کی چھت مشرقی طرز سے آراستہ تھی ستون منقش تھے گو نہ کھڑکیاں تھیں نہ روشنی۔ تاہم سارا کمرہ گلابی روشنی سے پُر تھا۔ گویا وہ شفاف پتھر سے بنا تھا۔ گوشوں میں چینی کی خوشبوئیں جل رہی تھیں۔ کمرے کے صحن میں کارچوبی گدے پڑے تھے۔ میں ایک دروازے سے

داخل ہوا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا- اور سامنے کے دروازے سے ایک عورت نمودار ہوئی جس سے ایک وقت میں میں محبت کرتا تھا- اور وہ اتنی خوبصورت معلوم ہوئی کہ میری سابقہ محبت کے شعلے بھڑک اُٹھے"۔

مزیو نے اس خواب کو ایک پر معنی انداز کے ساتھ ختم کیا- ولیریا بالکل بے حس و حرکت بیٹھی تھی کبھی کبھی اسکے چہرے کا رنگ سفید ہو جاتا تھا اور سانس آہستہ آہستہ لیتی تھی-

مزیو پھر بولا "تب میں جاگا اور وہ گیت گایا"۔ فیبیو نے پوچھا "وہ کون عورت تھی- وہ کون تھی؟" "وہ ایک ہندوستان کی عورت تھی- میں اُس سے دہلی میں ملا تھا...... اب وہ زندہ نہیں ہے- وہ مر چکی ہے"۔ "فیبیو نے نہایت سادگی سے پھر پوچھا" اور اس کا شوہر؟" "اُس کا شوہر کہا جاتا ہے وہ بھی مر گیا- جلدی ہی دونوں میری نظروں سے دُور ہو گئے" مزیو نے جواب دیا "تعجب" فیبیو بولا "میری بیوی نے بھی ایک عجیب خواب دیکھا ہے- کل ہی رات کو"۔ مزیو نے ولیریا کو گھور کر دیکھا- "جسے اُس نے مجھ سے بیان نہیں کیا"۔ فیبیو نے کہا- اس وقت ولیریا اُٹھی اور کمرے کے باہر چلی گئی-

ناشتہ کے بعد ہی مزیو یہ کہ کر چلا گیا کہ اُسے فرارہ میں کچھ کام ہے اور شام سے قبل واپس ہوگا-

(باقی آئندہ)

رباعیات فرخ

دنیا سر مستیوں کا میخانہ ہے — ہر چیز میں کیف دَور پیمانہ ہے
لب ریز نشاط ہے فضائے عالم — ذرہ ذرہ میں رقص مستانہ ہے

ذوق مستی کا کچھ اثر رہنے دے — مینا و سبو پیش نظر رہنے دے
غرقِ مئے ناب کر کے مجھ کو ساقی — کفر و ایماں سے بے خبر رہنے دے

ہے وقف خمار مئے پرستی میری — خمیازہ کش ہوش ہے مستی میری
آغوش فنا میں پرورش پاتا ہوں — گہوارۂ نیستی ہے ہستی میری

رواںؔ

سراجؔ اور اثرؔ

جناب سراجؔ لکھنوی

"الناظر" کے اکتوبر اور نومبر سنہ ۱۹۲۹ء کے مشترکہ نمبر میں بابو جگت موہن لال صاحب رواںؔ کے کلیات "روح رواں" پر میں نے تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے اور تنقید میں تصویر کے دونوں رخ دکھائے ہیں۔ نہ تو میں نے ذکر محاسن میں خسّت کی اور نہ اظہار معائب میں رعایت، میرا ضمیر مطمئن ہے اور میرا دعویٰ ہے کہ میں نے اس مفصل تبصرہ میں دیانت داری کو دخل دیا ہے۔ یہ ایک دوسرا سوال ہے کہ بعض اشعار کے سمجھنے میں میں نے غلطی کی ہو جسکی وجہ سے میری نیت پر حملہ نہیں کیا جا سکتا۔

مجھے افسوس ہے کہ بعض حضرات کو اگر کچھ نہیں تو خواہ مخواہ ہی شکایت ہے کہ میں نے رواںؔ کے کلام پر تنقید کیوں کی۔ یہ ایک عجیب و غریب سوال ہے جس کا جواب میں سوائے اس کے اور کیا دے سکتا ہوں کہ میرا جی چاہا میں نے تنقید کی۔

اس میں شک نہیں کہ تنقید ایک ناخوشگوار ادبی فرض کے ادا کرنے کا نام ہے اور علی الخصوص لکھنؤ کے طبقۂ شعرا میں تو کوئی تنقید نگار کبھی ہر دلعزیز ہو ہی نہیں سکتا۔ خیر دنیا کی رائے سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ اہل نظر اور صاحبان فن تنقید کی اہمیت اور اُسکے فوائد بخوبی جانتے ہیں۔

جناب اثرؔ کی ادبی خدمات سے کون نہیں واقف۔ انھوں نے میرے تبصرے کو پسند فرمایا۔ اُنکی نظر میں میری تنقید غیر جانب دارانہ ہے۔ میرے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے۔ جناب اثرؔ جہاں بیشتر اعتراضوں سے متفق ہیں وہاں چھ شعر اور دو رباعیوں کے متعلق انھوں نے مجھ سے اختلاف

بھی کیا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں موصوف کا اختلافی مقالہ "ادب" کے جنوری نمبر میں شائع ہو کر میری نظر سے گزرا۔ ان اشعار کے متعلق مجھے اپنے بیان کردہ مطالب کی صحت پر اصرار نہیں اور نہ مجھے کوئی کاوش ہے کہ خواہ مخواہ سخن پروری کروں۔

اپنے فرصت کے اوقات میں میں نے جناب اثر کے مضمون کو غور سے پڑھا۔ جو مطالب اُنھوں نے بیان فرمائے ہیں وہ قابل غور ضرور ہیں۔ اُن کے مضمون کے تقریباً نصف حصہ سے مجھے اتفاق ہے یعنی معترف ہوں کہ دو شعر اور ایک رباعی پر اب میری نظر میں بھی میرے ایراد کچھ غیر وارد سے ہیں لیکن بقیہ چار شعر اور ایک رباعی کے متعلق مجھے ہنوز اطمینان نہ ہو سکا۔ اس لیے مزید تبادلہ خیال کی ضرورت سمجھتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ جناب آثر میری اس جسارت کو معاف فرمائیں گے۔

ذیل میں ناظرین کرام کی سہولت کے لئے میں اپنے اعتراض اور جناب آثر کے جواب کا خلاصہ درج کرنے کے بعد مزید اظہار خیال کی اجازت چاہتا ہوں۔

رواں کا یہ شعر ہے۔ ؎

سنگ زمین کعبہ خود بڑھ کے جبیں کو بوسہ دے　　　ایسے بھی چند سجدے ہیں ناصیۂ نیاز میں

اعتراض سراج:۔ ناصیۂ نیاز میں سجدہ کا ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ سنگ زمین کعبہ کی کیا ضرورت ہے۔ سنگ کعبہ کافی ہے۔

جواب اثر:۔ رواں کو یہ شعر اس طرح پڑھتے سنا ہے۔ ؎

سنگ حریم کعبہ .... الخ

لفظ زمین یا کاتب کی غلطی ہے یا رواں نے خود بدل دیا جسکے لئے وہ مبارکباد کے مستحق نہیں۔

دوسرے اعتراض کے متعلق سجدہ کا جبین میں ہونا ویسا ہی مسلم ہے جیسا ذائقہ کا زبان میں ہونا شعر میں صرف ناصیہ نہیں بلکہ ناصیۂ نیاز ہے۔ نیاز (جذبۂ عبودیت اور بندگی) کو ایک ذات فرض کیا اور ذات کو بطریق مجاز مرسل پیشانی سے متصف کیا کیونکہ ذوق سجود شان عبودیت ہے۔ ایسی جبین میں سجدوں کا وجود مضمر ہے۔ مگر نشان سجدہ کہاں سے آئے گا کیونکہ یہ شخصیت غیر مرئی ہے۔

مزید گزارش سراج۔:۔ میں نے لفظ زمین پر جو سنگ اور کعبہ کے درمیان شعر میں موجود ہے اعتراض کیا تھا۔ اگر زمین کی جگہ لفظ حریم ہے تو مجھے اسکی صحت میں کلام نہیں۔

رہا دوسرا اعتراض اسکے متعلق میں بادب عرض کرونگا کہ آثر نے جو معنی سمجھائے ہیں اُن سے سیری نہیں ہوتی۔ نیاز کے اصل معنی حاجت اور آرزو کے ہیں۔ سجدہ ایک فعل ہے جو ارتکاب پر موقوف ہے۔ پس جبین میں یا جبین نیاز میں سجدہ کا ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ اہل اسلام میں تو اعضائے سجدہ واضح کر دیئے گئے ہیں۔ انھیں اعضا میں سے ایک جبین بھی ہے محض جبین کے لئے سجدہ مقصود نہیں۔ ہاتھوں کی ہتھیلیاں، پاؤں کے گھٹنے بھی ہیں۔ اگر آثر کے بیان کئے ہوئے معنی درست سمجھ لئے جائیں تو دیگر اعضائے سجدہ بھی سنگ حریم کعبہ کو چومنے بڑھینگے اور سجدے ان سب میں مخفی ماننے پڑینگے۔ ایسی صورت میں جبین کی تخصیص کی وجہ کیا ہے۔ غور فرمائیے جتنی توجیہیں کی جاتی ہیں وہ دلنشین نہیں ہوتیں۔

جس طرح نیاز کو ایک ذات فرض کرسکتے ہیں اسی طرح ناصیۂ نیاز میں نشان سجدہ بھی فرض کیا جاسکتا ہے۔

روآں کا دوسرا شعر ؎

یہی ہستی اسی ہستی کے کچھ ٹوٹے ہوئے رشتے　　وگرنہ ایسا پردہ میرے اُنکے درمیاں کیا تھا

اعتراض سراج۔ عبد و معبود میں جو پردہ حائل ہے۔ شعر میں اُسی کی طرف اشارہ ہے۔ انداز بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ پردہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ردیف "تھا" یہ ظاہر کرتی ہے کہ پردہ تھا اب نہیں ہے۔ پہلا مصرع مبہم ہے۔ ہستی سے مراد بقید حیات ہونا، ٹوٹے ہوئے رشتہ کا مفہوم نظام حیات میں خلل ہے۔ لہٰذا یہ نتیجہ نکلا کہ زندگی اور موت یہی دونوں چیزیں پردہ ہیں۔ زندگی پردہ ہوسکتی ہے۔ موت عین وصال ہے۔ دونوں کا پردہ ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر ٹوٹے ہوئے رشتے سے مراد موت نہیں تو اسکا علم شاعر کو ہے۔

جواب اثر:۔ روآں نے ہستی کے ٹوٹے ہوئے رشتے بصیغۂ جمع کہا۔ سراج نے ہر جگہ واحد لیکر موت سے تعبیر کیا۔ ہستی نام ہے مجموعۂ اضداد کا۔ لہٰذا ہستی کے ٹوٹے ہوئے رشتے اُسکے بظاہر غیر مربوط و متبائن و متضاد تعلقات ہوئے۔ مثالیں متعدد ہیں = شادی، غم، رنج، راحت وغیرہ۔ ان کا امتیاز مٹ جائے تو معمائے ہستی حل ہو جائے۔ روآں کہتے ہیں کہ نہ صرف ہماری ہستی پردہ ہے بلکہ تمام تعلقات حجاب ہیں۔ یہ رشتے ٹوٹے جز و کل ایک ہو گئے۔

دوسرا اعتراض ردیف ہے [illegible] شعر [illegible] ردیف "ہے"

ہوتی تو شعر مہمل ہو جاتا۔

مزید گزارش سراج ۔ شعر کے جو معنی آثر نے بیان کئے اُس سے میری تسلی نہیں ہوئی۔ اس طرح تو دنیا میں کوئی کلام بے معنی نہیں رہتا۔ توجیہات الفاظ شعر سے جس قدر پیدا ہوتی ہیں اُنھیں سے بحث کی جا سکتی ہے۔ جو توضیح آثر نے کی وہ لازم معنی نہیں ہے۔ ہستی کے ٹوٹے ہوئے رشتوں سے کیفیات متضاد مراد لینا کسی حقیقی یا مجازی دلیل کا محتاج ہے۔ رنج و خوشی کا متضاد ہونا مسلم مگر یہ چیزیں لازمہ حیات انسانی ہیں نہ کہ حیات انسانی۔ ہستی وجود کا ترجمہ ہے۔ اگر ہستی کے ٹوٹے ہوئے رشتے جو بقول آثر سکون و اضطراب وغیرہ ہیں باقی نہ رہیں تو کیا وہ پردہ جو درمیان عبد و معبود وجہ افتراق ہے مرتفع ہو جائیگا؟ ٹوٹے ہوئے رشتوں کی قید سے کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔ ہستی کا مقابل نیستی ہے نیستی واجب الوجود سے ملانے والی شے ہے۔ اگر یہاں ہستی سے مراد وجود عنصری ہے تو اسے اصطلاحاً تشخص کہتے ہیں یعنی انسان مع اپنے اعضائے بدنیہ کے ہستی عام ہے جسم و روح دونوں کے لئے اور دونوں وجودی ہیں عدمی نہیں۔ اگر ہستی باقی نہ رہے تو واجب الوجود سے وصل کون چیز ہوگی۔

میں نے اپنے بیان کردہ مفہوم کی بنا پر ردیف کو کمزور ٹھہرایا ہے۔ آثر کے مطلب سے مجھے اختلاف ہے۔ لہذا "ہے" اور "تھا" کا سوال فی الحال بے سود ہے۔
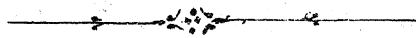
روان کا تیسرا شعر

قابل رشک ہیں دیوانوں کے آپس کے سلوک ان کو زنجیر سے زنجیر بدلتے دیکھا

اعتراض سراج :۔ زنجیر بدلنے کا امکان اُسی وقت ہو سکتا ہے جب سب اہل ہوش یا دو میں ایک ہوشیار ہو۔ دیوانے زنجیر سے زنجیر کیوں بدلنے لگے۔

جواب آثر :۔ لفظاً زنجیر سے زنجیر بدلنے میں شان دیوانگی موجود ہے۔ زنجیر سے زنجیر بدلنا ایک فعل عبث ہے معناً شاعری میں دیوانگی انتہائے ہوش و فرزانگی کا نام ہے۔ روان نے شعر میں رشتۂ اخوت و اتحاد کی مصوری کی ہے جو دیوانگان عشق میں ہوتا ہے جس طرح دوست آپس میں ٹوپی بدلتے ہیں۔

مزید گزارش سراج :۔ شاعر کہیں دیوانگی کا حقیقی مفہوم لیتے ہیں اور کہیں فرزانگی کا اعلیٰ درجہ مراد لیتے ہیں۔ اس شعر میں قرینہ واضحہ موجود نہیں اور جب تک کوئی فارق نہ ہو معنی کا تعین مشکل ہے

آثرؔ نے لفظاً اور معناً جو معنی بیان کئے ہیں اُن میں تضاد کا نقص موجود ہے زنجیر بدلنا فعل عبث ہے، اِس لئے یہ کسی فرزانے کا کام نہیں۔ رشتۂ اخوت قائم کرنے کا احساس دیوانوں میں کیونکر ہو سکتا ہے یہی عین اعتراض ہے۔ یا دیوانہ فرض کیجیے یا فرزانہ اُسکے بعد معنی کا تعین کیجیے تو وہی نتیجہ نکلے گا جو میں عرض کر چکا ہوں۔
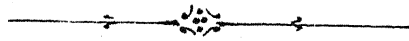
رؔواں کا چوتھا شعر

ہر ذرہ ہے ازل سے نغمہ طراز ہستی   اُس پر بھی ہے ابھی تک بے ربط ساز ہستی

اعتراض سراج :- یہ شعر ساز ہستی کے ترتیب دینے والے کی توہین ہے۔ ساز ہستی سے کیا مراد ہے۔ اور وہ بے ربط کیوں ہے نغمہ کن کے ساتھ ساز ہستی کی تکمیل ہوگئی تھی ازل سے اس وقت تک اُس کا بے ربط رہنا کیا معنی رکھتا ہے۔

جواب اثر :- ساز ہستی خود ہستی ہے۔ ہر ذرہ ازل سے ساز ہستی میں نغموں کو ترتیب دے رہا ہے مگر پھر بھی اب تک ساز سے وہ نغمے نہیں بلند ہوتے جو ہستی کا منشا واضح کر دیں اور مختلف پردوں میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

رؔواں نے ساز ہستی کا صانع خدا کو مانا ہے اور نغموں کا ترتیب دینے والا ذرّوں کو۔ اگر کوئی شخص ساز سے نغمے ترتیب نہ دے سکے تو یہ اُسکی خامی ہے یا ساز بنانے والے کی۔

مزید گزارش سراج :- مادیین کا یہ قول ہے کہ ذرات خود بخود مل گئے اور اُنھوں نے کوئی صورت اختیار کر لی۔ حکمائے الٰہیین کہتے ہیں کہ صانع نے اپنے ارادے سے ان ذرات کو مرتب کیا یعنی غیر ذات الشعور کو یہ سلیقہ نہیں ہے کہ وہ ایک ترتیب خاص سے خود بخود مرتب ہو جائے اور ہر چیز کی صورت اپنی نظم و ترتیب خاص پر قائم بھی رہے۔ اس کو ایک وضع خاص پر لانے کے لئے محرک درکار ہے۔ شعر میں اس محرک کی منقصت ہے۔ جو معنی آثرؔ نے لئے ہیں وہ الفاظ سے پیدا نہیں ہوتے۔ ایک مرتبہ اس شعر کی نثر کیجیے۔ ہر ذرہ ازل سے ہستی کے نغمے گا رہا ہے۔ بااین ہمہ ساز ہستی بے ربط ہے۔ یعنی راگ درست ہے اور باجہ یعنی ساز ناقص۔ ساز کیا ہے جس پر یہ راگ گایا جاتا ہے۔ وہی لوازم وجود، آثرؔ کہتے ہیں کہ یہی ساز خدا کا بنایا ہوا ہے۔ اور رؔواں کہتے ہیں کہ یہی بے ربط ہے۔ اب کس کی

مانیں۔ رواں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ راز ہستی غیر منکشف ہے یا یا الفاظ دیگر راگ محسوس ہوتا ہے مگر راگ سر بپورا کوئی نہیں کرسکتا۔ لہذا راز ہستی ایک ایسا نغمہ ہے جو کہ جانا بوجھا نہیں ہے حالانکہ الفاظ اس مفہوم کے ادا کرنے سے قاصر ہیں اور یہی عین اعتراض ہے۔

ہر وہ شے جو چشم ظاہر کو بے ربط معلوم ہوتی ہے ایک نظام خاص اور ترتیب خاص رکھتی ہے اور وہی عین نظام ہے۔ اُسے بے ربط کہنے کا حاصل یہی ہے کہ صانع کی صنعت میں نقص ہے۔ نغمہ ہستی ہو یا ساز ہستی جو شاعر کی نگاہ میں بے ربط ہے وہ صانع ازل کے سلیقہ ترتیب میں عیب ہے۔

رواں کی ایک رباعی ہے۔

جب شب میں شعاع نور کھو جاتی ہے
پیدا روح سکوت ہو جاتی ہے
فطرت اُس وقت کنمناتی ہے رواں
جس دم دُنیا تمام سو جاتی ہے

اعتراض سراج :- اِس رباعی کے تیسرے مصرع میں "کُنمناتی ہے" پر مجھے اعتراض ہے کُنمنانے کا استعمال اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص سوتا ہو اور نیند کی حالت میں وہ کروٹ یا انگڑائی لے۔ یہاں دُنیا سوگئی ہے لہذا اگر کُنمنا سکتی ہے تو دُنیا نہ کہ فطرت۔

جواب اثر :- سراج کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو اس رباعی میں لفظ فطرت کا صحیح مفہوم دریافت کرنے میں دھوکا ہوا۔ اس لفظ کے دو معنی ہیں۔ ایک تو نیچر (عام قدرتی مناظر) دوسرے مقتضائے طبیعت یا طینت۔ رباعی میں لفظ فطرت اسی موخرالذکر معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چوتھے مصرع میں لفظ دُنیا کی موجودگی لفظ فطرت کے دوسرے مفہوم کی نفی کرتی ہے۔ لہذا یہ ماننا پڑیگا کہ فطرت بمعنی طبیعت آیا ہے۔

آخری دو مصرعوں کا یہ مطلب ہوا کہ جب دُنیا سو جاتی ہے تو فطرت انسانی بیدار ہوتی ہے اور اپنے افعال و کردار کا جائزہ لینا شروع کرتی ہے۔

مزید گزارش سراج :- اس رباعی میں کُنمنانا کا لفظ بیداری کے معنی میں صرف ہوا ہے اور اسی بنا پر میں نے عرض کیا تھا کہ اگر کُنمنا سکتی ہے تو دُنیا جو سو گئی ہے نہ کہ فطرت۔

لفظ فطرت کے جو معنی اثر نے بیان کیے ہیں اُن سے نہ مجھے پہلے اختلاف تھا اور نہ اب ہے بلکہ

نہیں کہ مجھے اسکا علم نہ ہو کہ فطرت کے معنی طینت کے بھی ہیں - میرے خیال میں رواں نے لفظ فطرت اس رباعی میں طینت کے معنی پر استعمال ہی نہیں کیا - اگر ایسا ہے تو بھی مجھے آثر کے پیش کردہ مفہوم سے اختلاف ہے - آثر کہتے ہیں کہ جب تمام دنیا سو جاتی ہے تو فطرت انسانی بیدار رہوتی ہے - میں یہ عرض کرونگا کہ تمام دنیا میں سب کے ساتھ انسان اور حیوان بھی شامل ہیں اور جب تمام دنیا کے ساتھ انسان کا سو جاتا بھی لازمی ہے تو اسی انسان کی فطرت کا بیدار ہو کر اپنے افعال و کردار کا جائزہ لینا کیسا - اگر اس مصرع کے مطابق - ع

"میں راتوں کو اٹھ کر روتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے"

رواں کا یہ مطلب ہے کہ سب سوتے ہیں لیکن میں جاگتا ہوں اور میری فطرت بیدار رہوتی ہے تو قرینہ کلام سے اول تو یہ ظاہر نہیں ہوتا اس لئے کہ ایک عام بات بیان کی گئی ہے جیسا کہ آثر کے بیان سے ظاہر ہے "جب دنیا سو جاتی ہے تو فطرت انسانی بیدار رہوتی ہے اور اپنے افعال و کردار کا جائزہ لینا شروع کرتی ہے" - اس کے علاوہ سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ ضمیر انسانی کا کام رواں یا آثر فطرت انسانی سے لے رہے ہیں - انسان کے افعال کا جائزہ لینا اور ان پر افسوس کرنا انسان کے ضمیر کا کام ہے نہ کہ انسان کی فطرت کا جو فطرۃً مائل بہ گناہ ہے - انسان کی فطرت نیکی یا بدی کی ترغیب دے کر انسان کو خیر یا شر میں مبتلا کرتی ہے - بالفاظ دیگر جیسی انسان کی فطرت ہوتی ہے ویسے ہی اسکے اعمال ہوتے ہیں - اور ضمیر اچھائی پر مطمئن اور برائی پر مغموم ہوتا ہے - ظاہر ہے کہ فطرت کا کنمنانا "راتوں کو اٹھ کر رونے" کے مرادف نہیں ہو سکتا ہے اور اسی وجہ سے میں نے اس رباعی میں "کنمناتی ہے" پر اعتراض وارد کیا -

---

تصحیح :- ماہ فروری ۱۹۳۰ء کے "ادب" میں حضرت آرزو لکھنوی کی جو خاص غزل شائع ہوئی تھی اسکے اس مصرع میں "مان لی کس نے اپنی ہار خود یہ تھکن بتائیگی" خود یہ کے بجائے "بڑھ کے" ہونا چاہیے - غزل کے نقل کرنے میں غلطی ہو گئی تھی - ناظرین اسے درست کر لیں -

"عقلمند بچے"

تہوار کا دن تھا، گانوں میں پوجا پاٹ کی تیاریاں ہو رہی تھیں، بچے بوڑھے سب خوش تھے اور اشنان کر کے کپڑے بدل رہے تھے۔ کامنی اور نندی دو کمسن بچیاں تھیں۔ اُنکی ماؤں نے انکو بھی نہلا دھلا کے زرد رنگ کی نئی نئی ساریاں اور سُرخ ٹول کے کرتے پہنائے۔ ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی چوڑیاں، گلے میں روپیے کے ہار آنکھوں میں کاجل۔ بالوں میں تیل۔ غرض اُنھوں نے اپنی چہیتی بیٹیوں کو دُلہن بنا کر ارمان نکالے تھے۔

وہ تو ان لڑکیوں کو پہنا اُڑھا کے دوسرے کاموں میں لگ گئیں لیکن انھیں جو موقع ملا تو نظریں بچا کر اپنی اپنی جھونپڑی سے نکل بھاگیں قریب ہی ایک نشیب تھا جہاں برسات کا تھوڑا سا پانی اب تک موجود تھا۔ یہ دونوں وہیں پہونچیں اور دیر تک ایک دوسرے کو اپنا اچھا اچھا کپڑا دکھاتی رہیں۔ ایک کہتی "دیکھ نندی، ہمری ساری کیسی اچھی ہے!" تو دوسری جواب دیتی "ہوں۔ ہمرے کرتے سے تھوڑے اچھی ہے" غرض اسی طرح کے مکالمے کے بعد وہ کھیل میں منہمک ہو گئیں۔

تھوڑی دیر کنارے پر کھیل ہونے کے بعد پانی میں اُترنا طے پایا۔ اور نندی جو کامنی سے چھوٹی تھی، فوراً ہی بڑھی لیکن کامنی نے اُسے ٹوک کر کہا "دیکھ، کپڑہ نہ بھیگ جائے نہیں تو مائی مارے گی" چنانچہ دونوں نے اپنی اپنی ساری اوپر چڑھائی اور پھر پانی میں چلنا شروع کیا نشیب میں پانی بہت کم تھا اور بیچ میں مشکل سے نندی کے [illegible] گھٹنوں تک آتا ہوگا لیکن وہ بچی تھی ڈرنے لگی۔ یہ دیکھ کے کامنی نے اُسے اطمینان دلایا اور اپنے قریب بُلا لیا۔

جب نندی دوسری طرف کنارے کے قریب پہونچی تو اُسے پھر شرارت سوجھنے لگی۔ اُس نے ایک دفعہ پانی پر زور سے لات ماری اور بہت سی کیچڑ اور پانی اُڑ کر کامنی کی ساری، کرتے اور مُنہ پر پڑے۔ وہ بیچاری سر سے پاؤں تک بھیگ کر لدپھد ہوگئی۔ اُسے سخت غصہ معلوم ہوا اور اپنی چھوٹی سکھی کو مارنے کے لئے دوڑی لیکن نندی ہنستی ہوئی گھر کی طرف بھاگی۔

کامنی کو اپنی موجودہ حالت دیکھ کے بہت رنج و خوف معلوم ہوا۔ وہ وہاں سے روتی ہوئی چلی اتفاق سے راستے ہی میں اسکی ماں مل گئی۔ اُسنے جو اپنی لڑکی کو اس طرح دیکھا غصے سے آگ بگولا ہو گئی۔ ڈانٹ کے بولی "کاہے رے چڑیل اپنی ساری کیسے کھراب کی؟" کامنی نے رو رو کے بیان کیا کہ اسکی کوئی خطا نہیں ہے نندی نے عمداً اُسکے کپڑے خراب کر دیے۔

یہ سنتے ہی کامنی کی ماں ہزاروں گالیاں اور کوسنے دیتی ہوئی نندی کے گھر کی طرف چلی۔ اتفاق سے وہ راستے ہی میں نظر آگئی پھر کیا تھا پکڑ کے خوب ہی مارا۔ یہاں تک کہ نندی کے رونے کی آواز اسکی ماں تک پہنچی۔ وہ اپنے مکان سے آندھی کی طرح اٹھی اور گلی میں آکر بادل کی طرح برس پڑی۔ دونوں مائیں بری طرح لڑنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں سارا گاؤں سمٹ آیا اور خاصہ ہنگامہ ہوگیا۔ کوئی کہتا "کیا سمجھ کر مار دیا" تو کوئی چلاتا "اس نے کیوں لڑکی کے کپڑے ستیاناس کر دیئے"۔ اسی طوفان بدتمیزی میں ایک دیہاتی نے دوسرے کو دھکا دے دیا۔ اتنی سی بات قیامت ہوگئی۔ دونوں آپس میں دست و گریباں ہوگئے وہ تو کہیے کامنی کی بوڑھی دادی دونوں کے بیچ میں حائل ہوگئی ورنہ اچھی طرح چل جاتی۔

اس بڈھی عورت نے سب کو مخاطب کر کے کہا "اے مورکھو۔ کیا اسی طرح تہوار منایا جاتا ہے؟ پرمیشور کی یاد ایسے ہی ہوتی ہے؟ پوجا پاٹ کی جگہ دنگا فساد کر رہے ہو بھگوان سے کچھ بھی تو لاج کرو"۔ بڑھیا کی صدائے احتجاج نقار خانے میں طوطی کی آواز کی طرح سنائی نہیں دیتی تھی۔ لوگوں نے کئی بار اسے ڈھکیل بھی دیا لیکن وہ سمجھاتی ہی رہی۔

لڑائی کا سلسلہ آدھ گھنٹے تک قائم رہا۔ اسی اثنا میں کامنی نے اپنے کپڑے دھو کر سکھا ڈالے اور میلے سے آئی ہوئی کاغذ کی ڈولی لیکر پھر کھیلنا شروع کیا تھوڑی ہی دیر میں نندی بھی آکر کھیل میں شریک ہوگئی۔ دونوں نے اپنے کاندھوں پر ڈولی رکھی اور لڑنے والوں کے بیچ سے "ہٹو۔ راستہ دو" کہتی ہوئی گزر گئیں۔

لڑنے والوں کو بوڑھی عورت نے حقارت سے دیکھا اور پھر بلند آواز میں لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "لو یہ تو فوجن کے لئے تم لڑ لڑ کے اپنی جان دے رہے ہو وہ تمام جھگڑوں کو بالکل بھلا کے پھر کھیل کود میں لگ گئیں۔ نہ انکے دل میں کھوٹ ہے اور نہ میل کس پریم سے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں! دیکھو۔ ان کو دیکھو اور کچھ لاج کرو! کیا سچ مچ تم ان سے بھی کم سمجھدار ہو؟"

جنگ کرنے والوں نے بچوں کو دیکھا پھر ایک دوسرے پر نظر کی اور دل ہی دل میں خجل ہونے لگے۔ سارا مجمع اپنی حماقت پر ہنس پڑا اور ہر شخص "رام رام" کرتا ہوا اپنے گھر واپس آیا۔

"امن و سکون کی بہشت انہی کے لئے ہے جنکے قلوب چھوٹے بچوں کے دلوں کی طرح پاک و صاف ہیں"۔

(ماخوذ از "ٹالسٹائے")

(مدیر)

نقد و تبصرہ

کردار اور افسانہ

افسانہ نگاری ادبیات کا ایک مفید شعبہ ہے۔ اسکے ذریعہ سے قوموں اور ملکوں کی معاشرتی حالت سنبھالی جاسکتی ہے۔ واعظانہ انداز کے مضامین سے دلوں پر اتنا گہرا نقش نہیں پڑتا جتنا کہ ایک اچھے دماغ کے سوچے ہوئے اور اچھے عنوان سے لکھے ہوئے افسانوں کا پڑسکتا ہے۔ ان کے ذریعے سے ہمیں اپنی خراب معاشرت کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آجاتی ہیں۔ اپنی برائیوں کے مجسمے آنکھوں کے سامنے دکھلائی دینے لگتے ہیں۔ مگر اسکے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ نااہل قلموں کے سایہ میں جو افسانے نشو و نما پاتے ہیں انکا اثر جماعتوں اور قوموں کے اخلاق و معاشرت پر اچھا نہیں پڑتا۔ صحیح طور سے افسانہ نگاری کے فرائض ادا کرنے والوں کی تعداد کم ہے۔ اس لئے روزانہ اس متاع کاسد کی زیادتی ہوتی جارہی ہے۔ اس خرابی کی اصلاح کی صورت یہی ہے کہ افسانہ نگاری کے اصول سے اردو داں طبقہ کو روشناس کیا جائے خوشی کی بات ہے کہ مکتبۂ حیدرآباد کے لائق مدیر جناب عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی اس طرف متوجہ ہیں۔ آپ نے اس موضوع پر پہلے "دنیائے افسانہ" لکھی اور اسکے ذریعے سے اردو دانوں کو اس فن کے سمجھنے میں سہولت بہم پہونچائی۔ اور اب اس سلسلہ کی دوسری کڑی "کردار اور افسانہ" کے توسط سے اس فن کے دوسرے اہم اصولوں کو نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے اور انکی روشنی میں بعض مشہور افسانوں کے کردار جانچے ہیں اور ان پر فنی تنقید بھی لکھی ہے۔

"کردار اور افسانہ" کا پہلا حصہ زیادہ تر انگریزی تصنیفات سے ماخوذ ہے۔ البتہ دوسرے حصہ میں مصنف کی ذاتی کاوشوں اور نقد و نظر کی قوت کے واضح آثار ملتے ہیں مصنف نے سحرالبیان کی نجم النسا اور داستان امیر حمزہ کے عمرو عیار کے کردار کے متعلق جو بحثیں فرمائی ہیں وہ خاص طور سے قابل ستایش ہیں البتہ مراثی میرانیس کے بعض کرداروں سے بحث کرتے ہوئے مصنف کے قلم سے بعض ایسی باتیں نکل گئی ہیں جو تاریخی حیثیت سے صحیح نہیں ہیں۔

لائق مصنف صفحہ ۳۵ پر عون و محمد کے کردار کے تحت میں لکھتے ہیں۔ "حضرت زینب کے دونوں لڑکے درحقیقت افسانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے متعلق تواریخ میں کچھ پتہ نہیں چلتا اور ان کی

پیدائش مرثیہ میں میر انیس کی قوت تخلیق کی ممنون ہے"۔ مصنف کا یہ دعوی کہ حضرت زینبؑ کے یہ دونوں لڑکے درحقیقت افسانوی حیثیت رکھتے ہیں واقعہ کے خلاف ہے۔

اسلامی تاریخیں واقعۂ کربلا میں عونؑ و محمد صاحبزادگان عبداللہؑ بن جعفر کی موجودگی واضح طور سے بتلا رہی ہیں۔ عبداللہؑ بن جعفر کون تھے حضرت زینبؑ کے شوہر۔ اب خواہ ان صاحبزادوں کو حضرت زینبؑ کے بطن سے تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ بہرحال اُنکا وجود تاریخی ہے افسانوی نہیں اور پھر اُن کی حضرت زینبؑ کی طرف ابنیت کی نسبت بھی تاریخی ہے افسانوی نہیں۔

تاریخ ابن جریر طبری میں واقعات کربلا کے ضمن میں یہ عبارت ملتی ہے "فحمل عبداللہ بن قطبۃ الطائی علی عون بن عبداللہ بن جعفر فقتلہ وحمل عامر بن نہشل التیمی علی محمد بن عبداللہ بن جعفر فقتلہ"۔

(ترجمہ) پس عبداللہ بن قطبہ طائی نے عون بن عبداللہ بن جعفر کو حملہ کر کے قتل کر دیا اور عامر بن نہشل تیمی نے محمد بن عبداللہ بن جعفر کو۔

ہمیں امید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں اس غلطی کی اصلاح کر دی جائیگی۔

لائق مصنف سے ہمیں زبان کے متعلق بھی بعض شکایتیں ہیں۔ ایسے نئے لفظوں کا اختراع کرنا جو کو انگریزی لفظوں کا ترجمہ ہوں لیکن اردو کے مزاج سے عدم مناسبت کی وجہ سے وہ اس میں گھل مل نہ سکیں ہمیں پسند نہیں

صفحہ ۲۲ پر مصنف صاحب لکھتے ہیں "شخص قصہ کا کام بعض ناول نگاروں نے بیجان چیزوں کو شخصا کر لیا ہے"۔ شخصانا Personify کا ترجمہ ہے مگر مذاق سلیم کے لئے گراں۔ صفحہ ۳ پر Back ground کا ترجمہ پچھ زمین کیا ہے یہ بھی ثقیل ہے۔ حیدرآبادی ارباب قلم کے یہ غیر اعتدالی اجتہادات یقیناً قابل نظر ہیں ہمیں معلوم ہے کہ یہ اجتہادات ایک خاص اصول کے ماتحت کئے جا رہے ہیں۔ ان کے تحت زبان کو وسعت دینے کا جذبہ کارفرما ہے لیکن اسمیں اعتدال کا لحاظ ضروری ہے۔ ان اختراعات کی حدبندی لازمی ہے ورنہ پھر اسکا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہو سکتا۔

ان اختراعات کے علاوہ بعض اور بھی بات کی غلطیاں ملتی ہیں۔ صفحہ ۴۴ پر یہ عبارت ہے "کسی معاشرتی خصوصیات کا پتہ مشکل سے چل سکتا ہے"۔ اس جگہ معاشرتی خصوصیات کے بجائے معاشرتی خصوصیت ہونا چاہیے

صفحہ ۵۵ پر یہ جملہ ہے "انتظار کے بُرے نتائج سے مخوف ہو کر فوراً واپس ہوا"۔ مخوف کے بجائے خائف ہونا چاہیے

صفحہ ۵۵ پر "مرفہ الحال" کی جگہ غالباً کتابت کی غلطی سے مرفع الحال ہو گیا ہے۔

زبان اور اجتہاد کے ایسے مسامحے کتاب میں اور بھی ہیں ہمیں امید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں ان امور کا لحاظ رکھا جائیگا۔
کتاب مجموعی حیثیت سے قابل قدر ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۲۳۲ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ کاغذ بھی اچھا ہے اور طباعت بھی بری نہیں ہے۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ ابراہیمیہ، اسٹیشن روڈ۔ حیدر آباد دکن۔

ارمغان و نورہاں و پیشکش شاہجہانی و پنج رقعہ

منشی محمد ولایت علی خاں صاحب ولایت مرحوم

رئیس قصبہ صفی پور سے ناظرین "ادب"، کا تعارف ہمارے محترم جناب آثر کے مضامین سے کافی ہو چکا ہے۔ انھوں نے شرح و بسط سے بتلا دیا ہے کہ ہند کے اس لسان الغیب کی فارسی شاعری کا پایہ کس قدر بلند تھا اور اسکے تخئیل کی پرواز کس قدر اونچی تھی۔ اشعار کے پیمانوں میں انھوں نے تصوف کی جو شراب بھری ہے وہ حقیقت کا کیف پیدا کرنے والی ہے انھوں نے جن حقائق و معارف کی شاعری کی زبان میں ترجمانی کی ہے ان سے واضح طور سے معلوم ہوتا ہے کہ ولایت صاحب اُن منازل و مقامات سے پورے باخبر تھے۔ ان کے یہاں قال نہیں حال ہے۔ متذکرہ بالا رسائل مرحوم ہی کی قدیم رنگ کی فارسی انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہیں۔ انکے مطالعہ سے اسکا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس ہندی نژاد انسان کو اس رنگ کی فارسی نثر لکھنے پر بھی کس قدر قدرت تھی۔ عبارت میں سہ نثر ظہوری وغیرہ کا اغلاق موجود ہے افسوس ہے کہ ہندوستان میں اب فارسی کا وہ سابق کا مذاق باقی نہیں رہا ہے۔ اسکے جاننے والوں کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے اور خود ایران میں بھی انشاپردازی کا رنگ بدل چکا ہے مشکل نویسی کی جگہ سہل نویسی نے لے لی ہے۔ صنائع و بدائع کے زیوروں کو ترک کرکے بالکل سادگی اختیار کر لی گئی ہے۔ اس لئے مشکل ہے کہ ادب و انشا کے ان جواہر کی کوئی حقیقی قدر کی جا سکے لیکن تاہم جنھیں سہ نثر ظہوری و درہ نادرہ کا انداز انشا مرغوب ہے اور جو صنائع و بدائع سے گھبرا نہیں چکے ہیں اُن کے لئے یہ رسائل اب بھی عزیز الوجود متاع ثابت ہونا چاہیے۔ ارمغان الہ آباد و لکھنؤ یونیورسٹی کے بی اے کے نصاب میں بھی داخل ہے۔ پنج رقعہ عزیز مرحوم کی ابتدائی تصنیف ہے اسکی عبارت بے حد رنگیں ہے مصنف نے اس رسالہ کو غالب مرحوم کے پاس بغرض اصلاح بھیجا تھا۔ غالب مرحوم نے بجائے اصلاح کے اسکی بیحد تعریف و توصیف کی تھی۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مصنف کی فارسی انشاپردازی کا معیار ابتدا ہی سے کتنا بلند تھا۔

قیمت اور ملنے کا پتہ کہیں درج نہیں ہے۔ غالباً جناب سید اشرف علی صاحب ڈپٹی کلکٹر اورئی ضلع جالون سے یہ رسائل مل سکتے ہیں۔

مبصر لکھنؤ یہ لکھنؤ کی انجمن معراج الادب کا علمی و ادبی صحیفہ ہے۔ اسکی عمر ماشاء اللہ ایک سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ اسکی ادارت کے فرائض ہمارے محترم جناب حکیم آشفتہ صاحب نے اپنے پیشہ کی مصروفیتوں کے باوجود اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔ اور انھیں خوش سلیقگی اور قابلیت سے انجام دے رہے ہیں

اس وقت ہمارے پیش نظر "مبصر" کا مشاعرہ نمبر ہے جو اپنی دیدہ زیبی اور معنوی محاسن کے لحاظ سے گزشتہ نمبروں پر سبقت لے گیا ہے۔ اس میں کئی تصویریں بھی ہیں جو خاص طور سے جاذب نظر ہیں۔ یا نہ جو دیکھا نام اس قدر غیر شاعرانہ ہو لیکن پھر بھی شعر و شاعری سے متعلق اسکے مضامین خصوصیت سے قابل تحسین ہوتے ہیں۔ نظم کا حصہ بھی لکھنوی شاعری کا دلپذیر نمونہ ہوتا ہے۔ اس نمبر میں بھی جناب منظر، سراج اور خود حضرت مدیر کی غزلیں خاصی ہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی کی نظم "ابتجاے تغافل" خصوصیت سے دلچسپ ہے۔ اصل یہ ہے کہ جوش صاحب نظری شاعر ہیں۔ آپ کی نظموں میں ایک خاص کیفیت اور جوش موجود ہوتا ہے۔ اس طرف آپ کی متعدد نظمیں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُن سے کم سے کم میں تو اس نتیجے تک پہونچا ہوں کہ جوش صاحب آگے چل کر ہندوستان کے ملک الشعرا بننے والے ہیں۔ اُنھوں نے پرانا جادہ چھوڑ دیا ہے۔ نئے جادہ پر نہایت کامیابی سے چل رہے ہیں۔

"مبصر" میں مضامین نثر بھی اچھے ہوتے ہیں لکھنؤ میں اُردو نثر نگاروں کی بیحد کمی محسوس ہو رہی تھی اور جسے دیکھیے وہ شاعری ہی کے جام و صہبا لئے ادبی محفلوں میں آتا تھا۔ مبصر نے وجود میں آکر اس کمی کی تلافی شروع کر دی ہے اور لکھنؤ کے بعض شعرا نے نثر کی طرف بھی توجہ کی ہے۔

رسالہ کی کتابت اچھی ہے لیکن طباعت کی غلطیاں کافی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آشفتہ صاحب کی ادارت میں یہ رسالہ دن دونی رات چوگنی ترقی کریگا۔ قیمت چار روپیہ سالانہ ہے۔

ملنے کا پتہ:- "وکٹوریا اسٹریٹ لکھنؤ"

ساقی | اُردو کا یہ ایک جدید ادبی صحیفہ ہے جو دہلی سے شایع ہو رہا ہے۔ مضامین افسانوں اور ادب لطیف پر زیادہ تر مشتمل ہوتے ہیں۔ نظم کا عنصر بھی خاصا ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے "ساقی" کے ارکان ادارت کو ابھی اسکے مضامین کا پایہ اور بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ سالانہ قیمت ہے/ ہے۔

ملنے کا پتہ:- "ساقی دہلی"

ارمغان دہلی | یہ رسالہ بھی دہلی سے حضرت اشرف صبوحی کی ادارت میں شایع ہو رہا ہے۔ اس میں کچھ افسانے اور کچھ ظرافت کے مضمون ہیں۔ کیا ہمارے جدید شایع ہونے والے رسائل کوئی نیا مفید راستہ اپنے ادبی خدمات کے لئے نہیں نکال سکتے۔ قیمت سالانہ عہ ہے۔

ملنے کا پتہ:- "ارمغان دہلی"

ا۔ تاہری

کرایہ کا مکان

(رند کے قلم سے)

مجھے ہمیشہ اُن بدقسمت لوگوں کے حال زار پر ترس آتا ہے جو محض اس خطا پر کہ ان میں اور چند مربع گز کی چہار دیواری میں خاندانی رشتہ قائم ہو گیا ہے حبس دوام کے قیدیوں کی طرح سدا ایک ہی مکان میں دن کاٹنے پر مجبور ہیں - اس سرائے فانی میں ایک قیانوسی محلسرا انکے نام لکھ دی گئی ہے - جاڑا، گرمی، برسات - ہر موسم میں وہ اس میں محبوس ہیں - نئے نئے مکان بنتے دیکھ کر طرح طرح کی امنگیں ان کے دل میں پیدا ہوتی ہیں - ہر مکان کو جس پر "ٹولٹ" صاحب کے نام کی تختی آویزاں ہو للچائی نگاہوں سے دیکھتے ہیں - مگر جب اپنی بےبسی کا خیال آتا ہے تو حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے گھر آکر سو رہتے ہیں - اسکے برخلاف کرایہ کے مکانات میں رہنے والوں کی زندگی بڑے لطف سے گزرتی ہے - آج یہاں تو کل وہاں تتلی کی طرح رنگ رنگ کے مکانوں کا مزہ لوٹتے پھرتے ہیں - جہاں ایک مکان سے جی اُکتایا، یا بیوی صاحبہ نے امام ہو سمجھا کہ اس میں بھوت پریت یا شہید مرد وغیرہ کی صورتیں نظر آتیں - یا معدہ کی گرانی، پریشان خوابی کی تصویر بنی - بس فوراً دوسرے گھر کی تلاش شروع کر دی - اور اگر اس میں بھی خاطر خواہ آسایش نہ ملی تو "ملک خدا تنگ نیست، پائے مرا لنگ نیست" - اس سے بہتر کی جستجو میں مصروف ہو گئے - اگر قدرت نے مذاق سلیم عطا کیا ہے اور طبیعت میں شاعرانہ جذبات کی ہلکی سی رَو بھی موجزن ہو تو گو اہل خانہ کی تجدید کا موقع نہ سہی - تاہم ہر سال فصل بہار کے آتے آتے کسی نئے مکان کے ماحول سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دبی ہوئی اُمنگوں اور افسردہ جذبات پر صیقل چڑھانے کا موقع مل ہی جاتا ہے -

ذاتی مکان میں رہنے والوں کو ہر قدم پر طرح طرح کی مشکلات کا سامنا رہتا ہے - مثلاً اگر شکست و ریخت کی شکایت کی جائے تو کس سے، گنجایش کی کمی کا دُکھڑا رویا جائے تو کس کے حضور میں -

اگر تنگ آ کر تخلیہ کی دھمکی دیجیے تو کسے۔ اگر کبھی برسات میں سقف مکان نے دیواروں کی پیرانہ سالی پر رحم کھا کر اپنے بار سے انھیں سبکدوش کرنے اور عرش سے فرش پر آ رہنے کی ٹھہرا دی تو یہ تو ممکن ہے کہ ہرجانہ کا دعویٰ مع خرچہ ڈگری ہو جائے۔ مگر بڑی قباحت یہ آن پڑتی ہے کہ جانبین کے وکلا کی فیس جیب خاص سے ادا کرنا پڑتی ہے۔ اگر مملوکہ مکان کی دست درازیوں کا گلہ شکوہ احباب کے سامنے کرتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ خودداری کا خون ہوتا ہے بلکہ سننے والوں کی طرف سے اظہار ہمدردی کے بجائے نقصان مایہ و شماتت ہمسایہ کا خوف زیادہ غالب رہتا ہے۔ اسکے برعکس کرایہ کے مکانوں میں رہنے والوں کی برادری میں ہمدردی کا ملیہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ جہاں ان میں سے کسی ایک نے شکوہ شکایت کا سلسلہ چھیڑا سب کے سب نہایت دلچسپی سے اس داستان کو سنتے ہیں۔ بلکہ محض اسکا غم غلط کرنے کے لئے ہر شخص اپنے اپنے خانگی مصائب کا تذکرہ کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ تھوڑی ہی دیر میں اسے اس بات کا کامل یقین ہو جاتا ہے کہ اسکی شکوہ سنجی بالکل بے محل تھی۔ درحقیقت اسکا مکان نہایت کشادہ شاندار وسیع اور آرام دہ ہے۔ اسکے علاوہ اگر مکان کرایہ کا ہے تو آپ جب جی چاہے بلا تکلف اسکے بنانے اور بنوانے والوں کو دل کھول کر برا بھلا کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ اگر حسن اتفاق سے ذرا مغرور المزاج بھی واقع ہوئے ہوں تو اس سے آگے بڑھ جانے میں کوئی قباحت نہیں ہوتی لیکن اگر مکان خود اپنا یا آبا و اجداد کا بنوایا ہوا ہے تو گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کا سامنا ہے۔ سوائے اسکے کہ دن رات اس دوگونہ عذاب میں گھٹ گھٹ کر مجنوں بن جائیے یا مر جائیے اور چارہ ہی کیا ہے۔

کرایہ کے مکان میں ایک خاص صفت یہ بھی ہے کہ یہ ہر طریقہ پر کامل آزادی اور بےفکری سے تصرف میں لایا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر امور خانہ داری کی حکمراں قوت کو اس رد و بدل میں کچھ زیادہ سہولت یا آسائش کا امکان نظر آئے تو بلا تامل ڈرائنگ روم میں باورچی خانہ۔ سونے کے کمرے میں حمام اور دیواروں پر اقلیدس کی تمام شکلیں حل کرنے اور بڑوں کو پان کی پیک سے جا بجا گلکاری کرنے کی مکمل آزادی بلا تردد دی جا سکتی ہے۔ مزید براں صحن میں خاطر خواہ گہرائی کے گڈھے کھودنے۔ چوپاؤں کو باندھنے کے لئے کھونٹے گاڑنے۔ اور دالانوں میں مرغیوں کے ڈربے بنا لینے کا خداداد حق حاصل ہوتا ہے جسکی داد نہ فریاد۔ اگر اس گھریلو سوراج یعنی ہوم رول کا مکمل نقشہ دیکھنا منظور طبع ہو تو کسی کرایہ کے مکان کی زیارت عین اس وقت کرنا چاہیے جب کوئی آزادمنش

کرایہ دار رحال میں اُسے خیرباد کہہ گیا ہو۔

اب اگر محل وقوع کی طرف نظر ڈالئے تو اس بارے میں بھی ذاتی مکان حد درجہ کا ضدی اور کنسرویٹو واقع ہوتا ہے۔ کبھی اپنی جگہہ سے کھسکنے کا نام نہیں لیتا فیشن ایبل آبادی کا رخ مغرب کی طرف بدلے یا مشرق کی طرف۔ گرد و نواح کا علاقہ کاشتکاروں کے تصرف میں آجائے یا محکمہ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ اپنی حماقت کے ثبوت میں یکہ و تنہا کھڑا رہنا پسند کرتا ہے۔ اپنی پوزیشن سے ایک اینٹ بھی ہٹ جانا اسکے اصول وضعداری کے خلاف ہے۔ اسکے برخلاف کرایہ کے مکان ارتقائی منزلوں میں سب سے آگے نظر آئیں گے۔ امپرومنٹ ٹرسٹ کے تازہ ترین نقشوں کی بنیاد پر قیام پذیر ہونا انکی خاص صفت اور وقت شناسی ان کا خاص شعار ہے۔ ذاتی مکانات کی چہار دیواری اٹل ہونے میں سد سکندری کی ہم پلہ۔ اسکی وسعت یا گنجایش میں اضافہ کی خواہش محلہ والوں سے مقدمہ بازی کا پیش خیمہ۔ کنبہ پروری اور مہمان نوازی اسکی سرشت سے بیگانہ۔ الغرض بڑے جز رس اور خودغرض لوگ ہوتے ہیں۔ انکے مقابلہ میں کرایہ کے مکانوں کی خاص خوبی یہ ہے کہ انھیں حسب خواہش و ضرورت گھٹایا بڑھایا جاسکتا ہے۔ مثلاً شادی سے پہلے وہ ایک کمرے ایک کوٹھری، ایک دالان، ایک مختصر سے صحن اور برائے نام باورچی خانہ۔ حمام وغیرہ پر مشتمل ہوجاتا ہے۔ لیکن شادی کے بعد مکین کی طرح اسکی وضع و قطع میں بھی زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی خوش مذاق کے یہاں ہر برسات نئی کوپل پھوٹنے کا آبائی یا سسرالی مرض ہو تو اس مقابلے میں بھی کرایہ ہی کا مکان ایک آدھ کمرہ یا دالان نکلتا نظر آئیگا۔ اگر یقین نہ ہو تو ہمیں گو رہے وہیں جو گاں جس محلہ میں جی چاہے آزما لیجیے۔

پیچ در پیچ خاندانی گورکھ دھندوں کی بدولت میرے بعض احباب آج ذاتی مکان کے جنجال میں گرفتار ہیں۔ حالانکہ ان حادثات میں خود ان بیچاروں کا کچھ بھی قصور نہ تھا محض اوروں کے کئے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ میں کیا کہوں کہ یہ لوگ کس مصیبت میں قید حیات کے دن پورے کر رہے ہیں۔ ادنےٰ سی بات تو یہ ہے کہ اس ظلم کے باوجود کہ پشتہا پشت سے ان مکانوں میں رہنے والوں کی یہاں مرنے کی رسم جاری ہے۔ یہاں تک کہ اب کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جسے ملک الموت نے اچھی

طرح دیکھ بھال نہ لیا ہو۔ مگر بھی یہ غریب انھیں جان لیوا مکانوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کسی نہ کسی وقت یہ خاندانی رسم پوری ہو کر رہیگی۔ مگر مرغ بے بال و پر کی طرح اس قفس کی چہار دیواری سے نجات پانا ان کے بس سے باہر ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ لوگ اب تک جی کس طرح رہے ہیں۔

اِس معاملہ میں کرایہ کے مکانوں کی حالت آپ اسکے بالکل برعکس پائینگے۔ نحوست کا تو ذکر ہی بیکار ہے۔ کرایہ پر اُٹھنے والا مکان کبھی منحوس نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اگر منحوس ہو تو کرایہ پر کیوں اُٹھے۔ کرایہ پر اُٹھنے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ وہ منحوس نہیں ہو۔ اسکے علاوہ اگر ابتدا میں تھوڑی بہت نحوست ہوتی بھی ہے تو بہت جلد یکے بعد دیگرے آنے جانے والے کرایہ داروں کی ایک بڑی تعداد میں اس طرح منقسم ہو جاتی ہے کہ کسی نہ کسی کرایہ دار کے وقت میں آکر یہ مکان نہایت نیک نہاد خجستہ بنیاد۔ فرخ اساس اور مبارک آثار ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مکان ہیں جو اکثر اس مصلحت سے خالی رکھے جاتے ہیں کہ لوگ وقتاً فوقتاً انھیں کرایہ پر لے کر اپنے یہاں کی بیاہ شادیاں رچائیں۔ برائتیں اُتاریں۔ یا رقص و سرود کی محفلیں آراستہ کریں۔

نحوست تو یوں دور ہوئی۔ اب ہا مرنے جینے کا مسئلہ۔ اس کے متعلق مجھے متعدد مالکوں اور "داروغاؤں" سے تبادلہ خیال کا موقعہ ہوا۔ انکی رائے تو یہ ہے کہ موت کا مہیب فرشتہ اور جہاں جی چاہے بلا روک ٹوک آئے جائے۔ مگر جب وہ کسی کرایہ کے مکان کے دروازے پر نازل ہوتا ہے تو فوراً یہ شعر پڑھتا ہوا واپس جاتا ہے۔

اگر یک سر موے برتر پرم　　فروغ تجلّٰی بسوزد پرم

اسکے ثبوت میں وہ یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ "انھوں نے اپنے کسی مکان میں کبھی کسی کو مرتے نہیں دیکھا۔ ممکن ہے کہ یہ روایت صحیح ہو۔ مگر میری رائے اس بارے میں یہ ہے کہ جب ملک الموت کا ورود کرایہ کے مکان میں ہوتا ہے تو وہ اس شش و پنج میں پڑ جاتے ہیں کہ وارنٹ گرفتاری کی تعمیل مالک مکان پر ہونا چاہیے یا کرایہ دار پر۔ ایک اور وجہ بھی کبھی کبھی ذہن میں آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ مہینہ کی ابتدائی تاریخوں میں مالک مکان ملک الموت کے خلاف کرایہ دار کا سینہ سپر رہتا ہے۔ اور اسکے بعد کی تاریخوں میں مر بیٹھنا کرایہ دار اپنے حق میں مضر سمجھتا ہے اس لئے کہ کرایہ بہرحال پورے ماہ کا دینا ہوگا۔ خیر جان کی تو چنداں پروا نہیں مگر چلتے چلتے مالی نقصان برداشت کرنا مرے پر سو دُرّے کی مثال ہوگی۔

یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ ان مختلف تاویلات میں کون سی صحیح اور کون سی غلط ہے۔ وہاں جانے پر معلوم ہوگا۔ مگر اس وقت بے سود ہوگا۔ اس لئے کہ وہاں کی دنیا کرایہ کے مکانوں کی رحمت سے محروم ہے۔ لیکن ماحصل سب کا ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ مرض الموت سے جانبر ہونے کا سب سے قوی اور تیر بہدف نسخہ جو آج تک دریافت ہو سکا ہے وہ یہی ہے کہ مریض کرایہ کے مکان میں سکونت پذیر ہو جائے۔ چنانچہ اسی تمنا میں بڑے بڑے شہروں میں نامی حکیموں اور ڈاکٹروں کے پرانے مریض اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور المورہ، نینی تال اور اس قسم کے دیگر مقامات میں کوئی کرایہ کا مکان ایسا نہ ملیگا جس میں طرح طرح کے صدہا مریض فروکش نہ ہو چکے ہوں۔ بلکہ بعض لوگ تو صحت کی حالت میں وہاں جا کر حفظ ماتقدم کے طور پر بیمار پڑ لیتے ہیں۔ اس لئے کہ نہ معلوم پھر ایسا نادر موقع ہاتھ لگے یا نہ لگے۔

الغرض میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میرا کوئی ذاتی مکان ہوتا تو اگر اور کچھ بھی ممکن نہ ہوتا تو میں خود ہی اسکو باقاعدہ کرایہ پر لیکر رہتا۔ جب ملک الموت آکر سوال کرتے کہ اے انسان، بتا کیا تو ہی اس مکان میں کرایہ پر رہتا ہے؟ تو میں بے گناہ معصومیت سے جواب دیتا کہ اے اچھے۔ مہربان فرشتے۔ میں اس مکان کا مالک ہوں۔ (ایسے موقع پر تھوڑی بہت خوشامد جائز ہے۔) اور جب میونسپل کمیٹی کے ٹیکس کلکٹر جنھیں اس فرشتہ سے کچھ دور کی نسبت ہے آکر سوال کرتے کہ "وہ ہیں کیا تم اس مکان کا مالک ہونا مانگتا ہے" تو میں بلا تامل جواب دیتا کہ اے بظاہر خاکی وردی والے مگر باطن میں چھوٹے سرکاری فرشتے میں اس مکان میں کرایہ پر رہتا ہوں، میں نے مالک مکان کو کبھی نہیں دیکھا اور نہ اس سے میری ملاقات ہے۔

رباعیات فراق گورکھپوری

سوتے رہے میٹھی نیند سونے والے　　کھوتے رہے جان۔ جان کھونے والے
بڑھتا ہی رہا سکوتِ شامِ ہجراں　　روتے ہی رہے کسی کو رونے والے

سچ ہے ان کا کہیں ٹھکانا بھی نہیں　　سچ ہے ان کا کوئی سہارا بھی نہیں
صابر تھے یہ ہر حال میں دنا تو یہ ہے　　دل آپ کے دل دکھوں کا دکھتا بھی نہیں

غزلیات

جناب سید زاہد حسین صاحب زاہد سہارنپوری مرحوم اپنے زمانے کے ایک نغز گو شاعر تھے - آپ کا دیوان غزلیات مکمل و مرتب ہے - مگر ابھی شایع نہیں ہوا - مرحوم نے ایک بہت بڑا ذخیرہ مختلف تصانیف کا یادگار چھوڑا ہے - ہمیں انکی ایک غزل ملی ہے جو ناظرین ادب کی ضیافت طبع کے لئے پیش کش ہے - (مدیر)

احمدؐ سے ہے مقام خدا بے گماں بلند ۔۔۔ لیکن خدا گواہ کہ از دو کماں بلند

کیونکر غبار اُڑ کے ہو - تا آسماں بلند ۔۔۔ میں خاکسار - اور ترا آستاں بلند

دل جل رہا ہے کیوں نہ ہو آہ و فغاں بلند ۔۔۔ روشن جب آگ ہوگی تو ہوگا دھواں بلند

دل کیا نگاہ و ابرو و مژگاں سے بچ سکے ۔۔۔ نیزے بلند، تیر بلند اور کماں بلند

صیاد گھات میں ہے مخالف ہے باغباں ۔۔۔ میں بال و پر شکستہ ہوں و آشیاں بلند

کھٹکا بھی ہے انھیں کو بہت برق و باد کا ۔۔۔ جن طائروں کے باغ میں ہیں آشیاں بلند

مجموعۂ صفات ہے وہ شوخ حق نظر ۔۔۔ طناز مست ناز بھی قد جواں بلند

موزونیوں میں رتبہ سرو چمن سے بھی ۔۔۔ دو چار ہاتھ ہے مرا سرو رواں بلند

غنچہ بھی تو چٹکتا ہے اُس مُنہ کے سامنے ۔۔۔ اتنی سی اُسکی جان اور اتنی زباں بلند

پہونچی نہیں ہے بام حقیقت تلک ہنوز ۔۔۔ پھینکی بہت کمند خیال و گماں بلند

زاہد سفید سر ہوا خواب گراں سے چونک ۔۔۔ پھیلی ہے دھوپ مہر ہوا مہرباں بلند

جناب منشی صدیق حسن صاحب اسعد شاہجہانپوری

غم مجھے صدمہ مجھے کاوش مجھے سودا مجھے ۔۔۔ اُس کی رحمت ہے کہ ساری سختیاں تنہا مجھے

شوق کی وارفتگی حد سے زیادہ بڑھ گئی ۔۔۔ اب سمجھتے ہیں وہ کام دل سے بے پروا مجھے

اُن کی محفل سے بھی میں ناکام آیا کیا کہوں ۔۔۔ حسرتوں نے اپنی حد تک کر لیا رسوا مجھے

زندگی بیداری بزم ازل کا ہے خمار ۔۔۔ ماجرائے زندگی ہے عالم رویا مجھے

میں بھی تھا اُس بزم میں لیکن سراپا جوش شوق ۔۔۔ کس نے دیکھا کس نے پایا کس نے پہچانا مجھے

ہجر کا بیمار تھا میں چین سے کیا بیٹھتا ۔۔۔ فتنہ گر تیرے تصور نے دیا دھوکا مجھے

ہائے بزم آرزو کے نقشہائے دلفریب ۔۔۔ کوئی اس پردے میں اسعد دے گیا دھوکا مجھے

جناب آرزو لکھنوی

فروری سنہ ۳۶ء کے "ادب" میں حضرت آرزو لکھنوی کی ایک ایسی غزل شایع ہو چکی ہے جس میں عربی، فارسی کا ایک لفظ بھی نہ تھا اور اس سخت قید کے ساتھ اسکی زبان فصیح لکھنوی اردو تھی۔ اہل نظر حلقوں میں اسکے خوب چرچے ہوے۔ چنانچہ محترمی سید مسعود حسن صاحب رضوی نے حضرت آرزو لکھنوی سے تحریک فرمائی کہ وہ اس انداز کی غزل کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائیں۔ جس دن محترمی سید مسعود حسن صاحب رضوی کا خط موصوف کو ملا۔ اسی دن موصوف نے ایک ویسی ہی غزل کہکر بھیج دی اور وعدہ فرمایا کہ آئندہ "ادب" کے لئے اسی طرح کی غزلیں عنایت فرماتے رہینگے۔ جو لوگ قدامت پسندی کی دُھن میں زمانے کی آواز نہیں سُن سکتے وہ ان غزلوں کے بارے میں جو چاہیے کہیں لیکن جو لوگ زمانے کے اقتضا پر نظر رکھتے ہیں اور اُردو ہندی کا جھگڑا چکانے کے لئے بے چین ہیں وہ حضرت آرزو کی اس کوشش کو فال نیک سمجھیں گے اور دل سے اس کی داد دیں گے۔ کارکنان "ادب" جناب آرزو کے نہایت ممنون ہیں کہ موصوف نے اس مخصوص انداز کی غزلوں کی اشاعت کے لئے اس رسالے کو منتخب فرمایا۔ غزل ملاحظہ ہو۔

یوں گر کے سنبھل بیٹھے تھے یوں مر کے جئے تھے
نبٹ جاتے وہ اوروں کے جو دُکھ اپنے لئے تھے

بہ نکلے تو پانی تھے ۔ نہ ٹپکے تو بنے آگ
اُمڈے ہوے آنسو جو ہم آنکھوں میں لئے تھے

دُکھ بھرتے چلے جائیں تو چھاتی نہ پھٹے کیوں
کچھ پاس تھے پہلے ہی سے کچھ تم نے دئیے تھے

آنکھوں سے ٹپکنے کو ہے کیا ان کو بھی پھوڑوں
جو بھید چھپانے کے لئے ہونٹ سئے تھے

دھبّا بھی کوئی جوگ کے کمبل پہ نہیں ہے
یونہیں گئے وہ ڈوب جو چرچ کے دئیے تھے

کڑیاں بھی اُٹھاتا رہا ۔ پایا نہیں پھل بھی
بیگار کے جو بوجھ تھے سب میرے لئے تھے

بھاتے ہیں کلیجے کو وہ بکھرے ہوے تنکے
جو ایک جگہ برسوں میں چن چن کے کئے تھے

گن گاتے ہو اب چاہ میں کھوئے ہوے جی کا
پہلے تو اولہنوں پہ اولہنے ہی دیئے تھے

بس بن گئے ہیں سانپ کے چھالے کا وہ آنسو
بھر بھر کے جو آنکھوں کے کٹوروں میں پئے تھے

مُنہ آرزو اب کس کا ہے جو کھل کے کہے بات
مہکے تھے جو پھول اُس نے وہ سب توڑ لئے تھے

آثارِ ادبیہ

(جناب پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے)

"ادب" کے گزشتہ پرچے میں مایوس کا کچھ متفرق کلام نکل چکا ہے جگہ کی کمی کی وجہ سے انکی ایک غزل اور ایک نامۂ منظوم باقی رہ گیا تھا۔ یہ دونوں چیزیں اس مرتبہ شایع کی جاتی ہیں۔ ادیب

غزل مایوس

دیکھتا ہوں جس گھڑی جاناں تجھے میں خواب میں
آگ سی لگتی ہے میرے اِس دلِ بیتاب میں

گردشِ دوراں نے ڈالا مجھکو اس گرداب میں
غرق ہوں تیراک جسکے ساحلِ پایاب میں

ٔ ٔ ٔ ٔ ٔ ٔ

روزِ فرقت طوال ہونگے اور شبِ ہجراں دراز
یوں ہوا معلوم اپنے دل کے اضطراب میں

عاشقوں سے اپنے کہتا تھا ....
جب سے پایا ہے قرار اس نے مرے خوناب میں

یک بیک اسکے سفینے پر تباہی آگئی
جو پڑا ہے چارہ بحرِ عشق کے گرداب میں

لختِ دل ساتھ آنسوؤں کے یوں تڑپتے گرے ہیں
کودتی ہیں جس طرح سے مچھلیاں تالاب میں

جس میں ٹھہرا ہوں وہ دل ہی اُس سے ناواقف ہوں
ہے یہ حیرانی کہ اُسکو کیا لکھوں القاب میں

پھنس گیا ہے اُسکی اب لفِ مسلسل ہی میں جا
دل ہمارا پڑ گیا مایوس پیچ و تاب میں

نامۂ منظوم

اے صبا میرا نامۂ پُر درد
وہ جو ہے جور اور ظلم میں فرد

جاکے تو اسکے ہاتھ میں دینا
اور اس کا جواب بھی لینا

گر لکھے وہ جواب نامے کا
چومنا بڑھ کے پاؤں خامے کا

اور اسکے قریب تو جانا
حرفِ تسکین اُس میں لکھوانا

گر نہ ہو ویگی مندرج تسکیں
تنگ آوینگے مجھ سے اہلِ زمیں

ہے یہ مضمون نامۂ جانکاہ
جسکے ہر حرف سے نکلتی ہے آہ

جانِ من غیرتِ بہارِ چمن
گل رُخا رشکِ لالہ زارِ چمن

کیا لکھیں تجھ کو حالِ دردِ اپنا
تیرے غم سے ہے چہرہ زرد اپنا

کیا لکھوں تجھ کو حالِ دل جانی
ہوگیا ہوں میں مضمحل جانی

کیا لکھوں حال چشم گریاں کا
قصہ ہر ایک کو ہے طوفاں کا

یاں ہیں ہم تنگ جان سے اپنی
واں تمھیں کام آن سے اپنی

ہے تجھے پیش چشم آئینہ واں
شکل تصویر یاں ہیں ہم حیراں

تجھ کو سرمہ وہاں ہے مدِ نظر
کام کرتا ہے دل میں یاں خنجر

خوبیِ چشم پر تجھے ہے نگاہ
یاں ہے ہم کو ہزار روز سیاہ

تجھ کو ہر دم خیال قامت ہے
غم سے دل پر مرے قیامت ہے

واں لبوں پر ترے مسی ہے مدام
پر یہاں شکل غنچہ دل ہے تمام

تجھ کو واں زلف و رُخ کا اپنے خیال
زندگی ہم کو یاں ہوئی ہے وبال

واں تمھیں کام پان کھانے سے
یاں ہمیں خون دل بہانے سے

کس طرح تجھ کو جان دیکھیں گے
کس طرح تیری آن دیکھیں گے

یاد اب تک تری ہی دل پر ہے
ان دنوں کیا عتاب مجھ پر ہے

مہربانی وہ کم ہے کیوں یک لخت
زندگانی ہوئی ہے مشکل سخت

آپ رکھتے تھے آگے میرا خیال
پوچھتے تھے کبھو مرا احوال

کبھو کہتے تھے او ادھر آنا
میری آ کر کے دید کر جانا

جانتا ہوں کہ ہوگا تو بے حال
دیکھ مجھ کو اور اپنے جی کو سنبھال

آنکھوں سے تیری چین تھا مجھ کو
دیکھنا فرض عین تھا مجھ کو

جب سے وہ دیکھنا ہوا دشوار
تب سے رہتی ہیں چشم نرگس دار

حیف آتا ہے یہ بایں قربت
اگلی کم کس لئے ہوئی الفت

تیرے باعث سے آشنا چھوٹے
کوہ غم دل پہ سیکڑوں ٹوٹے

واسطے تیرے گھر کو چھوڑ دیا
اقرباؤں سے منہ کو موڑ لیا

تیرا ہی اب خیال رہتا ہے
تیرا شوق وصال رہتا ہے

گو کہ ہم جانتے ہیں اے دلبر
تجھ کو الفت بہت ہے مجھ سے مگر

چین بن دیکھے دل کو کیونکر آئے
کیوں نہ مانوس بن ترے گھبرائے

جانتا ہوں نہیں ترا قابو
جو ملے مجھ سے آ کے اے مہرو

مجھ سے ملنے کو تیرے اہلِ وطن
کرتے ہیں آج کل بہت قدغن

ہو گئی کیا ان دنوں تری حالت · آ گئی ہے جو دفعتاً آفت
دیکھنا بھی ترا ہوا موقوف · بات کرنا مرا ہوا موقوف
مجھ سے سن لے مرے بہار چمن · چھوڑ اپنا دیا، دیار و وطن
اس لئے ہم ترے قریب رہے · تاکنا جھانکنا نصیب رہے
دشمنوں نے کیا ہے وہ بھی بند · جی جلانا ہے دشمنوں کو پسند
چال انداز ناز اور وہ گھات · تیری باتیں وہ بھولی اور حرکات
چلبلاہٹ ہر ایک آن کے بیچ · جھوک بالے کے تیرے کان کے بیچ
سرمہ آنکھوں کا تیری اے محبوب · خم ابرو وہ تیرے خوش اسلوب
کبھی ہو چار چشم کہنا بات · کبھی منہ پھیر کر کے کہنا بات (؟)
کبھی کرنی وہ سرنگوں باتیں · چھین لینے کی دل کی سب گھاتیں
شرم شوخی شرارت اور غرور · اور کرنا حیا سے کچھ مذکور
جس گھڑی ہم کو یاد آتے ہیں · آگ سی دل میں اک لگاتے ہیں
کوئی دم تو جدا جو ہوتا تھا · رات بھر یار یاں میں روتا تھا
کہیں دم بھر کو تم جو جاتے تھے · ہم یہاں پہروں تلملاتے تھے
دل میں سمجھو تو کیا ہوا ہے غضب · ہوئے محروم بھی پیام سے اب
آنکھ میں رہ گیا ہے دم باقی · نہیں رہنے کے یار ہم باقی
واجب الرحم ہو گیا ہوں میں · کب تلک تیرے غم میں رو دوں میں
یوں مرا حال آ کے دیکھے اگر · چشم اپنی کرے لہو سے تر
پر سمجھتے ہیں بات کو ہم خوب · کم تری مہر وہ ہوئی محبوب
ورنہ اتنا ہے اختیار تجھے · کسی عنوان سے تو پوچھے نہ مجھے
اپنا رونا یہاں ہے طغیاں پر · طعنہ کرتی ہے چشم طوفاں پر
اور روتا ہوں اس سے میں اندیش · کوئی روز دوں میں ہے سفر درپیش
کوئی دن میں سفر کو جاؤں گا · پھر تجھے کس طرح سے پاؤں گا
کس طرح دل کو چین آوے گا · کیونکہ آرام دل یہ پاوے گا
تو نہیں ایک اس سفر میں ہے · کس طرح ہوں گے یہ منازل طے

ہم سفر جبکہ ہونگے تم اور ہم
آگے اُس دم اُٹھیگا اپنا قدم

ورنہ چلنا محال ہووے گا
تیرا ہر دم خیال ہووے گا

دوسرے سر پہ آگئی برسات
کس طرح تیرے بن کٹے اوقات

آیا موسم یہ سر پہ وحشت خیز
جس سے ہے چشم عاشقاں خونریز

جب سے وحشت ہوئی ہمیں دونی
اشک آتے ہیں چشم سے خونی

سبزے ہر طرف لہلہاتے ہیں
گل ہیں جتنے سو ڈہڈہاتے ہیں

کوسوں آتا نظر ہے تختۂ آب
جیسے گل ہو رہے ہیں سب شاداب

ہے گلستاں میں تا کمر پانی
ہر طرف آوے ہے نظر پانی

برگ گل جو گرے ہیں پانی پہ
ہیں وہ اشک واں ہیں لختِ جگر

چھا رہی ہیں گھٹائیں جیسے دھول
جس سے تاریک ہو رہا ہے جہاں

اک طرف دامنی دمکتی ہے
ابر میں تیغ سی چمکتی ہے

پڑ رہی ہے ہر اک طرف کو پھوار
سبزے کی ہو رہی ہے دونی بہار

ہے پپیہوں کی اک طرف یہ کوک
ہوے جاتے ہیں جس سے دل دو ٹوک

کہیں سبزہ ہے اور کہیں ہے آب
کہیں ڈبرے ہیں اور کہیں تالاب

کہیں بگلے ہیں اور کہیں ہے مور
ہو رہا ہے فلک پہ رعد کا شور

جانور باغ میں کریں ہیں غل
کرتی ہے چہچہے کہیں بلبل

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں
مچھلیاں آب میں اُچھلتی ہیں

بیٹھے ہیں باغ میں پرے کے پرے
ہر طرف کھیت ہو رہے ہیں ہرے

دشت و در میں تمام بدلا روپ
کہیں سایہ ہے اور کہیں ہے دھوپ

باغ خوشبو سے سب مہکتا ہے
سبزہ ایک طرف کو لہکتا ہے

سارے میدان ہو گئے جل تھل
کہیں فوارے بھی رہے ہیں اچھل

کہیں نسرین و نسترن کی بہار
ہو رہی ہے عجب چمن کی بہار

کہیں نہروں میں بھر رہا ہے آب
غنچہ و لالہ ہیں کہیں شاداب

آب جوئیں چمن میں جاری ہیں
بلبلیں چہچہے میں ساری ہیں

کر رہے ہیں کہیں پکھیرو شور
پانی کا ہے کسی طرف کو وفور

سبزہ ہر طرف کو منو پر ہے — لطف بگلوں کا کیا ہی جوبن پر ہے
کوئی بھیگے ہوئے ہیں بال و پر(؟) — کوئی پانی میں ہو رہا ہے تر
کوئی گاتا ہے اک طرف کو ملار — ہر طرح کے ہے جانور کی پکار
سبھی القصہ اپنے رنگ میں ہیں — نشۂ وصل کی ترنگ میں ہیں
ایک ہم ہیں کہ خستہ و رنجور — موسم گل میں ہیں چمن سے دور
کچھ عجب طرح دل کا عالم ہے — جس سے سب عیش وصل برہم ہے
آسمان و زمیں پہ یوں ہے بہار — کس طرح تیرے بن نہ ہوں ہم زار
ان دنوں سب ہیں وصل میں سرگرم — اور مجھ کو ہے اس بہار میں شرم
کس طرح اپنی زندگانی ہو — اس قدر کم جو مہربانی ہو
دل تڑپتا ہے شام و سحر — اور درپیش یاں ہے عزم سفر
کوسوں سبزہ نظر جو آوے گا — تیرے بن دل یہ تلملاوے گا
غم دوری ہماری جان پر ہے — ہر گھڑی یہ غزل زباں پر ہے
اس قدر ہم سے بے وفائی ہے — یہ نہیں رسم دلربائی ہے
بات پوچھی نہ ایک دن میری — تیرے دل میں یہ کیا سمائی ہے
نہیں آتا ہے چین غم سے آہ — دل میں کیسی بلا سمائی ہے
قتل کرنا غریب عاشق کو — یہی آئین آشنائی ہے
کوچہ ہے دل کا، کچھ تو کہتے تھے(؟) — ہائے تجھ تک نہیں رسائی ہے
نہ ملایا اسے کبھی مایوس — عشق کے ہاتھ سے دہائی ہے
حال دل اپنا رو چکا مایوس — اشک سے منہ کو دھو چکا مایوس
تو اگر اس پہ کچھ کرے گا کرم — دم میں دم آئیگا مرے اس دم
مہربانی ضرور اب تو کر — دست شفقت کو میرے دل پر دھر

نامہ تو یاں سے پا چکا اتمام
ہے محمدؐ پہ اب درود و سلام

"تمام شد۔ بتاریخ ۲۴ راگست سنہ ۱۸۲۴ء
مطابق ۱۸ ذالحجہ سنہ ۱۲۳۹ھ"

رجسٹرڈ
رجسٹرڈ
سندری اسنو
نہایت خوشبودار فیس کریم
عورتوں اور مردوں کے چہرے پر لگانے کا بہترین غازہ ہے
اس کو چند روز استعمال کرنے سے چہرے کی جھریاں۔ مہاسہ۔ جھائین۔ اور پھنسی کے داغ صاف ہو جاتے ہین۔
چہرہ کی سیاہی اور میل صاف کرکے سندری اسنو چہرے کے رنگ کو نکھار کر گورا اور صاف بنا دیگا۔
عورتوں کے چہرے کا چمڑہ مثل مخمل کے نرم۔ ان کے رخسارون پر چمک اور ملاحت پیدا ہو جائیگی مردوں کا
چہرہ سندری اسنو کے استعمال سے گداز اور بارونق اور صاف ہو جائیگا بچے اور جوان عورتین
اگر سندری اسنو برابر استعمال کرین تو ان کا چہرہ ہمیشہ گلاب کے پھول کیطرح سرخ و سپید رہیگا۔
ایک بڑی خوبی ہمارے فیس کریم میں یہ ہے کہ چہرہ پر لگائین تو مثل تیل وغیرہ کے چکنائی نہین آتی۔
اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ چہرہ پر کچھ لگایا ہے۔ کیونکہ سندری اسنو جلد مین جذب ہو جاتا ہے۔ اور بالکل یہ
معلوم ہوگا کہ آپ کے چہرہ کا رنگ قدرتی گورا اور چمکدار ہے۔ داڑھی شیب کرتے وقت اکثر استرہ کی
خراش یا کھرنچ لگ جاتی ہے۔ اگر سندری اسنو اس پر لگا دین تو فوراً خون کا نکلنا بند ہو جاتا ہے اور کھرنچ کا
نشان معلوم نہین ہوتا ہے۔ جاڑے میں اسکے لگانے سے چہرہ نہ تو پھٹتا ہے اور نہ روکھڑا ہوتا ہے۔ اور گرمی مین
نہ تو پسینہ آتا ہے۔ اور نہ دھوپ اور لُو کا اثر ہوتا ہے۔ ہر عمر کے مرد اور بچون کو سندری اسنو بیحد مفید ہے
قیمت فی پاٹ بارہ آنہ تین پاٹ کی قیمت دو روپیہ محصولڈاک علاوہ
اسے بھی ملاحظہ فرمائیے
محترمہ خورشید سلطانہ بیگم صاحبہ اڈیٹر رسالہ شباب اردو تحریر فرماتی ہین۔
مکرمی تسلیم۔ سندری اسنو کی ایک شیشی پہونچی۔ مین آپکی مشکور ہون۔ اور آپ کو اس
ایجاد پر مبارکباد دیتی ہون سندری اسنو مجھے بہت پسند ہے۔ آئندہ بجائے ہیزلن اسنو کے سندری اسنو استعمال کرونگی۔ اور
میری کئی سہیلیون کو بھی بہت پسند ہے۔ سر دست تین شیشی زبیدہ بیگم کے نام بھیجدیجیے۔
پتہ کا } ایس اے بی بخشی اینڈ کمپنی کوٹھی نمبر ۷ کولوٹولا اسٹریٹ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴ کلکتہ

فہرست مضامین

جلد — بابت ماہ مئی ۱۹۳۰ء — نمبر ۸

بزم ادب

جس قوم میں مطالعہ کا ذوق نہیں ہے مشکل ہے کہ اُسے شایستہ کہا جا سکے۔ اچھی کتابیں اور اُنکا عمومی حیثیت سے پڑھا جانا قومی شایستگی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم و ملک کے عقلا نوجوانوں کو برابر یہ نصیحت کرتے رہتے ہیں کہ وہ اچھی کتابوں کے مطالعہ کا ذوق اپنے میں پیدا کریں۔ علمی تربیت کا یہی موثر عنوان ہے۔ جو قومیں آج گوناگوں نعمتوں کی مالک بنی ہوئی ہیں اُن کے تمام طبقوں میں مطالعہ کا ذوق پوری قوت کے ساتھ موجود ہے مختلف مصروفیتوں کے باوجود وہ اِس شوق کے پورا کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکالتے ہیں۔ اچھی کتابیں خریدتے ہیں اور اُنھیں پڑھتے ہیں لیکن ہماری حالت اس معاملہ میں بھی قابل افسوس ہے۔ ہم میں مطالعہ کا شوق نہیں ہے۔ ہم اچھی کتابوں اور اچھے رسائل کے خریدنے میں اپنی کمائی کا کوئی حصہ صرف نہیں کرنا چاہتے۔ ہم نے علمی تربیت کا صرف یہ معیار قرار دے لیا ہے کہ یونیورسٹیوں کے کچھ امتحانات پاس کرلیں اور پھر باقی عمر کے لئے مطالعہ سے قطع تعلق کرلیں، نہ اچھی کتابیں خریدیں اور نہ اُنھیں پڑھیں لیکن یہ ہماری غلطی ہے۔ ان مدارج کے طے کرنے کے بعد جب تک کہ بہت سی راتیں چراغ کے سامنے کتابوں پر نظریں جمائے ہوئے جاگ جاگ کر نہ کاٹی جائیں، علمی منزلت کا حاصل ہونا خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ بدقسمتی سے ہمارے بہت سے پڑھے لکھے یہ خیال قائم کئے ہوئے ہیں کہ تعلیم کے ان رسمی مدارج کو طے کرلینا ہی معراج کمال ہے۔ اسکے بعد تو پھر انسان کو فیشن کی زلف دراز ہی کے سنوارنے میں مصروف رہنا چاہیے۔ کتابوں کا خریدنا پڑھنا اُنکے مطالعہ میں وقت صرف کرنا "تمدنی ابلہی" ہے۔ مطالعہ زندگی کو کامیاب نہیں بناتا۔ اسکے لئے ظاہری تماشوں اور مغربی فیشن کی پرستاری ضروری ہے۔

افسوس ہے کہ ہم اس نظریہ کے سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں۔ ہمارے خیال میں زندگی کی کامیابی

محض سطحی کامیابی ہوگی حقیقی کامیابی کو اس سے کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا۔ قومیں ظاہری نمائشوں اور مغربی فیشن کی نیدگی سے نہیں بن سکتیں۔ اِن جھوٹے موتیوں سے قومی رفعت کے تاج کی آرایش نہیں ہو سکتی حقیقی معنوں میں قومیں اُسی وقت سنور سکتی ہیں جب کہ اُن کا ہر فرد اچھی کتابوں کے پڑھنے کا دالہ و شیدا ہو اور اپنی بساط کے موافق اُنکے قدر و قیمت کے پہچاننے کی سعی جمیل کرے۔ یہی ناقدانہ مطالعہ اُن کے دماغی قوتوں کو اُبھار سکتا ہے۔ اور اس طرح اُن کے اعمال و افکار میں ایک خاص قسم کی حکیمانہ شان پیدا ہو سکتی ہے اور وہ ترقی یافتہ اقوام کی صف میں ممتاز نشست حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسروں کی عزت کی نگاہیں اُن پر پڑ سکتی ہیں اور اُن کی باتیں احترام کے ساتھ سنی جا سکتی ہیں۔

فضل و دانش کا طرہ اگر اُنکی معاشرت کی دستار پر آویزاں نہیں ہے تو وہ کسی کی نگاہ میں کھپ نہیں سکتے علمی بدشوقی کو اس عنوان سے پیش کرنا فریب نفس کی بدترین مثال ہے۔

ہندوستانیوں کو اگر فی الحقیقت ترقی کرنا ہے تو وہ عام علمی فضا پیدا کریں۔ اسکی کوشش کریں کہ نوجوانوں میں مطالعہ کا شوق عمومی حیثیت حاصل کرے۔ اچھی کتابوں کا خریدنا اور پڑھنا اُنکی زندگی کا جزو بن جائے۔ حکما و عقلا فضل و دانش کے جو بیش قیمت جواہر کتابوں میں پوشیدہ کر گئے ہیں اُنھیں ڈھونڈھیں اور اپنے افعال و اعمال کو اُنکی ضیا سے روشن بنائیں، یونیورسٹیوں اور مدرسوں کے رسمی نصاب کا طے کر لینا ہی علمی زندگی کا آخری نقطہ نہ سمجھ لیں۔

انڈیا آفس کی جدید عمارت ہندوستانی و مشرقی عجائب و غرائب کا معدن بنائی جا رہی ہے یہاں سلطنت بابل کی بھی یادگاریں ہیں۔ اور سلطنت ایران و عرب کی بھی۔ کرامول کا دستخط شدہ دستاویز بھی ہے اور نلسن کا ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام خط بھی۔ غرض ایک مستشرق کے لئے اس عمارت میں اتنے گرانبہا جواہر کا انبار ہے کہ اسکے دیکھنے اور شمار کرنے کے لئے ایک عمر چاہیے۔ بس اسی سے سمجھ لیجئے کہ انڈیا آفس کی اس جدید عمارت کے کتبخانے میں تقریباً دو لاکھ کتابیں ہیں۔ جن میں سے اکثر بہت ہی بیش قیمت ہیں۔

اس کتبخانے میں بیس ہزار صرف فارسی عربی اور سنسکرت زبان کی کتابوں کے قلمی نسخے موجود ہیں یوں تو اس بیش بہا ذخیرے کی ہر کتاب قابل قدر ہے لیکن اس میں ایک کتاب خاص طور سے دلچسپ ہے، یہ شیر دکن سلطان ٹیپو مرحوم کی ایک خود نوشت کشکول ہے جس میں سلطان نے اپنے خواب اور انکی تعبیریں لکھی ہیں - اس امر کا اندازہ محال ہے کہ سلطان ٹیپو سے بادشاہ کے خواب جسکے خیالات کو بھی بعض مورخین خواب پریشاں ہی سے تعبیر کرتے ہیں کس قدر دلچسپ ہونگے اور اگر اس سلطان کے خواب خیال واقعیت کا جامہ پہن لیتے تو آج ہندوستان کی صورت کیا ہوتی -

---

معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کے مایۂ ناز فلسفی و شاعر ڈاکٹر ٹیگور نے عارضی طور سے ادب شاعری کا مشغلہ ترک فرما دیا ہے اور پوری توجہ سے تصویرکشی شروع کردی ہے - چنانچہ آپ روزانہ تین چار نئی تصویریں تیار کر لیتے ہیں - اب سے پہلے ہندوستان کے ایک دوسرے نامور شاعر نے یہ شعر نظم کیا تھا - ؎

سیکھے ہیں مہرخوں کے لئے ہم مصوری ~~~ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

غالب کے یہاں یہ لطیف خیال شاعری کی حدود سے آگے نہ بڑھا تھا لیکن ڈاکٹر ٹیگور (واقعۃً) مصور بن گئے اور اس پیرانہ سالی میں فنون لطیفہ کا یہ شعبہ اتنا دلکش نظر آیا کہ انھوں نے شاعری کی رنگینیوں کو بھی (وہ عارضی طور ہی سے سہی) خیرباد کہہ دیا - ڈاکٹر ٹیگور فطری شاعر ہیں اُنکی روح "حسن" کی لطافتوں میں ہمیشہ ڈوبی رہتی ہے - صاف شفاف چاندنی میں جھلکتے ہوے تاروں کی بہاریں، سبز و شاداب چمنستان میں کھلے ہوے گلاب کے تختے ٹیگور کے لئے خاص طور سے سامان دلکشی ہیں - حسن فطرت کا جو اتنا دلدادہ ہو ناممکن تھا اگر وہ کسی نہ کسی زمانہ میں رنگ کی پیالیاں اور موقلم لیکر حسن و جمال کے خط و خال کی مادی تصویروں میں رنگ بھرنے نہ بیٹھ جاتا -

خدا کرے ڈاکٹر ٹیگور کا مصوری میں یہ عارضی انہماک بخیر و خوبی ختم ہو اور وہ پھر شاعری کی طرف متوجہ ہوں - ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر ٹیگور کی شاعری کا تازہ دور زیادہ پر کیف زیادہ روح افزا ہوگا - یقیناً اُس مصوری میں کمال کا پیدا ہو جانا جو ایک دوسرے مشرقی شاعر کے نزدیک مہرخوں کی ملاقات کی تقریب ہے - شاعرانہ فطرت میں بہت سی دلکش لطافتیں پیدا کر سکتا ہو -

افلاطون حکیم

(جناب مولوی سید اختر علی صاحب تلہری، مولوی فاضل، منشی فاضل)

یونان کی مردم خیز سرزمین نے جو حکما و فلاسفہ کی جماعت پیدا کی تھی اُس میں افلاطون کو گل سرسبد کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ صحیح معنوں میں دقیقہ رس و نکتہ سنج فلسفی تھا۔ معارف و حقایق پر اُسکی نظر تھی۔ اُسکے غور و فکر کی نگاہیں سطح اور قشر سے کھیلنے کی عادی نہ تھیں یہی وجہ ہے کہ اُسکے خیالات نے بعد کے افکار و آرا پر کافی اثر ڈالا ہے۔ یورپ کے حکما کی ایک بڑی جماعت اسی یونانی فلسفی کے خیالات کی خوشہ چیں رہ چکی ہے۔ ان کے نظامات فلسفہ میں افلاطونی افکار و آرا کا برابر سراغ ملتا ہے۔

اس نامور حکیم کی ولادت حضرت مسیح سے چار صدی پہلے ایتھنز میں ہوئی ہے۔ اسکی پیدایش سے تین چار سال پہلے پلوپونیشیا کی جنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ یہ وہ خوفناک جنگ تھی جس نے ایتھنز کی تاریخ میں انقلاب پیدا کردیا اور اسے اتنا امتداد ہوا کہ افلاطون کی پیدایش کے بعد بھی ۲۳ یا ۲۴ سال تک جاری رہی۔ اور اسکی ہولناکیوں اور ہیبت آفرینیوں میں کسی قسم کی کمی پیدا نہ ہوئی۔

افلاطون کا عہد طفولیت اور شباب کا ابتدائی حصہ اسی مصیبتناک فضا میں ختم ہوا۔ لڑائی کے آخری دنوں میں اُسے فوجی خدمت خود بھی کرنا پڑی۔ اُسکی نگاہوں نے ایتھنز کا اس لڑائی کی سخت چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہونا اچھی طرح دیکھا تھا۔ ناممکن تھا کہ یہ دلخراش مناظر اُس میں فلسفی بننے کی قوتیں نہ اُبھارتے اور پھر بچپنے ہی میں ایتھنز کے مشہور حکیم سقراط سے اُس کا تعارف ہوگیا۔ سقراط کے انداز کچھ اتنے جاذب تھے کہ اُس سے ایک مرتبہ جو شخص پانچ منٹ کے لئے بھی مل لیتا تھا وہ اُسے عمر بھر نہیں بھول سکتا تھا۔ افلاطون کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اُسے آغاز ہی میں سقراط سے معلم کے حکیمانہ خیالات سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ اور اُسکے فلسفیانہ مذاق نے مناسب سایہ میں نشو و نما پایا۔

افلاطون ایتھنز کی دمیقراطی طرز حکومت سے بیحد بدظن ہوگیا تھا۔ اسکی دو وجہیں تھیں۔

اوّل تو یہ کہ اُس کے خاندان کے بہت سے افراد اس طرز حکومت کی مخالفت کے سبب سے تیغ سیاست کے گھاٹ اُتر چکے تھے۔ دوم یہ کہ ایتھنز کی اس حکومت نے غلط فہمی کی بنا پر سقراط سے بے لوث حکیم کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ اِس سفاکانہ سیاست سے افلاطون بیحد متاثر ہوا اور اُسکے خیالات یونان کے موجودہ نظام حکومت کے بالکل مخالف ہوگئے۔

افلاطون اگرچہ بڑی حد تک اُس قسم کا مفکر تھا جو عالم خیال میں مستقبل کے حکومت و معاشرت کے نظام تیار کرتے ہیں۔ لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ عملی انسان نہ تھا۔ اُس نے اپنے طویل ترین مکالمات و قوانین میں سیاسی و معاشرتی اور تعلیمی نظام کا ایک ایسا ڈھانچہ تیار کیا ہے جس سے اُسکے عملی انسان ہونے کا اچھا خاصا ثبوت ملتا ہے۔

وہ فلسفیوں کے لئے راہبانہ عزلت نشینی اور دُنیا سے بے تعلقی پسند نہ کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہموطنوں کو معاملات کے انصرام میں ضروری مشورہ دیں اُن کی غلطیوں کی اصلاح کریں۔ اُنھیں صداقتوں کی تعلیم دیں۔ اِس اصلاحی روش کے اختیار کرنے سے اُن کے متعلق غلط فہمیاں ضرور پیدا ہونگی لیکن اس سے اُنھیں برداشتہ خاطر نہ ہونا چاہیئے۔ ان خیالات کے ماتحت افلاطون کے لئے بالکل ناممکن تھا کہ وہ کسی جماعت سے اپنے سیاسی مشورے سے دریغ رکھتا۔ وہ ہمیشہ اپنے افکار و آراء سے اپنے ہموطنوں کو مستفید کرتا رہا ہے۔

سسلی کی طرف سے جب خواہش کی گئی کہ وہ اپنے سیاسی نظریوں کو عمل کا جامہ پہنائے تو وہاں وہ خود اس فرض کے ادا کرنے کے لئے گیا۔ وہاں اس کا مشن کامیاب نہیں ہوا اور وہ واپس چلا آیا لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ عملی معاملات میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ اُس نے اکاڈیمی کی بنیاد ڈالی تھی جو مختلف صورتوں میں تو صدیوں تک قائم رہی۔ گو اس اکاڈیمی کا اثر گھٹتا بڑھتا رہا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ قدیم افکار و آرا کے بنانے میں خاص چیز ثابت ہوئی ہے۔ ایسے مفید ادارہ کا قائم کرنے والا محض خواب و خیال کی دُنیا میں رہنے والا انسان کبھی نہیں سمجھا جا سکتا۔

اس ادارہ کا ایک معین مقصد تھا اور اچھی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ اس کا منشا سیاسی جماعت کی تربیت تھی۔ اس میں لوگ پڑھتے تھے۔ اُن کو یہ بتلایا جاتا تھا کہ وہ علم کو علم کی غرض سے سیکھیں

اسی منشا سے اُنھیں جامیٹری وغیرہ جیسے خشک مضامین خاص توجہ سے پڑھائے جاتے تھے۔
اس ادارہ سے افلاطون کا عملی انسان ہونا اچھی طرح ثابت ہوسکتا ہے اور یہ واضح ہوسکتا ہے کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا اُسکی تمام تفصیلات پر اُسکی نظر پہونچ جاتی تھی اور وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس کام کو کس نوعیت سے شروع کرنا چاہیے۔ کن کن دقتوں سے کیسے مقابلہ کرنا پڑیگا۔ اُس کی اس حکیمانہ واقفیت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ یہ اکاڈمی اتنی کامیاب ہوئی۔
اس جلیل القدر حکیم کا انتقال ۸۰ برس کی عمر میں ہوا ہے۔ اُس کی تمام زندگی عقلی و روحانی تجربوں میں صرف ہوئی ہے۔

وہ دقیق النظر فلسفی ہونے کے ساتھ دُنیا کا بہترین نثر نگار بھی ہے۔

اُس کا تمام فلسفہ مکالمات کی شکل میں ہے۔

میں مضمون ذیل میں اُس کے نظریہ تصورات اور اُس کی جمہوریت کا خاکہ مختصر لفظوں میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

افلاطونی جمہوریت

افلاطون کے تمام مکالمات کا بالعموم یہ رنگ ہے کہ ایک غیر فلسفی شخص سیاسیات یا مذہب کے متعلق کچھ خیالات پیش کرتا ہے جن میں عادل صادق یا حسین کا لفظ آجاتا ہے اور فوراً سقراط یہ دریافت کرتا ہے کہ اس لفظ سے کیا مراد ہے۔ وہ شخص اس کی توضیح کی کوشش کرتا ہے اور دشواریوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ پھر دوسرے اشخاص اس بحث میں حصہ لینا شروع کردیتے اور مختلف عنوانوں سے اُسکے مطلب کی تشریح کرتے ہیں۔ سقراط ایک ایک کرکے ان کو باطل کرتا ہے۔ آخر میں اُس سے کہا جاتا ہے کہ وہ خود اسکی تشریح کرے۔ آخر کار سقراط اس فرض کو انجام دیتا ہے۔

جمہوریت میں بھی اُس نے یہی طرز اختیار کیا ہے اس مکالمہ میں انصاف کے متعلق بحث چھڑ جاتی ہے اور مختلف تعریفیں اُسکی پیش کی جاتی ہیں۔ سقراط سب کو ناکافی ثابت کرتا ہے۔ پھر سقراط کے دو خاص تلامذہ گلوکن اور ایڈیمینس انصاف کی حقیقت کے متعلق نہایت سوچ سمجھ کر استدلال کرتے ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسان میں انصاف کو ناانصافی پر ترجیح دینے کا کوئی فطری رجحان نہیں ہے۔ اُن کے استدلال کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں یہ ثابت

کیا جاتا ہے کہ انسان فطرۃً قانونی پابندیوں کا مخالف ہے۔ اس میں بہت سی خواہشیں پائی جاتی ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ اُنھیں پورا کرے لیکن بعد میں اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی خواہشوں کا آزادی سے پورا کرنا خطرناک ہے۔ کیونکہ دوسرے انسان بھی اسی قسم کی خواہشیں رکھتے ہیں اور وہ بھی اسی آزادی سے اُنھیں پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اس صورت میں تصادم کا ہونا ناگزیر ہے لامحالہ آزادی سے خواہشیں پوری نہیں کی جا سکتیں کیونکہ اس حالت میں زندگی کی بقا ناممکن ہے لہذا وہ اپنی خواہشوں پر کچھ پابندیوں کا عائد کرلینا اس شرط سے منظور کرلیتا ہے کہ دوسرے بھی اس پابندی پر راضی ہوجائیں۔ گویا وہ انھیں خواہشوں کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ جو معاشرتی حیثیت سے مضر ثابت نہ ہوں۔ اِس لئے مختلف قوانین بنائے جاتے ہیں اور اُن کی پیروی کی جاتی ہے لیکن یہ صرف خوف کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ خوشی کی وجہ سے نہیں۔ اگر یہ خوف نہ رہے تو پھر کوئی انسان آزادی سے اپنی تمام خواہشیں پوری کرنے میں تکلف نہ کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان فطرۃً قوانین پسند نہیں ہے یہ کیفیت جو اُس میں پائی جاتی ہے وہ مجبوری کا نتیجہ ہے۔ ایسی حالت میں اُسے فطرۃً انصاف پسند یا اخلاق پسند کیونکر کہا جا سکتا ہے۔

استدلال کے دوسرے حصہ میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انسان کا انصاف کی طرف رجحان درحقیقت بے غرضانہ نہیں ہے بلکہ عدل و جور کے نتائج کے تصور سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

سوسائٹی مختلف افراد سے مبنی ہے جن کی خواہشیں بداہۃً ایک دوسرے کے متضاد ہوتی ہیں اگر اُنھیں اعتدال کی حدود میں نہ رکھا جائے تو سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اسی لئے سوسائٹی اُن اعمال کو جن سے اس کا نظام باقی رہے پسندیدہ قرار دیتی ہے اور جن سے اُسکے نظام کو خطرہ پہونچنے کا اندیشہ ہو قبیح قرار دیتی ہے۔ اس حالت میں اچھا چال چلن وہی ہوتا ہے جسے سوسائٹی منظور کرتی اور مختلف انعامات کا مستحق قرار دیتی ہے اور بُرا چال چلن اُسکے بالکل برعکس ہے۔ اس سے کیا یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ لوگ جو اخلاق کے مطابق عمل کرتے ہیں اسکا منشا یہ نہیں ہے کہ وہ فطرۃً نیک ہیں بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کی ملامت سے ڈرتے ہیں۔

سوسائٹی جو انعامات اچھے چال چلن پر دیتی ہے وہ صرف زبانی پسندیدگی ہی سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ وہ مختلف مقولوں کے ذریعے سے انسان کو اس کا یقین دلا دینا چاہتی ہے کہ اس چال

چلن سے خوش حالی اور اطمینان بھی نصیب ہوتا ہے۔ اور پھر وہ اپنے انعامات اس دنیا تک محدود نہیں رکھتی بلکہ دوسری دنیا تک اُن کا سلسلہ پہونچا دیتی ہے۔ اور یہی رنگ اُسکے عقوبتوں کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی فطری خواہشیں دباتے اور سوسائٹی کے معیار کے مطابق نیک بننے کی سعی کرتا ہے۔ اِس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ درحقیقت نیکی اور اخلاقیت کی عزت کرتا ہے۔ اگر نیکی اور بدی کا مقابلہ ان انعامات وعقوبات سے قطع نظر کرکے کیا جائے تو پھر ان میں کوئی تفرقہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ فرض کیجیے کہ اگر کسی انصاف پر بے انصافی کے انعامات مرتب کئے جائیں تو کون شخص انصاف کو اختیار کرنا چاہیگا۔ اس امر سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اخلاقیت کا احترام اُسکی ذات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان نتائج وعقوبات کی وجہ سے جو اُس پر مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس صورت حال کی موجودگی میں اس کا ادّعا کہاں تک صحیح ہے کہ انصاف بے انصافی پر ذاتی حیثیت سے ترجیح رکھتا ہے۔ یا اخلاقیت عدم اخلاقیت سے بہتر چیز ہے۔ گلیشن اور اڈیمینس نے سقراط کو اسی امر کے ثابت کرنے کی دعوت دی ہے۔ جمہوریت کے بقیہ ابواب اسی اعتراض کے جواب میں ہیں۔ اس مقصد کے لئے اولاً سقراط نے اس کا ادّعا کیا ہے کہ انصاف کی حقیقت کا سُراغ بہترین امکانی ریاست (State) میں مل سکتا ہے۔ اس کے لئے اولاً اُسے اس سوال پر غور کرنا پڑا ہے کہ امکانی ریاستوں میں بہترین ریاست کون ہو سکتی ہے۔ اسکے جواب میں سقراط نے سلطنت کا ایک بہترین "مثالیہ" کا ڈھانچہ تیار کیا ہے جسکے تمام انتظامات نیکی کے عقلی تخیل کے ماتحت قائم کئے گئے ہیں۔

اس ریاست کا انصرام وانتظام ایسے افراد کے سپرد کیا ہے جنھیں وہ صحیح العقل فلسفیوں کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ وہی اپنی اعلیٰ قابلیتوں اور معاملہ فہمی اور اصول وقوانین کی صحیح باخبری کی وجہ سے ریاست کی بنیادیں مضبوط واستوار رکھ سکتے ہیں۔ وہ اس نگراں جماعت کو کسی ذاتی جائداد وغیرہ کا مالک نہیں دیکھنا چاہتا کیونکہ اس صورت میں اس کا امکان ہے کہ ذاتی مفاد وغیرہ کے خیالات ریاست کی بہبود سے اُسے بالکل غافل بنا دیں۔

ریاست کے بقیہ افراد کی تقسیم اُس نے دو جماعتوں میں کر دی ہے۔ فوجی، اور صناع وعمال۔ فوجیوں کے متعلق یہ کام ہے کہ وہ اس کا تحفظ حملوں وغیرہ سے

کریں۔ اور صناع و عمال کا کام یہ ہے کہ اُسکی دوسری ضرورتیں فراہم کریں۔ انصاف اُسکے نزدیک یہ ہے کہ ہر جماعت صرف اپنے فرائض ادا کرنے پر اکتفا کرے۔ دوسری جماعت کے فرائض و اعمال میں دست اندازی سے بالکل پرہیز کرے۔ وہ ہر کام اُس جماعت سے لینا چاہتا ہے جسکے لئے وہ موزوں ہے۔ وہ اس اصول کا سختی سے مخالف ہے کہ ہر شخص کو ہر کام کا اہل سمجھ لیا جائے۔

اُس نے روح انسانی کی بھی تین قسمیں کی ہیں۔ عقلی و جذباتی و عملی۔ اُس نے بتلایا ہے کہ فلسفی و حکیم میں عقلی حصہ کو ممتاز خصوصیت حاصل ہوتی ہے اور فوجیوں میں جذباتی حصہ کو۔ اور عمال و صناع میں عملی حصہ کو۔ جس طرح ریاست میں انصاف یہ ہے کہ ہر طبقہ اپنے فرائض ادا کرے اور دوسرے کے فرائض میں دست اندازی نہ کرے۔ اسی طرح انسانی روح میں انصاف یہی ہو سکتا ہے کہ اُسکی یہ تینوں قسمیں مناسب طریقہ سے اپنے فرائض ادا کریں۔ عقلی روح کو جذباتی روح پر تسلط ہونا چاہیے۔ اُسی کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ مجموعی مفاد ملحوظ رکھتے ہوئے جذبات کی رسّی کہاں تک ڈھیلی کی جائے۔ معاشرتی معدلت درحقیقت روح کی اسی حالت کا خارجی مظہر ہے۔

سقراط کے نزدیک نیکی و اخلاق و انصاف کو درحقیقت فلسفی و حکیم ہی سمجھ سکتا ہے۔ اُس کے نظریۂ تصورات کی بنا پر (جس کی تشریح آگے آرہی ہے۔) جملہ چیزیں حقیقۃً دوسرے عالم میں موجود ہیں لیکن اُنھیں صرف فلسفی جانتا ہے۔ اس لئے وہ جن قواعد کو بنائے گا اُن میں حقیقی نیکی و حقیقی انصاف کے آثار ہونگے۔ اُنھیں کی نگرانی و سیادت میں یہ حکومت و ریاست قائم ہو سکیگی عام انسانوں کی یہ حالت نہیں ہو سکتی۔ چونکہ وہ فلسفی نہیں ہیں اس لئے اُنھیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ نیکی کیا ہے اور اُنھیں اُسکی پیروی کیوں کرنا چاہیے۔ فلسفیوں کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کر کے وہ اس طرح کی نیکی حاصل کر سکتے ہیں جن کی اُن میں صلاحیت ہے۔ گویا افلاطونی جمہوریت میں عوام کی اخلاقیت نیکی کے علم پر مبنی نہ ہوگی اور نہ اس اعتقاد کا نتیجہ ہوگی کہ نیکی قابل عمل چیز ہے اور بُرائی قابل احتراز۔ اُن کی اخلاقیت نتیجہ ہوگی محض قوانین کی پابندی اور رائے عامہ کے لحاظ کا۔

افلاطون کا نظریۂ تصورات یا مثل افلاطونیہ

یونانی فلسفہ کا آغاز اس سوال کی جوابی سعی سے ہوا ہے کہ دُنیا کیا چیز ہے؟ کس سے بنی ہے؟ اُن کے متقدمین فلاسفہ نے اس کا جواب یہ پایا تھا کہ دُنیا کی ابتدائی آفرینش صرف ایک مادہ پانی ہوا یا آگ جیسی کسی چیز سے ہوئی ہے۔ اس سوال پر غور

و خوض کے ساتھ یہ ایک دوسرا مسئلہ بھی اہمیت اختیار کر گیا کہ ہم اپنے حواس پر کہاں تک اعتماد کر سکتے ہیں۔ دنیا ہمارے حواس کو واقعی چیز معلوم ہوتی ہے اس میں پھر وہ کون سی چیز ہے جس کو واقعی کہا جا سکے؟ وہ ارتسامات و نقوش جو ذہنی ہوتے ہیں؟ لیکن اُن میں ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے۔ ابھی کسی چیز کے دیکھنے سے دماغ و ذہن پر ایک چیز منقش ہوئی دوسری آن میں اُس سے بالکل مخالف دوسرا نقش پیدا ہوا۔ جو چیز واقعی ہے وہ ہمیشہ واقعی رہیگی۔ اُس میں لمحہ بلمحہ تغیر و انقلاب نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حواس سے ہمیں حقیقت کی بالکل اطلاع نہیں ہو سکتی۔

افلاطون نے اس دشواری کے حل کے لئے نظریہ تصورات ایجاد کیا ہے۔ اس نے اولاً اس کو جانچا ہے کہ ہمارے حواس جن چیزوں کا ادراک کرتے ہیں اُن کے علم کی نوعیت کیا ہے۔ افلاطون مدرکات حواس کے اضافی ہونے کے پہلو پر برابر زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شدت سردی سے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ کو اگر ٹھنڈے سے گرم پانی میں ڈالا جائے تو پانی گرم معلوم ہوگا۔ لیکن اگر گرم پانی میں غسل کیا جائے اور پھر اُسی ٹھنڈے سے گرم پانی میں ہاتھ ڈالا جائے تو وہ پانی ٹھنڈا معلوم ہوگا۔ گویا وہی پانی ایک وقت میں جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے گرم بھی ہوگا اور ٹھنڈا بھی۔ خرگوش ہاتھی کو بالکل چھوٹا معلوم ہوگا۔ لیکن چیونٹی کو بڑا۔ تو گویا وہی خرگوش ایک ہی وقت میں دیکھنے والے جانور کے لحاظ سے چھوٹا اور بڑا نہ ہوگا۔ یہی حال اخلاقی اوصاف اور جمال و عدم جمال کے علم کا بھی ہے۔ ایک ہی تصویر کسی شخص کو خوبصورت معلوم ہو سکتی ہے اور کسی کو بدصورت۔ ایک ہی عمل کسی کو پسندیدہ معلوم ہو سکتا ہے اور کسی کو غیر پسندیدہ۔ اس طرح افلاطون کے نقطۂ نظر سے مدرکات حواس بیک وقت موافق و مخالف اوصاف سے متصف ہوتے ہیں اور اس لئے اُن میں حقیقۃً کسی خاص قسم کے اوصاف ثابت نہیں کئے جا سکتے بلکہ انھیں اسکا حق ہے کہ وہ موافق و مخالف اوصاف سے بیک وقت متصف ہوں۔ اگر سیمین فرض کیجیے۔ الف کی صفت سے متصف ہے تو ہم نہایت سہولت سے اُسی سیمین کو ب کی صفت سے جو الف کے بالکل متضاد ہے متصف دکھلا سکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یا تو سیمین میں الف اور ب دونوں قسم کی صفتیں موجود ہیں یا ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ اور دیگر اعتبار

واضافت کا نتیجہ ہے۔ اس صورت میں کہنا بالکل صحیح ہے کہ سین ایسی چیز ہے جسے حقیقتاً کسی صفت سے متصف نہیں کیا جا سکتا اور یہیں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سین واقعی چیز نہیں ہے اور چونکہ سین خود متعین نہیں ہے اور نہ غیر تغیر پذیر اوصاف کا مالک ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کا کوئی معین علم بھی نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک ہی چیز کے متعلق متضاد فیصلے دیتے ہیں مثلاً ایک ہی تصویر کو ہم خوبصورت اور بدصورت دونوں بتلاتے ہیں۔ رائوں میں تضاد ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اُن میں سے کسی کو سچا نہیں کہا جا سکتا لیکن علم میں یہ تضاد فرض نہیں کیا جا سکتا۔

جو چیز واقعی ہے اس میں کچھ متعینہ خصوصیات ہونگی اور علم کو اُن سے جو تعلق ہوگا وہ یہی کہ اُن سے واقف ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم جو اس سے مدرک ہونے والی دنیا کا علم نہیں رکھتے لیکن سائنس اور ریاضی بتلاتی ہیں کہ ہمیں ان کا کچھ نہ کچھ علم ضرور ہے پھر علم آخر کس چیز کا ہے؟

افلاطون اسکا جواب یہ دیتا ہے کہ دنیائے اشکال و تصورات یا مثل کا ہمیں علم ہوتا ہے۔

اسکے سمجھنے کے لئے کہ اشکال و تصورات سے کیا مراد ہے ہمیں مثال کے طور پر سفیدی کے تعقل کو لے لینا چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ سفیدی نہ تو بعینہ سفید چیز برف یا ملائی وغیرہ ہے اور نہ وہ ان سفید اشیاء کے مجموعہ کا نام ہے۔ کیونکہ اگر ان تمام اشیاء کو جنھیں سفید کہا جاتا ہے جمع کیا جائے تو ان کا مجموعہ سفیدی نہ ہوگا بلکہ کچھ اور ہوگا۔

پھر آخر سفیدی کیا چیز ہے؟ شاید کوئی شخص جواب میں یہ کہے کہ سفیدی سے ہماری مراد وہ تصور یا تعقل ہے جو ہمارے دماغوں میں موجود ہے لیکن اس صورت میں یہ لازم آئیگا کہ اگر ہم سفید اشیا کا تعقل نہ کریں تو سفیدی کا وجود نہ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیا سفیدی کے تعقل کا سلسلہ ختم کر دینے سے اُس شئے کے اوصاف میں کوئی تغیر پیدا ہو سکتا ہے۔ بنا بریں سفیدی نہ تو کوئی ذہنی چیز ہے اور نہ خود بعینہ سفید چیز اور نہ سفید اشیا کا مجموعہ۔

افلاطون کی رائے میں سفیدی ایک شکل ہے' ایک تصور ہے جو مادی ہے نہ ذہنی وہ بالکل مکمل ہے اور غیر تغیر پذیر ابدی ہے اور حقیقی دنیا کی چیز اس حقیقی دنیا سے تعلق رکھنے والے اشکال و تصورات کے اثرات کا ہمیں پتہ چلتا ہے اور حواس سے مدرک ہونے والی چیزوں میں ہمیں اُن کا ناقص ادراک ہوتا ہے۔

یہ تصورات و مثل ہی ہیں جو مدرکاتِ حواس کو وہ اوصاف عطا کرتی ہیں جو اُن میں ہمیں محسوس ہوتے ہیں اور یہیں سے ان میں ادھوری واقعیت آجاتی ہے۔

اُنھیں تصورات و مثل کا ہمیں علم ہوتا ہے اور یہ علم رائے سے بالکل ایک علیحدہ چیز ہے۔ فلسفہ کا کام یہی ہے کہ وہ روح کو اس رائے کی دُنیا سے جہاں کی چیزیں تغیر پذیر ہیں علم کی دنیا میں لے جائے۔ وہاں اُسے اُن تصورات کا مشاہدہ ہوگا جن کے فیض کا نتیجہ مدرکاتِ حواس کا وجود ہے۔

افلاطون کے تمام فلسفہ کا مرکز ثقل اسی عالم تصورات کا اثبات ہے۔ وہ ہر جگہ اس سے کام لیتا ہے۔ اس عالم تک رسائی وہ صرف حقیقی فلاسفر کا حق سمجھتا ہے۔ اس لئے اُسکے نزدیک انھیں کے ہدایات پر چل کر دنیا نجات حاصل کر سکتی ہے اور ریاست (اسٹیٹ) کا نظام درست رہ سکتا ہے۔

افلاطون کے نظریہ تصورات پر ارسطو کی تنقید

حکیم ارسطاطالیس اگرچہ افلاطونی فلسفہ سے بہت کچھ متاثر ہے لیکن اُس نے نظریہ تصورات کی سختی سے تنقید کی ہے۔

افلاطون کے نزدیک یہ تصورات اُن جسمانی اشیاء جنھیں وہ اوصاف وخصوصیات عطا کرتے ہیں اور اُس دماغ سے جو اُن کا ادراک کرتا ہے ایک بالکل الگ وجود رکھتے ہیں یعنی فرس (گھوڑا) کے اُن افراد سے جو اس مادی دنیا میں موجود ہیں ایک تصور فرس بھی ہے جو اس حیوان کے افراد کو خصوصیات فرسیت عطا کرتا ہے اور جس کی وجہ سے ہم اُنھیں فرس سمجھتے ہیں لیکن وہ تصور ان افراد سے بالکل مستغنی اور اُن سے علیحدہ ایک چیز ہے۔

مختصر لفظوں میں ارسطو کے اس نظریہ پر دو اعتراض ہیں۔

اُس کا پہلا سوال یہ ہے کہ افراد فرس اور تصور فرس میں کیا تعلق ہے؟۔

افلاطون اس تعلق کے ظاہر کرنے کے لئے دو مختلف لفظ استعمال کرتا ہے۔ کسی جگہ کہتا ہے کہ وہ اُس میں گونہ شریک ہیں اور اسی شرکت کی وجہ سے افراد فرس میں خصوصیات فرس پیدا ہوتی ہیں لیکن بحث یہ ہے کہ صرف اس نقل اور شرکت کی وجہ سے اس خیال کی عمارت کیونکر اُٹھ سکتی ہے کہ حقیقی اور غیر تغیر پذیر یہ تصور فرس تغیر پذیر مادی فرس کی اصلی علت ہے۔

نقل و شرکت کے تعلق کی بنا پر افلاطون کا یہ دعویٰ کہ تصور فرس مادی فرس کے وجود اور اُسکے خصوصیات فرسیت کی علت ہے محض بے دلیل ہے ۔ یہ بالکل ایک اتفاقی بات ہو سکتی ہے کہ یہ مادی چیزیں ان تصورات کا آئینہ یا عکس ہوں ۔ اِس صورت میں مادی دُنیا کے خصوصیات کی توجیہ کرنے کے لئے اسکی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ نظریہ تصورات کی بنیاد ڈالی جائے۔

افلاطون کے اِس نظریہ پر ارسطو کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اسکے ذریعہ سے ہمارے عام تصورات اور تخیلات کو خواہ مخواہ کے لئے مستقل وجود دے دیا گیا ہے ۔ ارسطو ان عام تصورات کے وجود کا انکار نہیں کرتا چاہتا ۔ لیکن اُسکی بحث یہ ہے کہ ان کے وجود سے یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ ہم اُنھیں دماغ سے علیحدہ موجود مانیں اور یہ دعوی کریں کہ وہ اس دنیا کے علاوہ کوئی اور وجود رکھتے ہیں ۔ گویا ارسطو کے نزدیک افلاطون کو یہ مغالطہ ہوا کہ اُس نے اُن اوصاف کو جو ہم اشیا میں ادراک کرتے ہیں اور اُن کے تصورات کو مستقل وجود کا مالک بنا دیا اور اُن کے لئے ایک نئی بنیاد ڈالی ۔

ازمنہ متوسطہ میں افلاطون کے اس نظریہ تصورات کو زیادہ قبولیت حاصل نہیں ہوئی ۔ ارسطو کے خیالات کا سکہ زیادہ چلا ۔ چنانچہ عرب کے اکثر فلاسفر ارسطو کے انھیں خیالات کی ترجمانی کرتے رہے ۔ بعد میں آکر یہ بھی یاد نہ رہا کہ درحقیقت افلاطون کہتا کیا تھا ۔ اُسکے نظریہ کا اصل منشا کیا تھا ۔ مثل افلاطونیہ کا لفظ چیستان بن کر نقل ہوتا رہا اور اُسکی عجیب و غریب پیرایوں میں تشریح و توضیح کی جاتی رہی ۔ یورپ میں بھی افلاطون و ارسطو کے یہ خیالات مخلوط طریقے سے مختلف فلسفوں میں شامل رہے اگرچہ ارسطو کا اثر زیادہ نمایاں رہا لیکن افلاطون کے اس نظریہ کے ماننے والے بھی کم نہیں رہے ۔ قرون متوسطہ میں حقیقیین (Realists) اور اسمیین (nominalists) فلسفیوں کے ان دو مختلف گروہوں کا پایا جانا اسکی قوی شہادت ہے ۔ بشپ برکلے کے فلسفہ میں افلاطون کے نظریہ تصورات کے کافی آثار ملتے ہیں ۔ برکلے کی "روح برتر" افلاطون کی دنیائے تصورات سے ملتی جلتی ہوئی ہے ۔ استدلال کا جادہ بھی قریب قریب یکساں ہے ۔

اگرچہ یوں عام افہام کے لئے افلاطون کے مسلک کا سمجھنا بہت دشوار ہے ۔ اُن کے نزدیک ارسطو کے خیالات ہی قابل قبول ٹھہرینگے لیکن کیا عجب ہے کہ آگے چل کر افلاطون کے اس عالم مثال میں صداقت کے جلوے نظر آنے لگیں ۔ سر کونن ڈائل، سر الیور لاج وغیرہ کے روحی مکاشفے ابھی ابتدائی منزل میں ہیں ۔ اسرار نہفتہ ابھی پورے طور سے آشکار نہیں ہوئے ہیں ۔ کسے معلوم ہے کہ یہ تجربے اور مکاشفے علمی حیثیت میں آکر افلاطونی فلسفہ کی صداقت کا نشان نہ بنینگے ۔

مرثیہ میں شجاعت

(جناب اعجاز الہ آبادی)

(۳)

گزشتہ سے پیوستہ

مکالمہ کی ایک دوسری مثال پیش ہے۔ موقع یہ ہے کہ امام کا داخلہ میدان کربلا میں ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا، عورتوں کا ساتھ ہے۔ چاہتے ہیں کہ خیمہ ترائی میں ہو۔ معلوم نہیں کیسا وقت پڑے۔ پانی کی تو کمی نہ رہے۔ امام کے قلیل لشکر نے خیام نصب کرنے کا سامان شروع کیا۔ کہ اتنے میں شمال کی طرف سے شام کے لشکر کی آمد کے آثار ظاہر ہوئے۔ امام حسین کے رفقا کو کچھ تشویش ہوئی۔ آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ کیا کرنا چاہیے۔ اب شام کا ایک زبردست لشکر قریب آگیا حضرت عباسؑ علمدار سے اور فوج مخالف کے سردار سے جو اس موقع پر مکالمہ ہوا ہے وہ ملاحظہ ہو:-

اس فوج کے رئیس نے بڑھ کر کیا کلام　　حکم امیر ہے یہیں اترے سپاہ شام
چھوڑ دینگے ہم لب کہ جو راحت کا ہے مقام　　دریا سے ہٹ کے آپ بپا کیجئے خیام
لشکر کشی ہے بادشہ کائنات پر
کل مورچے سپاہ کے ہونگے فرات پر

کوفے سے کل جو آل ادھر آئے ہیں ہزار　　رستے میں شام کی ابھی فوجیں ہیں بیشمار
خالی ہیں نہر لیتی بیاباں نہ کوہسار　　[illegible] سے چلے آتے ہیں سوار
لاکھوں میں کوئی قتل کوئی [illegible] آئے گا
گیتی ہلے گی جب [illegible] آئے گا

فوجوں کا جائزہ تھا وہاں ہم چلے تھے جب　　گرد بیس بیس کوس کے لشکر پڑا تھا سب
دشتوں کی روم و شام کی آمد ہے روز و شب　　اس ارض پر نہ ہو جو سمائی تو کیا عجب
کیجیے مقام گر کوئی گوشہ جدا ملے
ممکن نہیں کہ نہر پہ خیمے کی جا ملے

ہم گھاٹ روکنے کے لئے آئے ہیں ادھر　　ہے آج شب کو داخلہ شمر کی خبر
سنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیر نرؑ　　تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضہ پہ کی نظر
کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

غصے میں رکھ کے دوش پہ شمشیر برق دم　　نعرہ کیا اسد نے کہ تم سے ہٹیں گے ہم ؟
گر فوج قاہرہ کی ہے آمد تو کیا ہے غم　　گرتا ہے کٹ کے سر وہیں جس جا جمے قدم
بپھریں جو شیر سامنے آتا نہیں کوئی
یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی

دنیا ہو اک طرف تو نہ آئے خیال میں　　لاکھوں میں اپنی تیغ چلی ہے جدال میں
گیتی ہو بے نشاں اگر آئیں جلال میں　　ہے سب طرح کا زور محمد کی آل میں
دریا ہے کیا، یہ شیر ہٹیں جس کو چھوڑ کے
جب پل بنا دیا در خیبر کو توڑ کے

تم کون ہو حسینؑ ہے مختار خشک و تر　　ان کے سوا ہے کون شہنشاہ بحر و بر
دیکھو فساد ہوگا بڑھو گے اگر ادھر　　شیروں کا یاں عمل ہے تمہیں کیا نہیں خبر
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہہ دیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

کیا ابن سعد شوم کی فوج اور کیا حشم　　سر لوٹتے پھریں گے بڑھایا اگر قدم
اترے ہیں آ کے نہر سلیماں کے ساتھ ہم　　کیا ان کے مورچے کہ جو ہوں چیونٹیوں سے کم
کچھ ڈر نہیں تجھے لاکھ اگر بد خصال ہیں
ہم بھی کنندۂ در خیبر کے لال ہیں

کیا سر پہ موت آئی ہے بس سامنے سے جاؤ　　فوجوں کا ذکر کر کے کسی اور کو ڈراؤ
دعویٰ ہے کچھ سپاہ گری کا اگر تو آؤ　　بیٹا رحیم کا ہوں مجھے غیظ میں نہ لاؤ
تلوار ادھر کھنچی کہ اُدھر کھیت پڑ گیا
پھر کچھ نہ بن پڑیگا اگر میں بگڑ گیا

ہم شیر ہیں قسم اسد کردگار کی　　رکھتے ہیں نا شتوا ہیں پرش ذوالفقار کی
شہ کی نہ جان یاں حقیقت ہزار کی　　ٹو کے یہ کیا مجال کسی نابکار کی
گرجیں ابھی تو رعد ہیں برسیں تو ابر ہیں
اک میں نہیں یہاں بہت ایسے ہزبر ہیں

ہر چند خاکسار ہیں فرزند بو تراب　　پر سرکشی کی ہم سے کسی کو نہیں ہے تاب
کھنچ جائیں تیغیں کہ جو الٹیں دم عتاب　　گردوں میں تھرتھرا کے چھپے قرص آفتاب
آجائے انقلاب کی آفت جہان پر
ہو آسمان میں یہ زمیں آسمان پر

ارض و سما کو ہم تہ و بالا کریں ابھی　　جو سرکشی کرے اُسے پسپا کریں ابھی
اس سرزمیں کو خون کا دریا کریں ابھی　　ساحل تک آئے جو اُسے ٹھنڈا کریں ابھی
بولے کوئی جو تن سے سر اُسکا جدا کریں
خیمہ بپا نہ ہو تو قیامت بپا کریں

ظالم بگڑ بگڑ کے بڑھے ایک بار سب　　بلوہ جو ہو گیا سمٹ آئے سوار سب
نیزے علم کیے ہوئے تھے نیزہ دار سب　　باندھے تھے ایک غول ضلالت شعار سب
لیکن ملا نہ سکتے تھے آنکھ اس لیے
اک شور تھا کہ حضرت عباس کو شیر ہے

بگڑے ابو ثمامہ و سعد فلک سریر　　تولی زہیر قین نے شمشیر بے نظیر
جوڑا کماں میں ابن مظاہر نے جھک کے تیر　　بولے اسد کہ زجر کے قابل ہیں یہ شریر
عابس کو غیظ لشکر بد خو پہ آگیا
غصے سے بل ہلال کی ابرو پہ آگیا

---

۱ تا ۱۰ یہ سب امام حسین کے مصاحب ہیں۔

بولے اٹھا کے نیزے کو ضرغامۂ دلیر   بس اب غزا میں آپ کی مناسب نہیں ہے دیر
بولے شعیب ادھر سے جو نکلیگا ایک شیر   بھاگینگے سب گھوڑوں کی باگوں کو پھیر پھیر
آقا کا ہے یہ پاس کہ ہم دور دور ہیں
کثرت پہ اپنی بھولے ہیں کیا بے شعور ہیں

اُلٹی جناب قاسم ذیشاں نے آستیں   قبضے پہ ہاتھ رکھ کے بڑھے اکبر حسین
بولے پکار کے بھتیجے زینبؑ کے مہ جبیں   شیروں سے کیا لڑائی کو لینگے یہ اہل کیں
کہئے تو نیزہ بازوں کو ہم دیکھ بھال لیں
تیوری کوئی چڑھائے تو آنکھیں نکال لیں

آگے تھے سب کے حضرت عباسؑ ذی حشم   بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دم بدم
تیغیں جو تولتے تھے اُدھر بانی ستم   کہتے تھے سر نہ ہوگا بڑھایا اگر قدم
لرزہ تھا رعب حق سے ہر اک نابکار کو
روکے تھا ایک شیر جری دس ہزار کو

مکالمہ کی تیسری مثال پیش ہے۔

حضرت امام حسینؑ تین دن کے بھوکے پیاسے جہاد کے واسطے یکہ و تنہا میدان جنگ میں تشریف لائے ہیں۔ دیر تک فوج یزید سے معرکہ آرائی رہی۔ تمام فوج امام حسینؑ کے حملوں سے پریشان اور منتشر ہوگئی یہ حالت دیکھ کر ایک نہایت زبردست پہلوان جس کا نام سیف بن قہران تھا فوج پر طعنہ زنی کرتے ہوئے مقابلے کے لئے بڑے اہتمام سے نکلا ہے۔ تمام فوجوں کو ایک جا کر لیا ہے نشی کو حکم دیا کہ ؎

جب میں لڑوں تو جان لڑائے رہے ذرا   چوٹیں ادھر اُدھر کی لکھے سب جدا جدا
بڑھ کر لڑا ہے کون قدم کس کے سرکے ہیں
پوچھے کدھر کے وار ہیں چلے کدھر کے ہیں

کلام میں جو خوبی ہے اس پر رائے زنی ہمارے موجودہ موضوع سے باہر ہے۔ مگر آپ اگر ذرا بھی غور کرینگے تو آسانی سے اندازہ ہو جائیگا کہ ایک قادر الکلام کس طرح سے ہر ایک کی زبان سے

اس کے شایانِ شان باتیں کرتا ہے سیف بن قہرمان امام حسینؑ کا جانی دشمن ہے۔ میر انیس کو اس سے جس قدر تنفر ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ مگر پھر بھی اُن کے مُنہ سے کوئی ایسا جملہ نہیں نکلتا جس سے اُسکی بہادری کی ہجو ہوتی ہو۔ پہلوان کے ہر لفظ سے جرأت کا اظہار ہوتا ہے۔ لڑائی کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ مگر باوجود اسکے کہ وہ دشمن ہے نہ تو کوئی بات ایسی ہے کہ جس سے امام حسینؑ کی تحقیر ہو نہ مرثیے میں کوئی لفظ ایسا ہے کہ جو پہلوان کے افعال اور امام حسینؑ کے اوصاف میں مشترک ہوں۔ حالانکہ بہادری کا دعویٰ ہر ایک کو ہے سیف بن قہرمان کا دعویٰ ملاحظہ ہو۔

نعرہ کیا کہ سب ہیں زبردست مجھ سے زیر
پسپا ہو وقت جنگ جو رستم سا ہو دلیر
مجھ سے لڑے وہ شخص جو ہو زندگی سے سیر
پنجہ ہے میرا پنجۂ محکم مثال شیر
اژدرہوں دو دست ہوں پیل دماں ہوں میں
برسے گا خوں کہ سیف بن قہرماں ہوں میں

ہو جائے گر مقابلہ میرا دم مصاف
صمصام سام ڈر سے نہ چھوڑے کبھی غلاف
اس تیغ بے پناہ کی ہو دھاک تا بہ قاف
سینہ حریف کا ہو قلم کی طرح شگاف
پشت و پناہ فوج ہوں افسر کی آڑ ہوں
بہر نبرد پاؤں جو گاڑوں پہاڑ ہوں

فرمایا شہ نے نام تو رکھا ہے رعب دار
پر سیف حق کی سیف بھی ہے قہر کردگار
تو پیلتن اگر ہے تو ہم ہیں فلک وقار
تو ہے اگر پہاڑ تو بجلی ہے ذوالفقار
گر یہ گرے چمک کے ابھی نور کی طرح
سرمہ ہو جل کے کوہِ گراں طور کی طرح

بے اصل ہیں یہ سب ترے دعوے زبوں خصال
مرحب شکوہ تو ہے تو ہم شیر ذوالجلال
گر دیو ہے تو ہم ہیں سلیمان فن کمال
جن ہے تو جانتا نہیں بیر العلم کا حال
اژدر ہے گر تو پوچھ کہ طفلی کے عہد میں
حیدر نے چیر ڈالا ہے اژدر کو مہد میں

تو کیا ہوا او لعیں ترا قد طویل کیا　　اژدر کی کیا بساط یہاں مست فیل کیا
سیفِ خدا کے آگے درشت و ثقیل کیا　　او روسیاہ کم تھے پر جبرئیل کیا

بیٹھی پروں پہ جب یہ گرا قدر شان سے
ثابت ہوا پہاڑ گرا آسمان سے

بولا بصد غرور و تکبر وہ خیرہ سر　　مجھ سا نہیں زمانے میں اب کوئی پُر جگر
ہرگز بچا ہے شر سے مرے بشر　　دُنیا میں بے چراغ کیے میں نے گھر کے گھر

ہاں میرے سامنے نہ تھمے گر پہاڑ ہو
جس جا مرا گزر ہو وہ بستی اُجاڑ ہو

حضرت امام حسینؑ کا برجستہ اور ترکی بہ ترکی جواب ملاحظہ ہو:—

فرمایا نحس ہونے میں تیرے نہیں کلام　　بوم آشیاں کو چھوڑ دے سُن لے جو تیرا نام
گلشن میں تجھ سا سبز قدم گر کرے مقام　　مرجھائیں تازہ پھول شجر خشک ہوں تمام

جس کھیت میں گزر ترا او نحس و شوم ہو
سرسبز پھر نہ خلق میں وہ مرز و بوم ہو

فقرے سنے جو گرم تو ناری جلا کمال　　رشکِ سیاہ ہو گیا آہن کی طرح لال
فرطِ غضب سے تن پہ کھڑے ہو گئے جو بال　　ساہی کی پشت بن گیا جسمِ زبوں خصال

بھڑکی تھی آگ دل میں حسد کا وفور تھا
سینہ شریر کا تھا کہ روشن تنور تھا

کہنے لگا بگڑ کے وہ کینا و کینہ جو　　اس دم بدن میں اونٹ رہا ہے مرے لہو
بیکار ہے یہ مزد و کنائے کی گفتگو　　اب اور روکیے مرا لے شاہِ نیک خو

لیکن نہ کھیت سے فرس تیز دم ہٹے
ساونت آپ ہیں تو نہ پیچھے قدم ہٹے

فرمایا ہم ہیں دفترِ مردانگی میں فرد　　دیکھے اگر جلال تو ہو آفتاب زرد
یہ پاؤں کیا ہٹینگے زمیں سے دمِ نبرد　　پیچھے کبھی ہٹی نہیں اپنے قدم کی گرد
کیا دخل اس جگہ سے جو اب رکنِ دیں ہٹے　　گر زلزلہ بھی ہو تو نہ اتنی زمیں ہٹے

اِس گھر کی صفدری نہیں تجھ پر ابھی عیاں	نادم تجھے کریں گی یہ تیری تعلیاں
کیوں مضطرب ہے او ستم ایجاد و بدزباں	ہوتا ہے دم میں سب ترے دعوے کا امتحاں

ہاں وقت پر نہ جنگ سے منہ موڑیو کہیں
ثابت قدم ہے تو نہ جگہ چھوڑیو کہیں

اب کہہ کہ کس طرح تجھے منظور ہے جدال	دعویٰ ہے تجھ کو فن سے حرب کے وہ سنبھال
پشتِ فرس پہ جھوم کے بولا وہ بدخصال	حاصل مجھے سپاہ گری میں ہے سب کمال

ساونت بھی دلیر بھی ہوں شاعر بھی فن بھی ہو
برچھیت بھی پھکیت بھی ناوک فگن بھی ہو

گرز و سنان و تیغ و تبر پر نہیں نگاہ	حربہ بس ایک خوب ہے مابین رزمگاہ
سنتا ہوں اس گھرانے کی ہے تیغ بے پناہ	میں بھی لڑونگا تیغ سے اے فاطمہ کے ماہ

دم بھر میں فیصلہ ہے نہ جھگڑا نہ دیر ہے
تلوار کی جو آنچ سہے وہ دلیر ہے

فرمایا خیر ٹھاٹھ بدل تیغ کھینچ !	چوٹیں جو ہوں سنجی ہوئی آج اُنکو آزما
سنبھالا یہ سُن کے گھوڑے پہ وہ بانی جفا	حربے جو اور رہا میں تھے تیغوں کے ماسوا

سمجھا کہ یوں دکھاؤنہیں آن بان کے
خادم کو سب وہ دے دیئے بکار جان کے

اس کے بعد جنگ شروع ہوتی ہے طرفین سے وار ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت امام حسین کے وار سے سیف بن قہرمان کی تلوار گر پڑتی ہے وہ دوسری تلوار ڈاب سے نکالتا ہے اس بار موقع پاکر حضرت امام حسینؑ نے ہاتھ بڑھا کے اسکی تلوار چھین لی۔

لشکر میں غل ہوا کہ جگہ ہے یہ حیف کی	لو اور دیکھو چھین لی تلوار سیف کی

اس شکست کے بعد وہ ایسا گھبرا جاتا ہے کہ بھاگنے کا قصد کرتا ہے۔ امام حسینؑ نے اسے روکا ہے اس وقت جو گفتگو ہوئی ہے وہ حد درجہ پر لطف اور حیرت انگیز ہے۔

ملاحظہ ہو:۔

گھوڑے کی باگ پھیر کے بھاگا وہ روسیاہ　　مثلِ اسد جھپٹتے ہوئے آپ سدِ راہ
فرمایا تھم ہنسیں نہ جوانانِ کج کلاہ　　ظالم یہی سپاہ گری کا چلن ہے واہ
سرسبز ہوگا کیا کہ ترا رنگ زرد ہے
تلوار ڈٹ کے منہ پہ جو کھائے وہ مرد ہے

کہتا تھا خود پہاڑ ہے خود سر جگہ نہ چھوڑ　　قوت تری کھلی نہیں ہم پر جگہ نہ چھوڑ
ظالم کھڑے ہیں سامنے افسر جگہ نہ چھوڑ　　منشی سیاہ کرتا ہے دفتر جگہ نہ چھوڑ
بد مست کیا وہ خواب تھا اب جاگنے لگا
فوجوں پہ طعن کرتا تھا خود بھاگنے لگا

بے مثل ہے تو جنگ کے فن میں کڑی اٹھا　　آئے کہیں نہ فرق سخن میں کڑی اٹھا
اے سنگ دل سبک ہو نہ رن میں کڑی اٹھا　　فولاد کی زرہ ہے بدن میں کڑی اٹھا
ہاتھوں سے آبرو نہ کہیں کے دے جائیو
نامرد ذوالفقار علیؑ لے کے جائیو
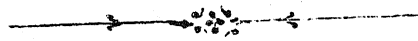
علامۂ کیفی

اور

موازنۂ مومن و میر

از جناب نواب جعفر علی خاں صاحب آثر بی اے

کچھ عرصہ سے رسالہ "نگار" میں علامہ کیفی چریا کوٹی کا ایک مسلسل مضمون "مومن و کلام مومن" کے عنوان سے باقساط شایع ہو رہا ہے، مجھے اُسکے اور اجزا سے بحث نہیں، صرف اس حصہ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جس میں "مومن" کا موازنہ "میر" سے کیا گیا ہے۔

آغاز میں ارشاد ہوا ہے کہ

"سب سے پہلے مومن کا موازنہ میر سے کر کے دیکھنا چاہیے کہ مومن اپنے انداز میں ربّ النوع اُستاد شاعران میر کے مقابلہ میں کہاں تک کامیاب و سرسبز ہوئے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میر نے غزل میں خاص رنگ پیدا کر کے اسکو متعلق (مستقل ؟) فن بنایا ہے۔ اس کے تسلیم میں بھی پس و پیش نہیں ہو سکتا کہ مومن نے اِس فن کو آسمانِ عروج کا آفتاب بنا کر اُردو کے ذرّوں پر کسب ضیا کے لئے احسان عظیم کیا ہے"۔

موازنہ کے لئے تین غزلوں کے شعر چنے گئے ہیں۔ اسکے علاوہ مومن کے مشہور شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

میں لفظ گویا کے مقابلہ میں میر کی ایک غزل جسکی ردیف (جزو ردیف) گویا ہے نقل کر کے ادعا کیا گیا ہے کہ ترازو کے ایک پلے میں اِس لفظ کو رکھئے اور دوسرے میں میر کی غزل۔

موازنہ اشعار کے مختلف طریقے ہوتے ہیں یا تو دو شاعروں کی ہم طرح غزلیں لیکر دیکھا جاتا ہے کہ کون قافیہ کس نے بہتر کہا اور لفظی و معنوی خوبیاں کس کے یہاں زیادہ ہیں یا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ اشعار لیتے ہیں جن میں کسی خاص مضمون پر طبع آزمائی کی گئی ہو۔ ہر حالت میں ضروری ہے کہ ترجیح کے وجوہ اور دلائل پیش کئے جائیں ورنہ موازنہ قابل اعتنا نہیں ہوتا ایک بات اور قابل غور و لحاظ ہوتی ہے۔ معدودے چند اشعار کے موازنہ سے کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ پورا کلام یا اُس کا بیشتر حصہ مطمح نظر ہونا چاہیے۔ یہ ایک اہم اور دشوار کام ہے۔ اور شاید فعل عبث اگر وہ شاعر جن کا موازنہ کیا جاتا ہے مختلف دور اور مختلف رنگ طبیعت کے ہوں۔ علامہ کیفی کا موازنۂ مومن و میر نہ صرف تشنہ و ناممکل بلکہ دلائل سے قطعاً بے نیاز ہے۔ اُنھوں نے پہلی ہم طرح غزل کے چند شعر درج کرنے کے بعد صرف اس قدر تحریر فرمایا ہے۔

"پہلے شعر میں میر صاحب نے آہ کے رنگ میں رات ہی بھر میں آتش غم سے گھل گھل کر شمع کی طرح تمام ہو جانے کو کہا ہے۔ مومن نے اپنا "سخت دل" پیش کیا ہے لیکن اہتمام اور ہمت دیکھیے۔ بہترین سلیقے اور اسلوب سے موتیوں کی طرح مالے میں پرو کر ان دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ یہی مناسبت تمام غزل میں قائم ہے"۔

دوسری اور تیسری غزل کے متعلق صرف یہ کہہ کر ٹال دیا گیا ہے کہ ان دونوں غزلوں کے فیصلے کی ضرورت نہیں۔ صاحب نظر اس میں خود فرق نکال سکتے ہیں۔

لیجیے موازنہ ختم ہو گیا۔ ہاں مومن غالب کے موازنہ کی تمہید میں اتنا اور ہے کہ

"میر کا زمانہ اور تھا اور مومن کا اور۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ کے اعتبار سے دونوں کی شاعریاں متاثر ہوئیں۔ معاصرین کے ساتھ موازنہ اور مقابلہ میں مومن کا جوہر ہر اعتبار سے کھل جائے گا"۔

محاکمے سے پہلے اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ مجھے مومن سے پرخاش نہیں، اس کی منقصت منظور ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ وہ ایک محدود دائرہ میں بہت اچھا کہنے والا گزرا ہے۔ اور بیشتر حصۂ کلام تغزل کا عمدہ نمونہ ہے۔ مگر میر کی ہمہ گیری اور خستگی نہیں۔ میر کی شاعری ایسی شاعری ہے جو فکر و کاوش سے بے نیاز معلوم ہوتی ہے۔ گویا ایک شخص اپنے محسوسات و جذبات

کیفیات بیان کر رہا ہے اور وہ بلا تکلف شعر کے سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ مومن کی شاعری ایک ایسے شخص کی شاعری ہے جو صاحب علم ہونے کے علاوہ رنگین مزاج بھی تھا۔ جسکے عشق میں خواہشات کا لگاؤ موجود ہے۔ میر کے لئے ہر حسین شے میں کشش ہے مگر صرف اس لئے کہ حسین ہے۔ اور کوئی علاقہ نہیں۔

اب موازنہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ علامہ کیفی نے پہلی ہم طرح غزل کے جو شعر منتخب فرمائے ہیں یہ ہیں:۔

میر ؎
گرمی سے میں تو آتشِ غم کی پگھل گیا
راتوں کو روتے روتے ہی جوں شمع گل گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

گرمیٔ عشق مانع نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا میں
لغزش بڑی ہوئی تھی ولیکن سنبھل گیا

عریاں تنی کی شوخی سے دیوانگی میں میر
مجنوں کے دشت خار کا دامن بھی جل گیا

مومن ؎
ٹھہرا تھا دل تھامے ہوئے پر نکل گیا
جب ٹھیس سانس کی لگی دم ہی نکل گیا

اُس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

جوں خفتگانِ خاک ہے اپنی فتادگی
آیا جو زلزلہ کبھی، کروٹ بدل گیا

اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

بتخانہ سے نہ کعبہ کی تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

دونوں غزلوں میں صرف ایک قافیہ "نکل" مشترک ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا ہٹ دھرم ہو کہ میر کے اس شعر پر مومن کے ہم قافیہ شعر کو ترجیح دے۔ ایک سچے عاشق کے لطیف جذبات کی اس سے بہتر مصوری کیا ہو سکتی ہے کہ ع

"تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا"

پہلا مصرع صرف میر ہی کہہ سکتا تھا جو میر سا درد مند دل رکھتا ہو۔ کہاں تو یہ حسن اسلوب اور کہاں مومن کا شعر ؎

ٹھہرا تھا دل تھامے ہوئے پر نکل گیا
جب ٹھیس سانس کی لگی دم ہی نکل گیا

دوسرے مصرع میں "ٹھیس سانس" کے اتصال نے کس قدر تنافر پیدا کیا ہے۔ (دوسرے شعر میں

یہی عیب "پنکھا" میں ہے) مومن کہتے ہیں کہ دل نہ تھا بلکہ پھوڑا تھا جسکی تکلیف سے زندگی بھر سامنا رہا اور صرف مرنے پر نجات ہوئی۔ دوسرے مصرع میں تکلیف کی تشریح ہے کہ جب سانس کی ٹھَیس لگی معلوم ہوا کہ دم نکل گیا۔ اپنی حدوں میں اچھا شعر ہے۔

مومن کے یہاں پھوڑا موجود ہے۔ مگر میر کے شعر میں صرف معشوق کی تیوری پر بل پڑنے سے دم نکلنے کا عالم دکھایا ہے۔ پھوڑے میں ٹھَیس لگنے سے اگر انتہائی ایذا ہوئی تو کیا لطف ہوا۔ صحیح خستگی دل کی وہی ہے جس کی طرف میر نے اشارہ کیا اور یہی ایک سچے عاشق کی شان ہے۔

ع۔ "تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا"

مومن کے شعر کا صحیح موازنہ میر کے اس شعر سے ہو سکتا ہے۔ ؎

مرہتے جو گل بن تو یہ سارا خلل جاتا — نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

سانس روکی جا سکتی ہے اور کم سے کم اُتنی دیر دل کا پھوڑا ٹھَیس سے محفوظ رہیگا۔ مگر میر کہتا ہے کہ خود جی یا جان میں خار کی خلش ہے لہذا جیتے جی راحت ممکن نہیں۔

موازنہ کی ایک اور شکل ہو سکتی ہے۔ تمام وہ شعر جن میں میر اور مومن نے دل کو پھوڑے سے تشبیہ دی ہے جمع کئے جائیں پھر دیکھا جائے کہ دونوں نے کیا کہا ہے۔ میں علامہ کیفی کو دعوت دیتا ہوں۔ وہ مومن کے شعر شائع کریں، میں جواب میں میر کے شعر پیش کرونگا۔

جو کچھ عرض کیا گیا اُسکے علاوہ دونوں غزلوں میں کوئی ایسا جزو مشترک نہیں جس پر موازنہ کی بنیاد رکھی جائے۔ شاید اسی وجہ سے علامہ کیفی ایک مبہم عبارت تحریر فرما کر خاموش ہو گئے جو کہیں نقل کی جا چکی اور جس کا مطلب کم سے کم میری سمجھ میں نہ آیا۔

دوسری غزل یہ ہے۔

میر ؎

ابر نے شکوہ تھے ہم، لیکن حضور میر سے — کارِ شکایت اپنا گفتار تک نہ پہونچا

بے چشم نم رسیدہ پانی چوانے کوئی — وقتِ اخیر تیرے بیمار تک نہ پہونچا

یہ بخت سبز دیکھو باغِ زمانہ میں سے — پژمردہ گل بھی اپنی دستار تک نہ پہونچا

(نگار میں میر کے اکثر شعر مسخ ہو کر چھپے ہیں۔ میں نے کلیات سے دیکھ کر صحیح کر دیئے ہیں)

مومن ؎

اللہ رے ناتوانی جب شدتِ قلق میں — بالیں سے سر اٹھایا دیوار تک نہ پہونچا

مفت آتّل سخن میں عاشق نے جان دی
قاصد ابیان اقرار تک نہ پہونچا

میں نے دونوں غزلیں بالمقابلہ دیکھیں، چار قافیے یار، دیوار، بیمار، دستار مشترک ہیں انھیں کا موازنہ ہونا چاہیے تھا یا ایسے اشعار کا جو قریب المعنی ہوں - نہ معلوم علامہ کیفی نے اشعار کا انتخاب کس اصول پر کیا ہے -

ہم قافیہ شعر یہ ہیں :-

میرؔ پیغام غم جگر کا گلزار تک نہ پہونچا
نالہ مرا چمن کی دیوار تک نہ پہونچا

جوں نقش پا ہے غربت حیران کار اُسکی
آوارہ ہو وطن سے جو یار تک نہ پہونچا

بے چشم نم رسیدہ پانی چُواتے کوئی
وقت اخیر تیرے بیمار تک نہ پہونچا

یہ بخت سبز دیکھو باغ زمانہ میں سے
پژمردہ گل بھی اپنی دستار تک نہ پہونچا

مومنؔ راز نہاں زبان اغیار تک نہ پہونچا
کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہونچا

بخت ساعدو کے جو چاہے سو کہے اب
اک بار یار مجھ تک میں یار تک نہ پہونچا

اللہ ری ناتوانی جب شدت قلق میں
بالیں سے سر اُٹھایا دیوار تک نہ پہونچا

عاشق سے مت بیان کر قتل عدو کا مژدہ
پیغام مرگ ہے یہ - بیمار تک نہ پہونچا

بے بخت رنگ خوبی کس کام کا ہے یعنی
تھا گل و لے کسی کی دستار تک نہ پہونچا

پہلے یار کا قافیہ لیجیے - مومن کے مطلع کا یہ مطلب ہے کہ شاید میرا ایک خط بھی یار تک نہ پہونچا ورنہ راز نہاں (یعنی میرا عشق) اغیار پر ظاہر کر دیتا اور وہ چرچا کرتے پھرتے - وہی بازاری عاشق اور بازاری معشوق !

دوسرا شعر اس قافیہ میں مطلع سے بھی بدتر اور بالکل بھرتی کا ہے -

میر کہتے ہیں کہ خود غربت نقش پا کی طرح اُس شخص کی ناکامی پر حیران ہے جو تلاش یار میں آوارہ وطن ہوا مگر اُسکو نہ پایا - الفاظ بتا رہے ہیں کہ شعر مجاز نہیں بلکہ حقیقت کی رہنمائی کرتا ہے معشوق نا دیدہ ہے اور اُسکا نشان نا معلوم - وطن عالم جان ہے اور غربت یہی عالم کون و فساد - غربت کو ایک ذات فرض کرنے سے یہ خوبی پیدا ہوئی کہ تمام عالم متحد ہو کر منزل جاناں ہو گیا - خود بقول میرؔ ہر قدم پر تھی اُسکی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا

شاہد مقصود بغل میں ہے مگر آوارہ وطن نہیں سمجھتے اور تلاش میں سرگرداں ہیں۔ غربت اُن کی آوارگی پر نقش پا کی طرح محوِ حیرت ہے۔ کہاں یہ بلند معنی اور نازک تخئیل کہاں مومن کا سوقیانہ مطلع۔
چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک!

دیوار کا قافیہ لیجیے۔ مومن کا شعر بھی خوب ہے۔ شدتِ قلق کا یہ تقاضا کہ سر دیوار سے ٹکرا کر پھوڑ ڈالا جائے مگر ضعف کا یہ عالم کہ بالین سے دیوار تک پہونچنا دشوار۔ کرب و اضطراب و ناتوانی کا نقشہ کھنچ گیا۔

میر کا شعر اس قافیہ میں مختلف مضمون کا حامل اور تخئیل کے لحاظ سے بالکل اچھوتا ہے۔ اُنھوں نے نالہ کو جگر کا پیغام غم کہا ہے اور کیفیت وہ دکھائی ہے کہ ایک ضعیف و پر شکستہ طائر یا مسافر چمن کی دیوار یا وطن کے سواد تک پہونچ گیا مگر اب اتنی طاقت نہیں کہ چمن یا وطن کی چاردیواری میں داخل ہو۔ مجبور ہو کر نالہ کرتا ہے تاکہ اُسکی آواز اہل چمن کے کانوں تک پہونچ جائے اور دستگیری کریں۔ مگر شدتِ ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ اسکی فریاد چمن کیسا دیوارِ چمن تک نہیں پہونچتی۔ ایسے بیکس و ناچار کی حسرت کا کیا ٹھکانا ہے۔ جو چمن سے اتنے قرب پر بھی اس قدر دور ہو۔ دیوار چمن تک آواز نہ پہونچنے میں ایک ادا نزاکت ہے۔ اگر نالہ دیوارِ چمن تک پہونچ جاتا تو شاید صدائے بازگشت آکر موجبِ تسکین ہوتی مگر بیچارہ اس سے بھی محروم ہے۔

بیمار کا قافیہ لیجیے۔ مومن کہتے ہیں کہ عاشق کو مژدۂ قتل عدو نہ سنا، تیرا خیال ہے کہ وہ خوش ہوگا مگر اُسکے حق میں پیام مرگ ثابت ہوگا قتل عدو کا رشک ہلاک کردیگا۔

میر کہتے ہیں کہ وقت آخر تیرے بیمار کی یہ حالت تھی کہ جو اُسکے حلق میں پانی ٹپکانے گیا آبدیدہ ہوگیا۔ شعر میں درد ضرور ہے مگر کوئی خاص پایہ نہیں رکھتا بلکہ پہلے مصرع میں اہمال ہے۔ مجھے میر کا شعر پسند ہے نہ مومن کا۔

دستار کا قافیہ لیجئے۔ مومن نے میر کا کامیاب تتبع کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھ میں تمام خوبیاں ہیں مگر بدنصیب ہوں۔ میرے کمال کی قدر نہ ہوئی۔ مومن کے شعر میں کچھ بھی تصنع ہے۔ اپنے آپ کو گل سے تشبیہ دے کر کسی کے طرۂ دستار ہونے کی تمنا ظاہر کی ہے۔ تشبیہ نکال دیجئے تو شعر میں کچھ نہیں رہتا اور کمال نے نشۂ استغنا نہیں پیدا کیا۔ برخلاف اسکے میر کا شعر فطرت کے

مطابق اور اُسی کے ساتھ حرماں کی مکمل تصویر ہے۔ اُنھوں نے بھی مراعاۃ النظیر سے کام لیا ہے بلکہ مومن سے زیادہ کیونکہ وہاں گل کی رعایت سے صرف "رنگ خوبی" ہے اور انکے یہاں "بخت سبز" اور "باغ زمانہ" ہے۔ تاہم تصنع نہیں پایا جاتا اور صنعت لفظی نے معانی کو محدود کرنے کے بجائے وسعت دی ہے۔ کل زمانہ ایک باغ ہے جہاں پھولوں کی بارش ہورہی ہے مگر میر ایسے بدنصیب ہیں کہ گل تازہ کیسا کوئی گل پژمردہ تک اُن کی دستار تک نہ پہونچا۔ شعر سے میر کا کیرکٹر جھلک رہا ہے۔ پھول خود ان تک آئے کسی سے مانگنا یا اُٹھا کر زینت دستار کرنا انکے لئے باعث ننگ وعار ہے۔

مومن کے اس شعر میں بھی تنافر کا عیب ہے۔ پہلے مصرع کا آخری لفظ تو اور دوسرے مصرع کا پہلا لفظ تھا واقع ہوا ہے ان کا قرب کانوں کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

مومن کی غزل دس شعر کی ہے اور میر کی نو شعر کی۔ مگر منتخب شعر میر کے یہاں زیادہ ہیں۔

مومن

اللہ ری ناتوانی جب شدتِ قلق میں	بالیں سے سر اٹھایا دیوار تک پہونچا
روتے تو رحم آتا، سو اُسکے روبرو تو	اک قطرہ خوں بھی چشم خونبار تک نہ پہونچا
بے بخت رنگ خوبی کس کام کا کہ میں تو	تھا گل و لے کسی کی دستار تک پہونچا
مفت اوّلِ سخن میں عاشق نے جان دیدی	قاصد ترا بیانِ اقرار تک پہونچا

میر

پیغام غم جگر کا گلزار تک نہ پہونچا	نالہ مرا چمن کی دیوار تک پہونچا
اُس آئینے کے مانند زنگار جسکو کھاوے	کام اپنا اُسکے غم میں دیدار تک پہونچا
جوں نقش پا ہی غربت حیران کار ہیں کہ	آوارہ ہو وطن سے جو یار تک پہونچا
یہ بخت سبز دیکھو باغ زمانہ میں سے	پژمردہ گل بھی اپنی دستار تک پہونچا
یوسف سے لیکے تا گل پھر گل سے لیکے تا شمع	یہ حسن کئی دن کر بازار تک پہونچا
افسوس میر وے جو ہونے شہید آئے	پھر کام اُن کا اُسکی تلوار تک پہونچا

تیسری غزل کے متعلق علامہ کیفی فرماتے ہیں کہ "مشترک قوافی کو سامنے رکھکر فرق دیکھنا چاہیے"۔ اُنھوں نے یہ اشعار درج کئے ہیں:۔

؎ قطعہ کا دوسرا شعر ہے۔ اسکے پیشتر یہ شعر ہے ؎

مستوری خوبرو کی دونوں نے جمع ہو ویں | خوبی کا کام کس کی اظہار تک پہونچا

میرؔ — سمجھی نہ بادِ صبح کہ آ کر اُٹھا دیا | اُس فتنۂ زمانہ کو ناحق جگا دیا
پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج | بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اُٹھا دیا
تکلیفِ دردِ دل کی عبث ہمنشیں نے کی | دردِ سخن نے میرے سبھوں کو رُلا دیا

مومنؔ — چلون کے بدلے مجھکو زمیں پر گرا دیا | اُس شوخ بے حجاب نے پردہ اُٹھا دیا
فرماتے ہیں وصال ہوا انجامِ کارِ عشق | کیا ناصحِ شفیق نے مژدہ سُنا دیا
اشکِ فغاں کی ہائے رقیب آفرینیاں | محشر نے خفتگانِ لحد کو جگا دیا
ہمدم دکھا اُسکو کسی ڈھب سے رحم آئے | ناصح کو میرے حال زبوں نے رُلا دیا
ایسی غزل کہی یہ کہ جھکتا ہے سب کا سر | مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

میں دونوں کی پوری پوری غزلیں درج کئے دیتا ہوں۔

میرؔ — آہ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا | اس باد نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا (۱)
سمجھی نہ بادِ صبح کہ آ کر اُٹھا دیا | اُس فتنۂ زمانہ کو ناحق جگا دیا (۲)
پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج | بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اُٹھا دیا (۳)
اس موجِ خیز دہر میں ہمکو قضا نے آہ | پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا (۴)
تھی لاگ اُسکی تیغ کو ہم سے سو عشق نے | دونوں کو معرکہ میں گلے سے ملا دیا (۵)
سب شورِ ماومن کا لئے سر میں گئے | یاروں کو اس فسانے نے آخر سُلا دیا (۶)
آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں | مشتِ غبار لیکے صبا نے اُڑا دیا (۷)
اعضا بدن کے جتنے تھے پانی ہو بہ گئے | آخر گدازِ عشق نے ہم کو بہا دیا (۸)
کیا کچھ نہ تھا ازل میں نہ طالع تھے جو درست | ہم کو دلِ شکستہ قضا نے دلا دیا (۹)
گویا محاسبہ مجھے دینا تھا عشق کا | اس طور دل سی چیز کو میں نے لگا دیا (۱۰)
مدت رہیگی یاد ترے چہرے کی جھلک | جلوے کو جس نے ماہ کے جی سے بھلا دیا (۱۱)
ہم نے تو سادگی سے کیا جی کا بھی زیاں | دل جو دیا تھا سو تو دیا، سر جدا دیا (۱۲)
بوئے کباب سوختہ آئی دماغ میں | شاید جگر بھی آتشِ غم نے جلا دیا (۱۳)
تکلیفِ دردِ دل کی عبث ہمنشیں نے کی | دردِ سخن نے میرے سبھوں کو رُلا دیا (۱۴)
اُن نے تو تیغ کھینچی تھی پر جی چلا کے میرؔ | ہم نے بھی ایک دم میں تماشا دکھا دیا (۱۵)

مومن ؎ چلون کے بدلے مجھ کو زمیں پر گرا دیا | اُس شوخ بے حجاب نے پردہ اُٹھا دیا (۱)
برق آہ کو جو میں نے کہا مُسکرا دیا | دل گرمیوں نے اسکی کلیجا جلا دیا (۲)
فرماتے ہیں وصال ہی انجام کار عشق | کیا ناصح شفیق نے مژدہ سنا دیا (۳)
دھوتا ہی عہد نامۂ غیر اپنا حال دیکھ | آب حیا نے خط جبیں کیا مٹا دیا (۴)
تاثیر سوز دل کرۂ نار ہے مگر | اُس شعلہ رو کو سینے سے میرے لگا دیا (۵)
کیا شاد شاد ہوں کہ وہ ہے تلخ کام تر | میری جو شور رشک نے عدو کو مزا دیا (۶)
بیچھا نہ میرے نالۂ آہن گداز نے | آئینہ دیکھنے کا تماشا دکھا دیا (۷)
رشک فغاں کی ہائے رقیب آفرینیاں | محشر نے خفتگانِ لحد کو جگا دیا (۸)
مٹی نہ دی فراز تاک آ کے اُسپہ بھی | کہتے ہیں لوگ خاک میں اُسنے ملا دیا (۹)
ہمدم دکھا اُب سکو کسی ڈھب سے رحم آئے | ناصح کو میرے حال زبوں نے رُلا دیا (۱۰)
اُسکی شرارتوں سے جگر داغ داغ ہو | گُل کھانے کو رقیب کا چھلا منگا دیا (۱۱)
ایسی غزل کہی یہ کہ جھکتا ہو سب کا سر | مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا (۱۲)

سات قافیے مشترک ہیں۔ پہلے "اُٹھا دیا" لیجئے۔ مومن کہتے ہیں۔ ؎

چلوں کے بدلے مجھکو زمیں پر گرا دیا | اُس شوخ بے حجاب نے پردہ اُٹھا دیا

بیچارہ میر دو چار شعر دلی کے کجکلاہ لڑکوں کی تعریف میں کہکر مطعون ہو گیا اور اُسکی بہترین تنقید یہ سمجھی جاتی ہے کہ "بلندش غایت بلند و پستش خیلے پست"۔ میرا دعوی ہے کہ مومن کے اس مطلع سے زیادہ پست و مبتذل و بازاری شعر میر کے یہاں ڈھونڈھے نہ ملیگا۔ نہ معلوم علامہ کیفی نے اس میں کیا خوبی دیکھی جو انتخاب فرمایا۔

مومن معشوق سے کہتے ہیں کہ اب چلون یا چلمن گرا دو۔ اُس نے شوخی و بے حجابی سے بجائے چلمن کے اُن کو زمین پر گرا کر شرم و حجاب کا پردہ اُٹھا دیا! اس بیحیائی کے انجام کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے،

دھوتا ہی عہد نامۂ غیر اپنا حال دیکھ | آب حیا نے خط جبیں کیا مٹا دیا

غیر نے معشوق کو عہد نامہ دیا تھا جس میں وفا و نباہ وغیرہ کے وعدے تھے معشوق نے پذیرائی کی مگر غیر دغا باز ثابت ہوا۔ اور بعد کو معشوق کی حالت میں کچھ ایسے تغیرات نمایاں ہوئے جن سے اُسکو حیا

اور اُسی کے ساتھ غیر کی بیوفائی یاد آتی ہے۔ مومن معشوق کو طعنہ دیتے ہیں کہ کیا اس شرم کے پسینے سے تیری قسمت کا لکھا مٹ جائیگا؟ علامہ کیفی نے سچ کہا کہ

"مومن نے اس فن کو آسمان عروج کا آفتاب بنا کر اُردو کے ذروں پر کسب ضیا کے لئے احسان عظیم کیا ہے۔"

مومن کے معشوق کے بھولے پن کا اندازہ آپ کو اس مطلع سے بھی ہوگا۔

غیر کو سینہ کے سے سیمبر دکھلا دیا | تم نے کیا کچھ کس کو اتنی بات پر دکھلا دیا

ادب مانع ہے کہ ایسی گندی فضا میں میر کا ہم قافیہ شعر پیش کیا جائے۔ مگر مجبوری ہے وہ کہتے ہیں۔

پوشیدہ راز عشق چلا جائے تھا سو آج | بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اُٹھا دیا

اُنھوں نے راز عشق کو برابر چھپایا۔ سعی ضبط میں دل کی طاقت صرف ہوتی رہی ضعف رونما ہوا جس نے راز عشق افشا کر دیا معشوق کو علم ہو گیا کہ یہ بھی مجھ پر عاشق ہے۔ ایسا نہ ہونا چاہئے تھا۔ مذاق عشق میں ناروا ہے۔ لہذا دل کی بے طاقتی کا شکوہ کر رہے ہیں۔ یہی ہیں وہ مقامات عشق جو ایک سچے شاعر کی تخیل کے جولانگاہ رہتے ہیں۔

دوسرا قافیہ لیجیے۔

مومن۔ برق آہ کو جو میں نے کہا مُسکرا دیا | دل گرمیوں نے اُسکی کلیجا جلا دیا

یہ مطلع غنیمت ہے۔ مومن نے معشوق کو ڈرایا کہ میری آہ سے حذر کر یہ برق کی طرح پر شرار ہے۔ وہ شوخی سے مُسکرا دیا۔ مطلب یہ تھا کہ میری برق تبسم میں تیری آہ سے زیادہ حرارت ہے اور معشوق کا قول سچ تھا۔ کیونکہ اُسکے تبسم نے میرا کلیجا جلا دیا۔

میر کہتے ہیں۔ بوے کباب سوختہ آئی دماغ میں | شاید جگر بھی آتش غم نے جلا دیا

ہر لحاظ سے ایک مکمل شعر ہے۔ جگر کی تشبیہ کباب سے مسلم ہے۔ آتش غم نے دل خاک کیا تھا، اب شاید جگر کو بھی جلا دیا۔ لفظ شاید نے مبالغہ کا زور کم کیا۔ عشق نے احساس کو اتنا لطیف کر دیا ہے کہ جگر جلتا ہے تو دماغ میں کباب سوختہ کی بو آتی ہے۔

تیسرا شعر لیجئے۔

مومن۔ تاثیر سوز دل کرۂ نار ہے مگر | اُس شعلہ رو کو سینے سے میرے لگا دیا

سوز دل کی تاثیر کو کرۂ نار کہا ہے اور معشوق کو شعلہ رو۔ آگ نے آگ کو کھینچا۔ اُپچ ضرور ہے مگر بے تکی۔ اور وہی بیہودہ تصنع جس کا حاصل کچھ نہیں۔ کرۂ نار مری ہے اور تاثیر غیر مری۔ لطف استعارہ معلوم۔

میر کہتے ہیں ؎ گیا محاسبہ مجھے دینا تھا عشق کا اس طور دل سی چیز کو میں نے لگا دیا

دل سی چیز کو مضطربانہ حوالے کر دیا گویا عشق کا بار قرض تھا جسکو فوراً ادا کرتے میں باز پرس ہوتی۔ عشق کے اضطراب و شوق و مجبوری و سراسیمگی کی عمدہ نقاشی ہے۔

چوتھا شعر۔

مومن ؎ دیکھا نہ میرے نالۂ آہن گداز نے آئینہ دیکھنے کا تماشا دکھا دیا

ابتدا میں فولاد کو صیقل کر کے آئینہ بناتے تھے۔ مومن نے نالۂ آہن گداز کیا۔ آئینہ پانی پانی ہو گیا اور اب معشوق اپنی صورت دیکھنے کو ترستا ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ شعر میں نہ اثر ہے نہ مزہ۔

میر کہتے ہیں ؎ ان نے تو تیغ کھینچی تھی پر جی چلا کے میر ہم نے بھی ایک دم میں تماشا دکھا دیا

اس مقطع میں ایہام ہے۔ "جی چلانا"، "دم میں"، اور "تماشا دکھانا" اپنے قریب و بعید دونوں معنی دے رہے ہیں۔ جی چلانا، ہمت کرنا اور جان دینا، دم میں۔ ایک آن میں یا ایک سانس میں۔ تماشا دکھانا۔ ترکی بہ ترکی جواب دینا، یا حیران و منفعل کرنا۔

معشوق نے قتل کو تیغ کھینچی یہاں شوق شہادت اور قاتل کے انداز نے وار ہونے کے پہلے ایک آن میں کام تمام کر دیا۔ معشوق دیکھتا ہی رہ گیا اور منفعل ہے کہ میں نے ایسے ناتوان کے قتل کا ارادہ کیوں کیا۔

پانچواں شعر:۔

مومن ؎ رشک فغاں کی لے رقیب آفرینیاں محشر نے خفتگان لحد کو جگا دیا

فغاں پر شور قیامت کو رشک آیا اور اس نے رقیب پیدا کر دیے وہ اس طرح کہ صور پھونکا اور تمام خفتگان لحد بیدار ہو گئے وہ سب مومن کے رقیب ہیں۔ وہی تصنع اور زمین آسمان کے قلابے ملانا۔ شعر میں رقیب آفرینیاں کی خوبصورت ترکیب کے علاوہ کچھ نہیں۔

میر کہتے ہیں ؎ سمجھی نہ باد صبح کہ آ کر اٹھا دیا اس فتنۂ زمانہ کو ناحق جگا دیا

بادِ صبح نے معشوق کو جگا دیا اُدھر تو اُسکے خواب عیش میں خلل پڑا اِدھر میر گلچینیٔ جمال سے محروم ہو گئے۔ اب افسوس کر رہے ہیں کہ ع اُس فتنۂ زمانہ کو ناحق جگا دیا۔

چھٹا شعر۔

مومن ؎ مٹی نہ دی فراز تلک کے اُسپہ بھی ۔۔۔ کہتے ہیں لوگ خاک میں مجھ کو ملا دیا

خاک میں ملا دیا میں ایہام ہے۔ لوگوں کی مراد خاک میں ملا دیا سے برباد کرنے سے ہے اور مومن لفظی معنی لیتے ہیں۔ وہی لفظوں کا گھروندا۔

میر ؎ تھی لاگ اُسکی تیغ کو ہم سے سو عشق نے ۔۔۔ دونوں کو معرکے میں گلے سے ملا دیا

اسلوب بیان میں کس قدر تازگی ہے۔

ساتواں شعر:۔

مومن ؎ ہمدم دکھا اب اسکو کسی ڈھب کہ رحم آئے ۔۔۔ ناصح کو میرے حالِ زبوں نے رُلا دیا

ناصح اور معشوق دونوں سنگدل اور بے حس ہیں۔ مومن کے حالِ زار کا یہ عالم ہے کہ ناصح بھی رونے لگا۔ ہمدم سے کہتے ہیں کہ اب کسی طرح معشوق کو لے آ۔ شاید اُسکو بھی رحم آجائے۔

میر ؎ تکلیف دردِ دل کی عبث ہمنشیں نے کی ۔۔۔ دردِ سخن نے میرے سبھوں کو رُلا دیا

ہمنشین نے دردِ دل بیان کرنے کو کہا کہ شاید سننے والے کوئی تدبیر نکالیں مگر یہ قصہ اس درجہ المناک تھا اور ایسے درد بھرے الفاظ میں بیان ہوا کہ سننے والے زار زار رونے لگے۔ مداوائے دردِ دل کی جو آس بندھی ہوئی تھی وہ بھی ٹوٹ گئی۔ لوگوں کے رونے سے معلوم ہوا کہ درد لاعلاج ہے۔

دونوں شعر اپنے اپنے رنگ میں خوب ہیں حقیقت نگاری کے اعتبار سے میر کو اوّلیت ہے۔

اب علامہ کیفی کا وہ معرکۃ الآرا دعویٰ آتا ہے کہ مومن کا ایک لفظ گویا میر کی غزل پر بھاری ہے۔

مومن کا شعر ہے ۔۔ ؎ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ۔۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

میر کی غزل کے یہ شعر نقل کئے گئے ہیں۔ قوسین میں جو شعر ہے میں نے دیوان سے اضافہ کر دیا ہے۔

؎ غنچہ ہی وہ دہان ہے گویا ۔۔۔ ہونٹ پر رنگ پان ہے گویا
میرے مرنے سے بھی وہ چونکے ہے ۔۔۔ اب تلک مجھ میں جان ہے گویا!
(سر بسر کیں ہے لیک وہ پرکار ۔۔۔ دیکھو تو مہربان ہے گویا)

حیرتِ روئے گل سے مرغ چمن چپ ہے یوں بے زبان ہے گویا

مسجد ایسی بھری بھری کب ہے میکدہ اک جہان ہے گویا

بسکہ ہیں اِس غزل میں شعر بلند یہ زمیں آسمان ہے گویا

وہی شور مزاج شیب میں ہے میرؔ اب تک جوان ہے گویا

علامہ کیفی نے یہ نہیں بتایا کہ مومنؔ کے شعر میں لفظ گویا گوہر بے بہا کیوں ہے۔ مگر شعر کی وبی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لفظ گویا کا مطلب ہے کہ تم دراصل میرے پاس نہیں ہوتے۔ ایسے عیب کہاں، مگر شدت اغراق و تصور اور محویت شوق میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے پاس ہو۔

مجھے اُن لوگوں سے اتفاق نہیں جو لفظ گویا کے لفظی معنی ہم کلام ہونے کے بھی لیتے ہیں۔ اس طرح شعر کی معنوی لطافت کا خون ہو جاتا ہے اور تصور نے خاموشی کا جو طلسم باندھا ہے ٹوٹ جاتا ہے۔ میرؔ کی غزل میں بھی لفظ گویا ہر جگہ خوبی اور سلیقے سے آیا ہے۔ علامہ کیفی کا حسن عقیدت کہ مومنؔ کے یہاں تو یہ لفظ موتی اور میرؔ کے یہاں خزف ریزہ معلوم ہوتا ہے۔

مثال میں یہی شعر لیجئے۔ ؎

حیرتِ روئے گل سے مرغ چمن چپ ہے یوں بے زبان ہے گویا

اگر مومنؔ کے یہاں لفظ گویا نے تصور کو تصدیق کی حد تک پہونچا دیا، تو میرؔ کے شعر میں لفظ گویا نے خاموشی حیرت کی بے نظیر مصوری کی ہے اور تنوع معانی پیدا کیا ہے۔

ایک معنی تو یہ ہوے کہ مرغ چمن حیرت روئے گل سے اس طرح چپ ہے گویا مُنہ میں زبان ہی نہیں۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ مرغ چمن اس طرح خاموش ہے کہ اُسکی خاموشی بزبان بے زبانی اعلان کر رہی ہے کہ مجھے حیرت روئے گل سے چپ لگ گئی ہے۔ خود خاموشی گویا ہے اور اظہار حیرت کر رہی ہے۔ فافہم!

؎ میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

ذرا علامہ کیفی مومنؔ کے دیوان سے "میرؔ کی سی" کا جواب نکال دیں۔

زمانہ کو میرؔ کا مد مقابل پیدا کرنے میں بہت سعی و کاوش کرنا ہوگی پھر بھی کامیابی معلوم۔ ؎

مت سہل ہمیں بوجھو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
(میرؔ)

تقسیمِ عالم

(جناب سید محمد صادق حسین صاحب بی۔اے۔ علیگ)

پرستاران فلسفۂ قدیم کے نزدیک دنیا کی آبادی کو بہ اعتبار مذہب تقسیم ہونا چاہیے اور دلدادگان دنیائے جدید کی تحقیقات کے مطابق بہ لحاظ قومیت گویا متقدمین مذہب کو اس تقسیم کا اصل اصول سمجھتے ہیں اور متاخرین قومیت کو!۔

مذہبی تقسیم کو جن وجوہ کی بنا پر ناقص قرار دیا جاتا ہے ان میں سب سے قوی دلیل غالباً یہ ہے کہ مذہب کا تعلق چونکہ انسان کے دماغ سے ہے اور وہ (مذہب) ایک متغیر، اختیاری اور اعتقادی کیفیت ہے۔ لہذا ایک تغیر پذیر اور دماغی مفروضہ کو تقسیم عالم جیسے نازک اور اہم مسئلہ کا اصل الاصول قرار دینا عقلاً ممنوع ہے! فرض کرو آج ایک شخص مسلمان ہے اور دائرۂ اسلام میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اگر کل وہ عیسائی ہو جائے تو فوراً اسلام کے دائرے سے خارج ہو کر عیسائیت کے دائرے میں منتقل ہو جائیگا معلوم ہوا کہ مذہبی دائرے اس قدر ناقابل اطمینان اور تغیر پذیر ہیں کہ آن واحد میں ایک متنفس ایک دائرے سے دوسرے دائرے میں منتقل ہو سکتا ہے۔ لہذا دنیا کی تقسیم اگر بلحاظ مذہب کی جائے تو وہ کتنی تغیر پذیر کس درجہ ناقابل اطمینان اور کس قدر ناقص ہوگی۔

اب اس تقسیم پر غور کرو جو باعتبار قومیت کی جائے! قومیت، اتنی مادی۔ اس قدر ٹھوس اور ایسی ناقابل تغیر واقعیت ہے جس کا تعلق براہ راست جسم سے اور واقعہ پیدائش سے ہے ایک شخص ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے اور اتفاق پیدائش کی وجہ سے ہندوستان کے دائرہ میں آجاتا ہے۔ اب خواہ وہ مسلمان رہے، ہندو ہو جائے، عیسائیت قبول کرلے یا دنیا کا کوئی مذہب اختیار کرے تاہم ہندوستانی ہی رہیگا، نہ وہ اپنی پیدائش کو تبدیل کر سکتا ہے اور نہ ہندوستان کے دائرہ سے نکل کر کسی دوسرے گروہ میں جا سکتا ہے۔ قدرت نے یا اتفاق پیدائش نے اسے ہندوستانی بنا دیا اور اسکو ترک یا تبدیل کر دینا ہرگز اسکے اختیار میں نہیں لہذا قومیت کے لحاظ سے

(۱) اگر مذہبی تقسیم دماغ سے متعلق ہے تو قومی تقسیم بھی دماغ ہی پر منحصر ہے۔ اب قومی تقسیم کو مذہبی تقسیم سے بہتر اور بلند سمجھنا، ترجیح بلا مرجح ہے۔

(۲) قومی تقسیم جس قدر راسخ اور مضبوط ہے اسی قدر ناقابل وسعت اور ناقابل ترقی! تقسیم باعتبار مذہب یقیناً قابل ترقی چیز ہے۔ اس لئے کہ اس دائرے کو وسیع کرنا ممکن ہے۔

(۳) قومی تقسیم میں نفاقِ بین الاقوام کے نشانات پائے جاتے ہیں اور مذہبی تقسیم باہمی ارتباط واتحاد کا سبق دیتی ہے!۔

یہ ظاہر ہے کہ اس قدر وسیع بحث کا اتنا مختصر تذکرہ، تصویر کے ہر رخ اور ہر پہلو کو پیش نظر نہیں کرسکتا۔ تاہم یہ خاکہ مذہبی تقسیم اور قومی تقسیم کی حقیقت پر غور کرنے میں بہت کچھ معاون ہوسکتا ہے۔ دورِ حاضرہ کی ان گنتی نعمتوں، لاتعداد خوبیوں اور متبرک خصوصیات کا ایک دردناک کرشمہ یہ بھی ہے کہ مذہب کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو دہریت اور لامذہبیت کی زہریلی ہواؤں سے بجھا دیا جائے۔ اگر غور سے دیکھو تو مذہبی تقسیم کی پستی اور قومی تقسیم کی بلندی کے نقوش کو اُبھارنے کی مذموم کوششوں میں بھی یہی زہریلا راز مضمر ہے!!۔

سلطان محمد تغلق عادل شاہ

گزشتہ سے پیوستہ

(۴)

مسٹر کے۔ ایم۔ مشیر احمد علوی۔ بی اے۔ علیگ

باب سوم

مالوہ، ملتان اور بنگال وغیرہ کی بغاوتیں

سب سے پہلے سلطان کے ہمشیر زادہ ملک بہاء الدین[1] گرشاسپ حاکم ساگر نے سنہ ۱۳۳۸ء میں علم بغاوت بلند کیا اور امرائے دکن کو بغاوت پر تیار کر لیا۔ جن لوگوں نے اسکا ساتھ نہیں دیا وہ حیران و پریشان ہوکر شادی آباد مانڈو[2] چلے گئے۔ جب سلطان کو اس فتنہ کا علم ہوا تو

---

[1] بہاء الدین عم زادہ سلطان محمد شاہ المخاطب بہ گرشاسپ کہ از امرائے کبار بود" فرشتہ۔

[2] مانڈو کسی وقت دنیا کے عجائبات میں شمار کیا جاتا تھا اور آج تک اسکی عظمت و شوکت کے سامنے بڑے بڑے ماہرین صنائع قدیمہ سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ یہ قلعہ پہاڑ کی ایک چوٹی پر ۱۸ کوس کے دائرے میں بنا تھا سلطان ہوشنگ غوری نے جب کہ وہ صرف الف خاں تھا اور اپنے باپ سے آزردہ ہو کر دھار سے جدا ہوا تھا۔ اس قلعہ کی مرمت کرائی تھی اور اسکے استحکامات میں اضافہ کیا تھا۔ جب وہ سلطان ہوا تو اسی کو اپنا دار الحکومت مقرر کیا اور اس کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے مشہور کر دیا۔ یہ قلعہ بہت قدیم زمانہ کا بنا ہوا تھا۔ ایک عجیب قصہ شہنشاہ جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے جسکا یہاں پر نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ راجہ بکرماجیت کے عہد سے پہلے ایک راجہ جی سنگھ دیو اس ملک پر حاکم تھا۔ اس وقت میں ایک کاشتکار گھاس چھیلنے جنگل میں گیا تھا۔ جب گھاس کی گٹھری لے کر آیا تو دیکھا کہ کھرپی کا کچھ حصہ زرد ہو گیا ہے۔ کسان کو تعجب ہوا اور کھرپی ایک لوہار کو دکھائی۔ اس لوہار کا نام ماندن تھا۔ لوہار نے پہچان لیا کہ کھرپی کا پھل سونے کا ہو گیا ہے۔ (صفحہ ۲۴ دیکھو)

خواجہ جہاں وزیر اعظم کو ان باغیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ جب خواجہ جہاں مانڈوگڈھ
پہنچا تو گرشاشپ آمادہ جنگ ہو کر میدان میں نبرد آزما ہوا لیکن عین موقعہ پر امیر کبیر خضر
بہرام جو گرشاشپ کا معتمد و مشیر تھا۔ خواجہ جہاں سے مل گیا۔ بہار الدین میدان سے فرار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱) اس نے سنا تھا کہ نواح کے جنگل میں کسی جگہ پارس پتھر ہے۔ جسکے چھونے سے لوہا
اور تانبا سونا ہو جاتا ہے اسکو شبہ ہوا کہ یہ کھرپی پارس پتھر سے مس ہوئی ہے وہ کسان کو ساتھ لیکر اس مقام پر گیا
جہاں کاشتکار نے گھاس چھیلی تھی اور خوبی تقدیر سے پارس پتھر اس لوہار کے ہاتھ آگیا۔ ایسی قیمتی جنس اپنے
پاس رکھنا خطرناک سمجھ کر لوہار نے وہ پتھر راجہ کی نذر کیا اور اس خوش قسمت راجہ نے اس طلسمی تحفہ سے بافراط سونا
بنایا اور بیشمار دولت اپنے خزانہ میں جمع کی۔ پھر راجہ نے اس قلعہ کی تعمیر شروع کی جو بارہ برس کی طویل مدت
میں تکمیل کو پہنچا اور مادن لوہار کی یادگار میں مانڈوگڑھ اسکا نام رکھا گیا۔ جے سنگھ دیو خوب عیش و عشرت کر چکا
اور اسکا دل دنیا سے سرد ہوا تو اس نے نربدا کے کنارے برہمنوں کو جمع کیا اور اپنی لاتعداد دولت انکے درمیان
تقسیم کر دی جس برہمن کا وہ سب سے زیادہ معتقد تھا اسکو پارس پتھر عنایت کیا مگر "تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل"
لالچی برہمن روپیہ و اشرفی کی جگہ پتھر پا کر نہایت غمزدہ ہوا اور وہ دولت لازوال بغیر پوچھے گچھے نربدا میں پھینک
دی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ پتھر ابھی تک نربدا میں پڑا ہے لیکن اسکا صحیح مقام کسی کو معلوم نہیں"
اس قصہ کا جھوٹ سچ شہنشاہ جہانگیر کی گردن پر ہے لیکن اسمیں کلام نہیں کہ بیشمار دولت اس قلعہ کی تعمیر میں
صرف ہوئی ہوگی۔ اور اگر بارہ برس کی مدت میں یہ تکمیل ہو گیا تو سمجھنا چاہیے کہ جلد ہوا !! اس قلعہ کے گرد بجائے خندق
کے قدرتی وادیاں ہیں اور ان میں سے بعض اس قدر عمیق ہیں کہ ان کو عبور کر کے قلعہ پر حملہ کرنا انسانی طاقت سے
باہر ہے۔ قلعہ کے اندر پانی اور چارہ کی افراط ہے۔ سرجان مالکم نے جب کہ وہ انیسویں صدی کے آغاز میں
بسلسلہ ملازمت مالوہ آئے تھے۔ زمینداران مانڈو کے قدیم کاغذات سے ایک نقشہ تیار کیا تھا۔ جس سے
مانڈوگڑھ کی وسعت کا اندازہ ملتا ہے انکی "یادداشت مالوہ" مطبوعہ ۱۸۳۳ء کے مطابق مانڈوگڑھ کے اندر
اراضی کی تقسیم اس طرح تھی۔ غیر مزروعہ ۲۵۵۵ بیگہ۔ حمام ۴۰ بیگہ۔ چھوٹی پہاڑیاں ۲۳۵۰ بیگہ۔ باغات
۳۲۶۳ بیگہ۔ مساجد ۷۰۵ بیگہ۔ چاہات ۳۱۰ بیگہ۔ محلات شاہی ۵۰۰ بیگہ۔ سرائیں ۳۰۵ بیگہ لال باغ شاہی
۳۰۰ بیگہ۔ بارہ بازارین ۱۴۷ بیگہ۔ بڑا تالاب ۹۱۰ بیگہ۔ چھوٹے تالاب ۳۶۳ بیگہ۔ آبادی ۲۲۵۸ بیگہ۔
مزروعہ ۵۴۸ بیگہ۔ انعام معافی زمینداران ۱۲۵ بیگہ۔ کل میزان ۱۱۸۷۶ بیگہ۔
زراعت کے لئے بھی جگہ ہے۔ دائرہ اتنا طویل ہے کہ ہر طرف سے سلسلہ رسد کا بند کر دینا قریب قریب غیر ممکن ہے،
جنوب کی طرف قلعہ کا راستہ اس قدر ناہموار اور ڈھالو ہے کہ سوار اس پر چل نہیں سکتا۔ ایک طرف دشمن کی فوج
کاٹ ڈالی جائے تو دوسری سمت والوں کو جلد خبر بھی نہیں پہنچ سکتی۔
(شاہان مالوہ، مولوی امیر احمد صاحب علوی بی اے۔ صفحہ ۳۵ --- ۳۸)

ہو گیا لیکن خواجہ جہاں قضائے مبرم کی طرح اُسکے تعاقب میں روانہ ہوا۔ پہلے بہاء الدین نے ساگر میں پناہ لی لیکن جب اُسکو خواجہ جہاں کا علم ہوا تو مع اہل و عیال کے کنپلہ (کرناٹک) کے راجہ کے یہاں جو اُس کا دوست تھا جا کر پناہ گزین ہوا۔ اسی اثنا میں سلطان بھی دیوگڈھ پہونچا اور خواجہ جہاں کو لشکر جرار لیکر کنپلہ روانہ کیا۔ اسے گرساشپ نے دو فاش شکستیں دیں لیکن تازہ دم فوج پہونچ جانے کی بنا پر سلطانی افواج کو فتح ہوئی۔ رائے کنپلہ زندہ گرفتار کیا گیا۔ لیکن ابھی قضا نے گرساشپ کو چند ساعتوں کی مہلت دی اور وہ دوبارہ فرار ہوا۔ مگر ایک دوسرے راجہ نے اُسکو زندہ گرفتار کر کے پابجولاں حاضر دربار سلطان کیا۔ مالوہ دوبارہ فتح کیا گیا اور بدستور ممالک محروسہ میں شامل کیا گیا۔ اگر ہندوستان کے جغرافیہ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آئے گا کہ ہندوستان دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ تو شمالی ہندوستان کہلاتا ہے اور دوسرا جنوبی ہند لیکن ہندوستان کا اطلاق بالعموم اُس وسیع زرخیز خطہ پر ہوتا ہے۔ جو پشاور سے شروع ہو کر آسام تک پھیلا ہوا ہے اور جنوبی ہند کو ازمنہ قدیمہ سے دکن کہتے چلے آئے ہیں۔ ہندوستان (شمالی) میں زیادہ تر زرخیز میدان ہیں اور دکن (جنوبی) کی سطح مرتفع ہے۔ دوسرے الفاظ میں دکن ایک پہاڑی مثلث ہے جسکے دونوں جانب وسیع سمندر لہریں مار رہا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ حصہ ہندوستان خاص سے ہمیشہ علیحدہ رہا۔ وندیاچل اور ستپورا کے سلسلے نے شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کے اخلاق و عادات، تمدن و معاشرت، زبان و نسل، رنگ و مذہب میں ایک گونہ حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ گو شمالی حملوں نے بہت کچھ جنوبی ہند کے رسم و رواج میں انقلاب پیدا کیا۔ لیکن یہ نقوش زیادہ دیرپا اُن ممالک پر قائم نہ رہ سکے۔ دکن کی سرسری تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ تیسری اور چوتھی صدی ق م میں موریا خاندان کے حکمرانوں نے دکن کے فرمانرواؤں پر حملہ کیا اور اُن کو مطیع بنایا اور جس سلطنت کی بنیاد چندر گپت کے ہاتھوں سے رکھی گئی تھی۔ اشوک کے بعد اس میں انحطاط کے آثار شروع ہو گئے اور ۱۸۵ سنہ ق م میں سپہ سالار اپشیا متھرا نے موریا خاندان کے آخری راجہ برہدرا کو قتل کر کے اس خاندان کا قلع قمع کر دیا اور ایک نئے خاندان سنگائی کی بنیاد ڈالی۔ گوداوری کرشنا

اور خلیج بنگال کا ساحلی میدان (وسط ہند) میں جو اقوام آباد تھیں اُنکو اندھرا کہتے تھے چنانچہ اسی رعایت سے اس ملک کو اندھرا دیس کہتے تھے۔ جب بُدھ مذہب کے مشہور داعی و مبلغ اشوک نے دُنیا سے مُنھ موڑا تو اندھروں نے اس وقت کو غنیمت سمجھا۔ خاندان سانگا دینی گزشتہ نسلوں سے زیادہ مستقل اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہوا تھا۔ ابھی شمالی ہندوستان کے فرمانروا کل ہندوستان کے حاکم تصور کئے جاتے تھے۔ لیکن اس نئی سلطنت نے ذی اقتدار ہونے کے بعد شمالی ہند کو بھی تسلط میں لاکر اپنا اقتدار قائم کیا اور تین سو سال تک برسر حکومت رہا لیکن ایک قلیل عرصہ کے بعد ایک غیر ملکی قبیلہ سا کیا نے اُن کی حکومت میں رخنہ ڈالا۔ بالآخر زوال شروع ہوا۔ اور شمال جلد ہی حسب رواج قدیم جنوب کے دائرہ اقتدار سے خارج ہوگیا۔ حتیٰ کہ تیسری صدی عیسوی کی ابتدا ہی میں اس خاندان کا قلع قمع ہوگیا۔ اندھرا خاندان کے آخری فرمانروا کے بعد اشراکوٹہ نے اپنی حکومت قائم کرلی۔ اور ان کا ایک خاندان تمام ملک دکن کا مالک بن گیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں اس حکومت کا بھی خاتمہ چالوکیہ نے کیا۔ اور چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں خاندان گپتا کے فرمانرواؤں نے دوبارہ جنوبی ہند کے ایک حصہ پر تھوڑے عرصہ کے لئے حکمرانی کی۔ ساتویں صدی میں شمال کے زبردست راجہ ہرشا وردھن اور جنوب کے بال کشن جنگ و جدال پر آمادہ ہوئے۔ لیکن جلد ہی مصالحت ہوگئی اور نربدا کا دریا حدفاصل بنایا گیا۔ چالوکیہ کے نامور راجہ تالیپا نے اشتراکوٹا کو حکومت سے ۹۷۲ء میں دست بردار کیا لیکن یہ عرصہ تک چالوکیہ بھی باطمینان حکومت نہ کرسکے۔ کیونکہ اُنکی بدنصیبی سے چولوں کی ایک نئی حکومت عروج پر تھی اور چالوکیہ اور چولا کے مابین مسلسل جنگ کا آغاز ہوگیا۔ تالیپا دوم کے عہد میں چالوکیہ کی قوت روبہ انحطاط ہوئی۔ سامیشوارا چہارم (تالیپا دوم کے لڑکے) نے چالوکیہ حکومت کو مستحکم کرنے کی بہت کوشش کی اور اُسکے سپہ سالار بوما نے جنوبی حصہ کو فتح بھی کرلیا۔ لیکن ۱۱۸۹ء کے ایک جدید انقلاب نے اُسکو بھی حکومت سے دست بردار ہوکر سلطنت کی جنوبی غربی سرحد میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور کیا۔ اس وقت چالوکیہ حکومت میں عام طور سے طوائف الملوکی کی وبا پھیل گئی اور یادو دا اور ہا تیالہ کے دو ماتحت خاندانوں نے اپنی اپنی

حکومتیں قائم کرلیں۔ دسویں صدی میں چولا خاندان کو دوبارہ عروج ہوا۔ بارھویں صدی کے نصف عشرہ میں ایسے حکمراں تخت نشین ہوئے جن میں نہ قابلیت تھی اور نہ صلاحیت اور نہ فرمانروائی کی اہلیت۔ لہذا اس موقع کو غنیمت سمجھکر ماتحتوں نے اس کمزوری سے فائدہ خاطر خواہ اُٹھایا اور طوق غلامی اُتار کر پھینک دیا۔ اب پانڈیا نے علیحدہ حکومت قائم کرلی جو آئندہ چل کر جنوبی ہند کی طاقتور حکومتوں میں سے ایک تھی۔ سترھویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں حسب ذیل سلطنتیں قائم تھیں۔

(۱) دیوگری کی یادوی حکومت جسکا آخری راجہ رام چندر تھا جس نے سنہ ۱۳۱۲ء تک حکومت کی۔

(۲) تلنگانہ۔ جس کے تحت میں شرقی دکن کا نصف حصہ تھا۔ اور رانی دورامہا جو خاندان کاکتیا سے تھی حکمرانی کررہی تھی۔ اس سلطنت کا دارالخلافت ورنگل تھا۔

(۳) ہائیلہ کی حکومت جسکے تحت میں ہنہا اور نیلور کا تمام حصہ تھا۔

(۴) پانڈیہ جو جملہ جنوبی حصہ ہند پر قابض تھے[1]

غرضکہ دکن کی یہ حالت تھی جسکی ایک سطحی تصویر گزشتہ اوراق میں پیش کردی گئی ہے اور ہر حکومت اپنا اقتدار مستحکم اور آئینی قلمرو وسیع کرنے کی تدابیر پر غور کیا کرتی تھی۔ ہمیشہ ان لوگوں میں اس میں جنگ قبیلانہ جاری رہتی تھی اور اس سلسلہ کو اُس وقت تک بقا رہی جب تک مسلمانوں نے شمال سے حملہ کرنا شروع نہ کردیا اور بالآخر فاتح کی حیثیت سے ان جملہ سلطنتوں کا خاتمہ نہ کردیا۔ سلطان محمد تغلق ایک بیدار مغز شہنشاہ تھا اُس نے اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں دکن کی اس سیاسی شطرنج کو خوب سمجھا اور بالآخر ان سلطنتوں کو ہلانے میں کامیاب بھی ہوا۔ اگر بہمنی سلطنت کا اقتدار اور آخر عہد کی بغاوتیں رونما ہوگئی ہوتیں تو یہ سلطنتیں بہت قبل ہی فنا ہوچکی ہوتیں۔

مالوہ کے فتح کرنے کے بعد سلطان نے کندھانہ کے مضبوط قلعہ کا جو مستحکم اور بلند پہاڑی پر

---

[1] جنوبی ہندوستان اور اُسکے حملہ آور مسلمان۔ انیگر۔ گزیٹیر ممالک محروسہ سرکار عالی حیدرآباد مرتبہ مرزا مہدی مخطوطات وملفوظات قلمی (دارالتصنیف اورنگ آباد)

دیوگڈھ کے اطراف میں واقع تھا محاصرہ کرلیا۔ ناک مایک جو قلعہ کا سردار تھا پہلے تو بہت شجاعت اور جوانمردی سے لڑتا رہا لیکن اقبال خسروی کے حضور میں اُسکو سرِ نیاز خم کرنا پڑا اور سلطان نے نہایت درجہ خوش ہوکر اپنے امرائے اعظم میں اُسکو شامل کرلیا اور کندھانہ کا قلعہ اسکے اہل وعیال کی اقامت کے لئے اُسکے پاس رہنے دیا۔ سلطان نے دیوگڈھ جاکر آرام کا خیال کیا ہی تھا کہ شمالی ہند سے پرچہ گزرا کہ ملک بہرام ایبہ حاکم ملتان نے مخالفت علانیہ اختیار کی ہے اور پنجاب کی تاخت وتاراج بھی شروع کردی ہے۔ سلطان بہ نفس نفیس ایک جرار تازہ دم فوج لے کر روانہ ہوگیا جس سے ارضِ ملتان دہل گئی۔ اِس معرکہ میں سخت خونریزی ہوئی لیکن ملک ایبہ فرار ہوگیا۔ یہ ملک ایبہ کون ہے؟ یہ وہی کشلو خاں ہے جس نے سلطان خلد آشیاں غیاث کے لئے تخت کی کوششیں کی تھیں اور سلطان محمد اُسکو ادب سے چچا کہتا تھا۔ بادشاہ مظفر ومنصور اُس نواح کے ایک عارف باللہ شیخ رکن الدین کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملتان میں قتل عام کا عندیہ ظاہر کیا۔ ذی عزت عالم نے سلطان کو اِس خیال سے باز رہنے کی تلقین کی۔ سلطان قتل عام سے باز رہا اور شیخ کی قدمبوسی کے بعد ایک دوسرے امیر قوام الملک کو ملتان کا حاکم مقرر کرکے ایک جماعت ملک ایبہ کے تعاقب میں روانہ کی اور تھوڑے عرصہ ہی میں فوج نے ملک ایبہ کو گرفتار کرلیا اور سر بریدہ سلطان کی خدمت میں حاضر کیا۔ سلطان کو اطمینان ہوا اور ملتان سے واپس جاکر دو سال تک دارالخلافت دہلی میں مقیم رہا۔

"از ملتان مظفر ومنصور بازگشت ودر دہلی آمد ودر دیوگر کہ خلق شہر (دہلی) با زن وبچہ آنجا روانہ شدہ بود نرفت وہم در دہلی ساکن گشت ودراں دو سال کہ سلطان در دہلی ماند امراو ملوک وحشم برابر ہمرکاب سلطان بودند وزن وبچہ ایشاں در دیوگر بود"[1]

اسی سال جبل قراجیل (ہمالہ) کے ایک راجہ پر بھی فوج کشی کی گئی۔

"سلطان محمد را در خاطر گزشت کہ کوہ قراجل کہ در راہ نزدیک میان ممالک ہند وممالک چین حائل وحجاب شدہ مضبوط علم اسلام گردد"[2]

---

[1] فیروز شاہی ضیاء الدین برنی۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ۔

چنانچہ جیسا کہ آئندہ اسکا ذکر مفصل ہوگا شہر فتح ہوا اور سلطان کی خواہش پوری ہوئی قلعہ فتح ہوا۔ قاضی وخطیب اشاعت اسلام کے لئے اس ملک میں بھیجے گئے۔ وہاں کا راجہ بہت طاقتور اور سرکش تھا اسی لئے اس مہم پر ملک نکبہ جو امیر دولت دار کے معزز عہدہ پر فائز تھا نامزد کیا گیا وہ چنانچہ ایک لاکھ سوار اور اسی قدر پیادہ فوج لے کر جبل قراچل کی وادی میں داخل ہوا اور ایک شہر (حدیہ؟) کو فتح کرلیا۔

اس قلعہ کے نیچے وادی تھی اور اوپر پہاڑ تھا۔ اتفاق سے موسم برسات آگیا اور عساکر اسلامیہ میں سخت وبا پھیل گئی۔ لامحالہ فوجی اذان سلطان لیکر پہاڑ پر چلے گئے لیکن دشمنوں نے عساکر شاہی کو بہت نقصان مختلف طریقوں سے پہونچایا۔ آخرکار راجہ نے حسب ذیل شرائط پر صلح کی۔ (۱) سالانہ مقررہ خراج دارالخلافت دہلی پہونچ جایا کریگا۔ (۲) حدود قراجبل میں اسلامی شعائر برتنے میں مداخلت نہ کیجائیگی۔ (۳) اور آئندہ اس وادی میں کوئی جدید عمارت بغیر اجازت سلطان کے نہ بنیگی۔ یہ شرائط سلطان نے منظور کرلئے اور جبل قراجیل ممالک محروسہ میں شامل کیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۳۳۵؁ء کا ہے۔ اسی سال ساحل کارومنڈل کے شریف جلال الدین حسن شاہ حاکم نے بھی علم بغاوت بلند کیا اور بادشاہ بن گیا۔

"سلطان محمد در نہب متمردان در حدود قنوج مشغول بود کہ سلطان در معبر زاد پدر ابراہیم خریطہ دار سید حسن در معبر بود بلفاک کردہ امرائے آنجارے را بکشت و آں ملکے افرو گرفت و حشمے کہ از دہلی برائے ضبط معبر نامزد بود ہم آنجا ماند و ایں خبر بسلطان رسید ابراہیم خریطہ دار را و اقربائے او را بگرفت و سلطان محمد در شہر (دہلی) آمد و از شہر استعداد کردہ بہ ترتیب لشکر کشی معبر جانب دیوگیر رواں شد"[1]

سلطان اس زمانہ میں قنوج کے حدود میں کچھ باغیوں کی گوشمالی کے لئے گیا ہوا تھا جیسے ہی اس نے یہ خبر سنی دہلی کا راستہ چھوڑ کر میرٹھ کرنال ہوتا ہوا کیتھل (شمال جانب از دہلی) پہونچا اور سید حسن کے رشتہ داروں کو گرفتار کرلیا۔ اسکے لڑکے ابراہیم خریطہ دار کو بھی شاہی حراست میں لے لیا اور دولت آباد روانہ ہوا۔ یہ قافلہ ۷۳۵؁ھ (۱۳۳۵ء) میں جبکہ موسم سرما شروع ہو چکا تھا۔ اکتوبر و نومبر کے مہینہ میں کاشتکاروں کو فصل ربیع کے لئے تقاوی دے کر روانہ ہوا۔ اس سال بارش نہیں ہوئی تھی اس لئے خریف کی پیداوار کم ہوئی تھی۔ سلطان نے ملک احمد ایاز خواجہ جہاں وزیر اعظم کو

---

[1] فیروز شاہی ضیاء الدین برنی ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔

نائب السلطنت بناکر دہلی واپس کیا - اس مرتبہ جو لوگ دہلی واپس جانا چاہتے تھے اُنکو ملک اباز کی ہمراہی میں دہلی واپس کیا لیکن پھر بھی ایک کثیر تعداد وہیں بس گئی جن کی یادگار اب بھی شاذ و نادر دکن میں موجود ہے - ملک احمد اباز نائب السلطنت نے دہلی پہونچ کر لاہور کا ایک خفیف ہنگامہ فرو کیا - سلطان ورنگل پہونچا کہ لشکر میں دوبارہ وبا پھیل گئی - اور مشاہیر امرا اس وبا کے نذر ہوے - سلطان بھی مبتلا ہوے لیکن فضل ایزدی شامل حال تھا جلد صحت یاب ہوا اور عماد الملک نائب وزیر اور ملک قبول نائب وزیر کو تلنگانہ کی حکومت تفویض کر کے دیوگڑھ واپس چلا گیا سلطان پٹن پہونچکر مقیم ہوا - چونکہ سفر کے تکان سے طبیعت ناساز ہو گئی تھی اس لیے یہاں پیا باقاعدہ علاج شروع کیا - صحتیابی کی خوشی میں دربار کیا اور ایک نو مسلم شہاب الدین کو نصرت خاں کا خطاب دے کر ملک بیدر کی حکومت تفویض کی اور ایک لاکھ تنکہ خراج سرکاری خزانہ کے لئے سالانہ اُس سے لکھوا لیا - اب اطمینان سے معبر کی مہم کے لئے تیار ہو کر تلنگانہ کے صدر مقام بیدر کوٹ جہاں سے معبر ۳ ماہ کے فاصلہ پر ہے مقیم ہوا - یہاں بھی اتفاق سے وبا پھیلی جسمیں ملک دولت شاہ اور امیر عبداللہ ہروی وغیرہ جلیل القدر امرائے سلطنت کا انتقال ہو گیا یہیں سلطان کے دشمنون نے اُسکی موت کی بے بنیاد خبر اُڑادی - اسی زمانہ میں خواجہ جہاں کا بھانجا اپنے ماموں کے قتل کی سازش میں دربار شاہی میں حاضر کیا گیا اور کیفر کردار کو پہونچا -

سلطان نے دولت آباد کا صوبہ مع مرہٹہ میر حسن ابن میر میران (ملک کبیر قتلغ خاں کو سپرد کیا اور خود معبر[۵۷] کی مہم کو بغیر سر کئے ہوے اپنی والدہ مخدومۂ جہاں کے ساتھ دہلی چلا گیا - اور دہلی

---

۵۷ - اہل عرب جنوبی ہند کے مغربی ساحل کو ملیبار اور مشرقی ساحل کو معبر کہتے ہیں -

معبر کے معنی گھاٹ کے ہیں - ساحل عموماً گھاٹ ہی کہلاتے ہیں - ازمنہ قدیمہ میں دریائے کاویری اور پالار کے درمیان چولا خاندان حکمراں تھا - اسی مناسبت سے اس خطہ کو ہندو مورخین نے چولا منڈل لکھا ہے - پرتگیزوں نے اس کا نام کارومنڈل رکھا - اسلامی تسلط سے قبل معبر میں ہندوں کی دو سلطنتیں قائم تھیں - شمال میں چولا خاندان حکمراں تھا جس کا ذکر اشوک کے کیبستوں میں بھی موجود ہے - اس خاندان میں راجہ راج دیو بہت مشہور راجہ گزرا ہے - اسکی پوتی سے ونگی کے چلوکیا راجہ دیملادیہ نے شادی کی - جسکے بطن سے راجندر پیدا ہوا - جو سنہ ۶ء میں کاونتگا کے لقب سے اپنے باپ کا جانشین ہوا - (صفحہ ۴۹ ملاحظہ ہو)

جانے کے پہلے جو لوگ متمنی تھے اُنکو بھی اپنے قافلہ میں شامل کر لیا ہے۔ یہ قافلہ دارالخلافت میں ذیقعد یا ذی الحجہ سنہ ۷۳۰ھ تک پہونچ گیا۔ اس بار اُس نے دکن کے پائے تخت بنانے کا خیال ترک کر دیا۔ دکن کا انتظام اپنے امرائے نامدار کے سپرد کیا۔ اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہ تھی کیونکہ تلنگانہ کا علاقہ (ورنگل کے علاوہ) اودر دیو کے پاس تھا اور کرناٹک بلال دیو کے پاس۔ تلنگانہ اور کرناٹک کا خراج ورنگل کے حاکم کے ذریعہ سے خزانہ عامرہ میں جمع ہوتا تھا۔ کنپلا اور دھوار سمدر کا علاقہ بھی ایک نومسلم راجہ کے سپرد تھا۔ جو ردر دیو کا عزیز بھی ہوتا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً یہ تمام علاقہ غیر مسلم باج گزار راجہ کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ بہر حال سلطان محمد تغلق نے ملک میں امن اور انتظامات قائم رکھنے کے لئے وہ سب کچھ کیا۔ جو وہ اس محدود صدی میں کر سکتا تھا اور بظاہر اس وسیع سلطنت میں کسی جدید فتنہ یا فساد کا اس وقت خیال باقی نہ رہ گیا تھا۔

(باقی آئندہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸) چار سال کے بعد چولا کی حکومت پر قابض ہو کر اپنا پایہ تخت منجورسے کانجی میں تبدیل کیا۔ اس طرح چولا سلطنت چلوکیا میں مدغم ہو گی۔

دوسری حکومت پانڈیا کی تھی کارکوئی ان کا دارالسلطنت تھا۔ بہت عرصہ تک مدورا کو مستقر بنایا گیا۔ حضرت مسیح سے مدتوں قبل اس خاندان کی بنیاد پڑی تھی۔ ان دونوں سلطنتوں کے ساتھ قدیم رومیوں کے تعلقات قائم تھے اور ان کے تجارتی جہاز ایشیائے کوچک سے نکل کر ساحل مصبر پر لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ مصبر کا سب سے بڑا اور پررونق بندرگاہ کادریدنم تھا جو اب معدوم ہو گیا ہے۔ چنانچہ رائل ایشاٹک سوسائٹی کے جرنل میں ایک مستشرق مسٹر آر سوئل نے لکھا ہے کہ "رومیوں نے مدورا میں اپنا سکہ بھی مضروب کیا تھا۔ اور رومیوں نے یہاں نوآبادی قائم کر لی تھی"۔

"آپ بیتی"

(از - بیگم ع - م - صاحبہ)

ایک طرف تو "ادب" کے ایڈیٹر صاحب چاہتے ہیں کہ خواتین "اُنھیں" آپ بیتی لکھ کر بھیجیں، دوسری جانب "اُن کا" اصرار ہے کہ تم ہی بسم اللہ کرو - میں سوچتی ہوں لکھوں تو کیونکر لکھوں اور کیا لکھوں - آج تک پرائے مرد کے پاس ایک پرزہ تک نہیں لکھا، پورا مضمون کیسے لکھ کر بھیجوں - قلم رکا جاتا ہے - ہاتھ کانپتا ہے، دل بلیوں اُچھلتا ہے - آنچل سے بار بار منہ کا پسینہ پونچھتی ہوں لیکن "وہ" میز پر جھکے ہیں، سختی سے حکم ہے "ہاں ہاں لکھے جاؤ - لکھے جاؤ - ابھی یہ کیفیت جاتی رہیگی - اچھا صاحب، لیجیے - آپ ہی کا کہا سہی - میں اپنی ہی کہانی لکھتی ہوں - سرتاج کا حکم ماننے میں شاید دوسری بہنوں کی بھلائی کی صورت نکل آئے -

میں چودہ برس سے کچھ کم ہی کی تھی کہ ابا جان نے اماں جان سے صلاح لی - آپس میں چپکے چپکے باتیں کیں اور ایک دوسرے کو مبارکباد دے کر اُٹھ گئے - مجھے کیا معلوم کیا سرگوشیاں ہو رہی ہیں - میں کھٹکی اُس وقت جب ابا جان کو دیکھ کر میں اُدھر گئی اور ستارہ نے مسکرا کر راہ میں روک لیا "بٹیا اُدھر نہ جاؤ، بی بی نے منع کیا ہے" - یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں ابا جان کے پاس جانے سے روکی گئی - لیکن اسے کیا جانتی تھی کہ وہ میری زندگی کا اہم ترین موقع تھا - اور اسی میں میرے "فروخت" کے متعلق سارے معاملات طے پا گئے -

"فروخت" کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا، مجھے میرے بھائی معاف کریں گے - اُنھوں نے ہماری کمزور صنف پر اتنے دنوں سے حکومت کر رکھی ہے کہ اب وہ ہمیں بالکل اسباب منقولہ میں سے سمجھنے لگے ہیں - جب ان کا جی چاہا ہمیں اُنھوں نے کچھ ہزار یا کچھ سو روپوں پر ایک غیر شخص کے سپرد کر دیا - اس میں نہ ہماری صلاح و مشورے کی ضرورت ہے اور نہ ہم سے پوچھنے گچھنے کی - بالکل اس طرح جیسے گھر کی پلی ہوئی گائے بکری ہم کسی دوسرے کو سپرد کر دیتے ہیں اور اپنی جگہ غیر کو اُس کا

مالک بنا دیتے ہیں۔ نہ ہم اُن جانوروں سے پوچھتے اور نہ ہمارے بزرگ ہم عورتوں سے پوچھتے ہیں

ہاں تو میں اس وقت اماں جان کے پاس نہ جا سکی۔ تھوڑی دیر بعد تین سہیلیوں میں سے ایک نے چھیڑنا شروع کر دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ شادی بیاہ کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس نے مذاق شروع کر دیا۔ کہ میں اپنی نسبت کی باتیں سننے جا رہی تھی۔ مجھے بہت بُرا معلوم ہوا اور میں اُسے جی بھر کوسکے خفا خفا جا کے اپنے پلنگ پر لیٹ رہی۔ وہاں لیٹے لیٹے یہی سوچتی رہی کہ آخر لوگ شادی بیاہ کیوں کرتے ہیں۔ اپنی زندگی دوسرے کے ہاتھوں میں دے دینا کون سی اچھی بات ہو سکتی ہے۔ پھر نہ جانے شوہر بُرا ملے یا بھلا، اُس سے مزاج میل کھائے یا نہ کھائے۔ آخر اسکی ضرورت ہی کیا ہے۔

اُس دن تو میں یہ سب سوچتی رہی لیکن دو چار ہی دن میں گھر بھر میں چونکہ ہر وقت اسی شادی بیاہ ہی کا تذکرہ رہنے لگا اس لئے اس خیال سے مانوس ہونے لگی۔ میں نے دوسروں کی زبانی "اُن کی" طرح طرح کی تعریفیں بھی سنیں۔ بہت پڑھے لکھے ہیں۔ وکیل ہیں۔ صاحبوں کی طرح ہیٹ کوٹ، پتلون پہنتے ہیں۔ مگر حسین نہیں ہیں۔ اور سن بھی شادی کا گزر چکا ہے یعنی تیس کے قریب عمر ہے۔ میں یہ سنتے ہی کہ سن تیس کے قریب ہے دل میں دہل گئی تیس برس کا مردوا اللہ جانے کتنے لڑکوں کا باپ ہوگا اور میری یہ حالت کہ میں رات کو اگر سوتے میں جاگتی تو مجھے اتنا ڈر معلوم ہوتا کہ اماں جان کو ضرور جگا لیتی۔ یا اللہ کیسے نبھیگی!۔

میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھی کہ شادی کے دن آ گئے گھر میں عزیزوں اور برادری کی عورتیں آنے لگیں اور میں سب سے تاریک کوٹھری میں بند کر دی گئی۔ ناون نے اُبٹن ملنا شروع کر دیے اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں سوائے پلنگ پر پڑے رہنے کے اور کوئی کام نہ کروں۔ سوائے چند مخصوص آدمیوں کے کوئی عورت میری جھلک تک نہ دیکھنے پائے۔ میں اس حبس کی وجہ سے جیسے جیسے زرد پڑتی جاتی اور جیتی کمزور ہوتی جاتی اُتنی میری دیکھنے والی عورتیں خوش ہوتیں وہ کہتیں "دیکھو ماشاء اللہ کیسی نکھر رہی ہے۔ بیاہ کے دن بالکل موم کی گڑیا ہوگی۔ زرد زرد رنگ پر سوہا کپڑا کیسا کھلیگا!"

خدا خدا کر کے یہ میعاد قید بھی ختم ہوئی اور وہ شب آ ہی گئی جسکے لئے یہ سب انتظامات ہوئے تھے۔

..... جب میں نے سیکڑوں قسموں کے بعد آنکھیں کھولیں اور اُنکی صورت دیکھی تو میں اُنکا چہرہ دیکھتے ہی ڈر گئی۔ اس لئے نہیں کہ وہ بہت بدصورت ہیں یا اُنکا چہرہ خونخواروں کا سا ہے بلکہ محض اس لئے

کہ ان کے چہرے پر حد درجہ متانت تھی اور سنوں کے تفاوت کی وجہ سے مجھے بہت بزرگ معلوم ہوتے تھے۔ میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ میری صورت سے خوش ہیں۔ لیکن میرے دل میں اُسی وقت سے یہ یقین سا ہو گیا کہ وہ میری سیرت سے خوش نہ ہو سکینگے۔

میرا خیال بالکل صحیح نکلا۔ تھوڑی دیر بعد جو اُنھوں نے مجھ سے جو باتیں کرنا شروع کیں، میں ان کا سر سمجھ سکی نہ پاؤں۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ کچھ زن و شوکے تعلقات اور اُنکے جداگانہ حقوق کے متعلق سمجھا رہے تھے۔ لیکن الفاظ اس طرح کے استعمال کرتے تھے جو اُس وقت میری سمجھ سے باہر تھے۔ میں لگے ہاتھوں یہ بھی کیوں نہ بتاتی چلوں کہ میں اس وقت جاہل محض تھی۔ میں نے صرف بغدادی قاعدہ پڑھا تھا۔ جب ابا جان اسکول بھیجنے کے لئے تیار ہوے تھے تو برادری کی عورتوں نے اتنے آوازے کسے تھے کہ وہ ہچکچا کر رہ گئے۔ اور میں بھی اپنے محلہ اور برادری کی اور لڑکیوں کی طرح جہالت کو جو کہ شرافت کی مخصوص شان ہو گئی ہے کلیجہ سے لگائے بیٹھی رہی۔

مجھے تو اب اس زمانہ کے واقعات بہت کم یاد ہیں، اور خدا زندہ رکھے اچھے اور ذہن کو، بھلا وہ کب یاد رکھنے دیتے ہیں لیکن "وہ" اب تک کبھی کبھی اُس وقت کے انداز تکلم یا میرے مخصوص لب و لہجہ کی نقل کر کے خود بھی ہنستے ہیں اور مجھے بھی ہنساتے ہیں۔ اُن واقعات میں سے ایک اپنی بہنوں کے لئے لکھتی ہوں۔

شادی کے کوئی دو ہفتہ بعد میں ایک دن بیٹھی تھی کہ کچھ ہاتھیوں کا ذکر ہوا میں نے اس سلسلہ میں ہاتھی کا لفظ مونث استعمال کیا "وہ" ہنس پڑے۔ پھر دیر تک متانت سے مجھے مذکر و مونث سمجھاتے رہے۔ لیکن میں بس اتنا سمجھ سکی کہ مذکر مرد ہوتا ہے اور مونث عورت۔ دوسرے دن جب "وہ" باہر سے آئے۔ تو میں تکیے کا غلاف سی رہی تھی۔ اُنھوں نے پوچھا "یہ کس کے لئے غلاف تیار ہو رہا ہے"۔ میں نے نہایت سادگی سے جواب دیا "آپ کی تکیہ کے لئے!" وہ زور سے ہنس پڑے میں نے استعجاب سے پوچھا "آخر اس میں ہنسی کی کون سی بات ہے؟" اُنھوں نے کہا "تکیہ مذکر ہے" میں بیساختہ بول اُٹھی "اوئی یہ بھی مرد ہے!" وہ آج تک "اوئی یہ بھی مرد ہے!" کی نقل کرتے ہیں۔ اور مجھے اب بھی اپنی جہالت پر جھینپ جانا پڑتا ہے۔ لیکن اُسی دن جب "وہ" اچھی طرح ہنس چکے تو اُنھوں نے مجھ سے ایسی بات کہ دی جو میرے دل پر نگینہ کی طرح جم گئی۔

اُنھوں نے کہا "اگر تمھیں میرے سامنے آدمی کی محبت حاصل کرنا ہے اور یہ چاہتی ہو کہ میں تمھیں سچے طور پر شریک زندگی بنا سکوں تو تمھیں چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے پڑھو۔ آج کل کے زمانہ میں کوئی عورت کسی پڑھے لکھے مرد کے ساتھ اس وقت تک محبّت و خوشی کی زندگی نہیں بسر کر سکتی جب تک کہ وہ اسی طرح پڑھی لکھی نہ ہو۔ ورنہ وہ مرد بجائے اسکے کہ اپنے فرصت کے اوقات بیوی کے پاس گزارے، یار دوستوں یا اوباشیوں کے ساتھ صرف کریگا۔ غذائے جسمانی کی مقررہ اوقات پر ضرورت ہوتی ہے لیکن غذائے روحانی کی حاجت ہر وقت رہتی ہے، تم ابھی تک میرے لئے جسمانی لذات کا مجموعہ ہو روحانی مسرتوں کا سامان نہیں ۔ میرا دل تمھاری طرف نہیں کھینچتا، میری روح کو تم سے لذّت نہیں ملتی۔ میں تمھارے ساتھ گھر میں ہوں لیکن پھر بھی تنہا ہوں میں کس سے باتیں کروں اور کس سے دل بہلاؤں۔ تم نہ میرے خیالات سمجھ سکتی ہو اور نہ میرے فقرے۔ خدارا پڑھو اور جلد سے جلد پڑھو!

میرے دل پر ان کی بات تیر کی طرح لگی۔ میں نے اُسی روز سے دن رات پڑھنا شروع کیا .... اور اب پانچ برس سے یہ حالت ہے کہ وہ کچہری اور موکلوں سے جتنا وقت فرصت کا پاتے ہیں میرے ہی پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ بلکہ یہ حالت ہو گئی ہے کہ لوگ انھیں "زن مرید" کہتے ہیں۔ پھر بھی وہ ہنستے ہیں اور کسی کی سماعت نہیں کرتے! ۔

کامیاب محبت کا گیت

(مشہور روسی فسانہ نویس ٹرجینیو کا ترجمہ)

(گزشتہ سے پیوستہ)

(از نقوی صفی پوری بی اے - علیگ)

(۶)

مزیو کے واپس ہونے سے چند ہفتہ قبل فیبو نے اپنی بیوی کی تصویر بنانا شروع کی تھی جسمیں وہ سینٹ سسلیا (فرقہ عیسائیہ کی ایک خدا رسیدہ عورت جس نے سب سے پہلے آلہ موسیقی ایجاد کیا) کی شباہت پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ہنر میں کافی ترقی حاصل کرلی تھی مشہور لیونارڈو ڈی وینس (اٹلی کا مشہور مصور) کا شاگرد اسکے پاس فرارہ میں آتا تھا اور اپنے استاد معظم کے اصول مصوری سے اسکو باخبر کرتا رہتا تھا، تصویر قریب قریب طیار ہو چکی تھی صرف چہرے میں کہیں کہیں رنگ آمیزی کی ضرورت رہ گئی تھی جسکے بعد فیبو اپنی بنائی ہوئی تصویر پر بجا طور سے ناز کرسکتا تھا۔ مزیو کے جانے کے بعد وہ اپنی کارگاہ میں گیا جہاں ولیریا اسکا انتظار کیا کرتی تھی مگر آج اسکو خلاف معمول نہ پاکر فیبو کو تشویش ہوئی۔ ادھر اُدھر اُس نے اُسکو تلاش کیا جب وہ نہ ملی تو وہ باغ پہونچا اور وہاں ایک سنسان جگہ پر ولیریا کو بیٹھا ہوا پایا۔ سر اُسکا سینے کی طرف جھکا ہوا تھا، ہاتھ گھٹنوں پر تھے۔ اپنے شوہر کے آجانے پر اُسکو کچھ اطمینان سا ہوگیا اور اُسکے گھبرائے ہوئے سوال کے جواب میں کہا "کوئی خاص بات نہیں خفیف سا درد سر ہے جلدی میں جاتی ہوں"۔ وہ کارگاہ میں گئے فیبو نے قلم ہاتھ میں لے لیا اور کام شروع کردیا لیکن تھوڑی دیر بعد اُسکو تصویر کے حسب دلخواہ اختتام سے عاجزی کا احساس ہوا۔ اِس سبب سے نہیں کہ ولیریا کا چہرہ زرد تھا اور اُسکے چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں تھے بلکہ وہ عصمت اور پاکبازی کا نشان جسکو وہ بہت زیادہ پسند کرتا تھا اور جس نے ولیریا کی تصویر بنانے میں

سینٹ سیسیلیا کا خیال اسکے دماغ میں پیدا کر دیا تھا اس دن ویلیریا کے چہرہ سے مفقود تھا۔ آخرکار اُسنے قلم رکھ دیا اور بیوی سے کہا "اس وقت میری طبیعت موزوں نہیں ہے جاؤ تم آرام کرو"۔ ویلیریا "ہاں میرے سر میں بھی درد ہے"۔ کہکر خوابگاہ میں جاکر لیٹ رہی فیبو اپنی کارگاہ میں بیٹھا رہا عجیب عجیب احساسات اُسکے دل میں پیدا ہوے جبسے اُسنے اتنی گرمجوشی سے بلایا تھا۔ اب اسکا قیام اُسکے لئے تکلیف دہ تھا۔ ویلیریا کی وجہ سے اسکو کسی کی رقابت کا کیا خوف ہو سکتا تھا۔ مزیو کا قیام اُسے باعث تکلیف اس لئے تھا کہ وہ اپنے دوست میں پہلی سی محبت نہ پاتا تھا۔ مزیو جو کچھ دور دراز ملکوں سے لایا تھا وہ سب تعجب خیز نادر الوجود اور نیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب اسکے گوشت و پوست میں سرایت کر گیا ہے۔ جادو کے کھیل، گیت، تعجب انگیز شرابیں، گونگا ملایا، حتیٰ کہ مصالحہ کی خوشبوئیں جن میں مزیو ہر وقت بسا رہتا تھا۔ اسکے بال، اسکی سانس ان سب نے فیبو میں ایک کیفیت پیدا کر دی تھی جو بہت زیادہ نا اعتمادی سے ملتی تھی یا شاید بزدلی سے۔ میز پر بیٹھا ہوا ملایا کیوں اسکو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا تھا یقیناً ہر شخص کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ وہ اٹلی کی زبان سمجھتا تھا۔ مزیو نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ ملایا نے اسی زبان کھونے میں ایک بہت بڑی قربانی کی اور اُسکے عوض میں وہ ایک بڑی طاقت کا مالک تھا یہ طاقت کس قسم کی تھی اور زبان کیونکر حاصل ہوئی۔ یہ بات بہت ہی محیر العقول تھی فیبو اپنی بیوی کے کمرہ میں گیا وہ بستر پر پڑی تھی لیکن ابھی سوئی نہ تھی، پیروں کی آہٹ سن کر وہ متحیر ہوئی مگر پھر اُسکو دیکھ کر وہ ویسی ہی خوش نظر آئی جیسی کہ باغ میں۔ فیبو بستر کے قریب بیٹھ گیا۔ ویلیریا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا "کیوں وہ عجیب و غریب خواب کیا تھا جس سے تم گزشتہ رات کو اتنی خوف زدہ ہو گئی تھیں؟ وہ مزیو کا ایسا خواب تو نہیں تھا"۔ ویلیریا نے جلدی سے کہا "ارے نہیں نہیں میں نے دیکھا .... ایک قسم کا درندہ مجھے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی کوشش کرتا تھا"۔ فیبو نے پوچھا "کیسا درندہ؟ انسان کی شکل کا"۔ "نہیں ایک جانور ..... ایک جانور ......"۔ ویلیریا نے گھبرا کے جواب دیا۔ ویلیریا نے کروٹ لے لی اور تمتماتے ہوے چہرہ کو تکیوں میں چھپا لیا۔ فیبو کچھ دیر تک اپنی بیوی کا ہاتھ تھامے رہا اور آہستہ سے اپنے لبوں تک لے گیا اور پھر اُٹھ کر چلا گیا۔ ان دونوں نے یہ دن نہایت مردہ دلی سے گزارا۔ کوئی نحوست ان کے سروں پر منڈلاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ یک جا ہونا چاہتے تھے گویا کہ انھیں کسی خطرہ کا ڈر ہے۔ لیکن حیران تھے کہ ایک دوسرے سے کہیں تو کیا کہیں۔ فیبو نے پہلے تصویر اُٹھانی کی

کوشش کی۔ پھر اریوٹ سٹو (اٹلی کا شاعر) کی تصنیفات سے دل بہلانے کی کوشش کی لیکن سب بے سود۔ اضطراب میں کوئی کمی نہ ہوئی۔.........

رات میں کھانے کے وقت مزیو واپس ہوا۔

(۷)

مزیو مطمئن تھا، خوش تھا، وہ فیبو سے اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد اُسنے ولیریا کو شیرازی شراب پیش کی۔ اور اُسکے انکار پر اُس نے یہ محسوس کیا کہ گویا اب شراب کی یقینی ضرورت نہیں ہے۔ فیبو مع اپنی بیوی کے خوابگاہ میں داخل ہوا اور فوراً سو گیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد اُسکی آنکھ کھلی۔ شریک بستر کو پہلو میں نہ پاکر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ دیکھا کہ اسکی بیوی شب خوابی کے لباس میں باغ کی جانب کے کمرے میں واپس آرہی ہے۔ ماہتاب اپنی پوری شان سے ضوفگن تھا۔ گو ذرا دیر پہلے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ولیریا کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرے سے حیرت اور خوف کے آثار نمایاں تھے۔ وہ ہاتھوں سے ٹٹولتی ہوئی پلنگ کی طرف بڑھی اور چپ چاپ لیٹ گئی۔ فیبو اس سے مخاطب ہوا لیکن اُس نے کچھ جواب نہ دیا گویا کہ وہ سو رہی تھی۔ فیبو کو ولیریا کے جسم پر ہاتھ رکھنے سے معلوم ہوا کہ اُسکے کپڑے اور بال پانی کے قطروں سے نم تھے اور اُسکے پاؤں خاک آلود تھے۔ تب وہ اُٹھا اور دروازے سے نکل کر باغ کی سمت دوڑا گیا۔ چاند کی شفاف روشنی ہر شے کو اپنے دامن میں لپیٹے ہوئے تھی۔ فیبو نے دیکھا تو روش پر دو شخصوں کے قدم کے نشان ملے۔ ایک ننگے پیر تھا اور یہ نشانات چنبیلی کی ایک جھاڑی تک جو مکان اور خیمہ کے ایک جانب تھی پائے جاتے تھے۔ وہ ابھی متحیر کھڑا ہی تھا کہ یکایک اُس گیت کی آواز جسکو اُس نے گزشتہ رات مزیو سے سنا تھا اُسکے گوش زد ہوئی۔ فیبو کے جسم میں ایک تھرتھری پیدا ہوگئی اور وہ دوڑ کر خیمہ کی سمت چلا.............. مزیو وسط میں کھڑا باجا بجا رہا تھا۔ فیبو اس پر جھپٹا "کیا تم باغ گئے ہوے تھے۔ تمھارے کپڑے نم ہیں۔" "نہیں ..... میں نہیں جانتا .... میرا خیال ہے ...... میں کہیں باہر نہیں گیا......" مزیو نے آہستہ سے جواب دیا گویا وہ فیبو کے داخلے اور اُسکی گھبراہٹ پر متحیر تھا۔ فیبو نے اسکا ہاتھ پکڑا "اور کیوں تم پھر اس راگ کو گا رہے ہو؟ کیا تم نے پھر کوئی ویسا ہی خواب دیکھا ہے۔" مزیو نے اپنی تحیر سے بھری ہوئی آنکھوں سے فیبو کو دیکھا اور کچھ نہ کہا۔ "جواب دو۔"

اوجِ فلک پر ماہِ منور مثلِ سپر ہے آویزاں
دریائے درخشاں سانپ کی صورت لہریں لیتا چمکے رواں
دشمن گہری نیند میں ہے اور دوست یہ ہے یہ رات گراں
بہرِ مدد! ایک چھوٹی چڑیا باز کے پنجے میں ہے طپاں

مزلیو کی زبان نے اسکا اعادہ کیا اور کچھ بڑبڑایا گویا کہ وہ سرسامی حالت میں تھا فیبو دو قدم پیچھے ہٹا۔ غریب پر اُسکی آنکھیں گڑی ہوئی تھیں۔ ایک لمحہ کے توقف کے بعد مکان کا رُخ کیا اور خوابگاہ میں چلا گیا۔ ولیریا کا سر جھکا ہوا تھا اسکے ہاتھ بے جان پڑے تھے اور وہ گہری نیند میں تھی، فیبو اُسکو فوراً جگا نہ سکا۔ کچھ دیر کے بعد جب ولیریا ہوشیار ہوئی تو اُس نے اپنے شوہر کے گلے میں باہیں ڈال دیں رو رو کے چمٹ گئی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ "کیا بات ہے میری جان۔ یہ کیا ہے؟" فیبو بار بار پوچھتا رہا اور اُسکو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ اب بھی اسکے سینے سے چمٹی ہوئی تھی۔ "آہ کیا پریشان خواب میں نے دیکھا" اُس نے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ فیبو نے کچھ اور پوچھا ہوتا لیکن وہ صرف کانپتی ہی رہی۔ کھڑکیوں کی سلاخیں نکلتے ہوئے آفتاب کی کرنوں سے سرخی مائل ہو گئیں۔ تب وہ آخرکار اسکے آغوش میں سو گئی۔

۸

دوسرے دن مزلیو صبح ہی سے غائب تھا۔ ولیریا نے اپنے شوہر سے ایک قریب کی خانقاہ میں جانے کی خواہش ظاہر کی جہاں اُسکا مذہبی باپ ایک ضعیف اور مقدس پادری رہتا تھا اور جسکی وہ معتقد تھی۔ فیبو کی بازپرس پر اُس نے کہا کہ وہ اپنی روح کو جو گزشتہ چند دنوں کے عجیب عجیب خیالات سے پریشان تھی اقرار کر کے تسکین دینا چاہتی ہے۔ الغرض ولیریا چار سہیلیوں کے ساتھ خانقاہ میں روانہ ہوئی۔ فیبو کا دل غم و غصہ سے بھرا ہوا تھا وہ اسی فکر میں ڈوبا ہوا کہ ولیریا کو کیا ہو گیا ہے باغ میں ٹہلتا رہا، کئی بار وہ خیمہ تک گیا لیکن مزلیو واپس نہ ہوا تھا۔ ملایا البتہ موجود تھا۔ اسے آتے ہوئے دیکھ کر وہ ہر مرتبہ ادب سے سر جھکا لیتا اور مسکرا کر بت کی طرح اسکی طرف گھورنے لگتا تھا۔

اسی اثناء میں خوف زدہ ولیریا نے بلا کسی شرم کے اقرار کے وقت ہر بات اپنے پیر و مرشد سے

کہ دی۔ پادری نے نہایت غور سے اسکو سُنا۔ اپنی دعائیں اُسکو دیں۔ اس گناہ سے جسکو اُس نے خوشی سے نہ کیا تھا اُسے پاک کیا لیکن اُس نے خود یہ سوچا وہ جادو۔ شیطانوں کا ہنر..... معاملہ یوں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا" اور ولیریا کے ہمراہ وہ اسکو دوبارہ مطمئن کرنے کے خیال سے محل تک آیا۔ پادری کو دیکھ کر فیبو کچھ متفکر سا ہو گیا لیکن تجربہ کار ضعیف آدمی نے یہ پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اُس سے کس طرح سے پیش آنا چاہیے۔ جب وہ فیبو کے ساتھ تنہائی میں تھا تو اُس نے ولیریا کے رازوں کا انکشاف نہیں کیا لیکن اپنے مہمان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیا کیونکہ اُسکے قصص راگ اور اُسکے سارے برتاؤ نے ولیریا کی قوت متخیلہ پر قابو پا لیا تھا۔ علاوہ بریں سے معلوم تھا کہ فریوا گلے دنوں میں بھی اپنے مذہب میں راسخ الاعتقاد نہ تھا اور ایک مدت تک ایسے ملکوں میں رہنے کے بعد جو مذہب عیسائیت کی روشنی سے منور نہ تھے۔ ممکن ہے کہ جادو کے ہنر سے وابستگی پیدا کر لی ہو۔ حالانکہ قدیم دوستی کا خیال لازم ہے۔ تاہم دور اندیشی علیحدگی کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ فیبو نے پادری کی رائے سے اتفاق کیا۔ جب فیبو نے پادری کی نصیحت ولیریا سے بیان کی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اور قادر لا زرد ان دونوں کے دلی شکریہ کے علاوہ غریبوں اور خانقاہ کے لئے بہت سے تحفہ تحائف لیکر واپس ہوا۔ فیبو نے ارادہ کیا کہ رات کے کھانے کے بعد فریو سے گفتگو کرے لیکن اُس کا نزالا مہمان کھانے پر نہ آیا۔ تب فیبو نے فریو سے دوسرے دن گفتگو کرنے کو طے کیا اور دونوں میاں بیوی آرامگاہ میں چلے گئے۔

۹

ولیریا لیٹتے ہی سو گئی لیکن فیبو کو نیند نہ آئی۔ رات کی تاریکی میں اُسکو ہر شے زندہ نظر آئی۔ بہت سے سوالات اُس نے اپنے دل سے کئے لیکن کوئی معقول بات اسکی سمجھ میں نہ آئی۔ "کیا واقعی فریو ساحر ہو گیا ہے؟۔ ولیریا پر اُس نے کوئی سحر تو نہیں کیا؟ وہ بیمار ہے..... لیکن اسکی بیماری ہے کیا؟" اسکا سر اُسکے ہاتھوں میں تھا۔ سانس رُکی ہوئی تھی اور تکلیف دہ خیالات میں محو لیٹا تھا۔ چاند پھر آسمان پر بلند ہوا اور شعاعیں کھڑکیوں کی سلاخوں سے چھن چھن کر آنے لگیں کہ یکایک خیمہ کی جانب سے ایک پر نور اور خوشبودار رد آنا شروع ہوئی۔ کیا یہ فیبو کے خواب کی ابتدا تھی؟...... تب ایک زرد زرد ار بھنبھناہٹ سنائی دی......

...... اور اُس وقت اُس نے دیکھا کہ ولیریا کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ چونکی، پھر اُس نے دیکھا کہ ولیریا اُٹھی پہلے ایک پھر دوسرا پیر پلنگ سے اُتارا اس وقت اسکی آنکھیں مثل چاند کے شیدائی کے بے نور اور ساکن تھیں اسکے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور اُس نے پروانہ وار باغ کی طرف چلنا شروع کیا۔ فیبو فوراً کمرے کے دوسرے دروازے سے دوڑا اور محل کے کونے کی طرف سے آکر اس دروازہ کو بند کر دیا جو باغ سے ملحق تھا...... مشکل سے وہ دروازہ بند کر پایا تھا کہ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا کوئی شخص اندر سے دھکے دے کر دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہے......

اور تب ایک غمگین بکے آنے کی صدا سُنائی دی۔ پھر اس خیال کے آتے ہی کہ شاید مزیو شہر سے واپس آگیا ہے۔ وہ خیمہ کی طرف جھپٹا۔ کیا دیکھتا ہے کہ چاند کی پوری روشنی میں مزیو اسکی طرف چلا آ رہا ہے وہ بھی مانند ایک چاند کے شیدائی کے چل رہا تھا۔ اسکے ہاتھ کشادہ تھے۔ اسکی آنکھیں کھُلی تھیں۔ لیکن کچھ دیکھ نہ رہی تھیں...... فیبو اسکی طرف دوڑا لیکن وہ اسکی پرواہ نہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا گیا، اُسکے قدم بے اختیارانہ بڑھ رہے تھے۔ اسکے مطمئن چہرہ پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ فیبو نے اسکو نام لیکر پکارا ہوتا...... لیکن اُسی وقت اُسنے کھڑکی کے چرچرانے کی آواز سنی........

اُس نے مڑ کر دیکھا تو خواب گاہ کی کھڑکی کھُلی ہوئی تھی اور ولیریا دہلیز پر ایک پیر رکھے نظر آئی......

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسکے ہاتھ مزیو کے متلاشی تھے اور وہ مزیو تک پہونچنے کی کوشش کر رہی تھی......

فیبو کا دل غصہ سے بھر آیا "مردود ساحر" وہ ایک غضبناک آواز سے چلّایا، ایک ہاتھ مزیو کے گلے پر اور دوسرا قبضہ پر تھا۔ خنجر نکلا اور چشم زدن میں مزیو کے پہلو کے پار ہوگیا۔ مزیو کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ ایک ہاتھ زخم پر رکھے خیمہ کی طرف لڑکھڑاتا ہوا بھاگا...... ولیریا بھی اُسی وقت ایک چیخ کے ساتھ زمین پر گر پڑی۔ فیبو اسکی طرف دوڑا، اسکو اُٹھایا۔ پلنگ پر لے گیا۔ اور اُس سے باتیں کرنا شروع کیں۔ وہ ایک عرصہ تک بلاحس و حرکت پڑی رہی۔ آخرکار آنکھیں کھولیں۔ اُس شخص کی طرح جس نے موت کے پنجے سے نجات پائی ہو۔ ایک گھڑی اطمینان کی سانس رُک رُک کے لی، اپنے شوہر کو دیکھا باہیں اُسکے گلے میں ڈال کر لپٹ گئی۔ "تم۔ تم۔ یہ تم ہو" وہ چپ ہوگئی۔ آہستہ آہستہ اُسکے ہاتھ پیر ڈھیلے ہوئے۔ سر پیچھے ڈھلک گیا اور ایک کامیاب مسکراہٹ کے ساتھ اُسنے رُک رُک کر کہا "شکر خدا۔ یہ سب ختم ہوگیا۔ لیکن میں کس قدر تھکی ہوئی ہوں"۔ اور اس پر ایک ہلکی نیند طاری ہوگئی۔

۱۰

فیبو ولیریا کے پاس بیٹھ گیا۔ اسکی نظریں ولیریا کے کھلائے ہوئے زرد لیکن مطمئن چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیے۔ اگر اُس نے مزیو کا کام تمام کردیا تھا تو اُسے کیا صورتیں اختیار کرنی چاہیے تھیں۔ یہ راز پوشیدہ رہنے والا نہیں تھا۔ آرچی ڈیوک وزرجوں کے علم میں اس واقعہ کا آنا ضروری تھا........ لیکن اس اہم واقعہ کی تشریح وہ کیونکر کریگا۔ اُس نے اپنے پیارے دوست اور عزیز کو اپنے گھر میں قتل کرڈالا تھا۔ کیوں قتل کرڈالا تھا۔ اسکا اسکے پاس کیا جواب تھا........ یا اگر مزیو بچ گیا ہے تو......؟ فیبو اس حالت تذبذب میں زیادہ عرصہ تک رہنا گوارا نہ کرکے اور ولیریا کو سوتا چھوڑ کر خیمہ کی سمت چل دیا۔ خیمہ میں ہر شے پر خاموشی طاری تھی صرف ایک کھڑکی سے کچھ روشنی نظر آتی تھی۔ اسکا دل بیٹھا جاتا تھا۔ اُس نے باہری دروازہ کھولا۔ (جس پر اس وقت خون آلودہ اُنگلیوں کے نشان موجود تھے) ایک تاریک کمرے سے گزرا۔ دہلیز پر ٹھٹھک کر کھڑا ہوگیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وسط کمرے میں مزیو کا رچوبی گدّے پر سر رکھے ہوئے ایک ایرانی کمبل پر پڑا تھا۔ اسکے اعضا اکڑے ہوئے تھے۔ ایک لال شال جس پر سیاہ کام تھا اسکے جسم پر پڑی تھی۔ اسکا چہرہ موم کی طرح پیلا تھا نیلے حلقوں والی آنکھیں چھت کی طرف مُڑی ہوئی تھیں۔ سانس رُکی ہوئی معلوم ہوتی تھی گویا وہ مُردہ تھا۔ ملایا بھی ایک سرخ شال میں لپٹا ہوا اسکے سروں پر جھکا ہوا تھا اسکے بائیں ہاتھ میں ایک نامعلوم درخت کی ٹہنی تھی جسے وہ آہستہ سے آگے کی طرف جھکاتا اور پھر ہٹا لیتا تھا۔ اُسکی آنکھیں اُسکے مالک کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ ایک چھوٹی سی مشعل جسکی کونپلی تھی روشن تھی۔ صرف ایک روشنی کمرے میں تھی۔ اسکی لو نہ ٹمٹماتی تھی اور نہ اُس سے دھواں نکلتا تھا۔ ملایا نے فیبو کے داخلہ پر کوئی حرکت نہ کی صرف اُسکی آنکھیں ایک مرتبہ اسکی طرف پھریں اور پھر مزیو کی جانب مُڑ گئیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وقفے سے وہ ٹہنی کو اوپر نیچے ہوا میں حرکت دیتا تھا۔ اُسکے لبوں میں جنبش ہوتی تھی۔ زمین پر ملایا اور مزیو کے درمیان میں وہ خنجر پڑا تھا جس سے فیبو نے اپنے دوست کو زخمی کیا تھا۔ ملایا اسکے خون آلود قبضے کو شاخ سے مس کرتا تھا۔ ایک منٹ گزرا.... ایک منٹ اور۔ فیبو ملایا کے پاس گیا اور اُسکی طرف جھک کر آہستہ سے پوچھا "کیا وہ مرگیا ہے؟" ملایا نے اپنا سر نیچے جھکایا۔ اور داہنا ہاتھ شال سے نکال کر ایک تحکمانہ انداز سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

فیبو نے سوال کو دہرایا ہوتا لیکن حکمراں ہاتھ نے پھر وہی اشارہ کیا - اور فیبو غصہ اور تعجب کرتے ہوئے چپ چاپ باہر چلا گیا - اُس نے ولیریا کو جسکے چہرے پر پہلے کی طرح اطمینان کے علامات نمایاں تھے سوتا پایا - اُس نے کپڑے نہیں اُتارے اور کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا - اور اپنا سر ہاتھوں میں تھام کر پھر خیالات میں غرق ہو گیا - صبح کو طلوع ہونے والے آفتاب نے اسکو اسی جگہ پر سوتا پایا - ولیریا ابھی تک بیدار نہ ہوئی تھی -

۱۱

فیبو کا ارادہ تھا کہ ولیریا جاگ اُٹھے تو فرار کی طیاری کرے لیکن دفعتاً کسی نے خوابگاہ کے دروازے پر دستک دی - فیبو باہر گیا تو اپنے قدیم ملازم انٹانسو کو کھڑا پایا - انٹانسو نے کہا "جناب ملایا نے مجھے اطلاع دی ہے کہ فریو بیمار ہو گیا ہے اور مع اپنے ساز و سامان کے شہر جانا چاہتا ہے - اور وہ آپ کے ملازمین کی مدد سامان باندھنے میں طلب کرتا ہے - علاوہ بریں کھانے کے وقت سواری اور بار برداری کے گھوڑے بھی مانگتا ہے - آپ کا کیا حکم ہے؟" فیبو نے پوچھا "کیا یہ اطلاع ملایا نے دی ہے؟ کس طریقے سے؟ - وہ تو گونگا ہے - یہ وہ کاغذ ہے جس پر اُس نے ہماری زبان میں بالکل ٹھیک ٹھیک لکھا ہے" "اور فریو تم کہتے ہو بیمار ہے" "جی ہاں وہ بہت بیمار ہے اور کسی سے مل نہیں سکتا" "کیا کسی ڈاکٹر کو بلایا ہے؟" "جی نہیں ملایا نے منع کیا ہے" کچھ سکوت کے بعد فیبو نے کہا "اچھا جاؤ یہ سب انتظام کر دو" انٹانسو چلا گیا - فیبو کو سخت تعجب تھا "تو ابھی وہ مرا نہیں ہے" اس نے خیال کیا - وہ نہ جانتا تھا کہ آیا وہ خوش ہو یا رنجیدہ - مگر پھر اس نے کہا "میں خوش ہونگا، کیونکہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسکو مردہ دیکھا ہے" فیبو ولیریا کے پاس واپس گیا تو وہ جاگ اُٹھی اور اپنا سر اُٹھایا - دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا - ولیریا نے پوچھا "کیا وہ چلا گیا؟" فیبو نے سر ہلایا ولیریا نے پھر پوچھا "کیونکر؟ کیا تمھارا مطلب ہے...... کیا وہ چلا گیا؟" فیبو کے دل سے یہ کہتے وقت ایک بوجھ سا ہٹ گیا "ابھی نہیں لیکن آج ہی چلا جائیگا اور ہم پھر اسکی صورت نہیں دیکھیں گے کبھی نہیں دیکھینگے" ولیریا نے ایک اطمینان سے بھرپور سانس لیتے ہوئے کہا "ہرگز نہیں ہرگز نہیں"

ایک خوش کن اطمینان کی لہر اسکے چہرے پر دوڑ گئی اُس نے دونوں ہاتھ اپنے شوہر کی طرف

پھیلا دیے "ہم اب اس کا کبھی ذکر تک نہ کرینگے - میرے پیارے سنتے ہو اب میں اپنا کمرہ اس وقت تک نہ چھوڑونگی جب تک وہ چلا نہ جائے گا - ذرا میرے خدمتگاروں کو یہاں بھیج دو........ لیکن ٹھہرو - اس چیز کو لیتے جاؤ" اُس نے مزیو کے پیش کردہ موتیوں کے ہار کی طرف اشارہ کیا جو قریب ہی ایک چھوٹی میز پر پڑا ہوا تھا" اور اُسے فوراً ایک نہایت ہی عمیق کنویں میں پھنکوا دو - مجھے گلے لگا لو - میں تمھاری ولیریا ہوں - اور دیکھو اس وقت تک میرے پاس نہ آنا جب تک وہ چلا نہ جائے" فیبو نے ہار اُٹھا لیا اُس نے دیکھا کہ موتیوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا - باہر جاکر ہار کنویں میں پھنکوا دیا - گھومتا ہوا باغ میں پہونچا اور ذرا فاصلہ سے خیمہ کی طرف دیکھا، جہاں فریو کی روانگی کی طیاریاں بڑے زور و شور سے ہو رہی تھیں - نوکر صندوق لا لا کر گھوڑوں پر لاد رہے تھے - لیکن ملایا اسکے درمیان میں کہیں دکھلائی نہ دیتا تھا - ایک نہ رُکنے والے شوق نے فیبو کو مجبور کیا کہ وہ جاکر دیکھے کہ کمرے میں کیا ہو رہا ہے - اسے یاد آیا کہ پشت پر ایک پوشیدہ دروازہ ہے جسکے ذریعہ سے وہ اس کمرے میں جا سکتا ہے - جہاں اُس نے مزیو کو صبح پڑا پایا تھا وہ چپکے سے اس دروازے تک گیا اور مقفل نہ پاکر بھاری پردہ کو ہٹایا اور نظر بچا کر کمرے کے اندر دیکھنا شروع کیا -

۱۲

مزیو بجائے کمبل پر پڑے ہونے کے اب کپڑے پہنے گویا سفر کے لئے کرسی پر بیٹھا تھا لیکن پہلے کی طرح اب بھی مردہ معلوم ہوتا تھا - سر کرسی کی پشت سے لگا ہوا تھا - بے جان زرد اور خشک ہاتھ گھٹنوں پر پھیلے تھے - اسکے سینے میں حرکت نہ تھی - کرسی خشک جھاڑیوں سے گھری ہوئی تھی اور اسکے قریب چند کشادہ منہ کے برتن رکھے ہوے تھے - دم گھوٹنے والی مشک کی تیز خوشبو پھیل رہی تھی ہر برتن کے گرد ایک بھورے رنگ کا چھوٹا سا سانپ لپٹا ہوا تھا - آنکھیں ان سانپوں کی سنہری تھیں اور جورہ رہ کے چمکتی تھیں - دو قدم کے فاصلے پر دراز قد ملایا کھڑا مزیو کا چہرہ دیکھ رہا تھا وہ رنگ برنگی کار چوبی لباس میں ملبوس تھا - چیتے کی دم کمر میں لپٹی تھی نوک دار اونچی ٹوپی سر پر تھی - وہ ساکت نہ تھا - کبھی وہ مودبانہ جھکتا تھا گویا کہ وہ عبادت کر رہا ہے اور کبھی اپنی پوری لمبائی سے حتی کہ انگوٹھوں پر کھڑا ہو جاتا تھا - اور پھر ایک خاص انداز سے ہاتھوں کو مزیو کی جانب متواتر حرکت دیتا تھا وہ سانس زور زور سے لے رہا تھا - اور پسینے کے قطرے اسکی پیشانی پر نمایاں تھے - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے ان سب باتوں کے

کرنے میں بیحد تکلیف برداشت کرنا پڑی تھی۔ ملایا کے ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ مزیو کا سر کرسی سے
بلند ہوتا تھا اور پھر اپنی جگہ پر واپس چلا جاتا تھا۔ پیالوں میں ایک سیاہ رقیق شے جوش کھا کر ایک
سُریلی آواز پیدا کر رہی تھی۔ بھورے سانپ ہر پیالہ سے نہایت آزادی کے ساتھ لپٹ رہے تھے
اتنے میں ملایا آگے بڑھا۔ اسکے ابرو اوپر چڑھ گئے۔ آنکھیں کشادہ ہو گئیں۔ اور اُس نے مزیو کے سامنے
اپنا سر جھکا دیا...... اس وقت مزیو کی مردہ پلکوں میں جنبش ہوئی اور آنکھیں کھل گئیں لیکن پتلیاں
بالکل ساکن تھیں۔ ملایا کا چہرہ کامیابی کے غرور اور انتقام کی خوشی سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنا
مُنہ کھولا اور کوشش کر کے سینے سے ایک آواز نکالی۔ مزیو کے لبوں میں جنبش ہوئی اور اس غیر انسانی
آواز کے جواب میں ان سے ایک موہوم سی آواز پیدا ہوئی...... لیکن اب فیبو اس نظارہ کا
زیادہ متحمل نہ ہو سکا۔ اُس نے ایسا محسوس کیا گویا کہ وہ ایک شیطان گاہ میں کھڑا ہے۔ اُس نے ایک
چیخ ماری اور سیدھا گھر کی طرف بھاگا۔

۱۳

تین گھنٹے کے بعد انٹانسیو نے فیبو کو اطلاع دی کہ مزیو روانگی کے لئے طیار ہے۔ فیبو
ایسی جگہ پر آ کے کھڑا ہو گیا جہاں سے خیمہ نظر آتا تھا۔ چند باربرداری کے گھوڑے خیمہ کے سامنے لدے
کھڑے تھے۔ اور ایک سواری کا مضبوط گھوڑا جس پر دوہری کاٹھیاں کھچی ہوئی تھیں سیڑھیوں
کے پاس موجود تھا۔ نوکر برہنہ سر کھڑے تھے۔ اتنے میں خیمہ کا دروازہ کھلا۔ اور مزیو ملایا پر جو پھر
ایک بار اپنی پرانی معمولی پوشاک میں تھا۔ تکیہ کئے ہوئے باہر آیا۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی
لیکن اُس نے حرکت نہ کی...... ہاں ضرور حرکت کی۔ اور کاٹھی پر بیٹھا۔ سیدھا بیٹھا۔ لگام تلاش
کی اور اُسے پا لیا۔ ملایا بھی اُچک کر اُسکے پیچھے بیٹھ گیا۔ اور اپنا ہاتھ اُس کی کمر میں ڈال دیا۔ اور یہ
گروہ روانہ ہو گیا۔ لیکن جب مزیو کا گھوڑا کچھ فاصلے پر اسکے سامنے سے ہو کر گزرا تو فیبو کو مزیو کے
چہرے پر دو سفید نشان ایک لمحے کے لئے دکھلائی دیئے اور پھر غائب ہو گئے۔ شاید مزیو کی آنکھوں
نے اسے مڑ کر دیکھا تھا۔ ملایا نے پھر پہلے کی طرح فیبو کو طنزیہ سلام کیا۔

۱۴

رات کو کھانے کے وقت دلیریا کھانے کے کمرے میں آئی۔ گو وہ خاموش تھی لیکن محبت کا

مجسمہ بنی ہوئی تھی، اُس نے اب بھی تھکن کی شکایت کی تھی لیکن اب فکر و تردد کے نشانات اسکے چہرے سے غائب تھے اب وہ پہلے کی طرح گھبرائی ہوئی نظر نہ آتی تھی - وہ مطمئن اور خوش تھی - فریڈا کی رخصتی کے بعد فیبو پھر اسکی تصویر بنانے کے لئے بیٹھا - اس مرتبہ اسکو مایوسی نہیں ہوئی - ولیریا کا چہرہ پھر پارسائی اور معصومیت کا آئینہ تھا - رنگ آمیزی کا برش بے تکلف کاغذ پر رواں ہوگیا -

میاں بیوی کی زندگی پھر اپنی پرانی رفتار پر آگئی - فریڈا ایسا غائب ہوا گویا کہ اس کا وجود ہی نہ تھا - فریڈا کی قسمت سب کے لئے ایک راز تھی - فیبو اور ولیریا کے درمیان میں یہ معاہدہ تھا کہ کبھی بھولے سے بھی فریڈا کا نام ان کی زبان پر نہ آئے گا اور نہ ان کو فریڈا کی آیندہ زندگی سے کچھ سروکار ہوگا - ایک دن فیبو نے اسے اپنا فرض سمجھ کر ارادہ کیا کہ وہ اس خوفناک رات کا واقعہ ولیریا سے بیان کردے لیکن غالباً ولیریا نے اس کو اس ارادے سے باز رکھا - کیونکہ جب فیبو نے قصہ شروع کیا تو ولیریا فوراً چپ ہوگئی - سانس رک رک کر آنے لگی - آنکھیں نصف بند کرلیں - اسکے بشرے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ ایک ضرب شدید کے منتظر تھے فیبو یہ دیکھ کر چپ ہوگیا اور ولیریا کا دل دکھانے سے باز رہا -

موسم خزاں کی ایک خوشگوار صبح کو جب کہ فیبو تصویر کی تکمیل میں مصروف تھا اور ولیریا باجا لئے ہوئے بیٹھی تھی دفعتاً اسکی انگلیاں بلا ارادہ باجے کے تاروں پر متحرک ہوگئیں اور یک بیک فضا "کامیاب محبت کے گیت" سے (جو فریڈا گایا کرتا تھا) معمور ہوگئی اور اسی وقت ولیریا کو شادی کے بعد پہلی مرتبہ اسکے بطن میں ایک نئی زندگی کی حرکت کا احساس ہوا - ولیریا چونکی، ٹھہری - اسکے کیا معنی ہوسکتے ہیں؟ یہ کیا؟ .... آہ!"

غزلیات

جناب بیخود موہانی

معجزہ صورِ قیامت سے دکھایا نہ گیا
آج بھی طالعِ خوابیدہ جگایا نہ گیا

ہاتھ ملتے رہے خود آگ لگانے والے
کچھ جلا خانۂ دل یوں کہ بجھایا نہ گیا

ذوقِ تردامنیِ دل کی جو مستی ہو یہی
دیکھ لینا میں جہنم سے جلایا نہ گیا

میرے تم ناز اُٹھاتے ہو کہ اپنے دل کے
مجھ سے ظالم کا یہ الزام اُٹھایا نہ گیا

آہ بجھ بجھ کے جلے رُو ستاروں کے چراغ
اک نہ تجھے دل کا کنول تھا کہ جلایا نہ گیا

کیسے کونین ہے دل کو خبرِ خلوتِ ناز
اور ظالم کبھی گھر سے کہیں آیا نہ گیا

ذرے ذرے سے سنا کرتے ہیں روداد اپنی
رازِ دل تا بزباں گو کبھی لایا نہ گیا

لن ترانی کے ترانے ارنی سے بدلے
شبِ معراج وہی ناز دکھایا نہ گیا

میں محبت کو مٹاتا مری ہستی کیا تھی
آپ نقاش سے یہ نقش مٹایا نہ گیا

اللہ اللہ تری حرمت تری رفعت اے عشق
آبِ رحمت سے ترا شعلہ بجھایا نہ گیا

عشق نے اُن سے زمانے کے ستم اُٹھوائے
جن سے اپنا ہی کبھی ناز اُٹھایا نہ گیا

موت کی نیند سے دنیا کو جگایا اے حشر
میری سوتی ہوئی قسمت کو جگایا نہ گیا

محفلِ دہر سے آپ اُٹھ گئے غیرت والے
کون مہماں تھا جو آخر کو اُٹھایا نہ گیا

جب سے جانا کہ یہ سب جلوہ گری تیری ہے
ایک ذرے کو بھی نظروں سے گرایا نہ گیا

حشر کیا قبل ازل بعد ازل بعد ابد
تیرے بیخود سے کبھی آپ میں آیا نہ گیا

جناب آرزو لکھنوی

آج رو دیتے ہیں ہم، چھیڑ کے کل ہنستے تھے
کیسی بستی وہ سہانی تھی جہاں بستے تھے

کیا کیا تم نے کہ چھوٹا وہ چلن مت پلٹی
آگے آنے لگے جو بھولے ہوئے رستے تھے

چاہ میں جی نہ الجھتا نہ سمجھ میں آتا
اسی کستی ہوئی پھانسی میں گلے پھنستے تھے

ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں میں جھکائے ہوئے کیوں
وہ چمکتے ہوئے تارے کہ بہت ہنستے تھے

جاگنا ہی تھا نہ سونا، نہ یہ دن تھا نہ یہ رات
وہ بھی کیا دیس تھا ہم جس میں کبھی بستے تھے

آسرے بڑھتے تھے رونے سے ترس آنے کے
بھیگ جاتے تھے یہ بندھن تو بہت کستے تھے

ہم پہونچے تری چوکھٹ پہ سویرے کیونکر
کئی چکر تھے کئی پھیر کئی رستے تھے

دھوکا دے ہی گئے نا، جھوٹی لگاوٹ والے
کیا بندھے بیٹھے ہیں اب جو نہ کبھی پھنستے تھے

جس میں جی ڈوب گیا، پھوٹ رہی تھی یہی چاہ
آنسو آنکھوں میں بھر آتے تھے جہاں ہنستے تھے

پانی پتھر کو کرے آرزو آنسو وہ کہاں
مہنگے ہونے پہ بھی موتی تو بہت سستے تھے

جناب اختر تلہری

ہمتِ دل پہ وفاداروں کو نازاں دیکھ کر
ہنس دیے وہ جانبِ شمشیر عریاں دیکھ کر

عالمِ ارواح میں آجائے اک تازہ حیات
مسکرا دو تم اگر گورِ غریباں دیکھ کر

ہے بلند و پست بیحد راہ ناہموار عشق
دیکھ کر اے رہروانِ کوئے جاناں دیکھ کر

اب وہ سمجھے ہیں کہ اُن کی غفلتوں نے کیا کیا
منفعل ہیں چہرۂ بیمارِ ہجراں دیکھ کر

منزلِ مقصود کے آثار تھے پیشِ نظر
کیوں نہ دل مسرور ہوتا بابِ زنداں دیکھ کر

منحصر ہے لذتِ کاوش بقائے زیست پر
نشترِ غمہائے پنہانی رگِ جاں دیکھ کر

جذبۂ شوقِ شہادت کی اُمنگیں بڑھ چلیں
تیرے ہاتھوں میں ستمگر تیغ عریاں دیکھ کر

یاد اُن کو آگئیں اپنی جفا کی وسعتیں
ہو گئے جب منظرِ گورِ غریباں دیکھ کر

اضطرابِ عاشقِ بیتاب یاد آ گیا
ابر کے پردہ میں اختر برق لرزاں دیکھ کر

فریاد

(از جناب جوش ملیح آبادی)

جنابِ "جوش" ملیح آبادی سے گزشتہ ماہ میں اتفاقاً ملاقات ہوگئی۔ ہم نے موصوف سے نظم کی درخواست کی، لیکن چونکہ موصوف اُن دنوں علیل تھے اس لئے کوئی تازہ نظم فی الفور نہیں عنایت فرما سکے۔ پھر بھی موصوف نے ہمیں ناکام نہیں رکھا اور اپنی نہایت کامیاب نظم "فریاد" ان الفاظ کے ساتھ عنایت فرمائی کہ اسمیں بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔

اس نظم کے پائے کی بلندی کو دیکھ کر ہم نے اسے باصرار حاصل کیا اور موصوف کی خدمت میں امتنان و تشکر کا ہدیہ پیش کیا۔ عام اس سے کہ یہ نظم اس سے قبل شائع ہو چکی ہے یا نہیں ہم اسے ناظرینِ "ادب" کے سامنے اس شاعرانہ اور مخلصانہ التماس کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ

"ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ"

اڈیٹر

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزمِ کافری / رعشۂ خوف بن گیا رقصِ بتانِ آذری

خشک عرب کی ریگ سے لہر اٹھی نیاز کی / قلزمِ نازِ حسن میں اُف رے تری شناوری

اے کہ ترا غبارِ راہ تابشِ روئے ماہتاب / اے کہ ترا نشانِ پا نازشِ مہرِ خاوری

اے کہ ترے بیان میں نغمۂ صلح و آشتی / اے کہ ترے سکوت میں خندۂ بندہ پروری

اے کہ ترے دماغ پر جنبشِ پرتوِ صفا / اے کہ ترے ضمیر میں کاوشِ نورگستری

چھین لیں تو نے مجلسِ شرک و خودی سے گرمیاں / ڈال دی تو نے پیکرِ لات و ہبل میں تھرتھری

تیرے قدم پہ جبہ سا روم و عجم کی نخوتیں / تیرے حضور سجدہ ریز چین و عرب کی خودسری

تیرے کرم نے ڈال دی طرحِ خلوصِ بندگی / تیرے غضب نے بند کی رسم و رہِ ستمگری

تیرے سخن سے دب گئے لاف و گزاف کفر کے / تیرے نفس سے بجھ گئی آتشِ سحرِ سامری

لحن سے تیرے منتظم پست و بلند کائنات / ساز سے تیرے منضبط گردشِ چرخِ چنبری

چین ستم سے بے خبر تیری جبینِ مہ وشی — ذکرِ جفا سے پاک و صاف تیری حدیثِ دلبری

تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے — دشت نوردوں کو دیا تو نے شکوہِ قیصری

بھٹکے ہوؤں پہ کی نظر، رشکِ خضر بنا دیا — راہزنوں کو دی ندا ہو گئے گرمِ رہبری

سُلجھا ہوا تھا کس قدر تیرا دماغِ حق رسی — پگھلا ہوا تھا کس قدر تیرا دلِ پیمبری

چشمہ ترے بیان کا غارِ حرا کی خامشی — نغمہ ترے سکوت کا نعرۂ فتحِ خیبری

زمزمہ تیرے ساز کا لحنِ بلالؓ حق نوا — صاعقہ تیرے ابر کا لرزشِ روحِ بوذری رضؓ

آئینہ تیرے خلق کا طبعِ حسنؑ کی سادگی — جذبہ تیرے عروج کا آلِ عبا کی برتری

شوخیاں تیرے ناز کی جنبشِ کاکلِ حسینؑ — رنگ ترے نیاز کا گردشِ چشمِ جعفریؑ

شان ترے ثبات کی عزمِ شہیدِ کربلا — شرح ترے جلال کی ضربتِ دستِ حیدری

رنگ ترے شباب کا جلوۂ اکبرؑ شہید — نقش ترے شکیب کا خونِ گلوئے اصغریؑ

تیرا لباس زرفشاں چادرِ کہنۂ بتولؑ — تیری غذائے خوش مزہ نانِ شعیرِ حیدریؑ

تجھ پہ نثار جان و دل، مُڑ کے ذرا یہ دیکھ لے
دیکھ رہی ہے کس طرح ہم کو نگاہِ کافری

تیرے گدائے بے نوا تیرے حضور آئے ہیں — آنکھوں میں اشکِ خستگی، دل میں غمِ سبک سری

آج ہوائے جور سے اُنکے سروں پہ خاک ہے — رکھی تھی جن کے فرق پر تو نے کلاہِ سروری

تیرے فقیر، اور دیں کوچۂ غیر میں صدا — تیرے غلام اور کریں اہلِ جفا کی چاکری

کون و مکاں کے بادشاہ! خاک بسر ہیں آج وہ — گرد تھا جن کے روبرو دبدبۂ سکندری

طرفِ کلہ میں جنکی تھے لعل و گہر ٹکے ہوئے — حیف کہ اُن سروں میں ہے دردِ شکستہ خاطری

جتنی بلندیاں تھیں، سب ہم سے فلک نے چھین لیں — اب وہ رزمِ غزنوی، اب وہ بزمِ اکبری

اُٹھ، کہ ترے دیار میں پرچمِ کفر کھل گیا — دیر نہ کر کہ پڑ گئی صحنِ حرم میں ابتری

مسلمِ خستہ حال را رخصتِ ترکِ تازہ دہ
نعمتِ دار و گیر بخش، دولتِ سوز و ساز دہ

آثارِ ادبیہ

(جناب پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے)

منشی مرزا علی اکبر صاحب مرحوم الہ آباد کے ایک ذی علم اور خوش حال بزرگ تھے۔ اُن کے کتبخانے کی کچھ کتابیں چند سال پیشتر تک اُن کے خاندان میں باقی تھیں۔ زمانے کے انقلاب اور مرزائے مغفور کے وارثوں کی علمی و مالی بے مائگی کی بدولت ان میں سے چند کتابیں سنہ ۱۹۲۲ء کے شروع میں میرے ہاتھ لگیں۔ قدیم اور کمیاب کتابوں کی فراہمی کا جو شوق مجھ کو ہے اُسکی بنیاد اُس وقت سے پڑی۔ گویا وہ کتابیں اپنے مالک کا ذوق و شوق بھی اپنے ساتھ لیتی آئیں۔

مرزا علی اکبر کا قاعدہ تھا کہ جو خط، دستاویز یا کوئی اور تحریر کسی کو لکھتے تھے اُسکی نقل اپنے پاس بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ اُنکے ذخیرۂ کتب میں خطوں اور دوسری تحریروں کی نقلوں کے دو تین ضخیم مجموعے بھی تھے۔ افسوس ہے کہ یہ مجموعے مجھے نہ مل سکے ورنہ بہت سے مفید اور دلچسپ معلومات حاصل ہو سکتے۔ علم اور خوشحالی تو مرزائے مرحوم کے خاندان سے رخصت ہو چکی تھی لیکن غیرت و حمیت اتنی باقی تھی کہ اپنے بزرگوں کی ہاتھ کی تحریروں کو غیروں کے ہاتھ میں دینا گوارا نہ ہوا۔ بہر حال جن صاحب کی ملک میں یہ ذخیرہ تھا اُنکی اجازت سے ایک مجموعے کے چند ورق میں نے نکال لئے جن میں تین خط تھے اور ایک مضمون۔ خطوں میں دو مرزا دبیر کے نام ہیں اور ایک اخبار وکٹوریہ گزٹ سہارنپور کے اڈیٹر کے نام۔ مضمون میں مرزا دبیر مغفور کی ایک مجلس کا مفصل حال درج ہے۔ جو انھوں نے الہ آباد میں مرزا علی اکبر مرحوم کے یہاں پڑھی تھی۔ یہ مضمون وکٹوریہ گزٹ میں شایع کرنے کی غرض سے اُس اخبار کے اڈیٹر کے پاس مذکورۂ بالا خط کے ساتھ، ا ستمبر سنہ ۱۸۵۹ء کو بھیجا گیا تھا۔ ذیل میں یہ مضمون اور خط نقل کیا جاتا ہے۔ مرزا دبیر مرحوم کے نام کے خط انشاء اللہ "ادب" کی آئندہ اشاعت میں پیش کئے جائیں گے۔ "ادیب"

مرزا دبیر مغفور کی ایک یادگار مجلس

مرزا صاحب موصوف کہ فی زماننا دبیر عطارد نظیر شاعر بے عدیل ہیں خصوصاً مداحی

اہلبیت صلواۃ اللہ علیہم و ذاکری جناب امام ہمام علیہ السلام میں گوے سبقت امثال و اقران سے بیجوگان فصاحت و بلاغت لے گئے ہیں۔ اواخر ماہ ذیحجہ میں حسب الحاج و استدعا بعضے رؤسائے ذی وقار و امرائے عالی اقتدار عظیم آباد کے تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ عشرۂ محرم میں باوصف اسکے کہ طبیعت مرزا صاحب ممدوح کی جادۂ اعتدال سے منحرف تھی لیکن نواب جعفر حسن خاں کے امامباڑے میں کہ مکان فردوس عنوان نہایت وسیع و پر فضا ہے رونق افروز ہو کر بذکر مصائب جناب سید الشہدا خود بھی داخل حسنات ہوے اور مومنین کو بھی فیضیاب کیا۔ اکثر مجلسیں ایسی ہوئیں کہ دس دس پندرہ پندرہ ہزار آدمی جمع ہوے اور خبر مرزا صاحب ممدوح کی سن کر ہزاروں آدمی دس دس بارہ بارہ منزلوں سے جمع ہوے۔ نواب صاحب محتشم الیہ نے بھی اس قدر حفظ مراتب خاطرداری کی کہ رفقا اپنے کئی روز پیشتر باسوار بہاے اقسام واسطے استقبال کے تا بنارس روانہ کئے اور کوئی دقیقہ تعظیم و تکریم میں فروگذاشت نہ کیا۔

بعد عشرۂ محرم کسی امیر کبیر حسین گنج کی درخواست و التجا سے ڈاک پر مرزا صاحب تشریف لے گئے۔ اور اس دن بسبب ورود محتشم الیہ و اجماع خلائق جناب صاحب کمشنر بہادر حسین گنج نے کہ نہایت خلیق و رحیم و قدرداں شرفا ہیں بپاس خاطر عمال و رعایا کے کچہری برخاست کر دی۔ سبحان اللہ جو کہ مقبول درگاہ حاکم حقیقی ہوئے حاکمان مجازی کیونکر قدر و منزلت اسکی نہ کریں۔ مختصر یہ کہ وہاں بھی ہزاروں آدمی مفخم الیہ کو سن کر مشکور و مسرور ہوے۔

معاودت کے وقت حاجی آغا عبد الحمید صاحب تاجر شیرازی نے کہ نہایت شخص باوقار و ذی اقتدار ہیں، بنارس میں مرزا صاحب کو مہمان کیا تیلیا نالہ میں وجود باوجود مرزا صاحب موصوف سے وہ مجلس ہوئی کہ کبھی ایسا مجمع شائقین و مومنین کا ہوا تھا نہ تصور میں آتا ہے کہ ہوگا۔

پھر مرزا صاحب موصوف وہاں سے ڈاک پر مع رفقا ۲۳ تاریخ محرم کو الہ آباد میں بمکان منشی مرزا علی اکبر صاحب تحصیلدار سابق و پنشن دار حال رونق افروز ہوے اور دو روز بپاس خاطر منشی مغفر اللہ وہاں مقیم ہو کر التماس پر منشی صاحب موصوف و میر علی سجاد صاحب تحصیلدار و دیگر رؤسائے باوقار کے یہ فرمایا کہ کسل سفر و ناسازی طبع سے طاقت کچھ پڑھنے کی جلسۂ عام میں نہیں ہے۔ الا آپ لوگوں کے اصرار سے جبراً یہ مضائقہ نہیں کہ دس بیس دوستان

خالص و اشخاص خاص کے جلسے میں کچھ ذکر مدح و مصائب ائمہ علیہم السلام کیا جاویگا۔ چنانچہ تیسرے پہر دن کو یہ تجویز ہوئی اور شام کو بالاخانہ منشی مرزا علی اکبر صاحب موصوف کہ کھلا ہوا تھا نہایت وسعت فصحت کے ساتھ محلہ منڈوی رانی میں شارع عام پر واقع ہے، فرش و روشنی سے آراستہ ہوا۔ باوصف اسکے کہ سوائے چند اشخاص ذی رتبہ و سخن فہم کے کسی کو اطلاع نہ دی گئی تھی لیکن بقول آنکہ ع

"نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا"

تمام خلقت الہ آباد و دریاآباد و سکان قصبہ کرالی وغیرہ گروہ گروہ و انبوہ انبوہ وہاں تک جمع ہوئی کہ تین صحن وسیع بالاخانہ مذکور کے کثرت مردم سے مانند دانہ ہائے انار کے مملو و مزاحم ہو گئے۔ مجال نہ تھی کہ جانشین مجلس زانو بدل سکیں۔ لاچاری کو مرڈنگیاں اور فانوس حتی کہ اوگالدان معدومی گنجایش سے اٹھا دیے گئے۔ اور آخر کو گرد و پیش کے کوٹھوں پر لوگ جا چڑھے۔ ؎

لب بام کثرت جو یکسر ہوئی　　تلے کی زمیں ساری اوپر ہوئی

آخر کو صدہا آدمی سڑک پر انبوہ ہوئے۔

مرزا صاحب نے ہفت بند ملا کاشی پر جو کئی کئی طرح سے مصرع لگائے تھے چند بند پڑھے کہ سامعین کو حالت وجد کی سی پیدا ہوئی۔ ہر طرف سے آواز تحسین و آفریں بلند تھی۔ پھر حضرت علی اکبرؑ کے سراپا کی تعریف میں کئی بند مرثیہ تصنیف اپنے کے پڑھ کر ایک بند بینیہ اس خوبی سے پڑھا کہ یا تو ساعت مدح سے شور و غل واہ واہ و صل علیٰ کا بلند تھا یا تمام مجلس سر پیٹتے واہ وفغاں کرتے کرتے از خود رفتہ ہو گئی۔ مرزا صاحب ممبر سے اتر آئے۔ ہر ایک کی زبان پر مردم الہ آباد کے یہ بات تہ دل سے جاری تھی کہ جب سے الہ آباد آباد ہوا نہ ایسا جلسہ ہوا ہے نہ آیندہ امید ہونے کی ہے۔ سچ ہے انقلاب زمانہ سے یہ بھی ہے کہ ایسے اشخاص ذی کمال ایسے شہروں میں وارد ہوویں۔ مصداق اسکا مرزا صاحب ممدوح کی دو رباعیاں واسطے ملاحظہ ناظرین کے مندرج ہوتی ہیں۔ ؎

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے　　اس گھر میں جو آسمان سے نکلے
پر شکر کہ لکھنؤ تو جنت تھا دبیرؔ　　آدم ٹھہرے جو ہم جناں سے نکلے

پہونچا جو کمال کو وطن سے نکلا　　قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
تکمیل کمال کی غریبی ہے دلیل　　پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

بالآخر مرزا صاحب مکرمت الیہ ۱۴ صفر کو مع رفقا و ہمراہیان بسواری ریل الہ آباد سے رجعت فرماکر پندرھویں شہر مذکور کو مع الخیر و عافیت داخل لکھنؤ ہوئے۔ فقط المرقوم ۱۷ ستمبر ۱۸۵۹ء

خط وکٹوریہ گزٹ سہارنپور کے اڈیٹر کے نام

جناب ...... صاحب عنایت فرمائے مخلصاں الطاف نمائے بیکراں دام اقبالہٗ۔

بعد سلام شوق و نیاز مخلصانہ مصدع اوقات ہمایوں ہوں کہ ایک خبر مفید خلائق کہ بے شبہ نہیشہ بشاشت افزائے خاص و عام ہے پرچہ علیحدہ میں ملفوف ہذا ہے بنکائے وسعت اخلاق کریمانہ آپکے ابلاغ کرتا ہوں اگرچہ بادی النظر میں عبارت اسکی اندک طول ہے لیکن یہ سمجھیے کہ واسطے ناظرین امشار و دیار کے بشاشت کا مول ہے۔ آپ اگر از راہ مہربانی و قدردانی مندرج صفحۂ اخبار فرمادیں گے تو خاکسار کی بھی مسرتی و مشکوری کا باعث ہوگا۔ ع

باکریماں کارہا دشوار نیست

امید ہے کہ عاجز کو ایک ہواخواہ قدیم و مخلصان صمیم سے تصور فرماکر ہمیشہ کاروبار لائقہ و اطلاع خیر و عافیت مزاج ملطف امتزاج سے یاد و شاد فرماتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کو مسند آرائے عز و اقبال و جاہ و جلال رکھے۔ المرقوم سترھویں ستمبر ۱۸۵۹ء۔ مقام الہ آباد۔ محلہ منڈوی رانی۔

مکرر یہ کہ ہنوز بندہ بموجب گزارش سابق اقتضائے آب و دانہ سے روانہ لکھنؤ نہیں ہوا۔ انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب بعضے امورات متعلقہ علاقہ نوخریدہ سے فرصت پاکر راہی شہر مذکور ہوگا بندگان سامی تا گزارش ثانی بدستور قطعات اخبار موسومہ احقر لکھنؤ میں بمحلہ حیدر گنج قدیم بمکان مولوی محمد کاظم عرف مرزا علی جان صاحب روانہ فرماتے رہیں۔ زیادہ زیادہ تاریخ و سنہ صدر

الراقم الاثم
علی اکبر عفی عنہٗ

مہر ظفر ہی کلاں

وہ کون تیل ہے
جو بال بڑھانے میں درجہ اوّل ہو ؟ سندری سہاگ ہے
جو قوت بصارت کو بڑھاتا ہو ؟ سندری سہاگ ہے
جو دماغ کی خشکی اور کمزوری کو دور کرتا ہو ؟ سندری سہاگ ہے
جو دل و دماغ کو معطر کرتا ہو ؟ سندری سہاگ ہے
جو بالوں کو گھونگھر والا اور چمکدار بناتا ہو ؟ سندری سہاگ ہے
جو دردسر نزلہ اور زکام کو دور کرتا ہو ؟ سندری سہاگ ہے
جو مٹی کے تیل یا نقصان رساں چیزوں سے پاک ہے ؟ سندری سہاگ ہے
جسکے استعمال سے بال چپکتے نہیں ہیں ؟ سندری سہاگ ہے
جسکے استعمال سے بال سفید ہونے سے محفوظ رہتے ہیں ؟ سندری سہاگ ہے
جسکے استعمال سے عورت مرد خوش رہتے ہیں ؟ سندری سہاگ ہے
لہذا جب سندری سہاگ میں تمام خوبیاں موجود ہیں تو پھر اسکے منگانے میں کیا تامل ہے۔
کیا ایک شیشی ارسال خدمت کیجائے؟ قیمت فی شیشی ایک روپیہ تین شیشی کی قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ محصول علاوہ
سینکڑوں شہادتوں میں سے دو تازہ شہادت ملاحظہ فرمایئے
جناب سید سلطان محمد صاحب درگاہ حضرت نظام الدین اولیا دہلی سے تحریر فرماتے ہیں۔ عرصہ ہوا کہ آپ سے میری اہلیہ نے چند شیشیاں سندری سہاگ تیل کی طلب کرکے استعمال کی تھیں جن سے اون کے سر کی تمام شکایتیں رفع ہوگئیں۔ اور بال بھی کافی سے زیادہ دراز ہوگئے۔ چنانچہ ابتک دوبارہ استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اسلئے فرمایش کا موقع نہیں ہوا معذور تصور فرمایا جائے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ میری اہلیہ نے اپنے تمام ملنے والے اشخاص و مستورات میں آپکے تیل کا شوق پیدا کردیا ہے۔ درحقیقت آپکا تیل سر کے تمام امراض کیلئے بہ صفت موصوف ہے۔ اور آپکی یہ ایک لاثانی ایجاد ہے۔
جناب سید نثار علی صاحب ہیڈ کلرک ضلع کھیری سے تحریر فرماتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے آپکے کارخانہ سے سندری سہاگ تیل کا پارسل منگایا تھا۔ اوس میں سے ایک شیشی انھوں نے مجھکو عنایت فرمایا۔ اسمیں شک نہیں کہ سندری سہاگ تیل واقعی نہایت بہترین چیز ہے۔ علاوہ اور اوصاف کے دردسر کا تو دشمن ہے۔ یہ صرف آپ کو بطور سرٹیفکیٹ تحریر کرتا ہوں
کیا اس سرٹیفکیٹ کے پڑھنے کے بعد بھی آپ کو سندری سہاگ تیل کے منگانے میں شک ہے؟ ایک شیشی ارسال خدمت کیجائے
پتہ ایس اے بی بخش اینڈ کمپنی (پوسٹ بکس نمبر) کرلوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

فہرست مضامین

جلد ۱ — بابت ماہ جون سنہ ۱۹۳۰ء — نمبر ۹

بزمِ ادب

ہمارے صوبہ کی گورنمنٹ نے چند سال سے ہندوستانی علوم و فنون کی ترقی کی طرف خاص توجہ کی ہے چنانچہ ہندی موسیقی کے لیے ایک کالج اور طب اور وید کی تحصیل کیلیئے ایک ایک اسکول اور ایک ایک کالج جاری کیا اور ہندی اور اُردو کی ترقی کیلیئے ہندوستانی اکاڈمی قائم کی۔ اس اکاڈمی کے ممبروں کو جن کی تعداد ۳۰ رکھی گئی ہے خود گورنمنٹ نامزد کرتی ہے۔ پہلی مرتبہ یہ نامزدگی مارچ ۱۹۲۷ء میں عمل میں آئی۔ چونکہ ممبری کی میعاد حسب قواعد اکاڈمی تین سال ہے اسلیئے گورنمنٹ نے مئی ۱۹۳۳ء کو نئے ممبر نامزد کردیئے جن کے اسمارگرامی حسب ذیل ہیں :-

صدر

ڈاکٹر سر تیج بہادر صاحب سپرو کے۔سی ایس آئی۔ ایم اے۔ ال ال ڈی ایڈوکیٹ ہائی کورٹ الہ آباد

ارکان منصبی

(۱) آنریبل منسٹر آف ایجوکیشن۔ یونائیٹیڈ پراونسسز۔

(۲) ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن یونائیٹڈ پراونسسز

(۳) وائس چانسلر صاحب الہ آباد یونیورسٹی۔

(۴) وائس چانسلر صاحب لکھنؤ یونیورسٹی۔

(۵) وائس چانسلر صاحب بنارس یونیورسٹی۔

(۶) وائس چانسلر صاحب علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

(۷) وائس چانسلر صاحب آگرہ یونیورسٹی

دیگر ارکین

(۱) سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے لکچرار اُردو لکھنؤ یونیورسٹی

(۲) ڈاکٹر تاراچند صاحب ایم اے پی ایچ ڈی پرنسپل کائستھ پاٹشالا یونیورسٹی کالج الہ آباد

(۳) خان بہادر سید ابو محمد صاحب ایم اے ڈپٹی کلکٹر۔

(۴) ڈاکٹر اے صدیقی صاحب ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی ہیڈ آف عربک اینڈ پرشین ڈیپارٹمنٹ الہ آباد یونیورسٹی

(۵) خان بہادر حافظ ہدایت حسین صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا۔ ایم ایل سی کانپور

(۶) سید محمد ضامن علی صاحب ایم اے لکچرار اُردو الہ آباد یونیورسٹی

(۷) رشید احمد صدیقی صاحب اُردو ڈیپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

(۸) رام بابو سکسینہ صاحب ایم اے۔ ال ال۔ بی ڈپٹی کلکٹر الہ آباد

(۹) مرزا محمد سجاد علی خاں صاحب ایم ال سی شیش محل لکھنؤ

(۱۰) مولوی محمد سلطان حیدر صاحب جوش ڈپٹی کلکٹر باندہ

(۱۱) ڈاکٹر شفاعت احمد خاں صاحب ایم اے ڈی لٹ سان آر ایچ اس۔ ایم۔ ال سی۔ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی۔

(۱۲) آنریبل سر شاہ محمد سلیمان صاحب نائٹ۔ ایم۔ اے۔ ال۔ ال ڈی بار ایٹ لا۔ جج الہ آباد ہائی کورٹ

(۱۳) مولوی محمد نعیم الرحمن صاحب ایم۔ اے۔ لکچرار الہ آباد یونیورسٹی

(۱۴) صاحب جی مہاراج آنند سروپ صاحب بہادر دیال باغ۔ آگرہ

(۱۵) ایم۔ ایچ۔ سید ضامن علی صاحب ایم۔ اے۔ ال۔ ٹی۔ لکچرار اردو۔ الٰہ آباد یونیورسٹی

(۱۶) ٹھاکر گوپال سرن سنگھ صاحب نمبرہ جارج ٹاؤن۔ الٰہ آباد

(۱۷) رائے بہادر لالہ سیتا رام صاحب بی۔ اے۔ ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر الٰہ آباد

(۱۸) بابو جگناتھ داس رتناکر صاحب راج سدن۔ اجودھیا

(۱۹) پنڈت بدری ناتھ بھٹ صاحب بی۔ اے۔ لکچرار ہندی لکھنؤ یونیورسٹی

(۲۰) پنڈت ایودھیا سنگھ اپادھیا صاحب ہندو یونیورسٹی بنارس

(۲۱) بابو دھیریندر ورما صاحب ایم۔ اے۔ ہندی لکچرار الٰہ آباد یونیورسٹی

(۲۲) رائے بہادر پنڈت شام بہاری مصر صاحب ایم۔ اے۔ [illegible]

(۲۳) بابو کرشن بلدیو ورما صاحب کیمپ کالپی ضلع جالون

(۲۴) ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ ہسٹری ریڈر الٰہ آباد یونیورسٹی

(۲۵) ڈاکٹر پنا لال صاحب آئی۔ سی۔ ایس مجسٹریٹ اینڈ کلکٹر بدایوں

(۲۶) ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی صاحب ایم۔ اے۔ ڈی۔ ایس۔ سی ہسٹری ریڈر۔ الٰہ آباد یونیورسٹی۔

(۲۷) پنڈت امرناتھ جھا صاحب ایم۔ اے۔ انگلش ریڈر الٰہ آباد یونیورسٹی

(۲۸) رائے صاحب بابو شیام سندر داس صاحب ناگری پرچارنی سبھا بنارس

(۲۹) ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ ایس۔ سی۔ ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ آف پولیٹکل سائنس الٰہ آباد یونیورسٹی۔

(۳۰) بابو ہیرا لال کھنا صاحب ایم۔ اے۔ پرنسپل شمبھو ناتھ سناتن دھرم انٹرمیڈیٹ کالج کانپور۔

شخصیتوں سے قطع نظر کرکے ہم اس بارے میں اصولی طور پر دو تین باتیں کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ممبروں کی موجودہ فہرست کا پہلی فہرست سے مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ چودہ ممبر علیحدہ کیے گئے اور ان کی جگہ نئے ممبر مقرر کیے گئے۔ یہ بات ہمارے نزدیک اصولاً قابل اعتراض ہے جو لوگ اپنے علم و فضل یا علمی و ادبی خدمات کی بنا پر ایک مرتبہ اکاڈمی کی ممبری کے قابل قرار پائے ہوں وہ تین برس کے بعد ایسے قابل نہ رہیں یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ غالباً تمام بڑی بڑی علمی انجمنوں کا یہی طریقہ ہے کہ جن لوگوں کو ایک مرتبہ ممبری کی عزت دیجاتی ہے وہ بغیر کسی اہم وجہ کے کبھی اس عزت سے محروم نہیں کیے جاتے۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اس مرتبہ اردو کے ممبروں کی تعداد بہت کم کر دی گئی ہے۔ پہلے صرف لکھنؤ اور نواح لکھنؤ کے دس ممبر تھے اب صرف تین ممبر رکھے گئے ہیں۔ ان میں بھی دو تو لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو اور ہندی کے لکچرار ہیں اور اس لیے ان کا انتخاب ناگزیر تھا۔ تیسرے صاحب شیش محل کے نواب سجاد علی خاں صاحب ایم۔ ال۔ سی ہیں جن کا انتخاب اس مرتبہ مندرجہ ذیل آٹھ حضرات کے عوض میں ہوا ہے۔

۱۔ لسان القوم مولانا سید علی نقی صاحب صفی جنکی مثنوی تنظیم الحیات کو خود اکاڈمی نے گذشتہ چند سال کی منظوم کتابوں میں بہترین قرار دیکر مولانا ممدوح کو پانچسو روپیہ کا انعام بھی دیا تھا۔

۲۔ جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے۔ جو کئی قابل قدر کتابوں کے مولف و مترجم ہیں۔

۳- جناب پنڈت منوہر لال صاحب زتشی ایم اے- آئی ای- اس- جنکی ادبی قابلیت اور وسعت مطالعہ سب پر ظاہر ہے۔ جنکے تنقیدی اور اصلاحی مضامین ہمیشہ وقعت کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ جنکی کتاب گلدستہ ادب" مدتوں نصاب تعلیم میں داخل رہ چکی ہے- جو یونیورسٹی کے امتحانوں میں اردو کے ممتحن ہوا کرتے ہیں اور جو اب بھی اکاڈمی کی فرمایش سے ایک کتاب کی تالیف میں مصروف ہیں-

۴- جناب مولوی نیاز صاحب فتحپوری جو ایک نہایت کثیر الاشاعت علمی اور ادبی رسالہ کے اڈیٹر ہونے کے علاوہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں-

۵- جناب منشی پریم چند صاحب بی اے جو ہندوستان کے عدیم النظیر افسانہ نگار ہیں اور جنکی ذات پر اردو ہندی دونوں زبانیں بجا طور پر فخر کر سکتی ہیں

۶- مولوی مہدی حسن صاحب ناصری ایم اے جو ایک فاضل بزرگ اور کئی کتابوں کے مولف ہیں

۷- مولوی نور الحسن صاحب نیر بی اے ایل ایل بی جنھوں نے ایک عمر اردو کا مبسوط لغت لکھنے میں صرف کر دی اور جنکا کارنامہ زندگی نور اللغات ہمیشہ اردو کی دنیا کو ان کا ممنون احسان رکھے گا-

۸- جناب مولوی عبد الماجد صاحب بی اے جنکے علم و فضل اور کمال انشا پردازی کا زمانہ معترف ہے اور جن کی کتابیں دور حاضرہ کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں-

ہم جناب نواب سجاد علی خاں صاحب کے خاندانی وقار ذاتی وجاہت اور اخلاقی محاسن کے دل سے معترف ہیں لیکن علمی اور ادبی خدمات کے لحاظ سے موصوف کو حضرات مذکورہ بالا کا نعم البدل قرار دینا مشکل معلوم ہوتا ہے اس مرتبہ جہاں اودھ اور لکھنؤ سے بے اعتنائی برتی گئی ہے وہاں الہ آباد پر خاص نظر التفات کی گئی ہے- یعنی تیس ممبروں میں پندرہ صرف الہ آباد سے اور پندرہ باقی تمام صوبہ سے لیے گئے ہیں، بہرحال ہم ان اصول کو سمجھنے سے قاصر ہیں جنکی بنا پر گورنمنٹ نے اس مرتبہ ہندوستانی اکاڈمی سے پرانے ممبروں کو خارج اور نئے ممبروں کو داخل کیا ہے اور حافظ کا یہ مشہور مصرعہ پڑھ کر خاموش ہو رہتے ہیں ع رموز سلطنت خویش خسروان دانند

کون اردو داں ہے جو حضرت انیس مغفور کے شاعرانہ کمال کا معترف نہیں ہے اگر ایسا با کمال شاعر کسی زندہ قوم میں پیدا ہوا ہوتا تو اس کی نہ معلوم کیسی کیسی شاندار یادگاریں قائم کی گئی ہوتیں اس کے کلام کے طرح طرح کے سیکڑوں اڈیشن نکل چکے ہوتے لیکن بدنصیبی سے انیس ہندوستان میں اور وہ بھی مسلمانوں میں

پیدا ہوئے جنکی بے حسی کا ایک زبردست ثبوت خود یہی واقعہ ہے کہ انیس کی کسی اور یادگار کا کیا ذکر وہ مختصر سا کمرہ جسمیں اُردو کا یہ عدیم المثال شاعر اپنے اقربائے خاص کے ساتھ محو خواب ہے وہ بھی ایک کھنڈر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اُسکی شکستہ دیواریں اور گری ہوئی چھت قوم کی غفلت اور بے حسی بلکہ بے حیائی اور بے غیرتی کا مظاہرہ کر رہی ہے کبھی کبھی کسی غیرت دار اور درد مند ہستی کی آواز تو بلند ہو جاتی ہے کہ انیس کا مقبرہ بننا چاہیئے انیس کی کوئی یادگار قائم ہونا چاہیئے اور انیس کا کلام اس شان سے چھپنا چاہیئے جسکا وہ مستحق ہے۔ مگر اس آواز پر لبیک کہنے والے آج تک اتنے نہو سکے کہ ان میں سے ایک بات بھی پوری ہو سکتی۔ ادھر چند روز سے کچھ لوگوں نے پھر اسطرف توجہ شروع کی ہے۔ اُنکی خدمت میں گذارش ہے کہ جس طرح بیشتر کئی مرتبہ یہ تحریک شروع ہو ہو کر رہ گئی اسطرح اس مرتبہ بھی یہ تحریک محض ایک "مقدس آرزو" نہ ثابت ہو۔ بلکہ چند ذی اثر اور دُھن کے پکے لوگوں کی ایک کمیٹی اس کام کیلئے بنائی جائے جو بغیر اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کیے ہوئے دم نہ لیں اور جنھیں اتنی غیرت ہو کہ وہ اس امر میں ناکامیابی کو اپنی ذاتی توہین سمجھیں۔

ہمارے ایک محترم نے نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال کی زبانی یہ واقعہ بیان کیا تھا کہ کسی یوروپین فاضل نے موصوف سے دریافت کیا کہ اُردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ جواباً انیس اس نے کلام انیس کی زیارت کا اشتیاق ظاہر کیا۔ نواب صاحب نے وہی سڑے ہوئے بادامی کاغذ پر نولکشور پریس کی چھپی ہوئی جلدیں اسکو دکھائیں اس نے کہا کہ میں اس بہترین شاعر کے کلام کا بہترین اڈیشن دیکھنا چاہتا ہوں۔ نواب صاحب نے نہایت شرمندگی کے ساتھ جواب دیا کہ اس سے بہتر کوئی اڈیشن موجود نہیں ہے۔ یہ سُن کر اس زندہ اور ذی حس قوم کی فرد نے کہا کہ جس شاعر کا کلام اسطرح چھاپا گیا ہو اُس کو میں کسی زبان کا بہترین شاعر ہرگز نہیں تسلیم کر سکتا۔ اگر کہیں وہ انیس کا مقبرہ بھی دیکھ لیتا تو شاید وہ ہندوستانیوں کو ان لفظوں سے یاد کرتا جسکے وہ مستحق ہیں کیا اب ہمارے قوائے اخلاقی و دماغی اس درجہ مفلوج ہو گئے ہیں کہ کوئی قوی سے قوی محرک بھی اُنکو جنبش میں نہیں لا سکتا

ہم سخت افسوس کے ساتھ یہ خبر درج رسالہ کرتے ہیں کہ چشم و چراغ خاندان انیس جناب سید خورشید حسن صاحب عروج عرف دولہا صاحب نے ۱۴ مئی ۱۹۳۰ء کو انتقال فرمایا اس دور میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں جناب مرحوم کا کوئی نظیر نہیں تھا۔ بالخصوص فن مرثیہ خوانی میں وہ دستگاہ تھی کہ دوست دشمن سب مرحوم کے اس کمال کے بدل معترف تھے۔ ہماری پژمردگی اور خود فراموشی جس کی بدولت ہمارے علوم و فنون برابر مٹتے جاتے ہیں یقین دلاتی ہے کہ اب یہ فن بھی حضرت عروج کے ساتھ دفن ہو گیا۔ میر انیس و میر نفیس کی مرثیہ خوانی کے سحر آگیں انداز کی جو تعریف بزرگوں سے سنتے تھے اسکی تصدیق جناب عروج مغفور کے کمال سے ہوتی تھی اسلیے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عروج کے انتقال سے انیس و نفیس کے کمال پر بھی ایک پردہ پڑ گیا۔ بہر حال ہم مرحوم کی بخشش کیلیے دست بدعا اور اُنکے پسماندگان کے غم میں شریک ہیں ہماری دلی تمنا ہے کہ ہم مرحوم کے فرزند رشید جناب محمد حسن صاحب فائز کو مسند کمال پر مرحوم کا صحیح جانشین دیکھیں

(مرثیہ میں شجاعت)

جناب اعجاز الہ آبادی

(۴)

گزشتہ سے پیوستہ

باپ بیٹے کی گفتگو میں جوش ہمت اور بہادری کے عنصر ملاحظہ ہوں۔ حضرت علی اکبر تین دن کے بھوکے پیاسے میدان کربلا میں جنگ کے لیے تشریف لے گئے ہیں خوب گھسان کی لڑائی کی ہے دشمن کی فوج منتشر ہو گئی ہے۔ عمر سعد کے غیرت دلانے سے ایک نہایت قوی تن پہلوان مقابلے کیلیئے آیا ہے۔ کچھ دیر تک لڑائی ہوتی رہی حضرت علی اکبرؑ برابر اُس کے وار کو رد کرتے رہے یہاں تک کہ تلوار کی لڑائی کی نوبت آ گئی۔ امام حسینؑ کو اس موقع پر تشویش پیدا ہوئی۔ آپ نے بیٹے سے پوچھا کہ مدد کو آؤں، لیکن حضرت علی اکبرؑ نے گوارا نہ کیا۔ باپ کو میدان جنگ میں آنے سے روکتے ہوئے فرمایا ؎

تشویش نہ فرمائیے میں نے اِسے مارا		آیا ہے تو جاتا ہے کہاں یہ ستم آرا
مرحبؔ کی طرح طول میں کرتا ہوں دوپارا		اللہ کی تائید ہے مولا کا سہارا
دل آپ بڑھائینگے تو بڑھ بڑھ کے لڑونگا
اس دیو سے میں سورۂ جن پڑھ کے لڑونگا

ہر چند سن اس کا ہے زیادہ مرے سن سے		پانی بھی لبوں تک نہیں پہنچا کئی دن سے
بیزار ہی ہے جن و ملک و انس کو اِن سے		ہم وہ ہیں کہ جا بر تھے دیو بھی جن سے
اس چاہ کے اندر بھی چُھڑاے ہیں دم اب تک
مشہور ہے افسانۂ بیر العلم اب تک

خادم کی لڑائی نہیں کچھ قابل تعریف آقا کے کرم سے ہے بہت پیاس میں تخفیف
غم یہ ہے کہ مولا کو نہایت ہوئی تکلیف ہے دھوپ کڑی سایہ میں لیجائیے تشریف

گردن ہے یہ تیغ اب اس عربدہ جو کی
چھینٹیں نہ پڑیں قبلۂ عالم پہ لہو کی

امام حسینؑ نے جو بیٹے کو جواب دیا ہے وہ کس قدر برمحل اور ہمت افزا ہے،

حضرت نے کہا خیر خدا حافظ و ناصر جرأت میں نہ تم کم ہو نہ میں صبر میں قاصر
یہ بیکس و بے پر ہے مدد کرنے کو حاضر دب جائیگا ادنیٰ سے بھی ادنیٰ ہے یہ کافر

تیور کہیں چھپتے ہیں شجاع ازلی کے
اعلیٰ ہے سر تم اعلیٰ ہو کہ پوتے ہو علی کے

ہاں دہنی طرف آنے نہ دیجو اُسے زنہار گھوڑے کو بڑھائے ہوئے روکے ہوئے تلوار
مغرور تن و توش پہ اپنے ہے یہ غدّار خود منھ کے بل آئیگا جو خالی گئے دو وار

دشمن جو لڑے جم کے تو پھر لُطف ہوا ہے
ہاں تھام لو باگ اسکے فرس کی تو مزا ہے

ماں بیٹوں کی گفتگو سنیئے کتنی ہمت افزا اور پُر جوش ہے کیا اُردو یا فارسی ادب میں اس سے بہتر شجاعت اور بہادری کے نمونے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ماں اپنے صاحبزادوں کو طرح طرح سے جوش دلاتی ہے کہ میدان میں جاکر بہادری کے ساتھ جنگ کریں اور جان دیکر اپنے بزرگوں کی یاد تازہ کردیں،

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت امام حسینؑ اپنے چھوٹے سے لشکر کے لیے علم بردار منتخب کرنا چاہتے ہیں ان دونوں بچوں کی تمنا یہ ہے کہ یہ علم ہم کو ملے اپنے کو مستحق اسلیے سمجھتے ہیں کہ یہ اس کے پوتے ہیں جو رسول خداؐ کی فوج کا علمبردار تھا۔ اسی فکر میں دونوں کبھی آپس میں مشورہ کرتے ہیں کبھی اپنی والدہ حضرت زینب سے خواہش کرتے ہیں کہ وہ اپنے بھائی امام حسین علیہ السلام سے سفارش کریں۔

گہ ماں کو دیکھتے تھے گہے جانب علَم نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثار سرِ اُمَم

کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم　　آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم
کیا قصد ہے علی ولی کے نشان کا
اماں کسے ملیگا علم نانا جان کا

کچھ مشورہ کریں جو شہنشاہ خوش خصال　　ہم بھی محق ہیں آپ کو اسکا رہے خیال
پاس ادب سے عرض کی ہم کو نہیں مجال　　اس کا بھی خوف ہے، کہ ہو آپ کو ملال
آقا کے ہم غلام ہیں اور جاں نثار ہیں
عزت طلب ہیں نام کے امیدوار ہیں

بیمثل تھے رسول کے لشکر کے سب جواں　　لیکن ہمارے جد کو نبی نے دیا نشاں
خیبر میں دیکھتا رہا منہ لشکر گراں　　پایا علم علی نے مگر وقت امتحاں
طاقت میں کچھ کمی نہیں گو بھوکے پیاسے ہیں
پوتے انھیں کے ہم ہیں انھیں کے نواسے ہیں

زینب نے تب کہا کہ تمھیں اس سے کیا ہے کام　　کیا دخل مجھکو مالک و مختار ہیں امام
دیکھو نہ کیجو بے ادبانہ کوئی کلام　　بگڑوں گی میں جو لوگے علم کا زباں سے نام
لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے ہو یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے

سرکو ہٹو بڑھو نہ کھڑے ہو علم کے پاس　　ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہِ فلک اساس
کھوتے ہو اور آئے ہوئے تم مرے حواس　　بس قابل قبول نہیں ہے یہ التماس
رونے لگوگے تم جو برا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں

اس عنوان کے اخیر میں ہم میر مونس کے کلام (جلد دوم سے) ایک اقتباس پیش کرکے دوسرے عنوان پر لے زنی کریں گے۔

موقع یہ ہے کہ حضرت حر نے فوج مخالف کو چھوڑ کر حضرت امام حسینؑ کا ساتھ دینے کے لیے آمادگی ظاہر کی ہے۔ سچائی دنیا میں بغیر اپنا اثر دکھائے نہیں رہتی۔ امام حسینؑ نے

اسلام کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لیے جس زبردست اور ہولناک طوفان کا صدہا
قربانیوں کے ساتھ مقابلہ کیا تھا اس کی حقانیت کا اقتضا بھی یہی تھا کہ فوج مخالف کا
ایک نہایت جلیل القدر سردار شمر و یزید کو سخت دست کہکر امام حسینؑ پر اپنی جان نثار کر دے،
حضرت حُرؓ وہ شخص تھے جنکو اس امر کے لیے مامور کیا گیا تھا کہ حضرت امام حسینؑ کو جس طرح بنے گھیر کر
راستے سے میدان کربلا میں لے آویں جیسا کہ انھوں نے کیا بھی۔ مگر باوجود ان کی اس مخالفت
کے نواسہ رسول نے وہ خلق و مروت کا برتاؤ کیا کہ چند ہی دن کے بعد حضرت حُر نے حضرت امام حسینؑ
کا کلمہ پڑھنا شروع کیا اور اس خلوص کیساتھ کہ بھائی بیٹے، غلام بھی اُن کے ساتھ امام حسینؑ پر
صدقے ہوگئے۔

اس معرکے میں پہلے حضرت حُر تیار ہوئے۔ اُن کا ارادہ معلوم کر کے اُن کے بھائی آمادہ
ہوئے پھر بیٹے اور غلام بھی مستعد ہوگئے یہ لوگ آپس میں صبح تک اسی قسم کی جاں نثاری و بہادری
کی گفتگو کرتے رہے۔ جب عمر ابن سعد (سپہ سالار) کو اس کی خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوا۔ حُر کو
طلب کر کے پہلے تو ملانے کی کوشش کرتا ہے اس طرح سے باتیں کرتا ہے کہ گویا اُسے کسی بات کی
خبر ہی نہیں۔ جب دیکھتا ہے کہ اس میں بھی ناکامیابی ہوئی تو یاسی سے کام لیتا ہے۔ ڈانٹتا ہے
اور شاہی عتاب کی خوفناک سزائیں یاد دلاکر اپنا کام نکالنا چاہتا ہے۔ مگر حُر راہ راست سے
نہ بہکنا تھا نہ بہکے۔ دونوں سرداروں کی گفتگو سے طبیعت میں ایک عجب جوش پیدا ہوتا ہے ؎

ہے غضب کعبے کے چلا جاوے وہ شیدائے امام — راس و چپ بھائی پسر پیچھے کمربستہ غلام
پسر سعد کو دیکھا تو کیا کچھ نہ کلام — ہاتھ ماتھے پہ کراہت سے رکھا بہر سلام

پھرے چہرۂ خولیؔ[1] بد اختر دیکھا
چاٹ کر ہونٹ رخ شمر ستمگر دیکھا

حُر کو دیکھا جونہی سعد نے غصے میں بھرا — بزدلا شیر کی اُبلی ہوئی آنکھوں سے ڈرا
بعد اک دم کے یہ بولا وہ شقی دوسرا — رکھ سوئے میمنہ تو اپنے سواروں کا پرا

جائے لڑنے جو ادھر سے اسے جانے دینا
نہر تک یاں کسی پیاسے کو نہ آنے دینا

[1] فوج یزید کا ایک خونخوار سردار ۱۲

تو دمِ صبح سے نکلا نہ پئے جنگ یہ کیا　　کیا ہوا کیوں متغیر ہے ترا رنگ یہ کیا
ہے نئی بات نیا طور نیا ڈھنگ یہ کیا　　مردِ جرار ہے اور جنگ سے ہے تنگ یہ کیا

پرچے اخبار کے شام سحر آتے ہیں مجھے
آج تیور ترے بگڑے نظر آتے ہیں مجھے

حال بیتابیٔ شب ہے مجھے معلوم تمام　　واں جو فاقہ تھا تو کھایا نہیں تو نے بھی طعام
غش تجھے آتا تھا روتے تھے جو اطفالِ امام　　کیوں اسی کجروشی سے مجھے کرتا تھا سلام

تیغ کھینچے ہوئے منہ پر مرے چڑھ آیا ہے
صاف کہدے کہ کسی نے تجھے بہکایا ہے

مجھ پہ ظاہر ہے کہ برخاستہ خاطر ہے تو　　دل ہے غائب کہیں گو سامنے حاضر ہے تو
غیظ میں آ کے کہا حر نے کہ جابر ہے تو　　قتل کرتا ہے نبی زادے کو کافر ہے تو

بچے مرتے ہیں ہاں دل ہو بیتاب ترا
کفر ہے پاس ترا شرک ہے آداب ترا

حکم دے مجھ کو نہ دریا کی نگہبانی کا　　تابعِ امر ہوں میں فاطمہ کے جانی کا
مجھ سے شیوہ نہیں چھٹنے کا مسلمانی کا　　قرق پیاسوں پہ میں کرنیکا نہیں پانی کا

خدمتِ احمدِ مختار میں جانا ہے مجھے
آج منہ ساقیٔ کوثر کو دکھانا ہے مجھے

دل تڑپتا ہے بس اب مجھ کو نہیں تاب کلام　　کل سے نرغے میں ہے محسن مرا اور میرا امام
اب نہ حاکم سے علاقہ ہے نہ تجھ سے کوئی کام　　دوستی مرد مسلمان کو ہے کافر سے حرام

ساتھ تیرا وہی دیگا جو کنشتی ہوگا
دوزخی کا کبھی پروانہ بہشتی ہوگا

پسرِ سعد پکارا کہ زباں اپنی سنبھال　　ابھی غصہ مجھے آجائے تو کیا ہو ترا حال
اپنی سرداری کا کچھ دھیان نہ حاکم کا خیال　　حلق و شمشیر ہے اس تیز زبانی کا مآل

با ادب گر مرے آگے سے نہ ٹل جائیگا
قید بھی ہوگا رسالہ بھی نکل جائے گا

حُر پکارا کہ سنبھال اپنی زباں کو اد شوم　　ہٹ کہ ہر نحس سعیدوں کیلیے سایۂ بوم
کھینچ لوں تیغ تو ہو جائے حقیقت معلوم　　چونٹیوں کی ہیں قطاریں ترے لشکر کا ہجوم
شیر قابو میں کب آتے ہیں یہ کیا بکتا ہے
حُر[1] ہوں میں مجھ کو کوئی قید بھی کر سکتا ہے

برچھیاں کیا یہ تری اور ترا بھالا کیا ہے　　کاٹنا منہ کا مرے سر کا نوالہ کیا ہے
خود میں بیزار ہوں یہ عہدہ و الا کیا ہے　　مجتمع چند نفر ہیں یہ رسالہ کیا ہے
جب تعلق نہ رہا مرد سبکدوش ہے پھر
نوکری چھوڑی تو آتری ہوئی پاپوش ہے پھر

حُر کے بھائی نے کہا او پسرِ سعد خموش　　کبھی آگاہ نہیں سخت کلاموں سے یہ گوش
رن میں آجائے اگر تیغ زنی کا ہمیں جوش　　مثل ماہی ابھی چور نگ ہوں یہ جوشن پوش
خاک پر خون کی نہریں ابھی جاری ہو جائیں
ہم ابھی چار جواں لاکھ پہ بھاری ہو جائیں

پاس آداب رکھیں شبیر یہ سکھ دل سے دُور　　اب ترا ساتھ نہ حاکم کی رفاقت منظور
دل میں کچھ سوچ تو او دشمن ادراک و شعور　　نار میں دیدہ و دانستہ گریں چھوڑ کے نور
راہِ حق سے نہ پھرے ہیں نہ پھریں گے اب تو
کٹ کے یہ سر قدمِ شہ پہ گریں گے اب تو

کیا نعرہ پسرِ حُر نے کہ او خانہ خراب　　اب جو بولیگا تو پھر تیغ سے دونگا میں جواب
یہ بزرگوں سے کلام کج و واکج یہ عتاب　　ہم سپاہی ہیں کڑی بات کی ہوتی نہیں تاب
نہ اگر حلم سے اپنے اب و عم بولیں گے
چار ہو جائیں گے اک منہ کے جو ہم بولینگے

تول کر گرز گراں سر کو پکارا یہ غلام　　میرے مختار سے یہ تند مزاجی کے کلام
تو ہے کیا اور ہے کیا مال ترا حاکم شام　　جان لے سر کے برابر ہے اجل کا پیغام

[1] حر یعنی آزاد

دب کے سینے میں گلا ناف میں ڈھل جائے گا

ابھی اک ضرب میں سر پاؤں سے مل جائے گا

مرثیہ کے دوسرے اجزاء کو لیجیے تو اُن سے بھی شجاعت کی بو آتی ہے۔ مگر چونکہ مضمون طولانی ہوا جاتا ہے لہذا اب ہم نہایت اختصار کے ساتھ خاص خاص عنوان کا ذکر کرینگے

آمد کسی کی سواری میدان جنگ میں آتی ہے تو اس شان و تجمل کے ساتھ کہ بہادری اور جوش ہر ہر قدم پر آنکھیں بچھاتے ہیں۔ یہ ٹکڑا عام طور سے شجاعت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ مجاہد کے تیور رعب و داب دشمن کی فوج میں تھرتھری پیدا کر دیتے ہیں گو یہ عنوان مختصر ہوتا ہے مگر اپنے ساتھ ہمت اور مردانگی کا پورا سامان لیے رہتا ہے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں

بڑھ کر نقیب فوج یہ کہتے تھے دم بدم
ہاں اے بہادرو نہ ہٹے ایک کا قدم
ابن معاویہ کے نمک کی تمھیں قسم
تیغوں سے سر دیانغ علیؑ کو کرو قلم
شیر خدا کے شیر کے آنے کا وقت ہے
ہاں غازیو یہ جان لڑانے کا وقت ہے

ناگہ سوار نیزوں کو دینے لگے تکاں
چمکیں اُبھی ہوئی صف اعدا میں برچھیاں
چلّوں سے تیر مل گئے کڑکی ہر اک کماں
غل تھا نشان دیں کو کرو آج بے نشاں
کچھ و نہ پاس یہ کہ امام زمانہ ہے
ہاں اے کماں کشو یہ تمھارا نشانہ ہے

یہ ذکر تھا کہ اتنے میں آئے شہ امم
طبل وغا پہ چوٹ پڑی کھل گئے علم
سردارِ فوج شام ہٹانے لگے قدم
رخ پھر گئے صفوں کے کسی میں رہا نہ دم
اللہ رے رعب فوج ستم تھرتھرا گئی
چہرے پہ روسیاہوں کے زردی سی چھا گئی

غل تھا زہے حسین زہے شان حیدری
دیکھی نہ یہ شکوہ نہ ایسی بہادری
تیور سے آشکار ہے رعب غضنفری
کس کی مجال ہے جو کرے اُنسے ہمسری
قابو میں ایسے شیر کا آنا محال ہے
لڑنا تو کیا کہ آنکھ ملانا محال ہے

۲۔ **مثال** ۔حضرت عباسؑ لشکر حسینؑ کے سپہ سالار تھے آپ کی شجاعت کی وہ دھاک تھی کہ بڑے بڑے زور آوران شام و روم گھبراتے تھے۔ اُن کی آمد کا بیان جہاں کہیں مرثیہ میں آیا ہے اُسکے ہر ہر لفظ سے ہمت و دلاوری آشکار ہے۔ اس مثال میں بھی آپ کو یہی خوبی نظر آئے گی۔

آیا ہے وہ جری جو ہزاروں میں فرد ہے　　شیروں کا شیر عازم دشت نبرد ہے
دہشت سے آفتاب کا چہرہ بھی زرد ہے　　بڑھکر بڑے سے جو اُسے لڑے وہ مرد ہے
سرپر کوئی ہوا نہیں اس خاندان سے
گھر میں انھیں کے اتری ہے تیغ آسمان سے

مشہور ہے جہاں میں یہ صفدر و حیدر ہے　　جبار کے غضب کا نمونہ ہے ان کا قہر
لڑنے میں آگئی جو شجاعت کی اُن کو لہر　　لاکھوں سے ایک وار میں یہ چھین لیں گے نہر
فرزند ہیں علی سے شہ کائنات کے
لاشوں کے پل بندھیں گے کنارے فرات کے

ہاں نورچشم فاتح خیبر قریب ہے　　لو وارث کشندۂ عنتر قریب ہے
لخت دل درندۂ خیبر قریب ہے　　جو تیغ کا دھنی ہے وہ صفدر قریب ہے
جوہر کبھی چھپے نہیں تیغ اصیل کے
کاٹے انھیں کی تیغ نے پر جبرئیل کے

یکتائے روزگار ہے وہ شیر حق کا لال　　اِک اِک جری ہے شیر درندہ دم جدال
اِن سے مقابلے کی بھلا ہے کسے مجال　　جرأت وہی ہے غیظ وہی ہے وہی جلال
دکھلائیں گے چلن اسد کردگار کا
گھر گھاٹ اِن کی تیغ میں ہے ذوالفقار کا

رشک چمن ہیں سب گل سرسبد یہ ہے　　آفاق میں نظیر ہر ہر اُحد یہ ہے
ذی مرتبت ہے صاحب فہم و خرد یہ ہے　　عباس نام کیوں نہو کس کا اسد یہ ہے
دیکھا نہیں جہان میں شیر اس جمال کا
دُرِّ نجف ہے فاطمہ زہرا کے لال کا

اللہ ری آمد عباس صف شکن — لرزاں تھے کوہ ہلتے تھے دل کانپتا تھا تن
جنگل کے شیر بن گئے تھے خوف سے ہرن — اک شور تھا کہ آج پڑے گا غضب کا رن

یہ شیر کم نہیں اسد قلعہ گیر سے
گویا مقابلہ ہے جناب امیر سے

تھا فوج قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر — تھیں موج کی طرح سب ادھر کی صفیں ادھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور — پانی میں تھے نہنگ ابھرتے نہ تھے مگر

فوجیں فقط نہ بھاگ گئی تھیں منھ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

چہرہ - یہ وہ عنوان ہے جو مرثیہ کے مطلع سے شروع ہوتا ہے جسمیں شاعر مختلف انداز سے اپنے بیان کو سنوارتا ہے جب کبھی شجاعت کا رنگ دیتا ہے تو وہ بھی رگ حمیت میں جوش کی لہر دوڑانے کے لیے کافی ہوتا ہے اور پڑھنے والے کے چہرے سے دلاوری کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔

دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اے رخش کلک رزم کا میدان دکھا مجھے — برہم ہجوم فوج بدایاں دکھا مجھے
دستے ستمگروں کے گریزاں دکھا مجھے — اوراق جزو کفر پریشاں دکھا مجھے

لکھ جائے دفتروں میں وغا فرد فرد کی
فصلیں جدا جدا ہوں کتاب نبرد کی

جب غازیوں کو رن کی رضا دی امام نے — کی فکر نام نیک ہر اک نیکنام نے
شیر نر جو گیا صف ہیجا کے سامنے — مانگی پناہ روح نریمان و سام نے

یکتا جو وہ جواں تھے جلالت میں زور میں
لرزاں زحل تھا چرخ پہ بہرام گور میں

ہاں تیغ آبدار زباں شعلہ بار ہو — مصروف ذکر معرکہ کار زار ہو
فقرہ ہر اک بسان دم ذوالفقار ہو — تیزی وہ ہو زباں میں کہ بجلی نثار ہو

رکھ لیجو آبرو کہ یہ پیاسے کی جنگ ہے
محبوب کبریا کے نواسے کی جنگ ہے

تلوار۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے دیکھنے والے کو خونخوار جنگ و سفاکی کا خیال آجاتا ہے اور کبھی کبھی یہ تمنا بھی ہوتی ہے کہ اسکو کہیں موقع سے چلتے ہوئے بھی دیکھ لیں، مگر اس تہذیب و ترقی کی دنیا میں (بالخصوص ہندوستان میں) یہ آرزو بہت کم پوری ہوتی ہے لیکن اگر کہیں ہو سکتی ہے تو وہ میدان جنگ نہیں بلکہ مرثیہ کے صفحات میں جہاں تذکرہ کارزار اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ تلوار کی لڑائی گھر بیٹھے آپ دیکھ سکتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اُسکے برکات سے مشرف اور نقصانات سے محفوظ رہتے ہیں۔ دل کو جوش اور اُمنگ کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ اور تلوار کی آنچ سے بھی آپ بچے رہتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

آئی جدھر وہ تیغ ہزاروں کے سر اُڑے — سنگیں لو کے سر پہ جو بیٹھی شرر اُڑے
پر کالۂ سپر اُڑے تیروں کے پر اُڑے — بازو کٹے کمانوں کے دست تبر اُڑے
لشکر پہ چھائی تیغ جناب امیرؑ کی
صف جل کے خاک ہوگئی فوج شریر کی

بڑھتی صفوں پہ تیغ دو دستی چلی گئی — پانی سے اُسکے آگ برستی چلی گئی
آئی جو اوج سے سوئے پستی چلی گئی — دم میں جلا کے خرمن ہستی چلی گئی
شامی ہر ایک کشتۂ شمشیر تیز تھا
لاشوں سے سب بھرا ہوا دشت ستیز تھا

گرتی تھی جب وہ تیغ شرربار فوج پر — رکتی تھی فرد پر نہ وہ تھمتی تھی زوج پر
آئی کڑک کے رہ گئی لہرا کے اوج پر — بجلی یہ تیغ چل گئی تلوار موج پر
قہر خدا کی صاف نشانی تھی ذوالفقار
پانی میں آگ، آگ میں پانی تھی ذوالفقار

باہم چلے جو تیغ دو دستی کے چار ہاتھ — سر سیکڑوں اُڑے تو کٹے بیشمار ہاتھ
وہ تیغ برق دم وہ جلالت شعار ہاتھ — خونریزی سے اُٹھاتی نہ تھی ذوالفقار ہاتھ

دریا تھا خوں کا دشت میں کوسوں بڑھا ہوا
نیزوں تھا ذوالفقار کا پانی چڑھا ہوا
جھنڈے حسام تیز کے مقتل میں گڑ گئے   ثابت قدم جو تھے قدم ان کے اکھڑ گئے
میداں میں کھیت لاشوں کے ہر سمت پڑ گئے   فوجیں تباہ ہو گئیں لشکر اجڑ گئے
ٹوٹا ہوا تھا پُل جو محیط نجات کا
تھا غرق بحر خوں میں سفینہ حیات کا

حضرت علی اکبر میدانِ جنگ میں ہاتھوں کی صفائی دکھا رہے ہیں۔ تلوار کی چال ڈھال اور تیزی قابل دید ہے ؎

دم ناک میں تھا فوج کا تلوار کو دیکھے   جاتے تھے چلے تیغ شرربار کو دیکھے
شعلہ سی لپکتی تھی وہ کفار کو دیکھے   تلوار کو دیکھے کہ کوئی وار کو دیکھے
یوں آن کے گرتی تھی وہ دشمن کے بدن پر
جس طرح سے شیر آتا ہے جنگل میں ہرن پر
جوہر صف اعدا کو دکھا کر نکل آئی   پھر خون میں ڈوبی تو نہا کر نکل آئی
دشمن کا جگر سینے میں کھا کر نکل آئی   ہر غول میں کس شان سے جا کر نکل آئی
کرتی تھی نظر وہ نہ برے پر نہ بھلے پر
چھریوں کی طرح چلتی تھی دشمن کے گلے پر
تھا غل کہ یہ تیغ تو جانے نہیں دیتی   میداں میں قدم ہم کو بڑھانے نہیں دیتی
سر تک سپر ہاتھ سے لانے نہیں دیتی   کیا لاگ ہے پاس اپنے یہ آنے نہیں دیتی
نے ہوش بدن کا نہ ہمیں سر کی خبر ہے
بجلی ہے کہ آفت ہے کہ شمشیر دو سر ہے
زندہ نہ کسی ظالم مکار کو چھوڑا   پیدل کو نہ مرکب کو نہ اسوار کو چھوڑا
نے تیر چلے کو نہ سوفار کو چھوڑا   لشکر میں نہ افسر کو نہ سالار کو چھوڑا
ثابت نہ کوئی عضو بدن چھوٹ کے نکلی
چار آئینے شیشے کی طرح توڑ کے نکلی

پنجے کو قلم کرکے سپر پر نہ لیا دم | چمکی بسر خود تو سر پہ نہ لیا دم
گردن پہ جو اُتری تو جگر پر نہ لیا دم | سینے میں در آئی تو کمر پر نہ لیا دم
ہر وار پہ اک اُس نے نیا رنگ دکھایا
راکب کو کبھی مرکب کو کبھی چورنگ دکھایا

بجلی کی طرح گاہ چمکتی ہوئی آئی | لہراتی ہوئی اور بہکتی ہوئی آئی
خوں میں کبھی دشمن کے ٹپکتی ہوئی آئی | ہر غول میں شعلہ سی لپکتی ہوئی آئی
لشکر پہ گری اور کبھی کوندکے نکلی
ہر غول کو سبزی کی طرح روندکے نکلی

زیں پر کبھی چمکی کبھی سر پر نظر آئی | گہہ خود پہ گہہ سینے کے اندر نظر آئی
ناگن نظر آئی کبھی اژدر نظر آئی | بجلی کبھی شعلہ کبھی صرصر نظر آئی
بہ نجا وہ سقر کو جو چڑھا گھاٹ پہ اُسکے
قربان ہوئے جاتے تھے سر کاٹ پہ اُسکے

ہر وار پہ اس تیغ کو کستے ہوئے دیکھا | اژدر کی طرح فوج کو ڈستے ہوئے دیکھا
کٹ جانے پہ سر زخموں کو ہنستے ہوئے دیکھا | ہر ضرب میں خوں اس سے برستے ہوئے دیکھا
پھر خوں میں نہا دھوکے جو وہ لال ہوئی تھی
سب فوج عدو خاک میں پامال ہوئی تھی

جس صف کی طرف آئی سنبھلتی ہوئی آئی | ہر ضرب پہ تیوری کو بدلتی ہوئی آئی
ناگن کی طرح زہر اُگلتی ہوئی آئی | اژدر تھی کہ ہر صف کو نگلتی ہوئی آئی
اس طرح لیے جاتی تھی سر آکے بدن سے
جسطرح کوئی پھول اُٹھا لیوے چمن سے

اس طرح پر اکثر گھوڑے کی تعریف، تذکرہ کارزار، سراپا وغیرہ سے شجاعت اور مردانگی کا دریا موجزن ہے۔ ہم نے آپ کے سامنے مرثیہ کے مختلف عنوانات پیش کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کوئی جزو مرثیہ میں ایسا نہیں کہ جس سے پست ہمتی کی بو آتی ہو۔ یہاں تک کہ بین میں بھی ایسی

کوئی بات نہ نظر آئے گی۔ چنانچہ ابتدا ہی میں بتا دیا گیا ہے کہ عزادارانِ حسین اس بات پر شکیبا ہرگز نہیں ہوتے کہ میدانِ کربلا میں بہادری کیوں دکھائی گئی بلکہ رونا تو اسی کا ہے کہ شرافت۔ عالی ہمتی اور شجاعت کا خون کیا گیا،

اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرثیہ سے تمام اُردو ادب متاثر ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اسمیں بھی سوز و گداز، افسردگی اور پست ہمتی کا عنصر غالب ہو گیا۔ اس دعوی کی تائید میں غزل پیش کی جاتی ہے، ہم اس کا جواب اپنے ایک مضمون[1] میں دے چکے ہیں لیکن اب بھی بہت سے لوگوں کو اطمینان نہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض یا الزام بالکل سطحی ہے اور یہاں تک سطحی ہے کہ جس کی کوئی بنیاد نہیں معلوم ہوتی۔ غزل کے لیئے ابتدا ہی سے سوز و گداز جزو لاینفک قرار دیے گئے اس لیے کہ اس سے زیادہ پُر اثر کوئی چیز نہیں ہو سکتی جو معشوق کو ہمدردی پر مائل کرے، مرثیہ کے عہدِ شباب سے پہلے کا بھی اگر آپ کلام دیکھیں گے تو یہی رنگ نظر آئیگا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ درد۔ میر۔ ظفر وغیرہ میر انیس یا مرزا دبیر کے کلام سے متاثر تھے جو اپنے دیوان کو درد و سوز و گداز کا مرقع بنا گئے۔ اگر افسردگی اور پست ہمتی کا عنصر آپ کو کہیں اُردو میں نظر آتا ہے تو اسکا ذمہ دار مرثیہ نہیں بلکہ اُس کا سرچشمہ انتزاع سلطنت ہے، بدقسمتی سے اُردو کی نشو و نما ایسی گھڑی سے ہوئی کہ جسوقت مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ انحطاط اور اضمحلال کے سیاہ بادل کسی طرف سے روشنی کی جھلک نہیں آنے دیتے تھے۔ ہندوستان میں اسلامی شان و شوکت کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ رہا تھا ایسی صورت میں لازمی تھا کہ افسردگی اور پژمردگی کا عنصر اُردو میں ضرور آجائے۔ ظفر سے زیادہ کون ماتم گسار ہو سکتا تھا۔ تیموریہ خاندان کا نام نہاد بادشاہ سہی مگر دل کے درد کو کیا کرتا، باپ دادا کا نام مٹتے ہوئے دیکھکر اپنے جذبات کو کیونکر روکتا، حسرت دیکھتا اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا کسی سے بھی اُمید نہیں ہو سکتی تھی کہ بابر و اکبر کی سلطنت پھر قائم کریگا۔ ایسی صورت میں اُسکے کلام میں یا دوسرے شعراء زمانہ شناس کے اشعار میں افسردگی ہے تو بیجا کیا ہے،

اگر مرثیہ کی وجہ سے پست ہمتی یا افسردگی پیدا ہوئی ہوتی تو اُسکے دو سبب ہو سکتے تھے

[1] ملاحظہ ہو الہ آباد یونیورسٹی کا اُردو میگزین (نوید زندگی کا جواب) ۱۹۳۰ء

یا تو امام حسینؑ کی تلقین میں یہ جھلک ہوتی یا مرثیہ گو شعرا نے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہوتا۔ مگر خوش قسمتی سے دو میں سے ایک بھی نہیں امام حسینؑ کے جذبات کا حال تو دنیا پر روشن ہی کہ عالی ہمتی اور شجاعت کی وہ بنظیر مثال قائم کی کہ جس کا جواب نہیں۔ ایک ادنیٰ سی بات یہ ہی کہ یزید کی فوج ایک موقع پر ایسی پیاسی ہوئی کہ آدمی اور جانوروں کی زبانیں نکلی آتی تھیں امام حسینؑ سے یہ حال نہ دیکھا گیا اپنے لشکر کا سارا پانی دشمن کی فوج کو پلا دیا۔ اسی کو تعشق مرحوم نے یوں بیان کیا ہی ؎

آپ پیاسا ہے غیروں کے لیے مشکل ہی   واہ کیا لخت دل فاطمہؑ دریا دل ہی

شجاعت وہ کہ ۷۲ آدمیوں کے ساتھ ایک جم غفیر کا مقابلہ کیا۔ بھوک پیاس میں وہ بہادری دکھائی کہ آج تک ضرب المثل ہی۔

مرثیہ کا حال آپ دیکھ چکے کہ جستہ جستہ مضامین میں بھی کہیں کوئی ایسی بات نہیں ملی کہ جسکو پست ہمتی سے تعبیر کرتے۔ اگر ایک سرسری نظر سے بھی مرثیہ دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ سر سے پیر تک شجاعت اور ہمت کا ایک مرقع ہی جسکے ہر گوشے میں جوش اور ہمت کا رنگ بھرا ہوا ہی اُردو تو اُردو فارسی ادب میں کوئی ایسی شے نہیں ملتی جو اسقدر حمیت اور مردانگی انسان کے دل میں پیدا کر دے۔

یہ ہم کو تسلیم ہی کہ مرثیہ میں صبر و قناعت استقلال کی بھی تعلیم دی گئی ہی لیکن اگر کسی کے نزدیک یہ انسانیت کی علامتیں میدان عمل و ترقی میں سنگ راہ ہیں تو اُسے قرآن مجید پھر سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ جو ان ہدایتوں کا سرچشمہ ہی۔ امام حسینؑ کی تمام تر تلقین اسی امر پر مبنی ہی کہ برائی کے مٹانے میں چاہے تم خود مٹ جاؤ گھر تباہ ہو جائے اعزا و اقربا قتل ہو جائیں مگر راہ راست سے قدم نہ ڈگمگیں اس کی قطعاً پرواہ نہ کرو کہ ہم قلیل ہیں اور دشمن کثیر ہیں۔ خدا مدد کریگا جس راہ پر امام حسینؑ نے دنیا کو چلانا چاہا تھا اگر اُس پر مسلمان عمل کرتے تو آج ترقی اور شجاعت کے اُس میدان میں نظر آتے کہ جہاں اُن کا کوئی حریف نہ ہوتا۔

سراج اور اثر

سراج نے جہاں روحِ رواں کی تعریف کی تھی متعدد اعتراض بھی کیے تھے منجملہ اُنکے چھ شعروں اور دو رباعیوں کی تنقید مجھے درست نہیں معلوم ہوئی اور میں نے ادب کے کسی نمبر میں اپنے اختلاف کا اظہار کیا۔ مجھے اُن کی منصف مزاجی بہت پسند آئی کہ اُنھوں نے میرے مضمون کے تقریباً نصف حصّہ کی صحت تسلیم کرکے باقی چار شعر اور ایک رباعی کے متعلق اپنا عدمِ اطمینان اور مزید تبادلۂ خیالات کی ضرورت سمجھی۔ اُن کی یہی خواہش اس خامہ فرسائی کی محرک ہی۔

رواںؔ کا شعر ہے سے

سنگِ حریمِ کعبہ خود بڑھ کے جبیں کو بوسہ دے
ایسے بھی چند سجدے ہیں ناصیۂ نیاز میں

سراج کو اعتراض تھا اور یہ کہ سجدے جبیں میں نہیں ہوتے نشانِ سجدہ ہو سکتا ہی میں نے مثال دیکر سمجھانا چاہا تھا کہ اگر ذائقہ زبان میں، شامہ ناک میں ہو سکتا ہی تو جبین میں سجدہ بھی ہو سکتا ہی جو ان چیزوں میں ربط ہی وہی جبین اور سجدہ میں ہی۔ میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اقبال یا رواںؔ کے شعر میں صرف ناصیہ یا جبیں نہیں ہی بلکہ ناصیۂ نیاز ہے۔

نیاز (جذبۂ عبودیت و بندگی) کو ایک شخص یا ذات فرض کرکے بطریقِ مجاز مرسل پیشانی سے متصف کیا کیونکہ ذوقِ سجود شانِ عبودیت ہی اور پیشانی کو سجدوں سے ربط ہی ایسی جبین میں سجدوں کا وجود مضمر ہے مگر نشانِ سجدہ کہاں سے آئے گا کیونکہ یہ شخصیت غیر مرئی ہی۔

سراج اپنے اعتراض کی توضیح کرتے ہیں اُن کو میرے بیان کردہ مفہوم نیاز میں بھی تامل ہی۔ اُن کے نزدیک اس لفظ کے اصلی معنی حاجت اور آرزو کے ہیں۔ اور سجدہ ایک فعل ہی جو ارتکاب پر موقوف ہے پس جبین میں یا جبین نیاز میں سجدہ کا ہونا کیا معنی رکھتا ہی اہلِ اسلام میں تو اعضائے سجدہ

بھی سنگ حریم کعبہ کو چومنے بڑھیں گے اور سجدے ان سب میں مخفی ماننے پڑیں گے - ایسی صورت میں جبین کی تخصیص کی کیا وجہ ہے"

"جس طرح نیاز کو ایک ذات فرض کر سکتے ہیں اسی طرح ناصیۂ نیاز میں نشان سجدہ بھی فرض کیا جاسکتا ہے"

آثر = سراج نے اپنے اعتراض کی نوعیت بدل دی ہے پہلے یہ اعتراض تھا کہ ناصیۂ نیاز میں سجدہ کا ہونا کیا معنی رکھتا ہے یعنی ناصیۂ نیاز میں سجدہ کا وجود ممکن نہیں - میں نے اسی کو مدنظر رکھ کر جواب دیا تھا - اب وہ کہتے ہیں کہ سجدہ ایک فعل ہے جو ارتکاب پر موقوف ہے لہذا سجدہ کا جبین میں ہونا بے معنی ہے نیز یہ کہ جبین کے لیے سجدہ کی تخصیص نہیں دار اعضا بھی شامل ہیں ان سب میں سجدوں کا وجود ماننا پڑیگا -

بحث کے آخری حصہ میں اہل اسلام کے معتقدات شامل کر کے اعضائے سجدہ کو وسعت دیکر جبین کی تخصیص مٹائی گئی ہے، میں انھیں کی دلیل سے ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ یہ ادعا قابل قبول نہیں کہ سجدہ ایک فعل ہے جو ارتکاب پر موقوف ہے - کوئی نماز بغیر سجدہ کے بجز نماز میت ادا نہیں ہوسکتی اور نماز کا فریضہ بجا لانے میں اسقدر تاکید کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص ڈوب رہا ہو تو محض آنکھوں کے اشاروں سے ادا کرے - گویا محض خیال سجدہ یا سجدہ کا اشارہ سجدہ کا بدل ہوگیا ایسی صورت میں سجدہ ایسا فعل کہاں رہا جو ارتکاب پر موقوف ہو - وہ اعضا جو سجدہ کے لیے مختص کیے گئے ہیں معطل رہے اور سجدہ نہیں بلکہ پوری نماز ادا ہوگئی -

نیاز کو ایک ذات فرض کرکے سجدوں کو اس سے منسوب کرنے کا جو میرا دعویٰ تھا سراج نے اسکی تردید نہیں کی اور وہ بدستور قائم ہے - یہی نہیں بلکہ اہل فن نے "جبین سجدہ" استعمال کیا ہے یعنی خود سجدہ کو جبین سے متصف کردیا - سجدہ کی جبین،

ایک دلیل اور پیش کرتا ہوں - ہر شئے کے دو وجود ہوتے ہیں یا ہوسکتے ہیں ایک ذہنی دوسرا خارجی باغ میرے پیش نظر نہو مگر میرے ذہن میں اسکا وجود ہے اسی طرح ممکن ہے کہ میرا ذہن ایسی شئے کا تصور کرے جس کا وجود خارجی نہیں ہے یا جو غیر مرئی ہے - مثلاً عنقا یا استغنا - میں سجدہ نہ کروں مگر سجدہ کا ارادہ یا آرزو ہے - شرع میں جو کچھ ہے ظرف سجدہ پیشانی ہے لہذا اگر میں کہوں کہ سجدے میری

جبیں میں تڑپ رہے یا میری جبیں میں موجود ہیں تو کیا حرج ہے۔علاوہ بریں جیسا عرض کیا جا چکا ہے جب نیاز کو ایک ذات فرض کیا اور جو ذات بھی ایسی جو سراسر جذبۂ عبودیت و بندگی وفنا دگی ہو تو اسکی جبین میں سجدوں کا نہونا سجدوں کے ہونے سے زیادہ حیرت انگیز ہے،

مگر سراج کو تو لفظ نیاز کے ان معنوں ہی سے اختلاف ہے اُن کا قول ہے کہ اس لفظ کے اصلی معنی حاجت اور آرزو کے ہیں۔میں مانتا ہوں کہ لغات کشوری میں لفظ نیاز کے یہی معنی درج ہیں مگر زبان اصلی معنوں کی کبھی پابند نہیں ہوتی بلکہ نازک فرق مفاہیم پیدا ہوتا جاتا ہے ذیل میں دیوان حافظ سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں ان میں جہاں جہاں لفظ نیاز واقع ہوا ہے اگر صرف حاجت یا آرزو کے معنی لیجئے تو بہت کم شعر ایسے رہیں گے جو مہمل یا بے مزہ نہ جائیں ؎

المنۃ للہ کہ در میکدہ بازست　　زاں رو کہ مرا بر در او روئے نیاز ست

یہاں نیاز خلوص وعقیدت کا مرادف ہے ؎

از بے ہمہ مستی وغرور ست و تکبر　　وز ما ہمہ بیچارگی و عجز نیاز ست

یہاں نیاز کا مفہوم اطاعت و فرمانبرداری ہے ؎

میان عاشق ومعشوق فرق بسیارست　　چو یار ناز نماید شما نیاز کنید

یہاں نیاز سے مراد فروتنی ہے ؎

اے سرو ناز حسن کہ خوش میروی بناز　　عشاق را بناز تو ہر لحظہ صد نیاز

یہاں بھی عجز کا مفہوم ہے ؎

غبار خاطر ما چشم خصم کور کند　　تو رخ بخاک بنہ اے حافظ از مقام نیاز

مقام نیاز مقام طاعت وفرماں گذاری ہے جسمیں عجز وانکسار مضمر ہے ؎

نیازمند بلا گو رخ از غبار مشوئے　　کہ کیمیائے مرادست خاک کوئے نیاز

یہاں نیازمند حاجتمند کے معنی دیتا ہے اور کوئے نیاز وہی مقام طاعت وبندگی ہے

ساقئے ناز بقفا ودگر داں عادت　　چوں بپرسیدن ارباب نیاز آمدہ

ارباب نیاز اہل آرزو ہیں،

حاصل۔سراج کہتے ہیں کہ سجدے پیشانی میں نہیں ہوتے میں کہتا ہوں کہ ہوتے ہیں

بالخصوص ناصیہ نیاز یا جبین نیاز میں اور اُن کا پایہ اُن سجدوں سے کہیں برتر ہے جنکی علامت پیشانی اور ہتھیلیوں اور گھٹنوں کا ٹیکنا ہے۔ اُن کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ اقبال حقیقت منتظر کو لباس مجاز اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ یہ سجدے نذر دیے جائیں اور رواںؔ کو یہ ناز ہے کہ

سنگ حریم کعبہ خود بڑھ کے جبیں کو بوسہ دے   ایسے بھی چند سجدے ہیں ناصیہ نیاز میں

دوسرا معرض بحث شعر ہے

یہی ہستی اسی ہستی کے کچھ ٹوٹے ہوئے رشتے   وگرنہ ایسا رشتہ میرے اُن کے درمیاں کیا تھا

بحث اس قدر نازک ہے کہ پوری عبارت نقل کیے بغیر چارہ نہیں،

سراج (ابتدائے اعتراض)

عبد اور معبود کے درمیان جو رشتہ قائم ہے اور جو پردہ حائل ہے اس شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے اور انداز بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ پردہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ردیف تھا یہ ظاہر کرتی ہے کہ پردہ تھا اب نہیں ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے شعر کا پہلا مصرع مبہم اور معنی بند ہے۔ ہستی سے مراد انسان کا بقید حیات ہونا اور ہستی کے ٹوٹے ہوئے رشتے کا مفہوم نظام حیات میں خلل اور انتشار واقع ہونا یعنی موت۔ لہذا یہ نتیجہ نکلا کہ زندگی اور موت یہی دونوں چیزیں پردہ ہیں۔ زندگی تو پردہ ہو سکتی ہے مگر موت عین وصال ہے اور اسی بنا پر دونوں کا پردہ ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر ہستی کے ٹوٹے ہوئے رشتے سے مراد موت نہیں کچھ اور ہے تو اس کا علم شاعر کو ہے شعر سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔

میرا پہلا جواب =

رواںؔ نے ہستی کے ٹوٹے ہوئے رشتے (بصیغہ جمع) کہا اور سراج نے اس کو ہر جگہ واحد کر کر موت سے تعبیر کیا نتیجہ غلط نہ نکلتا تو کیا ہوتا۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہستی نام ہے مجموعۂ اضداد کا لہذا ہستی کے ٹوٹے ہوئے رشتے اس کے بظاہر غیر مربوط و متبائن و متضاد تعلقات ہوئے۔ اس کی مثالیں متعدد ہیں۔ شادی و غم، رنج و راحت سکون و اضطراب وغیرہ وغیرہ۔ اگر اُن کا امتیاز مٹ جائے اور ایک دوسرے میں جذب یا تحلیل ہو جائیں تو معمائے ہستی حل ہو جائے

رواں پہلے مصرعہ میں کہتے ہیں کہ نہ صرف ہماری ہستی حجاب ہے بلکہ اسکے تمام تعلقات حجاب اندر حجاب ہیں جہاں یہ اختلافات مٹے یا یوں کہیے کہ رشتے ٹوٹے جزو کل ایک ہو گئے۔

دوسرا اعتراض ردیف پر ہے حالانکہ اسی نے شعر میں خوبیاں پیدا کیں بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ اگر ردیف بجائے تھا کے ہے ہوتی تو شعر مہمل ہو جاتا جب پردہ موجود ہے تو یہ علم کیونکر ہوا کہ ہستی اور اس کے متعلقات پردہ ہیں۔ یہ آگاہی اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہستی کے رشتے منقطع ہو کر احساس "انا" دل سے محو ہو جائے۔ اہل باطن کی نظر میں شکست ہستی کے یہی معنی ہیں۔ یہ احساس انا محض فریب خیال ہے اسی رواں نے اس کو اہمیت نہیں دی۔ سراج اسپر بھی معترض ہیں۔ کیوں؟ انکی عبارت سے اندازہ نہیں ہوتا

سراج کا جواب الجواب

شعر کے جو معنی اثر نے بیان کیے اس سے میری تسلی نہیں ہوئی۔ اسطرح تو دنیا میں کوئی کلام بےمعنی نہیں رہتا تو جہات الفاظ شعر سے جسقدر پیدا ہوتی ہیں انھیں سے بحث کی جاتی ہے جو توضیح اثر نے کی وہ لازم المعنی نہیں ہے۔ ہستی کے ٹوٹے ہوئے رشتوں سے کیفیات متضاد مراد لینا کسی حقیقی یا مجازی دلیل کا محتاج ہے۔ رنج و خوشی کا متضاد ہونا مسلم مگر یہ چیزیں لازمۂ حیات انسانی ہیں نہ کہ حیات انسانی۔ ہستی وجود کا ترجمہ ہے اگر ہستی کے ٹوٹے ہوئے رشتے جو بقول اثر سکون و اضطراب وغیرہ باقی نہ رہیں تو کیا وہ پردہ جو درمیان عبد و معبود وجہ فراق ہے مرتفع ہو جائیگا؟ ٹوٹے ہوئے رشتوں کی قید سے کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا ہستی کا مقابل نیستی ہے۔ نیستی واجب الوجود سے ملانے والی شئے ہے۔ اگر یہاں ہستی سے مراد وجود عنصری ہے تو اسے اصطلاحاً تشخص کہتے ہیں یعنی انسان مع اپنے اعضائے بدنیہ کے۔ ہستی عام ہے جسم و روح دونوں کے لیے اور دونوں وجودی ہیں عدمی نہیں۔ اگر ہستی باقی نہ رہے تو واجب الوجود سے واصل کون چیز ہوگی۔

اثر کی گذارش

سراج نے میرے جواب کے ابتدائی چند فقرے لیکر باقی عبارت کو شاید فضول سمجھکر چھوڑ دیا۔ حالانکہ جس عبارت پر جواب کی بنیاد قائم کی ہے محض تمہید تھی۔ ایک حد تک اس کا ذمہ دار میں بھی ہوں جسکا مجھے اعتراف ہے۔ میرا منشا یہ تھا کہ تعلقات ہستی حجاب ہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ متضاد کیفیتوں کا مجموعہ ہیں اگر اُن کا اختلاف مٹ جائے تو معمائے ہستی حل ہو جائے اور حجاب اُٹھ جائے مگر منزل تک رسائی پھر بھی نہ ہوگی کیونکہ تعلقات دنیوی کے علاوہ خود ہماری ہستی حجاب ہے بقول میر ؎

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ ہم نہویں تو پھر حجاب کہاں

اس مدعا کو اپنی بے استعدادی یا سہل نگاری کے باعث اچھی طرح واضح نہ کرسکا گویا بعد کی عبارت اس مفہوم کی طرف اشارہ ضرور کرتی ہے۔ سہولت کے لیے دوبارہ نقل کرتا ہوں:-

"رواں کہتے ہیں کہ نہ صرف ہماری ہستی پردہ ہے بلکہ اُس کے تعلقات حجاب اندر حجاب ہیں"

مندرجۂ ذیل عبارت بھی اسی مطلب کی رہنمائی کرتی ہے:-

"...... ہستی اور اُسکے متعلقات پردہ ہیں۔ یہ آگاہی اسی وقت ہوسکتی ہے جب ہستی کے رشتے منقطع ہوکر احساس "انا" دل سے محو ہوجائے"

"اہل باطن کی نظر میں شکست ہستی کے یہی معنی ہیں"

میں سراج سے استدعا کرونگا کہ اب میرے جواب کی روشنی میں اپنے اعتراض کو پڑھیں اور پھر کوئی نتیجہ موافق یا مخالف نکالیں۔

میرے اس خیال کو اب بھی لغزش نہیں ہوئی کہ ٹوٹے ہوئے رشتوں سے اُن کا بیان کردہ مفہوم نظام حیات میں خلل واقع ہونا ہرگز نہیں ہوسکتا بلکہ ایسے تعلقات ہیں جو منقطع ہوگئے۔ اسی طرح ہستی سے مراد بقید حیات ہونا نہیں ہے بلکہ احساس "انا" ہے یا پندار خودی، اور ہستی اس اعتبار سے نہ تو وجود کا ترجمہ ہے نہ اس کا مقابل نیستی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ میرے جواب کا ابتدائی جز مبہم رہ گیا تھا مگر جو نتائج میں نے مرتب کیے تھے بدستور اپنی جگہ پر ہیں۔

سراج کی عبارت میں ایک جگہ تقیض کا عیب ہے۔

نیستی واجب الوجود سے ملانے والی شے ہے اور اگر ہستی باقی نہ رہے تو واجب الوجود سے واصل کون چیز ہوگی؟

ممکن ہے کہ سہو کاتب سے کوئی لفظ رہ گیا ہو۔

تیسرا شعر

قابل رشک ہیں دیوانوں کے آپس کے سلوک اُن کو زنجیر سے زنجیر بدلتے دیکھا

اس شعر پر سراج کا اعتراض یہ تھا کہ وابستگان زنجیر کے درمیان زنجیر بدلنے کا امکان اسوقت ہوسکتا ہے جب سب اہل ہوش ہوں یا دو میں ایک ہوشیار ایک دیوانہ ہو۔ اگر دونوں دیوانے ہیں تو وہ زنجیر سے زنجیر کیوں

بدلنے لگے،

میں نے جواب دیا کہ زنجیر سے زنجیر بدلنے میں شانِ دیوانگی موجود ہی لہٰذا شعر لفظاً درست ہی اور معناً اسطرح درست ہی کہ اُس رشتۂ اخوت و اتحاد کی مصوری ہی جو دیوانگانِ عشق میں ہوتا ہی،

سراج کہتے ہیں کہ ان دونوں مطالب میں نقص تضاد ہی اور شعر سے واضح نہیں ہوتا کہ آیا اس میں دیوانگی کا بیان ہی یا فرزانگی کا لہٰذا معنی کا تعین بھی مشکل ہی زنجیر بدلنا فعل عبث ہی اس لیے کسی فرزانہ کا کام نہیں۔ اور رشتۂ اخوت قائم کرنے کا احساس دیوانوں کو نہیں ہوسکتا۔

آثر کی مزید گذارش = دیوانوں کی فرزانگی ضرب المثل ہی،

دیوانہ بکارِ خویش ہشیار = اور انگریزی میں ہی۔

There is method in his madness

(اس کے جنون میں سلیقہ ہی) = لوگ کسی خاص خیال یا جذبہ کے تابع ہو کر دیوانے ہوجاتے ہیں اور وہی خیال یا جذبہ عالمِ دیوانگی میں بھی کارفرما رہتا ہی شعر میں جن دیوانوں کا تذکرہ ہی شیدائیانِ اتحاد و اخوت تھے وہی جذبہ موجود ہی اور زنجیر سے زنجیر بدلکر اُس رشتۂ اخوت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کو اپنے فعل کی بھلائی یا خوبی کا احساس نہو مگر ان کا فعل اہلِ ہوش کے لیے قابلِ رشک ہی

شاعر ہمیشہ دیوانگی کے پردے میں یا دیوانوں کی زبان سے کوئی پتے کی بات کہتا ہی (بشرطیکہ شعر شعر کہے جانے کا مستحق ہو) میں سراج سے استدعا کرونگا کہ اپنا کوئی شعر (یہ قید ضروری ہی کسی اور کا شعر نہو) ایسا پیش کریں جو خالص دیوانگی کا مرقع ہو اور فرزانگی کو دخل نہو تاہم بامعنی ہو =

چوتھا شعر ــ

ہر ذرہ ہی ازل سے نغمہ طرازِ ہستی　　اسپر بھی ہی ابھی تک بے ربط سازِ ہستی

اعتراضِ سراج

یہ شعر سازِ ہستی کے ترتیب دینے والے کی توہین ہی سازِ ہستی سے کیا مراد ہی اور وہ بے ربط کیوں ہی نغمہ رکن کے ساتھ سازِ ہستی کی تکمیل ہوگئی تھی ازل سے اسوقت تک اُس کا بے ربط رہنا کیا معنی رکھتا ہی

جوابِ آثر = سازِ ہستی خود ہستی ہی۔ سائنے کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ذرہ ازل سے سازِ ہستی میں نغموں کو ترتیب دیرہا ہی مگر اب تک ساز سے وہ نغمے نہیں بلند ہوتے جو ہستی کا منشا واضح کردیں اور ساز کے

مختلف پردوں (ہستی کے مختلف مشاہدات و مظاہرات) میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے

رد اس نے ساز ہستی کا صانع خدا کو مانا ہے اور نغموں کا ترتیب دینے والا ذروں کو اس لیے کہ عالم مادی ذروں کا مجموعہ ہے۔ اگر کوئی شخص ساز سے نغمے ترتیب نہ دے سکے تو یہ اُسکی خامی ہے یا ساز بنانے والے کی۔ نغمے نکلتے تو ہیں مگر بے ربط اور مختلف ایسے نہیں کہ تمام عالم ایک ہی نغمہ سے گونج اٹھے۔ میں تو یہاں تک عرض کرونگا کہ شعر سے صنع یکتائے خالق بے ہمتا کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک ساز ہے اور اُسپر ہر ذرہ ازل سے مصروف نغمہ نوازی ہے مختلف نغمے نکل نکلکر فضائے بسیط میں پھیل جاتے ہیں تاہم وہ نغمہ طالع نہیں ہوتا جسکے لیے صناع نے ساز ہستی کو وضع کیا۔ ازل سے اب تک یہ کوشش برابر جاری ہے گو ہائے نغمہ شگفتہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نئی نئی راہیں نکلتی ہیں ہر نغمہ ایک جدید انکشاف ہے تاہم ہر نغمہ غالب کے الفاظ میں اپنی شکست کی آواز ہے۔ جب تک ساز بنانیوالے کا منشا پورا نہو ساز یقیناً بے ربط ہے۔ یہ عیب ساز میں یا ساز کا نہیں ہے بلکہ ہم کو اُسکے پردے ملانا نہیں آتے۔ گو استعداد موجود ہے ورنہ نغمہ طراز نہوتے،

سراج کا جواب الجواب

مادیین کا یہ قول ہے کہ ذرے خود بخود مل گئے اور اُنھوں نے کوئی صورت اختیار کرلی حکمائے الٰہین کہتے ہیں کہ صانع نے اپنے ارادے سے اُن ذرات کو مرتب کیا یعنی غیر ذات الشعور کو یہ سلیقہ نہیں ہے کہ وہ ایک ترتیب خاص سے خود بخود مرتب ہو جائے اور ہر چیز کی صورت اپنی نظم و ترتیب خاص پر بھی قایم رہے اسکو ایک وضع خاص پر لانے کے لیے محرک درکار ہے۔ شعر میں محرک کی منقصت ہے جو معنی اثر نے لیے وہ الفاظ سے پیدا نہیں ہوتے۔ ایک مرتبہ اس شعر کی نثر کیجیے ہر ذرہ ازل سے ہستی کے نغمے گا رہا ہے باین ہمہ ساز ہستی بے ربط ہے یعنی راگ درست ہے اور باجہ یعنی ساز ناقص۔ ساز کیا ہے جسپر یہ راگ گایا جاتا ہے وہی لوازم وجود۔ آثر کہتے ہیں کہ یہی ساز خدا کا بنایا ہوا ہے اور رواں کہتے ہیں کہ یہی بے ربط ہے اب کس کی مانیں۔

رواں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ راز ہستی غیر منکشف ہے یا بالفاظ دیگر راگ محسوس ہوتا ہے مگر راگ کا سر پیدا کوئی نہیں کرسکتا لہذا راز ہستی ایک ایسا نغمہ ہے جو کہ جانا بوجھا نہیں ہے حالانکہ الفاظ اس مفہوم کے ادا کرنے سے قاصر ہیں اور یہی عین اعتراض ہے،

ہر وہ شے جو چشم ظاہر کو بے ربط معلوم ہوتی ہے ایک نظام خاص اور ترتیب خاص رکھتی ہے اور یہی عین نظام ہے اُسے بے ربط کہنے کا حاصل یہی ہے کہ صانع کی صنعت میں نقص ہے۔ نغمۂ ہستی ہو یا ساز ہستی جو شاعر کی نگاہ میں بے ربط ہے وہ صانع ازل کے سلیقہ ترتیب میں عیب ہے =

آثر کی مزید گذارش =

افسوس کہ سراج اُس نازک فرق کو نہیں سمجھے جو گانے میں اور نغموں کو ترتیب دینے میں ہے وہ کہتے ہیں کہ ہر ذرہ ازل سے ہستی کے نغمے گا رہا ہے= حالانکہ طراز کے معنی ترتیب دینے کے ہیں لہذا پہلے مصرعہ کے یہ معنی ہوے کہ ہر ذرہ ازل سے ہستی کے نغمے ترتیب دے رہا ہے= تاہم ساز ہستی بے ربط ہے= ساز کی بے ربطی سے ساز کے نقص کا نتیجہ نکالنا بھی درست نہیں =

مثال کے لیے ستار لیجئے جو شخص ماہر فن ہے اُس سے کیسے کیسے میٹھے سُر نکالتا ہے۔ جہاں کوئی تار ڈھیلا یا بے میل ہوا فوراً درست کیا= کوئی اناڑی اسی ستار کو بجائے تو سوائے سامعہ خراش جھنکار کے سُریلی صدا نہ نکلے گی۔ لہذا عیب ساز میں نہیں بلکہ بجانے والے کے سلیقہ پر منحصر ہے،

ہستی ایک ساز ہے جس پر ہر ذرہ ازل سے نغمہ طرازی کر رہا ہے مگر اُس کے کُل پردوں سے واقف نہیں، پورے ساز پر عبور نہیں تاہم نغمے ترتیب پاتے جاتے ہیں اور بجائے خود دلکش ہیں مگر وہ فروغ نغمہ کہاں جو اُس کے تمام پردوں کے ایک ساتھ چھڑ جانے میں ہو سکتا ہے۔ اسی سے میں نے عرض کیا تھا کہ جب تک ساز بنانے والے کا منشا پورا نہو ساز یقیناً بے ربط ہے اور یہ خطا ساز کی نہیں بلکہ ہماری ہے کہ اُس کے پردے ملانا نہیں آتے۔ گو استعداد موجود ہے ورنہ نغمہ طراز نہوتے۔

سراج نے نہ معلوم کہاں کی مارئین اور الہیین کی بحث چھیڑ دی جو قطعاً غیر متعلق ہے۔ میرا یا ذات کا یہ مطلب نہیں کہ خدا نے کسی چیز کو ناقص خلق کیا نہیں ہر شے میں تکمیل کی استعداد موجود ہے اور نظم و ترتیب ہے مگر سراج کی طرح یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ لفظ کن کے ساتھ ساز ہستی کی تکمیل ہو گئی تھی تخلیق ہو گئی تھی اور جہاں تک صلاحیت کا تعلق ہے تکمیل بھی۔ مگر دنیا امر اہبطو کے تابع اپنی قسمت کی تکمیل کو برابر آگے بڑھ رہی ہے اور بڑھتی رہیگی۔ یہ قسمت کیا ہے صرف وہی عالم الغیب جانتا ہے مگر انسان میں اُس کا منشا دریافت کرنے کی آرزو ودیعت ہے، اور اسی ذوق و سرگرمی کا نتیجہ ہے کہ ع ہر ذرہ ہے ازل سے نغمہ طراز ہستی

مگر افسوس ع اس پر بھی ہے ابھی تک بے ربط ساز ہستی

اگر ایسا ہو تو نظریہ ارتقا ایک حرف غلط ہے۔ حالانکہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کی تصدیق ہوتی ہے، ازل ہی میں سازِ ہستی کی تکمیل ہو گئی تھی اور ہر شے مکمل تھی تو گناہ اور مسئلہ جبر و اختیار کی حقیقت کیا ہے؟

رواں کی رباعی۔

جب شب میں شعاعِ نور کھو جاتی ہے　　بیدار روح سکوت ہو جاتی ہے
فطرت اس وقت کسمساتی ہے رواں　　جس دم دنیا تمام سو جاتی ہے

اعتراض سراج۔ اس رباعی کے تیسرے مصرعہ میں کسمساتی ہے پر مجھے اعتراض ہے کسمسانے کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص سوتا ہوا اور نیند کی حالت میں کروٹ یا انگڑائی لے۔ یہاں دنیا سو گئی ہے لہذا اگر کسمسا سکتی ہے تو دنیا نہ کہ فطرت،

جوابِ آثر = آخری دو مصرعوں کا یہ مطلب ہوا کہ جب دنیا سو جاتی ہے تو فطرتِ انسانی بیدار ہوتی ہے اور اپنے افعال و کردار کا جائزہ لینا شروع کرتی ہے۔

جواب الجواب سراج،

اس رباعی میں کسمسانا کا لفظ بیداری کے معنی میں صرف ہوا ہے اور اسی بنا پر میں نے عرض کیا تھا کہ اگر کسمسا سکتی ہے تو دنیا جو سو گئی ہے نہ کہ فطرت۔ آثر نے فطرت کے معنی طینت لیے ہیں میرے خیال میں رواں نے لفظ فطرت اس رباعی میں طینت کے معنی پر استعمال ہی نہیں کیا اگر ایسا ہے تو مجھے آثر کے پیش کردہ مفہوم سے اختلاف ہے۔ آثر کہتے ہیں کہ جب تمام دنیا سو جاتی ہے تو فطرتِ انسانی بیدار ہوتی ہے۔ میں یہ عرض کرونگا کہ تمام دنیا میں سب کے ساتھ انسان اور حیوان بھی شامل ہیں اور جب تمام دنیا کے ساتھ انسان کا سو جانا بھی لازمی ہے تو اسی انسان کی فطرت کا بیدار ہو کر اپنے افعال و کردار کا جائزہ لینا کیسا۔ اگر اس مصرعہ کے مطابق ع

میں راتوں کو رویا کرتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے

رواں کا یہ مطلب ہے کہ سب سوتے ہیں لیکن میں جاگتا ہوں اور میری فطرت بیدار ہوتی ہے تو قرینہ کلام سے اول تو یہ ظاہر نہیں ہوتا اس لیے کہ ایک عام بات بیان کی گئی ہے جیسا کہ آثر کے بیان سے ظاہر ہے "جب دنیا سو جاتی ہے تو فطرت انسانی بیدار ہوتی ہے اور اپنے افعال و کردار کا جائزہ لینا شروع کرتی ہے" اسکے علاوہ سب سے زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ ضمیر انسانی کا کام رواں یا آثر فطرت انسانی سے لے رہے ہیں انسان کے

افعال کا جائزہ لینا اور اُن پر افسوس کرنا انسان کے ضمیر کا کام ہے نہ کہ انسان کی فطرت کا جو فطرۃً مائل بہ گناہ ہے۔

انسان کی فطرت نیکی یا بدی کی ترغیب دیکر انسان کو خیر یا شر میں مبتلا کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر جیسی انسان کی فطرت ہوتی ہے ویسے ہی اُسکے اعمال ہوتے ہیں اور ضمیر اچھائی پر مطمئن اور بُرائی پر مغموم ہوتا ہے ظاہر ہے کہ فطرت کا کُنمنانا "راتوں کو اُٹھ کر رونے" کے مرادف نہیں ہو سکتا۔ اور اسی وجہ سے میں نے اِسے رباعی میں "کنمناتی ہے" پر اعتراض وارد کیا۔

مزید گزارش آثر

میں جو کچھ عرض کر چکا اسپر قائم ہوں۔ سراج فطرت اور ضمیر میں فرق کرتے ہیں ضمیر کو افعال کا جائزہ لینے والا قرار دیکر فطرت کو فطرۃً مائل بہ گناہ کہتے ہیں۔ مگر اُسی کے بعد یہ جملہ ہے کہ انسان کی فطرت نیکی یا بدی کی ترغیب دیکر انسان کو خیر یا شر میں مبتلا کرتی ہے۔ اس نقیض کا حل میری سمجھ سے باہر ہے فطرت مائل بہ گناہ بھی ہے اور نیکی کی بھی (علاوہ بدی کے) ترغیب دیتی ہے حقیقت یہ ہے کہ فطرت عام لفظ ہے اور اسی فطرت کو جہاں تک انسان کی اخلاقی زندگی کا تعلق ہے ضمیر یا CONSCIENCE کہتے ہیں یہ ضمیر نہ صرف اچھے اور بُرے افعال پر تحسین یا نفرین کرتا ہے بلکہ قبل ارتکاب عمل نیکی کی دعوت اور بدی سے بچنے کی تاکید کرتا ہے۔ کوئی انگریزی شاعر کہہ گیا ہے

WHAT CONSCIENCE DICTATES TO BE DONE
OR WARNS ME NOT TO DO
THIS TEACH ME MORE THAN HELL TO SHUN
AND THAT MORE THAN HEAVEN TO PURSUE

(جس بات کا ضمیر حکم دے اُسکے لیے بہشت کی طرح تگ و دو کروں
اور جس بات سے ضمیر باز رکھنا چاہے اُس سے دوزخ کی طرح احتراز)

لہذا سراج کا یہ دعویٰ کہ ضمیر صرف بعد ارتکاب عمل پسندیدگی یا نفرت کا اظہار کرتا ہے کوئی قیمت

نہیں رکھتا۔ فطرت ہی کا نام ضمیر ہے۔ فطرت عام ہے اور ضمیر خاص جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ضمیر نیکی کی ترغیب اور بدی سے بچنے کی تاکید کرتا ہے لیکن انسان واقعات اور ماحول سے متاثر ہو کر ضمیر کی متابعت یا مخالفت میں عمل پیرا ہوتا ہے اُسکے بعد پھر ضمیر تحسین یا سرزنش کرتا ہے۔

رواں نے فطرت کا بیدار ہونا یا کُنمنانا استعارۃً استعمال کیا ہے۔ سراج اسکے لفظی معنی لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تمام دُنیا کے ساتھ انسان کا سوجانا بھی لازمی ہے تو اسی انسان کی فطرت کا بیدار ہو کر اپنے افعال و کردار کا جائزہ لینا کیسا۔

گویا انسان رات کو ایک مرتبہ سو کر پھر صبح تک جاگتا نہیں خصوصًا ایسا انسان جو اپنے ضمیر کی خلاف ورزی کر چکا ہو اور جسکا ضمیر اُس کی بغل مین بیمار بچے کی طرح میٹھی نیند نہ سو سکتا ہو بلکہ کُنمناتا ہو۔ یہ ناشاد انسان اُس کو تھپک تھپک کر سُلانا چاہتا ہے مگر وہ برابر کروٹیں لیتا اور کراہتا ہے۔

دن کی مصروفیتوں اور شور و شغب میں ضمیر کی آواز دب جائے تو دب جائے مگر شب کی خاموشی اور تنہائی میں جب قوائے عمل شل اور مضمحل ہوتے ہیں خصوصًا پچھلے پہر ضمیر کا مچلنا اور اُس کی نشتر زنی۔ گناہ کی سب سے بڑی عقوبت بھی ہے۔ مگر اسی کے لیے جس نے بار بار اعادۂ گناہ کر کے اُسکا گلا گھونٹ نہ دیا ہو!

شاید سراج کو میری اس رائے سے اتفاق ہو گا کہ میں اور وہ دونوں مضمون زیر بحث پر کافی لکھ چکے اب کسی تیسرے شخص کو محاکمہ کرنا چاہیئے۔ کم سے کم میں اپنے میں اتنی ہمت نہیں پاتا کہ آئندہ اسی مضمون پر قلم اُٹھاؤں۔

(جناب) اثر لکھنوی

عورت یا شیر؟

جناب سید محمد عسکری صاحب طباطبائی

(۱)

زمانہ قدیم مین جبکہ جاہلیت کے تیرہ و تار آسمان پر آفتاب تہذیب اپنی پوری درخشانی کیساتھ نہین چمکنے پایا تھا اور نہ دنیا کے گوشے گوشے نے اسکی شعاعون سے فیض حاصل کرنا شروع کیا تھا یورپ کے ایک گمنام حصہ مین ایک نیم وحشی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ نیم وحشی اسلئے کہ کچھ تو اوسکے خیالات اُن ہمسایون کیوجہ سے روشن ہوگئے تھے جنکی یہاں اُسوقت لاطینی زبان ترقی پذیر تھی اور کچھ اُسکے عادات و خصائل اپنی فطرت کے مطابق وحشیانہ تھے۔ یہ عجیب و غریب بادشاہ نہایت انوکھے خیالات اور متضاد جذبات کا مجموعہ تھا۔ اُسکی طرفہ ذہنیت کی بدولت ملک مین اکثر حیرتناک واقعات ظاہر ہوتے رہتے تھے۔ جنکی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی خودرو تخیل کو جو ظلم و انصاف کے امتیاز سے بیگانہ محض تھی عملی جامہ پہنانے کا عادی تھا۔ جو اسکے دلمین آتا تھا وہ ہوکر رہتا تھا۔ اُسکی وحشیانہ فطرت اور بے رحمانہ طبیعت کا اندازہ اس ایک بات سے ہوسکتا ہی کہ اُسکو گھوڑون کی پیٹ سیدھی کرا دینے مین خاص لطف آتا تھا عام اس سے کہ گھوڑے بیچارے کی جان بھی کوڑ کیساتھ تشریف لیجائے یا رہے۔

(۲)

اس عجیب الخلقت بادشاہ کی مرضی ہی اُسکا قانون تھی اُسکے ملک مین انصاف کرنیکے لئے نہ تو عدالتین تھین نہ کچہریاں ہان ایک اکھاڑا تھا جہان مجرمون کی قسمت منصف تھی اور وہی اُنکے جھوٹے الزام کا فیصلہ کرتی تھی۔ یہ اکھاڑہ ایک عظیم الشان عمارت کے اندر واقع تھا جسکے پیچیدہ رستے اور خفیہ کمرے سینۂ راز مین رکھے جاتے تھے جب کسی شخص پر کوئی سنگین جرم عاید ہوتا تھا تو بادشاہ کیطرف سے اعلان کردیا جاتا تھا کہ فلان دن فلان شخص کا فیصلہ اکھاڑے مین ہوگا۔ یہ اکھاڑا اور اُسکی عمارت تو دیگر اقوام کی نقل تھی لیکن اسکا طریقہ استعمال بادشاہ سلامت کے دماغی نشو و نما کی خاص پیداوار تھا۔

اکھاڑے کے چارون طرف مسلسل زینون کی بہت اونچی قطاریں تھیں جنپر تماشائی آکر بیٹھتے تھے۔ جب تمام

عائدین شہر اور امرائے دربار اپنی اپنی جگہوں پر آموجود ہوتے تھے تو بعد میں بادشاہ کی سواری آتی تھی۔ جو سب سے اونچے پر صدر نشست اختیار کرتا تھا۔ بادشاہ کے آنیکی خوشی میں رعایا جو شور مچاتی تھی اُسکے خاموش ہونے پر ایک خاص قسم کا باجا بجایا جاتا تھا جو بیچارے ملزم کیلئے نفخ صور سے کم نہیں ہوتا تھا کیونکہ اسی کے ساتھ نیچے کے ایک کمرہ کا دروازہ کھلتا تھا۔ اور ملزم اکھاڑے میں اس شان سے کھڑا دکھائی دیتا تھا کہ رنگ رُخ پریدہ جسم لرزاں۔ اور دل عالم اُمید و بیم میں اُوسکے سامنے دو بند دروازے بالکل ایکسے ہی سے اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے تھے اُسکو حکم دیا جاتا تھا کہ وہ کوئی دروازہ کھولے۔ غریب آنکھیں بند کئے۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کانپتے ہوئے پیروں سے آگے بڑھتا تھا اور بہ ہزار دشواری اپنے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے ایک دروازہ کھولدیتا تھا۔ اگر اوس نے اوس کمرے کا دروازہ کھولا جس میں بھوکا شیر اپنے شکار کا منتظر بند تھا تو بیچارہ فوراً لقمہ اجل ہو جاتا تھا۔ تماشائیوں میں اُسکی خوفناک چیخوں سے ہلچل پڑجاتی تھی۔ مرد منھ پھیر لیتے تھے بچے ڈر ڈر کے اپنی ماؤں سے لپٹ جاتے تھے اور عورتیں چیخیں مار مار کر رونے لگتی تھیں اور اگر ملزم نے اتفاقاً دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک نہایت حسین وجمیل دوشیزہ شرماتی لجاتی برآمد ہوتی تھی۔ ملزم کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھتا تھا ایک پادری آگے بڑھتا تھا اوس کے پیچھے مختلف قسم کے باجے بجتے ہوتے تھے۔ وہیں اکھاڑے میں ملزم کی بےقصوری کے صلہ میں اُس لڑکی کی شادی ملزم کے ساتھ کردیجاتی تھی۔ تماشائیوں میں خوشی کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ تالیاں بجائی جاتی تھیں اور سب خوش خرم گھر واپس ہوتے تھے۔

ملزم کو جسطرح شیر کے پنجہ سے نجات نہ تھی اوسی طرح شادی کے بغیر بھی چارہ نہ تھا چاہے وہ اُس لڑکی کو پسند کرتا ہو یا نا پسند چاہے اُسکی شادی کسی دوسری جگہ ٹھیری ہو یا ہو بھی گئی ہو ہر صورت میں اُسے اُس لڑکی سے شادی کرنا لازمی تھا۔ وہ ضدی اور طاقتور بادشاہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے جزا و سزا کے اس زبردست قانون میں مداخلت نہیں کرنے دیتا تھا۔

یہ تھا وہ قانون جس کے مطابق ملک میں انصاف عمل درآمد کیا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ طریقہ قطعاً غیر منصفانہ اور یکسر ناجائز ہے تاہم اسکی صداقت میں کسی شک ہو سکتا ہے ملزم کو قطعاً خبر نہ ہوتی تھی کہ کس کمرے میں عورت بند ہے۔ وہ آنکھ بند کرکے بلا تامل اپنی قسمت پر بھروسا کرکے کوئی ایک دروازہ کھولدیتا تھا۔ ایک منٹ پہلے تک وہ اپنے انجام سے مطلق بےخبر ہوتا تھا۔ وہ ہرگز نہیں جانتا تھا کہ دوسرے لمحے پر اُسکے سامنے جنگلی شیر کا بھیانک چہرہ ہوگا یا ایک معصوم لڑکی کی بھولی بھالی شکل؟ - وہ ابھی ابھی موت کے گھاٹ اُتریگا یا دولھن بیاہ کے

لائیگا۔ کبھی اِس دروازہ سے شیر نکلتا تھا کبھی اُس سے۔ اور پھر انصاف بھی فوراً عمل میں لایا جاتا تھا۔ اگر اسکی قسمت نے اُسے مجرم ٹھیرایا تو وہ فوراً شیر کا شکار ہوگیا اور اگر بے قصور ثابت کیا تو فوراً اُسے اپنی بے قصوری کا صلہ ملگیا چاہے اُس صلے کو وہ پسند کرے یا نہ کرے۔ اُسے بادشاہ کی جزا و سزا کے قبول کرنے سے کسی طرح مفر نہ تھا۔ بخوشی یا مجبوری!

یہ اکھاڑا بہت مشہور و معروف جگہ تھی جب کبھی کوئی ایسا موقع پیش آتا تھا تو لوگ دور دور سے آکر جمع ہوتے تھے اور وہ بھی قطعاً بیخبر ہوتے تھے کہ ابھی ابھی اُن کی آنکھوں کے سامنے ایک خونیں نظارہ پیش ہوگا یا ایک شادی کا بارونق منظر! اور یہی احتمال ان کی دلچسپی اور انہماک شرکت کا خاص سبب تھا وہ اس طریقے سے بہت خوش تھے اور اس کو بالکل منصفانہ خیال کرتے تھے۔ کیونکہ جو کچھ مجرم کا انجام ہوتا تھا وہ اُسی کے ہاتھوں کا کیا دھرا نہیں ہوتا تھا؟

(۳)

اس نیم وحشی بادشاہ کے ایک لڑکی تھی جسکی جوانی اپنے باپ کے بے لگام خیالات کیطرح باڑھ پر تھی اور حسن کا شباب اپنے باپ کے وحشیانہ جذبات کی طرح جوش پر۔ اُسکی طبعیت بھی بادشاہ کی طرح خود رو اور خود مختار تھی۔ وہ اپنے باپ کی آنکھوں کا تارا تھی اسلئے کیا مجال تھی جو کوئی بات اُسکی مرضی کے خلاف ہوجائے۔ ہر ایک ہر وقت ہاتھ جوڑے حکم بجالانیکے لئے مستعد رہتا تھا۔ اور سب اُسکے حُسن صورت کا دم بھرتے تھے۔ قدرت نے اُسے دولت حسن دینے میں ایک تو یونہی فیاضی سے کام لیا تھا دوسرے اُسکی آزادانہ روش اور بے فکری نے اُسکی صحت اچھی سے اچھی کردینے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی، وہ اکثر سیر و شکار کیلئے جنگلوں میں گھوڑے پر سوار نکلجاتی تھی اور وہاں کی تازہ اور جان بخش ہوا نے اُسکے رخساروں کو ایک ہمیشہ شگفتہ رہنے والی تازگی دیدی تھی۔ اُسکی غزالی آنکھیں وحشت آگیں رہتی تھیں اُسکا دل ہمیشہ پر جوش، یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسمیں کوئی برقی قوت پوری تیزی کیساتھ کام کررہی ہے۔ وہ ہر بات میں خاص انہماک سے حصہ لیتی تھی جس کام میں ہاتھ ڈالتی تھی اُسے پورا کرکے چھوڑتی تھی، اپنے ارادے کی مضبوط اور دھن کی پکی تھی، وہ بہادر تھی، حوصلہ مند تھی، اور نیم وحشی تھی، وہ تھی تو عورت لیکن اُسکی رگوں میں وہ خون گردش کررہا تھا۔ جو مردوں کا زہرہ آب کردے۔

اور سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اُسکا دل جذبۂ محبت سے بھی خالی نہ تھا قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ایک تو اُس کو یونہی قتالۂ عالم بنایا تھا۔ پھر اُسکے ہاتھ میں یہ حربہ بھی دیدیا۔ وہ ایک درباری نوجوان پر عاشق تھی اور اسی سرگرمی کیساتھ اُس سے محبت کرتی جو اُس کے ہر کام میں نمایاں تھی۔ نوجوان بھی خوبصورت تھا،

بہادر تھا اور شریف خاندان۔ اسکی بہادری کے فسانے اسکے اخلاق کے تذکرے اور اسکی خوش مزاجی کے چرچے ہر محفل کی رونق تھے۔ شہزادی اُسے ہر طرح پسند کرتی تھی۔ اُس سے محبت کرتی تھی اور اپنے ناز پروردہ دل کے تمام وحشیانہ اور گرم جذبات کیساتھ اُسکو چاہتی تھی۔ بہت دنوں تک یہ آگ درپردہ سلگتی رہی یہان تک کہ اسکی آنچ بادشاہ تک پہونچی اور وہ اس راز سے واقف ہوگیا۔ اُسنے بلا پس وپیش درباری کو قید کردیا اور اعلان کرادیا کہ فلاں دن اسکی قسمت کا فیصلہ اکھاڑے میں ہوگا۔ یہ واقعہ اپنی تمام خصوصیتوں میں فرد تھا۔ اسلئے بادشاہ اور اُسکے تمام افراد اسمیں خاص انہماک سے حصہ لے رہے تھے۔ اس سے پہلے کبھی ایسا واقعہ ظہور میں آیا تھا نہ کسی نے بادشاہ کی لڑکی سے محبت کرنیکی جرات کی تھی آخر میں اگرچہ یہ باتیں عام ہوگئیں لیکن اُس زمانہ میں یہ کوئی کم حیرت خیز بات نہ تھی۔

بادشاہ کے بالونشیروں میں سے سب سے زیادہ خونخوار شیر ڈھونڈھا گیا اور ملک کی حسین لڑکیوں میں سے سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی چنی گئی۔ کیونکہ اگر نوجوان کی قسمت اُسکے موافق فیصلہ کرے تو وہ ایسی فی الحال بیاہ کے لائق جو ہر طرح سے اُسکے واسطے موزوں ہو۔ ہر ایک جانتا تھا کہ جرم الفت سرزد ہوا اور ہوا۔ اسمیں تو کوئی شک ہی نہ تھا نوجوان ہی ہنکر تھا نہ شہزادی رہی یہ بات کہ محبت جرم ہے یا نہیں؟ اسکا فیصلہ اکھاڑے میں ہونیوالا تھا۔ اور بادشاہ کو یہی بات معلوم کرنے کے لئے خاص بےچینی تھی وہ نہایت بیقراری سے اس بات کے معلوم کرنیکا انتظار کررہا تھا کہ نوجوان درباری نے اسکی لڑکی سے محبت کرنے میں خطا کی تھی یا نہیں؟

(۴)

مقررہ دن آپہونچا۔ دور دور سے لوگ اکھاڑے میں آکر جمع ہونا شروع ہوئے جب سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو بادشاہ مع اپنی لڑکی کے صدر میں جلوہ افروز ہوا۔ اسکے سامنے ہی اُن خفیہ کمروں کے دروازے تھے جنمیں سے ایک میں شیر اور ایک میں دوشیزہ بند تھی۔ وہ دروازے کتنی خوفناک شباہت رکھتے تھے؟ غرضکہ سب کچھ تیار تھا۔ یا جا بجا نیچے کمروں میں سے ایک دروازہ کھلا اور شہزادی کا چاہنے والا مرد میدان عشق کے اکھاڑے میں آیا۔ تنومند بہادر، خوبصورت اور نڈر۔ لوگوں نے اُسے دیکھ کر چپکے چپکے ایک دوسرے سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ سب کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہوئی اور اپنے اپنے دل میں اُسکی سلامتی کے لئے دُعائیں مانگنے لگے۔ نصف تماشائیوں نے کبھی کاہے کو ایسا خوبصورت نوجوان دیکھا تھا۔ شہزادی اُس سے محبت کرتی تھی اسمیں کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ لیکن اُسکا وہاں موجود ہونا کتنا خطرناک تھا؟

نوجوان نے حسب دستور مڑکر بادشاہ کو سلام کیا اُسکے دلپر اُس مغرور بادشاہ کی ہیبت کا کوئی اثر تھا

نہ اپنی موت کا ڈر۔ اُسکی نگاہیں شہزادی پر جو اپنے باپ کے پہلو نشین تھی جمی ہوئی تھیں۔ اگر شہزادی کی فطرت میں اپنے باپ دادا کا وحشیانہ پن نہوتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ ایسے موقع پر موجود نہوتی لیکن یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ وہ اپنے تئیں کس طرح اس موقع میں شرکت سے باز رکھ سکتی تھی جبکہ وہ اس معاملے میں اتنی خوفناک دلچسپی رکھتی تھی۔ جبسے یہ اعلان کرایا گیا تھا کہ اُسکے عاشق کا فیصلہ اکھاڑے میں ہوگا شہزادی کو خواب خور حرام ہوگیا تھا رات دن اُسے سوائے اسکے کوئی فکر کوئی خیال نہ تھا کہ وہ کس طرح اپنے عاشق کو بچالے۔ وہ اس معاملے میں اور اسکے متعلقات میں ہمہ تن غرق ہوگئی تھی۔ اُسکی وہ تمام قوتیں جو اُسے ہر بات میں خاص انہماک سے حصہ لینے پر مجبور کرتی تھیں اس مرتبہ اپنے انتہائی جوش پر تھیں۔ اور وہ اپنے عاشق کی سلامتی کیلئے بیحد کوشاں تھی وہ جان بیچ کر بھی کمروں کا راز معلوم کرنے کیلئے تیار تھی۔ اور چونکہ وہ صاحب اقتدار تھی اسلئے اُسنے وہ کچھ کرلیا، جسکا کوئی دوسرا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ کمروں کا راز معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی وہ جانتی تھی کہ کس دروازے کے پیچھے ببر کا شیر ہے اور کس کے پیچھے خوبصورت عورت، یہ دروازے اس قدر دبیز تھے اور ان کے پیچھے موٹے موٹے چمڑے لگا کر ایسا انتظام کرایا گیا تھا کہ ذراسی بھی آواز اندر سے باہر آنے پائے، یہ قطعاً ناممکن تھا کہ دروازے کھولنے والے کو ذرا سا بھی پتہ لگ سکے کہ کس میں کیا ہے دنیا بھر اس راز سے ناواقف تھی لیکن حضرت زر نے اسے شہزادی کے لئے طشت از بام کر دیا تھا۔

وہ صرف یہی نہیں جانتی تھی کہ کس دروازے کے پیچھے عورت ہے بلکہ اس سے بھی واقف تھی کہ وہ کون عورت ہے۔ قرعۂ انتخاب اُسی کے محل کی ایک بے انتہا حسین لڑکی پر پڑا تھا شہزادی اُس سے نفرت کرتی تھی۔ اکثر اُسنے اُس لڑکی کو اپنے عاشق پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتے دیکھا تھا۔ اکثر اُسنے اُسکو اشارے کرتے ہوئے پایا تھا۔ اُسکو یہ بھی یاد پڑتا تھا کہ اُسکے عاشق نے ان اشاروں کا جواب بھی دیا۔ ایک آدھ دفعہ اُسنے ان دونوں کو آپسمیں دو ایک لمحے کے لئے بات کرتے بھی دیکھا تھا۔ صرف دو ایک لمحے کیلئے مگر اتنی دیر میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اُسکی بدگمان طبیعت ہرگز اُسے اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ باور کرے کہ یہ باتیں بالکل معمولی چیزوں کے متعلق تھیں لڑکی خوبصورت تو ضرور تھی لیکن اُسنے شہزادی کے محبوب سے محبت کرنیکی جرأت کی تھی پس شہزادی کا وہ تمام وحشیانہ خون جو اُسکی رگوں میں اوپر ہی تیزی کیساتھ دوڑ رہا تھا محض اسی خیال پر کھولنے لگتا تھا کہ وہ اُسکی محبت میں شریک ہے وہ اُس تمام صدیا درسے کیا تو جو اُسے اپنے باپ دادا سے میراث میں ملی تھی اُس لڑکی سے نفرت کرتی تھی جو دروازے کے پیچھے کھڑی کانپ رہی تھی۔

جب شہزادی کے عاشق نے مڑ کر اُسے دیکھا اور آنکھیں چار ہوئیں تو وہ اُس روحانی قوت کی بدولت جو اُسوقت حاصل ہوتی ہے جب عاشق و معشوق ایک روح دو قالب ہوجاتے ہیں فوراً سمجھ گیا کہ شہزادی کو کمروں کا راز معلوم ہے۔ وہ پیشتر بھی اُمید کرتا تھا کہ اُس کو معلوم ہوگا اور ضرور معلوم ہوگا۔ وہ اُسکی فطرت سے بخوبی واقف تھا وہ جانتا تھا کہ شہزادی جب تک یہ راز نہ معلوم کرلے گی چین نہ لیگی حالانکہ یہ تمام تماشائیوں حتیٰ کہ بادشاہ سے بھی پوشیدہ تھا۔ نوجوان کے دل میں جو ہلکی سی اُمید کی شعاع چمک رہی تھی اُسکی روشنی کا انحصار شہزادی کے راز معلوم کرنے کی کامیابی پر تھا۔ اور جیسے ہی اُسنے اُس پر نگاہ ڈالی وہ سمجھ گیا کہ شہزادی نے راز معلوم کرلیا ہے اُسکی روح نے اُسے پہلے ہی بتا دیا تھا۔

بس اُسنے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا "کون سا دروازہ کھولوں؟" شہزادی نے اُس کا سوال اُسی طرح سمجھا جیسے کہ وہ چیخ کر پوچھ رہا ہے "کون سا دروازہ؟" ایک لمحہ بھی ضایع نہ کرنا تھا۔ کوندہ کی لپک کی طرح سوال کیا گیا تھا۔ بجلی کی تڑپ کی طرح جواب دیا گیا۔

شہزادی کا داہنا ہاتھ جو کرسی کے ہتے پر رکھا ہوا تھا اُٹھا۔ اُسنے چپکے سے نہایت پھرتی کیساتھ داہنی طرف اشارہ کردیا۔ صرف اُس کا عاشق اس حرکت کو سمجھ سکا۔ وہ مڑا اور نہایت بہادری کے ساتھ سر اُٹھائے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ ہر دل نے دھڑکنا ہر آنکھ نے جھپکنا بند کردیا۔ سانسیں چلنا موقوف ہوگئیں۔ تماشائیوں کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اکھاڑے کے چاروں طرف ہزاروں کی تعداد میں بت بنا کر بٹھا دیئے گئے ہیں جنہیں سے ہر ایک کی نگاہ نوجوان پر جمی ہوئی ہے۔ وہ ایک قدم بڑھا اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے انتہائی استقلال کیساتھ اُسنے داہنی طرف کا دروازہ کھولدیا۔

(۵)

اب سوال یہ ہے کہ خونخوار شیر برآمد ہوا یا معصوم لڑکی؟

جتنا اس سوال پر غور کیا جائیگا اُتنا ہی اس کا جواب دینا مشکل معلوم ہوگا۔ اسکو حل کرنیکے لئے فطرت انسانی خصوصاً فطرت نسوانی کے غائر مطالعہ کی ضرورت ہے۔ فلسفۂ محبت بھی اسکے ذیل میں آجاتا ہے۔ یہ سوال ہمکو جذبات کی ایک دنیا میں لیجاتا ہے جہاں راستہ پانا دشوار ہے۔ ناظرین اسپر غور کریں اور اس کا جواب دیں یہ سمجھ کر نہیں کہ شہزادی کی جگہ اگر وہ ہوتے تو کیا کرتے بلکہ یہ ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہ اُس نیم وحشی خود مختار طبیعت والی عورت نے کیا کیا ہوگا جسکا دل ایک طرف تو محبت میں سُلگ رہا تھا اور دوسری طرف

رقابت کی آگ میں جلا جاتا تھا۔ فتح کس کی ہوئی محبت کی یا رقابت کی؟ محبت کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے محبوب کو بچائے اور رقابت کا اصرار تھا کہ دوسری عورت اسکو نہ ملنے پائے، چاہے وہ مر ہی کیوں نہ جائے۔ اُس نے کس کے کہنے پر عمل کیا؟ وہ اپنے محبوب سے ہاتھ دھو چکی تھی۔ لیکن اب اُسے کون پانیوالا تھا؟ اُسکی ایک ہم جنس عورت؟ کتنی مرتبہ شہزادی نے محض اسی خیال پر کہ اُس کا محبوب بھوکے شیر کے ہاتھوں زخمی ہو کر چیخیں مار رہا ہے اپنا منہ اپنے ہاتھوں سے ڈھانک ڈھانک لیا تھا مگر کتنی زیادہ مرتبہ اُسنے اس تصور پر کہ اُسکے عاشق نے خوشی خوشی دوسرا دروازہ کھولا خوبصورت لڑکی مسکراتی ہوئی بر آمد ہوئی نوجوان کا چہرہ دوبارہ زندگی اور ایک حسین تحفہ پانے کی خوشی میں چمک اُٹھا۔ اُسنے لڑکی کا ہاتھ پکڑا۔ باجے بجنے لگے اور ہر طرف خوشیاں منائی جانے لگیں اپنے ہونٹ چبا چبا کر لہولہان کر دیئے تھے اپنا گریبان چاک چاک کر ڈالا تھا اور اپنے بالوں کو نوچا تھا۔

وہ اس خیال پر کانپ جاتی تھی کہ پادری بڑھا اور اُسنے دونوں کو ایک دوسرے سے زندگی بھر کیلئے وابستہ کر دیا۔ اُس کا ایک ایک موئے بدن فتیلہ بن کر جلنے لگتا تھا جب وہ یہ خیال کرتی تھی کہ مجمع میں اس مبارک شادی پر خوشی کی آوازیں بلند ہوئیں اور اُسکی ایک مایوسانہ چیخ اُنمیں غرق ہو گئی۔ کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ نوجوان اپنی محبوبہ کا انتظار دوسری دنیا میں کرے۔

اور پھر بھی اُس کا دل پھٹنے لگتا تھا، اُسکا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ اُسکی آنکھوں میں خونخوار بھوکے شیر کی تصویر پھر جاتی تھی اُسکے عاشق کا سڈول خوبصورت جسم اور شیر کے تیز پنجے۔ اُس کا حسین و نازک چہرہ اور شیر کا ظالمانہ طمانچہ۔ وہ خون کے فوارے! اُس منہ سے نکلی ہوئی دردناک چیخیں جس سے اُسنے بارہا محبت کی باتیں سُنی تھیں جس سے اُسکے عاشق نے شکوۂ ہجر اور شوق وصل کا اظہار کیا تھا۔ اُسکی نیم وحشی طبیعت کا تقاضہ ضرور تھا کہ وہ اپنے عاشق کو اپنی ایک ہمجنس کے حوالے کرنے سے یہ بہتر سمجھتی کہ اُسکو ایک خونخوار شیر کے سپرد کر دیے مگر کیا محبت ایسے پاک جذبے نے اُسے عام سطح سے اتنا بلند نہیں کر دیا تھا کہ وہ اپنے عاشق کو شیر کے منہ سے بچا لیتی۔ شہزادی نہ معلوم کتنی راتیں کروٹیں لے لے کر اور کتنے دن تڑپ تڑپ کر کس نتیجہ پر پہونچی تھی اور اُسنے اپنا فیصلہ ایک لمحہ میں سنا دیا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ اُسکا عاشق اُس سے ضرور پوچھے گا اور اُسنے داہنی طرف ایک برقی لہر کیطرح ہاتھ کا اشارہ کر دیا تھا اس معمے کا حل کرنا کوئی کھیل نہیں ہر سوال کا جواب ناظرین کی رائے پر چھوڑا جاتا ہے۔

"فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"۔ کون بر آمد ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ عورت یا شیر"؟

(ماخوذ)

تحفۃ الہند

پروفیسر جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کو اہل ہند کے علوم متداولہ کے مطالعے کا شوق ہوا۔ چنانچہ کوکلتاش خان کی فرمائش سے مرزا محمد بن فخر الدین محمد نے کتاب تحفۃ الہند تالیف کی۔ فاضل مؤلف نے اسکا دیباچہ اپنے زمانے کے رواج کے خلاف اورنگ زیب کے مزاج کے موافق لکھا تھا، یہ دیباچہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔ اما بعد چنیں گوید ستابادۂ ہذیان بے حد مرزا محمد ابن فخر الدین محمد کہ در عہد میمنت مہد خدیو کشورستان، خدایگان قضا فرمان، نیر اوج صاحبقرانی، اختر برج گورگانی، شہنشاہ خورشید کلاہ گردوں سریر ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب بادشاہ عالمگیر خلد اللہ تعالیٰ ملکہ وسلطانہ۔ وافاض علی العالمین برہ واحسانہ حسب الاشارت بابشارت وزارت و امارت مرتبت۔ ابہت وایالت منزلت رفیع شاہ جاہ سکندر مکان کوکلتاش خان برائے مطالعہ ہمایوں بندگان شہریار والاتبار۔ محیط سلطنت کبریٰ، مرکز دولت عظمیٰ علوم متداولہ ہندیان جزوے چند پرداختم وآن را بہ تحفۃ الہند موسوم ومشہور ساختم۔"

اس کتاب میں ایک مقدمہ سات باب اور خاتمہ ہے، اُن کی تفصیل ذیل میں درج کیجاتی ہے:۔

مقدمہ۔ ہندی کے حروف تہجی اور رسم الخط۔

باب اوّل۔ پنگل یعنے اہل ہند کا علم عروض۔

باب دوم۔ تُک یعنے اہل ہند کا علم قوافی۔

باب سوم۔ النکار یعنے اہل ہند کا علم بیان وبدیع۔

باب چہارم۔ سنگار رس یعنے عشق و عاشق و معشوق کا بیان۔

باب پنجم۔ سنگیت۔ یعنے اہل ہند کا علم موسیقی۔

باب ششم۔ کوک یعنے عورت و مرد کے اقسام، اور عورتوں کے ساتھ معاشرت ومباشرت کا بیان۔

باب ہفتم۔ سامدریک۔ یعنے علم قیافہ

خاتمہ۔ اہل ہند کے لغات و مصطلحات وکنایات۔

کتاب تحفۃ الہند اب نہایت کمیاب ہے، میرے کتب خانے میں اس کا جو قلمی نسخہ ہے وہ بھی مکمل نہیں ہے۔

اِس میں سے باب پنجم کا زیادہ حصہ اور خاتمہ پورا غائب ہے۔ قدیم قلمی کتابوں کے جس ذخیرے میں سے یہ کتاب مجھے ہاتھ آئی اس میں ہندی و فارسی کا ایک مختصر سا لغت بھی نکل آیا، مگر نہ مصنف کا نام معلوم ہو سکا نہ کاتب کا، نہ زمانۂ تصنیف کا پتہ لگ سکا، نہ تاریخ تحریر کا، میں اس لغت کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے کسی بات کا سراغ لگ جائے، یکایک خیال گذرا کہ کہیں یہ تحفۃ الہند کا خاتمہ نہ ہو۔ مزید غور و فکر سے اس خیال کو اور تقویت پہونچی گئی جن وجوہ سے مجھے اپنا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے وہ درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) یہ لغت اور تحفۃ الہند دونوں کتابیں ایک ہی کاتب کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اگرچہ دونوں کتابوں کی جسامت میں فرق ہے مگر خط ایک ہے۔

(۲) تحفۃ الہند کے خاتمے میں مؤلف جو کچھ لکھنا چاہتا تھا یعنے "لغات و مصطلحات و کنایات اہل ہند" وہی اس لغت کا موضوع ہے۔

(۳) بعض لفظوں کے معنی اس لغت میں بھی دیے گئے ہیں اور تحفۃ الہند میں بھی۔ یہ معنی جن عبارتوں سے لکھے گئے ہیں ان میں ایسی لفظی مطابقت موجود ہے کہ دونوں عبارتیں ایک ہی قلم سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، مثلاً لفظ "کوک" کے معنی لغت میں یوں لکھے ہیں۔

"نام علمی است در اقسام زن و مرد و فن مباشرت"

اور تحفۃ الہند میں "کوک" کی تعریف یوں کی ہے:-

"علم کوک یعنے معرفت اقسام زن و مرد و صحبت داشتن و مباشرت کردن با زناں"

لفظ سنگیت کے معنے لغت میں یوں لکھتے ہیں:-

"علم موسیقی را نامند و آں مشتمل است بر راگ و تال و نرت یعنے نغمہ و صوت و رقص"

اور تحفۃ الہند میں سنگیت کی تعریف میں لکھا ہے:-

"عموماً مجموعہ راگ، و تال، و نرت یعنی نغمہ و اصول، و رقص، و خصوصاً بمعنی نغمہ باشد"

لفظ "رومانچ" کے معنی لغت میں یہ بتائے ہیں:-

"در اصطلاح اہل سنگار رس نام بھاوے است و آں بھاوے باشد کہ از شوق خواہش صحبت نایک نایکا قشعریرہ پیدا شود و موئے بر اندام تیغ کشد"

تحفۃ الہند میں علم سنگار رس کے تحت میں بھاؤ کے اقسام بیان کرتے ہوئے رومانچ کی تعریف یوں کی ہے۔

"در آں حالتے بود کہ از استیلائے شہوت و غلبۂ شوقِ صحبت نازک موئے بر اندام نا کتخدا باستد و قشعریرہ واقع شود"

(۴) لفظ اُبھرن کی شرح لغت میں یوں کی ہے :-

"بمعنی زیور و ہر صفت و آرائش بود و آں باصطلاح ایشاں (یعنے اہل ہند) دوازدہ ہست ، در علم سنگار رس بتفصیل ذکر نمودہ شد،"

اِس عبارت کا آخری جملہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اِس لغت کا مصنف علم سنگار رس کا بیان پیشتر کر چکا ہے اور ناظرِ کتاب اِس بیان کو پڑھ بھی چکا ہے۔ اِسلیے بارہ ابھرنوں کی دوبارہ تفصیل ضروری نہیں ہے۔ صرف اِس بیان کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ سیاقِ عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ علم سنگار رس پر مصنف نے کوئی علٰحدہ کتاب نہیں لکھی ہے۔ اگر مصنف کو اپنی کسی دوسری تصنیف کا حوالہ دینا ہوتا تو "در علم سنگار رس" کی جگہ "در کتاب سنگار رس" ہوتا یا کچھ ایسے لفظ ہوتے جن کا مفہوم یہ ہوتا کہ وہ کتاب جو میں نے علم سنگار رس پر لکھی ہے۔

اِن سب باتوں پر نظر کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ لغت اُسی کتاب کا ایک جزو ہے جس میں علم سنگار رس کا بیان بھی اِس سے پہلے موجود ہے۔ کتاب تحفۃ الہند کا باب چہارم علم سنگار رس کے بیان میں ہے اور خاتمہ میں لغات و مصطلحات و کنایاتِ اہلِ ہند کا ذکر ہے جو اِس لغت کا موضوع ہے۔ یہ بھی میرے اِس خیال کا زبردست ثبوت ہے کہ یہ لغت تحفۃ الہند کا خاتمہ ہی ہے۔

اہلِ شک تو اب بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاید کوئی اور کتاب بھی ایسی ہو جس میں علم سنگار رس کا بیان بھی ہو اور لغات و مصطلحات و کنایاتِ اہلِ ہند کا ذکر بھی ہو اور یہ لغت اُسی فرضی کتاب کا ایک جزو ہو۔ لیکن اگر اسی طرح کے مفروضات کو دخل در معقولات کا موقع دیا جائے تو دنیا کی کوئی بات بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔ بہر حال قیاسات و نظریات کی صحت کیلیے جس طرح کے ثبوت بالعموم کافی سمجھے جاتے ہیں اُن پر نظر کر کے میرے نزدیک یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ لغت اُسی کتاب تحفۃ الہند کا خاتمہ ہے جسے مرزا محمد ابن فخر الدین محمد نے اورنگ زیب عالمگیر کے لیے تالیف کیا تھا۔

اِس لغت میں ہندی الاصل الفاظ کے تلفظ اور معنی فارسی میں دیے گئے ہیں۔ کل الفاظ کی تعداد ڈھائی ہزار کے قریب ہے۔

اصل کتاب کا جتنا حصہ میرے پاس ہے اسکی ضخامت دو سو بائیس صفحے ہیں اور خاتمہ کتاب کا حجم چوالیس صفحے ہے۔ ہر صفحے میں اوسطاً بائیس سطریں ہیں اور خط بہت خفی ہے۔

——— (*) ———

استصواب

جناب سیّد سبط الحسن صاحب ہنسوی فاضل ادب

سحبان الہند حضرت علّامہ کیفی چریاکوٹی کی غزلوں کا مجموعہ میکدۂ کیفی میری نظر سے گذرا۔ مجھے اس میں مختلف قسم کی غلطیاں نظر آئیں۔ یہاں تک کہ ناموزوں شعر بھی بکثرت ملے۔ مجھے معلوم ہے کہ علّامۂ موصوف ایک ایسے زبردست فاضل ہیں جنکی خدمات کا فخر ہندوستانی اکیڈمی نے حاصل کیا شعرا اور تصانیف کے متعلق کام سپرد کیا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میکدۂ کیفی ملک کے نامور فاضل عالیجناب سر تیج بہادر سپرو ایم، اے، ایل۔ ایل ڈی کے نام سے معنون ہے ان ہی وجوہ سے ادب ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء میں علّامۂ موصوف کے ایک مضمون سے متعلق کسی نقّاد صاحب کے خیالات دیکھنے کے بعد بھی یہ ہمت نہیں ہوئی کہ میں ان غلطیوں کو واقعاً غلطی سمجھ لوں۔ مبادا میں اپنی عدم واقفیت کا فریب خوردہ ہوں۔ میرا خیال صحیح نہ نکلے اور جن چیزوں کو غلط سمجھوں اُن میں کوئی خاص بات ہو۔ لہٰذا اُن مقامات کو ارباب ادب و محققین فن کے سامنے اس غرض سے پیش کرتا ہوں کہ اگر اُن میں کوئی خاص بات ہو تو کوئی صاحب براہ مہربانی مجھے مطمئن کردیں۔ یہ بھی گذارش ہے کہ جو صاحب میرے اطمینان کے لیے قلم اُٹھائیں وہ کیفی صاحب کی تعریف یا تنقیص کرکے بحث کے رُخ کو دوسری جانب پھیر دیں اور میدان ادب میں آکر تہذیب و شائستگی کو ہاتھ سے نہ دیں بلکہ مہذب طریقہ سے مجھے سمجھا دیں۔ سب سے پہلے میں چند ناموزوں شعر لکھتا ہوں کیونکہ شعر کی بدترین قسم یہی ہے۔ میں بحر اور وزن بھی لکھ دوں گا تاکہ جو لوگ میرے اطمینان کے لیے کچھ لکھیں انھیں تقطیع کرنے میں آسانی ہو۔

(۱) ہاتھ کسی کا ہے ضرور گردشِ روزگار میں　　بلبل کے آشیانے کو آگ لگی بہار میں

دوسرے مصرعہ میں بلبل کا دوسرا لام تقطیع سے گرتا ہے یا نہیں۔ یہ بحر رجز مطوی مخبون ہے جسکا وزن ”مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن“ ہے۔

(۲) وہ دیکھتے تو ہیں ضرور لیکن نظر میں ہے غرور　　دل ہی مرا گندھا نہ ہو اُن کے گلے کے ہار میں

پہلا مصرعہ بحر سے باہر بالکل ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔

(۳) بس اے خراشِ خارِ غم اب تجھ سے مطمئن ہیں ہم ٹکڑے جگر کے آ گئے دیدۂ اشکبار میں

اس شعر کا بھی پہلا مصرعہ بالکل ناموزوں معلوم ہوتا ہے

(۴) کیفی دفور یاس میں آہ شرر اثر نہ کھینچ دن زندگی کے ہیں بندھے سانس کے ایک تار میں

دُوسرا مصرعہ بالکل ناموزوں بحر سے باہر معلوم ہوتا ہے پہلے مصرعہ میں بھی شاید کیفی کی ی گرتی ہے جس کو فصحائے حال بالعموم ناجائز سمجھتے ہیں ؎

حسب ذیل فارسی کی غزل میں سات شعر ہیں اور ساتوں ناموزوں معلوم ہوتے ہیں۔ بحر وہی ہے جو اوپر ذکر کی گئی۔

(۵) حکم تو چیست چوں بود عاشق مُبتلائے تو قتل کند جفائے تو زندہ کُند ادائے تو

پہلا مصرعہ ناموزوں ہے۔

(۶) از بزم گفتہ بر و قرباں روان من بگو بہر تو صد بجائے من کیست مرا بجائے تو

پہلا مصرعہ بالکل ناموزوں ہے بحر سے باہر ہے۔

(۷) تخت کے دکلاہ را شوق نیاز من کجا بہتر ز عمر بادشہ یک لحظہ گدائے تو

دوسرا مصرعہ بالکل ناموزوں ہے۔

(۸) دُنیا و دین و ماسوا یک نظر تو بر بلا غم کنم بکوئے تو جان دہم بپائے تو

پہلا مصرعہ ناموزوں ہے۔ دوسرے مصرعہ میں جان ، میں ، اعلان نون کی غلطی ہے اس وجہ سے دوسرا مصرعہ بھی ناموزوں ہے۔

(۹) بکشود راز سرمدی در پردہ ہائے بیخودی ایں دل مست حُسن من صورت دلربائے تو

پہلا مصرعہ بحر سے باہر بالکل ناموزوں ہے شعر کی معنویت بھی قابل غور ہے۔

(۱۰) پرسی چو راز عاشقی گو یا ز حال غافلی گوشہ بگوشہ کو بکو رسوا شدن برائے تو

پرسی کی ی ، اور گویا ، اور رسوا کا الف تقطیع سے گرتا ہے۔ جو فارسی میں ناموزوں مانا جاتا ہے۔ اس کے متقدمین بھی قائل ہیں۔

(۱۱) فارغ ز حال نیک و بد خوش زندگی ہمی کند اے شہ حسن بر درت کیفی بے نوائے تو

پہلا مصرعہ ناموزوں ہے۔

(۱۲) شمع سوزاں کہ ہمہ شب سبق آموخت مرا تب دیگر آمد و با سوز دروں سوخت مرا

دوسرا مصرعہ ناموزوں ہے دیگر کی "ے" تقطیع سے گرتی ہے۔ یہ بحر رمل مثمن مخبون محذوف الآخر ہے جس کا وزن "فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن" ہے

(۱۳) بہ سوز راز درونم تمام سوزد مجال نیست چو پروانہ آشکار کنم

پہلا مصرعہ ناموزوں ہے یہ بحر مجتث مثمن مخبون محذوف ہے جسکا وزن "مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن ہے"

(۱۴) پردے میں محمدؐ کے خدا جلوہ نما ہے فانوس محمد ہے شمع اس میں خدا ہے

میرے خیال میں "شمع" بسکون میم ہے اگر صحیح لفظ استعمال کیا جائیگا تو دوسرا مصرعہ ناموزوں ہو جائے گا۔ بحر ہزج مثمن اخرب مقصور محذوف الآخر ہے جسکا وزن یہ ہے "مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن"

(۱۵) شوق سے ہے بود دل لیکن بعد از اختیار گرمی ہے وجہ زندگی حد سے مگر فزوں نہو

پہلے مصرعہ میں "لیکن" کا "نون" تقطیع سے گرتا ہے لہذا مصرعہ ناموزوں ہے بحر اسکی وہی ہے جو پہلی غزل کی بیان کیگئی۔ دوسرے مصرعہ میں گرمی کی "ی" گرتی ہے جسکو فصحائے حال اب بالعموم ناجائز سمجھتے ہیں۔

(۱۶) دل سے جدا ہے کیا کہوں کیفی مزاج غم تلاش اچھا ہوا جو زخم دل حال مرا زبوں نہو

پہلے مصرعہ میں کیفی کی "ی" کا سقوط فصحائے حال کے نزدیک بالعموم قطعاً ناجائز ہے۔ دوسرا مصرعہ معنوں میں مجہول ہے

(۱۷) سُنا باغباں پھر بہار آ گئی گلستاں میں شور عنادل مبارک

یہ شعر بھی ناموزوں ہے کیونکہ پہلا مصرعہ بحر متقارب مثمن محذوف الآخر میں ہے اور دوسرا مصرعہ بحر متقارب مثمن سالم میں ہے۔ بخیال طوالت اور ناموزوں اشعار ترک کیے جاتے ہیں اب ایک ایک دو دو غلطیاں مختلف قسموں کی بنظر اختصار لکھی جاتی ہیں۔

(۱۸) جب ہو سکے نہ پاس ہیں صبر و سکون بھی کیفی بقرار و حزیں اور کیا کرے

صبر و سکون میں اعلان نون فارسی ترکیب کے ساتھ ہے جسکو فصحائے حال بالعموم غلط سمجھتے ہیں

(۱۹) جسکی آنکھیں پڑ گئیں پھر عمر بھر اٹھتی نہیں کیا کشیدہ بیخودی ساقی ترے ساغر میں ہے

کشش کی جگہ کشید کا استعمال خلاف محاورہ ہے۔

(۲۰) میں نہ تھا جب ہوے وہ بالیں پر — وقت سے موت پیشتر آئی
آئے کی جگہ "ہوئے" استعمال کیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ ہوئے میں ذم کا پہلو بھی ہے۔

(۲۱) ترچھی نظر تمھاری ہے کیا سے بڑھکر — بگڑی مری بنا دو بندہ نواز خواجہ
عنایت کی نظر کی جگہ ترچھی نظر سنا غلط ہے،

(۲۲) خدا کا نام ہے احمد کی تصویر — اسی صورت کے سانچے میں ڈھلی
تصویر سانچے میں نہیں ڈھلتی۔

(۲۳) فنا ہو کے میں چھوٹ جاؤں گا غم سے — مرض بڑھتے بڑھتے دوا سے ملے گا
مرض دوا سے ملیگا اس کے کیا معنے ہوئے اگر اس معنی میں کہا گیا ہے کہ مرض دوا ہو جائے گا تو ہرگز دوا سے ملنے کے معنی دوا ہو جانے کے نہیں ہو سکتے

(۲۴) دیکھنا ہے خلش ہجر میں کیا ہوتا ہے — آبلہ ہے دل بیتاب تو نشتر آنکھیں
کس کی آنکھیں نشتر ہیں اگر معشوق کی آنکھیں ہیں تو ہجر کی حالت ہے وہ دکھائی نہ دینگی اور اگر اپنی ہی آنکھوں کو نشتر کہا ہے تو مہمل ہے۔

(۲۵) دل میں ہے جوش وحشت پہ گا گریبے ہوئے — ہیں مست شوق ساقی کو ترپیے ہوئے
دوسرے مصرعہ میں ردیف بالکل خلاف محاورہ استعمال ہوئی ہے،

(۲۶) دور کیا تھا اُڑ کے پہونچا عرش پر اپنا غبار — اُسکے کوچے سے چلی تھی یہ ہوائے عشق ہے
نشست الفاظ خراب ہونے کی وجہ سے ضعف تالیف کا عیب آگیا ہے شعر کو نثر کرکے دیکھ لیجیے

(۲۷) پہونچیں گے اس طرح شہ بطحی کے سامنے — دم توڑ دیں گے گنبد خضرا کے سامنے
"دم توڑیں گے" کی جگہ دم توڑ دیں گے خلاف محاورہ ہے۔

(۲۸) دل میں اُسی نے داغ محبت کا رکھ دیا — وہ جس نے تم کو چاند کا ٹکڑا بنا دیا
"اُسی نے" اور "وہ" دو دو اسم اشارہ ایک ہی شخص کے لیے ایک شعر میں غلط ہے یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے کہ اس میں کتابت کی غلطی ہو مثلاً دوسرا مصرعہ یوں ہو۔

جس نے کہ تم کو چاند کا ٹکڑا بنا دیا

لیکن بعض اخبار میں بھی یہ غزل چھپی ہے اُس میں بھی وہ ہے اس سبب سے کتابت کی غلطی نہیں معلوم ہوتی۔

(۲۹) تم جود دینے پہ مجھ کو آؤ گے　　　تم کو مانگوں گا وہ گدا ہوں میں

پہلے مصرعہ میں ذم کا پہلو قابل نفرت ہے۔

(۳۰) ذیل کے قطعہ کا عنوان کیفی صاحب نے رباعی لکھا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جسمیں چار مصرع ہوں وہی رباعی ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ رُباعی مخصوص بحر میں ہوتی ہے ؎

صوفی کے ہاتھ ساقی کامل کا جام ہے　　　زاہد سے کوئی کہدے کہ توبہ حرام ہے

ہے حکم عام کوئی ہو پیاسا نہ جائے ہائے　　　ساقی کے در پہ آج بڑا اہتمام ہے

(نوٹ) تیسرے مصرعہ میں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے شاید "نہ جانے پائے" کی جگہ "نہ جائے ہائے" تحریر ہو گیا ہے۔

اس وقت اُلٹ پُلٹ کر دیکھنے سے چند موٹی موٹی غلطیاں جو نظر آئیں وہ پیش کی گئیں ہیں۔ فرصت کے وقت میں اسپر پھر ایک نظر ڈالوں گا۔

دیباچہ دوستداران بشر

(محترمہ جناب سیدہ ساجدہ بیگم صاحبہ)

ناظرین "ادب" کی خدمت میں گزارش ہے کہ میرے عم محترم سید اطہر حسین صاحب جعفری سابق پروفیسر السنہ مشرقیہ ۵۴ انفنٹری بریگیڈ ۸ اڈویژن موصل (عراق) نے اپنے حال کی سیاحت ایران و عراق وغیرہ سے واپس آکر مثل دیگر اعزا کے اِس ناچیز کو بھی چند تحفے عنایت کیے تھے۔ منجملہ انکے ایک کتاب موسوم بہ "دوستداران بشر" (جلد دوم) تھی جو آقا مرزا احمد ایرانی کی تالیف (بزبان فارسی جدید) اور مطبع کاویانی برلن (جرمنی) کی چھپی ہوئی ہے۔ لائق مولف ایرانی نے مختلف مطابع سے ایسے مشاہیر عالم کے حالات زندگی فراہم کرکے جنھوں نے ابنائے جنس کی نمایاں خدمتیں کیں ہیں ایک کتاب کی شکل میں شائع کی ہیں جسکا نام دوستداران بشر رکھا ہے۔ اِس کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے اور تیسرے میں مردوں کے حالات ہیں، اور دوسرے میں چند اُن زنان مردصفت کے کارنامے درج ہیں جنھوں نے ابنائے جنس کی خدمت گذاری میں طرح طرح کی زحمتیں اور مشقتیں برداشت کرکے ان کے شدائد و مصائب کے رفع کرنے اور ان کے اندوہ و متابعت کی تخفیف میں بلیغ کوششیں کی ہیں اور بیشمار مردوں کے مقابلہ میں گوئے سبقت لیجا کر اپنا ذکر خیر صفحات تاریخ میں چھوڑ گئی ہیں جیسا کہ معمول ہے۔ پہلے تو میں نے اِس کتاب کو فرط شوق میں از اول تا آخر سرسری نظر سے پڑھا لیکن اسکے مضامین کچھ ایسے دلچسپ تھے کہ پھر دوسری مرتبہ اُسے بغور پڑھا اور زیادہ لطف اندوز ہوئی۔ مضامین کی دلچسپی کے ساتھ ہی اُن کی نافعیت کو دیکھ کر خیال ہوا کہ اگر میری طرح ہمارے وہ بھائی اور بہنیں جنکے پاس اصل کتاب موجود نہ ہو اس لطف میں شریک ہوں تو کیسی اچھی بات ہو۔ لہذا اسی خیال کو مدنظر رکھ کر اس کتاب کا با محاورہ ترجمہ اردو میں کرایا جسکے مختلف مضامین بخواست خدا اسی محترم رسالہ "ادب" کے توسط سے باقساط ہدیۂ ناظرین ہوتے رہیں گے۔

لائق مؤلف ایرانی نے اہل ایران کی جس گری ہوئی تعلیمی حالت سے متاثر ہو کر اِس کتاب کی تالیف کی زحمت گوارا کی تھی اسکا خاکہ اپنے دیباچہ میں نہایت ہی دلکش پیرایہ میں کھینچا ہے چونکہ اہل ایران اور مسلمانان ہند دائم اس سے کہ مرد ہوں یا عورتیں کی موجودہ زمانہ کی تعلیمی حالت میں تھوڑا ہی فرق ہے۔ اسلیے دیباچہ مذکور کا مضمون ناظرین ادب کیلیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لہذا اسکا خلاصہ و ترجمہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد

اگر خدا نے چاہا تو دوستداران بشر کے عنوان کے ساتھ ہر خاتون کے حالات زندگی (بشرط امکان مع تصویر کے) اسی رسالہ کے ذریعہ سے پیش کیے جائیں گے۔

اسی سلسلہ میں یہ عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میرے اسی قسم کے چند مضامین محترمہ خورشید اقبال صاحبہ "حیا" میرٹھی مدیرہ رسالہ "خاتون مشرق" میرٹھ کی خاص عنایت کی بدولت ممدوحہ کے خاص نوٹ کے ساتھ رسالہ مذکور میں شائع ہو چکے ہیں جنھیں ناظرین و ناظرات رسالہ نے شرف پسندیدگی عطا فرمایا ہے۔

آخر میں ہمارے علم دوست لائق مدیر ادب کا شکریہ بہ کمال ادب ادا کیا جاتا ہے جنکی نوازش کی بدولت "ادب" ایسے محترم ادبی رسالہ میں جسے نامور ادبا ہند کے مضامین خاص کے شائع کرنیکا شرف حاصل ہے۔ ہم ایسی ناچیز ہستیوں کے (بقول شخصے) ٹوٹے پھوٹے الفاظ والے مضامین کے شائع ہونیکا زریں موقع نصیب ہوا۔

ناظرین کرام سے ترجمہ کی دشواریاں پوشیدہ نہیں۔ چنانچہ انھیں دشواریوں کی بدولت ترجمہ بھی نقائص سے خالی نہ ہوگا لہذا باادب التماس ہے کہ اگر ترجمہ میں کوئی ادبی نقص نظر آئے تو اسپر نکتہ چینی نہ کی جائے بلکہ ازراہ کرم اسکی اصلاح کر دی جائے جو بصد تشکر و امتنان قبول کیجائیگی۔ فقط۔ ناچیز ساجدہ

خلاصۂ دیباچہ

بعد الحمد والصلوۃ۔ دوستداران بشر کی پہلی جلد تمام کرنیکے بعد یہ فکر ہوئی کہ بعض اُن نوع خواہان بشر کے حالات زندگی بھی لکھ ڈالوں جنھیں میں نے دوسری جلد کے لیے منتخب کیا تھا۔ لیکن پھر یہ خیال آیا کہ آخر دنیا میں ایسی نوع خواہ عورتیں بھی تو گزری ہیں جنھوں نے اپنے افعال حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ سے ہیئت جامعۂ انسانی کے ساتھ بڑے بڑے احسانات کیے ہیں اور جنکے بیشمار حقوق افراد بشر کے ذمہ ہیں۔ ساتھ ہی اسکے ایک یہ خیال بھی دل میں پیدا ہوا کہ وہ طبقہ جو بہ تصدیق علما و فضلا ربیابان خرافات و حیرانی میں سرگرداں ہیں اور جنکے درمیان سے حقوق مدنیت و طائف معیشت۔ لوازم اجتماع و مودت، وسائط اُنس و راحت، وسائل آسودگی، و رفاہیت، حتی کہ ذرائع علم و تربیت مفقود و معدوم ہیں۔ بغیر تازیانۂ غیرت اور بجز اخلاق کی ناصحانہ تلخ باتو نکے ہوشیار نہوگا۔ لہذا فرصت کے زمانہ میں اپنی راحت و آرام کو خیرباد کہہ کے اس رسالہ کی تالیف میں مشغول ہو گیا۔

کوئی صاحب یہ خیال نہ کریں کہ زنان نوع خواہ دنیا میں صرف اتنی ہی ہیں جتنی اس رسالہ میں درج ہیں۔

Phulanthropalaa

بلکہ یہ تعداد انکی اصلی تعداد کی عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ دنیا کے متمدن اطراف واکناف میں علم دوست نیک بیبیاں بیشمار ہیں جن کا مرتبہ از روئے ہمدردی بشر کے ایسا بلند ہے کہ انکی ثنا وصفت کیلئے ایسی ایسی صد ہا کتابیں بھی کفایت نہ کرینگی۔ اگر کوئی شخص اِن زنانِ مرد صفت کی حالت کا اندازہ ایشیا کے بعض اشخاص مرد صورت کی حالت سے کرے تو معلوم ہو جائیگا کہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جہاں دوسرے ممالک کے مردوں نے موجودہ زمانہ کے علم وفضل کے اعتبار سے عوائل طبیعی کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا کر دنیا کے مختلف حصوں میں علم بزرگی بلند کیا ہے وہاں ایشیا کے بعض قوموں کے مرد پستی و ذلت کی کثرت اور شومی و بدبختی کی زیادتی کی بدولت ہر قابل تصور ذلت و رسوائی میں گرفتار ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ غیر ممالک کے مردوں کے مقابلہ میں دعوے مردانگی نہیں کر سکتے بلکہ وہاں کی عورتوں کے مقابلہ میں بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ ان کے پاس سوائے آباؤ اجداد پر بیجا ناز وغرور کے حقیقی علم وفضل کا کوئی سرمایہ نہیں۔ قلم تو اس ضمن میں ابھی کچھ اور لکھنا چاہتا تھا لیکن مناسب یہی ہے کہ اصل مدعا کی طرف توجہ کیجائے۔

واضح رہے کہ دنیا میں ہر فرد بشر کو تحصیل اخلاق اور تکمیل صفات کی غرض سے کئی مکتبوں میں داخل ہونا پڑتا ہے جن میں سے سب سے مقدم اور سب سے بڑا رحم مادر ہے۔ ایک ایرانی فاضل نے اسی موضوع پر ایک مفید مقالہ سپرد قلم کیا ہے جسکا خلاصہ محض اپنے دعوے کے ثبوت میں درج کیا جاتا ہے۔ فاضل مذکور لکھتا ہے "اس مکتب میں جنین اصول اخلاق کی تحصیل کرتا ہے۔ اور یہیں اسمیں وہ باتیں پیدا ہوتی ہیں جو ایام حمل میں اسکی ماں میں حقیقۃً یا عارضی طور پر موجود تھیں۔ مثلاً اگر اسکی ماں بالطبع بخیل یا حاسد تھی یا یہ عیوب اسمیں عارضی طور پر موجود تھے۔ تو بلاشبہ اُس جنین میں بھی یہ باتیں موجود ہو جائینگی۔ یا اگر وہ ماں کسی خوفناک چیز سے ڈر گئی تھی یا کسی سخت مصیبت میں گرفتار تھی تو یقیناً اس نونہال تازہ میں بھی جسکی آبیاری ماں کے اخلاق کے چشمہ سے ہوتی ہے دہی ہول و ہراس اور حزن وغم موجود رہے گا اسی طرح اور اخلاق بھی خواہ اچھے ہوں یا برے ماں کے عارضی حالات یا اصلی اخلاق کی بدولت اُس بچہ میں پیدا ہو جائینگے علمائے فرنگ نے کامل تحقیق کے بعد یہ دریافت کیا ہے کہ ماں نے ایام حمل میں جو خواب دیکھے ہیں یا جو جو خیالات اُس کے دل میں گزرے ہیں وہ سب کے سب جنین کے دماغ میں منقوش ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص نے کسی محل یا مقام کو بچشم خود نہیں دیکھا یا یہ کہ صرف خواب میں دیکھا یا محض دل میں انکا خیال گزرا مگر سمجھتا ہے کہ اس سے پہلے اسنے ضرور اسی طرح دیکھا ہے یا ان کا خیال دل میں آچکا ہے اسکا سبب یہ ہے کہ وہ رابطہ جو اصلاً ماں اور بچہ کے درمیان میں ہوتا ہے اُن تمام کیفیات حالات اور خیالات کو بچہ کے دماغ میں نقش کر دیتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اسنے خود ان سب باتوں کو دیکھا یا تصور کیا ہے۔ حالانکہ اسکی ماں نے ان کا تصور کیا تھا۔ اس طبیعی قانون کا اثر چھ پشت پہلے سے چلا آتا ہے اور

چھ پشت بعد تک باقی رہتا ہی۔ اکثر دیکھا گیا ہی کہ حمل کے وقت کوئی عورت کسی مرض میں مبتلا تھی چنانچہ جب بچہ پیدا ہوا تو وہی مرض اسمیں بھی موجود تھا۔ اسمیں ذرا بھی شبہ نہیں کہ جو خو یا صفت ماں میں ہوتی ہی وہی بچہ میں بھی پائی جاتی ہی بلکہ اگر ماں میں وہ بات عارضی یا وقتی ہوتی ہی تو بچہ میں دائمی اور طبعی ہوجاتی ہی کسی بچہ کا وراثتہً ماں کی خو بو حاصل کرلینے کو اہل ایران اپنی اصطلاح میں "سو" کہتے ہیں، مثلاً فلان سوئے مادرش نیست، یعنے فلاں شخص میں اسکی ماں کی خو بو نہیں ہی۔ جملہ حیوانات بلکہ نباتات میں بھی یہ وراثت وسو جاری وساری ہی۔ پھر فاضل موصوف لکھتا ہی "اس نکتہ ومقدمہ کے جان لینے کے بعد لازم ہے کہ عورتوں کے بارہ میں نہایت غور وخوض سے کام لیا جائے اور انکے حقوق کی کماحقہ رعایت کیجائے تاکہ انکے بچے بدخو وبدطبع نہ ہونے پائیں۔ اس کتاب کے پڑھنے والے نے اگر ایرانیوں کو دیکھا ہی تو ضرور تصدیق کریگا کہ (موجودہ زمانہ کی) ایران کی عورتیں جملہ حقوق بشریت وحظوظ معیشت سے محروم وممنوع ہیں۔ بلکہ انھیں زندہ درگور اور مثل کر و کور کے سمجھنا چاہیے۔ اس تحقیر وتوہین کو جسے ایرانی اپنی عورتوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں ان عربوں نے بھی اپنی لڑکیوں کے حق میں کبھی جائز نہیں رکھا جنھیں وہ کسی زمانہ میں زندہ دفن کردیا کرتے تھے، سمجھ میں نہیں آتا کہ جب روز بازخواست منتقم حقیقی کی جانب سے یہ خطاب ہوگا کہ "بای ذنب قتلت"، (یعنے کس گناہ کی پاداش میں یہ بیچاریاں قتل کی گئی تھیں) تو یہ دینداران اسلام کیا جواب دینگے۔ زنان ایران فرنگستان کے حیوانوں بلکہ کتوں سے بھی زیادہ خوار اور وہاں کے گورستانوں کی بلیوں سے بھی زیادہ ذلیل ہورہی ہیں۔ ہر بیغیرت وستمگار وجبروت اپنے انتہائی درجہ کے طبیعی ظلم اور اخلاق شدادی ونمرودی کو گھر کے اندر رہنے والی بیکس ومجبور عورت کے حق میں روا رکھتا ہی۔ اور اپنی ساری بزرگی وہیبت وصلابت کو اس بیچاری پر ختم کردیتا ہی۔ وہ دکھیاری غم کی ماری اس ظلم یزیدی وتعدی شدادی وستم فرعونی کے مقابلہ میں کوئی جائے پناہ سوائے حیلہ وتزویر ودروغ ودغل کے نہیں دیکھتی۔ اس زار واسختی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس خاتون میں جملہ اقسام کی بری عادتیں پیدا ہوجائینگی اور جب ماں کی یہ کیفیت ہوگی تو اس بچہ کا کیا کہنا جو اس مکتب دغل ومدرسہ حیلہ ومکر میں درس لیگا اسکی ذات گنجینہ کینہ ونفاق اور مخزن ومکر وشقاق ہوگی۔ یہی وجہ ہی کہ مملکت ایران سے اتفاق بلیہ یکلخت عنقا ہوگیا ہی۔ اب (اتفاق) کا صرف نام ہی نام باقی ہی جسے دوسرے الفاظ میں تملق بیجا یا چاپلوسی بے پروا کہنا بیجا نہوگا ورنہ عملاً مفقود ہوگیا ہی حتی کہ دو بھائیوں بلکہ باپ بیٹوں کے درمیان میں بھی نہیں پایا جاتا۔ اس فقدان اتفاق کا اصلی سبب بدی مکاتب ابتدائیہ ودرشتی ارحام دنیہ ہی۔ اسلیے کہ بیچاری عورتوں کو اپنے شوہروں کے جور وجفا کی بدولت مجبوراً اپنی جان بچانیکی غرض سے صدہا اقسام کے مکر وحیلے تراشنے پڑتے ہیں۔ ناظرین کتاب میں سے جس نے بھی ایرانی عورتوں کو دیکھا ہوگا وہ بخوبی جانتا ہے کہ سارے ایران میں ایک راستگو، خوشخو، اور درست کردار عورت بھی

مشکل سے نظر آئیگی۔ لیکن اس قصور کی ذمہ دار عورتیں نہیں ہیں بلکہ اُنکے رن صفت و بیمروت شوہروں کے وحشیانہ حرکات
اور میرانہ معاملات ہیں، جنکا ان بیچاریوں کو آئے دن سامنا رہتا ہی جب عورتوں کو ہمیشہ اس بیجا قید، حقارت اور اضطرار
کا سامنا ہوگا تو انکی طبیعتوں میں بری عادتوں اور پست صفتوں کا پیدا ہو جانا لازمی ہوگا۔ زن اسیر وہ ہستی ہی جو ہر قسم
کی دنائت و رذالت کو برداشت کرنے پر مجبور ہوتی ہی اور اس ظلم و ستم کے پنجے سے چھٹنے کی غرض سے ہر امکانی مکرو
حیلہ سے کام لیتی ہی۔ اُس سے جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ حیلہ و دروغ کا پُتلا ہوتا ہے"

اگرچہ اس دانشمند ایرانی کی یہ باتیں نہایت درجہ سخت ہیں لیکن ایسی ہیں کہ گویا کسی کو بھی اس سے انکار نہیں
ہو سکتا۔ گو زنان ایران جملہ اقسام کی بدبختی۔ فلاکت اور مسکنت کی نشانہ بنی ہوئی ہیں اور ابواب علم و تربیت مشروعہ
انکے لیے مسدود ہیں لیکن چونکہ انہیں فطانت جبلی و ذکاوت طبیعی موجود ہی لہذا جہاں تک اُنکے امکان میں تھا ایسے
کام ہیں جس سے اُنکے ابنائے جنس کا نفع و بہبود متصور تھا جد و جہد کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ بلکہ انکے بارہ میں کہا
جا سکتا ہی کہ اپنے علم میں انھوں نے مردوں سے زیادہ زحمتیں اُٹھائی ہیں۔ ابھی کل کی بات ہی کہ زنان تبریز نے استقرار مشروطیت
(پارلیمنٹ) و رفع استبداد میں جو فداکاری اور جاں نثاری کی ہی وہ تاریخ عالم میں بحروف جلی ثبت ہو گئی ہے۔ اس
رسالہ کے لکھنے سے دو ہی تین دن پہلے کسی ہندی دانشمند نے جریدۂ "ٹائمس" ہندوستان [illegible]
میں ایک مقالہ سپرد قلم کیا تھا جسمیں زنان ایران کے اوصاف کی تمجید و تحسین کیگئی تھی۔ اس میں اُنکے جملہ اقدامات و طن
پرستانہ کو یکے بعد دیگرے درج کیا گیا تھا حتیٰ کہ بنک ملی (National Bank) کی اعانت کی غرض سے
زنان ایران کا اپنے کپڑے اور زیورات کا فروخت کر ڈالنا۔ طہران میں مدرسۂ نسواں کی تحریک۔ تعلیمی امور میں بحث و مباحثہ
کی غرض سے مجالس منعقد کرنے میں اُنکے اقدامات وغیرہ بھی اسمیں درج تھے۔ اس مقالہ میں ان کی تمجید و تحسین
اس درجہ کیگئی تھی کہ باعث تعجب و امتنان ہی۔ لیکن اس اظہار سے یہ مقصود نہیں کہ عوام پر حقیقت امر مشتبہ ہو جائے
اور موجودہ نواقص و مفاسد پر پردہ پڑ جائے۔ نہیں بلکہ ابھی ایران کے مرد علم و ادب میں اوروں سے ہزاروں منزلیں پیچھے
ہیں۔ لہذا لازمی طور پر اُن کی عورتیں اُن سے بھی پیچھے حالت بے علمی و جہالت میں پڑی ہیں۔ جس قوم کے مرد کم از کم
۸۵ فی صد جاہل ہوں اور پڑھے لکھے آدمیوں میں سے بھی صرف ۵ فیصد اصلی معنی میں پڑھے لکھے کہے جانیکے
مستحق ہوں اُن کی عورتیں کس طرح علم و ادب و تربیت و معرفت کے حلقہ میں داخل ہونگی۔

یہ چند صفحات جو ہمارے ہموطنوں کی خدمت میں پیش کیے گئے ہیں اُن سے مدعا صرف یہی نہیں کہ زنان
ایران انھیں پڑھیں۔ اور جن خواتین کے حالات ان میں قلمبند ہیں اُن کی تقلید کریں، بلکہ یہ مطلب بھی ہی کہ ایران کے

دیکھی اُنکا مطالعہ کریں۔ اور دوسرے ممالک کی عورتوں کے کارناموں سے پند و عبرت حاصل کرکے کم از کم اتنا تو تصفیہ کریں کہ وہ اُس مرد کا کیا درجہ ہی جو عورتوں سے بھی کم ہو۔ جس حالت میں کہ غیر ممالک کی عورتوں نے فرایض انسانیت کے ادا کرنے میں اس درجہ کوشش سے کام کیا ہو کیسے افسوس کا مقام ہوگا کہ ایک خاص قوم کے مردان عورتوں کے مقابلہ میں اگر اقوام عالم کے سامنے اپنے دعوائے مردانگی کا ثبوت نہ دیسکیں۔ جو شخص کہ ایران کی سابقہ حالت کا مقابلہ اسکی موجودہ حالت سے کریگا وہ بیشک سمجھ لیگا کہ دونوں حالتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تاریخ دنیا شاہد ہی کہ زمانہ سابق کے اہل ایران علوم و فنون میں کمال حاصل کرکے اپنی مساعی جمیلہ کی بدولت شایاں یادگاریں دنیا میں چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن زمانہ حال کے ایرانی اپنی بے علمی و نادانی کی بدولت ساری دنیا میں ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں جس موضوع کو بھی لیا جائے اُسمیں صاف نظر آئیگا کہ ایرانیان سابق سایر ممالک دنیا کے لوگوں سے گوئے سبقت لیجا کر اپنے نام کو بزرگی و حشمت کے ساتھ دنیا میں یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن اگر زمانہ سابق سے گزر کر زمانہ لاحق پر نظر ڈالی جائے تو قضیہ بالکل برعکس نظر آئیگا۔ گو اس بیان سے ثابت ہوتا ہی کہ ایران کی موجودہ حالت خراب ہے لیکن ساتھ ہی اسکے یہ بھی صحیح نہیں کہ اب علم و ادب کی یہاں گنجائش ہی نہیں۔ نہیں بلکہ اگر علوم و ادبیات میں اضافہ کردیا جائے تو اسکے ساتھ ہی یہاں کے لوگ بھی زیادہ عاقل ہوجائینگے۔ اور اُنکی حالت بھی اب سے زیادہ سدھر جائیگی۔

بحالت موجودہ اہل ایران کے لیے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہی وہ انتشار علوم نافعہ و ترویج معارف ہی، تاکہ انھیں ذرائع سے اخلاق میں مفید تغیرات پیدا کرکے اِن قابل نفوس کو سعید و خوش بخت بنا دیا جائے۔ اسمیں شک نہیں کہ اس کام کے ضروری وسائل میں سے ایک یہ ہی کہ ایسی مفید اخلاقی کتابیں شایع کیجائیں جنمیں ایسے افراد کے حالات درج ہوں جنھوں نے اپنے دوران حیات میں ہیئت جامعۂ بشری کے ساتھ مفید خدمتیں کی ہوں اور اس خدمت کی راہ میں بڑی بڑی محنتیں اُٹھائی ہوں، اُمید ہے کہ یہ مختصر مضامین جو متعدد کتابوں سے منتخب کیے گئے ہیں اہل ایران کی غیرت کو حرکت میں لانے اور اُنکی رگ انسانیت میں ہیجان پیدا کرنے میں مفید ثابت ہونگے۔ اِن مضامین کا لکھنے والا انھیں ناظرین کی خدمت میں پیش کرکے اُمیدوار ہی کہ اگر انمیں کسی قسم کی غلطی یا سہو مشاہدہ کریں تو از راہ کرم اس سے چشم پوشی فرمائیں اسلیے کہ اس رسالہ کے لکھنے کی علت غائی اپنی فصاحت و بلاغت کا اظہار نہیں، بلکہ مدعا صرف یہ ہی کہ اہل ایران اُسے آسانی سے پڑھ سکیں اور اُسکے معانی و مطالب بخوبی سمجھ سکیں۔ چونکہ اب سخن کو طول ہوگیا ہی اسلیے دیباچہ اس دعا پر ختم کیا جاتا ہی کہ خداوند عالم جملہ افراد صالحۂ بشری کو حسن خاتمت و یمن عافیت عطا فرمائے۔ آمین۔ محمد۔ ۲۰ صفر سنہ ۱۳۴۳ ہجری

سلطان محمد تغلق عادل شاہ

گزشتہ سے پیوستہ

(۵)

مسٹر کے، ایم، مشیر احمد علوی، بی، اے، (علیگ)

باب چہارم

قحط عظیم اور سلطان محمد تغلق کی مساعی جلیلہ

۷۲۹ھ سے ہندوستان کی اقتصادی حالت خراب ہونا شروع ہوئی۔ حتیٰ کہ دوآب اور مالوہ کے علاقوں میں مطلقاً بارش نہ ہونے کی بنا پر فصل ربیع کو بہت سخت نقصان ہوا۔ مالوہ کی حالت تو اِس درجہ خراب نہ ہوئی لیکن دوآب کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ اور آئندہ سات سال تک (۷۳۶ھ تک متواتر ہندوستان میں قحط مسلط رہا یہ ایسا فاقد النظیر قحط کہا جاتا ہے کہ اِس میں علانیہ مردم خوری شروع ہوگئی تھی، پاک نہاد سلطان جو کچھ کرسکتا تھا اُسمیں اُسنے کوتاہی نہیں کی۔

"چوں سلطان محمد بازحمت از دیوگیر سوئے دہلی مراجعت فرمود در دھار رسید و چند روز توقف فرمود و از آنجا جانب دہلی رواں شد و در مالوہ ہم قحط افتادہ بود و دھار بکلی از تمامی راہ برخاستہ و قصبات و ولایات سرراہ پریشان و ابتر شدہ سلطان در دہلی رسید و چند گاہ در تربیت آبادانی و زراعت مشغول شد و دراں سال باراں ہم امساک کرد و ہیچ ترتیبے نہ شد د گاہ اسپاں و مواشی نماند و غلہ بشانزدہ و ہفدہ جیتل سیرے رسید و خلق مستہلک مے شد۔۔۔ سلطان بر سبیل سوندہار (تقاوی) برائے زراعت مال از خزانہ می داد و خلق درماندہ و عاجز گشتہ می شدہ و زراعت از امساک باران میسر نہ شدہ خلق کشتہ می شد"

یہ قحط ایسا عالمگیر تھا کہ لوگوں کو اپنی زندگی مصیبت ہوگئی تھی۔ بھوکوں نے اپنی اولادیں (نعوذ باللہ من الشیطن الرجیم) فروخت کر ڈالیں، ہر حرام شئے حلال ہوگئی، اور امیر و غریب سب پر یک ساں اِس منحوس قحط کا اثر پڑا۔

"در عہد آں بادشاہ (سلطان محمد تغلق) دو مرتبہ امساک باراں شد و در ہر کرت قریب سہ سال مردم اوقات بعسرت گذرانیدند"[۱]

[۱] فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی۔ ایشیاٹک سوسائٹی۔ کلکتہ

کہا جاتا ہے کہ اس قحط میں ایک قطرہ بھی آسمان سے اس سات سال کے عرصہ میں زمین پر نہ گرا اور ایک سا سیر غلہ سترہ درم کو بھی میسر نہ آتا تھا[۵۲]"

"قحط عام و گرانی غلہ ہفت سال چناں شد کہ قطرۂ از آسمان نہ بارید[۵۳]"

عادل شاہ نے بنگال و بہار کے علاقوں سے غلہ منگوایا اور دوآب میں ارزاں قیمت پر فروخت کرنے کا انتظام کیا۔ حاجتمندوں کو روپیہ تقسیم کیا گیا، غربا کی نگہداشت کے لیے مکانات مہیا کیے گئے، اور لاچاروں و بیکسوں کو غلہ روپیہ مفت تقسیم کرنیکے اسالیب جاری ہوے (احکام کو برنی اسالیب لکھتا ہے) ان انتظامات کی بنا پر نواح دہلی میں قحط زدہ افراد جوق جوق آنے لگے، ۷۳۲ھ میں قحط اپنے شباب پر پہونچگیا، سندھ، گجرات، دولت آباد، دوآبہ سے غلہ منگوایا گیا، اور عمال دوآب کو حکم دیا گیا کہ وہ غربا کو دہلی بھیجنے کی ترغیب دیں۔ اور جب سب دہلی میں جمع ہوگئے تو سلطان محمد خود اپنے سامنے، روزانہ ڈیڑھ رطل (۱۰ یا چھٹانک) فی کس کے حساب سے ہر شخص کو غلہ تقسیم کرتا، اور جب غلہ کافی تعداد میں آگیا تو چھ چھ ماہ کا غلہ ہر شخص کو دیکر ادسنے مکان رخصت کیا۔ اور خود بھی دارالخلافت سے دوآب کا دورہ کرنیکی نیت سے باہر نکل کھڑا ہوا۔

یہاں پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان قحطوں کے اسباب کیا تھے۔ یہ تو یقینی ہو کہ قحط ہندوستان میں یا تو طبعی اسباب سے پیدا ہوتے تھے یا حضرت انسان کی ستم ظریفیوں کا نتیجہ لازمی ہوا کرتے تھے۔ قحط طبعی کی وجہ ظاہر کہ کسی سال بارش نہ ہوئی یا جن موسمی تاثیرات سے بارش ہوا کرتی تھی وہ کسی سال مرتب نہ ہوسے اور اُن کا انجام امساک باراں کی شکل میں نمودار ہوا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہو کہ مسلسل بارش ہونیکی وجہ سے بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ آیندہ سال بارش اچھی نہیں ہوئی اور یہ شکل خطرناک بھی ہوا کرتی ہے، اور یہی اسباب مجتمع ہو کر قحط پیدا کرنے میں کامیاب ہوا کرتے ہیں۔ دوسرا سبب طبعی نہیں بلکہ کسبی ہو وہ اس طرح کہ جنگلوں کو کاٹ کر میدان بنایا جاتا ہو اور مشہور کیا جاتا ہے کہ آبادی بڑھ رہی ہے اور مزارعین کے لیے زراعت کے واسطے کافی زمین موجود نہیں ہو۔ لیکن اس صفائی کا انجام یہ ہوا کرتا ہے کہ بارش اُس خطہ میں کم ہوجایا کرتی ہے۔ جن رقبات میں جنگل ہوتے ہیں وہاں بارش بہ کثرت ہوا کرتی ہے، کیونکہ درختوں میں نمی (بھاپ) جذب کرنے کی ایک خاص کہربائی قوت ودیعت کی گئی ہے اسی سے جنوبی امریکہ میں بارش عمدہ ہوتی ہے کیونکہ وہاں دشوار گزار جنگل اب بھی موجود ہیں۔ ہندوستان میں بھی

---

۵۲ روضۃ الاولیا۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی ۱۴

۵۳ فیروزشاہی۔ ضیاء الدین برنی۔ ایشاٹک سوسائٹی۔ کلکتہ۔

"عہد اصنام" سے پیشتر جنگل موجود تھے جنکی وجہ سے کثرت سے بارش ہوا کرتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کا قومی رُت (موسم) برسات کا سمجھا جاتا تھا، اور جملہ اقسام کے سامان تعیش اسی خاص رنگین رُت کے لیے اُٹھا رکھے جاتے تھے۔ چنانچہ آج بھی ساون کے روح پرور مہینے میں عہد رفتہ کے مٹے ہوئے دھندلے نشانات کی یاد ہندوستان میں تازہ ہو جایا کرتی ہے۔ قحطوں کا پڑنا کوئی نئی بات نہیں ہے مصر و شام کا قحط تو کلام مجید سے بھی ثابت ہے جس میں کنعانیوں کو عزیز مصر کے حضور میں کشکول گدائی پھیلانے پر مجبور کیا تھا۔ عہد نامہ عتیق میں یہ واقعہ بہت تفصیل سے موجود ہے۔ ہندوؤں کی الہامی کتاب "وید مقدس" میں بھی جا بجا قحطوں کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن عہد اسلامی میں قحط کے متذکرہ بالا اسباب سے علیحدہ بھی ایک وجہ یہ ہوا کرتی تھی کہ اس عہد میں آئے دن جنگوں سے سابقہ تھا۔ مزارعین کو امن و چین ملنا عنقا کا حکم رکھتا تھا۔ وہ مجبوراً اپنی جان بچانے کے لیے پہاڑوں و غاروں میں پوشیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ لازماً اس طور سے زراعت کو شدید نقصان پہونچا کرتا تھا اور قحط پھیل جاتا تھا۔ سب سے آخر وجہ یا سب سے زیادہ سنگین و مہلک وجہ "وبا" ہوتی تھی۔ ایک دستور سا ہو گیا تھا کہ ہر جنگ کے بعد ایک نہ ایک وبا پھیل جایا کرتی تھی۔ اور اسکا خمیازہ بھی زیادہ تر مزارعین ہی کو بھگتنا پڑتا تھا۔ چنانچہ امراض خبیثہ اور قحطوں کا حملہ ہندوستان میں ۱۰۳۳ء سے لے کر سلطان محمد تغلق کے عہد حکومت تک آٹھ بار ہوا جو حسب ذیل نقشہ سے بخوبی واضح ہو جائے گا۔
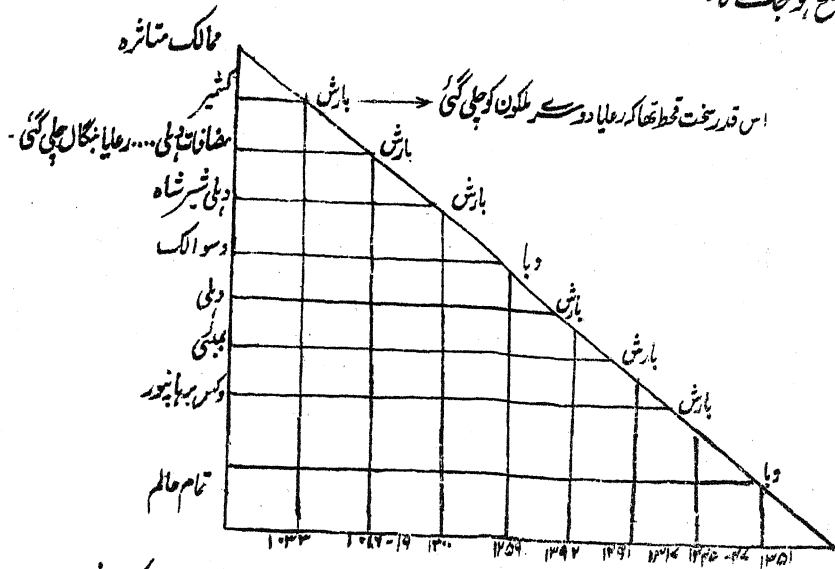
یہ قحط کا زمانہ سلطان محمد تغلق کے لیے یقیناً بہت نازک تھا۔ سلطان نے نہایت استقلال اور کامرانی سے اس بلائے ناگہانی کا مقابلہ کیا اور ہر آئینہ کامیاب بھی ہوا۔ اسی زمانے میں ملک المجاہد سلطان یمن نے سلطان محمد تغلق سے

دوستانہ راہ و رسم قائم کیے اور مصر سے سلطان ملک الناصر اور خلیفہ ابو الربیع مستکفی باللہ عباسی کے فرستادہ سفراء حاضر دربار ہوئے اور اپنے اپنے سلاطین کی جانب سے تحائف پیش کیے۔ خدا خدا کر کے ۷۴۳ھ میں بارش ہوئی اور پیداوار ہوئی اور مزارعین کو سانس لینے کا موقع ملا۔ سلطان نے دہلی میں زراعت کے انتظامات شروع کر دیے باقاعدہ محکمہ زراعت قائم کیا اور ہر قابل زراعت رقبہ کو مساوی مربعوں میں تقسیم کیا (ایک مربع۔ ایک ضلع) ہر مربع کی چوڑائی تیس تیس کوس یا ۶۰، ۶۰ میل کی تھی۔ ہر اس ۶۰ میل کے رقبہ کے لیے ایک جدید دیوان مقرر کیا تاکہ وہ مزروعہ و غیر مزروعہ اور شور زمینوں کو یکساں قابل کاشت بنائے۔ اِس لائحہ عمل پر ہزارہا روپیہ خرچ ہوا، لیکن فیاض سلطان نے خلق اللہ کے عیش و آرام کے مقابلہ میں اسکو ہیچ سمجھا، اور روپیہ پانی کی طرح بے دریغ خرچ کیا۔

"سی کروہ درسی کروہ دائرہ گرد از قیاس گرفتند بشرط آنکہ یک بالشت زمین مسافت چندی کروہ بے زراعت ماند، ہر چہ زراعت شود آنرا تبدیل کنند چنانچہ حنطہ بجائے جو کارند۔ و بجائے حنطہ نیشکر کارند و بجائے نیشکر انگور و رطب نہال کنند و قریب صد تن دارد زمین منصوبہ نصب شد"[1]

۷۴۳ھ کے آخری عشرہ سنام، سامانہ، اور کیتھل میں سرکشی کی اور گھنے جنگلوں میں منڈلیاں (گڑھیاں) بنا کر علانیہ غارت گری شروع کر دی، امن و امان خطرہ میں پڑ گیا، یہ باغی بالعموم جاگیردار تھے، چنانچہ سلطان بنفس نفیس ان کی گوشمالی کے لیے گیا، اور ان منڈلیوں کو مسمار کر کے باغیوں کو گرفتار کر کے دہلی واپس آیا۔

سلطان در ولایت ہائے سنام و سامانہ لشکر کشید۔ و متمردان و سرتابان آنجائے کہ منڈلہا کردہ بودند "و خراج نمی دادند و فساد ہا می کردند و راہ می زدند، سلطان محمد ابن شاہ را نہیب و تاراج فرمود۔ و جتہائے ایشاں را متفرق گردانید۔ و مقدماں و سرداران ایشاں را در شہر (دہلی) آورد بعضے از ایشاں مسلمان شدند و گروہ گروہ را داخل امرا گردانیدہ و با زن و بچہ در شہر (دہلی) سکونت گرفتند و از زمین ہائے قدیم ایشاں را بگسلانیدند۔ و شر ایشاں از ان دیار دفع شد و آیندگان و روندگان از راہ زنی خلاص یافتند"[2]

جو مسلمان ہوئے اُن کو دوبارہ جاگیریں عطا کیں اور جو باقی بچے اُن کو امراء وزراء میں تختہ تقسیم کر دیا گیا، لیکن کسی قسم کا خوفناک ظلم نہیں کیا گیا اور اس طرح سے یہ فساد رفع ہو گیا اور دوبارہ امن و امان کا ڈنکا بجنے لگا۔ اسی زمانہ

[1] فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ [2] فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔

نیا سال شروع ہوتے ہی پھر قحط کی وبا نازل ہوئی اور خلق اللہ پریشان ہو گئی۔ یہ قحط نہ صرف ہندوستان بلکہ چین تک میں بھی پھیلا۔ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ "آدمیوں کو آدمیوں نے کھایا، اس سال سلطان نے گزشتہ قحط کے تجربہ سے فائدہ اٹھایا، اور سلطنت کو دہلی کے محلے مقاضات اور میان دوآب تقسیم کر دیے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵۸) ایک کروڑ آدمی مر گئے، پھر اسکے بعد ۱۷۸۳ء میں گیارہ دن قحط پڑا اور اسکے ساتھ ہی ساتھ ہیضہ چلا جس نے ملک کو تباہ کر دیا۔ اُسکے بعد ۱۸۶۰ء میں ایک قحط اور پڑا، اور پھر ۱۸۶۶ء کا وہ ہولناک قحط پڑا جو اُنیسویں صدی کی یادگار کہلانیکا مستحق ہے اور لاتعداد جانیں تلف ہوئیں۔ اُسکے بعد پھر ۱۸۷۶ء اور ۱۸۹۷ء کے درمیان میں کل چھوٹے بڑے قحط اور خشک سالیاں ملا کر سات ہوئیں۔ پھر اسکے بعد ۱۸۹۶-۹۷ء کا عالمگیر قحط پڑا۔ اِس قحط کا اثر چونتیس کروڑ نفوس پر پڑا اور ممالک متوسط میں اِس قحط نے تو گویا قتل عام کر دیا اور اُسکے بعد ۱۸۹۹-۱۹۰۰ء کا قحط پڑا جو کہ سب سے زبردست تھا اور صرف اِسی قحط نے بارہ لاکھ ۳۶ ہزار آٹھ سو پچپن آدمی جیسے کو مار ڈالے، اُسکے بعد ۱۹۰۰ء کے قحط کے بعد چھوٹے موٹے قحط اور بھی پڑے جن کو ہم خود دیکھ چکے ہیں۔ ان میں سے ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۸ء کے قحط قابل ذکر ہیں۔

سلطان محمد تغلق جسکو ہمارے تمدن کی عقل کے لوگ صرف ایک پاگل اور ظالم ہی خیال کرتے ہیں لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ پھر بھی رعایا کا ہمدرد باپ تھا۔ ایشیائی سلطان جبروت اور ...... فرعونیت کا اگر نمونہ تھے تو اُن میں یہ بات بھی تھی کہ رعیت کا خیال بھی کرتے تھے اور جسوقت ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک ظالم بادشاہ بذات خود دن رات غلہ کی باربرداری اور درآمد کے کاموں کی نگرانی کر رہا ہے تو اُسکے گناہوں کی تلافی ہو جاتی ہے ....

.... اب ہم دکھاتے ہیں کہ قحط سالی .... میں یورپ کی گورنمنٹ نے ہندوستان کے ساتھ کیا کیا۔

وہ خوفناک قحط ۱۷۷۰ء میں پڑا اور جس میں بنگال کی ایک تہائی آبادی کا صفایا ہو گیا۔ اِسکے بارہ میں جو کچھ گورنمنٹ نے کیا وہ حسب ذیل ہے:-

"اگرچہ اسکے دالا حضور پہلے قحط کے علامات صاف ظاہر تھے اور ۱۷۶۹ء میں اندازہ لگ گیا تھا کہ قحط ہوگا۔ لیکن قحط کو روکنے کی کوئی تدبیر اختیار نہیں کی گئی اور اُسپر طرہ یہ کہ جب قحط کی شدت اور سختی محسوس ہوئی تو کوئی مناسب کافی طریقے نہیں اختیار کیے گئے" ([illegible])

اب اِس قحط کی سختی کا اندازہ حسب ذیل حوالجات سے کیجیے۔

چاولوں کا ایک روپیہ کا من بھر آتا تھا، اور اِس قحط میں ۳ سیر کا فروخت ہوا۔ یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ ۱۷۷۰ء میں چاول

ابن بطوطہ جو اس زمانہ میں قاضی القضات دہلی میں تھا وہ ۵۰۰ محتاجوں کا کفیل تھا۔ اسی طریقہ سے دوسرے اُمرا بھی۔ اس بار سلطان نے آبپاشی کے لیے کنوئیں کھودنے کے لیے ۷ لاکھ روپیہ تقسیم کیا۔ لیکن مخلوق قحط سے عاجز آگئی تھی گذشتہ قحط سے ابھی تک نہ پنپ سکی تھی۔ اس سے قحط نے ہمتوں کو پست کر دیا اور یہ نوبت پہونچ گئی کہ باوجود کوششوں کے

(بقیہ صفحہ ۵۹) ایک روپیہ کا ایک سو بیس سیر آٹا تھا اور گیہوں ایک روپیہ کا نوے سیر یعنے ۲ من ۱۰ سیر آتا تھا اور پور کرنل برڈ ہتمم)

اسکے بعد ذیل کا حوالہ ملاحظہ کیجیے۔

”وہ خوفناک منظر جو پیش ہوا اور اب بھی جاری ہے اس کا بیان ہی اسقدر ہیبتناک ہے کہ انسانیت اُسکی متحمل نہیں ہو سکتی یہ واقعہ ہے کہ بعض مقامات پر زندوں نے مردوں (لاشوں) سے اپنے پیٹ بھرے ہیں۔“ حوالہ تصص پیات بنگال از سٹر ہلو ہنٹر صفحہ ۴۱)

اسی قحط کے بارہ میں ایک اور حوالہ ملاحظہ ہو۔

”وہ خوفناک مصیبت جسکی تباہی کی تلافی دو پشت تک بھی نہ ہو سکی“ (حوالہ ایضاً)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ نام نہاد پاگل بادشاہ نے بھی قحط کے زمانے میں تمام ٹیکس و مالگذاری معاف کر دی اور مفت غلہ تقسیم کرایا مگر یہاں جو کچھ کیا گیا وہ ایسا تھا ---------- ٹیکس و مالگذاری کے بارہ میں اُسوقت کے وائسرائے ہسٹنگس سے تھے اُنھوں نے قحط کے زمانہ میں ٹیکس وصول کرنے میں جو گورنمنٹ کی طرف زیادتیاں ہوئیں اُن کا اقبال حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے :-

مالگذاری بیرحمانہ طریقہ سے وصول کی گئی۔ (تفصیل کے لیے دیکھو تاریخ رابرٹ)

خدا کی پناہ! جب ہم ان تمام باتوں پر غور کرتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ----------

---------- اور بھی جبکہ غلہ کی گرانی کا یہ حال تھا کہ بجائے من بھر کے ساڑھے تین سیر چاول بک رہے تھے اور قتل عام ہو رہا تھا جسمیں دس ملین جانیں ضائع ہوئیں۔ لیکن بے انصافی ہوگی اگر ہم اس لگان کی عجیب و غریب معافی کا تذکرہ نہ کریں جو اس قحط میں کمپنی بہادر نے کی وہ حسب ذیل ہے۔

قحط کے شدید ترین زمانہ میں زمین کا ٹیکس (یعنے مالگذاری و لگان) پانچ فی صدی معاف کیا گیا لیکن دوسرے سال دس فی صدی کے حساب سے (گویا اصل مع سود) زیادہ اضافہ کر لیا گیا (دیکھو تاریخ رابرٹ)

دنیا میں اضافے پیداوار کے بعد ہوتے ہیں مگر یہاں تو معاملہ ہی عجیب تھا۔

یہ تو ٹیکس کی وصولیابی اور معافی کا حال ہوا اب غلہ کی تقسیم کا حال سنیے اور پاگل تغلق کو دعائیں دیجیے۔

قحط و گرانی بڑھتی گئی "آدمی آدمی کو کھانے لگا" سلطان نے بر کمیں انتظام کیا اور ملک کے دورہ کیلیے دوبارہ چل کھڑا ہوا۔ سلطان نے یہ سمجھکر کہ خدائے قادر و توانا سے دعا کرنا چاہیے۔ صلوٰۃ استسقا (دعا) اور اعتکاف کی نیت سے قنوج کے قرب و جوار میں گنگا کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ اس مقام کا نام باب الجنت رکھا جسکو مختلف مورخین نے ہندی میں سرگ دوار لکھا ہے اور صوبہ دار اودھ ظفر آباد عین الملک کو حکم دیا کہ یہاں غلہ بھیجا جائے، چنانچہ کڑہ کی ولایت سے غلہ آنا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۶۰) اس قحط کے زمانہ میں کمپنی (یعنی گورنمنٹ) کے ملازموں نے چاول خرید خرید کر گراں قیمت پر فروخت کرنا شروع کر دیا...... کمپنی کے ملازموں نے لاتعداد دولت پیدا کر لی (تواریخ رابرٹ) ایک قحط میں تو یہ ... کیے، اب ایک دوسرے قحط ...... کو دیکھیے کہ جب ۷۷-۱۸۷۶ء کا عظیم الشان قحط پڑا جس کی طویل مدت عالمگیر وسعت اور سختی اپنا ثانی نہیں رکھتی کہ مدراس بمبئی صوبہ ممالک متحدہ اور پنجاب کوئی نہ بچ سکا تو گورنمنٹ نے قحط کی شدت کم کرنیکی بہت خراب کوششیں کیں اور لوگوں کی جان بچانے کی ذمہ داری سے صاف ... کر دیا۔

"آدمیوں کی جان بچانے کا کام بغیر روپیہ پیسہ کے خرچ کے خیال کیے ہوئے ایک ایسا کام ہے جسکی ذمہ داری لینا ہماری طاقت سے باہر ہے" (ملاحظہ ہو رپورٹ کمیشن ۱۹۰۱ء)

سبحان اللہ کیا عذر معقول ہے۔ ایک پاگل بادشاہ محمد تغلق تو روپیہ کو مٹی کی طرح لوگوں کی جان بچانیکے لیے اڑا دے اور اورنگ زیب ایسا بادشاہ خزانے کے دہانے کھولدے کہ کسی طرح رعایا کی جان بچے۔

"اور یہ کہ محض فلاکت زدہ آبادی اور ٹیکس ادا کرنے والوں ہی کے فائدہ کو مد نظر رکھتے ہوئے گورنمنٹ ہند کا یہ فرض ہے کہ کاہل الوجودی اور خواہ مخواہ کا بار ڈالنے سے بچائے" (حوالہ رپورٹ کمیشن ۱۹۰۱ء)

گویا قحط زدوں کی امداد محض اس وجہ سے نہیں کیگئی کہ لوگوں میں سستی نہ پیدا ہو۔ اس سے جو کچھ بھی فائدہ ہوا وہ مسٹر بنرجی نے اپنی مشہور کتاب انڈین اکانمک میں حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے

"تعجب کا موقع نہیں ہے کہ (اس کا نتیجہ) خوفناک اتلاف جان ہوا"۔ (صفحہ ۳۰۳)

۱۸۳۳ء میں گنتور قحط جو پڑا تو اسکو قحط ہی نہیں مانا گیا۔ ملاحظہ ہو۔

"مصیبت کی سختی کو گورنمنٹ نے تسلیم ہی نہیں کیا کہ پانی سر سے گذر گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ لاکھ کی آبادی میں سے دو لاکھ آدمی مر گئے" حوالہ کمیشن ۱۸۸۰ء

یہاں اسکا تذکرہ نہ کرنا کوئی بے انصافی نہیں ہے کہ گورنمنٹ نے خاص طور پر آخری دور کے قحطوں کو دور کرنیکی کوشش کی،

ہوا اور دار الخلافت کے نرخ سے سستا فروخت ہوا۔ سلطان کے دار الخلافت سے ہٹنے کی وجہ سے نے خیانت شروع کی اور محتاجوں کو تکالیف بڑھنا شروع ہوئی جس سے اکثر دنیا سے بھی چل بسے اِس قسم کی شکایات سلطان کو ملیں۔ سلطان نے تحقیقات کے بعد مجرمین کو سخت از سخت سزائیں دیں سلطان کو معتکف ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ اُسکا تقدس اُسکی نیت خالص رنگ لائی معصوموں محتاجوں، فاقہ مستوں، پریشاں حالوں کی دعائیں اثر سے خالی نہ گئیں۔ باران رحمت برسا اور اِس فراوانی سے برسا کہ جل تھل بھر گئے اور سلطان نے دربار احدیت میں سجدہ شکرانہ کیا۔ اور خوش و خرم دار الخلافت واپس چلا گیا۔

مکرمی جناب فرخ بناسی

ذوق طلب میں عشق کو رسوا نہ کیجئے
اپنے سوا کسی کی تمنا نہ کیجئے

ملنا نہیں تو وعدہ فردا نہ کیجئے
محدود میرے شوق کی دنیا نہ کیجئے

اکراہ نفس جس سے ہو وہ بندگی ہے کفر
کعبہ ہی کیوں نہو کبھی سجدا نہ کیجئے

مٹنے نہ پائے دل سے مرا انتظار کا
وعدے کا لطف یہ ہے کہ ایفا نہ کیجئے

باتیں کسی سے راز کی کہنا فضول ہے
جب تک کہ رازداں کوئی پیدا نہ کیجئے

احساس اب مجھے خلش درد کا نہیں
تکلیف التفات مدادا نہ کیجئے

اپنی جفا کو دیکھئے اور میرے ضبط کو
بس بس حضور عذر جفا کا نہ کیجئے

دنیائے آرزو مری لیتی ہے کروٹیں
محشر خرام نازسے برپا نہ کیجئے

رگ رگ میں اٹھتا ہو طوفان اضطراب
ایسی نگاہ سے مجھے دیکھا نہ کیجئے

مجرم اگر جو آپ سے کبھی درماں کا نام لو
لیکن مذاق درد کو رسوا نہ کیجئے

بیگانہ واری سی کا فرخ ہے اک نظر
یہ بھی نہ مصلحت ہو تو اچھا نہ کیجئے

انتخاب از مثنوی شادی و غم

(غیر مطبوعہ)

جناب حکیم سید علی عباد صاحب قیس

یارب تو خالق جہاں ہے
مختار زمین و آسماں ہے
پیدا کیے اربع عناصر
قدرت ہے تری ہر اک سے ظاہر
چشمے کیا کیا کیے ہیں پیدا
قدرت کے بہا دیے ہیں دریا
یہ مہر و سپہر و ماہ و اختر
ہیں ذرہ بارگاہ انور
امکان و وجوب و بود و نابود
آگے ترے سب کے سب ہیں موجود
کیا ملک وجود کیا عدم ہے
سب زیر قلم و قلم ہے
عالم کہتی ہے جس کو خلقت
ہے غنچۂ بوستان قدرت
اللہ رے لطف بندہ پرور
ہیں دشمن و دوست سب برابر
رندوں کو ہے شوق بادہ نوشی
ستار کو ذوق پردہ پوشی
بندوں نے نیا خدا تراشا
تو دیکھ رہا ہے چپ تماشا
یہ لطف و کرم کیا بتوں پر
بے گھر تجھے تو اپنا دیدیا گھر

غزل در معرفت

تو ذہن میں بھی کبھی نہ آیا
منزل ہے تری کہاں خدایا
سنتے ہیں شور سخن ذاقرب
پر ہم نے ترا نشاں نہ پایا
جو مایۂ ناز فلسفہ تھے
تو اُن کی سمجھ میں بھی نہ آیا

جس نے پایا تجھے نہ دیکھا — جس نے دیکھا تجھے نہ پایا
پہونچا دُنیا کو چھوڑ کر وہ — جس دم تو نے جسے بُلایا
ہستی کے تھکے مسافروں نے — منزل کو لحد کی جب بسایا
ہر سمت سے وحشتوں نے گھیرا — واں اپنا تھا کوئی نہ پرایا
کیا ذکر ہو دوستوں کا مالک — دشمن کے بھی تو ہی کام آیا
پھیلا کے لحد میں پاؤں سوئے — ایسا غربت میں چین پایا
بیدار جو کر گئے نکیرین — رحمت نے تھپک کے پھر سُلایا
جب ہو چکی سب کی نیند پوری — تب اُٹھنے کا حکم صور لایا
دیکھیں دربار عام تیرا — تو نے اُنھیں اسلیئے جگایا
گم کر کے حکومتِ سلیماںؑ — عبرت کا سبق ہمیں پڑھایا
پھیری جو نگاہ لطف تو نے — شاہوں کو بھی دربدر پھرایا
جس کو چاہا اُسے بگاڑا — جس کو چاہا اُسے بنایا
مہتاب گواہی دے رہا ہے — تو ہی نے بڑھایا اور گھٹایا
جسمیّتُ و جسم تجھسے یوں دور — جس طرح نبیؐ سے تیری سایا

رَبِّ صَلِّ علیٰ رسولکَ
اَعنِی بِہٖ اشرفَ البرایا

———o(※)o———

غزلیات

ناظرینِ ادب کو پیشتر اطلاع دی جا چکی ہے کہ حضرت آرزو کی جو غزلیں اس رسالہ میں شایع ہونگی اُن میں ہندی لفظوں کے سوا عربی اور فارسی کا کوئی لفظ نہ ہوگا۔ جناب آرزو کی زبان دانی اور قدرت بیان کی کیا تعریف ہو سکتی ہے کہ اس سخت قید کے باوجود وہ ایسی فصیح اور شیرین اُردو میں اپنے خیالات ظاہر کر دیتے ہیں کہ کسی کو اس قید کا علم ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ہم وقتاً فوقتاً ناظرین کرام کو حضرت آرزو کے اس کمال کی طرف متوجہ کرتے رہیں۔

اڈیٹر

دیکھا تو نہیں ابتک اور ڈھونڈھ نکالا ہے
آنکھوں میں اندھیرا ہے۔ پاؤں میں اُجالا ہے

چاہت کے کٹھن رستے، کرتے ہیں لہو پانی
تلوے کا چبھا کانٹا آنکھوں سے نکالا ہے

اُس چھیڑنے والے کو بٹھلا کے کلیجے میں
اِک دُکھ سا لیا ہے مول۔ اک روگ سا پالا ہے

موتی یہ بھرم کا ہے۔ آنسو نہ اسے جانو
آنکھوں نے گرایا تھا۔ پلکوں نے سنبھالا ہے

سر کے تو کہیں گھونگھٹ۔ دیکھیں تو سہی آنکھیں
کچھ دور نہیں وہ بھی۔ جس دن پہ کہ ٹالا ہے

اُٹھتی ہوئی ہوکوں نے۔ رُکتے ہی چھری ماری
اب گھاؤ کلیجے کا میٹھا ہوا چھالا ہے

رُت پلٹے سماں بدلے۔ آنسو نہیں تھمنے کے
ساون کی جھڑی یہ ہے۔ بھادوں کا نہ جھالا ہے

جھوٹی بھی وہ آس اچھی۔ سچ پوچھیے تو جس نے
مرتے کو جلایا ہے۔ گرتے کو سنبھالا ہے

دُکھے ہوئے تلووں میں۔ چھالوں کی تپک اُف اُف
جل اُٹھّی ہے چٹکی بھی۔ کانٹا جو نکالا ہے

جب آڑ میں ہو سورج۔ پھر چاند ہے اک دھبّا
بے تیرے اندھیرا ہے۔ تو ہو تو اُجالا ہے

تاکا کہ ہوا گھائل۔ دیکھا کہ لہو اُگلا
چتون کی چھُری کھانا۔ کیا منہ کا نوالا ہے

بگڑا ہے تری تیغ میں۔ یوں مجھسے لہو میرا
تلوار پہ دھبّا سا۔ اک ہے بھی تو کالا ہے

کیا کوندتی بجلی ہے۔ چھُوٹے اس تری کُھڑکے کی
جھپکی ہوئی ہیں آنکھیں اور پھر بھی اُجالا ہے

ہے آرزو ایک اُسکو۔ بیھڑا ہو کہ جَکڑا ہو
وہ ڈھونڈھ نکالیگا جو ڈھونڈھنے والا ہے

جناب محمد جمیل احمد خاں صاحب کوکب شاہجہاں پوری

تلاطم آشنا گرداب کو ساحل سمجھتے ہیں
جہاں دم ٹوٹ جاتا ہے وہیں منزل سمجھتے ہیں

لگا دے بڑھ کے اور اک ہاتھ صدقہ دست و بازو کا
کہ اب تارِ نفس کو نیشترِ بسمل سمجھتے ہیں

تری تیغِ ستم کا ذکر کیا اے فتنۂ عالم
نگاہِ لطف کو بھی اہلِ دل قاتل سمجھتے ہیں

نہیں ہے اُن کو فکرِ چارہ فرمائی نہوائے دل
یہ کیا کم ہے کہ اپنی تیغ کا گھائل سمجھتے ہیں

ہمیں کوئی بتائے کون محرومِ نوازش ہے
وہ دیتے ہیں مگر ہاں جسکو حسن قابل سمجھتے ہیں

لبِ خاموش کیوں شرمندۂ عرضِ تمنا ہوں
سمجھتا ہوں وہ میرا مدعا سے دل سمجھتے ہیں

خدا رکھے بڑی نعمت ہے دل میں کاوشِ پیہم
اسی کو ہم حیاتِ عشق کا حاصل سمجھتے ہیں

نہیں معلوم کیا ہے صورتِ تکمیلِ نظارہ
کہ اب نظروں کو بھی اہلِ نظر حائل سمجھتے ہیں

ازل ہی سے ہیں محرومِ سکون وقفِ تپش کوکب
عجب آفت کا ٹکڑا ہے جسے سب دل سمجھتے ہیں

جناب لیاقت علی صاحب تاباں

کمالِ جذب دیکھیں جذبِ کامل دیکھنے والے
کہ خود بیتاب ہیں بیتابیٔ دل دیکھنے والے

بس اے لذت کشِ ذوقِ ستم مشقِ ستم کب تک
ہوئے جاتے ہیں بسمل رقصِ بسمل دیکھنے والے

نظر کر دیدۂ دل سے ہر اک محفل میں لیلیٰ ہے
اُلٹ دے پردۂ محمل کو محمل دیکھنے والے

تجھے معلوم ہے زندانیوں پہ کیا گذرتی ہے
بہار موجِ آوازِ سلاسل دیکھنے والے

تجھے بھی کچھ خبر ہے ڈوبنے والے پہ کیا گذری
تماشائے حباب و موجِ ساحل دیکھنے والے

بہارِ گریۂ رنگیں کسی دن رنگ لائیگی
لہو روئے گا اُو خونابۂ دل دیکھنے والے

یہ پھل پایا کہ گلزارِ جفا کی سیر کرتے ہیں
بہارِ سبزۂ شمشیرِ قاتل دیکھنے والے

چلے آتے ہیں پروانے برابر جان دینے کو
چلے جاتے ہیں رنگِ شمعِ محفل دیکھنے والے

کرو اہلِ وفا کو قتل لیکن یہ بھی تو دیکھو
کہاں سے آئیں گے آدابِ محفل دیکھنے والے

سوائے یاس و حسرت اب رہا سینے میں کیا باقی
کبھی دل ہم بھی رکھتے تھے ارے دل دیکھنے والے

کمالِ زندگی ہے اضطرابِ زندگی تاباں
سبق لیں موج سے آغوشِ ساحل دیکھنے والے

جناب سید کاظم صاحب نشتر

شباب عمر کے بادہ کا وہ خمار کہاں	جوانی ہو گئی رخصت نشاط کار کہاں
ریاض دہر میں جھلسا ہوا شجر ہوں میں	بہار فصل سے امید برگ و بار کہاں
ضمیر صاف ملے کب ہوس کی موجوں سے	کہ آب آئینہ ہوتا ہے بیقرار کہاں
طلائی حسن پہ دیوانہ ہو نہ اے منعم	یہ مکر چاندنی ہے اس کا اعتبار کہاں
پڑا ضعیفی سے پالا ہوا شباب وداع	خزاں رسیدہ گلستاں میں اب بہار کہاں
ہزار رنگ بدلتا ہے آسمان ہر روز	ہے ایک حال پہ قائم یہ روزگار کہاں
سمجھ رہے ہیں جو مختار خود کو دنیا کا	وہ اپنی موت کو ٹالیں یہ اختیار کہاں
وہ کیقباد وہ دارائے روزگار کہاں	وہ دبدبہ میں سکندر سے تاجدار کہاں
جلو میں ان کے رسالہ کہاں سوار کہاں	قدم قدم پہ دعاؤں کی وہ پکار کہاں
کیا اجل کے طمانچہ نے سب نشہ کافور	مے غرور حکومت کا وہ خمار کہاں
پڑے ہیں خاک پہ خاموش قیصر و فغفور	لحد کا کنج ہے۔ وہ قصر زرنگار کہاں

نہ پھول بحر جہاں میں ہوائے نخوت سے
حباب عمر کے خیمہ کا اعتبار کہاں

جناب سید حسن صاحب ظہیری ناظم بزم ادب بھوپال

نقل میں اصل حقیقت کو نمایاں کر دیں	دل کے ہر ٹکڑے کو یوں نذر گریباں کر دیں
خم گیسو کی عوض عقدے وہ دل کے کھولیں	زلف کے بدلے مرے دل کو پریشاں کر دیں
جی میں آجائے تو کیا کچھ نہ دکھائیں کر کے	اس طرح دل کو جلائیں کہ چراغاں کر دیں
دل کے ارمان ہی بنجائیں نہ دل کے دشمن	گھر کے مالک ہی کہیں گھر کو نہ ویراں کر دیں
کفر و اسلام نہ کہئیے کہ کہاں سے آئے	کہدیں سچّی تو وہ برپا ابھی طوفاں کر دیں
ہمنے تو اشک ندامت سے زمیں تر کر دی	اب وہ مختار ہیں چاہیں تو گلستاں کر دیں

آخر انساں ہے فرشتہ تو نہیں ہے سیّد
کیوں نہ گھبرائے جب افکار پریشاں کر دیں

جناب اولاد حیدر صاحب فوقؔ بلگرامی

وادیٔ غربت میں حیراں عاشق رنجیدہ ہے
یہ بلا نادیدہ ہے یہ حال نارسیدہ ہے

بار آیا جان و دل کا مالک و مختار تو
جان عطا کردہ ہے تیری دل ترا بخشیدہ ہے

چاندنی میں آج کوٹھے پر بلایا ہے مجھے
ولولوں کے اوج میں ہر موئے تن بالیدہ ہے

کب کمال حسن سے گھٹ کر رہا اوج اُنکا
آسماں ہیں یہ غبار ناتواں پیچیدہ ہے

کیا عجب ہے دوسرے ہیں شیخ آکر بیٹھ جائیں
آپ کیا جائیں اُسے وہ گرگ باراں دیدہ ہے

کیا کہیں احوال بیمار محبت آپ سے
رنگ کاہی ہو گیا ہر عضو تن کاہیدہ ہے

فوقؔ سے مل آئیں چل کر لطف آئیگا بہت
طبع سنجیدہ ہے اُسکی مرد صحبت دیدہ ہے

حب وطن بملک سلیماں نمی رسد
یوسف عزیز گشت بکنعاں نمی رسد

هیچ آفتے بآفت ہجراں نمی رسد
من مرگ خویش خواہم و ہم آں نمی رسد

نگرفتہ است زخمی تو لذت خلش
کوتاہ دستیش بہ نمکداں نمی رسد

شبہائے گور و لیل قیامت سیاہ است
لیکن بظلمت شب ہجراں نمی رسد

لطفے پدید نیست ز غوغائے روز حشر
تا اینکہ ایں سرود بمستاں نمی رسد

کوتہ دلی تا نہ دہد لذت خلش
دل می جہد ہزار بہ پیکاں نمی رسد

از شکوہائے جور و جفائے ستم وشان
طول است دفترے کہ بپایاں نمی رسد

در حیرتم کہ خنجر خوں ریز ابروش
ببریدہ حلق و تا برگ جاں نمی رسد

از باغ ہر گلے کہ گرفتیم ما بدست
ریزد بسر زمین و بداماں نمی رسد

می گشت چاک دامنم پاک دامنی
افسوس دست من بگریباں نمی رسد

ہر سر بکدہ دادہ دہر سیر بین طور
در مرتبہ بپوسی عمراں نمی رسد

ایں لخت خون کہ دیدہ من میدہد باو
در سنگ و در رنگ لعل بدخشاں نمی رسد

اے فوقؔ شعرہائے ترا اعتبار نیست
تا آنکہ ایں سخن بہ سخنداں نمی رسد

دسمبر ادب ۱۱

آثارِ ادبیہ

پروفیسر جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے

منشی مرزا علی اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا ذکر "ادب" کے گذشتہ پرچے میں آثارِ ادبیہ کے تحت میں کیا جا چکا ہے۔ اُن سے اور مرزا دبیر مغفور سے گہرے تعلقات تھے باہم خط و کتابت ہوتی تھی۔ مرزا علی اکبر کے دو خط مرزا دبیر کے نام اور وہ القاب و آداب جو مرزا دبیر نے اپنے خطوں میں مرزا علی اکبر اور اُن کے بیٹے سردار حسین کو لکھے تھے اور جنکو سردار حسین مرحوم نے ایک علیحدہ کاغذ پر نقل کر لیا تھا مجھ کو دستیاب ہوگئے ہیں اور ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:-

مرزا دبیر مغفور کے نام

(حاشیہ: ادیب)

مرزا علی اکبر کے دو خط

(۱)

دل جدا دیدہ جدا سوے تو پرواز کند　　گرچہ من در قفسم بال و پرم بسیار است

جناب مرزا صاحب فقید المثل و یکتائے زماں وحید العصر و فیاض دوراں۔ آبیاری نہال گل عطوفت و مکرمت شادابی غنچہ عنایت و موہبت۔ ممہد قواعد عنایات صمیم بشید ضوابط تفضلات قدیم۔ ادام اللہ تعالیٰ اخلاقکم و اشفاقکم۔ تمنائے دولت ملازمت والا نہ بحدیست کہ قلم نیاز رقم بہ تسطیر آں مبادرت نماید۔ و آرزوے شرف مجالست معلی نہ بمرتبہ ایست کہ زبان تلجلج عنوان شمہ ازاں مودی ساز د طوطی زبان اگر در شکرستان بیان توضیح اشتیاق تقبیل اقدام بندگان سامی سالہا نغمہ سرا گردد۔ و عندلیب خامہ بر گلبن نامہ بہ تلویح اشواق زیارت لقائے سعادت انتمائے خادمان گرامی قرنہا زمزمہ آرا شود یکے از ہزاروانہ کے از بسیار مودی نتواند نمود۔ ناچار حقائق اکتارش بادراک ضمیر فیض مصیر تقدس اساس و وجدان فواد سراپا رشاد حقیقت شناس محول نمودہ بوقت مجالست و تبیین زبانی کہ انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب بیسر می آید نمودہ منحصر داشتہ بہ التماسات ضروریہ میگراید عنایت نامہ شفقت آمود و شفقت نامہ عنایت اندود کا لبدر فی الدجا

ادب

نزولِ اجلال و ورودِ اقبال فرمودہ این غریقِ لجۂ حیرانی و مستغرق ورطۂ پریشانی را از لطمہ ہائے تشاویش جان فرسا و اندیشہ ہائے جان ربا رہانیدہ بساحلِ امید و کنارِ کامرانی فائز گردانیدہ۔ گویا ہاتفِ غیبی از عالم لاریبی مژدہ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ و سروشِ ہمیت خروش نوید قد افلح المومنون بگوشِ عقیدت کوشِ این بیہوش خود فراموش رسانیدہ

بگویم نامہ کز فردوس باغے　　شبِ امید را روشن چراغے

سوادش چشمِ جان را کحل کاری　　بیاضش روشنیٔ دیدہ و دل

ز ہر سطرش بدل آمد سرورے　　ز ہر حرفش بدل افزود نورے

اگر غلط نکنم ایں شعر گویا مصداق آنست

چوں سوید او بیاض خط او را دیدم　　روز نوروز و شبِ قدر بہ یکجا دیدم

حرف حرفش کشتی جواہر زواہر مضامین بشارت قرین بر دوش و لفظ لفظش دریا دریا گوہر ہائے معنیٔ بشاشت آگیں در آغوش داشت ع بکشودم و بر مردمکِ دیدہ نہادم۔ ایزد برآرندۂ حاجات و کشائندۂ ابواب مقاصد و مرادات است آن کثیر الاشفاق را بایں بندہ نوازی و اشفاق طرازیہا ہموارہ زیب افزائے و سادۂ عز و برتری دارد بے غائلہ زیب اگر ہر سرِ موے من زبانے گردد

نیارم گوہرِ شکرِ تو سفتن　　سرِ موے ز احسانِ تو گفتن

مخمور و مشکورم بایں فوران اخلاق و عنایت و غلیان اشفاق و موالفت کہ ہنگام موادعت کہ وعدہ موامرت با طبائے اہل حذاقت و مواطات رائے شان با جناب حکیم علیم محمد ابراہیم صاحب فرمودہ بودند بانکہ از تعب سفر نیاسودہ بودند بفور تفقد و الطاف ہمہ امورات ضروریہ را درگذاشتہ بوفائے آن پرداختند

از دست و زبانے کہ برآید　　کز عہدۂ شکرت بدر آید

من عقیدت کیش را اگر توقع صحت و عافیت عزیزہ بضعۂ کبدی فرح فوادی حاصل است از برکت دعاہائے آن والا منزلت مقبول بیتسار حضرت صمدیت و اعانت و ممارست خدام والا شوکت است۔ بار بار موعیدش گردیدن جسارت از جادہ ادب ورزیدن است۔ از قدامت چرخ ستیزہ کار چہ شکایت رانم کہ امروز خط طولانی برخوردار سعید من مرزا عبد الحسن کہ رسید از ان ممرضیت مریضہ شفاہا اللہ تعالیٰ در جمیع عوارض و علل باوجود ممارست بپرہیز ود والبغایت اشد مدرک شد چگویم و چہ ترقیم کنم کہ باصغائے ایں حال

سراسر ملال چہ غمام غموم بر خاطر این وقت هموم مراکم نشد. علی الحال عازم آنم کہ فردا کہ تاریخ بست و ششم
صفر یوم السبت خواہد بود بسواری ریل تا کانہ پور و از انجا بڈاک دیگر رہگرای لکھنؤ شوم انشاء اللہ الرحمان
بقیہ داستان اشواق بے وساطت نامہ و پیغام بمعرض بیان خواہم آورد. بتقدیم نیاز نامہ بر دعاہای ازدیاد
عمر و دولت آں ابر مطیر مروت و فتوت می کنم ؎

سایۂ عاطفت مخلد باد ... بر دعا کردن اختصار اولی

بحضور حضرات میرن خان صاحب و میر حسن خاں صاحب و مرزا محمد عباس صاحب و میر بشارت علی صاحب شاگرد مرزا
مغل صاحب سلام و نیازم قبول باد و بمیان غلام حسین دعا. برخوردار عقیدت شعار مرزا عنایت حسین آداب تسلیم و کورنش
و تعظیم بحضور والا و دیگر صاحبان مرقومۂ بالا عرض می کند. بخدمت محبی مرزا مغل صاحب نیز سلام و شوقم فائز باد.
تتمہ تاریخ بست و پنجم صفر سنہ ۱۲۷۴ھ روز جمعہ بمقام الہ آباد محلہ منڈی رانی۔

(۲)

عالی جناب معلی القاب معدن مروت مخزن عطوفت دام ظلکم

بعد اہدای تحفۂ سلام نیاز و تمنای حصول ملازمت سعادت انباز گذارش طراز مدعا ام (ہیچ) ازین
عریضہ بپاسخ والانامہ متضمن شکر طرازی ہای عاطفت شفیقانہ فرستادہ ام. از نظر اقدس گذشتہ باشد. پیش
خط بنام گرامی عزیز از جان مولوی محمد کاظم باشعار توقف روانگی برخوردار قرۃ العین عنایت حسین با دیگر مراتب
نیز ابلاغ کردم کہ بحضور اقدس تذکرہ نمودہ باشند. دی روز خط مولوی محمد کاظم صاحب سید در ان ذکر ابذال
توجہات عالی در امر تجسس فرمایش احقر بلا مناسب والا موکد شدن بسبب اکثرے از احباب بپای جستجو و دقت ہا
بوجہ کم یابی و گرانی کبوتر بسبب رفتن قرقل قرقل سوے کلکتہ و تا ہم جمع شدن با فارسی عدد از بازار نخاس
و حسین آباد و غیرہ و استفسار روانگی نور چشم موصوف کہ تا کدام تاریخ بہ کانپور خواہند رسید یا دیگر امور
قلمی بود. خدا را گواہ کردہ راست می نویسم کہ من ناچیز از ابذال عطوفت ہای شریف کہ از بدو ملاقات بر حالم
از آنچہ نویسم افزون است از تہ دل ثناخوان و شکر طراز ہستم. و اغلب کہ ذائقۂ این نوازش ہا تا دم واپسیں
از کام دلم زائل نشود ع شکر شفقت ہای تو چنداں کہ شفقت ہای تو. لہذا بصد شکر و سپاس عرضہ
میدہم از حسن اتفاق و بچنیں توجہات شریف یک ٹکڑی کبوتران خوش پرواز و شکیل از شخصے کہ برسم تجارت
از لکھنؤ آوردہ بود دستیاب شد. اکنوں کارگذاران درگاہ عالی را از تلاش دیگر کبوتران امتناع فرمایند۔

وتا رسیدن عریضۂ ہذا اسچہ از کبوتران بہم رسیدہ اند نزد میاں غلام حسین یا برخوردار مرزا علی خان صاحب بطور امانت باشند۔ بندہ بکسے منا طلبیدہ خواہد گرفت یا خود کہ تمنائے زیارت لقائے سعادت انتمائے عالی دارد عنقریب حاضر شدہ ہمراہ خود خواہد آورد۔ بامداد امروز برخوردار مرزا احمد حسین صاحب بسواری ریل رہگرائے لکھنؤ شدند اغلب کہ تا فردا شرف حضوری یابند۔ باقی خیریت است و خیریت باد۔ بصاحبزادگان بلند اقبال و جناب بڑے مرزا صاحب و میر بادشاہ علی صاحب و مرزا محمد عباس صاحب و حکیم مرزا محمد حسین صاحب و منشی اکبر علی صاحب دجب ہا قبول باد۔ بندہ زادگان آداب و تسلیمات میرسانند۔ المرقوم نوزدہم رجب سنہ ۱۲۷۹ھ

نقل آداب و القاب خطوط کہ جناب مرزا دبیر صاحب قبلہ مرحوم

بہ جناب منشی مرزا علی اکبر صاحب قبلہ مغفور جد عاصی یعنی مرزا حسین ولد قام نمودند

(※)

جناب منشی صاحب لوح صحیفۂ عنایت و کرم عنوان دفتر جود و ہمم دام شانکم و قام بنیانکم۔ بعد سلام خلوص انضمام و آرزوئے لقائے برکت انتمائے شریف مرفوع ضمیر صفا تخمیر باد۔ پریروز صحیفۃ الصرعت پاسخ نمیقۃ العنایت بپایۂ ابلاغ آمدہ اغلب کہ بنظر عطوفت پرور گذشتہ باشد۔ در نیولا وصلی طبیعت زیر مشق قلم بے اعتدالی است۔

(※)

جناب منشی صاحب مخدوم و مکرم الطاف فرمائے بیکراں عطاف افزائے فراواں دام عنایاتکم۔ بعد سلام مسنون و اشتیاق گوناگوں بہرہن رائے زریں باد کہ خبر وحشت اثر انتقال اہل خانہ انجمند خصال دیدہ را اشکبار و دل را بیقرار ساخت و علم آہ بر آسماں برافراخت۔ الحذر از چرخ بے رحم کہ از کز لک جفایت عالمے مجروح و از خنجر ظلمت جہانے مذبوح سنگ حوادث تو شیشۂ دلہا می شکند و تیشۂ سوانح تازہ نہال خاطر را از بیخ می کند دست ظلم دراز کردی و ابواب تعدی باز۔ افسوس صد افسوس کہ تند باد ایں واقعہ شمع شبستان آرام را در ربود و چراغ آسائش را خاموش نمود۔ مگر از انجا کہ رشتۂ حیات از ازل ناپائدار و شیرازۂ زندگانی از ابد بے اعتبار ہر یک را ہمیں راہ رفتنی و منزل آخرت گرفتنی است بمصداق کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ برخوان دنیا مہمان و پس کار ردان رفتگاں راں بجز صبر و شکر چارہ ندارد وجہہ یارا کہ حرف کیف و کم و بر زبان آرد۔ دریں صورت بفحوائے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ راضی برضائش بودن و در دلت استرضایش حاصل نمودن است توقع کہ دریں ماتم پر درد صبر اختیار فرمایند و ابواب شکیبائی بر و کشایند۔

(※)

وہ کون تیل ہے
جو بال بڑھانے میں درجہ اوّل ہو ؟ سندری سہاگ ہے
جو قوت بصارت کو بڑھاتا ہو ؟ سندری سہاگ ہے
جو دماغ کی خشکی اور کمزوری کو دور کرتا ہو ؟ سندری سہاگ ہے
جو دل و دماغ کو معطر کرتا ہو ؟ سندری سہاگ ہے
جو بالوں کو گھونگھر والا اور چمکدار بناتا ہو ؟ سندری سہاگ ہے
جو درد سر نزلہ اور زکام کو دور کرتا ہو ؟ سندری سہاگ ہے
جو مٹی کے تیل یا نقصان رساں اجزا سے پاک ہو ؟ سندری سہاگ ہے
جسکے استعمال سے بال چپکتے نہیں ہیں ؟ سندری سہاگ ہے
جسکے استعمال سے بال سفید ہونے سے محفوظ رہتے ہیں ؟ سندری سہاگ ہے
جسکے استعمال سے عورت و مرد خوش رہتے ہیں ؟ سندری سہاگ ہے
لہٰذا جب سندری سہاگ میں تمام خوبیاں موجود ہیں تو پھر اسکے منگانے میں کیا تامل ہے۔
کیا ایک شیشی ارسال خدمت کیجائے؟ قیمت فی شیشی ایک روپیہ تین شیشی کی قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ محصول علاوہ
سینکڑوں شہادتوں میں سے دو تازہ شہادت ملاحظہ فرمایئے
جناب سید سلطان محمد صاحب درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ دہلی سے تحریر فرماتے ہیں۔ عرصہ ہوا کہ آپ سے میری اہلیہ نے چند شیشیاں سندری سہاگ تیل کی طلب کرکے استعمال کی تھیں جن سے اون کے سر کی تمام شکایتیں رفع ہوگئیں۔ اور بال بھی کافی سے زیادہ دراز ہوگئے۔ چنانچہ ابتک دوبارہ استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اسلئے فرمائش کا موقع نہیں ہوا۔ معذور تصور فرمایا جائے۔ مگر میں نے دیکھا میری اہلیہ نے اپنے تمام ملنے والے اشخاص و مستورات میں آپکے تیل کا شوق پیدا کردیا ہے۔ درحقیقت آپکا تیل سر کے تمام امراض کیلئے مجرب صفت موصوف ہے۔ اور آپ کی یہ ایک لاثانی ایجاد ہے۔
جناب سید نثار علی صاحب ہیڈ کلرک ضلع کچہری سے تحریر فرماتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے آپ کے کارخانہ سے سندری سہاگ تیل کا پارسل منگایا تھا۔ اوسمیں سے ایک شیشی انھوں نے مجھکو عنایت فرمایا۔ اسمیں شک نہیں کہ سندری سہاگ تیل واقعی نہایت بہترین چیز ہے۔ علاوہ اور اوصاف کے درد سر کا تو دشمن ہے۔ یہ عریضہ آپ کو بطور سرٹیفکیٹ تحریر کرتا ہوں
کیا اس سرٹیفکیٹ کے پڑھنے کے بعد بھی آپ کو سندری سہاگ تیل کے منگانے میں شک و شبہ ہے؟ ایک شیشی ارسال خدمت کیجئے
پتہ:- ایس۔ اے۔ بی بخشی اینڈ کمپنی (پوسٹ بکس نمبر ۱۴۲) کوٹھی نمبر ۱۱ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

ادب

مرتبہ
سید اعظم حسین

جلد ۲ بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۳ع نمبر ۱

بزم ادب

"ادب" کی پہلی جلد نو نمبروں پر ختم کردی گئی - دوسری جلد چھ نمبروں پر سال کے ساتھ ختم ہوگی - اور پھر جنوری سنہ ۱۹۳۱ء سے انشاء اللہ اُسکی ہر جلد چھ نمبروں پر مشتمل ہوا کرے گی - چونکہ "ادب" کا اجراء اکتوبر سے ہوا تھا اسلیے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اُسکی پہلی جلد چھ نمبروں کے بجائے نو نمبروں پر ختم کیجائے تاکہ آئندہ سے اسکی جلدوں کا حساب انگریزی سنہ کے حساب سے ہو سکے -

خدا کا شکر ہے کہ "ادب" کی پہلی جلد ختم ہوئی اور اس نمبر سے دوسری جلد شروع ہو رہی ہے جن ناسازگار حالات میں اس علمی و ادبی جریدہ کا اجراء کیا گیا تھا اُنھیں دیکھتے ہوے اسکی بہت کم توقع تھی کہ پیش نظر مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی ہو سکے گی لیکن بزرگوں کی دعاؤں نے ہمارا ساتھ دیا اور ہم اپنے مقاصد میں اُمید سے زیادہ کامیاب ہوے ناشکری ہوگی اگر اس موقع پر ہم اپنے اُن مخصوص معاونین کی قلمی عنایتوں کا اعتراف نہ کریں جنھوں نے "ادب" کو اپنا پرچہ سمجھکر اُسکے لیے مضامین نظم یا نثر لکھے - جناب نواب جعفر علیخاں صاحب اثر ڈپٹی کلکٹر - جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے - جناب سید علی عباس صاحب حسینی ایم اے - جناب مولانا سید اختر علی صاحب تلہری - جناب خواجہ اطہر حسین صاحب ایم اے - جناب شبیر احمد صاحب علوی بی اے - جناب سید اطہر حسین صاحب (مقیم بھوپال) جناب سید اعجاز حسین صاحب ایم اے جناب ممتاز حسین صاحب عثمانی مدیر "اودھ پنچ" - حضرت آرزو لکھنوی حضرت صفی لکھنوی حضرت ثاقب لکھنوی حضرت عزیز لکھنوی حضرت نجود موہانی حضرت ناصری حضرت قیس رنگی پوری حضرت فراق گورکھپوری حضرت فرخ بنارسی اور دیگر صاحبان قلم کے احسانات سے ہم سبکدوش نہیں ہو سکتے - واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ محترم اہل قلم "ادب" کو اپنی قلمی اعانتوں سے محروم رکھتے تو وہ اُردو جرائد کی بزم میں اس شان کے ساتھ کبھی جلوہ گر نہیں ہو سکتا تھا - جناب نواب حیدر یار جنگ صاحب نظم طباطبائی اور جناب ڈاکٹر مرزا محمد ہادی صاحب رسوا مد ظلہم کی اعانتوں کی برکت کے ساتھ ممدوحین صدر کی ہمدردیوں نے "ادب" کو صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ کردیا - ہمیں اپنے اُن تمام قلمی معاونین کی بزرگانہ شفقتوں سے قوی امید ہے کہ آئندہ بھی "ادب" کو ان کی قلمی سرپرستیوں کا شرف برابر حاصل ہوتا رہیگا اور ان کے مبارک سایہ میں ہمیں اردو ادب کی خدمتگذاری کا حسب منشا موقع ملتا رہیگا -

اسی سلسلہ میں ہم اُن حضرات کے بھی شکر گذار ہیں جنھوں نے "ادب" کی مالی امداد فرماکر اُسکی بقا کا سامان فرمایا -

بہار کی بہار کا گہوارہ یعنی شہر عظیم آباد اور اسکے گلہائے خنداں یعنی رؤسائے شہر خصوصاً سلطان احمد بالقابہ جناب نوابزادہ سید محمد مہدی صاحب۔ جناب نواب سید محمد صاحب۔ جناب نواب باقر علی خاں صاحب اور جناب نواب جابر علی خاں صاحب کی ادب نوازیوں کے اعتراف میں کارکنان ادب سراپا سپاس ہیں۔

آخر میں ہم اپنے اُن معاصرین کے بھی دل سے شکر گذار ہیں جنھوں نے "ادب" کی خدمتوں کا اعتراف کر کے ہماری پوری ہمت افزائی کی اور اُسے اپنی بزم میں جگہہ دیکر ممتاز کیا۔

ہم نے "ادب" کی ابتدائی اشاعتوں میں صاف صاف لکھدیا تھا کہ ہمارا مقصد تیسرے درجے کی ادبیات مہیا کرنا نہیں ہے بلکہ ہمارے پیش نظر اُردو ادب کی ٹھوس خدمت ہے اسلیئے "ادب" کے صفحات میں نہ تو عریاں تصویریں ہوں گی اور نہ قبیح افسانے اور نظمیں۔ ہم نے "ادب" کی نو اشاعتوں میں اس ارادہ پر تا امکان سختی سے عمل کیا گو ہم نے مضامین کی اشاعت میں زہد خشک کا مسلک اختیار نہیں کیا۔ افسانے بھی شایع کیے مزاحیہ مضامین بھی اور غزلیں بھی لیکن ظاہر ہے کہ نرے رند بھی نہیں بن سکے کہ ہر وقت مینا در بغل و صراحی بدست نظر آتے۔ ہم نے تنقیدی مضامین بھی درج کیے اور فلسفیانہ معاملات پر بھی۔ ہمیں اُمید تھی کہ ہماری یہ اعتدالی روش عام طور سے پسند کی جائیگی۔ لیکن ایسا نہوا۔ ہمارے بعض قارئین کو "ادب" کی خشکی کی شکایت ہے اُنھوں نے ہمیں زبانی بھی اور تحریر کے ذریعہ سے بھی اس طرف متوجہ کیا اور اس کی خواہش کی کہ "ادب" کو رنگینیوں کا گلدستہ بنایا جائے۔ اس میں جاذب نظر تصویروں کی افراط اور دلوں میں گدگدی پیدا کردینے والے مضمونوں کی بہتات ہو ہم نے اُن کی اس رائے پر سنجیدگی سے غور کیا لیکن افسوس ہے کہ ہم اپنا مسلک ترک نہیں کرسکے۔ چنانچہ 'ادب' اب بھی اسی اعتدالی روش پر گام فرسا رہیگا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ آئندہ سے "ادب" کے دو حصے کردیے جائیں ایک حصہ میں سنجیدہ مضامین درج ہوں اور دوسرے میں دوسری قسم کے تاکہ اس ادبی دسترخوان سے ہر شخص اپنے کام و دہان کے مطابق لطف اندوز ہوسکے۔ جن حضرات کو خشک علمی مضامین سے دردسر ہونے لگتا ہے وہ اس حصہ کے صفحات اطمینان سے الٹ دیں اور دوسرے حصہ سے اپنے ذوق کی تسکین حاصل کریں اور جن افراد کو خشک مضامین سے دلچسپی ہے وہ دوسرے حصہ کو نظر انداز کردیں۔ بشرطیکہ ناظرین کرام اس تجویز کو پسند فرمائیں ادب کو موجودہ حالت سے زیادہ مفید اور دلچسپ بنانے کے متعلق بہت سی تجویزیں پیش نظر ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اُن پر عمل کرنا اسوقت تک دشوار ہے جبتک کہ ادب کے خریداروں کی تعداد میں معقول اضافہ نہوجائے۔ اس کی مالی حالت

ہر حیثیت سے قابل اطمینان نہو جائے۔ خریداران ادب اگر اتنا کام کریں کہ اپنی برادری میں اضافہ کے لیے پورے طور سے مستعد ہو جائیں اور اُن میں کا ہر فرد کم سے کم دو خریدار دے تو پھر "ادب" کے حجم میں بھی اضافہ ہو جائے اور اُس کا پرچہ اپنی جگہ پر دلچسپ و مفید مضامین کا مخزن بن جائے۔

ہماری یہ خواہش کوئی بڑی خواہش نہیں ہے جسے ہمارے خریدار پورا نہ کر سکیں۔ صرف تھوڑے سے التفات کی ضرورت ہے۔
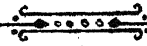
ہمارا یہ بھی قصد ہے کہ اس جلد کے آخر میں ہم ایک خاص نمبر جو اپنی علمی و ادبی خصوصیات کی بنا پر بے نظیر ہو شایع کریں۔ ابھی سے یہ کہنا کہ ہم اُسے کن شاندار خصوصیات کا مالک بنانا چاہتے ہیں قبل از وقت ہے لیکن ناظرین کو ہم اس کا اطمینان دلانا چاہتے ہیں کہ یہ نمبر "ادب" کی روایات کے مطابق ہوگا۔ وہ صرف ہنگامی اور وقتی خوش گپیوں کا مجموعہ نہ ہوگا بلکہ صحیح ادبی خدمتوں کا بہترین گنجینہ۔ ہم نے اپنے بزرگوں اور محترم قلمی سرپرستوں سے اس خاص نمبر کے متعلق خط و کتابت شروع کر دی ہے اور اُسکے کامیاب بنانے کے لیے اُن کی قیمتی رائیں دریافت کی ہیں۔
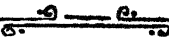
یوں تو دُنیا جائے ثبات نہیں ہے یہاں جو شخص پیدا ہوا ہے، مرنے کے لیے۔ انسانی زندگی سے زیادہ کوئی بے اعتبار چیز نہیں ہے لیکن تاہم جب ہے موت کا فرشتہ ایسی ہستیوں کو چھین لیتا ہے جن کے دم سے بزم عالم کی رونق ہوتی ہے تو دل کو لازمی طور سے صدمہ ہوتا ہے اور بے اختیار جی ماتم کرنے کو چاہنے لگتا ہے ایسے وقت میں موت کا فلسفہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور قلب و دماغ پر جذبات کی حکومت ہو جاتی ہے۔

سنہ ۱۹۳۰ء اس لحاظ سے اُردو ادب کے لیے نہایت نحس ثابت ہوا ہے۔ اس زمانہ میں ہم سے ایسی کئی ہستیاں جدا ہو گئیں جن کی یاد ہمیں برسوں رلائے گی۔

جون کے "ادب" میں ہم جناب سیّد خورشید حسن صاحب عروج سے زبردست ادیب شاعر کے انتقال پُر ملال کی جانگداز خبر سنا چکے ہیں۔ اس نمبر میں ہمیں پھر کئی ایسی ہستیوں کا ماتم کرنا ہے جو اُردو ادب کے خصوصیت سے سرپرست تھے۔ علیا حضرت بیگم بھوپال کے انتقال کی خبر پر ہم ابھی اشکبار ہی تھے اور اُن کی ادب نوازیوں اور علمی خدمتگاریوں کو یاد کر کے خون کے آنسو بہا رہے تھے کہ دار السرور رامپور سے یہ وحشت اثر خبر موصول ہوئی کہ ہز ہائینس جناب نواب سیّد حامد علی صاحب بالقابہ والی ریاست رامپور نے طویل علالت کے بعد اس دنیائے فانی کو خیرباد کہا اور اپنی دنیا کو

صفِ ماتم پر بٹھا دیا۔ مرحوم خود اچھا خاصا ادبی ذوق رکھنے والے رئیس تھے اور پھر علم پرستی اُن کا خاص شیوہ تھا۔ اُن کے دامن دولت سے بہتیرے فضلا و ادبا وابستہ تھے۔ اُن کی سرپرستی میں بہت سے علمی کام ہوئے۔
غالباً ۱۹۱۸ء میں اُنھیں اس کا خیال پیدا ہوا تھا کہ ایک ایسی جامع کتاب تیار کی جائے جس میں تفصیل کے ساتھ شیعی علم کلام و فقہ وغیرہ کے مسائل ضبط ہو جائیں۔ اس اہم خدمت کی انجام دہی کا قرعہ فاضل اجل جناب مولانا سید ظہور الحسن صاحب قبلہ مجتہد کے نام نامی پر نکلا تھا چنانچہ جناب موصوف نے نہایت جانفشانی کے ساتھ اس علمی خدمت کو انجام دینا شروع کر دیا تھا۔ جناب حکیم مولانا سید ذوالفقار حسین صاحب قبلہ جو خود اپنی جگہ پر ایک فاضل جلیل ہیں اور جن کا ادبی و علمی ذوق تعریف و ستایش سے بے نیاز ہے جناب مولانا کے دست راست تھے۔ اس تالیف کا نام جامع حامدی رکھا گیا اور اس کی کئی ضخیم و ضخیم جلدیں جو مسائل کلامیہ سے متعلق ہیں شایع بھی ہو چکی ہیں۔ کاشکہ یہ علمی کارنامہ جناب نواب صاحب کی حیات ہی میں تکمیل کو پہونچ جاتا۔ ہمیں اُمید کامل ہے کہ اُن کے جانشین صالح جو خود ایک ادب نواز و الی ملک ہیں اور جنھیں علم و مذہب سے کافی شغف ہے اس طرف توجہ فرمائیں گے اور اپنے پدر بزرگوار کی اس علمی یادگار کو ادھوری حالت میں نہ چھوڑینگے۔
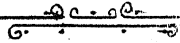
اسی سلسلہ میں یہ خبر بھی کم اذیت دہ نہیں کہ اُردو دنیا کے سب سے بزرگ اخبار نویس سید جالب صاحب دہلوی بھی ہمیں داغ جدائی دے گئے۔ سید صاحب مرحوم نے جس قابلیت سے ہمدم کی ادارت فرمائی یا جس استقلال سے آخر عمر میں ہمت نکالا وہ دنیائے صحافت میں آپ اپنی مثال ہے۔
سید صاحب ایک جامع صفات بزرگ تھے۔ وسعت اخلاق کی یہ حالت تھی کہ اُنکے احباب کی نہایت کثیر جماعت میں شاید ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جسکی سید صاحب مرحوم نے کبھی دلشکنی کی ہو۔ وسعت نظر کا یہ عالم تھا کہ دنیا کا کوئی علمی یا عملی موضوع جس پر مرحوم نہایت طویل اور صد درجہ پر از معلومات تقریر نہ فرما سکتے ہوں جن لوگوں نے سید صاحب مرحوم کو نہایت مشکل موضوعوں پر فی البدیہہ تقریریں کرتے ہوئے سُنا ہے وہ اُن کے اس کمال پر ہمیشہ محو حیرت رہیں گے۔ سید جالب صاحب نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ مطالعہ کتب میں اور آمدنی کا زیادہ حصہ خرید کتب میں صرف کیا تھا۔ مرحوم کا کتبخانہ بیس پچیس ہزار کتابوں اور قابل قدر کتابوں پر مشتمل ہے۔ جہانتک ہم سمجھتے ہیں اُنکے پسماندگان کی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ اس گرانبہا علمی ذخیرہ کے تحفظ کا مناسب انتظام کر سکیں۔ کیا اچھا ہو کہ ہماری قوم کی کوئی دولتمند فرد اس کتبخانہ کو مناسب قیمت پر حاصل کر کے اپنے اور سید صاحب مرحوم دونوں کے بقائے نام کا انتظام کرے۔

اُردو کی دو کمیاب کتابیں

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے

اُردو کی عمر کو دیکھتے ہوئے اس کا کتابی ذخیرہ اب بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اگر مختلف علوم و فنون کی وہ کتابیں جو اس زبان میں لکھی گئیں یا شایع ہوئیں لیکن دست بُردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں وہ بھی موجود ہوتیں تو اُردو کا وقار اور بڑھ جاتا اور اس کم عمر زبان کا کتابی ذخیرہ بے شبہ حیرت خیز معلوم ہوتا۔ ان فراموش شدہ کتابوں میں بہتوں کا ایک آدھ نسخہ اب بھی کہیں نہ کہیں نظر آجاتا ہے۔ اگر ایسا کوئی کتب خانہ قائم کیا جائے جس میں اُردو کی مشہور و معلوم کتابوں کے علاوہ کمیاب کتابیں بھی ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کر دی جائیں تو یہ زبان کی ایک بہت بڑی خدمت ہو۔ مگر جب تک اِن کتابوں کی حفاظت کا یہ طریقہ عمل میں نہیں آتا اُس وقت تک بہی خواہان اُردو کو کم سے کم یہی کرنا چاہیے کہ جہاں کہیں اُردو کی کوئی کمیاب کتاب اُن کو نظر آجائے وہ اُس کے متعلق ضروری اطلاعات اور اُسکے کافی اقتباسات کسی ادبی رسالہ میں شایع کر دیں۔ اس طرح اگر وہ کتابیں محفوظ نہ رہ سکیں تو بھی اتنا تو معلوم ہی رہیگا کہ کون کون لوگ اُردو کی خدمت کر چکے ہیں اور کِس کِس طرح کی کتابیں اس زبان میں لکھی جا چکی ہیں۔ اگر اُردو کی تمام بے نشان کتابوں کا مفصل حال معلوم ہو جائے تو اُردو ادب کی تفصیلی تاریخ لکھی جا سکے۔ اسی ضرورت کا احساس کر کے فی الحال دو کمیاب کتابوں کا حال لکھا جاتا ہے۔ یہ دونوں کتابیں لکھنؤ کے مؤقر رسالہ "اودھ پنچ" کے فاضل اڈیٹر جناب حکیم شیخ ممتاز حسین صاحب کے کتبخانہ میں موجود ہیں۔ اسیطرح اور کتابوں کا حال بھی وقتاً فوقتاً شایع ہوتا رہیگا۔

ادیب

۱۔ داؤد کے زبور[1]

شمالی ہند میں اُردو نثر کی اشاعت میں شیو رام پور[2] کے پادریوں نے جو کام کیا اُس کا اجمالی علم

---

[1] لفظ زبور اُردو میں بالعموم واحد اور مؤنث استعمال کیا جاتا ہے۔

[2] شیو رام پور کے مسیحی مبلغوں کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اُنھوں نے اُردو کا نستعلیق ٹائپ رائج کر دیا تھا۔

تو اُن لوگوں کو ہے جو ادب اُردو کی تاریخ سے واقفیت رکھتے ہیں لیکن اُن کے کارناموں کا تفصیلی علم اب تک نہیں ہے۔ اس وقت ایک ایسی کتاب کا ذکر کیا جاتا ہے جو اسی جماعت کی طرف سے ۱۸۲۵ء میں شایع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا نام "داؤد کے زبور" ہے۔ یہ اصل عبرانی زبور کا اُردو ترجمہ ہے۔ اُس زمانہ کو دیکھتے ہوئے ترجمہ نہایت قابل تعریف ہے اور اس لحاظ سے کہ اصل عبرانی کا ترجمہ ہے اور بھی زیادہ قابل قدر ہے۔

کتاب کے سرورق کی عبارت یہ ہے:-

داؤد کے زبور باعانت بیبل سوسیتی کے اصل عبرانی سے اُردو زبان میں ترجمہ ہوکے

سنہ ۱۸۲۵ عیسوی میں شیورام پور کے چھاپہ خانہ میں چھاپے ہوئے۔

پوری کتاب میں ۳۵۴ صفحے اور ۱۵۰ زبور یا دعائیں ہیں اُن میں سے پہلا اور چھیاسیواں اور آخری زبور ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:-

(۱) پہلا زبور

کیا مبارک آدمی ہے جو گناہ گاروں کی رائے پر نہیں چلتا اور خطاکاروں کی روش پر کھڑا نہیں رہتا اور ٹھٹھا کرنے والوں کی محفل میں نہیں بیٹھتا بلکہ یہوواہ کی شریعت میں عیش کرتا ہے اور رات دن خداوند کی شریعت میں سوچ کرتا ہے۔ سو وہ اس درخت کے مانند ہوگا جو سیلابوں کے رہگذروں پر لگایا جاوے اور اپنے وقت پر میوے لاوے جسکے پتے مُرجھاتے نہیں اور اپنے ہر ایک کام میں پھولتا پھلتا رہیگا۔ لیکن گنہگار ایسے نہیں بلکہ وے تو خس و خاشاک کے مانند ہیں جسے ہوا اُڑالے جاتی ہے۔ سو گنہگار ٹکیں گے اور خطاکار راستبازوں کی مجلس میں کھڑے نہ رہیں گے کیونکہ یہوواہ راستبازوں کی راہ پہچانتا ہے پھر گنہگاروں کی راہ نیست و نابود ہوگی۔

(۸۶) چھیاسیواں زبور

اے یہوواہ اپنا کان میری طرف کر اور مجھے جواب دے کہ میں فقیر اور مسکین ہوں میری جان بچا کہ میں تیرا مورد رحم ہوں تو اے میرے خدا اپنے بندے کو جس کا توکل تجھ پر ہے نجات دے۔ اے خداوند مجھ پر رحم کر کہ میں تمام دن تیرے آگے نالہ کیا کرتا ہوں اپنے بندے کے جی کو خوش کر کہ اے خداوند میں نے اپنے دل کو تیری طرف اُٹھایا۔ کیونکہ تو اے خداوند بھلا ہے اور بخشنے پر تیار ہے اور تیری رحمت

ان سب پر جو تیرے نام لیوا ہیں واقع ہے۔ اے یہواہ میری دعا کان دھر کے سن اور میری مناجات کی آواز سن۔ میں اپنے سبت کے دن تجھے پکاروں گا کہ تو میری سنے گا۔ معبودوں کے درمیان خداوند تجھسا کوئی نہیں اور تیری سی صنعتیں کہاں ہیں۔ اے خداوند ساری امتیں جنھیں تو نے خلق کیا آئیں گی اور تیرے آگے ماتھا گھسیں گی اور تیرے نام کی تمجید کریں گی کہ تو بزرگ ہے اور تیرے کام تعجب کے ہیں اور تو ہی اکیلا خدا ہے۔ اے خداوند مجھ کو اپنی راہ بتا کہ میں تیری صداقت میں خراماں ہوؤں گا میری دلجمعی کر تاکہ میں تیرے نام سے ڈروں۔ اے یہواہ میرے خدا میں اپنے سارے دل سے تیرا شکر گذار ہوں گا میں ابد تک تیرے نام کی تمجید کروں گا۔ کہ تیری رحمت مجھ پر بہت ہے اور تو نے میری روح کو اسفل جہنم سے نجات دی ہے۔ اے خدا گردن کشوں نے مجھ پر چڑھائی کی ہے اور "زکر" لوگوں کی جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے اور انھوں نے تجھے اپنا پیشوا نہیں کیا۔ لیکن تو اے خداوند رحیم خدا اور مہربان اور حلیم ہے تیری رحمت اور صداقت کی نہایت نہیں۔ میری طرف متوجہ ہو اور مجھ پر رحم کر اپنے فضل سے اپنے بندے کو توانائی بخش اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو نجات دے۔ مجھ کو نیکی کا کوئی نشان دکھلا تاکہ وے جو میرا کینہ رکھتے ہیں دیکھیں اور شرمندہ ہوویں کہ تو نے اے یہواہ میری مدد کی اور مجھ کو تسلی دی

(۱۵۰) ایک سو پچاسواں زبور

یہواہ کی ستایش کرو اسکے بیت قدس میں اُس کی ستایش کرو اس کی قدرت کی فلک پر اسکی ستایش کرو اس کی نادر صنعتوں کے برابر اُس کی ستایش کرو۔ اُس کی لطیف بزرگی کے مطابق اُسکی ستایش کرو۔ نقارہ بجا کے اُس کی ستایش کرو۔ بین اور بربط چھیڑتے ہوئے اس کی ستایش کرو۔ طبلا اور بانسری بجاتے ہوئے اُس کی ستایش کرو۔ سارنگی اور ارغنوں بجاتے ہوئے اُسکی ستایش کرو۔ زور سے چٹکلیاں بجا کے اُس کی ستایش کرو۔ جھنجرے زور سے بجا بجا کے اُس کی ستایش کرو۔ ہر ایک چیز جو سانس لیتی ہے یہواہ کی ستایش کرے ہللویاہ۔

۲۔ تفسیر مرتضوی

یہ پارۂ عم کی منظوم تفسیر ہے جو شاہ غلام مرتضےٰ جنون ابن مولوی سید محمد تیمور الہ آبادی نے تصنیف کی تھی۔ اس تفسیر کو خواجہ عبدالصمد نے "مدرسہ کمپنی بہادر" کے دو مدرسوں حافظ محمد صدیق اور مولوی محمد وجیہ کی تصحیح سے مولوی عبدالماجد ابن مولوی حکیم عبدالمجید کے مطبع طبی میں ۱۲۵۹ھ میں چھپوایا

کل کتاب میں ۲۸۲ صفحے ہیں اور ہر صفحے میں ۱۵ سطریں ہیں۔ کتاب ایسے ٹائپ میں چھپی ہوئی ہے جسے نسخ اور نستعلیق کے درمیان کی چیز کہہ سکتے ہیں۔ عربی عبارتیں نسخ ٹائپ میں ہیں۔ یہ کتاب ان اشعار سے شروع ہوتی ہے:-

ہے سزا ئے حمد وہ عالی جناب — جسنے بھیجا ہے محمدؐ پر کتاب
یعنی قرآں کو بایں نظم کلام — کہ پر از آیات قدرت ہے تمام
ہے کلام حق پر از اعجاز سب — کوئی اس صورت سے کہہ سکتا ہے کب
کون کہہ سکتا ہے اور کس نے کہا — قول حق جسنے سنا عاجز رہا
کیونکہ ہو مخلوق سے خالق کا کام — کیونکہ ہو بندہ خدا کا ہمکلام
یہ کلام حق ہے شرکت سے بری — بندہ سے کب ہو خدا کی ہمسری
کس سے ملتا ہے کلام ذوالمنن — کہ سخن شاہوں کا ہے شاہ سخن

"خاتمہ کتاب" میں مصنف نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ تفسیر حضرت علیؑ کے حکم سے لکھی گئی اور انکی بارگاہ میں مقبول ہوئی۔ یہ مقام بھی ذیل میں نقل کیا جاتا ہے کہ مصنف کا بیان انھیں کی زبان میں سنا جا سکے:

"دربیان خاتمہ کتاب"

ذکر حق میں ایک شب اے دوستاں — میں گیا بیخود تا اوج آسماں
دیکھتا ہوں کیا بر چرخ بریں — بیٹھے ہیں حضرت امیرالمومنیں
تخت زریں پر باعزاز تمام — ہیں ملک ہر سو برائے اہتمام
اولیا ہیں دست بستہ باادب — خاموشی سے صورت دیوار سب
جاکے در پیش شہ عالی مقام — باادب ہو کر کیا میں نے سلام
عرض کی میں نے کہ یا حضرت امام — حکم سے تفسیر کہہ لایا غلام
دونو جلدیں رکھکے دونو ہاتھ پر — لے گیا میں نذر کو پیش نظر
پایا حضرت کی مدد سے انصرام — ورنہ ہو سکتا تھا کب مجھ سے یہ کام
دونو لیں دست مبارک سے اٹھا — دیر تک دیکھا کیے شیر خدا

تب یہ فرمایا بآوازِ بلند — تیری محنت کو کیا ہم نے پسند
خوش ہوئے ہم اس تری تفسیر سے — تیری اس تحریر و اس تقریر سے
دوست جو اس کو رکھا ہمنے بجاں — دوست رکھیں گے اسے سب مومناں
مانگتا ہے ہمسے کیا اس کا صلا — جو تو چاہے دیویں ہم تجھکو دلا
میں جو پایا شہ کا لطفِ بے قیاس — یہ کیا خدمت میں میں نے التماس
مانگتا ہوں تم سے میں حبِّ خدا — اور حبِّ اہل بیت مصطفےٰ
اور مہرِ جملہ آلِ فاطمہ — اور با ایماں ہو میرا خاتمہ
اور ہوں دُنیا میں با عز و وقار — باقی جب تک ہے حیاتِ مستعار
اور غلامِ مرتضےٰ میرا ہے نام — میں غلاموں میں رہوں حاضر مدام
اک مرا فرزند جو ہے نورِ عین — ہے غلام و بندہ حضرت حسین
مانگتا ہوں تم سے اے حق کے حبیب — دولتِ دارین ہو اس کو نصیب
اور رہے جس گھر میں دائم یہ کتاب — وہ رہے آباد تا روزِ حساب
اور جو اسکو پڑھے با اعتقاد — اسکی حاصل ہوئے سب دل کی مراد
کہہ نہیں سکتا میں اسکو برملا — جو صلہ اس کا مجھے شہ سے ملا

اس تفسیر میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ پہلے سورہ کا نام اور اس کے آیات والفاظ وحروف کی تعداد عربی میں لکھی گئی ہے پھر اُردو میں نظم کردی گئی ہے۔ اُسکے بعد سورہ کی شانِ نزول لکھ کر ایک ایک آیت کی تفسیر کی گئی ہے۔ پورے سورہ کی تفسیر ختم ہونے کے بعد اس سورہ کے متعلق رسول کی کوئی حدیث اور ائمۂ دین میں سے کسی کا قول نقل کرکے اُس کا ترجمہ اُردو نظم میں کیا گیا ہے۔ ذیل میں سورۂ اخلاص کی تفسیر اور اُسکے متعلقات نقل کیے جاتے ہیں جن سے کتاب کی نوعیت کا اندازہ بخوبی ہوسکے گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورۃ الاخلاص مکیۃ وآیاتہا اربع وکلماتہا خمسۃ عشر وحروفہا سبع واربعون۔

سورہ اخلاص ہے مکیہ خاص — چار آیت ہر کا اس میں خواص
پندرہ کلمے اور سینتالیس حرف — صورتِ دستی ہیں یہ سورہ شگرف

در شان نزول این سورہ

اہل مکہ نے کہا حضرت سے آ — ہے بنا کس چیز سے تیرا خدا
سیم و زر سے یا کہ چوب و سنگ سے — یا کہ سنگ قیمتی خوش رنگ سے
کہو خدا تیرے کا کیا مرغوب ہے — اس کا کیا ماکول و کیا مشروب ہے
اس طرح اہل معالم نے لکھا — کہ یہودو نے یہ حضرت سے کہا
یا نبی اپنے خدا کا وصف کر — تا کہ ایماں لاویں ہم تیرے اوپر
ہے جو کچھ توریت میں وصف خدا — جانتے ہیں دیکھیں تم کہتے ہو کیا
راست تم کہو کیا ایک ہے تیرا خدا — یا شریک کوئی ہے اس کا دوسرا
کس سے یہ میراث پہنچی ہے اسے — پھر یہ میراث اسے پہنچی ہے کسے
مشرکوں سے سن کے ایسا قیل و قال — رو کیا اپنا بسوئے ذوالجلال
منتظر تھے وحی کے حضرت رسول — قل ھو اللہ کا ہوا اسدم نزول

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ

اے محمد کہو ہے وہ اللہ ایک — ہے وہی دونوں جہاں کا شاہ ایک
ایک ہے لیکن نہ از روئے عدد — کیونکہ ہے وہ ذات بے پایان و حد
لامکاں اس ذات سے آباد ہے — قید یکتائی سے بھی آزاد ہے

اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ

یعنی ہے بے نقص و لاحاجت خدا — ہے وہ ہر محتاج کا حاجت روا
کچھ نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہر صمد — بے نیاز و بے اعانت بے مدد
صاحب عین المعانی نے لکھا — از جناب بو علی ابن رضا
کہ یہ فرماتے ہیں معنیٔ صمد — کنہ سے مایوس ہو جس کی خرد

ہے ہمیشہ باقی اور فانی نہیں　　اس کا عالم میں کوئی ثانی نہیں

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝

وہ نہیں جنتا نہ زائیدہ ہوا　　نہ کسی کا باپ نہ بیٹا نہ ما
خود نہ بیٹا نہ کسی کا باپ ہے　　جب سے ہے وہ ذات آپ ہی آپ ہے
لم یلد کہنے سے یہ ظاہر ہوا　　نہ ہے عیسیٰ اور عزیز ابن خدا

وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝

اور نہیں اس کا کوئی خویش و تبار　　یعنی بے مانند ہے پروردگار
رد ہوا قول مجوس اور شرکاں　　کہتے ہیں کیف حق کی ہر یہ گمرہاں
اپنے تئیں جو حق نے فرمایا احد　　یعنی میں ہوں بے شریک و بے عدد
اور صمد یعنی کہ میں ہوں بے نیاز　　ہوں نہیں بیچارگوں کا کارساز
اور کہا ہے لم یلد اس واسطے　　ہے منزہ علت و معلول سے
لم یکن کہنے سے یہ ظاہر ہوا　　یعنی خود آئندہ ہے ذات خدا
راز اس سورے کا سن اے راز جو　　تاکہ تو بھی واقف اسرار ہو
ہوئی ہر اسموں میں یک اسم خدا　　فوق ہے اللہ سے اس کا مرتبا
ہستی مطلق کا کیا کیجے بیاں　　لا مکاں سے ہے پرے وہ بے نشاں
چشمۂ کافور کہتے ہیں اسے　　وہاں صفاتوں میں رسائی ہے اسے
اور وہ بحر شور ہے کان نمک　　جس نمک کو پہنچے نہ جان سمک
واں نہیں دم مارنے کی بات ہے　　بے صفت بے اسم تنہا ذات ہے
قل کا فاعل ہے محمد جان لے　　واسطے حق کا اُسے پہچان لے
خلق و خالق میں وسیلہ ہے وہی　　بے وسیلہ اُسکے نہ پہنچا کوئی
قاب قوسین حق نے اور ادنا کہا　　یعنی وہ ایسا مقرب ہے مرا

یہ محمد کا ہے وہ عالی مقام ... کہہ نہیں پہنچا کوئی واں خاص و عام
جو محمد نے کہا سب مانیئے ... تو خدا اپنے تئیں پہچانیئے
جو خدا سے تو ملا چاہے تو جا ... پیچھے ہی پیچھے محمد کے چلا
اور نہ کی احمد کی جس نے پیروی ... راہ زن اس کا ہوا دیو قوی
چھٹ گئی اس سے صراط المستقیم ... بعد از یں شیطاں ہوا اس کا ندیم
سن خداوند یگانہ ہے احد ... جس کا عالم میں نہ والد نہ ولد
ہے منزہ اور مقدس بے نیاز ... بندہ پرور ہے کریم کارساز
عقل کو اس بارگہ میں رہ نہیں ... کنہ سے اسکے کوئی آگہ نہیں
معنی اللہ اکبر فہم کر ... ہے بڑا سب سے خدائے دادگر
ہستی مطلق ہے وہ بحر عمیق ... عرش و کرسی و فلک جس میں غریق
کیا نہ قرآں میں یہ تو نے ہے پڑھا ... کہ محیط جملہ اشیا ہے خدا
نور حق بیشک ہے ہر شے پر محیط ... جوہر و عرض و مرکب اور بسیط
تنگ جس پر عرصہ ارض و سما ... کب سکے ہی فہم ناقص میں سما
ہے بجائے قطرہ فہم مرد ماں ... قطرہ میں دریا کی گنجائش کہاں
فہم میں گر آوے تو اے بے بساط ... فہم تیرا ہو محیط اور حق محاط
یہ مخالف ہے کتاب اللہ کے ... اور احادیث رسول اللہ کے
فہم میں آوے سو ہے اہل فنا ... عقل میں آنے سے برتر ہے خدا
جان خالق ایک ہے مخلوق دو ... ذہن خارج میں سمجھ اس بات کو
ذہن میں ہے ایک مخلوق نہاں ... دوسرا مخلوق خارج میں عیاں
پہلے ہو ہے خلق در علم خدا ... خلق ثانی ہو ہے پھر خارج میں آ
ہے وجود واجب ان دونوں سے پاک ... بس تو فکر ذات میں مت ہو ہلاک
بے نہایت ہے وہ ذات کبریا ... ہے نہ جس کا ابتدا نہ انتہا
فہم میں تیری وہ آ سکتا نہیں ... بحر کوزے میں سما سکتا نہیں

فہم میں آوے نہ کہو اس کو خدا — فی الحقیقت تجھ سے وہ پیدا ہوا
بُت پرستی چھوڑ اے پاکیزہ خو — اپنی اس مخلوق کا بندہ نہ ہو
لے ہمیشہ دل سے اس خالق کا نام — اور کہو حضرت محمد پر سلام

قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہ سمع رجلا یقرأھا فقال وجبت قیل یارسول اللہ وما وجبت قال وجبت الجنۃ

یہ روایت سُن کے اکثر راویاں — کرتے ہیں حضرت پیمبر سے بیاں
کہ سُنا بیشک نبی نے اک جواں — سورۂ اخلاص پڑھتا تھا عیاں
بس پیمبر نے کہا واجب ہوئی — تب لگے کہنے کہ کیا حضرت نبی
تب یہ فرمایا ہوئی واجب بہشت — اے ہوا مغفور یہ نیکو سرشت
سُن یہ ارشاد رسول خاص ہے — ثلث قرآں سورۂ اخلاص ہے
جس نے یک نوبت پڑھا صبح و مسا — اُس نے گویا ثلث قرآں کو پڑھا

روی عن علی بن ابی طالب کرم اللہ انہ قال من قرء قل ھو اللہ احد بعد صلواۃ الفجر احد عشر مرۃ لم یلحقہ یومئذ ذنب ولو اجھد الشیطان

ایک راوی نے روایت اے اخی — یوں علی ابن ابی طالب سے کی
کہ بلاشبہ پیمبر نے کہا — سورۂ اخلاص کو جس نے پڑھا
یعنی وقت صبح دم بعد نماز — یازدہ نوبت بصد عجز و نیاز
ہووے گا اُس سے نہ اُس دن یک گناہ — گو کرے گا جہد دیو روسیاہ

شکستہ دل

(مترجمہ سید عسکری حسن صاحب جعفری مظفر پوری)

جن کے دلوں سے جوانی کا جوش زائل ہو چکا ہے، ولولے مٹ چکے ہیں یا متواتر ناکامیوں نے جنکے دلوں کو بےحس بنا دیا ہے اُن کی مخصوص عادت ہے کہ محبت خالص کی سرگذشتوں کا مضحکہ اُڑاتے ہیں اور عشق صادق کے کارناموں کو قصّہ گویوں کا خودساختہ افسانہ یا شعرا کی تخئیل و وہم سے تعبیر کرتے ہیں درانحالیکہ حقیقت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ زندگی کے تجربوں نے آخر مجھسے منوا ہی لیا کہ افکار دنیوی کے سبب سے انسان کے ظاہری اطوار میں چاہے کتنی ہی رُکھائی پیدا ہو جائے یا کاروباری میل جول کی جہت سے چاہے کتنی ہی ظاہرداریاں جزو خصائص ہو جائیں مگر پھر بھی یہ مسلم ہے کہ اُنھیں بےحس دلوں میں محبت کی دبی ہوئی چنگاریاں بھی موجود ہوتی ہیں جنھیں اگر ذرا سا بھی چھیڑ دیا جائے تو بھڑک اُٹھیں اور پھر جان کے لالے پڑ جائیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود عشق و محبت کی دیوی کا دل سے معتقد اور اُسکے اصول کا پیرو ہوں ہاں ہاں! میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھے دلوں کے ٹوٹنے کا یقین ہے میرے نزدیک محبت کی ناکامیاں مہلک ثابت ہو سکتی ہیں۔ تاہم میرے خیال میں یہ محبت کا روگ صرف مردوں ہی کے لیے جان گسل نہیں ہے بلکہ میں جانتا ہوں کہ بہت سی موہنی مورتیں موت کے ہاتھوں قبل از وقت مٹ گئی ہیں۔ ہائے ؏

خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

مرد تو غرض اور حرص کا بندہ ہے اُسکی فطرت ہی اُسے کھینچکر دُنیا کے بکھیڑوں اور ہنگاموں میں اُلجھا دیتی ہے عشق و محبت اُسکے لیے یا تو جوانی کی زینت ہے یا یوں سمجھیے کہ ایک نغمہ ہے جو ناٹک کے ہر ایکٹ کے بعد گایا جائے یہ صنف اپنی شہرت کی طالب دولت کی خواہاں دنیا میں نام و نمود کی جویاں اور اپنی ہی نوع پر حکومت کرنیکی متمنی رہتی ہے۔ بخلاف اسکے عورت کی زندگی عشق و محبت کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ اس کا نازک دل اُسکی دنیا ہے اگر وہ کسی حکومت کی متمنی ہے تو بس کشور دل کی اور اگر اُسے کسی خزانہ کی تلاش ہے تو اسی کنز مکتوم کی۔ اسکی ہمدردی کا

اظہار مہمات عشق میں ہوتا ہے۔ محبت گویا اُسکی بحری تجارت ہے اور اس کا دل وہ سودا ہے جو ساحل سے چل چکا ہو۔ اب اگر جہاز تباہ ہوا تو وہ غریب کہیں کی نہ رہی۔ دل کا دیوالہ ہے۔ ناکامی عشق مرد کے واسطے عارضی صدمہ کا باعث ہو سکتی ہے اُسکے کچھ نازک جذبات مجروح ہو سکتے ہیں اُسکے لیے بعض مناظر عیش اُجاڑ ہو سکتے ہیں مگر وہ عملی اور کاروباری ہے مختلف مشاغل سے وہ اپنی طبیعت بہلا سکتا ہے، عیش ہی کی طوفانی موجوں میں اپنے کو ڈال کر غم غلط کر لے سکتا ہے اور اگر وہ دیس جہاں اُسے ناکامیاں ہوئی ہیں رنج ماضی کی نشانیوں سے لبریز ہے تو وہ بقول شخصے رفتار سحر کی طرح آناً فاناً دُنیا کے اُس سرے جا کر چین لے سکتا ہے لیکن صنف نازک کی زندگی مرد کے مقابلہ میں بہت زیادہ یکرنگ اور محدود ہے یہ عالم خیال کی بسنے والی نسبتاً اپنے ہی جذبات اور تخیلات کی رفیقہ ہے۔ اب بتاؤ کہ اگر یہی مونس تنہائی سبب غم ٹھہرے تو پھر کون غمگسار ہو۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ وہ منائی جائے اور جیت لی جائے۔ اب اگر وہ اپنی چاہت کی بدولت دُکھ میں گرفتار ہو گئی تو اُسکے بیکس دل کی حالت بس اُسی قلعہ کیسی ہو جاتی ہے جسے کوئی چھین لے اور تاراج کر کے چھوڑ دے۔

ہائے! کیا کیا متوالی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ کیسے کیسے پھول سے رُخسار کُھلا گئے اور کیسے کیسے قد رعنا کنج لحد میں پنہاں ہو گئے۔ کون بتائے کہ اِن کے خرمن حسن پر کیسے بجلی گرا ئی۔ جسطرح فاختہ اپنے بازو سمیٹ لیتی ہے اور اُس تیر کو جس نے اُسکے قلب و جگر کو گھائل کر دیا ہو اپنے پروں میں چھپا لیتی ہے یونہی اِس صنف نازک کی معصوم فطرت بھی جراحات عشق کو خلق کی نظروں سے پوشیدہ رکھتی ہے۔ ان نازک اندامون کی محبت ہمیشہ خاموش اور شرمیلی ہوتی ہے۔ کامیاب محبت کا تذکرہ وہ خود اپنے دل سے کرتے ہوئے شرماتی ہیں۔ اور اگر اُسکے خلاف محرومی ہوئی تو یہ وفا کی پتلیاں اس ناکامی کو اپنے سینوں میں اسطرح چھپا لیتی ہیں کہ وہ عیش ماضی کی منہدم عمارت کے کھنڈر میں دب جاتی ہے۔ اُنکی تمناؤں پر تو پانی پھر گیا حیات کا لطف ہی باقی نہ رہا۔ اب وہ ان تمام دل خوش کن تفریحوں سے پہلو تہی کرنے لگیں جن سے روح میں تازگی اور رگوں میں حرکت پیدا ہوتی ہے بلکہ تمام اعضا میں صحت کی لہریں دوڑ جاتی ہیں، اب اُنکی میٹھی میٹھی نیند میں خواب پریشاں زہر پنہاں کا کام کرنے لگے۔ صدمات سے لہو خشک ہونے لگا یہاں تک کہ اُنکے سڈول اور قوی اجسام نحیف ہو گئے اب ضعف سے خفیف مرض بھی اُن کا کام تمام کر دینے کو کافی ہے ہے۔ اگر چار دن کے بعد ذرا ڈھونڈھو تو ہائے وہ کہاں محبت بالین لحد کھڑی نوحہ کر رہی ہے ع حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مُرجھا گئے۔ کیسے تعجب کی بات ہے کیا اندھیر ہے کہ وہ آفتاب حسن جنکی کرنیں دُنیا کو

روشن کیسے تھیں کسقدر جلد مغرب لحد میں ڈوب گئے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی ناگہانی مرض یا تکلیف نے
ان کا خاتمہ کر دیا مگر کوئی اُس روحانی دھچکے کو نہیں جانتا جس نے قوتوں کو توڑ کر اُنھیں موت کا
شکار بنا دیا۔ جنس لطیف کی مثال اُس درخت کی ہے جو زینت چمن اور نازش گلشن ہو۔ اُسکی ساخت
خوشنما ہو اور پتے خوبصورت ہوں مگر کیڑے اندر ہی اندر اُس کی جڑ کاٹ رہے ہوں اور جب اُس کے
پھولنے پھلنے کا زمانہ آپہونچے تو یکایک پژمردہ ہونے لگے، ڈالیاں رفتہ رفتہ زمیں دوز ہوتی جائیں یکے بعد
دیگرے پتے گرنے شروع ہوں یہاں تک کہ خشک اور کھوکھلا ہو کر بغیر کسی طوفانی جھٹکے کے خود بخود گر پڑے
جب اُس کی خوبیوں کی تباہی پر غور کیا جاتا ہے تو سالقہ ورعد یا باد سموم اُسکے تباہ کرنے والے ثابت نہیں
نہیں ہوتی۔

بیشتر شالیں عورتوں کی سیری نظروں سے ایسی گذری ہیں کہ وہ خود فراموشی اور تباہی کی جانب
اپنے پیروں خود بڑھتی جاتی ہیں اور یوں دنیا سے آہستہ آہستہ ناپید ہوتی جاتی ہیں گویا وہ نضا میں غائب
ہو رہی ہیں۔ میری کوشش بارہا ان نازنینوں کے اسباب ہلاکت کے تعیّن میں ناکام رہی۔ زوال صحت
دق وسل، ذات الجنب یا اضمحلال قویٰ ان میں سے ایک سبب بھی اصلی نہ ٹھہرا اور آخر اس نتیجہ پر پہونچنا
پڑا کہ محض ناکامیٔ عشق ہی اُنکو ہلاک کر دیتی ہے اور دوسری کوئی وجہ نہیں اس طرح کی حالت کی ایک
مثال کچھ روز ہوئے کہ مجھسے ایک شخص نے بیان کی تھی جس مُلک کا یہ واقعہ ہے وہاں کے باشندے اُسکی
تفصیلی حالت سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن مجھسے جن الفاظ میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے میں بجنسہ
اسی طرح لکھتا ہوں۔

آئرلینڈ کے نوجوان مُحبّ وطن روبرٹ ایمٹ کا افسانۂ غم ہر شخص کو یاد ہوگا۔ یہ ایسا پُر اثر واقعہ ہے
جو ذرا جلد فراموش نہیں ہو سکتا۔ آئرلینڈ کی بد امنی کے زمانہ میں اس شخص پر بغاوت کا الزام لگایا گیا، مقدمہ چلا
غریب مجرم ٹھہرا اور قتل کا مستوجب قرار پایا۔ اس کی سرگذشت نے لوگوں کے دلوں میں ہمدردی کا ایک جوش
پیدا کر دیا۔ وہ نہایت نوعمر، بیحد ذکی، بہت سخی اور بڑا بہادر تھا۔ ایک نوجوان شریف زادے میں جسقدر پسندیدہ
صفتیں ہونا چاہیئے وہ سب کی سب اسمیں موجود تھیں۔ سماعت مقدمہ کے دوران میں بھی اس کا رویہ
نہایت دلیرانہ اور بہادرانہ رہا۔ اُس کا شریفانہ حقارت آمیز غصّہ جسکی بنا پر وہ اپنے ملک کے خلاف بغاوت
کے الزام کو دور کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اُس کی زبردست مدافعانہ تقریر اور وہ درد انگیز التجا جو حکم

قتل سنتے وقت اُسنے آنے والی نسلوں سے کی تھی۔ یہ کل باتیں ہر شریف دلمیں کھپ گئیں یہانتک کہ اُسکے مخالف بھی اپنے اس معاندانہ طرزِ عمل پر افسوس کرنے لگے۔ لیکن ایک ایسا دل بھی تھا جسکے درد کی تشریح ناممکن ہے۔ ایمٹ اپنے فلاح و ثروت کے دنوں میں آئرلینڈ کے ایک ممتاز بیرسٹر (جون کیرن) کی مہ پارہ دختر کو محبوب رکھتا تھا۔ وہ لڑکی بھی ویسی ہی بے غرض اور پر جوش اُلفت رکھتی تھی جیسی عورتوں کی پہلی محبت عموماً ہوا کرتی ہے۔ جن دنوں دُنیا کے کل مقررہ آئین اور تمام حامیان قانون ایمٹ کی زندگی کی مخالفت پر صف بستہ دکھائی دینے تھے۔ جب وہ تہی دست بھی ہو چکا تھا اور ذلت و خطرات کی تاریکیوں میں گھرا ہوا تھا اُس حالت میں بھی اس لڑکی کے دلمیں اُسکی محبّت بڑھتی ہی گئی۔

جب دشمن ہمدرد ہو جائے تو بھلا اس لڑکی کے غم و ملال کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے جس کے دلمیں اُسکے مطلوب کی تصویر موجود ہو۔ ان باتوں کا حس بس وہی کر سکتا ہے جس کا محبوب اُس سے چھین لیا گیا ہو، جسکے رشتۂ الفت کو مقراض اجل نے دفعتاً قطع کر دیا ہو جس سے وہ تمام عمر زندہ درگور ہو گئی ہو اور اس دار المحن میں اسکی کل محبوب و مطلوب چیزیں ضبط کر لی گئی ہوں اور اُسے یکہ و تنہا مقید کر دیا گیا ہو۔

مگر افسوس ایسے حرّیت پسند شہید کی قبر ایسی خستہ و خراب حالت میں ہو کہ نہ تو اسپر کوئی ایسی یادگار بنی ہو جو غم جدائی کو کم کر سکے نہ غم کی کوئی اس طرح کی نشانی ہو جو فرقت کے وحشتناک خیالی منظر کو ذرا دلچسپ بنا سکے، غرض کوئی سامان ایسا نہ تھا جو صدمۂ ہجر کو غم کے پاک آنسوؤں میں بدل دیتا، زمانہ فراق میں کسی ہجراں نصیب کی تسکین کا باعث ہوتا اور جسطرح شبنم پژمردہ پودوں کو ہرا کر دیتی ہے اسیطرح وہ بھی کسی کمھلائے ہوئے دل کو کسی طرح ذرا شاداب کر سکتا۔

شومیٔ قسمت نے اس محبّت کی بدولت باپ کی ناراضی اور غصّہ کو یہاں تک برافروختہ کر دیا کہ آخر اس لڑکی کو اپنا گھر بار تک ترک کرنا پڑا جسکی وجہ سے اُس کی بیوؤں کی سی زندگی اور بھی تکلیف دہ ہو گئی۔ محض احباب کے ہمدردانہ کلام، اُن کی شفقت و محبّت اُس شخص کے دل پر جسنے ترک عافیت کر کے کنج عزلت اختیار کیا ہو۔ کیا خاک کوئی اثر کر سکتی ہے۔ آئرلینڈ والے عموماً ہر بات کا اثر زیادہ لیتے ہیں اس لیے تسلی اور تشفی، دلاسے اور ہمدردی سے بھی وہ نا امید ہو گئی ان چیزوں کی بے اثری کا تجربہ بھی اُسے ہو چکا تھا۔ وہاں کے امرا نے بڑی ہمدردی اور ترحم سے کام لیا تاکہ اس کا غم غلط ہو جائے وہ جلسوں اور محفلوں میں اپنے ساتھ لیجاتے، طرح طرح کی تفریح سے اُس کا غم دور کرنا چاہتے تھے اور رفتہ رفتہ

خیالات کو غم آگیں محبت کی طرف سے پلٹ دینا چاہتے تھے لیکن یہ سب باتیں اس کے واسطے بیکار محض ثابت ہوئیں،

بعض ایسے صدمات ہیں جو اُن انسانی قلوب کو جنھیں خوشی اور شادمانی کا مسکن کہنا چاہیئے اس طرح تباہ و برباد کر کے خاک میں ملا دیتے ہیں کہ پھر شگفتگی نصیب نہیں ہوتی۔ یہ غریب نہایت بیدلی سے کبھی کبھی ایسے جلسوں میں شریک ہونے کا اقرار کر لیتی لیکن وہاں بھی اسیطرح تنہائی کے عالم میں رہتی۔ جسطرح کوئی سنسان ویرانہ میں ہو۔ وہ اپنے ہی غمگین خیالات میں اسطرح غرق ٹہلا کرتی کہ بظاہر اُسے دُنیا و مافیہا کی بھی خبر نہ رہتی تھی۔

غم اُسکے دل میں کچھ ایسا پیوست ہو گیا تھا جو اس قسم کے دوستانہ و ہمدردانہ ترغیب پر استحضاء کرتا تھا۔ "سپنیرا" لاکھ تو نبی بجائے ہزار سر بھرے لیکن بہرے سانپ کو کوئی خبر نہیں ہوتی۔ پس بجنسہ یہی حالت اسکی بھی تھی۔ آس پاس کے گانیوالوں کے نغموں کا کوئی اثر اسپر نہ ہوتا تھا۔

جس راوی نے یہ قصہ مجھسے بیان کیا ہے اُس نے اُسے ایک بزم کی صحبت میں پارٹ کرتے دیکھا تھا اس سے زیادہ مؤثر اور تکلیف رساں واقعہ کسی نے کم ہی دیکھا ہو گا کہ ایک ایسے غم نصیب کو قہراً خوشی میں شریک ہونا پڑے۔ جہاں چار طرف عیش و عشرت کا جماؤ نظر آتا تھا وہاں خوشی اُس سے کوسوں دور دکھائی دیتی تھی اور بدنصیبی ہمزاد کیطرح ساتھ ساتھ پھر رہی تھی۔ خوشی کے ظاہری لباس میں اُس کے زرد چہرے اور افسردہ صورت سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے غمزدہ دل کو عارضی طور پر بہلانے کی بے سُود کوشش کر رہی ہے۔ پُر تکلف کمروں سے ہوتی ہوئی اور بے خبر تماشائیوں کے درمیان سے بالکل بے پروائی سے گذرتی ہوئی وہ تماشا گاہ کے اُس مقام پر پہونچی جہاں گانے والے بیٹھا کرتے ہیں، وہ زینہ پر بیٹھ گئی، کچھ دیر اس بے توجہی سے جو اس نمائشی منظر سے اُس کی بے غرضی ظاہر کر رہی تھی اُس نے اِدھر اُدھر مُڑ کر دیکھا اور افسردہ دلی کے ساتھ نہایت درد بھری آواز میں ایک دلسوز نغمہ گایا۔ آواز سُریلی تو تھی ہی مگر اس موقعہ پر انتہائی سادگی کا دلکش انداز تھا۔ یہ درد آمیز نغمہ اسکے غمگین جذبات کا پورا پورا ترجمان تھا۔ جسے سُنتے ہی مجمع کا مجمع ساکت اور مبہوت ہو گیا اور ہر شخص کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

ایسی باوفا نازنین کے اس مصیبتناک واقعہ نے اہل شہر کی ہمدردی میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ اور ایک بہادر فوجی افسر کو اُس کی مدد کے واسطے آمادہ کر دیا۔ وہ اُس کی محبت کا دم بھرنے لگا اور سمجھا کہ جبکو

مردے کا اسقدر پاس اور خیال ہے وہ زندہ کیساتھ کس قدر انس و محبت کرے گی. مگر اس لڑکی نے اس قسم کی محبت کو رد کر دیا اسلیے کہ اس کا دل ہمہ وقت اپنے چاہنے والے کے خیال اور یاد سے لبریز تھا ع "جن نینن میں پیو بسے دوجے کون سمائے" پھر بھی وہ افسر اپنے اظہار الفت اور گرمجوشی سے باز نہ آیا۔ وہ سچی محبت کا خواہاں نہ تھا بلکہ محض اسکی نظر لطف کا جویاں تھا۔ وہ خود بھی اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ زندگی کا گذارہ محض دوستوں کی ہمدردی پر منحصر ہے۔ بالآخر اسکی ہمدردی اور اوصاف حمیدہ اور ادھر اسکی مجبوری اور بے بسی نے اس افسر کی کامیابی میں اعانت کی اور باوجودیکہ اس لڑکی نے صاف کہدیا تھا کہ اس کا دل ہمیشہ کے لیے کسی اور کا ہو چکا ہے اسکی بیچارگی کی حالت نے قہراً اسے شادی پر مجبور کر ہی کر دیا۔ شادی کے بعد وہ افسر اس خیال سے اسے سسلی لیگیا کہ تبدیل آب و ہوا اور نقل مقام سے شاید اس کا غم غلط ہو جائے۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ بیشک وہ ایسی خاتون تھی کہ لوگ اس کو اپنے دلوں میں جگہہ دیں وہ ایسی شریف بی بی تھی کہ دنیا کے سامنے مثالاً پیش کی جائے۔ اس نے ہمیشہ خوش و خرم رہنے کی کوشش تو کی لیکن کسی چیز نے اسکے اس غم کو کم نہونے دیا جو رفتہ رفتہ اسکے جگر کو جلائے جاتا تھا اور آخر گھل گھل کر جان سے گذر گئی اور ناکامی عشق کا شکار ہو کر خاک کا پیوند ہو گئی۔ ہائے ؎

اب اس کی قبر پہ اسے روتی ہے بیکسی
جو غم نصیب ہجر کے صدمے سے مرگیا

(از واشنگٹن ارونگ)

ہریٹ بیچر اسٹو[۱]
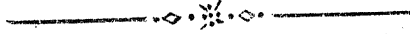
(محترمہ سیدہ ساجدہ بیگم صاحبہ)

اس عصر جدید میں رسالہ "حجرۂ عمو طام"[۲] کا اتنا کسی دوسری کتاب نے عوام و خواص کے دلوں پر نہ تو اثر کیا ہے اور نہ اُس سے ایسے فوری نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ اس رسالہ کو نئی اور پرانی دنیا کے ہر طبقہ کے لوگ پڑھا کرتے تھے۔ یعنی امریکہ کے بلاد اقصیٰ سے لیکر یورپ کے بعید ترین مقامات کے لوگ اس کے مطالعہ میں مشغول رہتے تھے۔ پیرس میں تو لوگوں کا ذوق و شوق اس انتہا کو پہونچ گیا تھا کہ مصنفین مشہور اور مؤلفین معروف کی کتابوں کا بھی اثر اُن کے دلوں پر اتنا نہ ہوتا تھا جتنا اس رسالہ کا۔ تین اخباروں نے ایک ہی وقت میں اسکی اشاعت شروع کی۔ عوام کا شوق اُسکے مطالعہ کا اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ اخبار "سیکل" کے خریدار نہایت بیتابی کے ساتھ اخبار "پرس" کا پرچہ محض اس خیال سے خرید اکرتے تھے کہ شاید رسالۂ مذکور کی کسی فصل کا وہ بقیہ حصہ جو اول الذکر اخبار میں ابھی نہ نکلا تھا اس دوسرے پرچہ میں دیکھنے میں آجائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس شخص نے ایسا رسالہ لکھکر اس درجہ ہیجان اور آشوب زمانہ میں پیدا کردیا اور جسکی بدولت حقیقۃً امریکا کی جنگ خانگی کا آغاز ہوا اور جس کے سر رسم بردہ فروشی کے منسوخ کرادنیے کا سہرا بندھا وہ کون سی ہستی ہے اور اُسکے کارنامے کیا ہیں۔

اس رسالہ کا لکھنے والا نہ تو کوئی ذی علم و تجربہ کار ناول نویس تھا اور نہ کوئی کسی مدرسہ کا شاگرد۔ بلکہ ایک غریب عورت تھی جو اکثر اوقات خانہ داری کی زحمتوں۔ متعدد بچوں کی نگہداشت و پرورش اور گھر کے آئے دن کے فقر و فاقہ کی بدولت ہمیشہ رنج و محن میں مبتلا رہا کرتی تھی۔ حقیقت میں اس ضعف و نقاہت ہی نے اس میں وہ جوش اور قوت پیدا کردی تھی جسکی بدولت اُس نے تمام عالم انسانی کو ان فوائد بے شمار سے بہرہ مند کردیا۔ مشار الیہا امریکہ کے ایک ایسے خاندان کی لڑکی تھی جسکا پیشہ آہنگری تھا۔ ۱۴ جون ۱۸۱۱ء مطابق ۱۲۲۶ھ کو کنکٹی کٹ کے ایک دیہات موسوم بہ لیچفیلڈ میں

۱؎ Harriet Beecher Stowe ۲؎ Uncle Tom's Cabin

پیدا ہوئی۔ چار ہی سال کی عمر میں اسکی ماں نے داغ مفارقت دیا جسکے کچھ ہی عرصہ کے بعد اسکی خالہ آکر اُسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی اور اُسکی تعلیم و تربیت شروع کردی۔ جب ۶ سال کی ہوئی تو اس کے والد نے دوسری شادی کی یہ نئی بیوی اپنے سوتیلے بچوں سے بڑی اُلفت و محبت رکھتی تھی اسلیے ہریٹ پھر اپنے والد کے یہاں چلی آئی اور ایک مدرسہ میں داخل کردی گئی۔ اُس نے لکھنے پڑھنے میں خوب ترقی کی حتیٰ کہ ۲۷ قصیدے اور انجیل مقدس کے دو بڑے اجزا حفظ کرلیے۔ اسکے والد نے ۲۲ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر اور بڑی بڑی سندیں حاصل کرکے مدرسہ کو خیرباد کہا اور مسیحی معلمین کے حلقہ میں داخل ہو گیا اگرچہ بعض دفعات ہریٹ سے یہ تقاضا کیا جاتا تھا کہ وہ اپنی چھوٹی بہن بھی کی دیکھ بھال کیا کرے لیکن پھر بھی اُس نے اپنے تحصیلات علمی میں کبھی غفلت نہیں کی۔ یہ مدرسہ لیچفیلڈ کی ذکی ترین شاگردوں میں سے تھی

ہریٹ کا طرز انشا ایسا مستحسن و مرغوب تھا کہ اُس نے اپنی دوازدہ سالہ عمر میں اس مضمون پر ایک مقالہ سپرد قلم کیا کہ "آیا دوام روح بدلایل طبعی ثابت ہو سکتا ہے؟" مقالۂ مذکور وہاں کے افاضل کے ایک بڑے مجمع کے سامنے پڑھے جانے کے لیے منتخب کیا گیا خود مشار الیہا کا بیان ہے "میرا مقالہ پڑھا گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے والد جو ہمارے اُستاد مسٹر برلس کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے خوش ہوے اور سوال کیا کہ یہ مقالہ کس نے لکھا ہے؟ جواب دیا گیا آپ ہی کی صاحبزادی نے۔ فی الواقع میری زندگی کا سب سے زیادہ قابل فخر لمحہ یہی موقع تھا" ۱۸۳۲ء مطابق ۱۲۴۸ھ میں ہریٹ کے والد کو جو ۱۶ سال تک مُلائے کلیسائے بوسٹن رہ چکے تھے۔ کنکٹی کٹ کے مدرسہ علوم شرعیہ کی ہیڈ ماسٹری پیش کی گئی۔ جسے اُنھوں نے قبول کیا اور مع بال بچوں کے کنکٹی کٹ چلے آئے۔ یہاں کے قیام کے زمانہ میں ہریٹ اکثر اطراف و جوانب میں ٹہلنے کی غرض سے جاتی تھی اور ایک خاتون کے ہمراہ جو اُسکے والد والے مدرسہ میں معلمہ تھیں دریائے اوھیو کو عبور کرکے اس مقام تک چلی جاتی تھی جہاں لونڈیاں اور غلام کثرت سے رہتے تھے اور اُس مقام کو اور وہاں کے حالات کو بغور مشاہدہ کرتی تھی۔ اُسکے کئی سال بعد جب ہریٹ نے اپنی کتاب چھپائی اور اُس معلمہ نے وہاں کے مفصل حالات اُس رسالہ میں پڑھے تو اُسے بیحد تعجب ہوا کہ ہریٹ نے کس طرح وہاں کے جزئیات اور کلیات کو اپنے ذہن میں محفوظ کر رکھا تھا جو اس نواح کے اوضاع و احوال کو اس درجہ درستی و صحت کے ساتھ معرض تحریر میں لا سکی۔

ماہ آخر ۱۸۳۶ء مطابق ۱۲۵۲ھ میں ہریٹ نے ۲۴ سال کی عمر میں پروفیسر سٹو سے شادی کر لی

جو بلند بالا اور خوش قامت ہونے کے علاوہ علم ادب سے بدرجۂ وافر بہرہ اندوز تھے۔ گو یونانی، عبری لاطینی۔ اور عربی ایسے علوم کی دولت سے مالا مال تھے لیکن مایۂ دنیا سے تہیدست تھے۔ شادی کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد پروفیسر موصوف نے نیو یارک سے لندن کا سفر اس غرض سے کیا کہ اپنے مدرسہ کے لیے ضروری کتابیں خرید لائیں اور دنیائے قدیم کی تعلیم و تدریس کے ترتیبات کے بارہ میں بعض ضروری اطلاعیں بہم پہونچائیں

پروفیسر اسٹو کی وطن سے غیر حاضری کے زمانہ میں ہریٹ اپنے بھائی اور والد کے ساتھ رہنے لگی۔ اگرچہ وہ کبھی کبھی امریکہ کے بعض بعض اخبارات کو اپنے مضامین بھیجا کرتی تھی اور اسطرح سے اپنے بھائی کی جس کا شغل محض نامہ نگاری تھا اعانت کرتی تھی لیکن اس تدبیر سے چنداں آمدنی نہ ہوئی۔ ہاں۔ اتنا ملگیا کہ اپنے لیے ایک عمدہ توشک خرید کرسکے۔ اسی زمانہ میں چند مدرسوں کے شاگردوں میں جن کے پرنسپل تھیوڈر ویلڈ صاحب تھے رسم غلامی کے خلاف تحریک پیدا ہوئی لیکن لونڈیوں اور غلاموں کے مالکوں نے اُن کی سخت مخالفت کی حتی کہ اخبار "نوع خواہ" [illegible] کے دفتر کو جسمیں غلامی کے خلاف مضامین شائع ہوتے تھے لوٹ لیا اور شائع شدہ جملہ مضامین کو پراگندہ کر دیا۔ گو اس زمانہ میں ہریٹ رسم غلامی کی مخالف تھی لیکن اس رسم کے فسخ و انسداد پر اسے چنداں اصرار نہ تھا۔

اس اثنا میں اُن کے دو توام لڑکیاں پیدا ہو چکی تھیں اور ماہ جنوری سنہ ۱۸۳۸ء مطابق شوال سنہ ۱۲۵۳ھ میں اُن کا پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ اگرچہ اپنے بچوں کی نگہداشت اور تنگی احوال سے ہریٹ کو سخت زحمت کا سامنا رہا کرتا تھا لیکن پھر بھی نہایت شوق اور خوشی کے ساتھ امور خانہ داری کو سرانجام دیتی تھی۔ اور تشویش اور پریشانی کو اپنے گرد نہ آنے دیتی تھی۔ بعض اوقات گھر کے ضروری کاموں کے علاوہ تحریر کا کام بھی کرتی تھی جسے زحمت بالائے زحمت کہنا چاہیے۔ لیکن اس مرد صفت خاتون کا کیا کہنا ان دونوں مہموں سے عہدہ برآ ہوتی سنہ ۱۸۳۹-۴۰ء مطابق سنہ ۱۲۵۵-۵۶ھ کے سخت سرما میں جبکہ غلہ بہت ہی گراں ہو گیا تھا ہریٹ اپنی بہن میری نامی سے ملنے گئی جسکی شادی ہرٹ فورڈ میں ہوئی تھی وہاں کے متعدد مدیران اخبار اور کتاب فروشوں سے ملی اور اپنی ایک کتاب جسمیں قصے لکھے تھے انھیں دکھلائی۔ وہ چاہتی تھی کہ اُسکی اشاعت کا کوئی ذریعہ نکل آئے۔ اُسکے صلہ میں جو رقم اسے ملی گو وہ بہت ہی قلیل تھی لیکن یہ امید ضرور تھی کہ کتاب رائج ہو جائے گی۔ جس سے آئندہ کافی نفع

حاصل ہوجائیگا۔ باوجود اسکے کہ سنہ ۱۸۴۰ء مطابق سنہ ۱۲۵۶ھ میں اسکے ایک بچہ پیدا ہونے سے اسکی موجودہ زحمت میں اور اضافہ ہوگیا لیکن پھر بھی تحریر کے کام میں اس درجہ انہماک بڑھ گیا کہ مجبوراً اپنے شوہر کو لکھنا پڑا کہ محض تحریر کے کام کے لیے اسکے لیے ایک کمرہ علحدہ کردیا جائے۔ شوہر بھی چونکہ فن کی وہ دانا تھا اسلیے کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ اور شوق دلایا اور لکھا۔

"عزیز من تمھیں مصنف ہونا ہے۔ اور تقدیر میں یہی لکھا ہے۔ وہ دن جلد آنے والا ہے جب تم کو شہرت ورفعت حاصل ہوگی جس سے تمھارے شوہر کا سر افتخار آسمان سے جا لگیگا۔ اور تمھاری اولاد تمھاری روح پر سلامتی بھیجے گی۔ دنیا میں کوئی عورت تمھاری سی نہیں ہے۔ کون ہے جسمیں تمھاری طرح مہارت کی جتنی ہی فراوانی۔ غرور کی اتنی ہی کمی۔ اتنی ضروریات زندگی اور اس درجہ قلت اسراف۔ اس پایہ کی فصاحت بیان اور اس درجہ قلت لالت اتنی زیادہ ملاحت اور اتنی کم رعونت ہو" باوجود ان خوبیوں کے اسکی زندگی بڑی سختی سے گزرتی تھی۔ گو ہمت بلند تھی لیکن تنگیٔ حال سے نجات نہ ملتی تھی۔

سنہ ۱۸۴۳ء مطابق سنہ ۱۲۵۹ھ میں پھر ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پروفیسر اسٹو کے مدرسہ کے طلبہ سب کے سب فقیر وتہیدست تھے۔ ان میں اتنی بھی استطاعت نہ تھی کہ ایک قلیل رقم بھی بطور مشاہرہ ادا کرتے۔ اکثر اوقات پروفیسر اسٹو اس بات پر مجبور ہوجاتے تھے کہ ادھر ادھر جاکر کہیں سے مدرسہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے چندہ فراہم کریں لیکن اپنی بیوی کو ہمیشہ گھرہی پر چھوڑ جاتے تھے کہ بہتر سے بہتر طریقے سے امور خانگی کو انجام دے۔ چنانچہ گھر کی چاردیواری میں اسدرجہ مقید رہنے سے ہریٹ کی صحت میں فرق آگیا۔ اور کثرت تکالیف سے خستہ اور بیمار رہنے لگی۔ لیکن پھر بھی ہروقت ہشاش بشاش اور قوی دل رہا کرتی تھی۔ ہریٹ کی کسی غمخوار ملنے والی کو اس کی اس گری ہوئی حالت پر ترس آیا اور اسنے بغیر اپنے نام کا اظہار کیے ایک رقم اسے بھیجدی جس سے اسے گرم پانی کے چشمہ میں غسل کرنیکا موقع مل سکا۔ تیرہ ماہ تک اطراف ممالک میں گھوم پھر کر واپس آئی تو دیکھا کہ خود پروفیسر صاحب کی صحت خراب ہوگئی ہے۔ چنانچہ وہ بھی گرم پانی کے چشمہ کو گئے۔ سنہ ۱۸۴۹ء مطابق سنہ ۱۲۶۵ھ کی فصل گرما میں ایک تازہ مصیبت رونما ہوئی یعنے تمام شہر میں وبا پھیل گئی۔ ہریٹ کو جسکے ذمہ اتنے بچوں کی نگہداشت تھی اس بلا سے سخت مصیبت کا سامنا ہوا حتی کہ خود اس مرض میں مبتلا ہونے اور دنیا کو خیرباد کہنے میں کوئی کسر نہ رہگئی تھی۔ گھر کے کام کاج کے لیے ایک کنیز تھی وہ بھی اس مہلک مرض میں مبتلا ہوکر راہیٔ عدم ہوگئی۔ اسکے بعد ہریٹ کا چھوٹا بیٹا چارلس بھی اس وبا کا شکار ہوا۔ گو ہریٹ کی عمر اسوقت ۳۷ سال کی تھی۔

لیکن مسلسل ۱۲ سال تک محنت اور رنج سہتے سہتے بالکل خستہ و لاغر ہوگئی تھی ماہ ستمبر ۱۸۴۹ء مطابق شوال ۱۲۶۵ھ میں پروفیسر اسٹو سے ایک دوسرے شہر میں مدرسۂ شرعیہ کی ہیڈ ماسٹری قبول کرنیکے لیے درخواست کیگئی۔ اِس اثنا میں ایک اور بیٹا پیدا ہوا جسکا نام اُس مرحوم بیٹے کے نام پر چارلس رکھا گیا۔ اُسی زمانے میں جبکہ ہریٹ بیحد مشغول تھی دارالشورائے امریکہ سے ایک قانون صادر ہوا جسکا مضمون یہ تھا کہ مفرور شدہ غلاموں کے مالکوں کو یہ حق حاصل ہے کہ جن جن زنگیوں کی ملکیت کا انھیں دعویٰ ہو تلاش کرکے پھر انھیں اپنے قبضے میں کرلیں اور اُن مقامات کے باشندوں کو جہاں وہ غلام پائے جائیں لازم ہوگا کہ اِس معاملہ میں اُن غلاموں کے آقاؤں کو ہر امکانی امداد بہم پہونچائیں۔

جوں ہی غلاموں کے آقا بوسٹن پہونچے لوگوں میں ہراس و ہیجان پیدا ہوگیا اور وحشت و دہشت طاری ہوگئی۔ مفرور غلام مارے خوف کے جنگلوں، غاروں، اور سردآبوں میں روپوش ہوگئے۔ بہتوں نے تو محض جان بچانے کے خیال سے قیام پر فرار کو ترجیح دی۔ مثلاً ایک بلور فروش جسکا کاروبار خوب چلتا تھا اِس خبر کو سُنتے ہی کہ اُسکا آقا اسکی قید کی فکر میں ہے کناڈا بھاگ گیا۔ لیکن دوران مسافت میں اسکے دونوں پیر سردی سے بالکل اکڑ گئے جنھیں مجبوراً کٹوانا پڑا۔ یہ سنگ دل آقا اپنے مملوک غلاموں کے ساتھ اِس درجہ بدسلوکی کرتے تھے کہ کوڑے مارنا، داغ دینا۔ یا کھانا بند کردینا اُنکے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ ہریٹ کی متعدد ملنے والیوں نے اسکے نام متعدد خطوط لکھے جن سے اُن مصیبتوں اور سختیوں کا اظہار ہوتا تھا۔ جو اِس قانون کے اشتہار سے رونما ہوئی تھیں۔ ایک نے لکھا تھا "اگر تمھاری طرح میرے قلم میں زور ہوتا تو میں ایسا مضمون لکھتی کہ لوگ سمجھ جاتے کہ غلامی کیا بلا ہے"۔ جس وقت پڑھتے پڑھتے ہریٹ اِس فقرے پر پہونچی تو خط کو ہاتھ میں دبا کر اپنے بیٹے سے جو قریب ہی کھڑا تھا کہا "اگر زندگی نے وفا کی تو ضرور کچھ نہ کچھ اِس مضمون پر لکھونگی"۔ اسکے بعد ہی کچھ دنوں بعد ہریٹ نے قلم اُٹھایا اور اُس قصہ کی جسکا خاکہ ذہن میں موجود تھا بنیاد ڈالی۔ اُسی زمانے میں جب پروفیسر اسٹو سفر سے واپس آئے اور اِس کتاب کے چند صفحے پڑھے تو کہنے لگے "یہ البتہ کام کی چیز ہوگی" ہریٹ نے اِس کتاب کے شایع کرنیکا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ اِسی لیے ہر روز اسمیں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتی رہتی تھی بعض اوقات اُسکے ورقوں کو اپنے زانو پر رکھکر کھانا پکاتے جاتی تھی اور لکھے جاتی تھی۔ خود کہتی ہے "میرے امکان سے باہر تھا کہ میں اِس افسانہ کو انضباط کے ساتھ لکھوں۔ لیکن اتفاق سے لکھ ہی گیا۔ میرا منشا نہ تھا کہ کسی بڑے کام کا سہرا میرے سر ہو اور نہ یہ خواہش تھی کہ اِس کتاب کی تصنیف سے کوئی مرتبہ یا شہرت مجھے حاصل ہو۔ لیکن یہ نیکنامی میری

قسمت میں لکھی ہی تھی - فی الواقع میرا قلم حضرت احدیت کے دست قدرت میں تھا اور ہر مضمون عالی مجھے اُسی کے درگاہ سے ملتا تھا - مجھے محض مشیت ایزدی کے اجرا کا ایک آلہ تصور کرنا چاہیے" خود پروفیسر اسٹو کہتے ہیں "یہ کتاب نہایت تکلیف و مصیبت کے زمانہ میں لکھی گئی اور سوائے فقرا کی دعائے خیر کے اسکے اور صلہ کی اُمید نہ تھی"

کتاب حجرۂ عمو طام کی اشاعت بتاریخ ۵ جون ۱۸۵۱ء مطابق ۴ شعبان ۱۲۶۷ھ اخبار عہد ملی میں شروع ہوئی اور اول ماہ اپریل میں ختم ہو گئی - جو رقم کہ منجانب اخبار مذکور مشار الیہا کو بطور حق التصنیف ملی قریب ۴۰ پونڈ (۹۰۰ روپیہ) کے تھی جبوقت یہ کتاب ایک افسانہ کی صورت میں اخبارات کے صفحوں میں شائع ہو رہی تھی بوسٹن کے ایک کتاب فروش موسوم بہ مسٹر جویٹ نے ازراہ ہمدردی مصنفہ سے کہا کہ اگر وہ خود نصف اخراجات کی متحمل ہوسکے تو اُس افسانہ کو کتاب کی شکل میں علیحدہ چھپوا دیا جائے - اگرچہ میاں بیوی دونوں کی حالت اس قابل نہ تھی کہ وہ طباعت کے اخراجات کو برداشت کرسکیں - لیکن مشار الیہا نے مجبوراً اِس شرط پر کتاب کے چھپنے کی اجازت دیدی کہ نفع میں سے ۱۰ فیصدی مصنفہ کو ملے - اِدھر کتاب مذکور کا آخری کلمہ لکھا گیا - اُدھر ہیرٹ کثرت زحمت و مشقت سے بستر علالت پر پڑ گئی - لیکن کتاب اِس درجہ مقبول ہوئی کہ اسکا وہم و گمان بھی مصنفہ کو نہ تھا -

اشاعت کے پہلے ہی روز اسکے تین ہزار نسخے بک گئے اور اسکے دوسرے ہی دن طبع ثانی کی نوبت آئی حتی کہ ایک سال کے اندر ۱۲۰ مرتبہ چھپی - خود امریکہ میں اسکی تین لاکھ سے زیادہ جلدیں فروخت ہوئیں - جس سے نفع کثیر حاصل ہوا منجانب ناشر کتاب مصنفہ کی خدمت میں دو ہزار پونڈ (تخمیناً ۳۰ ہزار روپیہ) کا چک اِس قول کے ساتھ پیش کیا گیا کہ "یہ وہ رقم ہے جو حسب قرارداد سابق منافع میں سے ۱۰ فیصدی کے حساب سے مصنفہ کو ملنی چاہیے تھی" اِس کثیر رقم کو دیکھتے ہی پروفیسر اسٹو کہنے لگے "میری ساری عمر میں اتنی رقم کبھی مجھے دیکھنے کو نہیں ملی"

انگلستان میں اپریل سے لیکر دسمبر تک صرف ۹ ماہ کے عرصہ میں یہ کتاب بارہ مرتبہ طبع ہوئی - اور کتاب فروشی کی بارہ کمپنیاں اسے فروخت کرتی تھیں - حساب کرنے پر معلوم ہوا کہ صرف انگلستان میں اسکی پندرہ لاکھ جلدیں طبع ہوئیں - اسوقت تک ہیس مختلف زبانوں مثلاً ارمنی، بوہیمی، ڈنمارکی، ہالینڈی، فلیمش، فنلنڈی، فرانسیسی جرمنی، آطریشی ([illegible]) اطالی، پولینڈی، پرتگالی، یونانی (قدیم و جدید) روسی، عربی، اسپانی، ولزی وغیرہ میں اسکے ترجمے ہوچکے ہیں - ۱۸۵۲ء مطابق ۱۲۶۸ھ میں امریکہ کے کسی تھیٹر میں اسکا ڈراما کیا گیا - اُسی زمانہ میں لندن کے دو تھیٹروں میں اسکے ڈرامے کھیلے گئے - اِس سے پہلے کسی دوسری کتاب کو اس درجہ قبولیت عامہ کا شرف حاصل نہیں ہوا - اِس کتاب میں وہ مصائب و متاعب بالتفصیل لکھے گئے ہیں جن کا

بدنصیب غلاموں اور کنیزوں کو ہمیشہ سامنا رہا کرتا تھا۔ اور جنکی بدولت ان کی حالت اس درجہ پست اور ذلیل ہو گئی تھی۔ اُس میں اس ظلم و عداوت اور جور و ستم وغیرہ کی بھی تفصیل درج تھی جو ان بیچارہ ہستیوں پر انکے سنگدل آقاؤں کے ہاتھوں سے ڈھائے جاتے تھے۔ اس میں قابل مصنفہ نے ان بدنصیبوں کی حالت اور انکی فلاکت و ذلت کی وہ تصویر کھینچی تھی جسکے مطالعہ سے ناظرین کے دل بھر آتے تھے۔ اور اُن قسی القلب آقاؤں کی بیرحمی اور اُنکے مظالم کا ایسا خاکہ کھینچا تھا کہ اُسکے دیکھنے سے کتاب پڑھنے والے کے دل میں اُنکی طرف سے نفرت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ شاید ہی کسی نے اِس کتاب کو پڑھا ہو اور غلاموں کی اِس ردی حالت سے آزردہ نہ ہوا ہو اور اس زحمت و مصیبت کا حال پڑھکر جن کا ان سیاہ فام غلاموں کو ہمیشہ سامنا رہا کرتا تھا اسکا دل دردمند نہوا ہو۔ اِس مفید کتاب نے جس درجہ لوگوں کے دلوں پر اثر کیا تھا اسکا اندازہ حیطۂ تحریر سے باہر ہے۔ وہ لونڈیاں اور غلام جو اِس سے پہلے طعمۂ شرارت و مورد ظلم و اسارت (قید) بنے رہتے تھے محض اِس کتاب کی بدولت حلقۂ آزادی میں داخل ہوے اور ہمیشہ کے لیے قیود و رنج غلامی سے اُنھیں نجات مِل گئی۔

درحقیقت یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جس نے لاکھوں نفوس انسانی کو آزاد کرا دیا۔ یہی نہیں بلکہ غلامی کی پستی سے نکالکر اُنھیں آزادی کی چوٹی پر پہونچا دیا۔ اور اُنکے جان و مال کا جو اُنکے آقاؤں کے قبضہ و تصرف میں تھے خود اُن کو مالک بنا دیا۔ ماہ مئی ۱۸۵۲ء مطابق رجب ۱۲۶۸ھ میں مصنفہ شہیرہ اپنے بھائی کے پاس بروکلین گئی اور وہاں چندے قیام کیا۔ اُسی زمانے میں پروفیسر اسٹو کو صیغۂ تعلیم تاریخ مقدس کی ریاست (افسری) کے لیے مدرسۂ انڈوور بھیجا گیا۔ لہذا وہ جس شہر میں رہتے تھے وہاں سے منتقل ہو کر یہاں چلے آئے۔ شہر انڈوور نہایت درجہ صاف اور یہاں کی آب و ہوا بہت سے عمدہ تھی۔ انھیں ایام میں بعض فضلا و عقلائے زمانہ نے کتاب حجرۂ عمو طام کے بارہ میں چند مضامیں اخباروں میں نکالے جن میں اِس کتاب پر نکتہ چینی کیگئی تھی۔ اُنھیں پڑھکر ہریٹ کو بھی مدافعہ کا خیال ہوا تا کہ معترضین کو اُنکے اعتراضات کا شافی جواب ملجائے چنانچہ ایک رسالہ موسوم بہ کلید حجرۂ عمو طام لکھنا شروع کیا۔ جسمیں دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا تھا کہ یہ کتاب بے سر و پا اور بے پادر ہوا باتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ جو کچھ بھی اسمیں لکھا ہے سب کا سب صداقت اور حقیقت پر مبنی اور مبالغہ سے مبّرا ہے اس میں غلاموں کی جس حالت کا نقشہ کھینچا گیا تھا وہ خالی از حقیقت نہ تھی اور ان پر وارد شدہ جن مظالم کا تذکرہ اسمیں تھا وہ از اوّل تا آخر سچ اور صحیح تھے۔ یہ تکملا اپریل ۱۸۵۳ء

مطابق جمادی الثانی ۱۲۶۹ھ میں جا کر تیار ہوا۔ اِسی مہینے میں انجمن مخالفِ رقیت (غلامی) نے جو گلاسگو میں قائم ہوئی تھی ہریٹ کو اسکاٹ لینڈ میں طلب کیا چنانچہ اپنے شوہر اور اپنے بھائی کی معیت میں وہ یہاں کے لیے روانہ ہوئی جبوقت یہ جماعت وارد لیورپول ہوئی اسکا استقبال نہایت شان و شوکت کے ساتھ کیا گیا۔ عسکلہ (گھاٹ) پر لوگوں کا ایک اژدحام تھا جوق کے جوق ایک ایسی محترم خاتون اور مصنفۂ عالی قدر کی زیارت کے لیے چلے آرہے تھے۔ جسنے عالم انسانی کے ساتھ ایسی گرانقدر خدمتیں کی تھیں۔ یہاں سے ہریٹ بسواری ریل اسکاٹ لینڈ آئی۔ اثنائے راہ میں جس جس اسٹیشن پر گاڑی رکتی تھی اس پر ان نوواردین کے استقبال اور خیر مقدم کے لیے ایک جمعیت کثیر موجود رہتی تھی۔ خود مصنفہ کہتی ہے "اِس ملک میں جس محبّت وملاطفت کا اظہار لوگوں نے میرے ساتھ کیا اُسے میں تازیست فراموش نہیں کرسکتی۔ "اسکاٹ لینڈ خوش آمدید" کی صدا ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتی رہے گی۔" ہریٹ کے گلاسگو پہونچتے ہی ہزاروں محبت آمیز خطوط آنے شروع ہوئے جو محض اظہار توقیر وتکریم اور خیر مقدم کی غرض سے لکھے جاتے تھے۔ اسکے بعد متعدد شہروں کے باشندوں کا ایک وفد آیا تاکہ زبانی مراتب دوستی ومحبت کا اظہار کرے۔ مشار الیہا لکھتی ہے "جس گلی کوچہ سے میرا گزر ہوتا تھا آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے جو محض میری زیارت کے لیے اطراف وجوانب سے آئے تھے"، گو ہریٹ وُرودِ گلاسگو کے روز تکان سفر سے قدرے خستہ وکسلمند تھی اور اسی لیے اُسے آرام کی غرض سے ایک کمرہ میں لیٹنا پڑا۔ لیکن اسکی زیارت کا شوق لوگوں کے دلوں میں اِس درجہ تھا کہ مجبوراً بستر چھوڑ کر باہر نکل آئی اور دو ہزار کی جمعیت کے اُس جلسہ میں شریک ہوئی جو محض اُسکی تعظیم وتکریم کے اظہار کی غرض سے مرتب کیا گیا تھا۔ جبوقت مشار الیہا وارد اڈنبرا ہوئی وہاں کا حاکم اعلیٰ مقامی امرا و اکابر کی ایک جمعیت کے ساتھ استقبال کے لیے آیا اور خیر مقدم کیا۔ اسکے بعد "انجمن انسداد غلامی" کا اُس سے تعارف کرایا۔ یہاں چند روز خوشی ومسرت کے ساتھ گزار کر ہریٹ ابرڈین و ڈنڈی ہوتی ہوئی لندن کے لیے روانہ ہوئی جہاں پہونچنے پر استقبال اور خیر مقدم نہایت ہی شاندار طریقہ سے کیا گیا۔ یعنے متعدد بڑے بڑے لوگ خود اسٹیشن پر آکر ہریٹ کو مع ہمراہیوں کے اُنکے قیام گاہ کو لے گئے جہاں آرام وآسائش کا جملہ سامان مہیا کیا گیا تھا۔ اِن جملہ مراسم واحترامات کے علاوہ مشار الیہا کو ایک مخصوص جلسہ میں دعوت دی گئی جو ایک عالیشان عمارت میں منعقد کیا گیا تھا۔ اور جس میں شہر کے رُؤسا و اکابر شریک تھے۔

مشہور زمانہ نوع خواہ بشر لارڈ شافٹسبری نے جن کا مرتبہ عالم انسانیت میں بہت بلند ہے اِس موقع کے مناسب

ایک بلیغ خطبہ پڑھا۔ اور ایک شہزادی نے محض اِس جلسہ کی یادگار کے طور پر ایک طلائی کنگن مومیٰ الیہا کو
پیشکش کیا جو نہایت درجہ خوش وضع اور خوبصورت تھا۔ اسکی شکل بالکل غلاموں کی بیڑی کی سی تھی اور اسپر
انگلستان میں انسداد غلامی کی تاریخ کندہ تھی (اسکے چند سال بعد اسپر امریکہ میں انسداد غلامی کی تاریخ بھی کندہ کردی
گئی تھی) بعد ازاں خود لندن کے کسی محلہ کی ایک خاتون نے محض اظہار تعظیم و تکریم کے طور پر چاندی کی ایک
نہایت نفیس و خوبصورت دوات نذر کی۔ الغرض لندن سے رخصت ہو کر ہیرٹ پیرس آئی جہاں کچھ عرصہ تک عزت
و احترام کے ساتھ رہ کر لاتیوں اور جنیوا ہوتی ہوئی کوہ آلپس دیکھنے کے لیے روانہ ہوئی۔ وہاں جا کر مشاہدہ سے
معلوم ہوا کہ کوئی گھر خواہ دیہات کا جھونپڑا ہو یا شہر کا محل ہو ایسا نہ تھا جسکے رہنے والے کتاب بجز عمو طام کے
مطالعہ سے مسرت اندوز نہ ہوتے ہوں۔ اِس کتاب نے وہاں کے خواص و عوام میں اسدرجہ مقبولیت حاصل
کرلی تھی کہ ایک روز کسی خاتون نے مصنفہ سے کہا "اے محترم بہن کیا اچھا ہو کہ آپ ایک اور کتاب
اِسی مضمون پر لکھیں اور جس تفصیل و تشریح کے ساتھ آپ چاہیں اس میں حالات درج کریں اِسلیے کہ ہماری
جاڑے کی راتیں اتنی طویل ہونے لگی ہیں کہ کاٹے نہیں کٹتیں" ہیرٹ وہاں سے جرمنی، بلجیم اور ہالینڈ دیکھتی ہوئی
پھر پیرس واپس آئی اور وہاں سے پھر لورپول آکر انگلستان کو خدا حافظ کہا۔ اِس سفر کا جو کچھ اثر دل پر ہوا تھا اُسے
مشار الیہا نے اپنی ایک خاص تصنیف موسوم بہ "تذکار پُر آثار ممالک خارجہ" میں بتفصیل درج کیا ہے۔ اسکے بعد
ایک دوسری کتاب (اِسی رسم غلامی کے خلاف) بنام ڈرڈ کمال توجہ اور جانفشانی کے ساتھ لکھنی
شروع کی۔ جس میں حسن بیان، لطف سخن، مناسبت کنایات و استعارات، ترتیب نکات، فصاحت
و بلاغت اور تنظیم سیاق الفاظ وغیرہ کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا تھا۔ اِس ایک لطیف حکایت سے جو اِس
کتاب میں لکھی ہے ظاہر ہو گا کہ ہیرٹ نے اِسکی تالیف میں کس درجہ غور و فکر اور کوشش سے کام لیا ہے۔
کسی اندھیری رات میں جبکہ چاروں طرف سیاہی کا پردہ پڑا ہوا تھا اور روشنی اطراف عالم سے کافور
ہو گئی تھی۔ ایک ہولناک طوفان آیا۔ بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک سے مکانات اس درجہ
متزلزل ہو رہے تھے کہ اندیشہ تھا کہ کہیں جڑ سے گر نہ جائیں۔ بجلی کی چمک تیرہ و تار افق کو جو شب دیجور
کی طرح روشنی سے محروم تھا اس درجہ روز روشن کی طرح منور کرنے والی اور دنیا کے لوگوں کو عجائب آثار
اور بدائع خلقت کا اسقدر جلوہ دکھانے والی تھی کہ گویا نور و ظلمات کے درمیان معرکہ آرائی ہو رہی
تھی کبھی ظلمت غالب آتی تو ساری فضائے آسمانی کو تاریک بنا دیتی۔ اور کبھی نور غالب آتا تو صفحۂ افق کو

دن کی مانند روشن کردیتا۔ طوفان کی آواز کے آگے اور تمام آوازیں دب گئی تھیں اور سوائے بادل کی گرج کے جسنے طوفان کے شور کو دبا رکھا تھا دوسری آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بجلی کی چمک سے جب فضائے آسمانی جگمگا اُٹھتی تو نظر آتا کہ بارش اِس زور سے ہو رہی ہے کہ بجائے بوندوں کے پانی کی دھاریں اوپر سے گر رہی ہیں۔ جواہرات کی سی آب و تاب رکھنے والے اولے چاروں طرف گر رہے تھے۔ ایک طرف تو طوفان کے شور نے جنگل میں گونج جانیکی وجہ سے ہزاروں درجہ بلند ہو کر ایک ہنگامۂ قیامت برپا کر رکھا تھا۔ دوسری طرف ہوا کی شدت نے سمندر میں وہ بلا کا تلاطم پیدا کردیا تھا کہ تہ کا پانی سطح پر آجاتا تھا جس سے سمندر نے ایک نہایت مہیب شکل اختیار کرلی تھی خلاصہ یہ کہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان اہل دنیا پر اسقدر غضبناک ہو کہ اُنھیں ایک عذاب الیم میں گرفتار کرنا چاہتا ہے یا یوں سمجھیے کہ حیات دنیا خاتمہ کو پہونچگئی تھی اور اسرافیل نے صور قیامت پھونکا تھا۔ عین اُسی حالت میں دو لڑکیاں ہریٹ کے کمرہ میں داخل ہوئیں۔ کیا دیکھتی ہیں کہ ہریٹ بستر پر لیٹی ہوئی مگر حالت بیداری میں ہو اور نہایت غور کے ساتھ اِن آسمانی کیفیات کا مشاہدہ کر رہی ہو اور اِس طوفان کی شدت کو جسکے شور کے آگے بم کی آواز بھی پست تھی اور برق کے خوشاب موتیوں کو جو لحظہ بلحظہ اپنی چمک دکھا رہے تھے۔ بکمال وقت ملاحظہ کر رہی ہے اور غور و فکر کے دریا میں غوطہ زن ہو۔ جب ہریٹ سے اِس خاص کیفیت کے بارہ میں استفسار کیا گیا تو جواب دیا کہ "میں نے اپنی تازہ تصنیف میں اِس طوفان و باراں کی شدت کا خاکہ کھینچا ہے اور اب اِس جملہ تفصیل و تشریح کا مقابلہ اصل کیفیت سے کر رہی ہوں کہ کہیں کوئی بات رہ تو نہیں گئی"۔ بہرحال اوائل تابستان ۱۸۵۲ء مطابق ۱۲۷۲ھ میں جب یہ کتاب بھی شائع ہوگئی تو ہریٹ پھر اپنے شوہر کے ہمراہ بحر اٹلانٹک کو عبور کرکے وارد انگلستان ہوئی اور لندن کے کسی ہوٹل میں قیام کیا جہاں ملکۂ انگلستان اور اُنکے شوہر پرنس البرٹ کی ملاقات کا شرف مشارالیہا کو حاصل ہوا۔ علیا حضرت ملکہ ہریٹ کو خود اپنے یہاں مدعو کرکے نہایت محبت اور نوازش سے پیش آئیں۔ چنانچہ پروفیسر اسٹو لکھتے ہیں "ملکہ معظمہ میری بیوی سے ملکر فی الواقع بہت خوش ہوئیں اور محض اُنھیں کی خاطر سے مجھے بھی شرف ملاقات بخشا۔ علیا حضرت نے ہم کو پرنس البرٹ سے بھی ملایا جنھوں نے دو مرتبہ نہایت متانت کے ساتھ میری بیوی کو اور دو ہی مرتبہ مجھے تعظیمانہ سلام کیا۔ اسوقت اُنکے چاروں بیٹے ہماری طرف اِس درجہ ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ آنکھوں کے ویدے حلقے سے باہر نکلا چاہتے ہیں۔ اُن کو بھی دیکھنے کے بعد دیگرے مصنفۂ "حجرۂ ٹوم" سے ملایا ملکہ کی ایک خادمہ نے کتاب "درد" کی ایک جلد میری بیوی کی جانب سے

نہایت ادب کے ساتھ علیا حضرت کی خدمت میں پیش کی۔ اسکے بعد ایک محترم خاتون نے جو علیا حضرت کی سہیلیوں میں سے تھیں میری بیوی سے کہا کہ ملکۂ معظمہ اس کتاب کو حجرۂ عمو طام پر ترجیح دیتی ہیں۔ اور اُنکے خیال میں یہ موخر الذکر کتاب سے کہیں زیادہ بہتر ہے" بعد ازاں ہیرئیٹ انگلستان کے مشہور و معروف مصنف چارلس کنگسلے سے ملنے گئی اور تین دن تک اُن کی مہمان رہکر اُنکے حسن تقریر اور لطف بیان سے بہرہ اندوز رہی اسکے کچھ عرصہ کے بعد وطن مالوف کو واپس آئی اور پھر تالیف و تصنیف میں مشغول رہکر اور کئی کتابیں لکھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی حجرۂ عمو طام کی لطافت و خوبی کو نہ پہونچی۔ اور نہ اس رسالہ کی طرح محبوب قلوب خواص و عوام ہوئی۔

اسی سال کے ماہ اگست میں مسز اسٹو نے تیسری اور آخر مرتبہ پھر انگلستان کا سفر کیا۔ مشار الیہا کا شوہر اور چھوٹی بیٹی بھی اس سفر میں ہمراہ تھی۔ اس سفر میں انگلستان کی ایک شہزادی نے نہایت ہی شاندار استقبال کے ساتھ ان سب کو شرف باریابی بخشا۔ اور کمال لطف و محبت کے ساتھ پیش آئی۔ فلورنس میں اسٹو کے سارے خاندان والے جمع ہو کر دوست و احباب کے درمیان نہایت لطف و خوشی سے دن گزار رہے تھے جس زمانے میں یہ لوگ ہوٹل میں مقیم تھے محض دل بہلانے اور وقت کاٹنے کے خیال سے اُن میں سے ہر شخص ایک مختصر سی حکایت لکھ کر سناتا تھا۔ ہیرئیٹ بھی اس قلمی تفریح میں شریک ہوتی تھی ان تمام قصص و حکایات کو جمع کر کے چار سال کے اندر ایک کتاب کی شکل میں شایع کر دیا۔ اسکے کچھ ہی دنوں بعد امریکہ کی خانگی جنگ نہایت زور و شور کے ساتھ چھڑی۔ غلاموں اور کنیزوں کے آقا تو ان بیچاروں کی آزادی سلب کرنا چاہتے تھے اور عالم انسانیت کے بہی خواہ اُن کو آزاد رکھنے میں کوشاں تھے۔ اسی وجہ سے فریقین میں جنگ چھڑ گئی۔ اُن لوگوں میں سے جو ابتدائے جنگ میں محض اپنی خوشی سے شریک محاربہ ہوئے تھے ہیرئیٹ کا بیٹا فریڈرک بھی تھا۔ اس معرکہ میں اس نے اس درجہ داد شجاعت و مردانگی دی کہ بہت جلد یاوری (میجری) کے درجہ پر فائز ہو گیا۔ ماہ نومبر ۱۸۶۲ء مطابق جمادی الاول ۱۲۷۹ھ میں جبکہ اس دیرینہ آرزو کے حصول کی خوشی میں ایک نہایت شاندار جلسہ کیا گیا اور اسمیں ہزاروں کی تعداد میں شریک جلسہ ہوئے۔ غلاموں اور کنیزوں کو کھانا کھلایا گیا۔ مسز اسٹو بھی مدعو ہوئیں۔ چونکہ وہ فوج جسمیں ہیرئیٹ کا بیٹا تھا اسی اطراف میں خیمہ زن تھی لہذا مشار الیہا نے نہایت شوق کے ساتھ جلسہ میں شرکت کی۔ اور اُن اکابر و اشراف کے ہمراہ جو وہاں موجود تھے اداے شکر و سپاس میں حصہ لیا۔ بیٹا بھی اپنی ماں کے ہمراہ اپنے بھائیوں اور بہنوں سے

ملنے گھر آیا اور اپنی جنگ آزمائی کی ساری داستان انہیں سنائی۔ اسکے تھوڑے عرصہ کے بعد جنگ گٹس برگ میں سخت زخمی ہوا جس سے خاصکر اُس کے سر کو سخت صدمہ پہونچا۔ گو سر کا زخم مندمل ہو گیا لیکن دماغ پر اس صدمہ کا اتنا اثر ہوا کہ اسکی کیفیت مجنونانہ ہو گئی۔ فلوریڈا میں اُس کے لئے ایک مزرعہ اس غرض سے خرید لیا گیا کہ شاید جنگل اور سبزہ جات میں قیام کرنے ہی سے اس اختلال حواس کا مداوا ہو جاوے۔ اسکے بعد اُسے سین فرانسسکو بھیجدیا گیا۔ لیکن وہ پھر اس سفر سے نہ لوٹا اور نہ کچھ خبر ہی ملی کہ اس پر کیسی اور کیا گزری۔

جنگ ختم ہوتے ہی پھر بعض لوگوں نے غلاموں کی آزادی کے خیال کو ترک کر دینے کا راگ الاپنا شروع کیا لیکن ہریٹ نے کسی اخبار میں ایک خط شایع کر دیا جس میں اس متارکہ کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا تھا یہ خط اسدرجہ بامعنی اور خوش اسلوب تھا کہ مسٹر جان برائٹ ایسے انگلستان کے معروف سیاست داں نے اُسے بہت پسند کیا۔ اس خط کے بعض فقرات یہ ہیں "کیا مسئلہ حریت و آزادی کو ترک کرکے ان چار لاکھ محترم نفوس کو غلامی ہی کی حالت میں پڑا رہنے دیا جائے۔ کیا اُن سے بیرخی کرکے انہیں اُن ہی کی قیمت کے حوالہ کر دیا جائے؟ جسطرح خدا کے وجود کا یقین ہے اُسی طرح یہ بھی یقین ہے کہ ہمارے لئے ایک سخت عذاب کا دن اور مصیبت جانکاہی کا موقع آنیوالا ہے۔ اور ہمکو اس بے اعتنائی کا خمیازہ بھگتنا ہوگا" چنانچہ یہ مسئلہ آزادی متروک نہوا اور ۱۸۶۶ء مطابق ۱۲۸۳ھ میں یہ ساری جنگ و جدل غلاموں کی کامل آزادی کے ساتھ ختم ہوئی۔ خلاصہ یہ کہ اس مصنفہ شہیرہ نے اپنی محنت و مشقت کا پھل پالیا اور اپنے مرنے سے پہلے ہی اپنی کوششوں کا نتیجہ آنکھوں سے دیکھ لیا۔

۱۸۶۳ء میں ہریٹ کے شوہر پروفیسر سٹو علی کے کام سے دستکش ہو گئے اور اُنکے اہل و عیال سب ہارٹ فورڈ کو چلے آئے۔ یہ مقام نہایت درجہ باصفا اور خوبصورت تھا۔ اسکے اطراف میں نارنگی۔ لیموں۔ گلاب اور دیگر اقسام کے پھولوں کے درخت بکثرت تھے فصل بہار میں جبکہ بقول شیخ سعدی سردی کے حملہ کے نشانات مٹ گئے تھے اور پھولوں کی دولت کا زمانہ آگیا تھا پروفیسر موصوف اس شان سے نظر آتے ہیں کہ سر اور ڈاڑھی کے سارے بال سفید ہیں۔ کتابوں کا ایک تھیلا سامنے رکھے ہوئے ایک درخت کے سایہ میں بیٹھے ہیں۔ انکی بیوی (ہریٹ) چاروں طرف پھول چنتی پھرتی ہے۔

ہریٹ میں بعض مصنفین و مولفین کی طرح غرور و تکبر نہ تھا۔ عاجزی و انکسار ہمیشہ اُسکا شعار رہا۔ اُسکے بارہ میں ایک روایت مشہور ہے کہ ایک دن کوئی عورت دور کا سفر طے کرکے ہریٹ سے ملنے آئی جہاں

پہونچکر کہا دیکھتی ہے کہ ایک دُبلی پتلی پستہ قد عورت پھول چن رہی ہے - اس سے پوچھا گیا مسز اسٹو سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ اس پھول چننے والی عورت (ہریٹ) نے جواب دیا - میں خود ہی مسز اسٹو ہوں - وہ عورت چاہتی تھی کہ معذرت پیش کرکے کسی طرح تلافی مافات کرے کہ مشار الیہا نے محض اسکی دلجوئی کی غرض سے اُسے ایک گلدستہ پیش کیا اور چلتے وقت نہایت ہی محبت کیساتھ اس سے مصافحہ کیا - آخر عمر میں ہریٹ کو نسیان کی شکایت لاحق ہوگئی تھی جسکی بدولت کبھی کبھی بعض ضروری سے ضروری بات بھی فراموش ہو جاتی تھی - ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ اپنے باغ میں ہریٹ جلسہ کرنیوالی تھی اس کیلئے اپنے متعدد دوستوں اور ملاقاتیوں کو مدعو کیا لیکن یہ بات اسکی یاد سے بالکل ہی جاتی رہی - اور اپنے خاندان کے اُن بچوں کو جن سے بہت محبت کرتی تھی اپنے ہمراہ لیکر جنگل چلی گئی اور جلسہ میں شرکت نہ کی - حتیٰ کہ جملہ مہمان ہریٹ کی آمد سے مایوس ہو کر واپس چلے گئے -

ہریٹ ایک واعظ باعمل تھی جس بات کی دوسروں کو نصیحت کرتی پہلے اُسے اپنا معمول بنا لیتی - اوسکی سترویں سالگرہ کا جشن اُسی صوبہ کے حاکم کے مکان پر منایا گیا - مشار الیہا کے بھائی نے ایک نہایت شاندار مناسب موقع خطبہ پڑھا - اس کے علاوہ متعدد تہنیت آمیز قصائد بھی پڑھے گئے - بعد ازاں ہریٹ مجمع کے سامنے آئی اور اپنی تقریر کے سلسلہ میں یہ فقرات ادا کئے "میں صمیم قلب سے اپنے جملہ احباب کا شکریہ ادا کرتی ہوں - اسکے علاوہ اور بھی کچھ کہنا ہے - اور وہ یہ کہ اگر آپ میں سے کسی کو وسوسہ و ہراس یا رنج و غم لاحق ہو تو بس یہ یاد کرے کہ خداوند عالم نے کس درجہ عنایت و لطف فرمایا ہے - یہ بھی سمجھ لے کہ اب غلامی کا بار گراں اُٹھ گیا اور ہمیشہ کیلئے ناپید ہوگیا - مجھے معلوم ہے کہ جنوب کیطرف یہ مسئلہ (آزادی غلامان) کس درجہ باعث رفاہیت عوام ثابت ہوا ہے - جب میں اس اطراف میں ٹہلنے جاتی ہوں تو اُنکے (غلاموںکی) پست کمرے اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں نظر آتی ہیں - اور میں مشاہدہ کرتی ہوں کہ یہ لوگ روز بروز متمول ہوتے جاتے ہیں - لیکن باوجود اسکے اُنکے ساتھ مدارا سے پیش آنا چاہئے کیونکہ اُن کے قوائے عقلیہ کم ہیں - اس کے علاوہ ان میں اور خامیاں بھی ہیں جو غالباً سفید پوشوں کی نگاہوں میں قابل نفرت ہوں گی - لیکن بلطور خود وہ بڑے ہی خوش و خرم ہیں - اور اُنہیں آپ لوگوں سے زیادہ اپنے کو خوش رکھنے کا طریقہ معلوم ہے ہمارے سیہ فام رفقا میں سے ایک کے پاس دو منزلہ مکان ہے - نہایت ہی خوبصورت - اُسی سے ملحق ایک خوشنما باغبان اور ایک کارخانہ شکر سازی ہے - ساتھ ہی اُسکے وہ متمول بھی ہے - ایک دن میرے شوہر اُس سے ملے تو

باتوں باتوں میں کہا کہ میرے پاس چالیس راس جانور - چار گھوڑے اور چالیس پرندے ہیں - ان سب کے علاوہ میرے دس بیٹے ہیں - جو سب میری ہی ملکیت ہیں - جس بات کا شایع ہو جانا مجھے پسند ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے نفس اور اپنے مال کا مالک ہے - اور تمام لوگ آسودہ اور مرفہ الحال ہیں انکو وسوسہ اور شک میں گرفتار نہ رہنا چاہئے - اس لئے کہ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہیگا" یہ تھی آخری عمومی تقریر مسز اسٹو (ہریٹ) کی - اس کے بعد ہریٹ کچھ عرصہ تک اپنے خطوط جمع کرتی - اور اپنے بیٹے مسٹر اسٹو کو اپنی سوانح عمری لکھنے میں مدد دیتی رہی - مشار الیہا نے اس موضوع پر ایک نفیس کتاب لکھی تھی - چنانچہ اس مقالہ کا زیادہ حصہ اسی سے ماخوذ ہے -

اسکے بعد وہ زمانہ آیا کہ ہریٹ آرام کرے اور دنیاوی کھیڑوں سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرے - لیکن اسی زمانہ میں ہریٹ پر ایک تازہ ناگہانی مصیبت ٹوٹی یعنی اگست ۱۸۸۶ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۰۳ھ میں اسکے شوہر نے داغ مفارقت دیا - اس سانحہ سے ہریٹ کو بیحد ملال ہوا اور ۲۸ رجون ۱۸۹۶ء مطابق ۱۶ محرم ۱۳۱۴ھ کو فالج میں مبتلا ہو کر بروز چہار شنبہ یکم جولائی کو ۸۶ سال کی عمر میں اس دار فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئی - اور اپنے پس ماندگان کو داغ مفارقت دیگئی -

(منقول)

(محمد جمیل احمد خان صاحب کوکب شاہجہانپوری)

اللہ اللہ یہ حجاب کا رنگ	رو کش مہر ہے نقاب کا رنگ
کس قدر شوخ ہے شباب کا رنگ	عرق رخ میں ہے شراب کا رنگ
لطف کسطرح دے شباب کا رنگ	کہ تصور میں ہے حباب کا رنگ
پرتو عارض درخشاں سے	آفتابی ہوا نقاب کا رنگ
لذت عشق اسی نے پائی ہے	جس نے دیکھا ہو کچھ عتاب کا رنگ
دل میں لیتا ہے چٹکیاں کوئی	کیوں نہ اشکوں میں ہو شہاب کا رنگ

چشم باطن سے دیکھ اے کوکب
ذرہ ذرہ میں آفتاب کا رنگ

"یادگار نسیم" پر ایک سرسری نظر

محمد حسین صاحب طالبعلم الہ آباد یونیورسٹی

"ادب" کبھی خاص جماعت کا حامی ہے اور نہ کسی شخص کا مخالف، سنجیدہ ادبی تنقید کیلئے اُسکے صفحات ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں۔ اگر جناب اصغر صاحب اس مضمون کا جواب دینا چاہیں تو وہ بھی نہایت خوشی کیساتھ درج رسالہ کر دیا جائیگا۔

(ادب)

جناب اصغر حسین صاحب اصغر (گونڈوی) مصنف "نشاط روح" نے "مثنوی گلزار نسیم" اور "دیوان نسیم" کا ایک مجموعہ تیار کیا ہے جو "یادگار نسیم" کے نام سے انڈین پریس الہ آباد میں طبع ہوا ہے۔ اس کتاب میں "التماس" کے عنوان سے شروع میں ایک مضمون ہے جسمیں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ یہ اڈیشن طلبہ کیلئے تیار کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ حواشی اور فٹ نوٹ کے ذریعہ سے انکو کافی مدد مل سکے۔ نیز اسکا لحاظ خصوصیت سے رکھا گیا ہے کہ شعر و ادب کے بارے میں طلبہ کی نظر بلند ہو سکے اور اُن میں صحیح بصیرت و صالح ذہنیت پیدا ہو سکے۔

ہم چند فٹ نوٹ پبلک کے سامنے اس غرض سے پیش کرتے ہیں کہ وہ فیصلہ کرے کہ آیا اصغر صاحب اپنے اس دعوی میں کامیاب ہوئے یا نہیں۔

نسیم۔ جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے، پرکار کی گردش مری پہونچ جائے (صفحہ ۲)

اصغر صاحب۔ یعنی ٹھیک ٹھیک مطلب کو ادا کر دوں۔ نکتہ۔ حرف۔ مرکز گردش میں رعایت لفظی ہے اور یہ صنعت مراعات النظیر ہے۔

گزارش۔ اس شعر میں حرف سے مراد حروف تہجی نہیں ہیں اور نہ مرکز سے مراد کاف گاف کا مرکز ہے پھر لکھنے کے تناسب سے صنعت مراعات النظیر کیسے ہو سکتی ہے۔ اصل میں اس شعر میں صنعت مشاکلہ ہے یعنی لکھنے کی مناسبت سے بے عیب نکتہ کو حرف نہ آنے سے اور اپنے کامیاب ہونے کو مرکز پرکار کی گردش پہونچ جانے سے تعبیر کیا ہے۔

نسیم۔ پایا جو سفید چشم صفحا یوں میل قلم نے سرمہ کھینچا (صفحہ ۵)

اصغر صاحب۔ چشم صفحا کی جگہ پر چشم صفحہ ہونا چاہئے تھا۔ کھینچا کے ساتھ صفحا کا قافیہ صحیح ہے مگر چشم صفحہ (یعنی فارسی ترکیب کے ساتھ) کا قافیہ صحیح نہیں سمجھا جاتا۔

گزارش۔ میں نہایت ادب سے عرض کرونگا کہ آپ نے شعر صحیح نہیں پڑھا چشم صفحہ مین اضافت نہیں ہی بلکہ سفید چشم میں ترکیب مقلوب ہی یعنی چشم سفید مطلب یہ ہی کہ جب صفحے کو چشم سفید پایا۔ اگر چشم صفحے کی طرف مضاف ہوتی تو بجائے پایا کے پائی ہوتا کیا آپ کے نزدیک نسیم یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ چشم مونث ہی۔ نسیم سے قافیہ میں ایسی فاش غلطی نہیں ہوسکتی تھی۔

نسیم۔ ہرچند کہ تھا وہ دیو کڑوا حلوے سے کیا منھ اوس کا میٹھا (صفحہ ۱۳)

اصغر صاحب۔ کڑوا کے معنی تند مزاج کے بھی ہیں کڑوا اور میٹھا میں صنعت تضاد یا صنعت طباق ہے۔

گزارش۔ جب کڑوا کے معنی تند مزاج کے ہیں تو کڑوا اور میٹھا میں صنعت تضاد کیسے ہوسکتی ہی اصل میں اس شعر میں صنعت ایہام تضاد ہی۔ صنعت تضاد اور ہی اور صنعت ایہام تضاد اور اگر کڑوا اپنے حقیقی معنی یعنی تلخ کے معنی میں مستعمل ہوتا تو صنعت تضاد ہوتی چونکہ تند مزاج کے معنی میں ہی لہذا صنعت ایہام تضاد ہی کیونکہ کڑوا کے حقیقی معنی یعنی تلخ تضاد کا وہم دلاتے ہیں۔ اصغر صاحب کے نوٹ میں کوئی کتابت کی بھی غلطی نہیں معلوم ہوتی یعنی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایہام کا لفظ کتابت میں رہگیا ہے اس سبب سے کہ انھوں نے صاف کردیا ہی اور یا طباق بھی لکھدیا ہے۔ تضاد اور طباق دونوں ایک ہی صنعت کے نام ہیں اور ایہام تضاد جو دوسری صنعت ہی وہ ایہام تضاد ہی کہلاتی ہی اس کو ایہام طباق نہیں کہتے۔

نسیم۔ حال اوس سے کہا کہ قول ہارا ہے پیر یہ نوجواں ہمارا (صفحہ ۱۴)

اصغر صاحب یہ جواں ہمارا پیر ہی یعنی یہ کہ یہ جواں ہمارا بہت ہی مکرم و محترم ہی پیر و جواں میں صنعت تضاد ہے۔

گزارش اس میں بھی صنعت تضاد نہیں ہی بلکہ وہی صنعت ایہام تضاد ہی۔

نسیم روشن ہے جو کچھ کیا ہے اندھیر پھر اپنی سمجھ سمجھ کا ہے پھیر (صفحہ ۱۵)

اصغر صاحب سمجھ کا پھیر (خام خیالی) ہے۔ روشن اور اندھیر میں صنعت طباق ہے۔
گزارش اس میں بھی صنعت طباق نہیں ہے بلکہ صنعت ایہام تضاد ہے کیونکہ روشن ہی ظاہر ہی کے معنوں میں ہے اور اندھیر خراب کام کے معنوں میں۔
نسیم۔ کر یاد کہیں چہ ذقن کو کو دے نہ کنوئیں میں باؤلی ہو (صفحہ ۵۲)
اصغر صاحب۔ باؤلی کے معنی دیوانی کے ہیں چاہ اور کنوئیں کی رعایت سے باؤلی (ایک بڑا اسیڑھیوں دار کنواں) کا لفظ لائے ہیں۔ اسے صنعت تجنیس کہتے ہیں۔
گزارش بھلا اس شعر کو صنعت تجنیس سے کیا علاقہ۔ صنعت تجنیس ایک لفظی صنعت ہے جس میں الفاظ تلفظ میں مشابہ ہوتے ہیں اور معنی میں مغائر۔ کنواں اور باؤلی نہ تلفظ میں مشابہ ہیں اور نہ معنی میں مغائر۔ اصل میں اس شعر میں صنعت ایہام تناسب ہے جو معنوی صنعت ہے۔
نسیم۔ بادل سا وہ بحر آسماں جوش۔ بجلی سی لہر سے تھا ہم آغوش (صفحہ ۵۴)
اصغر صاحب۔ معرکہ چکبست و شرر کے ساتھ جو نسخہ چھپا ہے اُس میں حاشیہ پر یہ مصرع یوں لکھا ہے۔ تھا بجلی سی لہر سے ہم آغوش۔
گزارش۔ چکبست نے جب مصرع صحیح کر دیا تھا تو آپکو وہی مصرع کتاب میں لکھنا چاہئے تھا کیونکہ اصل چیز کتاب کی صحت ہے آپنے جو مصرع لکھا ہے وہ ناموزوں ہے کیونکہ لہر کی ہائے ہوز ساکن ہے متحرک نہیں ہے۔
نسیم۔ کافور سی جل اُٹھیں سراپا ٹھنڈی ہوئیں تھا جنھیں جلاپا (صفحہ ۷۶)
اصغر صاحب جلاپا۔ رشک و حسد۔ ٹھنڈی اور جلاپا میں صنعت طباق ہے۔
گزارش۔ اس میں بھی صنعت طباق نہیں ہے۔
نسیم۔ حاجت کے گماں سے جب ہوئی دیر۔ جھنجھلا کے پلنگ سے اُٹھا شیر (صفحہ ۷۷)
اصغر صاحب پلنگ بمعنی چارپائی اور پلنگ بمعنی شیر کے تجنیس خطی کے لحاظ سے شیر نظم کیا گیا۔
گزارش۔ سبحان اللہ۔ یعنی تجنیس بھی آپکے نزدیک معنوی صنعت ہے کہ پلنگ اور شیر میں تجنیس ہو گئی اس سبب سے کہ پلنگ کے معنی شیر کے بھی ہیں تجنیس ایک لفظی صنعت ہے جسکو معنی سے کوئی تعلق نہیں اگر شعر میں شیر کی جگہ پلنگ کا لفظ ہوتا تو تجنیس ہوتی وہ بھی خطی نہ ہوتی بلکہ تجنیس تام مماثل ہوتی اس شعر میں صنعت ایہام

تناسب ہی جو معنوی صنعت ہی۔

نسیم - جاگا تو پری بغل میں پائی وہ نقش وفا عمل میں پائی (صفحہ ۷۸)

اصغر صاحب - وہ نقش وفا عمل میں پائی کی ترکیب غلط ہی۔ اُس نقش وفا کو عمل میں پایا۔ وہ نقش وفا عمل میں لکھی ہونا چاہئے لیکن نسیم کے وقت تک فعل کا اس صورت میں استعمال ممکن ہی کہ جائز رہا ہو نقش تعویز کو بھی کہتے ہیں اس لئے نقش اور عمل میں صنعت مراعات النظیر ہی۔

گزارش - جس طرح نقش اور عمل میں تناسب ہی اُسی طرح تعویز و عمل میں بھی تناسب ہی پھر اس کے کیا معنی کہ نقش تعویز کو بھی کہتے ہیں اس لئے نقش اور عمل میں صنعت مراعات النظیر ہی اور اس شعر میں صنعت مراعات النظیر ہی بھی نہیں بلکہ صنعت مشاکلہ ہی اس سبب سے کہ نقش کی مناسبت سے اپنے کام میں پانے کو عمل میں پانے سے تعبیر کیا ہی۔

نسیم - ہم چشم پھرے تھے شل مژگاں ہمسایہ تھے کشیدہ داماں (صفحہ ۷۴)

اصغر صاحب - دامن بچائے ہوئے۔ یعنی کوئی ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ مباحثہ گلزار نسیم کے نسخے میں یہ مصرع اس طرح ہی۔ ہمسایہ تھے سب کشیدہ داماں۔

گزارش - جب ایک موزوں مصرع آپکے سامنے موجود تھا تو پھر ناموزوں مصرع آپنے کتاب میں کیوں لکھا۔ معلوم ہوتا ہی کہ آپنے ہمسایہ کو کھینچ کر موزوں کیا ہی یعنی بجائے مفعول کے مفعولن کا رکن ابتدا میں لائے ہیں۔ لیکن کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ ہائے مختفی کے ماقبل جو فتحہ ہوتا ہی وہ تقطیع میں کھینچ نہیں سکتا جسقدر صنعتیں کہ اصغر صاحب نے بتائی ہیں اُن میں صرف دو شعروں میں صنعتیں صحیح ہیں باقی سب غلط ہیں اور وہ دو شعر یہ ہیں۔

نقطے ہوں سپند خوش بیانی جدول ہو حصار سحر خوانی

چوسر ہی کے سیکھنے کو یکسر گھٹا دہ بُرنگ نرد گھر گھر

ان شعروں میں جو مُراعات النظیر کی صنعت بتائی ہی وہ صحیح ہی۔ لیکن یہ صرف اتفاقی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس سبب سے کہ اور جن شعروں میں صنعت مراعات النظیر بتائی ہی وہ غلط بتائی ہی جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا اور زیادہ ثبوت کیلئے ہم اس کتاب کے مقدمہ صفحہ ۴۸ سے ایک عبارت نقل کئے دیتے ہیں

صنعت مُراعات النظیر یعنی تناسب لفظی کیلئے امانت لکھنوی خصوصیت کیساتھ شہرت رکھتے ہیں

فرماتے ہیں

دل پھنسانے کو لکھا اوس نے جو جال پہ خط — جعلسازی کی طرف پھر مرا صیاد آیا

تری جالی کی کرتی کے تصدق میں یہ صدر دیا ہے دل — مبصر دیکھکر آنکھوں کو کہتے ہیں کہ جالا ہے

میری تربت پر لگایا نیم کا اوس نے درخت — بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

قصہ کہنے میں نظر جب آگیا مجھکو وہ گل — گھانس کاٹی عارض رنگیں کا سبزہ دیکھکر

یہ کس کی زلف کی ناگن نے دل مارڈالا ہے — کہ کوسوں تک مری تربت پہ پھیلا کوڑیالا ہے

تو وہی صید فگن دشت میں رکھے جو قدم — آنکھیں آ آ کے ملیں جھیرٹیے گرگابی پر

تیرے گانے سے یہ حالت اے صنم ہوجائیگی — عاشق ناساز کو ہرتال سم ہوجائے گی

ناظرین نے ملاحظہ کیا کہ ان شعروں میں سے ایک بھی تو صنعت مراعات النظیر میں نہیں ہی پہلے شعر میں دو صنعتیں ہیں ایک لفظی یعنی صنعت شبہ اشتقاق دوسری معنوی یعنی صنعت ایہام تناسب دوسرے شعر میں صنعت تجنیس لاحق ہی چوتھی شعر میں صنعت مشاکلہ ہے باقی اور سب شعروں میں ایہام تناسب ہے۔ شاید کسی کو شبہ ہو کہ کچھ شعر صنعت مراعات النظیر میں بھی ہوں گے تو ہم اس کو صاف کئے دیتے ہیں کہ ہم نے ایک شعر بھی ترک نہیں کیا بلکہ سب شعر جو امانت کے اصغر صاحب نے لکھے تھے وہ لکھ دئے ہیں۔

مجمع الفوائد مولفہ مولوی سید حامد علی صاحب جو ہمارے درجہ کے نصاب میں داخل ہی اس میں صنعتوں کی مثالوں میں چند شعر گلزار نسیم کے بھی آگئے ہیں اصغر صاحب نے مقدمہ میں صنایع و بدایع کا عنوان قایم کرکے وہی اشعار نقل کردئے ہیں وہ تو بیشک صحیح ہیں اور باقی جن جن شعروں میں آپنے صنعتین بتائی ہیں ان میں سے سوائے دو شعروں کے اور سب غلط ہیں اور یہی ثبوت ہی کہ آپنے وہ اشعار مجمع الفوائد سے نقل کئے ہیں۔

مقدمہ میں اصغر صاحب نے چند عنوانات قائم کئے ہیں۔ مثلاً واقعہ نگاری۔ جذبات نگاری۔ وحشت کا نقشہ۔ رمز و اشارہ وغیرہ اور ان عنوانات کی تحت میں جو جو اشعار آگئے ہیں اُن کو نقل کردیا ہی لیکن کہیں کوئی علمی مسئلہ نہیں بتایا۔ یہ ضرور ہی کہ آجکل مقدمہ نگاری کا یہی رنگ ہی اور یہ رنگ اسوجہ سے لوگوں نے اختیار کیا ہی کہ اس کے لکھنے کیلئے قابلیت کی ضرورت نہیں ہی اور مسائل علمی بیان کرنے کیلئے علوم سے واقفیت کی ضرورت ہی جس سے ہر شخص واقف نہیں ہوتا اور مقدمہ ہر شخص لکھنا چاہتا ہے

لیکن ایسے مقدموں سے طلبا کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا کیونکہ بڑے درجوں کے امتحان میں علوم کے متعلق سوال آتے ہیں۔

مثنوی بھر میں ہر شعر میں جہاں کوئی صنعت ہو خواہ وہ صنعت لفظی ہو یا معنوی اصغر صاحب یہی لکھتے گئے ہیں کہ رعایت لفظی ہو رعایت لفظی ہو۔ بھلا اس سے طالب علموں کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہو یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ رعایت لفظی ہو ان کو یہ بتانا چاہیئے تھا کہ اس رعایت لفظی میں کونسی صنعت ہے کیونکہ یہی چیزیں طلبا کے امتحان میں آتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اصغر صاحب کو علم بدیع بھر میں صرف تین صنعتوں کے نام یاد ہیں مراعات النظیر۔ تضاد۔ تجنیس لیکن سمجھے ان کو بھی نہیں۔ علم بیان کے متعلق آپنے کہیں کوئی روشنی مثنوی بھر میں نہیں ڈالی۔ حالانکہ مثنوی میں تشبیہات۔ استعارات۔ مجاز مرسل۔ کنایات سب ہیں اور علم بدیع سے زیادہ ضروری چیز علم بیان ہو۔ تشبیہ و تمثیل کا عنوان بھی آپنے علیحدہ کیا لیکن اس میں بھی چند شعر تشبیہات کے لکھدئے اقسام تشبیہ نہیں بتائے نہ کہیں استعارے کی قسمیں بتائیں اور یہی باتیں امتحان میں آتی ہیں۔ محاورات جو مثنوی میں آئے ہیں وہ بھی نظر انداز کردئے گئے ہیں اصغر صاحب خود انصاف کریں کہ انہوں نے ہماری کیا بصیرت بڑھائی۔

عرضِ محبّت

(سیّد مطلب حسین صاحب عالی بی اے)

(۱)

سلیم اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بچپن میں اُسکی جتنی بھی ناز برداری کی جاتی کم تھی۔ خاندان متموّل تھا اور شہر کے پرانے رؤسا کے گھرانوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ سلیم کے والد اُسے انتہا سے زیادہ چاہتے تھے اور اُسپر جان دیتے تھے لیکن اُنھوں نے اُسکی تعلیم کی طرف سے کبھی بے پروائی نہیں کی بچپن ہی سے اُنھوں نے اُسکی تعلیم کا ایسا اچھا ڈھنگ مقرر کیا تھا کہ بائیس ہی برس کی عمر میں سلیم انگریزی کی انتہائی تعلیم ختم کر چکا تھا۔

اُس کے والد کے دل میں بیٹے کی خانہ آبادی کا جسقدر بھی ارمان ہوتا کم تھا لیکن سلیم ہمیشہ اس معاملہ میں باپ کی رائے کی مخالفت کرتا اور اُن کو شادی کے متعلق گفتگو کرنے کا بہت کم موقع دیتا۔

باپ نے بیٹے کی طبیعت کا اندازہ کر کے سکوت اختیار کیا اور سلیم ہی کی رائے پر چھوڑ دیا۔

(۲)

سلیم کا خاندان بہت بڑا خاندان تھا۔ اُسکے تمام عزیز مسلمانوں کے اکثر خاندانوں کے مثل آپس میں لڑنے بھڑنے کے بجائے نہایت میل اور محبت سے رہتے تھے۔ اُس کے خاندان والے اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم نے اپنے خاندانی معاملات کے تصفیہ کیلئے کبھی عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ ایک پورا محلہ اس خاندان کے لوگوں سے آباد تھا۔

سلیم فطرتاً نہایت خوش خلق اور ملنسار تھا۔ وہ اپنے ہر عزیز سے خواہ وہ غریب ہو یا امیر بڑی خندہ پیشانی سے ملتا اور برابر اُن کے یہاں آتا جاتا رہتا۔

اس کے دُور کے عزیزوں میں ایک صاحب عسکری مرزا بھی تھے یہ عرصہ تک سرکاری ملازم رہ چکے تھے اور اب پنشن پاتے تھے سلیم اُن کے یہاں بھی اکثر جاتا اور بڑی بڑی دیر تک بیٹھتا۔

سلیم علم کا خود بہت دلدادہ تھا۔ اُس نے عسکری مرزا کی لڑکی نعیمہ کو پڑھنے لکھنے کی ترغیب دی نعیمہ نہایت ہوشیار اور ذہین لڑکی تھی۔ اُس نے بھی پڑھنے لکھنے میں وقت صرف کرنا شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی مادری زبان میں پوری مہارت حاصل کرلی۔ اُس کے بعد اُس نے انگریزی زبان سیکھنا شروع کی اور جب سلیم اُسکے یہاں جاتا تو اُس سے مدد لیکر ابتدائی کتابیں ختم کرلیں۔

(۳)

اسی اثنا میں سلیم نے باپ سے انگلستان جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ دوچار بڑھے آدمیوں نے اُسکے باپ کو منع کیا کہ ہرگز ہرگز سلیم کو ولایت نہ بھیجنا ورنہ بیٹے سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔ لیکن سلیم کا اصرار بڑھتا گیا آخر کار باپ نے اجازت دیدی اور وہ سفر پر روانہ ہوگیا۔ ایک آدہ لوگ ایسے بھی تھے جو سلیم کے متعلق عجیب وغریب خیالات رکھتے تھے۔ ایک صاحب نے تو صاف صاف کہدیا کہ سلیم انگلستان محض شادی کرنے گیا ہے اور وہ ایسا ولایتی کے ہندوستانی عورت سے شادی نہ کریگا۔

اُسکے باپ بیچارے سب سنتے اور خاموش رہتے۔ سلیم ہر ہفتہ باپ کو خط لکھتا اور اپنے تعلیمی مشاغل کا ذکر کرتا۔ وہ انگلستان میں تین برس رہا اور وہاں کے امتحان میں کامیاب ہوکر واپس آیا۔ جب واپسی کی تاریخ کی اطلاع ہوئی تو باپ اور دوچار قریبی رشتہ دار اُسکو لینے کے لیے بمبئی گئے۔

تین برس کے بعد جب باپ نے بیٹے کو دیکھا تو اُن کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ لیکن زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ جو خیالات بعض لوگوں کے اُسکے متعلق تھے وہ سب غلط ثابت ہوے اور سلیم کے اخلاق وعادات پر انگلستان کے قیام کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا

(۴)

ایکدن سلیم حسب معمول نعیمہ کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ نعیمہ ایک انگریزی نظم پڑھ رہی تھی۔ اور وہ اُسکو اُس کا مطلب سمجھاتا جاتا تھا۔ نعیمہ نے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک بات پوچھوں" سلیم نے کہا "پوچھو" نعیمہ نے تھوڑی دیر سکوت اختیار کیا۔ پھر کہنے لگی "کل آپا جان پھوپھی اماں سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلیم میاں شادی بیاہ کچھ نہ کرینگے۔ لوگ کہتے تھے کہ کسی میم کو لائیں گے۔ لیکن وہ بھی غلط نکلا۔ کیا آپ سچ مچ شادی نہ کرینگے ؟"

نعیمہ کی عمر اس وقت پندرہ سے کچھ اوپر تھی طفلانہ شرارت اُسکے ہر ہر لفظ سے اور معصومانہ شوخی اُسکے

لہجے سے ٹپک رہی تھی۔ سلیم نے ذرا رکھائی سے کہہ دیا کہ میں تمھارے اس سوال کا جواب دینے کے لیے تیار نہیں ہوں لیکن نعیمہ نے اصرار کیا۔

سلیم نے کہا "میں شادی کے خلاف تو نہیں ہوں لیکن میں انتخاب میں کسی دوسرے کی رائے کو دخل دینا نہیں چاہتا"

نعیمہ نے کہا "تو اس کا وقت کب آئے گا"

سلیم "انتخاب تو میں کر چکا"

نعیمہ "وہ کہاں ذرا مجھے بھی تو بتائیے"

سلیم "تم کیا جانو؟"

نعیمہ۔ "نہیں مجھے ضرور بتائیے کہ وہ کون ہے؟"

سلیم۔ "میں تمھیں کیا بتاؤں جیسی اور عورتیں ہوتی ہیں ویسی ہی ایک وہ بھی ہے"

نعیمہ۔ "لیکن میری ہونے والی بھابھی جان کہاں ہیں کس شکل کی ہیں اور میں انھیں کب اور کیسے دیکھ سکتی ہوں۔

سلیم۔ "ہیں تو وہ یہاں سے قریب ہی لیکن نہ تم اُن سے مل سکتی ہو نہ دیکھ سکتی ہو"

نعیمہ۔ "میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے اُن سے ضرور ملا دیجیے۔ میں بہت ممنون ہونگی"

سلیم "یہ غیر ممکن ہے"

نعیمہ۔ "اچھا تو ایک نظر دکھا ہی دیجیے"

سلیم۔ "یہ بھی ممکن نہیں"

نعیمہ۔ "تو اچھا اُن کی تصویر ہی دکھا دیجیے"

سلیم نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد اس کا اقرار کیا۔ نعیمہ نے پھر کہا "تصویر کب دکھائیگا؟" سلیم نے کہا "جب تم کہو" نعیمہ نے کہا ابھی دکھائیے۔ سلیم نے پھر ایک دفعہ کوشش کی کہ نعیمہ اپنے ارادہ سے باز رہے لیکن اُس نے ایک نہ مانی اور سلیم کو مجبور کیا کہ آپ جلد سے جلد مجھے تصویر دکھا دیں۔

سلیم اُٹھ کر دوسرے کمرہ میں گیا۔ وہاں سے ایک آئینہ کاغذ میں لپیٹ کر لے آیا اور بولا۔ نعیمہ دیکھو۔ اگر تصویر دیکھکر تمھیں صدمہ پہونچے تو میرا کوئی قصور نہیں کیونکہ خود تمھارے اصرار سے

تمھیں تصویر دکھا رہا ہوں"

نعیمہ نے بے صبری سے سلیم کے ہاتھ سے وہ آئینہ لے لیا۔ اور نہایت شوق سے کاغذ ہٹا کر دیکھا۔
سلیم نے دوسری طرف مُنھ پھیر لیا تھا۔ اُسکے بعد سلیم نے اپنی گستاخی کی معافی چاہی اور بولا۔
"میں نے صرف تمھارے اصرار سے یہ جرأت کی اور سچ پوچھو تو میں قصور وار نہیں ہوں"

نعیمہ نے اپنی پیشانی پر سے پسینہ کے قطرے صاف کیے۔

سلیم نے بڑی جرأت کر کے اُس کے چہرہ پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ جس لڑکی کی بات بات سے ابھی چند منٹ پہلے شوخی و شرارت ٹپک رہی تھی اب وہی متانت کا پیکر اور نسوانی غرور کا مکمل مجسمہ ہو گئی ہے اور میری اس حرکت نے اُسے ایک لمحہ میں حدودِ طفلی سے نکالکر شباب کی پہلی منزل تک پہونچا دیا ہے۔

سلیم کا حوصلہ اور بڑھا اور اُس نے پوچھا۔ کیا میری یہ امید پوری ہو سکتی ہے؟

لیکن نعیمہ نے اس کا جواب نیچی نظروں اور خاموش زبان سے دیا۔

غزل

نواب علی خاں صاحب گوہر

پھر دلِ گمشدہ کی یاد آئی ہائے میرا رفیقِ تنہائی
اُن کے آتے ہی مر گیا بیمار دل کو راحت ملی تو نیند آئی
درِ زنداں سے جوشِ وحشت میں سر کو ٹکرا رہا ہے سودائی
بتکدہ بن گیا خدا کا گھر ہے نے کی اسقدر جبیں سائی
اپنے رہنے کو دونوں عالم میں دل کی بستی انھیں پسند آئی
ہم قفس میں ہیں دور گلشن سے آہ کس وقت میں بہار آئی

آج گوہر کی تم سے رخصت ہے
اے غم و یاسِ شامِ تنہائی

تنہا اور ناسخ

محمد اظہار الحسن صاحب بی اے - ایل ایل بی - (علیگ)

جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا مؤلف سیر المصنفین کے ایک ہموطن وہم پیشہ بزرگ نے ذیل کا مراسلہ بغرض اشاعت ارسال فرمایا ہے جسمیں موصوف نے تنہا صاحب کے ایک مضمون کی چند غلطیاں دکھائی ہیں، جناب تنہا کے سے مستند لکھنے والوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کوئی بات بغیر کافی تحقیق کے نہ لکھیں گے۔ ممدوح نے مضمون زیر بحث میں ناسخ کے ضخیم دیوانوں میں سے صرف بہتر شعر جو اُن کے نزدیک بہترین ہیں منتخب کرکے پیش کیے ہیں، اگر اس قلیل تعداد میں بھی چند شعر دوسرے شاعروں کے شامل ہو گئے ہیں، تو ایک معتبر مؤلف کی احتیاط کے خلاف ضرور ہوا۔ اگر مراسلہ نگار صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہو تو امید ہے کہ حضرت تنہا اُسے رفع فرما دیں گے۔

(ادیب)

صاحب سیر المصنفین مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے ایل ایل بی، وکیل آج کل ایک تذکرہ اُردو شعرا کا مرتب فرما رہے ہیں جسمیں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ ۲۰ شاعروں کا ذکر ہوگا اور ہر ایک کے ۷۲ منتخب اشعار درج کیے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں مختلف شعرا کا تذکرہ بالاقساط مولوی صاحب "الناظر" میں شایع کرا رہے ہیں چنانچہ دسمبر ۱۹۲۹ء کے "الناظر" میں تنہا صاحب نے ناسخ کی طرف توجہ کی ہے۔

اس مضمون کو پڑھ کر افسوس ہوا کہ ابھی تک ہمارے ادیبوں میں تنقید کا صحیح مذاق پیدا نہیں ہوا۔ تنقید بالعموم تنقید نہیں رہتی بلکہ تنقیص یا تحسین کا پہلو اختیار کر لیتی ہے۔ یہی حال تنہا صاحب کے مضمون زیر نظر کا ہے میں اس وقت ناسخ کی حمایت میں کچھ لکھنا نہیں چاہتا ہوں اسلیے کہ اُن کی ذات اس سے بے نیاز ہے۔ اگر تنہا صاحب خود ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے تو اُن کو معلوم ہو جائیگا کہ انھوں نے ناسخ کے ساتھ زیادتی کی ہے اور جو کلمات استعمال فرمائے ہیں وہ ناسخ کے تو کیا خود اُنکے بھی شایانِ شان نہیں ہیں۔

ناسخ کے مشہور مطلع ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

کا مقابلہ میر کے اس نشتر ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

سے کرتے ہوئے تنہا صاحب فرماتے ہیں:

"اک گریباں چاک ناسخ ہے جو اس شعر کا مصداق ہے کہ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

دوسرا گریباں چاک میر ہے دونوں کا مقابلہ کیجئے ......"

آپ ناسخ کے مطلع کو جو چاہیں کہیں۔ مان لیجئے کہ مطلع نہایت لغو ہے لیکن خدا را یہ تو بتایئے کہ اس سے ناسخ کی بوالہوسی کیونکر ثابت ہوتی ہے۔

بہر حال تنہا صاحب اپنی رائے میں آزاد ہیں۔ اسوقت میں ناظرین کی توجہ ایک دوسرے مسئلہ کی جانب منعطف کرانی چاہتا ہوں۔ تنہا صاحب نے جو انتخاب ناسخ کے اشعار کا کیا ہے اُس کا پینتیسواں شعر یہ ہے۔

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

موصوف کے ارشاد کے مطابق یہ شعر ناسخ کے دیوان اول میں ہونا چاہیے۔ میں نے ناسخ کے دونوں دیوانوں میں اس شعر کو تلاش کیا لیکن بے سود۔ میرا خیال ہے کہ یہ شعر خواجہ وزیر کا ہے۔ تذکرۂ گل رعنا میں یہ شعر خواجہ مرحوم کے منتخب اشعار میں درج ہے۔ دور موجودہ کی گراں بہا تصنیف "تاریخ ادب اردو" مؤلفہ مسٹر رام بابو سکسینہ مترجمہ مرزا محمد عسکری میں بھی اس شعر کو خواجہ وزیر سے منسوب کیا گیا ہے۔ کیا تنہا صاحب براہ کرم مطلع فرمائینگے کہ انھوں نے یہ شعر ناسخ کے دیوان کے کس ایڈیشن میں ملاحظہ فرمایا۔

اسی طرح اپنے انتخاب میں بہتر واں نمبر تنہا صاحب نے اس شعر کو دیا ہے ؎

دل اُس بت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے
خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے

اسکے متعلق آب حیات کے نہم ایڈیشن مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۱۷ء کے صفحہ ۳۶۶ پر یہ نقل درج ہے:

"ان دنوں ناسخ کے مزاج میں منصفی اور حق شناسی کا اثر ضرور تھا۔ چنانچہ الہ آباد میں ایک دن

مشاعرہ تھا سب موزوں طبع طرحی غزلیں کہکر لائے تھے۔ شیخ صاحب نے جو غزل پڑھی مطلع یہ تھا

دل اب محوِ ترسا ہوا چاہتا ہے		یہ کعبہ کلیسا ہوا چاہتا ہے

ایک لڑکے نے صف کے پیچھے سے سر نکالا۔ بھولی بھالی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ معرکہ میں غزل پڑھتے ہوئے ڈرتا ہی۔ لوگوں کی دلدہی نے ہمت باندھی۔ پہلا ہی مطلع تھا ؎

دل اُس بُت پہ شیدا ہوا چاہتا ہی		خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہی

محفل میں دھوم مچ گئی۔ شیخ ناسخ نے بھی تعریف کرکے لڑکے کا دل بڑھایا۔ اور کہا کہ "بھائی یہ فیضانِ الٰہی ہی اس میں استادی کا زور نہیں چلتا تمھارا مطلع مطلع آفتاب ہی۔ میں اپنا پہلا مصرعہ غزل سے نکال ڈالونگا"

جہاں تک مجھے علم ہے جناب تنہا شمس العلما آزاد کے بہت معتقد ہیں تعجب ہے، کہ آب حیات میں اس نقل کی موجودگی میں اُنھوں نے اس مطلع آفتاب کو شیخ ناسخ سے کسطرح منسوب کردیا۔

خدانخواستہ ہمیں تنہا صاحب سے کوئی ذاتی کاوش نہیں ہی جو کچھ لکھا گیا نیک نیتی سے اور ایک ادبی غلط فہمی کو دُور کرنے کی غرض سے لکھا گیا۔

قاآنی کا زورِ تخیل اور حسنِ بیان

(پروفیسر عبد القوی صاحب فانی ایم اے)

قاآنی کا ایک قصیدہ حضرت علی بن موسیٰ الرضا علیہ التحیۃ والثنا کی شان میں ہے۔ اس کے چند شعر ذرا تفصیل سے ملاحظہ ہوں۔ مطلع ہے۔

بگردوں تیرہ ابرے بامداداں برشد از دریا
جواہر خیز و گوہر بیز و گوہر ریز و گوہر زا

کہتا ہے۔ صبح کو ایک سیاہ ابر سمندر سے اٹھا اور آسمان پر چھا گیا وہ موتی برساتا تھا۔ موتی بکھراتا تھا۔ موتی لٹاتا تھا اور موتی اُگلتا تھا۔

اس شعر میں اسقدر برجستہ اور بے ساختہ ترکیب و ترتیب کے ساتھ ترنم ریز اور نغمہ خیز الفاظ لائے گئے ہیں کہ پڑھنے سے ایک لذت اور ایک کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ذرا اس حسن بیان کو دیکھئے کہ نقادانِ سخن میں کسی کو حسن تکرار پر اصرار ہے اور کسی کو صنعت ترصیع پر۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ فضائے تخیل پر مضامین کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور اس میں سے الفاظ کے قطرات نہ صرف موتی بنکر ٹپک رہی ہیں بلکہ دوسرے مصرع کی لڑی سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جھڑی لگی ہوئی ہے۔

دوسرا شعر ہے۔

چو چشم اہرمن خیرہ چو روئے زنگیاں تیرہ
شدہ گفتی ہمہ چیرہ بمغزش علتِ سودا

کہتا ہے۔ وہ ابر ایسا تاریک تھا جیسے دیو کی آنکھ اور ایسا کالا تھا جیسے زنگیوں کا چہرہ۔ اسپر اسدرجہ سودا غالب تھا کہ مطلق سیاہ تھا۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیرہ تیرہ اور چیرہ محض صنعت سجع یا مبادلۃ الراسین کیلئے استعمال کئے

گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ چشم اہرمن کیلئے "خیرہ" روئے زنگیاں کیلئے "تیرہ" اور علت سودا کیلئے "چیرہ" سے زیادہ موزوں مناسب اور مفہوم خاص کو ظاہر کرنے والے الفاظ نہیں مل سکتے۔

اسی سلسلہ میں کہتا ہے۔

تنش با قیر آلودہ دلش از شیر آمودہ

بروں پر سرمہ سودہ دروں پر لولوئے لالا

بدل گلشن بتن زندان گہے گریان گہے خندان

چو در بزم طرب رندان ز شور نشاء صہبا

ان اشعار میں شاعر یہ دکھلاتا ہے کہ کالے کالے بادلوں سے موتی ایسی صاف اور شفاف بوندوں کا مینھ برس رہا ہے اور بجلی تڑپ رہی ہے۔ کہتا ہے۔ ابر اتنا کالا تھا گویا اُسکے جسم پر تارکول بھرا ہوا تھا لیکن اُس کے دل میں دُودھ بھرا ہوا تھا اسی پر بس نہیں کرتا اور کہتا ہے۔ بادل اسدرجہ سیاہ تھا گویا باہر کی جانب پسا ہوا سرمہ بھرا تا تھا مگر اندر چمکدار موتی بھرے ہوے تھے۔ اُسکے دل میں پھولوں کا باغ کھلا ہوا تھا گو اُسکا جسم قیدخانہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ کبھی روتا تھا اور کبھی ہنستا تھا جس طرح عیش وطرب کی محل میں شرابی سیہ مستی کے عالم میں کبھی روتے ہیں اور کبھی ہنستے ہیں۔

سیاہ ابر کو زنداں سے تشبیہہ دینا اور اُسکی بوندوں کو جو اُس میں مقید ہیں گلشن سے تعبیر کرنا نہایت لطیف تشبیہیں ہیں۔

"دلش از شیر آمودہ" اور "بدل گلشن" کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں فلسفۂ فطرت کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

بچے اور شیرخوار دودھ ہی کی بدولت پروان چڑھتے ہیں اور اسی سے اُنکی زندگی ہے۔ یہی حال زمین اور نباتات کا ہے۔ پانی اُن کے لئے بمنزلہ دودھ کے ہے۔ پانی ہی سے مردہ زمین میں جان آتی ہے اور نباتات کی پیدائش اور نشو ونما ہوتی ہے۔ پانی کی ہر بوند جو ابر میں چھپی ہوئی موجود ہے ایک ایک پھول کا حکم رکھتی ہے جو برستے ہی زمین کو گل ولالہ اور رنگ برنگ کے خوشنما

پھولوں سے آراستہ کردیتی ہے۔ انہیں بوندوں کا مجموعہ جو پھولوں کا سرمایۂ حیات ہے درحقیقت "گلشن" ہے جو ابر کی سیاہ دیواروں میں مقید ہے اور جیسے طرح طرح کے دل رُبا پھول فطرتاً موجود ہیں اور جس کے فیض مسیحائی سے ساری زمین گلشن ہی گلشن نظر آتی ہے۔ سبزہ زاروں کی کثرت اور چارہ کی افراط سے مویشیوں کی بن آتی ہے۔ وہ خوب آسودہ ہو کر چرتے ہیں اور بقول مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی اسی گھانس کا دُودھ بنجاتا ہے۔

رَبّ کا شکر ادا کر بھائی	جس نے ہماری گائے بنائی
کل جو گھاس چری تھی بن میں	دُودھ ہوئی وہ گائے کے تھن میں

باران رحمت کے نازل ہوتے ہی باغ تو باغ گھورے اور مزبلے بھی سبزہ و گل سے ڈھک جاتے ہیں اور ساری زمین کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔

پھر "گریان" پانی برسنے کی اور "خندان" بجلی چمکنے کی تفسیر ہی نہیں بلکہ سچی تصویر ہے جو شاعر نے پیش نظر کردی ہے۔ ذرا اس صنعت تضاد کی خوبی کا لطف دیکھئے۔

جب بارش کی یہ کیفیت ہو تو پھر رندوں کو بادہ خواری اور اُس کے سرور و کیف سے لطف اندوزی کی کیوں نہ سوجھے۔ چنانچہ شاعر دوسرے مصرع میں "گریان" و "خندان" کی حالت کو مثال سے سمجھاتے ہوئے نشہ کا زور دکھلاتا ہے کہ اسوقت تو خود فطرت بھی مستی سے بیخود ہے۔ وہ عالم ہے جیسے رندان بادہ خوار جو شراب کے نشہ میں سیہ مست ہو کر کبھی ہنستے ہیں اور کبھی روتے ہیں اسکا لطف کچھ وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جنہوں نے آتے جاتے کبھی کلوار خانہ پر نظر ڈالی ہو یا جنپر خدانخواستہ خود کبھی ایسا عالم طاری ہوا ہو ورنہ زاہد خشک بقول شاعر

ہائے کمبخت تونے پی ہی نہیں

بھلا اس کیفیت کی خوبی اور حسن بیان سے کیا لطف اُٹھا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ سارا قصیدہ اسی طرح کی لطیف تشبیہوں اور صنایع و بدایع سے مرصع ہے اسپر زورِ تخیل زبان کی روانی اور حسن بیان مستزاد۔ کلام کیا ہے بالکل جادوگری ہے۔

اب ایک مسمّط کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

ندا ناز کو دکے شگوفہ از چہ پیر شد	نہ خوردہ شیر عارضش چرا برنگ شیر شد

گمان برم کہ ہمچو من بدام غم اسیر شد زپا فگندہ دلبرش چہ خوب دستگیر شد
بلے چنین برند دل ز عاشقان نگار را

روح پرور موسم ہے۔ قدرت کی ہر چیز پر جوبن ہے۔ دلوں کی اُمنگیں اور طبیعتوں کی جولانیاں اپنا رنگ دکھا رہی ہیں۔ خون جوش کھا رہا ہے۔ عشق کی آگ بھڑک رہی ہے کلیاں تک اس عشق اور ہجر کی سوزش سے متاثر نظر آتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے۔ نہیں معلوم غنچہ کو بچپن ہی میں کیوں بڑھاپا آ گیا۔ اُس نے تو ابھی دُودھ بھی نہیں پیا تھا یعنی پوری طرح نشو و نما تک نہ ہوئی تھی۔ پھر آخر اُسکے رُخسارے دُودھ کے مانند کیوں سفید ہو گئے یعنی وہ مرجھا گیا میرا خیال ہے کہ شاید وہ بھی عشق کے پھندے میں پھنس گیا۔ محبت کا کیا اچھا صلہ ملا کہ اُسکے محبوب نے اُسے یوں ٹھکرا دیا۔ ہاں! محبوب تو عاشقوں کا دل یوں ہی لیجاتے ہیں۔ یہاں شاعر یہ دکھاتا ہے کہ محبت و عشق کے جذبات جو موسم بہار میں حسن و عشق کی ازلی کشش کے باعث ہیجان میں ہوتے ہیں وہ صرف جاندار وں ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ کلیاں تک ان سے متاثر ہیں اور ہجر کی مصیبتوں کے ہاتھوں تباہ حال ہیں۔ شاعر کا یہ بلند تخئیل اپنی جدت ادا پر آپ گواہ ہے۔

اسی مسمط کا ایک دوسرا بند ہے۔ زور تخیل اور صنعتوں کی خوبی کے علاوہ ذرا حسن بیان کو دیکھئے۔

بہار کا زمانہ ہے حسن پرست عاشق اپنے معشوقوں کے ساتھ گلگشت چمن میں مصروف ہیں۔ مرغان چمن کے ساتھ بوتلوں کے کاگ بھی اُڑ رہے ہیں لیکن ایک قسمت کا مارا ہجراں نصیب عاشق میر تقی میر کے حسب ذیل شعر کی تصویر بنا ہوا۔

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی[1]

اپنی حسرت کا یوں اظہار کرتا ہے۔

دریں بہار ہر کسے ہوائے راغ دارد بیاد باغ طلعتے خیال باغ دارد
بہ تیرہ شب ز جام مئے بکف چراغ دارد ہمیں دل من است و بس کہ درد و داغ دارد
جگر چو لالہ پُر ز خون ز عشق گلعذار را

یعنی فراق کی شب تاریک ہے۔ میں ہوں اور میرا دل ہے جس میں درد بھی ہے اور داغ بھی

[1] ایک نامراد عاشق بہار کی آمد کو دیوانگی اور زنجیر سے تعبیر کرتا ہے۔

اللہ بس باقی ہوس۔ جب جی گھبرا اُٹھتا ہے تو آب آتش خیز کا جام بھر کر ہاتھ میں لے لیتا ہوں جسکی روشنی سے اس اُجڑے ہوئے گھر میں کچھ کچھ اُجالا ہو جاتا ہے میرا دل بھی اس موسم بہار میں سیر کیلئے خاصا لالہ زار ہے کیونکہ لالہ کی طرح یہ بھی "پر زخون" یعنے سُرخ اور غم سے داغدار ہے۔

ایک قصیدہ کا مطلع ہے۔

نسیم خلد می وزد مگر ز جوئے بار ہا　　　کہ بوی مشک می دہد ہوائے مرغزار ہا

اس شعر میں شاعر بہار کی آمد کا سماں اس انداز سے کھینچتا ہے کہ بجھے سے بجھے ٹوٹے دل میں بھی ایکدفعہ تو اُمنگوں کی لہریں دوڑ ہی جاتی ہیں۔ کہتا ہے۔ شاید جنت کی ہوائیں چشموں اور ندیوں کے کنارے سے چل رہی ہیں کیونکہ سبزہ زاروں کی ہواؤں میں مشک کی لپٹیں آ رہی ہیں کیسے شیریں سادہ اور برجستہ الفاظ میں کیسا پاکیزہ اور مستانہ خیال ادا کیا گیا ہے۔

اسی قصیدہ میں ایک جگہ کہتا ہے۔

بکف بطے ز سرخ مے کہ گر از و چکد بہ نے　　　ہی ز بند بند وے برون جہد شرار ہا

یہاں شاعر شراب کی سُرخی اور اثر کی تیزی کا ذکر کرتا ہے۔ کہتا ہے۔ ہاتھ میں شراب کی صراحی ہے جسمیں سرخ شراب جھلک رہی ہے اور اسکی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ اگر اس میں سے ایک قطرہ بھی نے میں ٹپک جائے تو اُسکی جوڑ جوڑ سے (شراب کی) چنگاریاں اُڑنے لگیں۔ یہاں شراب کی صرف سُرخی ہی کا شعلہ کی سُرخی سے مقابلہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اثر کی تیزی کا بھی جس سے لطف دوبالا ہو گیا ہے۔

ایک دوسرے قصیدہ کا مطلع ہے۔

بہار آمد کہ از گلبن ہمی بانگ ہزار آید　　　بہر ساعت خروش مُرغ زار از مرغزار آید

شاعر بہار کے آنے کی خوشخبری دیتا ہے اور ثبوت میں کہتا ہے کہ بہار آگئی کیونکہ گلاب کے درختوں سے بلبلوں کے نغموں کی آوازیں آ رہی ہیں اور سبزہ زاروں سے ہر دم چڑیوں کے چہچہے سُنائی دے رہے ہیں۔ بہار کی آمد کی کیسی دلکش اور ولولہ انگیز تصویر ہے۔ مردہ قلوب کیساتھ شاعر کی یہ سحر بیانی مسیحائی کا کام کرتی ہے۔ مرغزار اور مرغزار میں صنعت تجنیس نہایت پر لطف ہے۔

صنعت لفّ و نشر

بلحاظ لغت "لف" کے معنی لپیٹنے کے ہیں اور "نشر" کے پھیلانے کے۔ اصطلاحاً یہ ہے کہ

چند چیزون کا پہلے مفصل یا مجمل ذکر کیا جائے۔ یہ "لف" ہی۔ پھر اسی قدر چیزون کا اور ذکر کیا جائے جو پہلی ذکر شدہ اشیاء سے مناسبت اور تعلق رکھتی ہوں یہ "نشر" ہی۔ اگر "لف" کی ترتیب کے مطابق "نشر" ہی تو اسے "لف و نشر مرتب" کہتے ہیں۔ اساتذۂ متقدمین نے اس صنعت کا استعمال کیا ہی مگر کم اور سادگی کے ساتھ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

عنصری کہتا ہی۔

یا بہ بند دیا گشاید یا ستاند یا دہد ۔۔۔ تا جہان باشد ہمی مرشاہ را این یادگار
آنچہ بستاند ولایت آنچہ بدہد خواستہ ۔۔۔ آنچہ بند د دستِ دشمن آنچہ بگشاید حصار

فرخی

در رگ و اندر تن و اندر دل و اندر دو چشم ۔۔۔ خواب و صبر و روح و خون را اے مہ افتاد انقلاب
رنج دارد جائے خون و درد دارد جائے روح ۔۔۔ عشق دارد جائے صبر و آب دارد جائے خواب

فردوسی

بروز نبرد آن یلِ ارجمند ۔۔۔ بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند
درید و برید و شکست و ببست ۔۔۔ یلان را سر و سینہ و پا و دست

عبدالواسع جبلی

ندارم در غم و رنج و جفا و جودِ تو خالی ۔۔۔ لب از باد و سر از خاک و رخ از آب و دل از آذر
بحسن و رنگ و بوئے و طعم در عالم ترا دیدم ۔۔۔ قد از سرو و بر از عاج و خط از مشک و لب از شکر

رشید الدین وطواط

بہ بزم و عزم و حزم و رزم گوئی عاریت داری ۔۔۔ کف از حاتم ہش از رستم تن از بیژن دل از حیدر
بخشم و حلم و عفو و طبع برداری اگر خواہی ۔۔۔ رگ از خاک و تگ از باد و نم از آب و تف از آذر

امیر خسرو

ز شوق عشق و سوز داغ تو باشد برین گونہ ۔۔۔ دمم دود و غمم سود و دلم عود و تنم مجمر
ندیدم چون توئی در شکل و ناز و خوبی و خندہ ۔۔۔ برون رنگ و درون جنگ و بدل سنگ و بلب شکر

قاآنی نے اس صنعت کا زیادہ استعمال کیا ہی۔ نمونتاً ایک قصیدہ[1] کے چند شعروں پر اکتفا

[1] یہ قصیدہ ناصر الدین شاہ کی مدح میں ہی۔ صفحہ ۱۵۰ دیوان قاآنی مطبوعہ بمبئی ۱۳۱۲ھ

کیجاتی ہے۔ یہ پورا قصیدہ اسی صنعت میں ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قاآنی نے اس صنعت میں جو حُسن و خوبی پیدا کردی ہے اسکی نظیر دوسری جگہ ذرا مشکل سے ملیگی۔

فرو بگرفتہ گیتی را بباغ و راغ و کوہ و در
نم ابر و دم باد و تف برق و غو تندر

شخ از نسرین ہوا از سمن چمن از گل تل از سبزہ
حوصل بال و شاہین چشم و ہدہد تاج و طوطی پر

چو سیمین سرو من کش ہست روی و موی و چہر و لب
مہ روشن شب تارے گل سورے مئے احمر

دو ہاروت و دو ماروت و دو گلبرگ و دو مرجانش
پر از خاب و پر از تاب و پر از آب و پر از شکر

مرا ہست از غم و اندیشہ و فکر و خیال او
بقا مشکل دو پا در گل ہوا در دل ہوس در سر

صنعت ترجیع

دونوں مصرعوں میں ہموزن یا ہم قافیہ الفاظ کے استعمال کا رواج متقدمین کے آخری دَور یعنے ساتویں صدی تک اسدرجہ تھا کہ شاید ہی کوئی قصیدہ اس صنعت سے خالی ہوتا تھا۔ مثالاً ہم چند شعر عنصری کے نقل کرتے ہیں۔

رُخے چون نو شگفتہ گل ہمہ گلبن برنگ مُل
ہمہ شمشاد پر سنبل ہمہ بیجادہ پر شکر

برو از نیکوئی معنی بغمزا زجادوے دعوی
بچہرہ حجت مانی[1] بخوبی حاجت آزر[2]

شگفتہ لالہ رخسارہ حجاب لالہ جرّارہ[3]
بر از عاج و دل از خارہ تن از شیر و لب از شکر

زمن طاعت و زو فرمان ہمو زرق و ہم او حرمان
ہم او درد و ہمو درمان ہم او دزد و ہمو داور

سرشتہ رویش از رحمت ہمیدون گنج پر نعمت
رُخ از نور و خط از ظلمت لب از مرجان دل از مرمر

سمن بوے شبہ[4] موے بلاجوئے[5] جفاخوے
پریزادے پریروے پری چہرے پری پیکر

دلآرامے دلآرائے غم انجامے غم افزائے
نکو روئے نکو رائے بحُسن اندر جہان سرور

عنصری کا یہ قصیدہ امیر نصر بن ناصر الدین سبکتگین کی مدح میں ہے۔ یہ پورا قصیدہ اسی صنعت میں ہے۔ اسکو اس درجہ قبولیت عامہ حاصل ہوئی کہ قریب قریب کُل شعرا نے اسکی تقلید میں قصائد لکھے مگر سلمان ساوجی امیر خسرو اور قاآنی نے اس میں بہت سی خوبیوں کا اضافہ کیا اور اس کا حُسن

[1] ایک ایرانی پیغمبر اور مصور کا نام ہے ۱۲ [2] حضرت ابراہیم کے والد کا نام ہے جو بہت بڑے بت تراش تھے ۱۲ [3] زلف ۱۲
[4] سیاہ بوتہ ۱۲ [5] ایک نسخہ میں جفا گوئے (از جفا گفتن) بھی ہے ۱۲

دوبالا کر دیا۔ قاآنی نے بھی متقدمین کے تتبع میں یہ صنعت بہت برتی ہے۔ چنانچہ ایک قصیدہ کے جسمیں اوّل سے آخر تک اس صنعت کا التزام رکھا گیا ہے۔ چند شعر متذکرہ بالا ردیف و قافیہ کے ملاحظہ ہوں۔

چو سیمین سرو من کش ہست روی و موی چہر و لب — مہ روشن شب تاری گل سوری مئے احمر
برش دیبا فرش زیبا قدش طوبیٰ خدش جنت — تنش روشن خطش جوشن رخش گلشن لبش شکر
ز صنع ایزدی محو ند و مات و دائم و حیران — اگر لؤلؤ شا اگر ارژنگ اگر مانی اگر آزر
قوی حال و قوی یال و قوی بال و قوی بازو — جہان جوی و جہان گیر و جہاندار و جہان داور
کفش رنگین دلش سنگین خطش مشکین لبش شیرین — بخو توسن بر و سوسن بر رخ گلشن بتن مرمر
سمن خوی و سمن بوی سمن روی و سمن سیما — پری طبع و پری زاد و پری چہرہ و پری پیکر
حقائق خان دقائق دان معارک جو یلارکن زن — فلک پایہ گرانمایہ ہما سایہ ہمایون فر

نغمۂ رُوح

سیّد مقبول حسین صاحب احمد پوری

سُنا ہے روزِ محشر اک حسیں کا سامنا ہوگا — ہم اپنی جان سے جالیں تو پھر وعدہ وفا ہوگا
یہاں صبح ملال اور شامِ غم کی کلفتیں جھیلیں — وہاں پر باغ جنت حسرتوں کا خوں بہا ہوگا
نہ یہ ہوگا نہ وہ ہوگا محبت دل سے کہتی ہے — مٹا کر خود کو انساں آپ اپنا آشنا ہوگا
جمال اپنا ہر اک دیکھے گا اپنے حسنِ سیرت میں — وہاں ہر شخص کے پیشِ نظر اک آئینہ ہوگا
محبت حکمراں ہوگی محبت کا عمل ہوگا — نہ شکووں کی جگہ ہوگی نہ بے موقع گلا ہوگا
خود اپنے آپ کو نغمہ محبت کا سنائینگے — خود اپنی ذات پر حق عبودیّت ادا ہوگا
یہ دنیا آزمائش ہے اگر نبھ جائے انساں سے — تو اُٹھ جائے گا پردہ سامنے اپنے خدا ہوگا
فراق و وصل کی تصویر دوزخ اور جنت ہے — اگر ہے عشق کامل وصل کا بھی آسرا ہوگا
حسیں ہے گر دلِ انساں، غمِ روزِ جزا کیسا — خدا خود حُسن ہے بتلاؤ پھر وہ کیوں خفا ہوگا
اگر دل کی محبت ہے محیط ہر ابن آدم پر — خدا دل میں رہے گا کون کہتا ہے جدا ہوگا

اگر مقبول اپنا خون بہے انساں کی خدمت میں
تو وہ اُس حُسنِ کل کے ہاتھ میں رنگ حنا ہوگا

"سوگ"

سید ہاشم رضا صاحب

صبح ہوتے شمیم نے آخری سانس لی۔ ماں بیہوش ہو کر جوان بیٹے کی میت پر گری۔ بائیس برس کی محنت مٹی میں ملنے جا رہی تھی۔ بہن چیخ چیخ کر رونے لگی شمیم اسکو بہت چاہتا تھا۔ کنبے کی عورتوں نے کہرام مچایا کیونکہ مرنیوالا بڑا محبت شعار تھا۔

جس کا گھر اجڑا تھا وہ زمین پر خاموش ایک طرف بیٹھی تھی۔ نہ زبان پر نالے تھے نہ سینہ میں آہ۔ جب رونے کا پہلا شور ختم ہوا تو سب نے حیرت سے راشدہ کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں سے آنسو تک نہ نکلتے تھے۔ ایک عورت نے چپکے سے دوسری سے کہا "بہن۔ کیسا اندھیر ہے؟ شاید دنیا سے محبت اٹھتی جاتی ہے۔ جب میرا راج پاٹ لٹا تھا تو میں اتنا روئی تھی کہ آنسوؤں کے ساتھ آنکھوں کی روشنی بھی بہ گئی۔ ابتک دنیا کی چیزیں دھندلی نظر آتی ہیں۔ مجھے تو راشدہ کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے" "شاید اسے شمیم سے محبت نہ تھی"

تھوڑی دیر کے بعد ایک عورت اٹھی اور راشدہ کے بال پریشاں کر دیئے۔ اسکی کلائیوں میں وہ چوڑیاں تھیں جو اُسنے عید میں بڑے شوق سے پہنی تھیں، سب بیدردی سے توڑ ڈالی گئیں، مگر راشدہ اسیطرح بےحس بیٹھی رہی۔

رونا پھر شروع ہوا گھر سے آوازیں بلند ہوئیں لیکن ابکی بار بھی راشدہ کی آواز اُس ہنگام میں ہم آہنگ نہ تھی۔ لوگوں کا شک یقین کے درجہ تک پہنچ گیا شمیم کی ماں اب ضبط نہ کر سکی میت چھوڑی اور راشدہ کے پاس آئی۔

"غافل لڑکی تجھے کچھ خبر ہے؟ تیرا سہاگ لٹا اور تو یوں بےخبر بیٹھی ہے؟ اتار دے یہ گلابی دوپٹہ اتار دے اور لے یہ سفید چادر شمیم کفن اوڑھے اور تو اسکے لیے اتنا بھی نہ کرے شاید تجھے شمیم سے محبت نہ تھی مگر کنبے کی لاج کا تو خیال ہوتا۔ یہ انگوٹھی کیسی ہے؟ لا مجھے دیدے کہ اب تیری انگلیاں خالی رہیں گی" یہ وہ انگوٹھی تھی جو شمیم نے اسے شادی کی یادگار کے طور پر دی تھی۔ راشدہ اب بھی ویسی ہی بیٹھی رہی۔

لاش گھر سے اٹھ گئی اور سناٹا ہو گیا جتنی بیبیاں آئی تھیں شام تک اپنے اپنے گھر چلی گئیں اور دنیا کی ہنسی خوشی میں مشغول ہو گئیں جب شام کی تاریکی نے دنیا بھر کو گھیرا تو راشدہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ کمرہ میں گئی جہاں اسکی دو برس کی بچی سو رہی تھی۔ آہستہ سے پیشانی چومی کہ کہیں جاگ نہ جائے۔ پاس کی کوٹھری میں گئی اور سارے بدن پر مٹی کا تیل چھڑک لیا صحن کے ایک گوشے میں چراغ جل رہا تھا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں شمیم کا دم نکلا تھا۔ راشدہ لپکی اور چراغ کی لو کو دامن سے لگا لیا۔ آگ بھڑک اٹھی۔ . . . . .

کلامِ انیس و مزارِ انیس

جناب نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال کے نام نامی سے اُردو کی دُنیا بخوبی واقف ہے۔ آپ کا ایک نہایت ضروری مراسلہ مدیر ادب کے نام آیا ہے جو اس قابل ہے کہ تمام بہی خواہانِ اُردو کی نظر سے گذرے لہذا اُس کو شائع کر کے ہم ناظرین سے پُرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس مراسلہ کو غور سے پڑھیں اور اپنے ایک نہایت اہم فرض سے سُبکدوشی حاصل کرنے کیلئے عملی اقدام فرمائیں۔

"ادب"

عزیز مکرم = رسالہ ادب کے جون نمبر میں آپنے کلام انیس و مزار انیس کے متعلق مُلک و قوم کو متوجہ کیا اور اس ذکر میں ضمناً میرا نام بھی لیا ہے۔ اس کی نسبت کچھ کہنا چاہتا ہوں =

کلامِ انیس

سنہ ۱۹۱۳ء میں مجھے خیال ہوا کہ کارنامۂ انیسؔ کا ایک صحیح و مہذب ایڈیشن اس طرح اور اس پیمانہ پر شایع کیا جائے کہ مہذب دُنیا بھی اُسے ملاحظہ و مطالعہ کر سکے۔ اس لحاظ سے میں لکھنؤ گیا کہ وہاں اُس کی تصحیح کا اُسوقت بہترین موقع تھا۔ جناب مرحوم میر علی محمد صاحب عارفؔ اور جناب مکرم سید مہدی حسن صاحب احسنؔ سے مشورہ کیا گیا یہ دونوں صاحبان کلام انیسؔ کی تصحیح پر مستعد ہوئے۔ اور اُن کی توجہ سے تقریباً چھ مہینوں کی عرق ریزی کے بعد اُن مرثیوں کی قابل اعتبار تصحیح ہو گئی۔ عارفؔ مرحوم کی مُہر و دستخط لیکر مینے وہ مرثیے رکھ لیے۔

اس بڑے کام سے فارغ ہونے پر اَب اُن مراثی کے شائع کرنے کی فکر ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ یہ فرض مُلک اور گورنمنٹ کا ہے کہ ایسے کلام کو اپنے انتظام و اہتمام سے دُنیا کے سامنے پیش کرے۔ اس لحاظ سے میں نے ایک میموریل تیار کیا اور شملہ جا کر اُسے لارڈ ہارڈنگ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اس میموریل میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ اُردو، اہل ہند کی متفقہ زبان اور اس مُلک کا وہ تحفہ ہے جسے ہندو مُسلم اتحاد نے پیدا کیا اور انگریزوں نے جسکی پرورش و آبیاری کی ہے اور نیز یہ کہ انیسؔ اُردو کے وہ شاعر ہیں جنھوں نے نہ صرف اس زبان کو مہذب ہی بنایا بلکہ اپنے کلام کی بُنیاد اُس فلسفۂ اخلاق پر رکھی جسکی نظیر کتب الہامی کے سوا کہیں اور نہیں ملتی۔ اور عہد کٹوریہ کی وہ ایک ایسی ممتاز ہستی ہیں جو بکرما جیت کو بھی مُیسّر

نہ ہو سکی! اسلیئے اس مہذب گورنمنٹ کا یہ فرض ہو کہ اس کلام کو اپنی نگرانی میں شائع کرکے مُلک کو بلند نام کردے۔

وائسرائے پر اس تحریر کا خاص اثر پڑا اور بکمال توجہ اُنھوں نے اپنی ایک چٹھی کے ساتھ اس میموریل کو سر سنکرا نرائن (جو اُسوقت ایجوکیشن ممبر تھے) کے پاس بھیجدیا۔ اور مجھے ہدایت کی کہ اُن سے ملکر اس کا تصفیہ کروں۔ میں موصوف سے ملا۔ گفتگو ہوئی۔ وہ بھی متاثر ہوئے۔ طے پایا کہ گورنمنٹ اپنے خرچ سے کلام انیس کو شایع کرے۔ میں شملہ سے خوش خوش واپس آیا۔ اس معاملہ میں ابھی محکمۂ تعلیمات سے خط و کتابت جاری ہی تھی کہ دفعتاً جنگ یورپ چھڑ گئی۔ گورنمنٹ مالی مشکلات میں پھنسی اور اس عظیم الشان کام کا سرانجام نہ ہو سکا!

اسی دوران میں مجھے حیدرآباد جانا اور وہاں قیام کرنا پڑا۔ وہ تصحیح شدہ مراثی میرے ساتھ تھے۔ عزیزی مسٹر راس مسعود (سابق ڈائرکٹر تعلیمات حیدرآباد) کو اس کا علم ہوا۔ مجھسے اُنھوں نے اُن مرثیوں کے دیکھنے اور بعد کو سرکاری طور پر اُن کے شائع کرنے کا شوق ظاہر کیا۔ اُن عزیز سے کوئی چیز عزیز کیونکر ہو سکتی تھی۔ میں نے وہ مرثیے اُن کے حوالہ کر دیئے۔

اُسکے بعد ہی میں یورپ چلا گیا۔ واپسی پر علم ہوا کہ ریاست حیدرآباد نے کلام انیس شائع کیا ہے۔ خوشی ہوئی! لیکن لکھنؤ میں جناب مہاراجہ بہادر محمود آباد اور جناب احسن سے یہ سن کر کہ حیدرآباد سے جو مرثیے شایع کیئے گئے وہ مطبع نولکشور سے بھی زیادہ غلط اور مسخ ہیں۔ مجھے تعجب اور سخت رنج ہوا! معلوم ہوتا ہے کہ وہاں جن صاحب کے سپرد یہ کام کیا گیا اُنھوں نے اپنے علم و مذاق کے مطابق اُن مرثیوں پر قلم نسخ پھیرا اور شایع فرمایا ہے!

غرض وہ محنت یوں برباد گئی۔ اب نہ عارف پیدا ہوں گے اور نہ احسن و خیال کو پھر زمانہ اتنی فرصت دیگا کہ کلام انیس اس طرح تصحیح ہو کر شایع کیا جا سکے۔ اور جب تک یہ نہ ہو ایک ایسا کلام اگر سونے کے ورق پر اور جواہرات کے حروف میں بھی تحریر کیا جائے تو حاصل؟!

مزار انیس

ٹھیک زمانہ یاد نہیں مگر غالباً دس بارہ سال گذرے کہ میں لکھنؤ گیا۔ مزار انیس کی زیارت فرض تھی۔ وہ ادا ہوئی۔ افسردہ گیا تھا مردہ واپس آیا! وہ جگہ، جہاں ایک معلّم اخلاق اور رازدار فطرت دُنیا کا بہترین شاعر سو رہا ہے، ایسی نظر آئی کہ جس سے بدتر صورت خواب میں بھی دکھائی نہیں دے سکتی! کانپ اُٹھا۔ اتفاقاً اس کا ذکر نواب مرتضیٰ حسین خاں صاحب سے آیا۔ وہ خود متاثر تھے آخر

اُنھوں نے اُس زیارت گاہ کے از سر نو درست کرانے کا ارادہ کیا۔ ایک نقشہ تجویز ہوا۔ اور موصوف نے اپنی محنت و صرف سے ایک پلین بنوایا۔ معلوم ہوا کہ مزار کی تیاری میں بہت زیادہ صرفہ نہیں۔ لیکن چونکہ اس کام کو شخصی نہیں بلکہ مُلکی و قومی اہمیت دینا تھی اسلئے کسی ایک صاحب سے مدد لینا درست نہ تھا اسوجہ سے اُسکے متعلق متعدد حضرات سے ذکر کیا گیا۔ مگر چونکہ ہماری قوم عرصہ سے دُور از کار باتوں میں مبتلا رہ کر صحیح و درست کاموں کے سمجھنے کا مادہ کھو چکی ہے اسوجہ سے آرزو کے مطابق ہماری آواز پر بہت کم لبیک سنائی دی! اور آخر وہ نقشہ نواب صاحب موصوف کے پاس تحفۃ العجائب بنا ہوا انکی الماری میں بند کا بند رہ گیا!!

اب ادھر اسکے متعلق پھر ایک صدا بلند ہوئی ہے اور اس آواز میں آپ بھی شریک ہیں۔ ملک و قوم کی موجودہ حالت دیکھ کر گو میں عرصہ سے خموش ہو گیا ہوں اور یہاں کی فضا پر نظر کرکے کسی امر میں لب ہلانا پسند نہیں کرتا۔ لیکن چونکہ یہ کام بھی ایک فرض ہے اور تارک فرض گنہگار اسلیے اگر صحیح طور پر اور ایک معقول پروگرام کے ساتھ یہ کام شروع کیا جائے تو دیگر حضرات کے ساتھ اسمیں شریک ہونا میں اپنی عزت سمجھوں گا۔ والسلام

غزل

نواب جعفر علی خاں صاحب آثر لکھنوی

جوشِ طوفانِ حوادث موجبِ تسکیں ہوا ٹل گئی سر سے بلا کوئی تو دل غمگیں ہوا

نوبہارِ ناز میں تیرے تبسّم کے نثار دامنِ نظارہ رشکِ دامنِ گلچیں ہوا

مایۂ صبر و تواں رنگیں خرامی لے گئی رہزنِ ہوش و خرد وہ دامنِ پرچیں ہوا

اپنی اپنی جان کی اب خیر مانگیں بوالہوس سُن رہا ہوں دلنوازی حسن کا آئیں ہوا

جسکو کہتے ہیں خزاں شاید ہے تکمیل بہار دفتر گلزار کا اک اک ورق زریں ہوا

ذوقِ غم نا آشنائے شکوۂ بیداد ہے نالہ آتے آتے لب تک نغمۂ رنگیں ہوا

ذبح کے ہنگام یوں لپٹی گلے سے تیغ آثر
حلقِ بسمل سے بلند اک نعرۂ تحسیں ہوا

نقد و تبصرہ

فیض میر

سلطان الشعرا حضرت میر محمد تقی میر کے اسم گرامی سے کون ناواقف ہی؟ اُنھوں نے اُردو کی غزلیہ شاعری میں جو معجزے دکھلائے ہیں اُنکی نظیر لانے سے ابتک زمانہ قاصر ہی۔ درد و الم اور سوز و گداز کی جو تصویریں اُنھوں نے کھینچی ہیں وہ ہمیشہ اس قابل رہینگی کہ اُنھیں برابر کلیجہ سے لگائے رکھا جائے۔

"فیض میر" انہیں کے باکمال قلم کا نثری نتیجہ ہی جسے اُنھوں نے اپنے بیٹے "فیض علی" کیلئے فارسی میں لکھا تھا اور انہیں کے نام کی مناسبت سے اسکا نام "فیض میر" رکھا تھا۔ یہ چند حکایتوں کا مجموعہ ہی جن میں باکمال فقیروں کے واقعے لکھے ہیں۔ میر کو فارسی نثر لکھنے میں بھی کمال حاصل تھا۔ "نکات الشعرا" (تذکرہ میر) سے اُنکی فارسی نگاری کے جوہر کھل چکے تھے "فیض میر" اُن کی اعلیٰ فارسی انشاپردازی کا مزید ثبوت ہی۔ چھوٹے چھوٹے شستہ اور بامحاورہ جملوں میں الٰہیات و تصوف کے دقیق مسائل کو نہایت خوبی سے حکایتوں کے ضمن میں سمجھاتے چلے جاتے ہیں۔ میر نے اس رسالے میں جو حکایتیں لکھی ہیں اُنکا اس زمانہ میں اعتقاد بہت مشکل ہی۔ اُن میں بہت سی ایسی خوارق عادت باتیں آ گئی ہیں جنھیں میر کی خوش اعتقادی کا نتیجہ سمجھا جائیگا۔ تاہم اُنکا پڑھنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہمیں پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اُنھوں نے "فیض میر" مطبوعہ لباس میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ پروفیسر صاحب نے شروع میں ایک بصیرت افروز مقدمہ لکھا ہے جس میں اُنھوں نے اپنے مخصوص دلپذیر رنگ میں فیض میر کے متعلق بہت سی مفید چیزیں اور اس ضمن میں اور دوسرے ضروری اُمور لکھدئے ہیں اور پھر فیض میر کی فائدہ رسانی کا دائرہ وسیع کرنیکے لئے اُن حکایتوں کا اُردو میں خلاصہ بھی پیش کر دیا ہی۔ کاغذ نہایت اچھا ہی۔ لکھائی چھپائی بھی خوب ہی۔ قیمت ۱۲ ؍ ہمیں اُمید ہی کہ میر کے قدردان اس رسالے کو ہاتھوں ہاتھ خریدیں گے۔ ملنے کا پتہ:- "کتاب گھر" وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ۔

تاریخ الاُمت

حصۂ ہفتم - آل عثمان

مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں تاریخ اسلام کے معلم ہیں۔ آپ عرصہ سے تاریخ الاُمت

کی تدوین تالیف میں مصروف تھی۔ ہماری نظر سے اسکے ابتدائی چھ حصّے نہیں گذرے ہیں البتہ ساتواں حصّہ ریویو کے سلسلہ میں پڑھا ہے۔ اس میں فاضل مولف نے ٹرکی کے عثمانی حکمرانوں کے حالات مختصر طریقہ سے قلمبند کرنیکی کوشش کی ہے چونکہ مولف کا اس تالیف سے مقصد تعلیمی ہے علمی نہیں ہے اسلئے وہ بہت سی ضروری باتوں کی تفصیل نہیں کر سکے ہیں آخر میں مصطفےٰ کمال صدر اول جمہوریہ ترکیہ کے حالات بھی دیدئے ہیں اور عثمانی خاندان کے زوال کے اسباب پر بھی نظر ڈالی ہے عام طور سے عبارت سلیس ہے۔ یہ حصّہ ایکسو بیس صفحات پر حاوی ہے کاغذ اچھا ہے طباعت بھی معقول ہے قیمت عہ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعۂ قرول باغ دہلی۔

ہمارے رسُول

یہ جناب خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی کی ایک مختصر تالیف ہے جس میں جناب سرورِ کائنات کے سوانحی حالات اجمال کے ساتھ درج کئے گئے ہیں یہ رسالہ میسور کے نصاب میں داخل ہے پنجاب و ریوپی کے اسلامیہ مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس کا پہلا اڈیشن ختم ہوچکا ہے۔ کہیں کہیں مذہبی اعتقاد کی جھلک پیدا ہوگئی ہے۔ عبارت صاف اور سلجھی ہوئی ہے۔ پہلے قیمت ۸ رکھی تھی اب ۶ کر دی گئی ہے۔ اسکا حجم چھوٹی تقطیع کے اسی صفحات کا ہے کاغذ اچھا ہے کتابت و طباعت بھی معقول ہے۔ مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی سے مل سکتا ہے۔

طریق النجات فی ترجمۃ الصحاح من المشکوٰۃ

جناب ابو محمد ابراہیم بن حکیم عبدالعلی مرحوم ساکن آرہ ضلع شاہ آباد نے عوام مسلمین کی فائدہ رسانی کا مقصد پیش نظر رکھتے ہوئے صحیح بخاری و صحیح مسلم کی ضروری حدیثوں کا ترجمہ نہایت سلیس اردو میں لکھا ہے۔ اس کتاب کے چار حصّے ہیں اور ان میں سُنّی فقہ کے قریب قریب ضروری مسائل آگئے ہیں۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے۔

پہلی جلد ایکسو چالیس صفحات پر مشتمل ہے اس کی قیمت فی جلد ۱ر ہے۔ دوسری جلد کے ۸۴ صفحے ہیں قیمت ۸ تیسری جلد ۱۲۲ صفحات پر حاوی ہے قیمت ۹ ر ہے چوتھی جلد میں دو سو چالیس صفحات ہیں اور قیمت عہ ر ہے۔

ملنے کا پتہ اسٹار بک ڈپو نمبر ۴۸ لوئر سرکلر روڈ کلکتہ۔

"قاضی محمود بحری" اور "سُکھ سہیلا"

زمانۂ موجودہ کا اقتضا ہے کہ اگر ادبیات عالم میں اردو کو کوئی امتیازی حیثیت دلوانا ہو تو ادب اردو کے متعلق انگریزی میں مضامین لکھے جائیں۔ محمد حفیظ سید صاحب ایم اے ایل ٹی پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی یہ خدمت برابر انجام دیتے رہتے ہیں اور انکی یہ کوششیں ہی خواہان اردو کے نزدیک نظر استحسان سے دیکھنے کے قابل ہیں۔

مندرجۂ بالا دونوں رسالے بھی سید صاحب نے انگریزی زبان میں لکھے ہیں۔ ان میں علی الترتیب دو قدیم

دکنی شاعروں قاضی محمود بحری اور شاہ برہان الدین جانم شمس العشاق اور انکی تصنیفات کا حال نہایت تحقیق سے لکھا گیا ہے۔ اور انکی ایک ایک صوفیانہ نظم "بنگاب نامہ" اور "سکھ سہیلا" کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے "بنگاب نامہ" کے مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی لگادی گئی ہے۔ "اور سکھ سہیلا" کو کئی قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے اسکا اصل دکنی متن بھی دیدیا گیا ہے۔ قدیم دکنی نظموں کے صحیح پڑھنے اور سمجھنے کیلئے بقدر محنت اور استقلال کی ضرورت ہے کہ ایسے کام سید صاحب ہی کے سے علم دوست اور مستقل مزاج لوگ انجام دیسکتے ہیں جن لوگوں کو ادبی تحقیق کا ذوق ہے وہ ان رسالوں کو یقیناً بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ سید صاحب ایسے ہی تحقیقی مضامین سے اردو کو مستفیض فرماتے رہیں گے۔

"گلشن گفتار" مرتبہ سید محمد صاحب ایم اے

یہ اردو شاعروں کا ایک مختصر تذکرہ ہے جس کو ایک غیر معروف دکنی شاعر خواجہ خاں حمید نے ۱۱۶۵ھ میں تالیف کیا۔ اردو شعرا کے تذکروں کی تاریخ میں اس سن کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ اسی سن میں میر تقی میر اور فتح علی گردیزی نے بھی ایک ایک تذکرہ لکھا۔ اور ابتک اس سے پہلے کا کوئی تذکرہ دستیاب نہیں ہوا۔

"گلشن گفتار" کا مولف خود ایک دکنی شاعر ہے اس لئے شعرائے دکن کے متعلق اس کے بیانات اوروں سے زیادہ معتبر ہیں۔ "گلشن گفتار" کو اس لحاظ سے بھی خاص اہمیت حاصل ہے کہ یہ سب سے پہلا تذکرہ ہے جو دکن میں تالیف ہوا۔ سید محمد صاحب نے اس کتاب کو تالیف کر کے یقیناً اردو زبان کی ایک خاص خدمت انجام دی ہے جس کے لئے وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

لائق مرتب نے حاشیہ پر ہر شاعر کا حال متعدد قدیم تذکروں سے نقل کر کے اسکے متعلق تمام معلومات یکجا کردئے ہیں جس سے اس کتاب کا مطالعہ بہت زیادہ مفید ہوگیا ہے۔ شروع میں چودہ صفحوں کا ایک مقدمہ بھی ہے جس میں شعرائے اردو کے قدیم تذکروں اور مولف "گلشن گفتار" کے متعلق ضروری معلومات فراہم کردئے گئے ہیں۔

"گلشن گفتار" کے مرتب مولوی سید محمد صاحب ایم اے دکن کے ان نوجوانوں میں ہیں جن سے ادبی تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے کی توقع کیجاتی ہے۔ اس سے پہلے بھی موصوف کی ایک نہایت مفید کتاب "ارباب نثر اردو" کے نام سے شایع ہوچکی ہے جس میں فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں اور ان کی تصنیفوں کا مفصل حال درج ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ موصوف اپنی ایسی مفید تالیفوں سے اردو کو مالامال کرتے رہیں گے۔

کتاب مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے۔ حجم ۹۰ صفحے اور قیمت ۱۲ر ہے۔

خمخانۂ خلد یا بوستانِ رشید

ہندوستان میں ایسا کون ہوگا کہ مرثیہ سے دلچسپی رکھتا ہو اور حضرت رشید مغفور کے نام نامی سے واقف نہو آپکا کلام ملک کے گوشہ گوشہ سے خراج تحسین وصول کرچکا ہے میر انیس آپکے حقیقی نانا اور عشق و تعشق آپکے حقیقی چچا تھے چنانچہ حضرت رشید نے الفاظ و محاورات کی صحت میر عشق سے مضامین کی نزاکت میر تعشق سے اور زبان کی سلاست میر انیس سے گویا وراثتاً پائی تھی۔ مرثیہ کی طرح غزل گوئی میں بھی آپکا شمار اساتذۂ فن میں تھا۔ آپکی غزل میں حضرت تعشق لکھنوی کی غزل گوئی کا رنگ جھلکتا ہے اور وہ تمام محاسن پائے جاتے ہیں جنکا ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ رباعیاں بھی آپ خوب کہتے تھے بالخصوص پیری کے حال میں جو کثیر التعداد رباعیاں کہی ہیں وہ اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ سلام بھی آپنے ایسے ایسے کہے ہیں کہ اُن کے بہت سے شعر لوگوں کی زبان پر ہیں اِس مختصر تبصرہ میں اتنی گنجایش نہیں ہے کہ آپکے کلام یا ہر صنف سے کچھ مثالیں پیش کیجائیں اس لیے صرف سلام کے چند شعر لکھے جاتے ہیں انھیں سے حضرت رشید مغفور کی شاعری کا اندازہ کیا جا سکے گا ؎

میرے گناہ تولتی ہے رحمتِ خدا — قدسی الگ کھڑے ہیں ترازو لیے ہوئے

خیمہ سے لاش لیچلے اکبر کی جب حسینؑ — ماں در تک آئی ہاتھوں پہ گیسو لیے ہوئے

جنس ثواب بکتی ہے بازار حشر میں — ہم بھی کھڑے ہیں تھوڑے سے آنسو لیے ہوئے

مرثیہ گوئی تو آپ کا خاص فن ہی تھا۔ اسی صنف سخن میں آپکا کمال پورے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ ساقی نامہ جو عہد موجودہ میں مرثیہ گوئی کا نہایت اہم جزو ہو گیا ہے اسکی ایجاد کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ مرثیہ میں مضامین بہاریہ کو معراج کمال پر پہنچانا آپکا وہ کارنامہ ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انھیں خوبیوں کی بنا پر مرثیہ کے شایق حضرات آپکے کلام کی تلاش میں رہتے اور ایک ایک مرثیے کی نقل بڑی بڑی قیمتیں دیکر حاصل کرتے ہیں۔ قدر دانان کلام رشید کو مرحوم کے نواسے اور شاگرد رشید جناب شدید کا شکرگذار رہنا چاہیے کہ انھوں نے حضرت رشید کے مرثیوں کو مرتب کرکے شائع کرنا شروع کیا ہے۔ پہلی جلد شایع ہو چکی ہے مرثیے مستند نسخوں سے نقل کیے گئے ہیں مگر افسوس ہے کہ کتابت کی غلطیوں سے بالکل پاک نہیں ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ جناب شدید آئندہ جلدوں میں تصحیح کی طرف اس سے زیادہ توجہ فرمائینگے۔ بہرحال یہ جلد اس قابل ہے کہ مرثیوں کے شایق اُسے ہاتھوں ہاتھ خریدیں۔

حجم ۲۰۰ صفحے۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ :۔ مطبع نور الاسلام رکابگنج۔ باغ میر عشق۔ لکھنؤ۔

حسن و عشق

پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی

پردہ دار ہستی تھی ذات کے سمندر میں
حسن خوب کھل کھیلا اس صفت کے منظر میں

حسن عشق میں ہے یا عشق حسن میں مضمر
جوہر آئینہ میں یا آئینہ ہے جوہر میں

عشق محشر آرا کی طور پر گری تجلی
حسن لن ترانی کی رہ سکا نہ چادر میں

خاک دیر و کعبہ کی خوب چھان لی تو نے
اب ذرا جھکا کر سر دیکھ من کے مندر میں

دیکھ اے تماشائی گل ہے رنگ و بو بالکل
امتیاز نا ممکن ہے عرض سے جوہر میں

گل میں اور بلبل میں کون جانے کیا گزری
چشم پوش مستی تھی اس برہنہ منظر میں

اونچی بناتے ہیں حسن کو سخن گو کیوں
کاٹ ان اداؤں کا کب ہے تیغ و خنجر میں

حسرت اور ارماں کی ہو کہاں سے گنجائش
ہے وہی مرے دل میں ہو رہی ہے جو سر میں

فرط سوز الفت میں دیکھ کر سکوں دل کا
بجلیاں مچلتی ہیں بادلوں کے محشر میں

چارہ گر کو حیرت ہے ارتقائے وحشت سے
پانو میں جو چکر تھا آ رہا ہے وہ سر میں

ہوں وہ رند یا صوفی مست اسکی دھن میں ہیں
جانے کتنے میخانے بھر دیے ہیں کوثر میں

چرخ کیا اتر آیا آج فرش گیتی پر
رند بھی ہیں چکر میں میکدہ بھی چکر میں

مے وہ ہوش بر افگن اور نظر وہ صہبا پاش
مست کیوں نہ ہو کیفی ایک وہی ساغر میں

"ارشادات"

حضرت صفیؔ لکھنوی

دیں بھی جواب خط کہ نہ دیں کیا خبر مجھے — کیوں اپنے ساتھ لے نہ گیا نامہ بر مجھے
تھا سازِ اضطراب جو سوزِ جگر مجھے — سمجھی شبِ فراق چراغِ سحر مجھے
سُرمہ ہیں چشمِ دل کے لئے تلخ تجربے — پیری نے کر دیا ہے وسیع النظر مجھے
وہ کون ہیں جنھیں ہوسِ عمرِ خضر ہے — طُولِ امل ہے زندگیٔ مختصر مجھے
مُنعم سے کہہ دو اوسطِ فقر و غنا ہے ایک — اس کو ملا ہے زر تو متاعِ ہُنر مجھے
انصاف اُٹھ گیا تو کرے کون فیصلہ — بیجا شکایتیں اُدھر اُن کو اِدھر مجھے
پہونچا پیام دوست کا دُشمن کی معرفت — بھیجی کسی نے زہر ملا کر شکر مجھے
دورانِ زندگی میں تو ہی نے دیا جواب — افسوس کام کے نہ ملے ہم سفر مجھے
سرگرم گفتگو ہے لحد سے یہ میری خاک — تجکو دہانِ خُشک ملا چشمِ تر مجھے
ساغر میں جب شرابِ مُقطّر نظر پڑی — یاد آ گئی تراوشِ خونِ جگر مجھے
سرمایہ دارِ دولتِ کونین کر چکا — دے کر دلِ پُر آبلہ مشتِ گہر مجھے
بھرتا رہوں کہاں تک الٰہی میں آہِ سرد — محجوب کر نہ اے نفسِ بے اثر مجھے
اپنے چمن کے پھولوں میں کانٹوں کا رنگ ہے — اچھا ریاضتوں کا ملا یہ ثمر مجھے
ہے یہ شکستِ شیشۂ دل کی صدا بلند — زلفوں نے لا کے چھوڑ دیا تا کمر مجھے
طرزِ شاک پر ہوں کسی کے مٹا ہوا — سب جانتے ہیں نقشِ سرِ رہگذر مجھے
کہتی ہے دل کے درد میں آواز ڈوب کر — ناحق اُبھارتا ہے فریبِ اثر مجھے
ہنگامِ نزع پھر نہ رہی کوئی آرزو — جب تم نے آ کے دیکھ لیا اک نظر مجھے
عقدے تعلقاتِ عناصر کے حل ہوئے — دخل اس نظامِ دہر میں تھا کس قدر مجھے

دل دیدیا صفیؔ مگر اس کی خبر نہ تھی
پینا پڑیگا ہجر میں خونِ جگر مجھے

"تجلیات"

حضرتِ ثاقب لکھنوی

میں وہ ہوں جس کا زمانے نے سبق یاد کیا
غم نے شاگرد کیا پھر مجھے اُستاد کیا

حُسنِ جانسوز نے وحدت میں مجھے یاد کیا
میں یہ سمجھا کہ مجھے عشق نے برباد کیا

جس جگہ کھائی تھی ٹھوکر وہیں تربت تھی مری
بھُولنے والے نے مشکل سے مجھے یاد کیا

نہیں معلوم وہ میں ہوں کہ کوئی اور اسیر
سُن رہا ہوں کہ گرفتار کو آزاد کیا

میری آہوں کی ہوا دُل میں نہ آجانا تم
یہ وہی ہیں کہ جنھوں نے مجھے برباد کیا

ناتوانی میں گرے تھے جو لہو کے قطرے
میں تو بھُولا ہوا تھا دل نے بہت یاد کیا

دل تھا وہ موت رہا کر گئی جسکو بس مرگ
میں تھا وہ جس کو کسی نے بھی نہ آزاد کیا

جتنے شکوے ہیں تجھی سے ہیں کہ اس عالم میں
مجھکو بُلبُل کیا صیّاد کو صیّاد کیا

حشر میں زخموں کو از بر ہے ابھی قصۂ ظلم
کون کہتا ہے کہ بھُولے ہوے کو یاد کیا

راستا چلنے کے قابل نہ رہا اے ہمدم
میں نے منزل پہ نیا مرحلہ ایجاد کیا

میں تو چیونٹی کے کچلنے سے حذر رکھتا تھا
پھر مجھے کس نے تہِ زانوے جلّاد کیا

اتنا زندہ رہے ہم جس سے کھلیں معنی موت
صبحِ ایجاد میں قصدِ عدم آباد کیا

بُو نکلنے لگی غنچوں سے تو پھر ڈر کس کا
یہ خبر سچ ہے تو صیاد نے آزاد کیا

قبل از وقت پھنسا دام میں اور پھنستے ہی
جو تمنّا یہاں لائی تھی اُسے یاد کیا

عالمِ حُسن ہے وہ نقشِ معانی ثاقب
جو مری طبعِ خداداد نے ایجاد کیا

خالص اُردو

حضرتِ آرزو لکھنوی

آرزو کی جو غزلیں بعض خاص قیود کے ساتھ رسالۂ ادب میں شایع ہو رہی ہیں اُنکے متعلق ادب کی کسی گذشتہ اشاعت میں لکھدیا گیا تھا کہ اُنمیں کوئی لفظ غیر ہندی استعمال نہیں کیا جائیگا۔ اب جناب آرزو نے اپنے ایک مراسلہ میں وہ قیود وضاحت سے لکھ بھیجے ہیں جو مختصراً بیان کیے جاتے ہیں۔ "ادب"

۱- بالعموم ہندی الفاظ استعمال کیے جائینگے لیکن وہ بھی جو ٹکسالی اُردو کا جزو ہو چکے ہیں۔ ۲- جو غیر ہندی الفاظ صورتاً یا معناً یا دونوں طرح اپنی اصل سے ہٹ گئے ہیں اُردو کے حکم میں داخل سمجھے جائینگے۔ ۳- وہ ہندی الفاظ جو انفراداً اُردو میں داخل نہیں ہیں اور وہ غیر ہندی الفاظ جو اپنی اصل پر قائم ہیں جب کسی محاورہ کا جزو ہو جائینگے تو داخل اُردو سمجھے جائینگے۔ ۴- جو الفاظ ہندی اور غیر ہندی میں مشترک ہیں اُن سے احتراز نہ کیا جائیگا

گذشتہ پرچے کی غزل میں ایک مصرعہ تھا "کچھ دُور نہیں وہ بھی جس دن پہ کہ ٹالا ہے" اُس میں لفظ "دُور" پر گرفت کی جاسکتی تھی لیکن اب جناب آرزو نے تحریر فرمایا ہے کہ وہ مصرعہ یوں ہونا چاہیے تھا۔ "آنے ہی کو ہے وہ بھی جس دن پہ کہ ٹالا ہے"۔

پانی میں آگ دھیان سے تیرے بھڑک گئی — آنسو میں کوندتی ہوئی بجلی جھلک گئی
کب تک یہ جھوٹی آس کہ اب آئے وہ اب آئے — پلکیں جھکیں، پپوٹے تنے۔ آنکھ تھک گئی
ندی بھی آنسوؤں نے بہا دی تو کیا ہوا — کھولن جو تھی لہو میں نہ وہ آج تک گئی
دونوں کو ایک کرتی ہی بڑھ کر لگی کی لاگ — اُٹھی یہاں سے آنچ وہاں تک لپک گئی
یہ دن دہاڑے سامنے کون آگیا کہ دھوپ — پڑتے ہی چھاؤں کانپ کے پیچھے سرک گئی
کھلنا کہیں چھپا بھی ہے چاہت کے پھول کا — لی گھر میں سانس اور گلی تک مہک گئی
آنسو رکے تھے آنکھ میں دھڑکن کا ہو بُرا — ایسی تکان دی کہ پیالی چھلک گئی
میری سنک بھی بڑھتی ہی اُن کی ہنسی کیساتھ — چٹکی کلی کہ پاؤں کی بیڑی کھڑک گئی

جسنے اُڑا دی راتوں کی نیند اور دن کا چین
جی سے نہ پھر بھی آرزو اُسکی للک گئی

آثار ادبیہ

مرزا دبیر مرحوم کے لکھے ہوئے چند آداب و القاب

(گذشتہ سے پیوستہ)

(پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے)

جناب منشی صاحب مخدوم و مکرم مصدر عنایت اتم مرکز دائرہ اخلاق مجسم عنوان صحیفہ اشفاق معظم زاد الطافکم
بعد سلام سنت الاسلام و اشتیاق لقائے فرحت انتما مشہود رائے تودد آرا نمودہ می آید۔

بعد سلام مسنون الاسلام و اشتیاق مالا یطاق مشہود ضمیر اشراق تنویر نمودہ می آید۔

شوق مشتاق آرزو مشتاق جاں مشتاق تست　　　چشم مشتاق آشکارا دل نہاں مشتاق تست

ورود عنایت صحیفہ الطاف آمود شکوہ ریاد آوریہا فرمود شکایت فراموشیہا مانند راہ دور و دراز طولانی بود مگر مضامین تردد آگینش بیکحرف سر نمود بلکہ بدریافت حال ملازمان خیلے تردد افزود و دامن دل را بغبار ملال آلود جناب باری ملازمان را مطمئن فرماید

جناب منشی صاحب مظہر عنایت اعم مصدر عطوفت اتم ذو المجد و الکرم زاد الطافکم۔ عارض صفحہ را از غازہ سواد سلام سنت الاسلام آراستہ و شاہد اشتیاق مالا یطاق را بزیور ارقام پیراستہ مشہود رائے مہر انجلا نمودہ می آید کہ عنایت صحیفہ رافت طراز ورود فرمود ابواب بہجت و سرور کشود فی الواقع درینولا بسبب دریافت اخبار اخبار ملازمان نواب مرزا احمد صاحب جداگانہ شبدیز قلم بمیدان نیاز نامجات ندوید مگر یاد می آید کہ اعجاز نامہ عالی کہ رسید در تحریر جوابش تاخیر ہم نگردید کوائف ایذا رسانی معاندان سامعہ محبت را خراشید

جناب منشی صاحب معنی مصاحب لوح صحیفہ اخلاق عنوان انشاء اشفاق قام بنیا نکم العالی ما دامت الایام

واللیالی۔ بعد خامہ تراشی با سید سامعہ خراشی اظہار مطالب ضروریہ می نماید کہ در قطعہ سحاب رحمت و احسان اعنی دو الطاف نامۂ کرامت توامان یکے عین نظر باشارت و دیگرے نور روز در بشارت متقدم و موخر سراپا مفتخر دیدہ مہجور را نورے و دل رنجور را سرورے بخشیدہ۔ و دویکے ایں دو مکرمت نامہ حرفے داخل و فتر وصول نگردیدہ ورنہ ممکن نبود کہ ایں سراپا اشتیاق جواب الطاف نامجات تحریر نمی نمود۔

جناب منشی صاحب اخلاص مصاحب بسم اللہ انشائے مکرمت و امتنان دیباچہ بیاض عنایت و احسان دام مجدہم بعد سلام خلوص انضمام و آرزوئے مواصلت کثیر البہا ہجت مرفوع ضمیر صفا تخمیر باد۔

بعد سلام تودد انضمام و اشتیاقیکہ در تحریرش زبانہا کوتاہ و قلمہا عذر خواہ مشہود ضمیر تودد تخمیر نمودہ می آید۔

جناب منشی صاحب عنوان صحیفۂ اخلاص بسم اللہ۔ دیباچۂ اختصاص دام شانکم و قام بنیانکم۔ بعد خامہ تراشی بقصد سامعہ خراشی ابتدائیش بسلام خلوص انضمام و انتہائے آں بدعائے حصول مرام می نماید۔

جناب منشی صاحب عالیمرتب معالی مناقب سرفراز فرمائے بست ہمتان قدر افزائے کم حمیتان دام مجدکم۔ بعد سلام خلوص انضمام و تمنائے ملازمت عشرت التزام مرفوع ضمیر صفا تخمیر می گرداند۔

جناب منشی صاحب مصابرت مصاحب سالک مسالک تسلیم و رضا عارج معارج امتحان و ابتلا دام شانکم سلامیکہ فاتحہ مصحف الاسلام ہست بمجلس تعزیت خواہر زادہ مرحوم آں مخدوم خواندہ و دعائیکہ حرز بقائے عنصر شریف و متعلقان آں و الا شانست بگوش اجابت رسانده مرفوع رائے تحمل آرا می گرداند بمعائنہ حقیقت جانگزا و مشاہدہ عبارت ہوش ربا یعنی مضامین رحلت خواہرزادہ جناب عجب اضطرارے و انتشارے لاحق حال داعی گردید لیکن ازانجا کہ گلہائے حیات روزگار از تخم بے ثباتی مستعار آفریدہ اند چارہ بجز صبر و شکیبائی ندیدہ چار و ناچار تحمل برایں بلا و توکل بذات خدا نمودم و بخدمت سامی نیز گذارش میدہم کہ مصداق آیۂ انی ہذا

وَاللہ مَعَ الصّابرین۔ رنج و غبار را مبدل بہ تسلیم و رضا فرمایند و نظر بر واقعات جناب سید الشہدا علیہ التحیتہ والثنا نمایند۔

عالیجناب کرامت انتساب بسم اللہ دیباچہ عز و جلال خطبہ صحیفہ فضل و کمال۔ سلامیکہ قفل تمنیات را انفتاح و نیازیکہ انجمن مرادات را مصباح بتائید خالق المساء والصباح می باشد ہدیہ محفل عشرت منزل نمودہ کاشف مدعا ہستم عرصہ بعید سیگذرد کہ صحیفہ شریفہ فرح بخش خاطر نیاز آگین نگردیدہ و بدل سطور شرمہ نور بصارت بدیدہ انتظار نکشیدہ

بعد سلامیکہ قندیل فلک اسلام است مشہود رائے تو دو دبیر اگر دانیدہ می آید۔

جناب کمالات انتساب صدر نشین انجمن صدق و صفا نقش نگین انگشتر مہر و وفا۔ بعد اہدائے تحف گلدستہ سلام خلوص انضمام کہ گل ہمیشہ بہار چمنستان اسلام و ارمغان گلگشتگان بوستان شریعت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام است مرفوع ضمیر بیضا نظیر باد شمع نامہ بفانوس لفافہ جلوہ افروز انجمن وصول گردیدہ۔

جناب مرزا صاحب اقتدار مصاحب معنیٔ لفظ مہر و وفا و لفظ معنی صدق و صفا۔ سلام خلوص انضمام کہ تعویذ صحت و سلامت جہت ارباب اضطرار و دعائے تاثیر انتما کہ فردہ خیر و عافیت برائے اصحاب افکار است اہدائے دولت خانہ تسلی آستانہ نمود بلکہ بعہدۂ دربانی قدرش افزودہ قفل رقم مقصود بمفتاح قلم مسعود مفتوح مینمایم۔

بعد تمہید سلام مسنون الاسلام و تسوید مراتب تمنائے تو دد الالتیام عقدۂ مرام و گرہ از کلام میکشاید۔

بعد بسط بساط سلام سنت الاسلام و مراتب اشتیاق مالا کلام مشہود ضمیر تو دد تخمیر نمودہ می آید آداب و القاب کہ برایں عاصی ارقام فرمودہ بودند:۔

عزیز از جان سعید دو جہان قرۂ باصرۂ محبت نور حدقۂ قابلیت زاد عمرہٗ۔

بعد دعائے حصول مطالب ذیل مآرب واضح ولائح باد۔

بیرایۂ سعادت وسرمایۂ رشادت سلمکم اللہ تعالیٰ
بعد سلام مسنون الاسلام دادعیۂ صحت امزجہ خرد و کلاں مطالعہ نمایند۔

خطیب منابر فصاحت عندلیب حدایق بلاغت برگزیدۂ کونین سلمک اللہ الخافقین

طوطیٔ شکرستان فصاحت عندلیب چمنستانِ بلاغت سعید کونین

عندلیب بوستان محبت واتحاد بلبل چمنستان مودت وودا د
بعد اہدائے ہدیۂ گلدستۂ سلام کہ گل ہمیشہ بہار گلزار اسلام است مکشوف ضمیر عطوفت تخمیر باد۔

میر اُنس لکھنوی کی دو غیر مطبوعہ رُباعیاں

ہم کو یہ رباعیاں سید محمد جواد صاحب شکیل نبیرۂ میر رحیم مرحوم سے دستیاب ہوئیں جس کے لیے ہم موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

کسی رئیس کی مدح

جب تک ہی جہاں میں نسل آدم قائم ۔۔۔ جب تک عرض وسما ہیں باہم قائم
ہی شمس و قمر میں نور جب تک باقی ۔۔۔ یارب رہے یہ رئیس اعظم قائم

کربلائے معلیٰ پہونچنے کی خوشی

قسمت جو رسا ہوئی تو یاں تک پہنچا ۔۔۔ فرق تو قمر آسماں تک پہنچا
چرچا ہی شہر میں یہ گھر گھر ہوگا ۔۔۔ لو اُنس بھی اب اُس آستاں تک پہنچا

دنیا کے ڈاکٹر اور حکیم - وید سب نے متفق ہو کر مان لیا ہے، کہ
پیٹ کی خرابی کی وجہ سے بہت سے امراض پیدا ہوتے ہیں چنانچہ
موت کا علاج
تو ہے نہیں، مگر
وہ بیماریاں جو پیٹ کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً پیٹ کا درد - پیٹ پھولتا ہو - بدہضمی سے قبض ہو جائے - یا
پتلا پاخانہ آئے - کلیجہ میں درد رہتا ہو - کھل کر بھوک نہ لگتی ہو - کھٹی ڈکار آتی ہو - طحال (پلہی) ہو گیا ہو - تلی
بڑھ گئی ہو - معدہ کمزور ہو جانے کی وجہ سے کھانا ہضم نہ ہوتا ہو - پتلا پاخانہ آتا رہتا ہو - پیشاب زیادہ آتا ہو
یا پیشاب تھوڑی تھوڑی دیر پر ذرا ذرا آتا ہو (جس کو ذیابیطس کہتے ہیں) یہ سب بیماریاں نئی ہوں یا زیادہ
دن کی پرانی - سب کو فوراً رفع کر دیتا ہے - اس لئے آپ سے سفارش کیجاتی ہے کہ آپ ایک شیشی ضرور اپنے
پاس رکھئے - اور اچانک بیماریوں کیلئے عرق اکسیر اعظم تجربہ کار ڈاکٹر اور حکیم کا کام دیتا ہے۔
سینکڑوں بزرگوں نے تو اسے اپنے گھر کا ڈاکٹر مان لیا ہے - چنانچہ بطور سند ایک بزرگ کا خط آپ ملاحظہ فرمایئے
شانِ کبریائی دیکھئے
جناب شاہ محمد فضل امام صاحب شاہ آباد آرہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ جناب کو یاد ہو یا نہ ہو میں قریب ایک سال سے
جناب کی دوا عرق اکسیر اعظم منگا کر اپنے یہاں ہر چھوٹے بڑے مرض میں استعمال کرا رہا ہوں -
اللہ کی شان ہے کہ جسکو دوا دیجاتی ہے - فوراً مرض سے اسے نجات ہو جاتی ہے سبحان اللہ دوا کیا ہی طلسم ہے
خداوند تعالیٰ موجد کو دنیا اور آخرت میں سرخرو فرمائے آمین ثم آمین -
عرق اکسیر اعظم کا شہرہ یہاں آرہ میں بہت ہی - ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ میں نے آپکے یہاں سے ۳ شیشی اکسیر اعظم کی
منگائی تھی مگر دوا ختم ہو گئی - لہٰذا براہ کرم چھ شیشی عرق اکسیر اعظم کی جلد روانہ فرما کر مشکور کیجئے
عرق اکسیر اعظم رجسٹرڈ
قیمت فی شیشی ایک روپیہ تین شیشی کی قیمت دو روپیہ بارہ آنے - محصول علاوہ
فرمائش کے وقت رسالہ ادب کا حوالہ دیجئے
پتہ ملنے کا ایس - اے - بی - حسینی - اینڈ کمپنی - کوٹھی نمبر ۲ کولوٹولہ اسٹریٹ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴ کلکتہ

اَدَب

مُرتّبۂ

سیّد اعظم حسین

جلد ۲ بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۳۰ء نمبر ۱۱

بزمِ ادب

ہم جانتے ہیں کہ "ادب" کچھ وقت سے پہلے نکلے اور نہیں نکلتا۔ وہ کتابت و طباعت کی غلطیوں سے پاک بھی اور نہیں رہتا۔ یہ صورتِ حال کیوں ہے؟ بات یہ ہے کہ "ادب" کا پہلا پرچہ چند خادمانِ ادب اور محذدانِ "ادب" کے اتفاقی ارادہ کا فوری نتیجہ تھا۔ نہ پہلے سے کوئی مضمون تھا نہ کتابت طباعت وغیرہ کا تجربہ جلدی جلدی مضمون لکھے گئے۔ کاتب تلاش کیا گیا۔ مطبع تجویز ہوا اور "ادب" کا پہلا پرچہ نکل آیا۔ کئی مہینے تک یہی حالت رہی آخر "ادب" نے دوسرے مضمون نگار حضرات کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا اور ہمکو بھی یہ موقع حاصل ہوا کہ ہم ایک مہینے میں دو نمبر چھپوالیں اور آئندہ اطمینان سے کام کر سکیں لیکن ملیریا کی دستدرازیوں نے سارے شہر کے ساتھ کبھی اڈیٹر کو کبھی منیجر کو کبھی کاتبوں کو کبھی مطبع والوں کو اپنا شکار بنائے رکھا۔ مختصر یہ کہ ہمارا ارادہ پورا نہ ہوسکا اور جس جلدی کیساتھ "ادب" کا پہلا پرچہ نکالا گیا تھا اس سے ابتک نجات نہیں ملی۔ حالت یہ ہوتی ہے کہ اکثر مہینہ کی بیس بائیس تاریخ تک کاپیاں لکھکر ملتی ہیں جو جلدی جلدی صحیح کرکے پریس میں فوری طباعت کی درخواست کے ساتھ بھیجدی جاتی ہیں۔ وہاں سے پروف کے ساتھ ایک جلد باز آتا ہے جو ہر منٹ پر یاد دلاتا رہتا ہے کہ اگر پروف جلدی نہ دیکھے گئے تو پرچہ اس ہفتہ میں نہ چھپ سکیگا۔ بھلا ایسی صورت میں پروف پڑھنے والے کا دل و دماغ کیونکر بجا رہ سکتا ہے نگاہیں کاغذ پر ہوتی ہیں اور دل کی حرکت اور نفس کی آمد شد سے گویا جلدی جلدی کی آوازیں آتی رہتی ہیں! اب اگر کتابت و طباعت کی غلطیاں رہجائیں تو کیا تعجب؟

لیکن یہ دورِ تعجیل انشاء اللہ بہت جلد ختم ہو جائیگا اور ہماری خواہش کے مطابق "ادب" غلطیوں سے پاک ہوکر اپنے قدردانوں تک اسی طرح وقت پر پہنچا کریگا جسطرح ابتک پہنچتا رہا ہے۔

یوں تو تمام انسانی کوششوں کے بعد بھی "ادب" اسطرح غلطیوں سے مبرا نہیں ہوسکتا جسطرح کوئی الہامی کتاب ہوسکتی ہے لیکن پھر بھی ہم اپنے ان مخصوص کرم فرما حضرات کو آیندہ سے احتیاط رکھنے کا یقین دلاتے ہیں جنھوں نے "ادب" کو اپنے مستقل اور ناقدانہ مطالعہ کی عزت بخشکر اسکی خامیوں سے ہمیں ہمارے ضمیر کیطرح آگاہ کیا۔

اس سلسلے میں ہم جناب مولانا محمد مصطفےٰ صاحب صدر الافاضل مدرس اوّل مدرسہ عباسیہ پٹنہ کے ممنون ہیں کہ

موصوف نے اکتوبر ۱۹۲۹ء سے مارچ ۱۹۳۰ء تک کی "ادب" کی کتابت و طباعت کی غلطیاں ایک خط میں لکھکر ارسال فرمائیں۔ موصوف نے اپنے گرامی نامہ کے آخری حصہ میں "چند احسینی" کی تاریخ پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ ہم ناظرین کی آگاہی کیلئے اسے ذیل میں درج کرتے ہیں اور مدیر "آثار دبیّہ" جناب ادیب مدظلہ کی توجہ اسطرف منعطف کراتے ہیں۔

مولانائے ممدوح فرماتے ہیں :۔

"شیخ چند احسینی" کی تاریخ وفات کے حل میں جو محترمی جناب مولانا السید عدیل اختر صاحب قبلہ کا نتیجۂ فکر ہے انکا کمال تسلیم کرتے ہوئے تاریخی حیثیت سے کلام ہے۔ تاریخ فرشتہ کی عبارت ہے "(یوسف عادلشاہ) در بلدۂ بیجاپور بمرض سوء القنیہ گرفتار گشتہ در سنہ ستہ عشر و تسعمائۃ (۹۱۶ھ) ازیں زندان فانی بریاض جاودانی نقل فرمود و نعش او را حسب الوصیہ از بین سلطانیہ بقصبہ کرکی بردہ در جنب قبلہ شیخ جلال المشہور بہ "شیخ چندا" کہ باوے ارادت صادق داشت مدفون گردانیدند" جس کا حاصل یہ ہے کہ شیخ چندا نے یوسف عادلشاہ کے پہلے ہی انتقال فرمایا تھا نہ کہ ۳۰ برس بعد تک زندہ رہے۔

میری نظر میں اسکا حل یہ ہے کہ صرف "رخ چندا" میں تاریخ ہے جیسا کہ مصرع بتاتا ہے اس مرکب میں چھ حرف ہیں جن میں سے چ خاص فارسی حرف ہے۔ تاریخ میں حروف عربیہ اسمی اور حرفی دو طرح سے اخذ کئے جاتے ہیں۔ حرفی وہ ہیں جو تختی پر لکھے جاتے ہیں جیسے ا ب ت ث وغیرہ اور اسمی وہ ہیں جن پر کلمہ تعریف الف لام آتا ہے جیسے الالف الباء التاء الثاء وغیرہ اور الف لام کو علیحدہ کیکے الف با تا ثا بولتے ہیں یہ بھی اسمی حیثیت میں ہیں۔ اس تاریخ میں حروف غیر منقوطہ ر (۲۰۰) د (۴) ا (۱) اور فارسی حرف چ (۳) (اسکی صرف حرفی حیثیت ہے) حرفی حیثیت سے اخذ کئے گئے لہذا ان کے اعداد کا مجموعہ ۲۰۸ ہوا۔ اور منقوط حروف خ اور ن اسمی عنوان سے ماخوذ ہوئے یعنی خا اور نون کے اعداد کا مجموعہ ۷۰۷ ہوا $\frac{۲۰۸ + ۷۰۷}{۹۱۵}$ دونوں کا مجموعہ ۹۱۵ آتا ہے ممکن ہے کہ یوسف عادلشاہ سے ایک سال پہلے ۹۱۵ھ میں شیخ نے اور شیخ سے ایک سال بعد ۹۱۶ھ میں یوسف عادلشاہ نے انتقال کیا ہو معاصرت بھی باقی رہی اور تاریخ بھی درست ہو گئی"

اس مختصر سے زمانۂ ادارت میں بعض تلخ تجربات نے ہمیں جن نتائج تک پہنچنے پر مجبور کیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی لشکر کا میمنہ و میسرہ درست کر کے جنگ شروع کر دینا آسان کام ہے لیکن کسی رسالہ کے مضامین کا انکے لکھنے والوں

کی حیثیتوں اور شخصیتوں کو ملحوظ رکھکر ترتیب دینا بہت دشوار ہے۔

کس کے نام نامی کے ساتھ قبلہ و کعبہ لکھا جائے اور کسے صرف صاحب پر ٹالدیا جائے۔ کس کی "آفریں باش" "خندۂ بندہ نواز" کا خیر مقدم کیا جائے اور کس کے "ملامت کن" "تبسم جانگداز" کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ کس کی خدمت میں اپنے کو مزید عنایات کا مستحق ثابت کیا جائے اور کس کی نظروں میں خود کو لعنت و ملامت کا سزاوار بنایا جائے۔ یہ سوالات وہ ہیں جن کی طرف سے اطمینان ہونا مشکل ہے۔

گو "ادب" کے قلمی معاونین ایسے عالی ظرف حضرات ہیں جو ان چھوٹی باتوں کی طرف توجہ کرنا ہی اپنی ذلت سمجھتے ہیں لیکن ہمیں کبھی کبھی ایسے حضرات سے بھی سابقہ پڑتا ہے جو محض اس امر پر بگڑ جاتے ہیں کہ ان کا گرانقدر مضمون سب کے آخر میں کیوں رکھا گیا یا اس پر خفا ہو جاتے ہیں کہ ان کے نام نامی کے آگے پیچھے بہت سے القاب و آداب کیوں نہیں لکھے گئے۔ اس طرح کے ایک بزرگ کا اصرار ہے کہ مجھے "ملک الشعرا" لکھو اسلئے کہ فلاں گروہ لکھتا ہے دوسرے بزرگ کی تاکید ہے کہ مجھے "خاقانی ہند" لکھو اسلیے کہ میرے دادا کو ایران سے یہ خطاب ملا تھا۔ لیکن نہ اول الذکر یہ غور فرماتے ہیں کہ انکو جس جماعت یا فرد نے خطاب بخشا ہے وہ اسکا حق بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ نہ موخر الذکر کو یہ خیال ہوتا ہے کہ میرث پدر کیلئے علم پدر کی ضرورت ہے!

ناتجربہ کاری کیوجہ سے ابتدا میں ہم سے اس طرح کی غلطیاں ہوئیں مگر خدا کا شکر ہے کہ عقل سلیم نے ہمیں بہت جلد بتا دیا کہ یہ قیود صرف خیالی و خود ساختہ ہیں اور سوائے چند مشرقی زبانوں کے دنیا کی کسی زبان میں یہ مذموم طریقہ رائج نہیں ہے۔ اسلئے اب ہم بھی نہ مضامین کی ترتیب میں مضمون نگار کی شخصیت کا خاص لحاظ رکھتے ہیں اور نہ مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری القاب و آداب کو جگہ دیتے ہیں۔ البتہ جب ہم اپنے طور پر کسی نوٹ یا مضمون میں کسی ادبی بزرگ کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہاں مناسب احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔

ہم اپنے کرم فرما جناب سید مجتبےٰ حسین صاحب رئیس عظیم آباد کے حد درجہ ممنون ہیں کہ انھوں نے جناب نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال ایسے مستند ادیب کا مضمون اور اپنا ایک بسیط نوٹ ہمیں ارسال فرمایا۔ مضمون اور نوٹ دونوں حسب تاکید بجنسہٖ شایع کئے جا رہے ہیں۔

اس پرچے میں جناب نواب حیدر یار جنگ صاحب نظم طباطبائی مدظلہ اور جناب محترم چودھری سید نظیر الحسن صاحب فوق رئیس میاں بن کے افکار تازہ بھی ہدیۂ ناظرین کئے جا رہے ہیں۔ ہمدردین کی ادب نوازیوں

کے ہم شکر گذار ہیں۔

"محمد تغلق" سے متعلق جو بسیط اور پراز معلومات مضامین کا سلسلہ جناب بشیر احمد صاحب علوی کی عنایت سے "ادب" میں جاری تھا اسکی چھٹی قسط نہ گذشتہ نمبر میں نکل سکی اور نہ اس پرچہ میں۔ اس مرتبہ مضمون ہی دیر کرکے پہنچا تھا۔ اب کے کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ لکھکر رہ گیا۔ شایع نہ ہو سکا۔ انشا اللہ آیندہ ماہ میں اسکی ایک قسط ضرور شایع ہوگی۔

مدت سے ہماری خواہش تھی کہ جناب خانبہادر سید محمد ہادی صاحب ڈائرکٹر محکمہ زراعت ریاست علیہ بھوپال کے کلام کی اشاعت کا شرف "ادب" حاصل کرے۔ نہ اسلیے کہ ممدوح کسی ریاست میں بڑے عہدہ پر فائض ہیں بلکہ اسلیے کہ ممدوح دنیائے ادب میں بہت بلند پایہ رکھتے ہیں اور ممدوح کی شاعری اُردو ادب میں گرانقدر اضافہ ہے۔ خدا کا شکر ہو کہ مکرمی جناب سید اطہر حسین صاحب اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے اور ہمیں ممدوح صدر کا کلام اشاعت کے لیے ملا۔ آئندہ ماہ میں ہم اُسے زینت "ادب" کرینگے۔
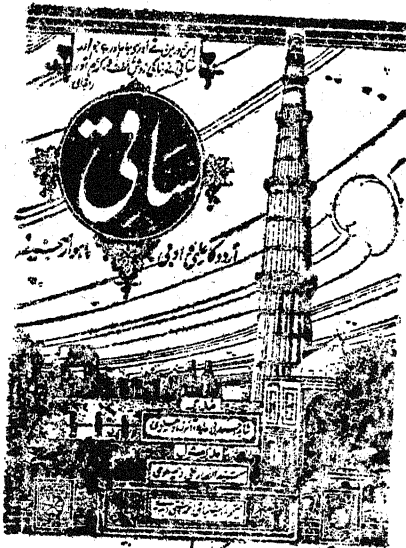
داستانِ اُردُو
بُودھ مت، جین مت اور سنسکرت
سنہ ۵۴۳ قبل مسیح تا ہزار عیسوی

نواب نصیر حسین خان صاحب خیالؔ

"(۱) دنیائے ادب بہ مسرت سنے گی کہ ملک کے بہترین ادیب نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیال کی تازہ تصنیف داستان اُردو جسکی کافی شہرت ہوچکی ہے اب قریب الختم ہے۔ اس کتاب کے اول دو باب غیر آریا و آریا جسمیں اُن کی زبان و ادب کا نہایت عالمانہ فلسفیانہ طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ علی گڈھ کے مشہور رسالہ سہیل میں شائع ہوچکے ہیں۔ اس داستان کا تیسرا باب بودھ مت جین مت اور سنسکرت ہے اس کے بیان کی ایک نقل ہمیں ملی ہے جسے بہ فخر ہم رسالہ اَدَب میں شایع کرتے ہیں۔

(۲) جناب خیال کی رائے ہے کہ ہماری اُردو برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اور نیز یہ کہ یہ بھاشا سنسکرت کی ایک شاخ نہیں بلکہ غیر آریا یعنی ہند کے قدیم و اصلی باشندوں کی زبان ہے۔ حکمراں قوم و زبان یعنی آریوں اور سنسکرت نے اس پر وہی اثر ڈالا جو عربی نے فارسی پر اور فارسی نے ترکی پر یا فرنچ نے انگریزی پر اور پھر انگریزی نے اپنی محکوم زبانوں پر ڈال کر اُنھیں مہذب و ممتاز بنا دیا ہے۔ یہ برج بھاشا، گو شروع میں ایک پراکرت (معمولی بولی) سے زیادہ رتبہ نہیں رکھتی تھی، مگر حاکم و محکوم کے تعلقات نے اسے اتنا سیر کر دیا کہ یہ بڑھ کر سنسکرتی بھاشا کہلانے لگی اور پھر راجہ بھوج اور دوسرے علم دوست و زبان پرور راجاؤں کی توجہ سے کویوں یعنی ہندی شعرا کے اظہار خیالات کا ذریعہ بنی اور اس طرح ترقی پاکر یہ مہا بھاشا پکاری گئی۔

(۳) یہ زبان برج یعنی متھرا کی بھاکا تھی۔ یہ مقام وسط ہند میں تھا۔ تجارتی تعلقات اور تیرتھ گاہ ہونے کی وجہ سے چار سمت سے خلقت ٹوٹتی اور وہاں جمع ہوتی اور آمد و رفت میں موجودہ زمانہ کی سی آسانیاں نہ ہونے کے باعث وہ جماعت متھرا میں تھم لیتی اور وہاں کے خیالات و زبان سے

متاثر ہو کر گھر لوٹتی۔ اور اسطرح ہند کی دوسری بھاکھاؤں کے الفاظ برج میں اور برج کی لفظیں اور زبانوں میں بھٹکتی رہتیں۔ کرشن جی نے برج ہی میں جنم لیا اور اُس سے اُس کا شہرہ اور اس کا وزن معمولی نہ تھا۔ اُس وقت وہاں کی ہر چیز پاون یعنی متبرک سمجھی جاتی تھی یہاں تک کہ متھرا کے جانور بھی جنتی مانے اور سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے۔ دُور دُور کی بستیوں میں اُن کی یاد تازہ رہتی اور اُن کے گھروں میں جب کوئی پرند چہکتا تو تڑپ کر کہہ اٹھتے کہ "پھر بولی چڑیا برج باسی"! یعنی متھرا کی چڑیا پکارتی اور بلاتی ہے چلو چلو! یہ وہ ساکھ اور یہ ساکھ تھی جس نے برج کی ہر چیز کو عزیز بنایا اور اس لیے وہاں کی زبان اور لفظوں کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچایا اور پھیلایا!

(۴) جناب موصوف کی یہ بھی تحقیق ہے کہ بیرونی الفاظ (مثل تاتاری، ترکی و تورانی اور ژند و پہلوی) یہاں کی اور بھاکھاؤں کی نسبت برج بھاشا میں اس سبب سے زیادہ ملے اور پھٹے کہ وہ خطہ اُن قوموں (تاتاری وغیرہ) کے تجارتی و جنگی حملوں کا ہمیشہ سے چاندماری بنا رہا ہے۔ پھر سکندر اور اس کے اردو نے یہاں یونانی و رومی الفاظ کا ایک لشکر اُتار دیا عربی اُس کے بعد آئی اور شمال ہند اور مغربی ہند (سندھ) کی راہوں سے وہ وسط ہند تک پہونچی اور برج آکر وہاں کی بھاشا سے مصافحہ کرنے لگی۔ اور جب کہ ایرانی مسلمان اِدھر آئے تو اُن کی پذیرائی نے اس بھا بھاشا کو فارسی بھاشا اور اُن کے برادرانہ تعلقات نے اسے اُردو بنا دیا!

(۵) اِن اسباب سے جناب خیال اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ۔ (اوّل) یہ زبان، غیر آریا اور ملک کی اصلی و قدیمی زبان ہے اور اسلیے جبتک یہ غیر آریا جن کی اس ملک میں غالب تعداد ہے مخاطب نہوں یہ زبان بھی مفتوح نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ چونکہ اس زبان میں ہند کی ہمسایہ قوموں کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں اس لیے اُن سے تعلقات قائم کرنے اور اُن کے باقی رکھنے میں اس زبان سے بہتر واسطہ سر دست ممکن نہیں اور تیسرے یہ کہ زمانہ سے اس زبان میں دوسری ملکی زبانوں کے الفاظ پھٹے ہوئے اور اسکی لفظیں وہاں خمیر ہو چکی ہیں اس لیے اُردو ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک بہ آسانی اور بے تکلف بولی اور سمجھی جاتی اور اس وسیع ملک میں برادرانہ تعلقات کے قائم رکھنے اور کاروبار کے بڑھانے میں حد کی کارآمد ہے۔ اور اِن وجہوں سے اب اُردو یہاں کی راشٹر بھاشا یعنی ملکی زبان بنے رہنے کی مستحق ہے!

(۶) داستان اُردو کے اِس صغری و کبری نے اس موضوع پر اگلی تصانیف کو بے نتیجہ کر دیا۔ اور چونکہ اس مرقع میں صرف بھاشا اور اُردو ہی کی صورت نظر نہیں آتی بلکہ کچھ اور گلکاریاں بھی ہیں اسلیے اِس کا پایہ اور بلند ہو جاتا اور کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ شاید ہی کوئی ایسی تصویر کھینچ سکے!

(۷) چونکہ مذہبوں اور زبانوں کا ہمیشہ سے چولی دامن کا سا ساتھ رہا ہے، اس لیے جناب خیال نے اس داستان کے اندر اُن مذاہب السنہ کا ذکر خیر بھی کر دیا جن کا اثر [illegible] ہماری بھاشا اور اُردو پر پڑتا رہا ہے۔ یہ بیان بھی اہم و سبق آموز ہے۔ ملکوں، قوموں، مذہبوں اور زبانوں کے عروج و زوال کے اسباب اگر تلاش کیے جائیں تو اُن میں ایک نہ ایک سبب مشترک ملے گا اور وہ سبب اس نادر تصنیف میں جس طرح واضح کر دیا گیا ہے وہ اس داستان کی جان ہے۔ اسی ایک باب (بودھ مت، جین مت اور سنسکرت) میں اُس وقت کی دنیا کا وہ نقشہ ہمارے سامنے کھنچ جاتا ہے جسکے دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ایک انسائکلوپیڈیا درکار اور پھر عمر نوح کی ضرورت ہے۔ مگر یہاں وہ دریا کوزہ میں بند کر دیا گیا اور تشنہ شوق اُسے آب حیات سمجھ کر پیتا اور مزے لیتا ہے!

(۸) یہ امر بھی قابل لحاظ و لایق قدر ہے کہ یہ داستان اُس زبان و طرز میں بیان کی گئی ہے جو واقعی اُردو ہے! ہمارے ادیب و انشا پرداز اس داستان کے اسی ایک باب کو پڑھیں اور اس نمونہ کو آگے رکھ کر اگر اپنے کمیتِ قلم کو جولان کریں تو ہمارا ہارا ہوا میدان جیت لیا جائے اور وہ ہمیشہ اپنے قبضہ میں رہے اور پھر اُردو کو شکست نہ ہونے پائے!!"

(سید مجتبیٰ حسین خان)

آریوں یا قدیم ہندو دھرم کے ماننے والوں نے سنسکرت کو جو عروج دیا اُس کا حال اوپر گذر چکا۔ یہ زبان گو ایک زمانہ تک سلطنت و مذہب کی زبان ہونے کی وجہ سے با وقار رہی، لیکن چونکہ مذہب کی طرح غیروں اور خصوصاً غریب شودروں کو اس کا چھونا اور مزا چکھنا تک چھوت تھا اسلیے وہ عام نہ ہو سکی۔ اِسکے علاوہ یہ قدرتی طور پر بھی ذرا سخت اور عوام کی زبان پر چڑھنے والی نہ تھی، اسوجہ سے اسکا پھیلنا اور ملک پر چھا جانا مشکل تھا۔ عوام اپنی ہی پراکرت اور بھاکھا بولا کرتے اسلئے وہ بدستور قائم رہیں اور اُن کا چلن ہمارے بزاریں عام و [illegible] ہو گیا۔

راجہ پرجا میں اب نہ مذہب واسطہ تھا نہ زبان۔ اسوجہ سے عوام بے چین ہو کر کسی انقلاب کے خواہان تھے کہ اسی عظیم الشان راج (ہندو سلطنت) کی ایک شاخ اور سورج بنسی چھتریوں کے گھر سے ایک چاند طلوع ہوا جسکا اصل نام سدھارتھ تھا مگر جو اپنے علم و گیان کی بدولت آگے چلکر مہنی گوتم بودھ کے مقدس لقب سے پکارا گیا۔

نوجوان سدھارتھ، راجہ سدھودانا کے فرزند اور کپیلا وستو راج کے یوور اجہ (ولیعہد) اور سکیا والوں پر حکومت کرنیوالے تھے۔ یہ جگہ ہمالہ کی ترائی میں اور کاشی (بنارس) سے سو میل کے اندازاً اُتر کو تھی۔ انکی اٹھان گو حسب معمول شہزادوں کیطرح اور سپاہیانہ ہوئی۔ مگر بچپن سے پیر پالنے میں۔ یہ زندگی انھیں خوش نہ آتی اور انکا زیادہ وقت اپنے خانہ باغ کے کسی گوشۂ تنہائی میں گذرتا جہاں وہ اکیلے بیٹھے کچھ سوچا کرتے۔ اسپر بھی جوان ہوئے تو سپہ گری و بہادری میں ایسا نکلے کہ اپنی بی بی کو سویمبر کی سبھی محفل میں اور گنوار دشمن کا مقابلہ کرکے بازوؤں کے زور سے جیت لائے۔

چند دن عیش میں بھی گذرے۔ اس رنگ میں پڑکر اپنی خاندانی مذہبی تعلیم بھی بھلا بیٹھے اور آزاد دکھائی دینے لگے۔ لیکن اتفاقاً ایکدن شہر میں تفریح کو نکلے۔ سواری چند ہی قدم بڑھی تھی کہ ایک بڈھا نظر آیا۔ اسکی صورت، چال اور کپکپاتے جسم کو دیکھتے ہی دل بیٹھا اور انسان کی اس بیچارگی اور اس کے اخیر وقت کو یاد کرنے لگے۔ اس خیال میں ڈوبے ہوئے تھے کہ دفعتہً ایک بیمار سامنے آگیا۔ ایک اور تازیانہ پڑا۔ اسکی حالت دیکھ کر بے چین ہوگئے۔ انجام پر غور کرنے لگے۔ ابھی کسی نتیجہ پر پہنچے نہ تھے کہ رام نام ست ہے کی دل دوز آواز کانوں میں آئی اور بغل سے ایک ارتھی (جنازہ) نکل گئی۔ قلب پر ایک گھونسا پڑا۔ سر پکڑ کر رہ گئے۔ دنیا سے دل بیزار اور اچاٹ ہوگیا۔ جلد گھر لوٹے۔ اپنی ہستی کو یاد کرنے اور یہاں کے غموں کو سوچنے لگے۔

زمانہ گذر گیا۔ اب ان کے یہاں ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔ اس تازہ تعلق سے گھبرائے کہ یہ نیا رشتہ کہیں بیڑی نہ بن جائے اور اسمیں پھنس کر یہ روح قید نہ ہو جائے۔ اس خوف نے بے چین رکھا۔ رات آگئی۔ آدھی دنیا سوتی اور آدھی جاگتی تھی۔ یہ بھی ہشیار تھے۔ دماغ نے کچھ فیصلہ کیا۔ بی بی کے حجرے میں آئے۔ وہ غافل تھیں۔ دھیما دھیما چراغ جل رہا اور معصوم بچہ بھی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ کھڑے ہوگئے۔ دونوں پر پیار کی آخری نظر ڈالی۔ دل ہی دل سے خدا حافظ کہا۔ چپکے رخصت ہوئے۔ دبے پاؤں در تک آئے۔ کواڑ کھولا۔ ہولے سے اسے بھیڑا۔ نکلے اور [illegible] میں چل کھڑے ہوئے۔ صبح ہوئی۔ ایک رفیق ساتھ تھا۔ اسے بھی اپنا گھوڑا اور شاہی جوڑا دیکر لوٹا دیا۔ لمبے گھنگھر والے اور سیاہ ریشمی شہزادوں کے سے شاندار بال بھی کٹوا ڈالے۔ جوگی بنا لیا۔ امیر سے فقیر کا بھیس بدلا! آرام ترک کرکے سختیوں کے جھیلنے اور خدا کی راہ کو ڈھونڈھ نکالنے اور [illegible] مکتی (نجات) کے رستہ کو پیدا کرنے پر تیار ہوگئے

سُدھارتھ اب پورب کو چلے۔ پٹنہ کی طرف آئے۔ اور وہاں پنڈتوں سے پڑھنا، علم گیان حاصل کرنے لگے
پُرانی تعلیم نے انہیں بھی ریاضت اور جسم ظاہر کے گھلا دینے کا سبق دیا۔ راج گیر (صوبہ بہار) کے پہاڑ پر تپسیا (عبادت) کرنے
اور اسے بھی کوہ طور سمجھ کر خدا کو ڈھونڈھنے لگے۔ سکون نہ ہوا تو وہاں سے گیا جی (جنوب بہار) کے بنوں میں اتر آئے
اور برسوں آسن جمائے بیٹھے رہے۔ برت (روزہ) اور ظاہری پوجا پاٹ پر بھی مقصود نہ ملا تو تھک کر سب چھوڑ بیٹھے
اور اپنے طور پر آرام اور اصلی خوشی کا رستہ تلاش کرنے لگے۔ سوچتے سوچتے دماغ بے حس اور بدن ٹھنڈا پڑا تو غش آ گیا۔ چونکے
تو خود کو دوسرا پایا۔ ایک عالم وجد و سُرور میں بے اختیار پکار اُٹھے۔ کہ۔

"دھرم کرو۔ دان کرو۔ دھرم کا سنکھ پھونکو۔ دھرم کی ڈونڈی بجاؤ"!

آواز تھی کہ کڑکتی بجلی۔ آسمان تھرّایا اور زمین ڈولی۔ اُٹھ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو ٹھیک رستہ بتانے پر لیس ہو گئے

سُدھارتھ اب بُدّھا یعنی روشن ضمیر تھے۔ کاشی (بنارس) کے پاس ہرنوں کے ایک جنگل میں پہنچے
اور وہاں بے دھڑک اپنا وعظ شروع کر دیا۔ برہمنوں کے خلاف اُنھوں نے اپنی سیکھیا (پند) خواص کے سامنے نہیں
بلکہ عوام کے آگے اور سنسکرت میں نہیں بلکہ عام پراکرت میں کہنا شروع کی۔ اسلئے خلقت ٹوٹی اور جھکی۔ برہمنوں کے
بیجا غرور کو جو دیکھ نہ سکتے اور دیوبانی زبان (سنسکرت) کو جو سمجھ نہ سکتے تھے اُن کے دن پھرے۔ شودر تک دھرم کو سمجھ کر
اور اسکی روشنی میں کچھ اور جلوہ دیکھ کر اُبھرنے اور بلند ہونے لگے۔ اور یہاں کی وہ پراکرتیں اور بھاشائیں جو
پنڈتوں کی بدولت خاک بسر تھیں، غبار کی طرح اُٹھنے اور ہند کی فضا میں ٹھہر ٹھہر بسنے لگیں!

گوتم جی کا منشا صرف اپنے مت کو پھیلانا تھا نہ کہ کسی خاص زبان کی حمایت و اشاعت۔ اسلئے اُنھوں نے
اپنے دھرم کا سنکھ کسی ایک آلہ سے نہیں بلکہ اُن تمام آلوں سے پھونکا جو اُنھیں بہ آسانی ملتے گئے۔ اور چونکہ اُنکا وعظ
ملکی اور ٹھیٹھ زبان میں ہوتا تھا اسلئے وہ زبانیں سنسکرت کے مقابلہ میں بڑھتی اور پھیلتی چلی گئیں۔

بُدّھا، کاشی کے بنوں میں رہے تو وہاں کی بھاکھا میں کھڑے وعظ کہتے رہے اور اُس زبان کا درجہ بھی
بڑھا رہے ہیں۔ اسی طرح مگدھ دیس (جنوب بہار) آئے تو مگدھ دیسی میں اپنا پیام (پیغام) سنایا اور عوام کے چلتے لوگوں کو
ہاتھ میں لیکر اُن کا اور اُن کی زبان کا بول بالا کر دیا۔ پھر پچھم کا رُخ کیا اور آخر میں پنجاب پہنچے تو اِدھر سے اُدھر تک
کی دیسی (بھاکھا) میں اپنا وعظ کہتے اور آگے بڑھتے چلے گئے۔

گوتم جی نے اسی برس کی عمر پائی اور تیس سال سے اوپر اپنی سیکھیا سنائی۔ اس مدت میں اس ملک کی
مت پلٹ گئی۔ پھر اُن کے شاگردوں اور خصوصاً چندر گپت اور راجہ اشوک کی بدولت صدیوں تک یہ مذہب

یہان راج کرتا رہا۔ بعد کو دکھن پہونچا اور ادھر سے مختلف جزیرون مین نکل گیا اور وہان گھر بنا کر رہ گیا۔ ہمالہ پھاند کر چین و ماچین مین بھی اسنے اپنا جھنڈا گاڑ اور اپنی جنم بھوم چھوٹنے پر بھی چینی و سیتی زمین پر اس کا پھریرا اب تک لہرا رہا ہے!

جین مت ٹھیک اسی زمانہ مین جبکہ دُنیا کے اکثر حصہ مین طرح طرح کے مذہبون متون اور دھرمون کی بنیاد پڑ رہی اور ایران مصر اور کنعان کی زمین بھی ایسے ہی گل کھلا رہی تھی، ہند مین بودھ مت شروع ہوا۔ اور اُسکے ساتھ ساتھ یہان ایک اور دھرم نکلا جسے جین مت کہتے ہین۔

اس مت کے بانی مہاویرا ہین جنھون نے پانچوین صدی قبل مسیح شمال بہار مین اپنا وعظ شروع کیا۔ یہ دھرم بھی بودھ مت کی طرح، برہمنون کی خدائی کے برخلاف اٹھا اور ان کے مظالم کو توڑنے اور نیچ ذاتون اور شودرون کے اُبھارنے پر آمادہ ہوگیا۔ بہار کے دکھنی حصہ یعنی مگدھ دیس مین بودھ مت کا علم بلند اور اس صوبہ کے شمالی حصہ یعنی ترہت کے علاقہ مین، جین مت کا جھنڈا گڑا تھا۔ ان دونون متون کا گو اصول ایک تھا مگر اُن کی تعلیم جدا تھی۔ مقصد ایک رستہ ایک؛ اسلئے اُن مین مقابلہ نہ ہوا، اور دونون بڑھتے چلے۔

مہاویرا، مگدھ دیس بھی آئے اور پھرتے اور وعظ کرتے رہے۔ ان کے ننہیالی رشتہ دارون مین قدیم آنگا (موجودہ بھاگلپور) کے راجہ اور مگدھ دیس کے اکثر بڑے زمیندارون اور ٹھاکرون نے جین مت کو قبول کیا۔ اور جسطرح چندر گپت اور اسوکھ کے اقتدار کیوجہ سے بودھ مت بڑھا اور پھیلا اور آخر پوربی (زبان) اور مگدھی کا نام نکلا؛ اسی طرح اُن زمیندارون اور ٹھاکرون کے اثر سے نہ صرف جین مت ہی پنپا اور دھنی بنا بلکہ وہان کے بزرگون مین بھی مقامی زبانون کا چلن عام ہوگیا۔

یہ دھرم نہ فقط بہار اور مگدھ دیس ہی کے علاقہ مین جہان پارس ناتھ کا مشہور مندر اب بھی کھڑا ہے، سر اُٹھائے رہا بلکہ دہ ہزاری باغ کے جنگلون اور چھوٹا ناگپور کی پہاڑیون کو پھاندتا بہت جلد دور نکل گیا۔ اور پھر مالوا [ا] اُجین پہونچکر راجہ بھوج [۲] کی سرپرستی مین راج کرتا اور برج بھاشا کو سنسکرت کے مقابلہ مین بڑھاتا اور عروج دیتا رہا۔

[ا] راجہ بھوج کی راجدھانی اُجین مین تھی۔ ان کے درباری کوی (شاعر) مشہور اور انکی توجہ سے اُسوقت کی بھاشا کی ترقی اور دوہون کی گرم بازاری کتابون مین مذکور ہے۔ [۲] متھرا (بقیہ نوٹ صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ ہو)

مالوہ و مارواڑ کے علاوہ دکھن میں دروپدی زمین اور پچھم میں گجرات و سندھ تک اس دھرم کے پوجاری اور دیسی (زبان) کے خریدار ابتک موجود اور کاروباری ہونے کی وجہ سے اپنے مت اور اپنی بولی کو ہندستان میں اونچا دکھا رہے ہیں۔ بودھ مت اپنی جنم بھوم سے کب کا دور ہو گیا۔ مگر جین مت اپنے دھن کی بدولت اس زمین پر پیر جمائے ابتک کھڑا، اپنی مختصر آبادی کے باوجود یہاں کی دوسری کروڑوں مخلوق سے مقابلہ اور اُن سے بے تکلف باتیں کر رہا ہے!

سامی جادۂ و مسلک ۔ آریوں اور سامیوں کے مراسم قدیمانہ ہیں۔ اونکی مذہبی و قومی تاریخ اور پھر اونکی زبانوں کا فسانہ بھی ملتا جلتا ہوا، اور اون کے عروج و زوال کا قصہ بھی یکساں ہے جسکا ذکر آگے آیگا۔

ایران اور زردشت و مجوس کو اس زمین پر حقِ تقدم (شفعہ) حاصل ہے اس لحاظ سے ان کی داستان پاستان اول ہونا چاہئے تھی۔ مگر وہ ذکر ایک مستقل ذکر ہے اور ایک خاص باب کا محتاج۔ اسلئے اُسے آیندہ پر چھوڑ کر اسوقت سامی حکایت سنائی جاتی ہے۔

سامی نسل اور سامی زبانوں نے عرب و افریقہ کے گمراہوں کو جسطرح صراطِ مستقیم دکھائی اسکی قدیم حکایت اب بھی تازہ ہے افریقیوں کے مظالم سے (بعد حضرت یوسف) مصر میں بنی اسرائیل، ہندوستان کے شودروں سے بھی بدتر ہو گئے تھے۔ اون میں حضرت موسیٰ کا سا اولوالعزم ہادی اٹھا اور اپنی قوم کو فرعونیوں سے چھڑا کر بیابانوں کے ملک (کنعان) میں لے آیا اور انہیں زندگی کا قانون بتایا اور پھر ریاست و سیاست کے رستے بھی دکھا اور سمجھا کر اُس غلام قوم کو آزاد بلکہ بادشاہ بھی بنوا دیا۔ کہ بغیر دنیوی اقتدار کے کوئی قانون ٹھیر نہیں سکتا اور کسی قانون کے بغیر کوئی قوم نہ ایک ہو سکتی اور نہ زندہ رہ سکتی ہے۔

وہ قوانین ایک کتاب میں قلمبند ہوئے۔ یہ توریت تھی اور اوسکی زبان سامی یعنی عبرانی تھی۔ یہود (یعنی اسرائیل) جبتک اُسے پڑھتے، سمجھتے اور اوسپر چلتے رہے، بڑھتے اور بلند نام دکھائی دئے۔ مگر جب اُنکے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲) اور آگے علاقہ کا پرانا نام برج ہے اور وہاں کی زبان کا نام برج بھاشا۔ یہ بھاشا دیگر ملکی زبانوں میں سب سے آگے تھی اور اسی وجہ سے وہ دوسرے صوبوں میں بھی مہمان عزیز بنی رہی۔ پورب میں بہار تک اُسکی صدا پہنچی۔ اور پچھم میں مارواڑ و سندھ تک اسکی آواز گونجی۔ مالوہ و دکھن میں وہ گھر بنا کر رہی۔ اُدھر کے راجاؤں کے منہ میں پڑی اور پھر گوپیوں (شعراء) کے شیریں ہونٹوں سے مدتوں ٹپکی!

یہاں ایک خاص مذہبی گروہ نکلا اور اس نے کتاب اللہ پر قبضہ کر کے عوام کو اپنا دست نگر بنا دیا تاوقتیکہ ان کے ذہن و دماغ معطل و بے حس ہو گئے۔ اور وہ بزرگ و آزاد قوم اپنی شاہی کھو بیٹھی اور آخر دوسروں کی غلام بن گئی![1]

اس عالم میں صدیاں گذر گئیں۔ موسوی مذہب علمائے یہود کے سخت سینوں کے سوا کسی کے دل میں نہ تھا۔ اس غیر حال کو دیکھ کر انہیں (یہود) میں سے ایک بندۂ خدا اٹھا۔ اس نے موسیٰ کے اصل قوانین کو بتانا اور قوم کے جھوٹے خداؤں (ربی و علما) کے زور کو ڈھانا چاہا۔

حضرت عیسیٰ کی تعلیم کا ماحصل حضرت موسیٰ کے دیے ہوئے ان قوانین کا جو علمائے یہود کی زبردستیوں سے مسخ یعنی کچھ سے کچھ ہو گئے تھے، درست کرنا اور دشمنِ قوم مذہب علما کو زیر اور اس پست قوم کو پھر زبر کر کے دنیا میں بہ آبرو پیش کرنا تھا۔

ابنِ مریم کے مخاطب وہ عوام تھے جن کی زبان کو وہ طور کے اس نور میں تجلی ہوئی نہ تھی جس میں توریت کے احکام روشن دکھائی دئے۔ بلکہ ان کا کلام اس صاف و سادہ و دیسی زبان میں تھا جسے عام لوگ سمجھتے مگر ان کے ربی جسے نجس جانتے تھے!

اس نئے دین کی بدولت جس طرح علمائے یہود پسپا ہوئے اسی طرح قدیم عبرانی بھی جو اب عوام کی زبان باقی نہ رہی تھی، بگڑی، اکھڑی اور ٹوٹی عربی بھی اسی سے بنی اور مدتوں اپنی اس اُمّ اللسان (عبرانی) کا شیر نوش کر کے پلتی اور بڑھتی رہی!

ہند کی تاریخ بھی ہم کو یہی سکھاتی اور یہاں کے مذہبوں اور زبانوں کا ایسا ہی فسانہ سناتی ہے گوتم جی اور مہاویرا کے سے خوش فکر بھی اپنے اپنے وقتوں میں ان ہی نیک کاموں کے سر انجام کی خاطر اٹھے جو مصر و کنعان اور فلسطین و شام میں اس وقت ہو رہے یا اس سے کچھ ہی قبل ہو چکے تھے۔

ان دونوں مہاتماؤں کی کوشش سے لک جاگا، برہمن (پنڈت) شودر ہوئے، عوام چونکے اور غریب شودر اٹھے اور آدمی سمجھے گئے! سنسکرت دیو بانی زبان باقی نہ رہی۔ اور گو خدا زبان نہ وارد

---

[1] پروفیسر وہلی (جرمن) نے اپنی مشہور تصنیف "راز غلامی" میں صحیح لکھا ہے۔ کہ "قومیں اپنی غلامی کے اسباب خود مہیا کرتی ہیں۔ علمائے ملت عوام کو اپنے قابو میں رکھنے کی ہوس میں ان کے دماغ سے سوچنے اور سمجھنے کی جرأت کا مادہ سلب کر کے رکھ کھینچ لیتے ہیں۔ غلامی کا یہ پہلا زینہ ہے۔ قومیں اس کی عادی ہو گئیں اور شرافت یعنی جائز آزادی کا احساس گھٹتا چلا۔ تا اینکہ وہ غیروں کی حکومت و تسلط کو بھی بآسانی گوارا کر لیتی اور اس ذلیل زندگی سے خوش رہتی ہیں!

مگر وہ بے زبان، گوتم جی اور مہاویرا ہی کی زبان سے نہیں بلکہ فلک زدہ شودروں کی زبان سے بھی بولا اور ان اچھوت کو بھی نوازتا اور سرفراز کرتا رہا!

بودہ مت اور جین مت اس ملک میں ہزار بارہ سو برس تک حکومت کرتے رہے۔ اس مدت میں برہمنی۔ دھرم کا بھرم کھل گیا۔ اور سنسکرت جو انکی ایک آلہ کار تھی بے کار ہو گئی۔ اور یہاں کی مختلف پراکرتیں جو غیر آریوں اور عوام کی زبانیں تھیں، ہر طرف گونجنے لگیں۔

برہمنی۔ دھرم نے زمانہ کے بعد یہاں دوسرا جنم لیا تو ملک کی کایا پلٹ چکی اور اس بھرت کی بھاکھائیں روپ بدل کر بہت زور پکڑ چکی تھیں۔ اور اس وجہ سے ان کا ادب و لٹریچر بھی جو قوموں کے سدھارنے اور بگاڑنے میں اور قوتوں سے زیادہ دخل رکھتا اور طاقتور ہوتا ہے، زبردست ہو چکا تھا۔ اسلئے کمارلیا بہاری کے سے پنڈت کو بھی جنھوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں ہندو دھرم میں نئی روح پھونکی، سنسکرت کی پھر سرداری کے قائم کرنے میں بلا کی دقتیں اٹھانا پڑیں۔ اس زبان (سنسکرت) کو اب شہ زور رقیبوں کا سامنا تھا۔ اس کے درخت اقبال کو گھن لگ چکا تھا۔ وہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی آخر مرجھائی اور سوکھ کر کانٹا ہو گئی!!

---

[1] ۳۴۳ قبل مسیح تا ہزار عیسوی۔ [2] ہندو دھرم تو اصل ویدمت ہے۔ مگر پنڈتوں اور برہمنوں نے اور مذاہب کے علماء کی طرح اس مذہب کو بھی ناس کیا اور اپنا من گھڑت دھرم بنا لیا!

اُردو میں ےٓ اور نونٓ تعظیمی

خان بہادر سید اولاد حیدر صاحب فوقؔ بلگرامی

اسم فاعل علی الاکثر بصیغہ واحد غائب ہے کے آگے فعل جمع کے صیغے میں لاتے ہیں۔ جیسے شاہزادےٓ صاحب آئے۔ صاحب عالم دریتے تشریف لیگئے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ جناب سیدہ ارشاد کرتی ہیں وغیر اشالہا۔

یہ ظاہر ہے کہ ان جملوں میں فاعل بصیغہ واحد ہے اور فعل بصیغہ جمع اسلئے خلاف قاعدہ معلوم ہوتا ہے۔ طلبا سے لیکر معلمین تک کو اسکی اصلیت سمجھنے میں اکثر غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ اور وہ غور و خوض کی زحمتوں سے قطع نظر کر کے اتنی ہی سمجھ لینے اور سمجھا دینے کو کافی سمجھتے ہیں کہ ان جملوں میں نونٓ اور ےٓ دونوں تعظیم کی غرض سے مستعمل ہوئے ہیں اسی بنا پر انکا نام نونٓ اور یائے تعظیمی رکھ لیتے ہیں حالانکہ قواعد زبان کی کتابوں میں انکا بیان ہے نہ نشان۔

بات تو ہے لگتی ہوئی اور قیاس بھی ہے کسیقدر ٹھیک لیکن ہر امر کو حقیقت جاننے اور اصلیت سے پہچاننے کی ضرورت ہے یوں تو زبان کی موجودہ کس مپرسی کہ عالم میں حروف اور اُنکے طریقہ استعمال کے جو نام نہ رکھ لئے جاویں اور اپنی زبان کو غیر زبان کے بیرونی الفاظ سے جتنا بھی مخلوط نہ کرلیا جائے وہ موجودہ ادبی اجتہاد کے عالم آزادی میں بعید نہیں لیکن احتیاط پسند ارباب نظر اتنا ضرور بتلادیں گے کہ اس طرز عمل سے ایک دن یہ نتیجہ ہونیوالا ہے کہ ہمکو اپنی زبان کے اصلی الفاظ کی پہچان بھی مشکل ہو جائے گی۔ یہی صورت اس ےٓ۔ نٓ تعظیمی کی ہی ہے اور اگر ابھی نہیں ہے تو مستقبل قریب میں ہو جانے والی ہے۔

انکی تعظیمی صورت تو ضرور مانی جائے گی لیکن قواعد زبان کے نقطۂ نظر سے حقیقتاً اور اصلیتاً دونوں اس کے خلاف ہیں حقیقت میں نہ یہ تعظیم کا نونٓ ہے اور نہ تکریم کی ےٓ۔ اصل میں یہ وہی جمع کا نونٓ اور جمع کی ےٓ ہے عربی کے قاعدہ ادبی کے مطابق معزز حضرات کے امتیاز مخصوصی قائم رکھنے کی غرض سے ضمائر وغیرہ بصیغہ جمع مستعمل ہوتے ہیں غریب اُردو نے بھی یہی رعایت تقلید اختیار کرلی ہے اور اسکو ضمائر سے بڑھاکر افعال تک میں بھی ملحوظ رکھا ہے۔

نونٓ اور ےٓ دونوں اُردو کے حروف حقیقت اور اصلیت میں جمع کی علامتیں ہیں جو اُسکے قواعد زبان میں منضبط ہیں اور انکے استعمال قواعد عربی ہی کے مطابق۔ صرف اظہار تعظیم کی ضرورت تک محدود ہیں اسلئے ہر زبان داں اور زباں آموز کو سمجھ لینا چاہئے کہ اصل حقیقت انکی جمع کی ہے۔ ان دونوں حروف کو حروف جمع کی اصلیت سے خارج کرنا اور ان کے لئے کوئی خاص اور جدا نام رکھنا قواعد زبان سے لاعلمی ہے اور ظلم حروف سے بے خبری۔

بلبن نامہ کی دستیابی

سید حسن صاحب برنی بی اے ایل ایل بی (علیگ)

اس عجیب و غریب کتاب کا روشنی میں آنا ضرور تعجب انگیز ثابت ہوگا، اور یقین ہے کہ اسکے شائع ہونے پر مبصرین اور نقادان تاریخ اس کتاب کے متعلق ایک عرصہ تک موافق و مخالف بحثیں کرتے رہیں گے لیکن میں بحیثیت مترجم و حواشی نگار کے اُن حالات کا بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں، جو اس کتاب کی دستیابی کا موجب ہوئے۔

سب سے پہلے بغیر کسی فخر و مباہات کے جذبہ کو شامل کیے محض ایک واقعہ کے طور پر بیان کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجھے بچپن سے تاریخ و آثار کے مطالعہ سے خاص شغف رہا ہے، ایک ذخیرہ قدیم دستاویزات، فرامین، اسناد اور قلمی کتابوں کا اپنے خاندان بزرگوں کے ترکہ میں چلا آتا ہے۔ اُن کا مطالعہ اور تحقیقات ان مضامین میں خاص طور پر دلچسپی بڑھانے کا باعث ہوئی، یہاں تک کہ وہ میری علمی زندگی کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ بن گئے۔

سال نو کا آغاز تھا، سردی پورے شباب پر تھی، اور میں اپنے کتب خانہ میں میز کے سامنے بیٹھا ہوا لیمپ کی روشنی میں مطالعہ میں مشغول تھا۔ رات کے نو بجے کا وقت تھا کہ یکایک دروازہ کھلنے کی آہٹ پاکر میں چونکا۔ ایک شخص متوسط قامت اندر آنے کی اجازت مانگتا ہوا نظر پڑا، میں نے اُسے اجازت دیدی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک معمر شخص تھا جسکی ڈاڑھی سفید اور عمر ساٹھ سے متجاوز ہوچکی تھی، لیکن اُسکے قویٰ مضبوط معلوم ہوتے تھے اور بشرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ اپنی جوانی کے زمانے میں وہ ایک خوش رو اور طاقت ور شخص ہوگا۔ عمر نے اُسکے حُسن کو پامال کردیا تھا، اور نشیب و فراز زمانہ کے آثار دستبرد نمایاں تھے، لیکن ابھی تک چہرہ سے خوشدلی کے آثار مفقود نہیں ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کبھی اُس نے بہتر زمانہ دیکھا ہوگا۔

اُس نے آتے ہی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ایک گٹھری میز پر رکھدی اور اپنا پرانا کمل جس کا بھورا رنگ بہت میلا ہوچکا تھا ترتیب سے اوڑھنے کے لیے سنبھالا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک نہایت بوسیدہ بادامی رنگ کی کشمیری بنی ہوئی عبا پہنے ہوئے تھا جس جا بجا کیڑے لگ جانیکی وجہ سے سوراخ پیدا ہوگئے تھے اور کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے پیوند بھی بڑے رفوؤں کو شرمندہ کرتے لگے ہوئے تھے، اس عبا پر نشان کام کے بنے ہوئے

آثار آستینوں، کندھوں، حاشیوں، اور کونوں پر نظر آتے تھے۔ میں ابھی اُسے دیکھنے میں مشغول تھا کہ اُس نے مجھ سے کہا:-

"جناب من آپ میری اِس ناوقت کی مداخلت کو معاف کر دیں، مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ کو پرانی کتابوں کا خاص شوق ہے اور اُن کی تحقیقات میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ میرے پاس کچھ کتابیں ہیں، جو عرصہ سے ہمارے خاندان میں چلی آتی ہیں۔ میں اُنھیں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اُنھیں دیکھنا پسند فرمائیں گے؟"

"میں نے کہا "میں آپ کی کتابیں بہ خوشی دیکھوں گا، لیکن اِس سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنا تعارف مجھ سے کرادیں"

پیر مرد نے کہا "حضرت، میری کتھا تو بہت لمبی ہے، جس کا بیان وقت چاہتا ہے، اور ممکن ہے بار خاطر ہو۔ اِس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ہمارا قدیم وطن کیتھل تھا، اور ہمارا خاندان سالار سید حسام الدین کیتھلی کی اولاد میں ہے جو اپنے زمانہ میں ایک بڑے شاہی عہدہ دار تھے۔ میرا نام سراج الدین ہے۔ میں کوئی پیشہ ور تاجر کتب نہیں ہوں میں نے فارغ البالی کا زمانہ بھی دیکھا ہے، اور میرے آباو اجداد کی حالت تو بہت ہی بہتر تھی۔ لیکن اُس کا اب کیا ذکر؟ فی الحال وسائل معاش مسدود ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اپنے خاندان کی کتابیں علیحدہ کرنے کے خیال سے گھر سے نکلا ہوں۔ کچھ نکل چکی ہیں۔ چند چیزیں انتخاب کر کے رکھ چھوڑی تھیں جنھیں علیحدہ کرنے کا خیال نہ تھا، لیکن تابکے۔"

میں نے دیکھا کہ پیر مرد کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ اُس نے اپنی گٹھری کھولنا شروع کی اور بغیر میرے جواب کا انتظار کیے کتابیں نکال نکال کر میز پر رکھنے لگا۔

"دیکھیے یہ حافظ کا دیوان ہے جو شاہجہاں کے وقت کا لکھا ہوا ہے، کاتب کا نام اور سنہ آخر میں درج ہیں۔ اسکی تصاویر بھی کسی اچھے اُستاد کی بنائی ہوئی ہیں"

میں نے اُسے دیکھا، فی الواقع اُسے ایک اچھا نسخہ قرار دیا جا سکتا تھا۔

"یہ خمسۂ نظامی ہے، یہ امیر خسرو کا دیوان بقیہ نقیہ ہے......" الغرض اُس نے متعدد نسخے میرے روبرو پیش کیے۔ سب طرح کے نسخے تھے، بعض بہت عمدہ، بعض اوسط درجے کے، اور کچھ معمولی۔

اُس نے ایک بوسیدہ جلد کا نسخہ جس کا چمڑا زیادہ تر کیڑے چاٹ چکے تھے اور جس پر بیل بوٹوں کے سنہرے ٹھپوں کے نشانات ماند پڑ چکے تھے میری طرف بڑھایا۔ "لیجیے یہ "بلبن نامہ" کا نسخہ ہے، جو عبداللہ ماجد نے بطور ایک بیش قیمت امانت کے میرے سپرد کیا تھا، اور مدت سے اسی طرح چلا آتا ہے۔ آہ! اس میں کچھ ہمارے خاندان کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے یہ ایک مخفی گوہر کی حیثیت رکھتا تھا۔ جسے دیکھنے کے بڑے بڑے لوگ مشتاق تھے، لیکن آج تک بخل کے ساتھ اُسے

چھپایا جاتا تھا، اس وقت میں اسے آپکے پاس لیکر آیا ہوں، اور اپنی امانت سے سبکدوشی حاصل کرنا چاہتا ہوں

کتاب کا نام سُنکر میرا شوق بیچینی کی حد تک پہنچ گیا۔ میں نے اس کتاب کا نام کبھی نہیں سنا تھا، نہ کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ میں نے کہا "میں اس کتاب کو بخوشی دیکھوں گا، ممکن ہے یہ میرے کسی مصرف کی نکلے۔ میں نے اس سے پہلے اس کتاب کا تذکرہ کہیں نہیں دیکھا"

یہ کہہ کر میں نے اُس کتاب کو کھولا اور سب سے پہلے سرورق دیکھا۔ اُس پر چھوٹی بڑی کئی مہریں لگی ہوئی تھیں کچھ مٹ چکی تھیں، اور کچھ کم مٹی تھیں، لیکن اُسکے وسط کی سب سے بڑی سنہری مہر جس کا قطر دو انچ لمبا تھا، ابھی تک صاف چمک رہی تھی، اور خطِ تعلیق میں "غیاث الدین بلبن" پڑھا جاتا تھا۔

قریب قریب میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے "غیاث الدین بلبن! کیا یہ ممکن ہے"، لیکن آنکھوں کو کس طرح جھوٹا کہا جا سکتا تھا، میں نے پھر غور سے دیکھا۔ مہر کے بائیں میں ۶۸۶ھ لکھا ہوا تھا۔

"یا اللہ! یہ کون کتاب ہے، اور اس پر بلبن کی مہر کیوں لگی ہوئی ہے؟ یہ اُسکے کتب خانے میں ہوگی۔ کسی نے اُسکے نام پر معنون کی ہوگی؟"

میں نے اور مہریں دیکھنا شروع کیں۔ داہنے گوشہ کی طرف ایک مہر جو تقریباً مٹ چکی تھی نظر پڑی، جس میں "سالار سید حسام الدین کیتھلی" پڑھا جاتا تھا

میں اس نام سے تاریخ کے ذریعہ سے واقف تھا، یہ مورخ ضیائے برنی کا نانا تھا، اور یہی نام تھا، جس کی طرف اس پیر مرد نے اپنے خاندان کو منسوب کیا تھا

یہ ایک اور سنسنی پیدا کرنے والا واقعہ تھا۔ میں نے خیال کیا کہ بلبن نے اپنے کتب خانہ کی اس کتاب کو سالار حسام الدین کو عطا کیا ہوگا۔

میں نے اب کتاب کو اندر سے دیکھنا شروع کیا۔ دبیز کاغذ تھا، جو اتنے زمانے کو برداشت کر گیا۔ اسے غالباً کافی احتیاط سے رکھا گیا تھا۔ پھر بھی کاغذ کا رنگ بہت میلا ہو گیا تھا، اور کیڑے کہیں کہیں لگ گئے تھے۔ پہلے صفحہ پر ایک نہایت پاکیزہ مستطیل زریں لوح، جس میں آرائشی کوفی خط میں بسم اللہ لکھی تھی، بنی ہوئی تھی۔ تمام کتاب پر سنہری جدولیں تھیں اور حاشیہ کا کاغذ نہایت خوبی کے ساتھ جدا گانہ وصل کیا گیا تھا۔ اُس کا خط بہت جلی نہ تھا، لیکن اسکی شان عجیب دلفریب تھی۔ اُسوقت تک نستعلیق وجود میں نہیں آئی تھی، لیکن متن کتاب جس خط میں لکھا ہوا تھا اُسے کامل نسخ بھی نہیں کہہ سکتے، یہ کتابی تحریر کی ایک جدا شان تھی، جس کا نام اسوقت تجویز کرنا مشکل ہو گا،

لیکن وہ ثلث، تعلیق، اور نسخ کے نمونوں سے ملکر ایک خاص طرز تھا، جسکے حروف نہ بالکل مدوّر تھے، نہ بالکل پھیلے ہوئے بعید مشابہت کے لحاظ سے وہ نسخ و نستعلیق کی درمیانی کڑی معلوم ہوتا تھا، لیکن اُس میں شکستہ طرز تحریر کے بعض عناصر بھی موجود تھے

میں نے اُسکے ورق اُلٹنا شروع کیے۔ فی الواقع اُس عہد کے کسی بہترین اُستاد کا قلم اُسکے لکھنے کے کام میں آیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد میں نے کتاب کا اخیر صفحہ دیکھنے کے لیے نکالا۔ اخیر میں مہر بلبن اور سالار سید حسام الدین کی مہریں لگی ہوئی تھیں اور اُن سے پہلے یہ عبارت درج تھی:-

"این نامہ کہ موسوم است بنام نامی حضرت خداوندگیہانی ادام اللہ ملکہ و سلطنتہ بامر بندگان عالی بتاریخ پنجم ماہ شعبان ۶۸۵ھ بپایان رسید۔ کاتب این نامہ کمترین بندگان بدرالدین کوہلی است کہ در دارالانشاء حضرت سلطانی بدبیری ماموریست۔ و چنانکہ در اوّل نامہ بلفظ مبارک رفتہ از بسم اللہ تا ختم این کتاب ہمہ کلمات بزبان خداوند سلطان است کہ دولت او پاینده باد و جاه و جلال او تابنده۔ و چون بپایان رسید بنظر اقدس گذشت و مسجّل شد بمہر عالی و سپرد شد بہ سالار سید حسام الدین بندۂ سلطانی کہ حسب الامر و الانگاه دارد و در ہیچ دقیقہ در نگاہداشت فرو نگذارد، و مطابق فرمودۂ عالی اتباع نماید۔"

اس خاتمہ کی عبارت نے اس کتاب کی تاریخ کو ایک بڑی حد تک روشن کر دیا۔ لیکن سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ اس خاتمہ کے رو سے یہ کتاب خود بلبن کی لکھائی ہوئی بتائی گئی تھی۔ لیکن معاصر مؤرخ ضیائے برنی کی تاریخ میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ البتہ اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بلبن وصایا لکھانے کا بہت شائق تھا۔ اور خود ضیائے برنی نے جو وصایا درج کیے ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے حالات بیان کرنے کا بھی خاص طور پر شوق رکھتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بلبن نے ایسی کوئی کتاب لکھائی ہو۔ لیکن یہ سب باتیں اُس کا متن جانچنے سے زیادہ واضح ہو جائیں گی۔

اب میں نے کتاب کا پہلا صفحہ کھولا، اور اُسکے دیباچہ کو پڑھنا شروع کیا۔ حمد و نعت کے بعد لکھا تھا۔

"امابعد می گوید کمترین بندۂ بندگان حضرت ربانی غیاث الدین بلبن سلطانی، کہ بعد از واقعۂ شہادت پسر بزرگ خود محمد سلطان کہ رحمت بے پایان بر روان پاک او باد، ہر اردوش گذشتہ کہ عمر من بپایان رسیدہ است و ہیچ نماندہ است دریں عالم کہ بادل بستہ شود، و آفتاب عمر و سلطنت من بلب بام آمدہ است و شاید کہ حیات من تقدیرے درنگ نماید، اما چیست دریں عالم کہ بچشم خود معائنہ نکردم۔ و ہیچ نعمتے نیست کہ مرا ارزانی نشد

و از حالات عبرت انگیز ہزار ہا بلکہ زائد مشاہدہ گشتہ و تجربہ رسیدہ و برخود ہم گذشتہ۔ از آن وقت کہ من چشم بمہد کشادم، و بصحرا بزرگ شدم، و اسیر گشتم و بدست بازرگانان افتادم و مرا بخدمت سلطان سعید رحمہ اللہ آوردند و بظل نعمت او بزرگ شدم، تا بعہد سلطان ہمرور ناصری انار اللہ برہانہ مرا پایہ افراشتہ شد، و بعون و فضل ایزدی بتخت سلطنت نشستم و چندیں سال بایالت و سلطنت گذرانیدم این ہمہ تجارب است کہ عبرت ہائے کثیر درو پوشیدہ ہست و از گرم و سرد و از نشیب و فراز آں قدر دیدہ شد از ہر قسم کہ سرمایہ بینش عالمیاں می تواند شد۔

قرار دادم کہ از حالات خود آنچہ گفتنی ہست یا نہ ہمہ راست راست از لفظ من نوشتہ آید و ایں ہمہ کلمات پیش من دبیر نبشت، و ہر روز خود می خواندم و باول و آخر مہر می کردم و چوں باختتام رسید بہ کتاب جمع کردہ شد و اورا باسم بلبن نامہ موسوم کردم۔

و این کتاب را باز بنظر خود گذرانیدم و چند بار خواندم و بارہا اشکبار شدم کہ جائے شادمانی بدلم نماندہ ہست، اما نمی خواہم کہ بہ زندگانی من ہر دمان یا بعد من بزمانۂ پسران من این کتاب شیوع پذیرد کہ چند امور ہست کہ پوشیدن آن تا یک زمانہ انسب باشد۔

و این کتاب را بیکے از مخلصان و معتمدان خود سالار سید حسام الدین کیتھلی سپرد نمودم، و امانت گذاشتم و وصیت کردم کہ اورا پوشیدہ دارد، و بپسران خود وصیت کند کہ ایشان ہم پوشیدہ دارند، و پس از گذشتن صد سال بیروں آرند و از و نسخہ گیرند و بدیگراں نیز برائے نسخہ گرفتن دہند۔ اما این اصل را ضائع نکنند کہ برائے اہل زمانہ سند ماند"

اس دیباچہ نے تمام تاریکی دور کردی۔ حسام الدین کے وارثوں نے اِس کتاب کو ہمیشہ مخفی رکھا اور بلبن کی وصیت سے بھی بڑھ کر آج تک اُسے روشنی میں لانے سے باز رہے لیکن بالآخر اُسکے ایک مفلوک وارث کے ہاتھوں وہ کتاب میرے سامنے اِسوقت موجود تھی۔

"یا اللہ! اگر یہ تلف ہوجاتی یا کسی ناواقف کے ہاتھوں میں پڑ جاتی تو کیا حشر ہوتا؟ اور اب بھی اِس کتاب کا کیا حشر ہوگا؟"

میں بخوبی واقف تھا کہ یہ ایک بے بہا کتاب تھی جسکی قیمت ادا کرنا میری استطاعت سے قطعاً باہر تھا، اور میں اسکے لیے تیار نہ تھا کہ اِس امر کو اُسکے مالک سے مخفی رکھوں۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔ وہ کتاب اپنے سامنے میز پر رکھدی اور پیر مرد کی طرف مخاطب ہو کر کہا:۔

"جناب، میں نے اِس کتاب کو دیکھا، اور ساتھ ہی آپ کی حالت اور رنج کا اندازہ کیا۔ میں اِس بیش قیمت چیز کو لے کر آپکو اس سے محروم کرنیکے لیے تیار نہیں۔ نہ میں اتنی استطاعت رکھتا ہوں کہ اسکی واقعی قیمت آپ کو ادا کر سکوں۔ اسکی قیمت کا بار کوئی شاہی خزانہ ہی برداشت کر سکیگا، اور یہ ممکن ہی کہ ایسا ہو۔"

پیرمرد نے میری طرف بغور دیکھا، وہ مسکرانے لگا پھر بولا۔

"جناب میں اِس سے بخوبی واقف ہوں، اور اسی لیے میں اِن میں سے ہر ایک کتاب فروخت کرکے انھیں اپنی وجہ معاش بنانے کے لیے تیار ہوں، لیکن اِس کتاب کو کسی قیمت پر بیچنا نہیں چاہتا۔ میں تو لبن کی اُس وصیت کو جو میرے بزرگوں اور خاندان پر فرض چلی آتی ہے پورا کرنا چاہتا ہوں، اور اس میں آپ کی امداد کا جویا ہوں۔"

میں نے گھبرا کر کہا "میں آپ کو ہر امکانی مدد دینے کے لیے تیار ہوں، لیکن۔"

پیرمرد نے کہا "آپ اِس کتاب کو میری طرف سے قبول کرکے، اسکے از سر نو زندہ کرنے کا وعدہ کریں۔ یہ کتاب یہاں اِسی لیے لائی گئی ہے اور اب یہاں سے واپس نہ جائیگی، نہ اس کا کوئی معاوضہ یا بدل قبول کرکے میں اپنے آپ کو اور اپنے بزرگوں کو رسوا کرونگا۔"

"آپ کا یہ خیال درست نہیں ہے" میں نے پیرمرد سے کہا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور اُس نے کہا۔

"واللہ! آپ نے مجھے پہچاننے میں غلطی کی۔ میں مٹ چکا ہوں، لیکن میرا دل مردہ نہیں ہوا ہی، اور ابھی تک آبا و اجداد کا خون رگوں میں گشت کر رہا ہے"

میں بہت حیران تھا، بیساختہ اپنی کرسی پر سے اُٹھا، اُسکی طرف لپکا، اور اُس سے جا کر لپٹ گیا، میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے، میں نے پیرمرد کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

وہ معذرت کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اُس نے کہا "میں اِس منظر کے لیے تیار ہو کر نہیں آیا تھا"

یہ بالکل سچ تھا، میں نے جو کچھ کیا وہ بھی محض اضطراری تھا، اُس نے آہستہ سے میرا ہاتھ پکڑا، گویا وہ میرا کوئی پرانا دوست تھا، اُس نے مجھے اپنے پاس بیٹھ جانے کی استدعا کی اور کہا "یہ باقی کتابیں بھی دیکھ لیجیے۔"

میں اُسکے پاس بیٹھ گیا، اور اسکی باقی کتابیں کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ میں نے چند ساعت اُس سے اُن کے متعلق گفتگو کی۔ اور رات کو اپنے یہاں ٹھہرنے کے لیے کہا۔

خوابگاہ میں اسکے پہنچ جانے کے بعد میں پھر کتب خانہ میں لوٹا اور اُس عجیب و غریب کتاب کے

مطالعہ میں رات بھر منہمک رہا۔

صبح میرا چھوٹا بچہ میرے کتبخانہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ لمپ روشن تھا اور کتاب ابھی تک سامنے کھلی ہوئی تھی۔ میں نے اسکی دلکش آواز سُنی وہ کہہ رہا تھا "ہم آگئے، ہم آگئے"

لیکن نہ معلوم اس حالت کو دیکھ کر اُس پر کیا اثر ہوا کہ وہ وہیں جھجکا، اور اُسکی زبان سے بیساختہ نکلا "ہم آجائیں، ابامیاں ہم آجائیں؟"

میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو بچہ دروازے سے لپٹا ہوا کھڑا تھا۔ میں نے بلبن نامہ کو رکھدیا، اور اُسکی طرف لپکا۔ وہ ہنستا ہوا میری گود میں آبیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد جبکہ میں اُس سے باتیں کرنے میں مشغول تھا پیرمرد بھی کتب خانہ میں داخل ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اُسکے چہرے پر خوشدلی کے آثار نمایاں تھے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ رات بفکری سے گذاری تھی، وہ بچہ کو دیکھ کر ہنسنے لگا اور اُس سے دیر تک باتیں کرتا رہا

اسکے بعد میں نے کچھ دیر اس سے گفتگو کی اور کچھ کتابیں اپنے کتب خانہ کے لیے انتخاب کیں۔ وہ اُسی روز شام کو رخصت ہوگیا، اور بشرط حیات واپس آنیکا وعدہ کر گیا۔

سات مہینے گذر چکے ہیں۔ وہ ابھی تک نہیں لوٹا۔ اُسکی امانت میرے ہاتھ میں ہے اور اُسکا ترجمہ تنقید و حواشی کے ساتھ چند سال بعد اہل ملک کے سامنے ہوگا۔

میں اُس پیرمرد کا ٹھیک پتہ نہیں جانتا، اسلیے کہ باوجود اصرار اس نے اسکے اظہار سے نہ معلوم کن وجوہ کی بناپر گریز کیا۔

اب جب کبھی یہ عجیب و غریب کتاب میرے سامنے آتی ہے میں دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ اُس پیرمرد کی عالی ظرفی و فیاضی زیادہ حیرتناک ہے، یا یہ کتاب جسے وہ مجھے دے گیا ہے، اور جس کو میں اپنے خیال میں محض اُسکی امانت کے طریق پر رکھے ہوئے ہوں؟
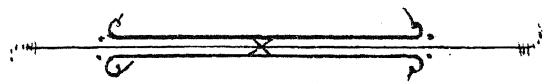
نوٹ:۔ ادب بابتہ ماہ جولائی میں "یادگار نسیم پر ایک سرسری نظر" کے لکھنے والے محمود حسین صاحب ہیں محمد حسین غلطی سے چھپ گیا تھا۔ ناظرین اس کی صحت فرمالیں۔

صیغۂ تعلیم کی بے پروائی

مولانا سید سبط الحسن صاحب فاضل ادب سابق لکچرار کرسچین کالج الہ آباد

یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ پہلے جو طلبا کالج اور اسکول سے نکلتے تھے وہ بہ نسبت اب کے طالب علموں کے زیادہ قابل ہوتے تھے۔ اس کا سبب ممکن ہے کہ کچھ اور باتیں بھی ہوں لیکن میرے خیال میں زیادہ تر سبب اس کا نصاب تعلیم کی خرابی ہے اور نصاب کی خرابی کا سبب یہ ہو کہ درجوں کے کورس مقرر کرنیکی کمیٹیاں مختلف ہیں اسی سبب سے کسی کمیٹی کو اس کی خبر نہیں ہوتی ہو کہ اس سے نیچے کے درجے میں کیسی کتابیں داخل ہوئیں اور اونچے کے درجہ میں کیسی کتابیں مقرر ہوئیں۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نیچے کے درجہ میں مشکل کتابیں داخل ہو جاتی ہیں اور اونچے درجہ میں بہت سہل جس سے طالب علم کی لیاقت میں ترقی نہیں ہوتی۔ مختلف قسم کی باریکیاں کتابوں میں نکالی جاتی ہیں، لیکن کوئی معیار قابلیت کا درجوں کے لیے مقرر نہیں ہوتا، اس سے زیادہ خرابی کی یہ بات ہو کہ ایک درجہ کی کتابوں میں بہ نسبت دوسرے درجہ کے اصولاً اسقدر اختلاف ہوتا ہے کہ بچوں کے دماغ پریشان ہو جاتے ہیں اور کوئی صحیح نقش اُن کے دل پر نہیں جمتا۔ نصاب تعلیم میں جو جو خرابیاں ہیں ہم اُن کو مفصل بیان کرنا چاہتے ہیں سب سے پہلے ہم قواعد اردو کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کیونکہ ہر ایک زبان میں تعلیم کی جڑ یہی ہے۔ اردو زبان کے قواعد صرف و نحو کے منضبط کرنیکا سلسلہ سوا سو برس سے ہے پہلی کتاب قواعد اردو کی مسمیٰ بہ دریائے لطافت فارسی زبان میں انشاء اللہ خاں نے سنہ ۱۸۰۲ء میں لکھی تھی۔ اسکے بعد مولوی احمد علی صاحب دہلوی نے ایک ابتدائی رسالہ صرف و نحو کا اردو میں لکھا جو سنہ ۱۸۴۵ء میں طبع ہوا جس کا نام فیض کا چشمہ ہے پھر مولوی امام بخش صاحب صہبائی نے جو دہلی کالج میں پروفیسر تھے ایک کتاب اردو صرف و نحو کی لکھی جو سنہ ۱۸۴۹ء میں طبع ہوئی، اسکے بعد بہت سی کتابیں قواعد اردو کی مدارس سرکاری کے لیے لکھی گئیں یہ سب کتابیں عربی و فارسی کی صرف و نحو کے تتبع میں تحریر ہوئیں لیکن جب کثرت کے ساتھ قواعد اردو کی کتابیں لکھی گئیں تو جدت پسند حضرات نے اجتہاد شروع کیا سب سے پہلے مولوی اسمٰعیل صاحب نے دو چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے جو کسی قدر عربی و فارسی کی صرف و نحو کے تتبع سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اسکے بعد اور حضرات بھی کچھ نہ کچھ عربی و فارسی کے اصول سے ہٹ کر قواعد لکھنے لگے۔ آخر میں مولوی عبدالحق صاحب دہلوی نے ایک بسیط کتاب

قواعد اردو میں لکھی جس میں یہ دعویٰ کیا کہ اردو زبان کو جیسی قواعد کی ضرورت ہی اُسکے مطابق یہ کتاب ہی اور میں نے جدھر اردو زبان کا رجحان دیکھا ہے اُدھر ہی اُس قواعد کے لکھنے میں اسکا ساتھ دیا ہی، پھر ایک کتاب زین العابدین صاحب فرجاؔ نے مسمّی بہ آئین اردو لکھی جس میں یہ ظاہر کیا کہ مولوی عبدالحق صاحب کی قواعد اردو ہرگز اردو زبان کے مناسب نہیں ہے بلکہ اُنھوں نے یہ چاہا ہے کہ انگریزی زبان کے اصول پہ اردو قواعد مرتب کریں اور انگریزی اور اردو زبان میں بعد المشرقین ہی، میں نے یہ قواعد ایسی لکھی ہی جو اردو زبان چاہتی ہی اور قواعد اردو عبدالحق صاحب میں جو مسائل اُن کے نزدیک غلط تھے اُن کی فہرست بھی کتاب میں لگا دی، غرض جتنے لوگ فارسی اور عربی کی لائن سے ہٹے اُنھوں نے ایک نیا راستہ نکالا اور ایک دوسرے کی رائے سے متفق نہ ہوا۔ اگر ان شہسواران علم و ادب کی تگ و دو پبلک ہی کے میدان تک محدود رہتی تو نہایت مناسب تھا کیونکہ محکمہ تعلیم اگر کسی وقت توجہ کرتا تو ان کتابوں سے اسکوٹری ردّ ملتی اور وہ بہت آسانی سے ایک لائن ایسی قرار دیدیتا جس پر مدارس سرکاری کے لیے قواعدیں لکھی جاتیں وہ لائن خواہ مناسب ہوتی یا نہوتی مگر ہر شخص جو طلبار کیلئے قواعد لکھتا وہ مجبوراً اُس کا پابند ہوجاتا اور چونکہ وہ کتابیں ایک لائن پر ہوتیں لہٰذا طلبار کی سمجھ میں آسانی سے آجاتیں لیکن قیامت تو یہ ہوئی کہ ان کتابوں کا اثر اسکول کی کتابوں میں بھی پہنچا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک درجے میں تو لڑکوں نے کچھ پڑھا اور اُس سے اونچے درجے میں جب گئے تو وہاں اُسکے خلاف پڑھا پہلے نقش کا دماغ سے مٹنا آسان نہیں ہوتا لہٰذا دوسرا نقش اُن کی سمجھ میں نہ آیا اور بالآخر اُنھیں شکایت پیدا ہوی کہ دوسری زبانوں کی قواعد ہم سمجھ لیتے ہیں لیکن اپنی زبان کی قواعد ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اسوقت حسب ذیل کتابیں قواعد اردو کی صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے اسکولوں میں داخل ہیں۔

درجہ سوم و چہارم اینگلو ورناکیولر و ورناکیولر مدارس میں: تہذیب القواعد[1] حصہ اول، رسالہ قواعد اردو[2] حصہ اوّل، قواعد اردو[3] حصہ اول (جمال الدین حیدر)

درجہ پنجم لغایت ہشتم اینگلو ورناکیولر مدارس میں: مبادی القواعد[1]، افضل القواعد[2]

درجہ[۱] پنجم لغایت ہفتم ورناکیولر مدارس میں: تہذیب القواعد[1] حصہ دوم، رسالہ قواعد اردو[2] حصہ دوم، قواعد اردو[3] حصہ دوم (جمال الدین حیدر)

---

[۱] جو کتابیں درجہ پنجم لغایت ہفتم ورناکیولر مدارس میں منظور ہیں وہ اینگلو ورناکیولر مدارس میں بھی درجہ پنجم لغایتہ ہشتم میں بکثرت پڑھائی جاتی ہیں۔

ہائی اسکول اکزامینیشن میں قواعد اردو جمال الدین حیدر۔ اساس اُردو۔

یہ کل کتابیں آپس میں ایک دوسرے سے اسقدر مختلف ہیں کہ اگر علم صرف کا پہلا سوال لڑکوں سے پوچھا جائے کہ کلمے کی کتنی قسمیں ہیں تو کچھ لڑکے کہیں گے پانچ اور کچھ کہیں گے دو اور کچھ کہیں گے تین، یہ نہیں کہ چھوٹے درجے کے لڑکے کم تعداد بتائیں اور بڑے درجے کے زیادہ بلکہ اسکے برعکس بتائیں گے۔ جب اصول ہی میں اختلاف ہو گیا تو فروعات کے اختلافات کی کیا حد ہو سکتی ہے۔

خشت اوّل گر نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

اگر لڑکوں سے اسم کا یا کسی کلمہ کا شجرہ بنوایا جائے تو کسی کے یہاں دادا پوتا نظر آئیگا اور کسی کے یہاں پوتا دادا یہ بات نہیں ہے کہ مختلف مصنفین کی وجہ سے یہ اختلاف کتابوں میں ہے بلکہ ایک ہی مصنف نے جو تین تین حصے کتابوں کے لکھے ہیں اس میں پہلے حصے میں کچھ بتایا ہے دوسرے میں اُسکے خلاف اور تیسرے میں دونوں کے خلاف، مثلاً تہذیب القواعد حصہ اول میں کلمے کی پانچ قسمیں بتائی گئی ہیں اور حصہ دوم میں تین اور اساس اردو میں دو اور یہ تینوں کتابیں ایک ہی مصنف کی لکھی ہوئی ہیں تمام اختلافات کے لکھنے کے لیے ایک پوری کتاب کی ضرورت ہے لیکن مثال کے لیے ہم اس سلسلے میں سے چند اختلافات لکھتے ہیں۔

(۱) تہذیب القواعد حصہ اول صفحہ ۲۳ و ۲۴ و نیز حصہ دوم صفحہ ۶۳ و ۶۴ میں ماضی کی چھ قسمیں بتائی گئی ہیں اور "اساس اردو" کے صفحہ ۹۰ تا ۹۴ میں ماضی کی پانچ قسمیں بیان کی گئی ہیں ماضی قریب نہیں بتائی گئی اسکے صیغوں کو فعل حال بتایا گیا ہے۔

(۲) تہذیب القواعد حصہ اول صفحہ ۲۰ و نیز حصہ دوم صفحہ ۵۷ میں فعل حال کی ایک قسم بتائی گئی ہے اور اساس اردو کے صفحہ ۹۴ تا ۱۰۱ میں فعل حال کی چھ قسمیں بتائی گئی ہیں۔ مضارع، امر، حال مطلق، حال ناتمام، حال تمام، حال احتمالی اس میں ماضی قریب حال تمام بتایا گیا ہے

(۳) تہذیب القواعد حصہ دوم صفحہ ۸۶ میں سجاوٹ، بناوٹ وغیرہ ایسے اسماء حاصل مصدر بتائے گئے ہیں اور "اساس اردو" صفحہ ۷ میں ایسے اسما کے لیے اسمائے کیفیت کا لفظ ایجاد کیا گیا ہے۔

(۴) تہذیب القواعد حصہ اول صفحہ ۸ میں صفت بجائے خود کلمہ کی ایک قسم ہے اور حصہ دوم صفحہ ۱۹ میں اسم نکرہ کی قسم ہے اور اساس اردو میں کلمہ مستقل کی ایک قسم ہے۔

(۵) تہذیب القواعد حصۂ دوم صفحہ ۱۸ میں اسم اشارہ اسم معرفہ کی قسم ہے جسکی ایک قسم ضمیر بھی ہے یعنے ضمیر اور اسم اشارہ دونوں معرفہ کی قسمیں ہیں اور اساس اردو صفحہ ۷۲ و ۸۰ میں اشارہ ضمیر کی قسم ہے

(۶) تہذیب القواعد حصہ اول صفحہ ۹ میں ضمیر بجائے خود کلمہ کی ایک قسم اور حصۂ دوم صفحہ ۱۸ میں ضمیر اسم معرفہ کی قسم بتائی گئی ہے اور اساس اردو میں کلمہ مستقل کی قسم ہے۔

(۷) تہذیب القواعد حصۂ دوم صفحہ ۱۹ میں اسم استفہام نکرہ کی قسم بتایا گیا ہے اور اساس اردو صفحہ ۷۲ و ۸۷ میں ضمیر کی قسم بتایا گیا ہے۔

(۸) تہذیب القواعد حصہ دوم صفحہ ۱۸ میں اسم موصول اسم معرفہ کی قسم بتایا گیا ہے اور اساس اردو صفحہ ۷۲ و ۷۶ میں ضمیر کی قسم بتایا گیا ہے۔

(۹) تہذیب القواعد حصۂ دوم صفحہ ۱۱۵ میں جملہ اسمیہ جملہ مفرد کی قسموں میں بتایا گیا ہے اور اساس اردو صفحہ ۱۹۲ میں جملہ اسمیہ مرکب جملہ کی قسموں میں بتایا گیا ہے یعنی جملہ بیانیہ جملہ اسمیہ قرار دیا گیا ہے۔

(۱۰) تہذیب القواعد حصہ دوم صفحہ ۱۸ میں - تو - میں - وہ - یعنی - حاضر - متکلم - غائب - اسم کی قسموں میں بیان کیے گئے ہیں اور اساس اردو صفحہ ۷۳ میں ضمیر کی قسم ہیں۔

(۱۱) تہذیب القواعد حصہ دوم کے صفحہ ۵۶ میں ہے

فائدہ - حروف س - ب - ت - ع - ا - ط - مؤنث بولے جاتے ہیں باقی مذکر

اور اساس اردو کے صفحہ ۲۶ میں ہے -

۱۷ - حروف تہجی س، ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، چ، ح، خ، ر، ڑ، ز، ژ، ط، ظ، ف، ہ، ی مؤنث ہیں اور باقی حروف مذکر - میم اور جیم کی بابت اختلاف ہے مگر اتفاق مذکر ہی پر ہے - اس قسم کے اختلافات کثرت سے ہیں -

غرض قواعد اردو کی جتنی کتابیں اسوقت اسکولوں میں جاری ہیں وہ آپس میں اختلافات سے بھری ہیں اور ظاہر ہے کہ لڑکوں کے لیے ایسی تعلیم کسقدر مضر ہوگی لہذا ان کی یہ شکایت کہ قواعد اردو ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہرگز بیجا نہیں ہے -

جتنی کتابیں اسوقت داخل نصاب ہیں ان میں سے اگر کوئی مدرس منتخب کرکے ایسی کتابیں لینا چاہے کہ شروع سے آخر درجے تک ایک لائن پر کتابیں مل جائیں تو نہیں مل سکتیں - ان اختلافات کی وجہ سے لڑکوں پر جو ظلم ہوتا ہے وہ ناقابل برداشت ہے فرض کرو کہ کسی مدرسے میں اساس اردو پڑھائی جاتی ہے اور دوسرے مدرسے میں قواعد اردو

جمال الدین حیدر کی اور امتحان میں سوال آیا کہ "زید کھڑا رہا تھا" اس جملہ کی ترکیب نحوی کرو تو قواعد اردو پڑھنے والے لڑکے نے جملہ اسمیہ کی ترکیب کر دی اور اساس اردو پڑھنے والے لڑکے نے جملہ بیانیہ کی ترکیب کر دی۔ ممتحن صاحب ان دونوں میں سے ایک کو ضرور ہی فیل کرینگے کیونکہ اجتماع ضدین کیسے ہوسکتا ہے حالانکہ دونوں لڑکوں کی کوئی خطا نہیں ہے جو اُن کو پڑھایا گیا وہ اُنھوں نے لکھدیا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ زیادہ تر لڑکے جو قواعد اردو میں کم نمبر پاتے ہیں اسکا سبب یہ نہیں ہے کہ لڑکے قواعد اردو پڑھتے نہیں ہیں بلکہ کتابیں قواعد اردو کی ان کے درجوں میں غلط ہیں۔ سب سے زیادہ ستم یہ ہوا ہے کہ ان گرامروں میں مسائل غلط بیان کیے گئے ہیں اور ان پر بھی صیغہ تعلیم نے کچھ توجہ نہیں کی۔ مثالاً چند غلطیاں اس قسم کی ہر ایک کتاب سے لکھی جاتی ہیں۔

تہذیب القواعد حصہ دوم کی غلطیاں

(۱) صفحہ ۶۶ و صفحہ ۱۲۱ میں ہوا، تھا وغیرہ فعل ناقص بتلائے گئے ہیں اور صفحہ ۱۲۳ سے ۱۲۵ تک جملہ اسمیہ کے بیان میں ان کو حرف ربط بتایا ہے اور ایک تنبیہ لکھی ہے جسکی پوری عبارت ہم نقل کرتے ہیں۔

"تنبیہ - دراصل تھا۔ تھے۔ تھیں۔ حروف ربط زمانی - اور ہے۔ ہیں۔ ہو۔ ہوں۔ حروف ربط غیر زمانی ہیں۔ اکثر قواعد نگاروں نے ان کو فعل ناقص لکھا ہے لیکن یہ نہ خیال کیا کہ فعل ایک مستقل کلمہ ہے اور تنہا مسند ہوتا ہے اور یہ حروف ایک غیر مستقل کلمے ہیں اور تنہا مسند نہیں ہوسکتے۔ ایک اسم یا دو اسم کے ساتھ آتے ہیں۔ اسم کے ساتھ نہ آئیں تو اُن سے کوئی معنی نہیں سمجھے جاتے اگر ان کو فعل ناقص کہا جائے تو اردو میں جملہ اسمیہ کون جملہ قرار پائیگا۔ علاوہ ازیں فعل مصدر سے مشتق ہوتا ہے اور یہ غیر مشتق ہیں"

اس اجتماع ضدین سے کہ ایک جگہ ہوا، تھا وغیرہ فعل ناقص بتائے گئے اور دوسری جگہ اُسکی تردید کرکے حرف بتائے گئے۔ بچوں کا کیا ذکر ہے بڑوں کی عقل حیران ہو جاتی ہے کہ ہم کس کو صحیح سمجھیں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مختلف قواعدوں سے عبارت بغیر سمجھے ہوے نقل کی ہے۔ ایک کتاب میں پہلی عبارت لکھی تھی اور اُسمیں ہوا، تھا وغیرہ فعل ناقص لکھے ہوے تھے لہذا وہ نقل کر دی دوسری قواعد میں دوسری عبارت لکھی ہوئی تھی وہ نقل کر دی اسکا خیال کہ ہمارے بیان میں اختلاف نہ ہونے پائے وہ شخص کرتا ہے جو سمجھ کے نقل کرتا ہے۔

(۲) صفحہ ۱۵ میں غائب۔ حاضر۔ متکلم۔ اسم کی قسمیں قرار دی گئی ہیں اور "تو" اسم حاضر اور "میں" اسم متکلم بتایا گیا ہے اور صفحہ ۲۲ میں یہ ضمیر کی قسمیں بتائی گئی ہیں یعنے "وہ" ضمیر غائب اور "تو" ضمیر حاضر اور "میں" ضمیر متکلم۔ اس اختلاف کا سبب بھی

وہی ہے جو پہلے مسئلہ میں بیان کیا گیا۔

(۳) صفحہ ۳۳ میں اسم ظرف کے بیان میں ہے۔

"(۲) کبھی اسم کے آخر میں ستھان، واری، سال، سالہ، شالہ، ال، یال، الہ بڑھاتے ہیں جیسے دیوستھان پھلواری، ٹکسال، دھرمسالہ، پاٹ شالہ، سسرال، ننھیال، شوالہ۔"

تنقید۔ مثالوں میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو اسم کے آخر میں علامت مذکورہ بڑھانے سے نہیں بنے بلکہ اسم میں کچھ تغیر ہونے کے بعد بڑھائے گئے ہیں۔ جیسے پھُل، ٹک، ننھ، کوئی اسم نہیں ہیں۔

(۴) صفحہ ۳۲ میں اسم آلہ کے بیان میں ہے۔

"(۲) بعض میں مصدر کے الف کو یائے معروف سے بدل دیتے ہیں۔ جیسے کھرچنا سے کھرچنی۔ کترنا سے کترنی۔ دھونکنا سے دھونکنی۔ چھاننا سے چھلنی۔ پھونکنا سے پھکنی۔ لیکن پھانسنا سے پھانسی میں نا گرا کر یائے معروف بڑھائی ہے۔ کسنا سے کسوٹی میں امر پر وٹی بڑھایا ہے۔"

تنقید۔ کسنا اور پھانسنا کے تصرف تو لکھدیے لیکن پھونکنا اور چھاننا میں بھی تصرف کیا گیا ہے وہ نہیں لکھے، پھونکنا میں واؤ گرا کر مصدر کے الف کو یائے معروف سے بدلا ہے اور چھاننا میں ھ کے بعد کے الف کو ل سے بدل کر قاعدہ جاری کیا ہے۔

(۵) صفحہ ۳۰ میں اسم تصغیر بنانے کے قاعدہ میں ہے۔

"(۲) کبھی الفاظ کے آخر میں وا۔ یا بڑھانے سے۔ جیسے جورو سے جوروا۔ مرد سے مردوا۔ لونڈی سے لونڈیا۔ بھائی سے بھیا (اس لفظ میں ھ کے بعد کا الف گر جاتا ہے)"

تنقید۔ بھائی میں جو تصرف ہوا ہے وہ لکھدیا لیکن جورو اور لونڈی میں جو تصرف ہوا ہے وہ نہیں لکھا اگر بغیر تصرف کے قاعدہ جاری ہوتا تو جوروا۔ لونڈی یا۔ ہوتا۔

(۶) اُسی صفحہ میں اُسی سلسلے میں ہے۔

"(۳) کبھی ڑا۔ ڑی۔ لی۔ لا۔ یا وغیرہ اسم کے آخر میں بڑھا دیتے ہیں۔ جیسے آنکھ سے انکھڑی۔ گانٹھ سے گٹھڑی۔ مکھ سے مکھڑا۔ پلنگ سے پلنگڑی۔ جو سے جوڑا۔ کونڈے سے کونڈالی۔ تاند سے تندولا۔ کھاٹ سے کھٹولا۔ انبہ سے انبیا۔"

تنقید۔ مثالوں میں بہت سے الفاظ ہیں کہ اسم کے آخر میں علامت مذکرہ بڑھانے سے نہیں بنے بلکہ اسم میں

کچھ تصرف بھی ہوا ہے جو ظاہر نہیں کیا گیا۔ یعنی آنکھ۔ گانٹھ۔ کونڈے۔ ناند۔ کھاٹ۔ انہیں کچھ تصرف ہونے کے بعد علامات متذکرہ بڑھائے گئے ہیں۔

(۷) صفحہ ۶۰ میں بے جان چیزوں کی تانیث کی بحث میں ہے۔

"(۲) جن عربی مصدروں کے آخر میں الف یا ت ہو یا مفاعلت یا تفعیل کے وزن پر ہوں وہ مؤنث ہیں تعویذ اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے۔"

تنقید۔ انشا۔ انزا۔ تماشا۔ احیا۔ اخفا۔ اجرا۔ استقرا۔ استہزا۔ اثبات۔ خلعت۔ رایت۔ شربت۔ تفاوت سیکڑوں مصادر ایسے ہیں جن کے آخر میں الف یا ت ہے اور وہ مذکر ہیں۔

(۸) پھر اُسی صفحہ میں اسی بحث میں ہے۔

"فائدہ۔ حروف س۔ ب۔ ت۔ ع۔ ا۔ ط۔ مؤنث بولے جاتے ہیں۔ باقی مذکر"

تنقید۔ الف کو کوئی مؤنث نہیں کہتا۔ ع بھی مختلف فیہ ہے بلکہ زیادہ تر مذکر بولا جاتا ہے، علاوہ اُن حروف کے جو مؤنث لکھے ہیں اور یہ حروف بھی مؤنث ہیں۔ مثلاً پ۔ ٹ۔ ث۔ چ۔ ح۔ خ۔ د۔ ڈ۔ ذ۔ ر۔ ڑ۔ ز۔ ژ۔ ظ۔ ف۔ ہ۔ ی۔ ان کو کوئی بھی مذکر نہیں کہتا۔

(۹) صفحہ ۷۰ میں جمع کے بیان میں ہے۔

"(۱) مذکر اسم جن کے آخر میں الف یا ہ ہو تو الف یا ہ کو یائے معروف سے بدلکر جمع بناتے ہیں۔"

تنقید۔ بالکل غلط۔ بلکہ یائے مجہول سے بدل کر جمع بناتے ہیں۔ جیسا کہ خود اسی کتاب میں لڑکا۔ قصہ کی جمع لڑکے۔ قصے بنائی گئی ہے۔

(۱۰) اسی سلسلے میں صفحہ ۷۰ میں ہے۔

"(۳) اگر مؤنث اسم کے آخر میں واو معروف اور الف ہو تو الف یا نون کو ہمزہ سے بدل کر تین جمع کا لگاتے ہیں اگر صرف واو ہو تو ہمزہ بڑھا دینگے۔ جیسے خوشبو۔ خوشبوئیں۔ جوں۔ جوئیں۔"

تنقید۔ کیا دنیا میں کوئی اس مہمل مسئلہ کا مطلب سمجھ سکتا ہے؟

(۱۱) صفحہ ۷۱ میں فعل مرکب کی قسموں میں ہے

(۱) فعل ابتدائی

ع ہونے لگا گھٹ ٹپا اندھیرا طائر لینے لگے بسیرا

ہونے لگا اور لینے لگے میں لگا اور لگے سے ہونے اور لینے کے کام کا شروع کرنا سمجھا جاتا ہے۔ ایسے فعلوں کو فعل ابتدائی کہتے ہیں۔

فعل ابتدائی وہ مرکب فعل ہے جس سے کسی کام کا شروع کرنا سمجھا جائے۔

قاعدہ۔ مصدر کے الف کو یائے مجہول سے بدلکر جس فعل کا جو صیغہ بنانا چاہو وہ اسکے ساتھ ملادو"

تنقید۔ قاعدہ کا کچھ مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ ہونا یہ چاہیے کہ مصدر کے الف کو یائے مجہول سے بدل کر جس فعل کا جو صیغہ بنانا چاہو وہ مصدر لگنا سے بنا کر اُسکے ساتھ ملادو۔

(۱۲) صفحہ ۸۲ میں ہے۔

(۳) فعل اجازتی

"آپ کے دل پر نہ میل آنے دیا ہے پر طبیعت چین یاں لینے بھی دے

آنے دیا۔ لینے دے میں دیا اور دے سے آنے اور لینے کام کی اجازت سمجھی جاتی ہے۔ ایسے مرکب فعلوں کو فعل اجازتی کہتے ہیں۔

فعل اجازتی وہ مرکب فعل ہے جس سے کسی کام کی اجازت سمجھی جائے۔

قاعدہ۔ مصدر کے الف کو یائے مجہول سے بدلکر جس فعل کا جو صیغہ بنانا چاہو وہی اُس پر بڑھادو"

تنقید۔ یہ قاعدہ بھی مہمل ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ مصدر کے الف کو یائے مجہول سے بدلکر جس فعل کا جو صیغہ بنانا چاہو وہ مصدر دینا سے بنا کر اُس پر بڑھادو۔

(۱۳) صفحہ ۸۶ میں مصدر سے مادہ اور حاصل مصدر بنائے گئے ہیں اسمیں مصدر "رکانا" سے حاصل مصدر "رکاو" بنایا گیا ہے اور مادہ "اُسکار" کا لکھا گیا ہے

تنقید۔ رکانا کوئی مصدر نہیں ہے رُکنا یا روکنا ہے رُکا ماضی کا صیغہ رُکنا سے ہے مادہ نہیں ہو سکتا کیونکہ مادہ امر کا صیغہ اردو میں ہوتا ہے۔

(۱۴) صفحہ ۹۱ میں اسم حالیہ کے بیان میں ہے۔

"قاعدہ۔ مادہ مصدری پر واحد مذکر کیلیے تا ہوا یا الف یا یائے مجہول اور واحد مؤنث کیلیے تی ہوئی یا تی جمع مذکر کیلیے تے ہوے یا تے اور جمع مؤنث کے لیے تی ہوئیں یا تی بڑھادو۔"

تنقید۔ مادہ مصدری پر الف یا یائے مجہول بڑھانے سے کوئی صیغہ حالیہ واحد مذکر کا نہیں بنتا۔ مثلاً بنا بنے لکھا لکھے گرا گرے، اس میں کوئی حالیہ نہیں ہے۔ کوئی مثال ایسے حالیہ کی نہیں دی گئی۔ اسی قسم کی پینتیس غلطیوں کے نوٹ میرے پاس ہیں اگر بالاستیعاب کتاب دیکھی جائے تو غالباً اور بھی زیادہ مسائل غلط نکلیں

دوستداران بشر

(۲)

"ژان دارک" یا "جون آف یارک"

محترمہ سیدہ ساجدہ بیگم

جس طرح مردوں کے افراد نے مختلف زمانوں میں کارہائے بزرگ کئے ہیں اور بنی نوع انسان کو اپنی ذات سے بڑے بڑے فائدے پہنچائے ہیں یا اپنے کاموں کی عظمت کی بدولت اپنا نام نیک صفحہ روزگار میں یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ اُسی طرح بعض عورتوں نے بھی اعصارِ مختلفہ میں ایسے کارہائے نمایاں کے علاوہ جو انکی ہمجنسوں سے شاید ہی کبھی عمل میں آئے ہوں گے بہت سے خارق عادات کام بھی کر دکھائے ہیں۔ اور خاصکر انبیا اور بانیان مذاہب مثلاً حضرت عیسیٰؑ و موسیٰؑ کے زمانوں میں تو عورتوں کی ذات سے بیشمار مفید خدمتیں عمل میں آئی ہیں۔ اور جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہی خود حضرت ختمی مرتبتؐ کے زمانہ میں سب سے پہلی مفید خدمت اُس وجود ذیجود کے ساتھ حضرت خدیجہؓ سے عمل میں آئی ہے۔ اسی قسم کی عورتوں نے اپنے اپنے زمانہ میں ہیئت جامعہ انسانی کے ساتھ بڑے بڑے احسانات کئے ہیں۔ لیکن امور سیاسی میں بہت ہی کم دیکھا گیا ہے کہ کسی عورت نے اپنی ملت کی خدمت کی ہو یا یہ کہ اسکی ذات سے ملک و ملت کے حق میں کوئی مفید کام ہوا ہو۔ لیکن ژان دارک اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ اسلئے کہ اس زنِ مرد صفت نے محض کارہائے مردانہ ہی نہیں کئے بلکہ غیرت و قوت قلبی کی حیثیت سے بھی اکثر مردوں سے گوے سبقت لیگئی ہے۔ یہ وہ عورت ہے جسے خوابان روزگار کی سردفتر بننے کا حق حاصل ہے۔ نہ فقط اسکی نوع کو بلکہ تمامی جنس بشری کو اسکے وجود یا نمود پر فخر و مباہات کرنا چاہئے اگر کسی کو یہ منظور ہو کہ غیرت و شہامت کا مجسمہ اپنی آنکھوں سے دیکھے تو چاہئے کہ اس خاتون کے حالات پر نظر کرے۔ اور مشاہدہ کرے کہ اس نادرۂ دوراں و اعجوبۂ روزگار نے انتہائی درجہ کے شور و شغب کے زمانہ میں اپنے ملک و ملت کی کس طرح فریاد رسی کی ہے اور کس طرح گرداب ذلت و شقاوت سے نجات دلائی ہے۔ ہاں۔ ژانؔ دارک وہ نام ہے جسے اہل فرانس

کی ہر فرد مقدس سمجھتی ہے اور اس نام دالی عورت کی جملہ شایستہ خدمات کو جو اس نے اہل وطن کے ساتھ کی ہیں ہمیشہ سراہا کرتی ہے۔ اگر مختلف ممالک اور اقوام کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو نظر آئیگا کہ جب اور جس کسی نے بھی شدت و سختی کے موقع پر اپنے وطن کی کوئی خدمت کی ہے تو اسکا مطمح نظر ہمیشہ حصول جاہ و جلال و ترقی مدارج و مراتب رہا ہے اور ساتھ ہی اُسکے جس حد تک کہ حزم و احتیاط نے اجازت دی اپنی فداکاری کو محدود رکھا ہے۔ برخلاف اس محترم خاتون کے جس نے وطن پر سے اپنی جان تصدق کر دی لیکن کسی حالت میں بھی جاہ و حکمت اور تمول و دولت کا خیال تک دل میں نہ لائی۔ اور بقول خود اپنے مذہب وطن کے ساتھ فریضۂ انسانیت ادا کیا۔ اسکی زندگی کے حالات مردوں کے لئے تازیانۂ غیرت اور عورتوں کیلئے مایۂ عبرت ہیں۔ مشکل سے کوئی ایسی پھٹس طبیعت کا آدمی نکلے گا جسکی حمیت اسکے (ژان دارک کے) حالات کے مطالعہ سے ہیجان میں نہ آجائے جس زمانہ میں کہ فرانس کا اُفق سیاست ہر طرف سے مکدر و تیرہ و تار ہو رہا تھا اور وہاں کی ساری فضا پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اس خاتون نے تجلی نور کی طرح جلوہ افروز ہو کر اُس ملک اور ملک والوں کو اس تاریکی سے نجات دلا دی۔ اور اپنے گرامی قدر وطن کو اغیار کے وجود سے خالی کرا دیا ہاں! مملکت فرانس کو لازم ہے کہ اسکی رہین منت رہکر ہمیشہ اسکو غیرت مجسم اور وجود مکرم کے نام سے پکارا کرے اور عالم وطن پرستی میں اُسے یکتا و یگانہ شمار کرے۔ اذا کان النّساء ھٰذہٖ لفضلت النّساءُ علی الرّجالِ
"جب عورتیں اس شان کی ہوں تو البتہ عورتوں کو مردوں پر فضیلت حاصل ہے"

سنہ ۱۴۱۲ء مطابق ۸۱۵ھ میں چارلس بادشاہ فرانس کا دماغ مختل ہوگیا۔ اسلئے امور مملکت میں خرابی پڑنے لگی اُسی زمانہ میں ہنری پنجم شاہ انگلستان نے یہ دعویٰ کیا کہ اُن حقوق کی بنیاد پر جو انگلستان کے سلاطین سابق کو حاصل تھے فرانس کا تخت و تاج اصل میں میرا حق ہے۔ اور اس لئے سارا ملک ہی میرا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں عمائد و اکابر فرانس کے درمیان آپس میں جھگڑا پیدا ہوا کہ حق کس کی طرف ہے۔ اور ان دونوں بادشاہوں میں سے کسے فرانس کے سریر سلطنت اور اریکۂ حشمت پر متمکن ہونا چاہئے۔ فرانس کے ان جھگڑوں اور بے نظمیوں کو دیکھکر ہنری کو زائد الوصف خوشی ہوئی اور پہلے سے بھی زیادہ اس امید کے حصول کے درپے ہوگیا۔ اور آخر کار فرانس کے ساتھ جنگ چھیڑ ہی دی۔ سب سے پہلے یہ کام کیا کہ تمام قلعوں اور دوسرے مقاموں پر جو دریائے سین کے داہنے کنارے پر واقع تھے قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں اُس لشکر کیساتھ جسکی تعداد فرط احتیاج اور بیماری کی وجہ سے گھٹ گھٹا کر ایک ثلث رہ گئی تھی شہر کالے Calais کی طرف رُخ کیا ادرجو راہ کہ اڈورڈ سوم شاہ انگلستان نے

اختیار کی تھی اور فتحیاب ہوا تھا اسی پر یہ بھی چلا۔ درمیان راہ میں لشکر فرانس سے جس کے نفوس کی تعداد ساٹھ ہزار تھی مڈبھیڑ ہو گئی۔ اگرچہ اسوقت ہنری کی فوج میں صرف ۹ ہزار سپاہی تھے مگر چونکہ وہ مقام جہاں اس سے پہلے انگریزوں کو فتح وظفر نصیب ہو چکی تھی یہاں سے چنداں دور نہ تھا اور فتح سابق کی یاد نے ان کی رگ غیرت میں ایک ہیجان سا پیدا کر دیا تھا اسلئے ہر سپاہی اس بات پر تلا ہوا تھا کہ یا تو فتح حاصل کریگا یا مردانگی کے ساتھ شربت موت نوش کریگا۔ علاوہ اس کے یا تو پنجہ دشمن کے خون سے لال ہوگا یا میدان قتال میں اپنے ہی خون میں نہائیگا چونکہ میدان قتال کی زمین بارش کی وجہ سے مرطوب ہو گئی تھی اسلئے فرانس کے سوار کیچڑ کی زیادتی سے پیش قدمی نکر سکے۔ انگلستان کے بے نظیر تیراندازوں نے دشمن پر جی کھول کر تیر برسائے اور چاروں طرف سے میدان اُنکے لئے تنگ کر دیا یہانتک کہ بمصداق آیہ کریمہ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ میم اقبال پرچم انگلستان پر چلی اور فرانسیسی سپاہ سخت نقصان جان و مال کے ساتھ مغلوب ہو گئی اور راہ فرار اختیار کی مقتولین فرانس میں سے سات شاہزادگان والا تبار۔ ایکسو اُمرائے عالیمقدار اور آٹھ سو عمائد و بزرگان فرانس تھے۔ اور سپاہی تو دس ہزار سے زیادہ کام آئے لیکن انگریزوں کی طرف کشتوں کی تعداد صرف سولہ سو تھی۔ خلاصہ یہ کہ ہنری نے فوراً کالے فتح کر لیا اور کمال تزک و احتشام کیساتھ انگلستان واپس آیا۔ جہاں اسکا استقبال و خیر مقدم نہایت شان کے ساتھ کیا گیا۔ اور مجلس ملی نے ایک مبلغ کثیر پیشکش کیا۔ اس شاندار فتح نے ہنری کے سمند شوق کے ساتھ تازیانہ کا کام دیا۔ اور اس بات پر آمادہ کر دیا کہ فرانس کے ساتھ جنگ کا سلسلہ جاری رکھے۔ اور جسطرح بھی ممکن ہو فرانس کے تاج و تخت کو حیطۂ تصرف میں لے آئے۔ چنانچہ ۱۴۱۷ء میں پھر عنان توجہ فرانس کی جانب موڑی اور صوبۂ نارمنڈی فتح کرکے پے در پے متعدد شہروں پر قابض ہو گیا حتی کہ شہر راؤن نے بھی چھ ماہ کے سخت مقابلہ کے بعد قحط و گرانی کے سبب سے اطاعت قبول کر لی۔ اس طور سے ہنری فرانس کے ایک بہت بڑے حصہ پر قابض ہو گیا۔ چونکہ ملک فرانس میں ابھی تک لوگوں کے درمیان اندرونی نفاق اور خانگی جنگ کا سلسلہ باقی تھا اور وہاں کے اُمرا ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار تھے اسلئے انگریزوں کے مقابلہ میں آنیوالا کوئی بھی نہ تھا۔ ۱۴۲۰ء میں ہنری رفعت و جلالت کی بلندی پر پہنچ گیا۔ اور اس قابل ہو گیا کہ من مانی جو شرطیں چاہے فرانس سے منوالے۔ ان شرائط کے بعد فریقین کے درمیان ایک معاہدہ موسوم بہ عہدنامۂ ٹرائیس ہوا۔ ان شرائط کا بہترین مقصود تو یہ تھا کہ اوّل ہنری شاہِ چارلس کی دختر کیتھرائن کو اپنے حبالۂ نکاح میں لے آئے۔ ثانیاً اس مختل الشعور شاہِ فرانس کے زمانۂ حیات تک ہنری فرانس کا نائب السلطنت مانا جائے۔ ثالثاً شاہِ چارلس کی وفات کے بعد خود ہنری اسکا قائم مقام ہو۔ چونکہ ظاہری اسباب یہ کہہ رہے تھے کہ ہنری حتماً تخت و تاج

فرانس پر متصرف ہوجائیگا لہذا وہ انگلستان واپس آیا لیکن واپسی کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہ خبر پاکر کہ ولیعہد فرانس ایک لشکر گراں کے ساتھ انگریزی فوج پر حملہ کرکے غالب آگیا اور اُسے فرانس سے بھگا دیا ہنری نے فوراً ہی پھر فرانس کا رُخ کیا اور پھر ایک زبردست فتح حاصل کی۔ اب اُسے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ اپنے عالم شباب ہی میں تخت فرانس پر متمکن ہوکر سلطان ترین وخاقان بحرین بنجائے۔ لیکن موت نے اُسے بجائے تخت سلطنت کے تختہ مرگ پر بٹھا دیا۔ اور صرف ۳۳ سال کی عمر میں اُسے دیارِ عدم کو پہنچا دیا۔

اس واقعہ کے دو ماہ بعد شاہ فرانس چارلس بھی دنیا سے چل بسا ہنری ششم لپسر ہنری پنجم جو کیتھرائن دختر چارلس کے بطن سے تھا صرف ۹ ماہ کا تھا جب اسکے والد نے انتقال کیا۔ اسلئے معاہدہ مذکور کی رُو سے اُسے فرانس کا بادشاہ ہونا چاہیئے تھا۔ لہذا اُسکی تاجپوشی کی رسم انگلستان و فرانس ہر دو ممالک میں ادا ہوئی۔ اور اسکا چچا ڈیوک آف بڈفورڈ فرانس کا نائب السلطنت قرار پایا۔ اسوقت تک تمام مملکت فرانس انگریزوں کے قبضہ میں نہ تھی۔ انھوں نے بسرکردگی ڈیوک آف بڈفورڈ فرانس کیساتھ سخت مجادلہ کیا حتیٰ کہ پانچ سال کے بعد یہ اُمید نظر آئی کہ عنقریب جملہ سلطنت فرانس انکے حیطۂ تصرف میں آجائیگی۔ اُسوقت انگریزی محاصرہ شہر آرلینز پر تھا جس کے اطراف میں بڑے بڑے قلعے بناکر پہاڑی توپیں لگادی گئی تھیں تاکہ اندرون شہر کے تمام قلعوں اور برجوں کو گراکر خاک میں ملا دیا جائے۔ چھ ماہ کے عرصہ میں محاصرہ نے اسقدر ترقی کرلی کہ انگریزوں کو یقین ہوگیا کہ شہر مذکور اب زیادہ مقابلہ کی تاب نہیں رکھتا۔ اور عنقریب سر اطاعت خم کردیگا۔ اُسوقت یہی نظر آتا تھا کہ فرانس کی سرنوشت کا دارومدار محض شہر آرلینز کی فتح یا شکست پر ہے۔ اس خاص موقع پر جبکہ فرانس بےانتہا نا اُمیدی اور بدبختی کی حالت کو پہنچ گیا تھا پردۂ غیب سے ایک ہاتھ نمودار ہوا اور عقدۂ دیرینہ کھول دیا۔ یعنی ژان دارک گوشۂ تنہائی سے نکلکر اس بدنصیب ملک کی فریادرسی کیلئے آمادہ ہوگئی۔ یہ بزرگ خاتون ایک دہقان ساکن دامرمی کی بیٹی تھی۔

دامرمی سرحد فرانس و جرمنی پر ایک چھوٹا سا قریہ ہے۔ اسکی ولادت ۱۴۱۲ء مطابق ۸۱۵ھ میں ہوئی اور وہ لڑکپن ہی سے مثل اور دیہاتی لڑکیوں کے جنگلوں۔ دروں۔ اور ٹیکروں پر گھوما کرتی تھی۔ اُسے مویشیوں۔ پرندوں اور درختوں سے بڑی الفت تھی اور اخلاقاً بھی متواضع۔ کارکن۔ اور پاکدامن تھی۔ اُسے تاگا کاتنا اور کپڑا بننا آتا تھا۔ مگر لکھنے پڑھنے سے بالکل ہی بے بہرہ تھی۔ اس زمانہ میں سارا شمالی فرانس مسلسل جنگوں کیوجہ سے ویران ہورہا تھا اور یہاں کے باشندوں کی حالت بہت ہی نازک ہوگئی تھی شہروں اور قصبوں کا تو کیا ذکر ہے یہ چھوٹا سا قریہ بھی جنگ کے خوفناک اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا تھا۔ اسی لئے یہاں کے باشندوں کی حالت بری ہورہی تھی۔ جب مشارالیہا کی عمر تیرہ سال کی ہوئی تو اُسے اسبات کا اعتقاد ہوا کہ کوئی مسیحی ولی اُسے نظر آیا اور بتاکید اس امر کی ہدایت کی کہ ژان اپنے فرائض مذہبی

کرادا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ اس دائمی حزن و اندوہ کے ساتھ ہی جو فرانس کی پریشانی کی وجہ سے لاحق تھا مشار الیہا
ہمہ تن بحر مکاشفہ میں غرق رہنے لگی اور یہ جملہ اس کے ورد زبان ہو گیا "فرانس ایسے خوبصورت ملک کی حالت پر
مجھے افسوس آتا ہے" پندرہ سال کی عمر میں پھر وہی ولی نظر آیا اور اُسے حکم دیا کہ میدان کارزار کی راہ لے اور ولیعہد
فرانس کے ہمراہ جانبازی کا تماشہ دکھائے۔ اس غریب دوشیزہ نے کہا "میں ایک فقیر کی لڑکی ہوں۔ مجھے گھوڑے کی
پشت پر سوار ہو کر لشکر کو احکام دینا نہیں آتا" اتنا کہتے ہی اسکا دل اسقدر بھر آیا کہ رونے لگی۔ لیکن چونکہ اس مکاشفہ
کی واقعیت کا اُسے کامل یقین تھا اسلئے امتثال امر پر آمادہ ہو گئی۔ اُسنے اپنی بعثت کا ذکر پہلے اپنے رفقا اور احباب
سے کیا جواب میں اُسے خوب بناتے اور مضحکہ اڑا کر ستاتے تھے۔ اُس کے باپ نے تو یہ قسم کھالی تھی کہ میں اُسے دریا میں
ڈال دونگا۔ اسلئے کہ مجھے اپنی کنواری لڑکی کا غیر مردوں کے ہمراہ میدان جنگ کو جانا گوارا نہیں۔ لیکن وہ موقع پا کر
کسی نہ کسی طرح بھاگ نکلی اور ولیعہد کی خدمت میں حاضر ہوئی اس مکاشفہ کی ساری کیفیت ولیعہد کو سُنادی اور وعدہ
کیا کہ دشمن کو مغلوب کرکے شہر ہرس میں اُسکے سر پر تاج شاہی رکھ دیگی۔ اسوقت اسکی عمر ۱۸ سال کی ہو گئی تھی۔ اسکا
قد بلند اور جسم طاقت دار اور پھرتیلا تھا۔ اس میں اتنی سکت تھی کہ تمام دن صبح سے شام تک بغیر کسی غذا اور راحت کے
گھوڑے کے زین پر بیٹھی رہے۔ ایک سفید گھوڑے پر سوار۔ سر سے پیر تک سفید رنگ کے جوشن میں غرق۔ ایک سفید
علم داہنے ہاتھ میں لئے گشت کرتی پھرتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ انسان نہیں بلکہ کوئی فرشتہ ہے۔ کمینے سپاہی جو عموماً تند مزاج
اور پست فطرت ہوتے ہیں اسکی اسدرجہ اطاعت کرتے تھے کہ گویا کوئی فرشتہ ہے جو لشکر کی کمان کے لئے آسمان سے
نازل ہوا ہے۔ باوجود اسکے کہ وہ ابھی کمسن تھی اور طبیعت میں وقار کے ساتھ ہی ساتھ نرمی بھی تھی لیکن جو حکم بھی اسکا ہوتا تھا
سب کے سب اسکی اطاعت کرتے تھے۔ اور تاحد امکان اسکے اجرا میں کوشاں رہتے تھے۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ وہ کمینہ
عادات بھی جو سپاہیوں کے خصائص میں سے تھے جاتے رہے اور برابر اس دوشیزہ کے ساتھ عبادتگاہوں میں
جاکر عبادت کرتے تھے۔ جدھر رُخ کرتی تھی فتح و ظفر اسکے قدموں سے لگی رہتی۔ آخرکار ماہ اپریل ۱۴۲۹ء
میں آرلینز کی جانب رُخ کیا اور ایک سخت طوفان کی حالت میں انگریزی لشکر کے وسط سے گزر کر اپنے سارے لشکر کے
ہمراہ مع جملہ سامان خورد و نوش کے شہر کے اندر داخل ہو گئی اسکے تہور اور جسارت کو دیکھکر غنیم پر اسدرجہ رعب طاری ہوا
کہ یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ اس ہنگامہ میں اس سے کسطرح مقابلہ کیا جائے۔ اس اثنا میں فرانس کا سپہ سالار شہر سے باہر
نکلا۔ مشار الیہا نے اس سے خطاب کرکے کہا "میں تمہارے لئے وہ بہترین کمک لائی ہوں جو کبھی کسی اور کو نصیب نہوئی
ہوگی اور یہ امداد غیبی مالک عرش و کرسی کی جانب سے ہے" اسکے بعد حکم دیا کہ ان قلعوں پر جو انگریزوں نے بیرون شہر

بنا رکھے تھے حملہ کر دیا جائے۔ انہیں سے آخری قلعہ اسدرجہ مستحکم تھا کہ فرانس کا سپہ سالار اسپر حملہ کرتے ڈرتا تھا۔ چنانچہ ایک جنگی مجلس مشورہ منعقد کی گئی جس میں بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ اس خاص قلعہ پر حملہ نہ کیا جائے۔ ژان اس خبر کو سنتے ہی چلا اٹھی "اگر تم لوگ اپنی اپنی عقل سے کام کرتے ہو تو میں بھی اپنی عقل کے مطابق عمل کرونگی"۔ فوراً ہی سپاہیوں کو آواز دی جھنڈا ہاتھ میں لیا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر چاہتی تھی کہ انگریزی فوج پر حملہ کرے کہ سپہ سالار نے اس اہم خطیر سے خوف زدہ ہو کر محض اسے روکنے کی غرض سے شہر کا دروازہ بند کرا دیا۔ لیکن ژان دروازہ توڑ کر باہر نکل گئی۔ بعض سرداران فوج جو اس کے بہی خواہوں میں سے تھے اسکے باہر نکل جانے کی خبر پاتے ہی اپنی اپنی فوج کو ہمراہ لیکر میدان جنگ میں آ گئے کیونکہ انھیں اطمینان تھا کہ فتح و فیروزی اسکے لئے لازمی ہے۔ جب انگریزوں نے عرصۂ جنگ کو اپنے لئے تنگ دیکھا تو سخت مقابلہ کیلئے آمادہ ہو گئے۔ اور بکمال تہوّر و شجاعت کے ساتھ لڑے۔ مشار الیہا کے حکم کے مطابق کئی بلند منجنیقیں لائی گئیں۔ چاہتی ہی تھی کہ ان پر چڑھ کر قلعہ فتح کرے کہ اس گیر و دار میں اسکے جسم پر ایک کاری زخم لگا۔ لوگ اسے آہستہ سے اٹھا کر قریب کے ایک انگورستان میں لیگئے۔ وہاں پڑی ہوئی تھی کہ کانوں میں لشکر فرانس سے پسپائی کے بگل کی آواز آئی۔ باوجود اسدرجہ زخمی ہونیکے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جدال و قتال کیلئے سپاہیوں کا دل بڑھانے لگی یہ کہتی جاتی تھی "خبردار قدم پیچھے نہ ہٹے۔ تھوڑی دیر دم لیلو۔ کچھ کھا پی لو اور پھر جنگ میں مشغول ہو جاؤ۔ جسدم میرا علم دیوار قلعہ سے ٹکرائیگا فتح و ظفر نصیب ہوگی"۔ اسکی ان باتوں سے سپاہیوں کا دل بڑھ گیا اور ایک مرتبہ پھر حملہ کیا۔ چنانچہ جیسا ژان نے کہا تھا ویسا ہی ہوا۔ قلعہ فتح ہو گیا۔ انگریز سب کے سب فرار کر گئے۔ اور شہر آرلینز آزاد ہو گیا۔ پھر کیا تھا فتح کے بعد فتح نصیب ہوتی گئی۔ یہانتک کہ لشکر فرانس دروازۂ ریمس تک پہنچ گیا۔ اور مشار الیہا کی پیشین گوئی کے مطابق ولیعہد فرانس کو وہاں لا کر اسکی رسم تاج گذاری ادا کیگئی۔ جسوقت تاج شاہی سر پر رکھا گیا ژان نے بآواز بلند کہا "اے شاہ باوقار۔ خدا کی مشیت پوری ہوئی"۔ ان مراسم کے ادا ہو جانے کے بعد اسکے دل میں شوق پیدا ہوا کہ جنگ و جدال سے کنارہ کش ہو کر اپنے جھونپڑے کو واپس جائے۔ اور اپنے والد سے ملے۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی "اے کاش پھر وطن جانا نصیب ہوتا کہ وہاں اپنے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ بھیڑیں چراتی۔ وہ سب مجھے دیکھکر ضرور خوش ہوں گے"۔ لیکن دربار فرانس چونکہ اسکی قدر کی اہمیت سے واقف تھا اسلئے اسے جانے نہ دیا۔ اسوقت ژان کا یہ عقیدہ تھا کہ اب اسکی بعثت و ماموریت کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ اور آیندہ جنگ کیلئے حکم نہیں رہا۔ لیکن بادشاہ کے اصرار سے پھر رک گئی۔ اور جنگ کامپین میں گھوڑے سے گر کر قید ہو گئی۔ اس زمانہ میں قیدی فروخت کر دئے جاتے تھے۔ چنانچہ ژان بھی اسی قاعدہ کے بموجب ڈیوک آف برگنڈی

ے ہاتھ جو بہوا خواہان انگریزیں سے تھا فروخت کر ڈالی گئی حتیٰ کہ اس نے بھی اُسے انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

دشمن کی نگاہوں میں یہ تمام فتح و نصرت۔ ترقی و تائید جوزآن کو حاصل ہوئی تھی محض جادو کے اثر سے تھی۔ بلکہ خود شاہ فرانس کا بھی یہی خیال تھا کیونکہ اُسکی جملہ فداکاریوں کو یک لخت فراموش کر کے رذالت و کمینہ پن کے ساتھ اسکا حق نعمت بھلا دیا۔ اور اسکے استخلاص کیلئے ذرا بھی کوشش نہ کی۔ ایک سال تک مقید رہنے کے بعد اسکا مقدمہ محکمہ شرعیہ میں جسکے حاکم اعلیٰ قاضی بودیس تھے بغرض سوال و جرح پیش ہوا۔ اسپر یہ الزام عاید کیا گیا تھا کہ وہ شعبدہ باز اور جادوگر ہے۔ اسکی طرف سے پیروی کرنیکے لئے کسی کو بھی اجازت نہ تھی۔ لہذا وہ معصوم و بیگناہ خود ہی جوابدہی کر لیتی تھی۔ اسکے جملہ جوابات میں ایک قسم کی سادگی اور راستی پائی جاتی تھی۔ ان میں اور عدالت کے فقہا کے مکر آمیز سوالات میں بیّن فرق نظر آتا ہے۔ اس سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا تیرا یہ عقیدہ ہے کہ تو مظہر اخلاق خداوندی ہے؟ تو جواب دیا کہ "مظہر لطف خدا نہ سہی مگر اس سے التجا ضرور کرتی ہوں کہ اپنے لطف و کرم کو میرے شامل حال رکھے"۔ پھر پوچھا گیا کہ وہ اولیا جو اُسے نظر آتے تھے انگلستان سے متنفر تھے یا نہیں۔ جواب دیا کہ "اولیا اُسی کو دوست رکھتے ہیں جسے خدا دوست رکھتا ہے اور اُسی سے نفرت رکھتے ہیں جس سے خدا نفرت رکھتا ہے"۔ رئیس محکمہ نے یہ بھی کوشش کی کہ مغالطہ دیکر اُسے دام میں پھنسا لے لہذا سوال کیا کہ آیا خدا انگریزوں سے متنفر ہے یا نہیں۔ جواب دیا کہ "میں نہیں جانتی کہ وہ انسے نفرت رکھتا ہے یا نہیں۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ اُن لوگوں میں سے جو میدان جنگ سے بچکر چلے آئیں گے شاہ فرانس ہر ایک کو اس ملک سے نکال دیگا میرے ہاتھ میں بجائے نیزے کے علم تھا اور ہمیشہ میری کوشش یہی رہی کہ کسی کو بھی قتل نکروں۔ چنانچہ ابھی تک میرا ہاتھ کسی کے خون سے آلودہ نہیں ہوا میں صرف یہ کہتی تھی کہ انگریزوں پر دھاوا کردو۔ اور سب سے پہلے خود انپر حملہ کرتی تھی"۔ دیگر سوالات کے جواب میں بیان کیا ہاتف غیب نے مجھ سے کہا کہ "یہ علم لیلے اور کسی سے خوف نکر۔ خدا تیری مدد و کمک کریگا"۔ پھر سوال کیا گیا کہ فتح و ظفر کی اُمید اُس علم کی بدولت تھی یا خود اُسکی ذات کی بدولت۔ جواب دیا کہ "میری اُمید محض حق تعالیٰ پر تھی"۔

کسی اور پر نہ تھی۔ مشہور ہے کہ ایک شخص جوزآن سے سوالات کئے جانے کے موقع پر موجود تھا اسکی سچائی اور نیت کی صفائی سے اسدرجہ متحیر ہوا کہ کہنے لگا "کیا شریف عورت ہے! اس میں عیب اگر ہے تو صرف یہ کہ اہل انگلستان سے نہیں ہے"۔ قاضی نے اس کے الزامات بارہ فصلوں میں لکھے تھے۔ اور سحر و جادو کا الزام اسپر عاید کیا تھا۔ ۲۴ مئی ۱۴۳۱ء مطابق ۳ محرم ۸۳۴ھ جو دو سال قبل اسکی گرفتاری کی تاریخ تھی اُسے قبرستان میں لے گئے۔ وہاں قبل ہی سے دو چبوترے تیار کرائے گئے تھے جنمیں سے ایک پر قاضی اور علماء کی نشست تھی اور دوسرے پر زآن کھڑی کی گئی تھی۔ ایک واعظ نے نہایت سختی سے اس سے خطاب کیا اور کچھ دیر تک طعن و تشنیع کرتا رہا۔

ژاآن کھڑی ہوئی صبر و استقلال کے ساتھ ان باتوں کو سناکی۔ حتی کہ جب شاہ فرانس کو گالی دیجانے لگی تو اُسے یارائے تحمل نہ رہا۔ اور بآوازِ بلند کہنے لگی:" مجھے جو تیرے دل میں آئے کہہ لے۔ لیکن شاہ فرانس کی شان میں گستاخانہ زبان مت کھول۔ وہ ایک مسیحی دیندار ہے اور جیسا تو کہتا ہے ویسا نہیں ہے۔ میں بحلف کہہ سکتی ہوں کہ وہ مسیحیوں میں سب سے شریف ہے۔ اور سب سے زیادہ اپنے دین و مذہب کو دوست رکھتا ہے۔" جب یہ موعظہ ختم ہو چکا تو واعظ مذکور نے توبہ نامہ پڑھکر اُسے سنایا۔ لیکن ژاآن اسبارے میں مزید توضیح کی خواستگار ہوئی۔ کہا "میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو مستوجب توبہ ہو۔ میرے جملہ اعمال امرِ الٰہی کے مطابق تھے۔" اس سے کہا گیا کہ لازم ہے کہ کلیسا کا حکم بجا لائے۔ اور محض تہدید و تخویف کے طور پر یہ بھی کہدیا گیا کہ میر غضب حاضر ہے۔ ذرا بھی قاضیوں اور عالموں کے حکم کی خلاف ورزی ہوئی کہ فوراً جلا دیجائے گی۔ اس بیچاری نے دیکھا کہ یہ عالم نما حضرات اسکی عاقلانہ باتوں کی سماعت نہیں کرتے۔ تعصب و حبِ جاہ نے انکی آنکھوں کو کور اور کانوں کو کر کر دیا ہے۔ نہ تو دوسرے کی کچھ سنتے ہیں اور نہ سوائے اپنے مطلب کے انھیں کچھ نظر آتا ہے۔ ایسی نازک حالت میں بڑے بڑے سورماؤں کے دل دہل جاتے ہیں۔ یہ تو ایک بے بس عورت تھی۔ سوائے اطاعت کے چارہ نہ دیکھا۔ کانپتے ہاتھوں سے توبہ نامہ پر دستخط کر دئے۔ مگر ساتھ ہی اسکے یہ بھی کہدیا کہ اس کاغذ پر دستخط کرنے سے جلجانا بہتر ہے۔ اسکے بعد قاضی بووَیں نے فتوے سنانا شروع کیا۔

"چونکہ خدا کی عنایت سے ژاآن اب گمراہی کے دائرہ سے منحرف اور راہِ ہدایت کی طرف مائل ہو کر پھر آغوشِ کلیسائے مقدس میں پناہ گزیں ہوئی ہے لہذا الزام کفر اسکے سر سے اُٹھ گیا۔ لیکن چونکہ اس نے حضرت باری تعالےٰ اور کلیسائے مقدس کیتھولیکی کے خلاف گناہ کیا ہے اسلئے اگرچہ فرطِ رحمت و عنایت سے اسکی جان بخشی ہو گئی ہے لیکن پھر بھی بقیہ حیات تنگ حبس میں رہے گی۔ جہاں کھانیکے لئے بجائے نان کے غصہ و اندوہ اور پینے کے لئے بجائے پانی کے حسرت و رنج ملا کریگا۔" لیکن یہ مہلت بھی محض وقتی مہلت تھی۔ دشمنوں کو اسکا زندہ رہنا ہی منظور نہ تھا لہذا چاہتے تھے کہ کوئی نیا عذر تلاش کر کے اُسے قتل کر ڈالیں۔ گو ابتدا میں حصول مدعا کی جانب چنداں مائل نہ تھے لیکن آخر میں اسپر جادوگری کا اتہام رکھکر قتل ہی کر دیا۔ شہر روآن کے بازار میں ایک انبار خشک لکڑی کا لگایا گیا۔ اور ژاآن کو اس مقام پر لیگئے۔ دیکھا کہ اس کے سارے دشمن اور وہ مولوی صورت حضرات اسکے قتل ہی میں اپنی ساری ترقی کا راز مضمر سمجھتے ہیں اور اسکی خونریزی پر تلے ہوئے ہیں۔ مگر اس مجسمۂ غیرت و شہامت کے دل میں اس خطرناک ماحول سے خوف اور دہشت کا نام بھی نہ تھا۔ نہایت درجہ قوت دلی اور متانت

کے ساتھ اسکا مقابلہ کیا۔ اگر ناظرین اس وحشت ناک منظر کا خاکہ اپنی نگاہ کے سامنے بنائیں تو معلوم ہوگا کہ اس بیکس و مجبور (عورت) میں کسدرجہ دلیری و شجاعت ہوگی جو ایسے ہولناک موقع پر بھی اپنے حواس قائم رکھ سکی۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے موقعے بہت سے نظر آئینگے کہ شجاعان زمانہ جو میدان رزم میں نہایت پردلی اور جرأت کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرتے تھے جب دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار ہوکر قصاص کے لئے حاضر کئے گئے تو بالکل ہی بدحواس ہوگئے۔ گو انھوں نے گریہ وزاری نہ کی ہو لیکن آثار خوف وہراس تو ضرور انکی پیشانی پر نمودار ہو گئے۔ لیکن یہ نادرۂ زمانہ خاتون بغیر کسی رعب وہراس کے مجمع عام میں آتی ہے اور باوجود اس علم کے کہ عنقریب آگ میں جلا دیجائے گی اپنے وقار و عظمت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ کیوں نہ ہو۔ ایسی ہی معظم ہستیاں ہمیشہ تاریخ کے صفحات کو مزین کرتی رہیں گی۔ اور بعد میں آنیوالی نسلوں کے لئے سرمشق غیرت و شجاعت بنی رہیں گی۔ اُس مرد صفت ژان کیلئے ضروری تھا کہ اپنے وطن کو دشمن کے چنگل سے نجات دلائے اور اس مدعا کے حصول میں اپنی جان گرامی کو فدا کردے۔ اگر کہا جائے کہ اُس عورت کو اُس زمانہ کے تمام مردوں پر فوقیت حاصل ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اسلئے کہ اس زمانہ کے امراء و اعیان میں سے کوئی بھی نہ تھا جو مثل ژان کے راہ وطن میں فداکاری کرتا اور اپنا نام صفحہ تاریخ میں چھوڑ جاتا۔ گویا کہ مادر دہر کو خوب معلوم تھا کہ اس یگانۂ روزگار خاتون کو کس زمانہ میں پیدا کرنا اور کس طرح سے فرانس اور اہل فرانس کے دلی عقدہ کو کھولنا چاہیئے تھا۔ ژان ایک روح پاک اور گوہر تابناک تھی۔ یگانہ روح نجابت و وطن پرستی اور بہترین مجسمۂ پرہیزگاری تھی۔ بارے اُسنے اپنے قتل کے موقع پر صلیب طلب کی تاکہ دم آخر عیسائیوں کی رسم کے مطابق اسکی زیارت کرلے۔ کسی انگریز سپاہی نے اپنی چھڑی توڑکر صلیب تیار کردی۔ اتنے میں ژان کے خاموش ہونٹوں سے ایک صدا بلند ہوئی جس نے اُس خاموشی کو جو اطراف میں طاری تھی توڑ دیا۔ کہا "بیشک میں خدا کی طرف سے مامور تھی۔ ہاتف غیب نے مجھے اس کام پر آمادہ کیا تھا۔ اور میں نے دھوکا نہیں کھایا"۔ اس کے بعد اس بیکس کو سولی پر چڑھا کر آگ میں جلا دیا گیا۔ گویا اُس حالت خاص میں ژان فرانس اور اہل فرانس سے خطاب کرکے بزبان بے زبانی کہہ رہی تھی ؎

آنکہ دائم ہوس سوختن ما می کرد
کاش می آمد و از دور تماشا می کرد

اگرچہ اُس کی زندگی کا اس بری طرح سے خاتمہ کیا گیا لیکن اسکے بعد اُن لوگوں نے جو اُسکی فداکاریوں کی قدر و قیمت سے واقف تھے اسی جگہ پر جہاں وہ جلائی گئی تھی اسکا مجسمہ تیار کرا کے نصب کرادیا۔ تاکہ اخلاف کیلئے

مایۂ عبرت رہے مملکت فرانس کے تمام شہروں میں اُسکے احترام میں یادگاریں قائم کی گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ ناظرین میں سے کسی صاحب کو یہ گمان ہو کہ جو کچھ ژاآن کے بارے میں لکھا گیا ہے اسمیں مبالغہ کا دخل ہے لہذا محض انکے اطمینان قلب کیلئے یہ عرض کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا مضمون فضلاء انگلستان کے مضامین کا خلاصہ اور ترجمہ ہے اور انھوں نے تو اس سے بھی زیادہ اسکے اعمال و خصائل کی تمجید و تحسین کی ہے۔ سیموئیل اسمائیلز مشہور فلسفی انگلستان کتاب "وظیفہ" میں اسکے تولد و نشو و نما کا حال بالتفصیل لکھتے ہوے اسکی زندگی کے کارناموں کو از ابتدا تا انتہا بیان کر کے آخر میں لکھتا ہے کہ اہل فرانس ژاآن دارک کو بھولے نہیں ہیں۔ اور بقاے یادگار کی غرض سے اسکے متعدد مجسمے نصب کئے ہیں اور خاصکر عساکر فرانس نے بعد کے زمانہ میں آسکو ہمیشہ توقیر و تکریم رکھا ہے حتیٰ کہ اس زمانہ میں بھی جب کبھی کوئی فوج قریۂ دامری کی طرف سے جو ژاآن کا مولد ہے گذرتی ہے تو سپاہی ذرا دیر کیلئے ٹھہر جاتے ہیں اور ژاآن کی تعظیم کے طور پر اُسے فوجی سلامی دیتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ قاعدہ ابتک جاری ہے اور اُس ملک نے جس کے حق میں ژاآن نے صدق دل سے شایستہ خدمتیں کی ہیں اسکی یادگار کو برقرار رکھا ہے۔ یہ امر بھی حیرت سے خالی نہیں کہ ژاآن کے قتل کے ۱۵ سال کے بعد روم پایۂ تخت اطالیہ میں مجلس شرعیہ منعقد ہوئی جسکا صدر خلیفہ کیتھولیکی پاپ اعظم تھا۔ اس موقع پر ژاآن کے مقدمہ کی کامل تحقیقات کی گئی اور آخر میں یہ فتوے دیا گیا کہ مشار الیہا بیگناہ تھی۔ بڑے بڑے علما و فضلا مثلاً والٹر (فرانسوی) سوتے (انگریزی) اور شیلر (جرمن) ہلکہ اوروں نے بھی اسکی توصیف میں کتابیں اور مشہور مقالے لکھے ہیں۔ لیکن شیلر کی تصنیف ژاآن کی بہترین یادگار رہے۔

زندہ جاوید ماند ہر کہ نکونام زیست
کز عقبش ذکر خیر زندہ کند نام را

——∘◇◇◇∘——

افراط غیرت

مولانا سید اختر علی صاحب تلہری

خورشید اودھ کے ایک کھاتے پیتے شریف گھرانے کا نونہال تھا اُس کے باپ اور چچا تمام بستی میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اُنھوں نے اسکی تعلیم و تربیت پر خصوصیت سے توجہ کی تھی۔ وہ اچھا خاصہ ذہین تھا اسلئے بہت جلد لکھ پڑھ گیا۔ اُنیسویں سال اُس نے فلسفہ کا ایم اے پاس کر لیا۔

ابتدا ہی سے اُسے مطالعہ کا بیحد شوق تھا کھیل کود سے اُسے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی فرصت کے اوقات میں وہ اخبارات و رسائل اور دوسری اچھی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ اُس کی حالت اُن عام گریجویٹوں کی نہ تھی جن کی علمی کائنات صرف چند درسی کتابیں ہوتی ہیں اور جو کسی مجمع میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی کے چند جملے خاص لہجہ میں بول دینا اپنی قابلیت کی سند سمجھتے ہیں۔ اُس نے جو کچھ پڑھا تھا اُسکو جو کچھ حاصل کیا تھا سمجھ کر اسکا مطالعہ وسیع تھا۔ اُسکی نظر دقیق تھی۔ وہ اُردو اور انگریزی میں قلم برداشتہ اچھے اچھے مضامین لکھ لیتا تھا طالب علمی ہی کے زمانہ میں پنجاب اور یو پی کے ممتاز رسائل میں مختلف علمی و ادبی مباحث پر اسکے چند مضامین شایع ہو چکے تھے جنھیں عام طور سے پسند کیا گیا تھا۔ اُسکی وضع نہایت سادہ تھی فیشن کے بناؤ سنگھار سے اُسے کوئی واسطہ نہ تھا۔ انکسار اور شگفتہ مزاجی اُسکے اخلاق کی ممتاز خصوصیتیں تھیں۔

امتحان پاس کرنیکے بعد اُسے ڈپٹی کلکٹری مل رہی تھی اس کے باپ اور چچا نے بہت چاہا کہ وہ اسے منظور کر لے لیکن وہ کسی طرح اسپر تیار نہ ہوا۔ اُس کی خواہش یہ تھی کہ وہ کسی قومی تعلیمی ادارہ میں ملازمت کرے۔ یہی ایک طریقہ تھا جس سے وہ اپنا علمی شوق باقی رکھ سکتا تھا اور پھر ملک و قوم کی خدمت کے بھی بہترین مواقع اُسے حاصل ہو سکتے تھے۔

چنانچہ اُس نے لکھنؤ کے ایک قومی کالج میں معمولی تنخواہ پر ملازمت کر لی۔ اُسے فلسفہ سے خاص لگاؤ تھا۔ ہیوم برکلے کینٹ اور مل کی تصنیفات زیادہ تر اُس کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ وہ کوئی بات تقلیدی طور پر نہ مانتا۔ بلکہ ہر امر پر ذمہ دارانہ طور سے غور کرتا اور پھر اپنی آزاد رائے قائم کرتا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اُس کے خیالات ایک خاص ڈھانچہ میں ڈھل گئے تھے۔ اُس کی رایوں میں بڑھاپے کی متانت پیدا ہو گئی تھی۔

وہ جوان تھا لیکن عشق و حسن کی لطیف داستانوں کی پذیرائی کیلئے اُس کے پاس سوائے خندۂ تحقیر کے

اور کچھ نہ تھا مس لطیف اور شاہد کے جنون عاشقی کا جانگداز تماشا اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر وہ اسی ہمشیرہ خلل دماغ سے تعبیر کرتا رہا اس کا خیال تھا کہ پڑھے لکھے مردوں اور عورتوں میں مروجہ عشق عاشقی کا پیدا ہونا اخلاقی غیر شائستگی کا نتیجہ ہے - ازدواجی رجحان ایک حد تک یقیناً تقاضائے فطرت ہے لیکن اس رجحان کو دیوانگی کے قالب میں تبدیل ہو جانے دینا بوالہوسی ہے - اس کے کیا معنی کہ "اعتباری حسن" کی ایک چلتی پھرتی تصویر دیکھ کر انسان اپنے حواس میں نہ رہے کسی حسین چہرہ کی یاد میں راتیں جاگ جاگ کر کاٹ دے - رات اور دن کی فرصت "تصور جاناں" کے لئے وقف کر دے کسی بے مروت کی نگاہوں کے بدلتے ہی دل کی رگوں کو ٹوٹ جانے دے

اُس نے خود بہت سی زاہد فریب صورتیں قریب سے اور بے تکلفانہ طور سے دیکھی تھیں جمیلہ مقامی مدرسۃ النسوان کی ایک نہایت شکیل معلمہ تھی - بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں - جُٹی بھویں - گھنی پلکیں - گلاب سے رخسارے - سڈول جسم - جامہ زیبی دلربایانہ ادائیں غرضکہ ایک مرد کا دل صید کرنے کیلئے جن تیروں کی ضرورت ہو سکتی ہے جمیلہ کے حسن کے ترکش میں سب موجود تھے - اور پھر لطف یہ تھا کہ خود جمیلہ کے دل میں خورشید کی طرف سے ایک لگاؤ پیدا ہو گیا تھا - اُس نے اپنے حسن کا جادو ڈالنے کی پوری کوشش کی لیکن خورشید پر مطلق اثر نہ ہوا جمیلہ کا نیاز عشق اُس نے بے پروائی کے ساتھ ٹھکرا دیا -

خورشید اگرچہ رگوں میں شباب کا خون دوڑنے کے باوجود جنس مقابل کی لطافتوں کا قدرداں نہ تھا لیکن اسکے معنی یہ نہیں تھے کہ اسکے دل میں صنف نازک کی طرف سے نفرت کا جذبہ موجود تھا - بلکہ درحقیقت وہ عورتوں کا کافی احترام کرتا تھا - اُسے اس صنف سے دلی ہمدردی تھی - اُسکی خواہش تھی کہ عورتیں تعلیم و شائستگی کے زیوروں سے آراستہ ہو جائیں اسکا دماغ ہمیشہ ایسی اسکیمیں سوچا کرتا تھا جو عورتوں میں تعلیم عام کر دیں اُنکی معاشرتی حالت سدھار دیں - اُنمیں خودداری کا جوہر اُبھار دیں وہ بوالہوس مردوں کا آسانی سے صید نہ بن سکیں اور اُنکی آلہ عیش کی حیثیت میں نہ رہیں -

(۳)

گولہ گنج میں خورشید کے ایک قریبی عزیز ممتاز احمد رہتے تھے جن کا لکھنؤ میں اچھا خاصہ کاروبار پھیلا ہوا تھا - وہ اگرچہ پرانے زمانہ کے تھے لیکن جدید دور کے خیالات کی عام رو نے اُن کی قدامت پسندیوں کا رنگ بہت ہلکا کر دیا تھا خورشید کا اُنھیں کے مکان پر قیام تھا - ممتاز احمد اور اُن کی بیوی خورشید سے اُسکی شریف النفسی اور اُس کے عادات و اطوار کی پاکیزگی کی وجہ سے بہت محبت کرنے لگے تھے ممتاز احمد کی سولہ سترہ سال کی ایک نا کتخدا لڑکی عشرت تھی جو سارا اُس گھر کا اجالا تھی پانچ برس پہلے ممتاز احمد کے پانچ لڑکے اور

لڑکیاں تھیں لیکن موت کے ظالم ہاتھوں نے وہ سب اُن سے چھین لئے تھے صرف عشرت زندہ بچی تھی اسلئے ماں باپ اس بڑھاپے کے سکھ کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اُسے معمولی تعلیم دی گئی تھی اُس نے قرآن شریف اور دینیات کی کچھ کتابیں پڑھی تھیں۔ نظیر احمد اور راشد الخیری کی چند تصنیفیں بھی اُس کی نگاہوں سے گذر چکی تھیں اُسے کچھ ٹوٹا پھوٹا لکھنا بھی آتا تھا۔ مگر وہ بہت زیادہ ذہین تھی اس لئے اُس نے جو کچھ پڑھا تھا اُس سے کہیں زیادہ سمجھ اُس میں موجود تھی۔ سینے پرونے اور گھر کے کام کاج سے جو وقت بچتا اُس میں وہ برابر اُردو کی کتابیں اور زنانے رسالے پڑھتی اور آہستہ آہستہ اپنی قابلیت بڑھاتی۔

عشرت کا رنگ گندمی تھا۔ آنکھیں کالی اور تھوڑی سی بڑی مُنہ لمبا چہرہ رخساروں پر گوشت کم۔ قد کسیقدر لنبا جسم چھریرا مجموعی حیثیت سے وہ کسی غیر معمولی حسن کی مالک نہ تھی البتہ قبول صورت ضرور تھی۔ فطری ذہانت نے اُس کی باتوں میں ایک خاص طرح کی کشش پیدا کردی تھی اُس کے ہر انداز سے انسانیت اور شائستگی کے آثار نمایاں تھے۔

خورشید بے تکلفانہ گھر میں آیا کرتا تھا عشرت اُس سے پردہ نہ کرتی تھی۔ خورشید اس ذہین لڑکی کی باتیں بہت دلچسپی سے سنا کرتا تھا عشرت جو کتابیں پڑھتی اور اُن میں اُس کی سمجھ میں جو کچھ نہ آتا وہ خورشید سے پوچھتی اور یہ اُسے توجہ سے بتلاتا۔ اُس کے سوالات سے ذہانت اور فہم کی پختگی کے واضح نشان ملتے۔ خورشید اُس کی باتیں سنکر اکثر اپنے دل میں کہتا کہ اگر کہیں عشرت کو تعلیم سے باقاعدہ فائدہ اُٹھانیکا موقع ملتا تو یہ اسلامی ہندوستان کی طبقۂ نسواں کی ایک گوہر درخشندہ ہوتی۔ اسکی ذہانت وذکاوت اور فضل ودانش کی تابناکیوں سے نہ معلوم کتنے گوشے جگمگا اُٹھتے۔ ایسی سوسائٹی کیونکر معاف کیجا سکتی ہے جو عشرت جیسی ہونہار ہستیوں کو محض اس جرم پر کہ وہ صنف نازک کی فرد ہیں تعلیم کی برکتوں سے پورے طور سے فیضیاب نہ ہونے دے؟

ابھی یہ کہنا کہ خورشید عشرت کو چاہنے لگا تھا شاید وہ اپنے خیالات کی توہین سمجھے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اسکی عزت کرنے لگا تھا۔ عشرت کی سلیم الطبعی کا احترام اس کے دل میں پورے طور سے نشو ونما پاچکا تھا اُس سے باتیں کرنے کی ایک مخفی خواہش اُسے برابر گدگداتی رہتی اور وہ چاہتا کہ عشرت کے معلومات کے خزانہ میں مفید اضافے کرتا رہے۔ وہ اُسے ملکی وقومی تحریکوں کے حالات بتاتا دوسرے ملکوں کی عورتوں کی تعلیمی ترقی کے واقعے سُناتا اچھی اچھی اُردو کی کتابیں لاکر دیتا اور مختلف رسائل کے خاص خاص مضامین پر اُس کے پڑھنے کیلئے نشان بنادیتا

ممتاز احمد اور اُن کی بیوی خورشید کی افتادِ طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے، وہ اسے انسان کی شکل میں فرشتہ سمجھتے تھے اُسکی نیکی اور شرافت پر اُنھیں پورا اعتماد تھا۔ وہ عشرت کیلئے خورشید کی ہم نشینی ایک نعمت سمجھتے تھے۔ انھیں اسکا یقین تھا کہ خورشید میں نیکی اور شرافت نے اسکی صلاحیت بھی باقی نہیں رکھی ہو کہ وہ عشرت کو کسی بُرے رستہ کی طرف لگا سکے اگر کبھی عشرت کے قدم کو لغزش بھی ہوگی تو خورشید اسکو سنبھال لیگا۔ اسی وجہ سے ان دونوں نے کبھی خورشید اور عشرت کے ایک ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کو مشکوک نگاہوں سے نہیں دیکھا' اور نہ کبھی اسکی روک تھام کی۔

خورشید اور عشرت میں اب بے تکلفی خاصی ہوگئی تھی وہ گھنٹوں تنہا بیٹھے ہوئے مختلف مسائل پر گفتگو کرتے مگر کوئی ایسی بات کبھی درمیان میں نہ آتی جس سے اسکا پتہ چلتا کہ انکی یہ بے تکلفی دوسرا رنگ اختیار کر رہی ہے، اُن کے دلوں میں وہ لگاؤ پیدا ہو چلا ہے جو آگے چلکر عشق و محبت کی شوریدہ سری میں تبدیل ہو سکتا ہے خورشید اگرچہ پڑھا لکھا اور خاصا سمجھدار نوجوان تھا لیکن پھر بھی ناتجربہ کار تھا۔ اُسے انسانی فطرت کا جو کچھ علم تھا وہ محض کتابوں کے توسط سے۔

فطرت انسانی کی بہت سی نیرنگیاں انکی نگاہوں سے اوجھل تھیں اُسے اُن مخفی رستوں کی اطلاع نہ تھی جو عشق و محبت کے لطیف جذبات کی خاص گذرگاہیں ہیں اُسے ان رجحانات کی زبردستیوں کی وسعت پر پورے طور سے اطلاع نہ تھی وہ ابتک یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ صحبتیں درحقیقت اُنھیں فرائض کے تکملہ ہیں جو بحیثیت ایک انسان کے اُس پر عاید ہوتی ہیں۔ گویا وہ تو اسطرح اپنے خیال میں ایک باصلاحیت فطرت کو جلا دے رہا تھا لیکن حضرت عشق اسکی سادگی پر مسکرا مسکرا کر مخفی طور سے اُسکے دل و دماغ میں شوریدگی کی بارود بچھاتے جا رہے تھے۔

(۳)

خورشید کی زندگی کا ایک نیا باب اسدن شروع ہوا جسدن وہ مصر کی مشہور مقررہ مس راشدہ خانم کی تقریر سنکر گھر پلٹا۔ عشرت پردہ کی پابندیوں کیوجہ سے خود نہ جا سکی تھی مگر خورشید کی زبانی پوری تقریر کا ماحصل سننے کی مشتاق بیٹھی تھی۔ انھیں دیکھتے ہی اس نے پوچھا "کہئے خورشید بھائی مس راشدہ نے تقریر میں کیا کیا باتیں بیان کیں"! اُنھوں نے شیروانی اُتاری اور عشرت کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئے۔

اتفاق سے وہاں پھولوں کا ایک گجرا رکھا ہوا تھا اُسے اُٹھا لیا اور پھولوں کو ہاتھوں سے ملتے ہوئے مس راشدہ کی تقریر کے ضروری اجزا دہرانے لگے۔ عشرت جب تقریر کا خلاصہ سن چکی تو پیشانی پر بل ڈالکر بولی "اسی تقریر کے شہرے تھے! آپ تو کہتے تھے کہ راشدہ بہت پڑھی لکھی اور فہمیدہ ہیں، ٹھیک تو ہے یورپ میں تعلیم پائی ہے جبھی تو بے لحاظ فرنگنوں کی طرح مردانی باتیں کیں! یہ اُنھوں نے عورتوں کو لڑنے مرنے کی کیا

نصیحت کی؟ عورتیں جنگ کیلئے نہیں پیدا ہوئی ہیں۔ وہ تو صلح و آشتی کی روح ہیں وہ مظلوم ہیں مظلومیت
ہی اُنکا سلاح جنگ ہے۔ وہ بھائیوں سے اپنے حقوق منتوں سے لیں گی خوشامدوں سے لیں گی۔
لڑ بھڑ کر نہیں، توبہ۔ مس راشدہ ہمیں مردوں سے جنگ وجدال کا مشورہ دیتی ہیں! عورتوں کا ان آویزشوں
میں اپنا آنچل پھنسانا اُنکی فطرت کے خلاف ہے۔ لڑنا جھگڑنا مردوں ہی کو خوب آتا ہے"

خورشید عشرت کی ان نکتہ چینیوں کو بڑے شوق سے سنتا رہا اور دل ہی دل میں خالص مشرقی
آب و ہوا میں پرورش پائی ہوئی عشرت کا مغرب کی نقل کی ہوئی راشدہ سے خاص مسرت کے ساتھ مقابلہ کرتا
رہا اور پھر اس لطیف بحث کو ذرا طول دینے کے لئے اُس نے چھیڑتے ہوئے یہ کہا "عشرت حقوق مانگنے سے نہیں
ملتے منتوں سے نہیں ملتے یہ چیزیں تو قوت بازو ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ جانبازی و سرفروشی ہی سے یہ
میدان جیتے جاتے ہیں۔ یہ تم نے کیا کہا کہ جنگ و جدال عورتوں کی فطرت کے خلاف ہے؟ کیا تم نے یورپ کی سفریجیٹ
عورتوں کا حال نہیں سنا ہے؟ انہوں نے اپنے حقوق طلبی کے جنون میں کیا کچھ نہیں کیا۔ کونسی شورش
اٹھا رکھی۔ کیا وہ اس مردانہ جدوجہد سے تمہارے خیال میں عورتیں نہیں رہیں۔ یا اُن سے نسوانی فطرت
غائب ہو چکی تھی؟ میرے خیال میں تو عورتیں اگر انتقام لینے پر آمادہ ہو جائیں تو پھر اُن سے زیادہ خون ریز اور
خون آشام کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ مردوں سے اتنی سفاکی اور بے رحمی نہیں ہو سکتی" عشرت نے اپنے سر
جھٹکا کے آہستہ سے مسکراتے ہوئے کہا "دیکھئے نا ابھی ابھی آپ نے پھولوں سی نازک چیز کو بالکل مل دل ڈالا۔ ایک
ایک پتی علیحدہ کر دی۔ ایک مرد کا ہاتھ ایسی خوشنما نازک چیز پر ایسی بے دردی کی مشق کرنے لگا تھا۔ بے رحمی
تو عورتوں ہی کی فطرت میں داخل ہے!"

خورشید یہ چبھتا ہوا فقرہ سنکر چونکا۔ اُسنے اپنے سامنے کی بکھری ہوئی پھولوں کی پتیوں پر نظر ڈالی عشرت
کے چہرے کو دیکھا پھر چپ چاپ گردن جھکا لی۔ اور خاموش ہو گیا۔ عشرت نے اس خاموشی کو قطع کرنے کیلئے مس
راشدہ کے دوسرے حالات چھیڑ دئے۔ خورشید نے اُن کے مختصر جواب دئے اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے کمرے
میں چلا آیا آج پہلی مرتبہ اُسنے اپنے دل میں ایک خاص قسم کی خلش محسوس کی ایک پھانس چبھتی دیکھی جسکی وجہ سے درد بھی تھا
لذت بھی تھی اور الجھن بھی۔

(۴)

لکھنؤ میں ملیریا کی ہوا بہت تیزی سے چل رہی تھی۔ ہر گھر میں تین چار آدمی بیمار پڑے ہوئے تھے۔
حکیموں اور ڈاکٹروں کی طبابت گاہوں میں مریضوں کا ٹھٹ لگا رہتا تھا۔ خورشید بھی ملیریا کی لپیٹ میں

آگیا۔ بخار ایکسو چھ ڈگری سے کسی وقت کم نہ ہوتا ممتاز احمد صاحب اور اُنکی بیوی بھی قدرے بخار میں مبتلا تھے۔ عشرت البتہ اچھی تھی وہی ان مریضوں کی تیمارداری کر رہی تھی۔

اُسکا زیادہ وقت خورشید کی خدمت میں صرف ہوتا۔ اسکو پابندی سے دوا دیتی بخار جب تیز ہوجاتا تو اُسکی پٹی کرنے بیٹھ جاتی اُسکی گھنٹہ گھنٹہ بھر کی حالت سے ڈاکٹر ممتاز کو مطلع کرتی رہتی۔ ایک رات خورشید کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ عشرت برابر اس کے سرہانے بیٹھی رہی، بار بار تھرمامیٹر لگاتی اور بخار کی شدت دیکھکر گھبرا اُٹھتی غرضکہ پوری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دیتی۔ خورشید کو جب ذرا ہوش آتا اور عشرت کو سرہانے بیٹھا ہوا پاتا تو نہایت لجاجت سے کہتا "عشرت تم جاکر سو رہو۔ مجھے میری حالت پر چھوڑ دو کہیں تم خود بیمار نہ ہو جاؤ۔ میں اب بالکل اچھا ہوں" خورشید کی یہ باتیں سنکر عشرت کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے مگر وہ اُنھیں پی جاتی اور پھر مسکرا کر کہتی "آپ میری فکر نہ کریں۔ میں برابر کُنین استعمال کر رہی ہوں میں بیمار نہ پڑوں گی۔ آپ پریشان نہ ہوں" ایک ہفتہ میں خورشید اچھا ہو گیا۔ لیکن اُن سنہرے رشتوں میں جس سے قلوب ایکدوسرے سے منسلک کئے جاتے ہیں دوسری گرہ پڑ گئی۔ ممکن تھا کہ پہلا پھندا کچھ ڈھیلا ہوتا مگر اب کی اسطرح سختی سے گلوگیر ہوا کہ خورشید سے فلسفی کا بھی دم گھٹنے لگا۔ رات کے وقت جب کتاب پڑھنے بیٹھا تو اُسے اپنے میں غیر معمولی تغیر نظر آیا۔ اُسکی نگاہ حروف پر دوڑ رہی تھی لیکن دل کہیں اور تھا۔ دماغ میں غیر مانوس خیالات برابر چلے آرہے تھے۔ خورشید نے ان خیالات کو ہٹانا چاہا اور پھر کتاب پر نظر جمائی لیکن دماغ قابو میں نہ آیا۔ کئی مرتبہ خورشید نے کتاب پڑھنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر جھنجھلا کر کتاب بند کردی اور اپنے اس تغیر پر دل ہی دل میں بگڑنے لگا۔ مگر یہ برہمی کی کیفیت چند سکنڈ رہی اور پھر انھیں خیالات کا دل میں ہجوم ہونے لگا۔ آخر وہ پلنگ پر لیٹ گیا لیمپ کی روشنی کم کردی پائنتی سے چادر گھسیٹ کر اوڑھلی اور سنجیدگی سے اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔ وہ برابر اپنے دل سے یہ سوال کر رہا تھا کہ اسے بھی کیا وہی بیماری ہو گئی ہے جسے ابتک وہ خلل دماغ سے تعبیر کرتا رہا تھا۔ کیا وہ بھی شاہد کی طرح ایک عورت کی زلفوں میں اسیر ہو گیا ہے؟ کیا واقعی عشرت نے بیخبری کے عالم میں اُس کا پورے طور سے شکار کر لیا۔ کیا اب وہ اپنے ہی عمل سے اُن خیالات کی تکذیب کر دیگا جنکی وہ پورے جوش سے برابر تبلیغ کرتا رہا تھا؟ آخر وہ کیا کر رہا ہے؟ وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن دماغ پراگندہ ہو رہا تھا اسنے سر جھکا کر پھر سوچنا شروع کیا واقعی وہ عشرت کو چاہنے لگا ہے؟ کیا اُس کے برتاؤ نے سابق کی بے تکلفی کو جنون انگیز

محبت میں تبدیل کردیا ہے، کیا وہ فی الحقیقت میری تمناؤں اور ارمانوں کی مرکز بن گئی ہے؟ لیکن عشرت تو کچھ زیادہ خوبصورت بھی نہیں ہے جمیلہ تو اس سے کہیں زیادہ حسین تھی لیکن اُسکا تو مجھپر کوئی جادو نہ چلا۔ تو کیا اب میں اتنا بے غیرت ہو جاؤنگا کہ عشرت کی خاطر دنیا میں اپنے کو مطعون کروں اپنے علمی مشغلوں کو خیرباد کہدوں مگر عشرت اخلاق کا مجسمہ ہے انسانی ہمدردی اُسکے خمیر میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ اگر میرے دل دماغ پر چھائی چلی جارہی ہے تو کیا بیجا ہے لیکن پھر میرے دل میں اسکی خواہش کیوں پیدا ہورہی ہے کہ میں اخلاق کی دیوی کو اپنا کرکے رکھوں؟ اُس کی پرستش تو دور سے بھی کیجا سکتی ہے! انہیں خیالات میں خورشید سوگیا صبح کو جلد جاگ اُٹھا مگر آج اُس کی طبیعت بہت افسردہ تھی کالج گیا اور وہاں پڑھایا بھی مگر اُسے برابر دل میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہوتا رہا۔ پڑھاتے پڑھاتے اس کا دماغ انہیں سوالات کے سلجھانے میں مصروف ہوجاتا اور وہ اپنے میں یہ جنون کے آثار پیدا ہوتے دیکھکر گھبرا اُٹھتا۔

گیارہ بجے کالج سے واپس آیا اور برائے نام کچھ کھاکر پلنگ پر سست بیٹھ گیا اُسی تاریخ کا تازہ اخبار اُٹھالیا اور سرسری طور سے اُس کی سُرخیاں دیکھیں لیکن طبیعت نہ لگی۔ اور پھر انہیں خیالات میں ڈوب گیا۔ کبھی سوچا کہ عشرت پر اپنے اس تغیر کا اظہار کردے اور اُس سے صاف صاف کہدے کہ وہ اُسے چاہنے لگا ہے اسکی زلفوں میں گرفتار ہوچکا ہے۔ اُس کے شمع رخ کا پروانہ بن چکا ہے۔ لیکن فطری خودداری اور حیا اس رائے کو مسترد کردیتی۔ وہ سوچتا کہ عشرت اس کے اس طفلانہ اظہار عشق پر اُسے آخر کیا کہے گی۔ اُس کے اخلاق کے متعلق اُسکا کیا خیال ہوگا۔ وہ اُسے یقیناً بے اصولا۔ بے غیرت اور خودغرض قرار دے گی عشرت شریف ہے غیور ہے وہ میری اس غیر سنجیدہ روش کو پسند نہیں کرسکتی۔ آخر اُس نے یہ طے کیا کہ جو کچھ ہوا اس جنون کو بڑھنے نہ دے بیماری کا علاج آغاز ہی میں کرے۔ یہ سوچکر اُس نے ارادہ کرلیا کہ ایک ماہ کی چھٹی لیکر گھر چلا جائے۔ چنانچہ دوسرے دن اُس نے چھٹی کی درخواست دیدی اور خود روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ ممتاز احمد صاحب اور اُنکی بیوی نے جانے کی وجہ دریافت کی خورشید نے جواب دیا کہ بخار کے حملے کے بعد ابھی صحت درست نہیں ہوئی ہے۔ ڈاکٹر متھرا نے مشورہ دیا ہے کہ ایک ماہ تک کسی قسم کا دماغی کام نہ کروں یہاں رہکر یہ مشکل معلوم ہوا اسلئے مکان جانے کا ارادہ کرلیا ہے۔

ممتاز احمد صاحب نے اس رائے کو پسند کیا اور اسپر زور دیا کہ خورشید کتب بینی بھی مستقل طور سے کمی کردے اور مکان پر اپنا وقت زیادہ تر تفریح میں صرف کرے۔

عشرت نے بھی خورشید کے اس ارادہ کو خاموشی کے ساتھ سُنا۔ چلتے وقت اتنا ضرور کہا "خورشید بھائی مکان سے خیریت کے خط بھیجتے رہیگا ورنہ طبیعت پریشان رہیگی"

عشرت کی اس درخواست نے خورشید کے دماغی توازن پر ایک مرتبہ پھر بجلی گرائی۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ اس درخواست کا کیا جواب دے۔ اگر خط بھیجنے کا وعدہ کرتا ہے تو اس سفر کا اصل مقصد فوت ہوتا ہے اور بیماری جوں کی توں باقی رہتی ہے اور اگر وعدہ نہیں کرتا ہے تو بالکل بے موقع اور بد اخلاقی کی بدترین صورت ہوتی ہے۔ اور پھر یہ کسی اور کی درخواست نہ تھی۔ عشرت کی درخواست تھی۔ اسکی محسن اور تیمار دار کی درخواست تھی۔ وہ گھبراہٹ میں انشاء اللہ کہتا ہوا باہر نکل آیا تانگہ پر سوار ہوا اسٹیشن پہنچا اور مکان جانیوالی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ مکان پہنچکر ماں باپ کی شفقتوں کے سایہ میں اس کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ چھوٹے بھائی اور بہنوں میں اسکا دل بہلنے لگا۔ تنہائی کم ملتی تھی اسلئے وہ خیالات بھی اُسے کم ستانے لگے۔ ہفتہ عشرہ میں اُس چڑھتے ہوئے سیلاب کا زور بظاہر اچھا خاصا دھیما پڑ گیا۔ دل و دماغ بہت کچھ اپنی اصلی حالت پر آ گئے۔ گویا کھولتے ہوئے پانی کی ہانڈی پر کسی نے ڈھکنا رکھدیا!

(۵)

ایک دن وہ باہر کمرہ میں بیٹھا ہوا برنارڈ شا کی ایک جدید تصنیف کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ڈاکیہ آیا اور اُسنے ایک لفافہ دیا شناسا خط دیکھتے ہی اُس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ گھبراہٹ کے ساتھ اُس نے لفافہ چاک کیا عشرت کا خط تھا جس میں یہ چند جملے لکھے ہوئے تھے۔

"خورشید بھائی تسلیم۔ اللہ۔ آپ تو بڑے بے مروت نکلے! گئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے مگر خیریت کے دو حرف بھی نہ لکھے! کچھ آپ ناراض تو نہیں ہو گئے ہیں؟ جلد جواب دیجئے اور مجھپر احسان کیجئے۔

عشرت"

خورشید اس خط کو دیکھکر دم بخود ہو گیا اور اسکی نگاہوں میں اپنی شکست کی تصویر پھرنے لگی جنونِ عشق کے غلبہ کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ وہ سوچنے لگا کہ اس خط کا جواب دے یا نہ دے۔ بالآخر اُس سے نہ رہا گیا اور قلم دوات کاغذ لیکر خط لکھنے بیٹھ گیا۔ کئی مرتبہ خط لکھا اور چاک کیا۔ پھر کھڑے ہو کر جلد جلد ٹہلنا شروع کیا اور کسی خیال میں ڈوب گیا۔ تھوڑی دیر کے غور کے بعد پھر قلم اور کاغذ اُٹھایا اور جواب میں چند سطریں لکھیں:-

"عشرت تمہارا خط پہنچا اب میں اچھا ہوں اطمینان رکھو۔ میں اور تم سے ناراض! یہ تم نے کیا لکھا!

سراسان کی قابلیت اور اسکی نیک منشی اور جوان صالح ہونے کی سچی تعریف کر دی۔ ممتاز احمد کو خورشید کی رائے پر پورا اعتماد تھا اُنھوں نے رقعہ کو منظور کر لیا۔ دو ہی ایک روز میں دن تاریخ بھی مقرر ہو گئی عشرت اپنی زندگی کی تباہی کے اس تماشہ کو وحشت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور اُسے اپنی عروسی میں ماتم کا سامان نظر آرہا تھا!

خورشید نے عشرت کو احسان سے بیاہ دینے کا مشورہ تو دیدیا لیکن اسکی الجھنوں میں خوفناک اضافہ ہو گیا تمام کام اس سے چھوٹ گئے اب اُس کا مشغلہ صرف یہ تھا کہ حسرتناک اشعار درد بھرے لہجہ میں گنگناتا اور تنہا پڑا رہتا۔ سب سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ عشرت کی عروسی کے دن جتنے قریب آرہے تھے اُسکی وحشت بڑھتی جاتی تھی۔ ہر وقت اُسکی نگاہوں کے سامنے موت کی تصویر رہتی مسرت کا کوئی ہلکا سا خیال بھی اُسکے دل میں نہ آتا!

ایک دن سات بجے شام کو وہ اپنے کمرہ سے اُٹھکر عشرت کے پاس آیا۔ وہ سر جھکائے اُداس بیٹھی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ خورشید کی صورت دیکھتے ہی آبدیدہ ہو گئی۔ خورشید نے آج پہلی مرتبہ عشرت کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ کلیجہ پر چوٹ سی لگی۔ بیچین ہو گئے اور گھبرا کر کہہ اُٹھے۔ عشرت خدا کیلئے رو ؤ نہیں۔ تمہارے آنسو مجھ سے نہیں دیکھے جا سکتے۔ پھر سنبھل کر مسکرائے اور پوچھا "یہ صورت کیوں بنی غم کی"۔ عشرت نے ایک بار ان کی طرف حسرت سے دیکھا۔ اور آنسو بہاتے ہوئے بولی "آپکو میرے رونے سے کیا مطلب؟ آپنے تو مجھے اپنی خودداری کی قربانگاہ پر نذر چڑھا دیا۔ گوسفند قربانی کی تڑپ کا قصاب پر کیا اثر؟ اُسے تو اپنے کام سے کام" خورشید اپنی دلی تکلیف کیوجہ سے اشعاروں کو جلدی نہ سمجھ سکے پھر بھی عشرت کے لب و لہجہ کے درد نے اُن کی آنکھوں سے آنسو نکال ہی دئے اور گھبرا کر پوچھنے لگے "خدا کیلئے صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے"۔ عشرت نے گھٹنوں پر سر رکھ لیا اور اسی طرح سر نہوڑائے بولی "کیا آپکی حیا پرستی نے میرا خون نہیں کیا؟" اس فقرہ نے خورشید کے تمام جسم میں لرزش پیدا کر دی۔ دل تو بہت چاہا کہ آج پردے چاک کر دئے جائیں اور اپنے سچے جذبات سے عشرت کو بھی آگاہ کر دیا جائے۔ مگر وہی بات کی پچ۔ اپنے کہے کی غیرت۔ اپنی رائے کا لحاظ۔ اب کہے تو کیا اور کرے تو کیا۔ اُس نے جسطرح ممکن ہوا اپنے کو روکا اور اپنی تمناؤں کا گلا گھونٹ دیا مگر دماغ بے قابو ہو گیا حواس کے نظام میں اختلال پیدا ہو گیا۔ وہ مجنونانہ انداز سے اپنے کمرے کی طرف بھاگا اور وہاں پہنچتے ہی پلنگ پر گر پڑا۔ اور اس دماغی ہیجان کی حالت میں اپنی اور عشرت کی حالت پر غور کرنیلگا

وہ بار بار سوچ رہا تھا کہ میں نے اُس غریب پر یقیناً بڑا ظلم کیا۔ وہ مجھے چاہتی تھی اور پورے طور سے چاہتی تھی۔ اب سے پہلے خود میں ہی نے کیوں نہ اُسے شادی کا پیغام دیدیا۔ زیادہ سے زیادہ والدین ناراض ہوتے لیکن عشرت کا دل تو اس بُری طرح نہ دُکھتا۔ اب اس قصور کی تلافی کیونکر کیجائے۔ عشرت میرے سوا کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ پھر میں اُسے پوشیدہ طور سے لیکر کسی دوسرے ملک کو کیوں نہ چلا جاؤں۔ وہ اس تجویز کو یقیناً پسند کریگی۔ یہ سوچتے ہی وہ قلم دوات اور کاغذ لیکر بیٹھ گیا اور اُس تجویز کے متعلق عشرت کو ایک خط لکھنے لگا لیکن ایک مرتبہ پھر سنبھلا اور اُسکی فطری شرافت اُبھری اُسنے خط چاک کردیا اور اپنے کو اس غیر شریفانہ ارادے پر نفرین کرنے لگا "ہائیں یہ میں نے کیا سوچا تھا کیا عشرت کے اُس احسان کا یہی بدلہ ہے کہ میں اُسے رسوا کردوں اُسکی غیرت کو دھبہ لگادوں؟ ماموں ممتاز احمد نے جو مجھپر عشرت کے معاملہ میں اتنا اعتماد کیا تھا کیا اُس کا مقتضا یہی ہے کہ میں انھیں مُنھ دکھانے کے قابل نہ رکھوں؟ مانا کہ میں عشرت کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں اور اُسکی جدائی میرے لئے موت ہے لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنی اس خودغرضی کے بھنور میں اُسکی باعزت زندگی کی آسائشوں کو ہمیشہ کیلئے ڈبودوں؟

احسان مجھ سے زیادہ عشرت کو آرام پہنچا سکتا ہے۔ چند ہی دنوں میں وہ عشرت کو مانوس بنالیگا۔ اور اُس کے دل سے یہ خلش جاتی رہے گی۔ اور پھر خود میں ہی نے تو ممتاز ماموں کو اس رشتہ کے منظور کرلینے کا مشورہ دیا تھا۔ ایسی حالت میں اس سے زیادہ کمینہ پن اور کیا ہوسکتا ہے کہ میں عشرت کو لیکر کہیں ادھر چلا جاؤں۔ یقیناً یہ غیر شریفانہ خیال تھا۔ آخر یہ بیہودہ خیال میرے دماغ میں کیونکر آیا۔ کوئی شک نہیں مجھ سے انسانیت رخصت ہوچکی۔ میں بالکل حیوان بن گیا پھر آخر ایسی ہستی کی بقا کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جو اسقدر ذلیل ہوجائے۔ مجھ میں اب شرافت نہیں رہ گئی۔ مجھ میں اب غیرت نہیں رہ گئی۔ میں بالکل خودغرض بن گیا۔ میرے خیال میں رذالت سرایت کرگئی ہاں ہاں مجھے اب زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ میرے اس غیر شریفانہ ارادہ کا کفارہ صرف موت ہی موت یقینی اور فوری موت" یہ خیال آتے ہی وہ اپنے بکس کیطرف وحشیانہ طور سے جھپٹا اُس سے بھرا ہوا ریوالور نکالا اور ریوالور پیشانی سے لگا کر خالی کرلیا۔ ریوالور کی آواز سنتے ہی عشرت جو اُس کمرے سے قریب ہی تھی خورشید کے پاس گھبرائی ہوئی پہنچی وہاں جاکر دیکھا کہ ریوالور اُس غیرت دار کا کام تمام کرچکا ہے۔ عشرت نے بیتابی کیساتھ جھپٹ کر خورشید کے پاس سے ریوالور اُٹھایا اور یہ دیکھا کہ اُس آتشیں مشین میں اُسکے حصہ کی بھی کوئی گولی باقی ہے کہ نہیں۔ مگر اب اُس میں سے گولی کہ نکلتی۔ افراطِ غیرت کی قربانی کے لئے تو زندگی شرط ہے!!

"سالی"

رند کے قلم سے

میں نہیں کہہ سکتا کہ بزم ادب کے سنجیدہ اور متین ہم جلیس کہاں تک اس بارے میں میرے ہم خیال ہو سکیں گے مگر کئی سال کے مسلسل تجربہ کی بنا پر میرا ذاتی عقیدہ تو یہ ہے کہ حقیقی معنوں میں سالی استواریٔ ایمان کی محک بھی ہوتی ہے اور مجدد ایمان بھی۔ میں نے یہ خوب آزمایا ہے کہ جب کبھی میں اپنی سالی کو دیکھ لیتا ہوں میرے عقاید مذہبی پر ایک نئی صیقل ہو جاتی ہے۔ یا یوں کہوں کہ میرا ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ میری سالی مناظرہ کی کوئی لمبی چوڑی کتاب، ایک پر جوش وعظ، یا بشری ہیئت میں عذاب الٰہی کا نمونہ ہیں۔ نہیں نہیں۔ وہ بذات خود تو بہت ہلکی پھلکی۔ کم سخن۔ اور خدا کی خاص رحمت کا بیّن ثبوت ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جب کبھی اُن سے چار آنکھیں ہو جاتی ہیں تو بیساختہ میرا دل اُس مذہب کی عظمت اور صداقت کی داد دے اُٹھتا ہے جو دائرہ ازدواج کی وسعت کو انتہائی سہولت کے حدود تک پھیلا دینے کے باوجود سب سے زیادہ نازک اور پرخطر موقعہ پر بین الاختین کی حدِ فاصل قائم کر کے سالیوں کی سچی محافظت کرتا ہے!

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسی شدید حد بندی کی ضرورت ناگزیر تھی۔ اس لئے کہ ایک طرف تو خود مذہب ایک سے چار تک کی اجازت کھُلے خزانے دیتا ہے اور دوسری طرف ہر خاندان کے بزرگ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اس پرانی دُھرانی دنیا میں اپنے ہم پلہ اور حسب خواہش ذی رتبہ خاندانوں کی بہت قلت ہے۔ بلکہ بعض "ہیچو من دیگرے نیست" فرزندان آدم کے نزدیک تو اس جنس کا سرے ہی سے فقدان ہے۔ اب ایسی نازک حالت میں اگر مذہب اس طرح کا اٹل حکم امتناعی نافذ نہ کر دیتا تو اسکا ایک لازمی نتیجہ تو یقیناً ہوتا کہ دنیائے اسلام میں غیر ضروری مگر سہل الحصول تعدادِ ازدواج کی رسم بہت عام ہو جاتی جو بلاشبہ اسلام کی بنیادی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ بتعینہٗ حد بندی کا نتیجہ یہ ہے کہ گو جمیع ممالک اسلامی (اور غیر اسلامی) میں بہنوئیوں کے دلوں پر سالیوں کے حسنِ جمال کی سنہری بجلیاں بلا روک ٹوک گرتی رہتی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ سالیوں کی

زبان حال سے لن ترانیوں کے ہمت شکن اور مایوس کن زمزمے کی صدا بھی بہنوئیوں کے کان میں ہر آن گونجتی رہتی ہے۔ اور اسی طرح محض ہنسی مذاق میں بات ٹل جاتی ہے!

مضمون کی وادی بہت دشوار گذار ہے اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی ضرورت ہے۔ تاہم رندانہ لباس کی پردہ پوشی اور ادبی خدمت گذاری کا ذوق اسکی جرات دلاتے ہیں کہ اُن مابعد کے نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جو لوکل گورنمنٹ اور میرے درمیان خانہ جنگی کی حد تک پہنچ سکتے ہیں۔ آج بیویوں اور سالیوں کا تقابل ہدیہ ناظرین کروں۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ اور اگر کہیں بانسہ بالکل ہی الٹا پڑا اور حضرت "رند" "نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے" تو بھی فرزند آدم کی حیثیت سے کسی شکایت کا محل نہیں۔ "جو کچھ فلک دکھائے وہ ناچار دیکھنا"!

بہرحال اسکے ماننے میں تو شاید آپکو بھی تامل نہ ہوگا کہ بیوی اگر چمنستان عشرت کا پھول ہے تو سالی اس پھول کی لطیف مہک ہے۔ جب پھول زیب دستار ہوتا ہے تو مہک بھی مشام دماغ کو معطر کرتی ہے بیوی اگر نخلستان محبت کا چشمۂ شیریں ہے تو سالی کی حیثیت دُور سے لبھانے والے۔ چشم فریب اور دل فریب سراب سے کسی طرح کم نہیں۔ بیوی اگر مہر درخشاں ہے تو سالی ماہِ ضو فشاں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس چاندنی کے پھول کا راز تبسم اُس سورج مکھی کے زیب چمن رہنے پر مشروط ہے۔ مگر جہاں ضیاءِ مہر کی خیرگی افزا تابش۔ تصورات لطیف کی دشمن اور داستانِ حیات کا غیر دلچسپ باب سمجھی جاتی ہے۔ وہاں ماہ منیر کی سکون بخش نور افشانی راحت و تسکین کا سرمایہ اور افسانۂ حسن و عشق کا دیباچہ مانی جاتی ہے۔

ہاں استعارات کا رخ قدرے بدل کر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آبلۂ دل کے لئے بیوی اگر جراح کا نشتر ہے تو سالی کسی ہمدرد مرہم رکھنے والے کا نازک ہاتھ۔ بیوی اگر مطرب خوشنوا ہے تو سالی اسکے ساتھ بجنے والا دلکش ساز (اس تشبیہ کے ماخذ وہ دلچسپ مواقع ہیں جب "محرم راز من" میرے فرد جرائم کی بالاعلان تشہیر پر مائل ہوتی ہیں اور انکی بہن۔ جو اسوقت گویا میری سالی ہی نہیں رہتیں۔ ایک لطیف مگر ناقابل گرفت عنوان سے انکی ہمنوائی میں مشغول ہو جاتی ہیں)۔ پھر۔ بیوی اگر برسات کی موسلا دھار بارش ہے تو سالی موسم بہار کی ننھی ننھی پھوار۔ اور بطور تتمہ۔ بیوی اگر زخم جگر کے لئے سنگ جراحت ہے تو سالی اس زخم کیلئے کہیں سیندھی کہیں لاہوری اور کہیں پکے رنگ کے نمک کی ایک ہلکی سی کنکری ہے!

اس سلسلہ میں اس بات کا تذکرہ بھی خالی از لطف نہ ہوگا کہ غالب مرحوم نے سالی اور بیوی کے اس تقابل کو ایک مشہور غزل کے دو مصرعوں میں اپنے مخصوص طرز بیان اور قابل رشک اختصار کے ساتھ ایک دلچسپ پیرایہ میں نظم کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک روز حضرت غالب کسی مشاعرہ کے لئے غزل کی تیاری میں مصروف تھے اور انکی سالی جو اسدن انکے یہاں مہمان تھیں طرح طرح سے انکے تسلسل خیال اور انکے حدود صبر کی آزمائش پر تلی تھیں۔ آخر کار جب ہمارے بالعموم مشکل پسند شاعر نے اپنے آپکو اس "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کے غیر معمولی مخمصہ میں گرفتار پایا تو ایک عجب انداز سے اپنی سالی کی طرف دیکھا اور کچھ جھنجھلا کر کہدیا کہ "غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں"۔ اتنے ہی میں اُدھر سے بیوی بھی سامنے آنکلیں اور "انکو دیکھتے ہی "بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا" والا مصرعہ بھی موزوں کر دیا!

یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ مگر ایک پہلو سے سالی کو بیوی پر بہت بڑی فوقیت حاصل ہے اور وہ یہ کہ شادی کے تھوڑے یا بہت دن بعد۔ ایک نہ ایک دن وہ روز بد بھی آتا ہی ہے کہ بیوی محض بچوں کی ماں بنکر رہجاتی ہے اور شوہر "باپ" مگر سالی ہمیشہ سالی ہی رہتی ہے۔ اس پر لطف رشتہ کی شوخی اور نزاکت سدا بہار ہوتی ہے جسکی ترو تازگی پر انقلاب ایام کی تلخ کوبی بھی کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتی!

خدا جانے ایسا کیوں ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اس ارمان بھرے لفظ کے سنتے ہی شادی کے بعد کا دور ابتدائی مع اپنی تمام امیدوں۔ امنگوں اور جذبات کے نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ جب نیا نیا دولھا سہرے کے بوجھ سے گردن جھکائے اور بیویوں کے خوف سے نظریں نیچی کئے۔ شرماتا جھینپتا۔ اور ایک بھاری عنوان سے اپنی دلھن کے خرام ناز کی نقالی کرتا ہوا پہلے پہل سسرال کے گھر میں داخل ہوتا ہے تو اُسے للچانے۔ ستانے اور چھیڑنے کی ابتدا سالیوں ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ فارسی کے کسی استاد نے سچ کہا ہے کہ عشق کی ابتدا ہمیشہ محبوب ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ ورنہ "تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود"۔

اگر سالی نہ ہو تو مشرقی طرز معاشرت اور رسم و رواج کے اعتبار سے سسرال میں نو گرفتار دولھا کی زندگی وبال جان ہوجائے اور اسکے دن بڑی کس مپرسی کے عالم میں کٹیں۔ (یہ محض دعوے ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے اکثر سالی نداردہ احباب اسکی تصدیق بھی کر چکے ہیں) مگر خدا سالیوں کا بھلا کرے

جنکی بدولت سسرال کے زمانہ قیام کا ہر "دن" بھی روز عید کیطرح ہنستے کھیلتے گذر جاتا ہے۔ جب بہنوئی کی بیوی کی شادی رچتی ہے تو سالی کے فرائض لاتعداد اور اُسکی مصروفیتیں گوناگوں ہوتی ہیں۔ کبھی بہنوئی کی خاطر مدارات میں منہمک۔ کبھی اسکی خوشدامن تک اسکے پیغامات پہنچانے اور بشرط ضرورت اُسکی طرف سے بلامعاوضہ وکالت کرنے میں مصروف۔ کبھی مہمانوں کی آؤ بھگت کا مشغلہ ہے۔ کبھی بہن کے سجانے بنانے کی فکر دامنگیر ہے۔ اور کبھی بہنوئی کے سامان استراحت میں دل لگا ہے۔ سچ تو یوں ہو کہ ایک انار و صد بیمار۔ ایک اس غریب کی جان اور سیکڑوں دھندے۔ مگر باینہمہ وہ ان سب فرائض کو اسطرح کی دلی ہمدردی اور ایسی خندہ پیشانی سے سرانجام دیتی ہے کہ گویا سب ہنگامہ اُسی کی خاطر برپا ہے اور وہ آپ ہی اپنی بہن ہے!

سالی کو بہنوئی سے اُسی قسم اور اُسی پایہ کی فطری محبت ہوتی ہے جیسی........ جیسی کہ بہنوئی کو سالی سے۔ اس تشبیہ کا نامکمل رہجانا اسکا شاہد ہے کہ اس رشتہ کی گدگداہٹ کچھ ایسی دلفریب اور اسکی یگانگت میں غیریت کی کچھ ایسی جھلک نمایاں رہتی ہے کہ جسکی نظیر دنیا کے کسی اور رشتہ یا تعلق میں نہیں ملتی! زن و شو کے تعلقات میں یگانگت کی فراوانی شاعرانہ تخیل کا محل باقی نہیں رکھتی۔ اگر ماند شبے ماند۔ اور بس! یہی تو وجہ ہے کہ افسانہ نویس اور ناولسٹ اسپر مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی تصانیف کے پلاٹ کو عین اُس مقام پر لاکر چھوڑ دیں جہاں سے ازدواجی زندگی کے غیر شاعرانہ ڈرامے کا حقیقی آغاز ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سالی اور بہنوئی کے رشتہ میں بے حجابی میں حجاب کا پردہ۔ یگانگت میں غیریت کا چلن۔ کچھ شوخی اور کچھ حیا۔ کچھ تمنا اور کچھ استغنا۔ کچھ بے لوثی اور کچھ چھیڑ چھاڑ۔ ایسی چیزیں ہیں جو جذبات "شعر خیز" کے دوام کی ضامن اور انکے استقلال کی کفیل رہتی ہیں۔

بہنوئی کی نگاہ میں سالی باعتبار سن ہمیشہ جوان ہی رہتی ہے (خدا کرے سالیاں بھی بہنوئیوں کو اسی نگاہ سے دیکھتی ہوں) اسلئے کہ اکثر سفید ریش اور پوپلے بہنوئی اپنی ہم سن سالیوں سے اُسی تیور سے مذاق کرتے پائے جاتے ہیں جسکے وہ عین شباب میں عادی تھے۔ اور انکی سالیوں کے ترکی بہ ترکی جوابات کا پارہ بھی اُسی ابتدائی درجہ حرارت پر قائم نظر آتا ہے۔ گویا یہاں جراثیمی ڈاکٹروں اور حکیموں کے اُس قول کی تصدیق ایک نئے عنوان سے ہوتی ہے جسکی بنا پر یہ لوگ پھولوں کے سونگھنے کی نسبت انہیں

دو ہی سے دیکھنا زیادہ مفید اور حیات بخش بتاتے ہیں۔ سالی اور بہنوئی کا رشتہ اپنی نوعیت میں اجتماع ضدین کا آئینہ ہے۔ بیوی کی بہن۔ نصف یہ اور نصف وہ۔ کبھی یہ۔ کبھی وہ۔ کبھی سب کچھ۔ اور افسوس کہ کبھی کچھ بھی نہیں۔ جو لوگ مردوں اور عورتوں میں پاک یا پاکیزہ محبت (Platonic love) کے قائل نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سالی اور بہنوئی کے رشتہ پر کبھی گہری نظر نہیں ڈالی۔ ورنہ یہ لوگ اپنا نظریہ کبھی کا بدل چکے ہوتے!

بعض اوقات انسانی منصوبوں اور قضا و قدر کے فیصلوں کی دائمی کشمکش کی بدولت اس رشتہ کی لطافت میں ایک نئی قسم کی دلچسپی کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اُدھر دلھن بننے کے دلفروز شوق کی تیز گامی اور اِدھر بھولے میاں کی مایوس کن پست خرامی۔ وہاں بڑے کی قید اور یہاں بلا تامل فیل ہونیکی عادت۔ ایک طرف سے امکانی بلکہ غیر امکانی تعجیل کی فرمائش اور دوسری طرف ولایت کے سفر کی تیاریاں۔ اور اگر یہ کچھ بھی نہ ہو تو بھی خاندانی دستور کے مطابق پنڈتوں۔ جوتشیوں اور نجومیوں کی دوربین نگاہ میں ستاروں کی ناموافقت۔ یا استخارہ کی عدالت عالیہ کا اس قرآن السعدین کے خلاف فتوے۔ یہ سب بہت تشکن مواقع ہیں جہاں لب بام تک رسائی کی صورت نکلتے نکلتے کمند کا رشتہ تڑسے ٹوٹ جاتا ہے اور بظاہر بنا بنایا کھیل بگڑتا نظر آتا ہے۔ گو قسمت کا مریض پھر ایک سنبھالا لیتا ہے اور مایوسی کے اندھیرے میں ایک نئی شمع کی شعائیں ضو فشانی کرنے لگتی ہیں لیکن اس اُلٹ پھیر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سالی بیوی اور بیوی سالی بن جاتی ہے۔ اس صورت حال کی لطافتوں کی تصویر کشی الفاظ میں نہیں کیجا سکتی۔ جب اس طرح کی سالی سے نگاہیں چار ہوتی ہیں تو ایک عجب سماں پیش نظر ہوتا ہے۔ ایک طرف جھپی ہوئی آنکھیں اُسکی غمازی کرتی ہیں کہ قوت تخیل نامکمل تصویر کی تکمیل پر مائل ہے۔ اور دوسری طرف للچائی ہوئی نظریں اس تصور کی شاہد ہیں کہ "جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

الغرض سالی ایک ایسی نعمت ہے کہ جو لوگ اس سے محروم ہیں وہ ہر حیثیت سے ہمدردی کے مستحق ہیں۔ خواہ وہ کنوارے ہوں یا بیاہے۔ جن لوگوں کو خزانہ قدرت سے ایک سے زائد سالیاں ملی ہوں وہ یقیناً خوش قسمت ہیں۔ اور جنہیں صرف ایک ہی ملے وہ ان سے بھی بڑھکر خوش نصیب۔ اسواسطے کہ ایک کا خوش رکھنا کئی کے خوش رکھنے سے نسبتہً سہل۔ ایک کی خفگی کا سہنا اسی نسبت سے آسان ہوتا ہے۔ اور ازدواجی زندگی میں ان دونوں مرحلوں سے روشناس ہوئے بغیر چارہ نہیں۔ سالی اگر حسن صورت

میں بیوی سے کمتر ہو تو سرمایۂ عبرت ہے۔ اور اگر حسین تر ہو تو وجہ تسلی ہے۔ اگر دونوں اپنے اپنے مقام پر حسن کی دیویاں ہوں تو بہنوئی اپنی چھوٹی سی مملکت حسن کا راجہ اندر ہے۔ اور اگر دونوں وہ ہوں جو کہنے کو دل نہیں چاہتا تو یہ مملکت ہمیشہ کیلئے خارجی خطرات سے محفوظ ہے۔ سالی اگر عمر میں بیوی سے کم سن واقع ہو تو سبحان اللہ۔ اور بڑی تو ظاہر ہے کہ اور بھی بڑی نعمت ہے :

بعض سالیاں بیوی کی ہمسن بھی ہوتی ہیں۔ اور توام بہنوں میں ہمشکل وہم شباہت ہونا ابتدا سے رائج ہے۔ چنانچہ حال ہی میں کہیں پڑھا تھا کہ ایک زندہ دل نے اس طرح کی دو بہنوں میں سے ایک سے شادی کی۔ چند روز بعد ایک دوست نے سوال کیا کہ حضرت! آخر آپ پہچانتے کیونکر ہیں کہ کون بیوی کون سالی؟ اسپر ہمارے ہیرو نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ عزیز من! میں نے اس مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا۔ کیونکہ کبھی مجھ اسکی ضرورت ہی واقع نہیں ہوئی۔

سالی کی ان صنفوں میں وہ صنف بھی قابل تذکرہ ہے جہاں فطرت کی ستم ظریفی دو بہنوں کو نہ صرف توام بلکہ حقیقی اور جسمانی معنوں میں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے وابستہ پیدا کرتی ہے۔ میں حیران ہوں کہ قدرت کے اس نظام (یا بدنظمی) کو ایک جان اور دو قالب کہوں۔ یا ایک قالب و دو جان۔ سال گذشتہ ایک مرد میدان نے اس طرح کی دو بہنوں میں سے ایک بہن سے شادی کی لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ یہاں ایک اور دو کا فرق ہی سرے سے مبہم ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اصول فقہ کے اعتبار سے یہ شادی ایک ہی سے ہوئی یا دونوں سے ہوگئی۔ اور اسی بنا پر اس میں بھی اشکال واقع ہو سکتا ہے کہ آیا ایسا عقد جہاں قدرت پہلے ہی سے دونوں بہنوں میں پکی اور دائمی گرہ لگا چکی ہو۔ جائز بھی ہے یا نہیں۔ بہرحال یہ نازک مسئلے تو وکیلوں اور فقیہوں کے حل کرنے کی چیزیں ہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ شادی ہوئی اور اکثر رسالوں اور اخباروں میں ان دونوں بہنوں کے فوٹو بھی چھپے۔ بلکہ لکھنؤ اور دیگر مخصوص مقامات پر اسکا بھی امکان ہوا کہ چار آٹھ آنے کا ٹکٹ لیکر فطرت کے اس معمہ کی بچشم خود زیارت کرلیجائے۔ دیکھنے ہم بھی گئے تھے۔ اور تماشہ بھی ہوا۔ مگر ہمیں اسکا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے اس رشتہ کا گورکھ دھندا ابھی ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ لہٰذا اس کے متعلق "شرم نارسائی" کے تحفہ کے سوا کسی اور تنقیدی اظہار خیال کا امکان نہیں!

مختصر یہ کہ جس پہلو سے دیکھئے سالی نہایت ہی مفید اور قابل قدر چیز ہے جہاں تک ممکن ہو اسے

اپنے پاس رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اسواسطے کہ دکھ بیماری وغیرہ کے موقعوں پر اُس سے بڑھکر تیمار دار۔ بچوں کی نگراں اور جملہ امور خانہ داری کی انچارج کوئی دوسری ہستی نہیں ہو سکتی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اس مفرح قلب کا نسخہ مجرب و آزمودہ ہے۔ قباحت صرف اتنی ہے کہ اس بدمذاق دنیا میں یہ جنس نہایت گراں قیمت پر ملتی ہے۔ یعنی تجرد کی سبکباری کو ایک مکمل بیوی اور امکانی بچوں کی غیر متعین تعداد کے بارسے بدلنے پر رضامند ہونا پہلی شرط ہے۔ یا یوں کہئے کہ جب کسی چوکھٹ پر داماد بنکر بیوی مانگنے جائیے تب کہیں سالی ملتی ہے۔ تاہم مجھے توی امید ہے کہ اس مضمون کے پڑھنے کے بعد وہ تنہا خور اور نفس پرست لوگ جو بیوی اور بچوں کے خوف سے شادی کے نام سے گریزاں ہیں۔ بیوی کی خاطر نہ سہی۔ کم از کم سالی کے لالچ میں اپنے غیر فطری رویہ کی اصلاح پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اور اگر سوئے اتفاق سے شادی کے بعد انھیں یہ معلوم ہوا کہ انکا نام سالی ندارد والی فہرست میں منسلک ہے تو سمجھ لیں کہ فطرت اُن سے انکی سابقہ کج فہمیوں کا انتقام لے رہی ہے۔ علاوہ بریں قدرت کی نوازشیں "ظرف قدح خوار" کے مطابق ہوتی ہیں' میرا اس میں کوئی قصور نہیں !!

"ارشادات"

نواب حیدر یار جنگ صاحب نظم طباطبائی

سنگِ جفا کا غم نہیں دستِ طلب کا ڈر نہیں
اُس پہ ہوا اپنا آشیاں نخل جو بارور نہیں

پہلے جگر پہ آہ کا نام نہ تھا نشاں نہ تھا
آخرِ کار یہ ہوا آہ تو ہے جگر نہیں

شبنم و گل کو دیکھکر وجد نہ آئے کس طرح
خندۂ بے سبب نہیں گریۂ بے اثر نہیں

تیرے فقیر کا غرور تاجوروں سے ہے سوا
طرفِ کلہ میں دے شکن اُسکو یہ دردِ سر نہیں

کوشک و قصر و بام و در تو نے بنا کیے تو کیا
حیف ہے خانماں خراب دل میں کسیکے گھر نہیں

شانِ کریم کی یہ ہے 'ہاں' سے ہو بیشتر عطا
لطف عطا کا کیا ہو جب 'ہاں' سے ہو بیشتر نہیں

صبحِ ازل سے تا ابد قصہ نہو گا یہ تمام
جورِ فلک کی داستاں ایسی بھی مختصر نہیں

شاطرِ پیرِ آسماں واہ ری تیری دستبرد
خسرو کیقباد کی تیغ نہیں کمر نہیں

نقد و تبصرہ

"گنجینۂ تحقیق"

مصنفۂ پروفیسر سید محمد احمد صاحب تجود موہانی ایم اے منشی فاضل

حضرت تجود کی گرانمایہ ہستی دُنیائے ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ اُردو کے ایک بلند پایہ شاعر اور مستند ادیب کی حیثیت سے آپ علمی و ادبی دنیا میں خاص شہرت کے مالک ہیں۔ گنجینۂ تحقیق آپکے اُن پانچ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو آپنے مختلف اوقات میں فارسی اور اُردو ادب کے متعلق تحریر فرمائے ہیں۔ آپنے ان مضامین میں بہت سے ادبی رموز و نکات حل فرمائے ہیں اور بہت سی ایسی چیزیں جمع فرما دی ہیں جنکا مطالعہ اُردو اَدبیات کا ذوق رکھنے والوں کیلئے صد درجہ مفید ہے۔ آپکا طرز تحریر شوخ، رنگین اور پُر مغز ہے۔ عبارت شاعرانہ لطائف سے پُر ہے۔ کہیں کہیں اطناب بھی ضرور ہو جاتا ہے مگر شگفتگی و تازگی ہاتھ سے کہیں نہیں جاتی چونکہ حضرت مصنف کو غالب سے خاص طور پر عقیدت ہے اسلئے اُن مضامین میں جو غالب کی شرحوں پر لکھے گئے ہیں یا اُن میں جو آرگس کے اُس مقالہ واہیہ کی رد میں لکھے گئے ہیں جسمیں نہایت شوخ چشمی سے غالب کو سارق کہا گیا تھا مصنف کا قلم نہایت تیزی سے چلا ہے۔ آرگس سا کم علم خود نما یقینی اسیطرح کے جواب کا مستحق تھا۔ البتہ بعض بعض مقامات پر فارسی اساتذہ کی ایک حد تک حق تلفی بھی ہو گئی ہے۔ سو وہ بھی اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔

مجموعی حیثیت سے یہ تصنیف یقینی اس قابل ہے کہ اُردو ادب کی بہترین تصنیفات کے پہلو بہ پہلو جگہ پائے اور شائقین ادب کے کتب خانوں کی زینت بنے۔ حجم ۳۴۵ صفحے۔ کاغذ و طباعت معقول و دیدہ زیب۔ قیمت قسم اول ۳ قسم دوم ۲، کتاب حضرت مصنف سے شیعہ کالج کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

"اسلامی جہاد"

مصنفۂ مولوی سید اختر علی تلہری صاحب اختر۔ مولوی فاضل منشی فاضل۔

مولانا اختر علی تلہری صاحب۔ اُن خوش قسمت افراد میں سے ہیں جنھیں عربی و فارسی زبانوں پر عبور حاصل ہونے کے ساتھ ہی انگریزی پر بھی ایک حد تک قدرت حاصل ہے۔ اس تبحر علمی میں اُنکی خداداد ذہانت و ذکاوت نے اور چار چاند لگا دئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ایچ۔ جی ویلیز اور مارگولیتھ سے مشہور انگریزی مصنفین کی بھی غلط بیانیوں کا پردہ فاش کرتے رہتے ہیں۔ زیر نظر رسالہ آپنے انھیں مصنفین کی رد میں لکھا ہے۔ ان نام نہاد مستشرقین و مورخین نے

اسلام کے سمجھنے میں جہاں اور غلطیاں کی ہیں وہاں اسکے بانی حضرت محمد صلعم پر یہ بھی اعتراض وارد کردیا ہے کہ حضرتؐ کے غزوات وسرایا حکومت وسلطنت کے قیام کی غرض سے کئے گئے تھے۔ جناب مولانا نے نہایت ہی مدلل طور پر اس امر کو ثابت فرمادیا ہے کہ یہ اعتراض ان حضرتؐ پر محض بہتان ہے اس سلسلہ میں جو عقلی ونقلی دلائل مولانا نے تحریر فرمائے ہیں وہ حد درجہ مسکت ہیں۔

ہمارا یہ لکھنا کہ مولانا کی عبارت حد درجہ دل آویز اور پسندیدہ ہوتی ہے تحصیل حاصل ہے۔ ناظرین ادب مولانا کے حسن بیان وزبان سے اچھی طرح واقف ہیں ہمارا تو خیال ہے کہ یہ رسالہ بھی مولانا کی پہلی تصنیف "ابتلائے عظیم" کی طرح بہت جلد حسن قبول حاصل کریگا اسی طرح سر وآنکھوں پر جگہ پائیگا جسکا وہ مستحق ہے۔

سکریٹری مؤید العلوم مدرسۃ الواعظین (جسے مولانا نے اپنی یہ مختصر گر پرقدر دینی خدمت ہدیۃً دیدی ہے) سے ۳ر پر ملسکتا ہے۔

"آئینہ اردو"

مولفہٗ مولوی محمد شفیع اللہ صاحب شفیعی آروی

یہ کتاب اردو فن املا کے مستحکم ضوابط، تذکیر وتانیث کے مشکل قواعد، عبارت نگاری کے ضروری شرائط، محاورات کی توضیح اور مترادف الفاظ کی تشریح پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اسمیں زباں دانی وشعر فہمی وغیرہ کے سے دقیق مسائل پر بھی ضمنی بحثیں ہیں۔ مولف نے ہر مقام پر نہایت تجسس وتحقیق سے کام لیا ہے۔ عبارت خاصی شگفتہ اور رواں ہے۔ یہ کتاب چونکہ طلبا کے لئے لکھی گئی ہے اسلئے اسکے مختلف ابواب کو "تعلیم" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ کتاب میں اس طرح کے ۳۲ درس ہیں جو طلبا کیلئے ضرور مفید ہیں۔

جناب مولف سے ہمیں بعض بعض مقامات پر اختلاف ہے۔ ان میں سے چند مثالاً عرض ہیں، تعلیم سوم میں موصوف نے ان الفاظ کی فہرست دی ہے جو اردو میں غلط صورت میں مستعمل ہیں اس فہرست میں لاپروا۔ یگانگت اور قائم مقامیاں" کو بھی آپ نے شامل فرمایا ہے۔ آخر الذکر لفظ کے متعلق شاید موصوف کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ "قائم مقامان" کی جگہ مستعمل ہے۔ ہمیں جہانتک علم ہے یہ لفظ قائم مقامی کی جمع ہے اور اس صورت میں اس میں کوئی سقم نہیں نظر آتا۔ یگانگت اور لاپروا کے متعلق یہ عرض ہے کہ فارسی میں یہ الفاظ خواہ کسی صورت میں مستعمل ہوں لیکن اردو میں اب یہ نزاکت وغیرہ کی طرح اسقدر عام طور پر رائج ہیں کہ اب انکا بدلنا یا انھیں غلط کہنا زبان کو ضرورت سے زیادہ محدود کرنا ہے اور اردو سے نئے الفاظ ایجاد کرنیکا وہ حق سلب کرنا ہے جو ہر زبان کو حاصل ہے۔ اسی طرح جہاں مولف نے متروک ومستعمل الفاظ کی بحث چھیڑی ہے وہ جگہ بھی قابل نظر ہے۔ جناب مولف نے بھانا (پسند آنا)۔ بھلا

(اچھا) پیر (پاؤں) کو متروک بتایا ہے اور توسین والے الفاظ کو مستعمل۔ ہمارے نزدیک دونوں ابتک مستعمل ہیں بلکہ بعض مواقع تو ایسے ہیں کہ جہاں پر یہ نام نہاد متروک الفاظ ہی زیادہ بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ طبع ثانی کے موقع پر حضرت مولف غریب اُردو کی تہی دامانی کا خیال فرماتے ہوئے اسقدر سخت گیری سے کام نہ لینگے۔

کتاب مجموعی طور پر مفید اور عمدہ ہے۔ ہم جناب مولف کو انکی اس تالیف پر مبارکباد دیتے ہوئے اسکی امید کرتے ہیں کہ شائقین اُردو انشا اسے اپنے کتب خانوں میں ضرور جگہ دینگے۔

حجم ۱۶۰ صفحے۔ قیمت عہ، ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ تجارتی اسٹار بک ڈپو نمبر ۴۴ لوئر سرکولر روڈ کلکتہ

"اسباق غیر درسی"

مولفہٗ بابو لکشمی نرائن دھون اسسٹنٹ ماسٹر جوبلی کالج لکھنؤ

بابو لکشمی نرائن دھون صاحب ایک نہایت ہی تجربہ کار معلم ہیں۔ آپنے ساری عمر تعلیمی اداروں ہی میں کاٹی ہے اسی لئے آپ ان دقتوں سے کماحقہ واقف ہیں جو انگریزی مدارس کے طلبا کو اپنی مادری زبان کے حاصل کرنے میں پیش آتی رہتی ہیں۔ یہ کتاب آپنے انہی دقتوں کے کم کرنے کیلئے لکھی ہے۔ اسمیں مختلف انشا پردازوں اور شعرا کے نمونے نظم و نثر درس کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ مولف نے ہر سبق کے بعد چند سوالات ایسے دیدئے ہیں جنکے حل کرنیکے بعد اس سبق کی تمام مشکلیں دور ہو جاتی ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کتاب اسکی مستحق ہے کہ وہ ہائی اسکول کے نصاب اُردو کے ساتھ پڑھائی جائے۔ اس سے طلبا میں اُردو ادب کے پڑھنے کا شوق اور سمجھنے کا مادہ روز افزوں ترقی کریگا۔

قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ رام نرائن لال پبلشر الہ آباد۔

رباعیات ۔ مصنفہ خان بہادر سید اولاد حیدر صاحب فوق بلگرامی۔

حضرت فوق بلگرامی ان قابل قدر ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی ساری عمر علم و ادب کی خدمت کیلئے وقف کردی ہے۔ "اسلامیات" سے جسے کچھ بھی دلچسپی ہوگی وہ حضرت فوق کی شخصیت سے ضرور ہی واقف ہوگا۔ آپکی ہر اُردو تصنیف وسعت نظر، نکتہ سنجی اور تحقیق و تدقیق کا زامہ ہے۔ حضرت فوق شاعر کی حیثیت سے ابتک پبلک میں آنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ یہ رباعیات آپکے اس رُخ کو بھی واضح کرتی ہیں۔ کلام پختہ اور زبان اسقام سے پاک ہے۔ ایک رباعی بطور نمونہ حاضر ہے

نہ لعل و گہر جہار سومی خواہم   نہ ساغر و مے نہ رنگ و بومیخواہم
بازآمدم از تنعمات دنیا ہ   یارب ز مانہ آبرو می خواہم ہ

قیمت نامعلوم۔ ملنے کا پتہ ستارہ ہند پریس کلکتہ نمبر ۵۲ بنیاپوکر لین۔

ع۔ ع حسینی

"فدائے شوہر"

حضرت نشتر لکھنوی

موت کے آغوش میں لیٹی ہوئی ہے اک حسیں
زندگانی کی کوئی امید اب باقی نہیں

سو رہا ہے ایک بچہ دو برس کا شیر خوار
دیکھتی ہے اُس کو حسرت کی نظر سے بار بار

محشرِ جذبات کے اُٹھتے ہیں لاکھوں ولولے
دردِ پنہاں سے نمایاں ہیں ہزاروں حوصلے

نالے کچھ سینے سے نکلے، کچھ لبوں پر تھم گئے
چند قطرے اشک کے کچھ بہہ گئے۔ کچھ جم گئے

رُخ پہ ہیں آنکھیں لگی آنکھوں سے ہیں آنسو رواں
کہتے ہیں معصوم سے معصوم، دل کی داستاں

کون میرے بعد سینہ سے لگائے گا تجھے ؟
کون راتوں کو کلیجہ پر سُلائے گا تجھے ؟

کون لے گا گود میں سو کام گھر کے چھوڑ کے ؟
کون راتوں کو اُٹھے گا نیند اپنی توڑ کے ؟

صبح چپکی پسینے میں بھی خبر رکھے گا کون اب
زانوے خستہ پہ اپنے تیرا سر رکھے گا کون ؟

آنکھ میں آنسو ترے بھر آئیں گے جب بھوک سے
کس کے سینہ میں جلن اُٹھے گی غم کی ہوک سے ؟

زردیِ عارض سے تیرے کس کا چہرہ ہوگا زرد ؟
پھانس سے انگلی کی تیری کس کے دل میں ہوگا درد ؟

تیری بیماری میں خاکِ دشت و در چھانیگا کون ؟
تیری صحت کے لیے سو منتیں مانیگا کون ؟

جب نظر لگ جائے گی تجھ کو نصیبِ دشمناں
کون سر سے نت نئے صدقے اُتاریگا یہاں ؟

درد سے تیرے اُٹھے گی کس کے دل میں غم کی ٹیس ؟
کون پائے گا تجھے نازوں سے چکّی پیس پیس ؟

مثلِ پروانہ رہیگا کون تیرے آس پاس !
کون پہنائیگا تجھ کو ہر گھڑی سُتھرا لباس ؟

تیری آنکھوں میں لگا کر سُرمۂ دُنبالہ دار
کون دیکھے گا ترے بوٹے سے قامت کی بہار ؟

کون ہوگا شادماں سُنکر تری کِل کاریاں ؟
کون پہلے سے کرے گا عید کی تیاریاں ؟

کون ٹوپی میں تری اچھی سی ٹانکے گا کرن ؟
کون راتوں کو ترے کرتے میں کاڑھے گا چکن ؟

تیرے رونے کی صدا پہنچے گی کیونکر گوش میں ؟
ہوگا تو جھولے میں، اور میں قبر کی آغوش میں !

آگیا اس یاس کے عالم میں شوہر ناگہاں
اُس کی صورت دیکھ کے کہنے لگی وہ نیمجاں

میرے پیارے میرے والی، میرے شوہر سر کے تاج — تو خدا حافظ کہ میں دنیا سے اب جاتی ہوں آج
میری بخشش ہو تمھیں اور میرا ایماں ہو تمھیں — میری جنت ہو تمھیں اور میرے رضواں ہو تمھیں
دل کے ہر ذرہ میں ہے مہر و وفا کی روشنی — تم مری نظروں کے آگے ہو خدا کی روشنی
میں رہی ہوں باؤلی بنکے تمھاری چاہ میں — زندگانی میں نے کاٹی ہے، وفا کی راہ میں
میری جانب سے تمھیں پہنچا ہو کچھ رنج و ملال — یا کچھ اپنے فرض کا میں نے نہ رکھا ہو خیال
یا شکایت کی صدا لب سے نکالی ہو کبھی — یا کہ نادانستگی سے بات ٹالی ہو کبھی
یا کبھی بھولے سے کی ہو کچھ اطاعت میں کمی — یا کہ نادانی سے کی ہو میں نے خدمت میں کمی
یا کبھی مانگا ہو میں نے اپنی الفت کا صلہ — یا مصیبت پر مصیبت کا کیا ہو کچھ گلہ
جوڑ کے کہتی ہوں دونوں ہاتھ میں پیش حضور — طالب رحم و کرم ہوں بخشدیں میرے قصور

آؤ میرے پاس اپنے کان تو لاؤ قریب — اپنے بچہ کے لیے کر لے وصیت غم نصیب
میرے دردِ دل کی اک غمگیں کہانی ہے یہی — میری ساری عمر کی آخر نشانی ہے یہی
سر پہ اسکے ہاتھ رکھنا خاطر مغموم سے — پونچھنا تم گرد مظلومی رخ معصوم سے
لے نہ جانا جھٹ پٹے میں شام کو باہر اسے — اور لیجانا تو اک تعویذ پہنا کر اسے
میرے پیارے تم نہ آنا دیر کر کے شام کو — نیند آتی ہے سویرے ہی مرے گلفام کو
سوتے سوتے خوف سے اچھلے اگر یہ نازنیں — سورۂ الحمد پڑھ کے اسپہ دم کرنا وہیں
گود یہ ڈھونڈھے مری بھر کے اگر ہمکاریاں — تم تھپکنا پیار سے دینا اسے چمکاریاں
غنچۂ دل اُس کا گھڑکی سے نہ کھُلانا کبھی — یہ مچل جائے جو ضد سے تم نہ جھلانا کبھی
اماں اماں کہہ کے راتوں کو جو روے زار زار — پیار کرنا اپنے سینے سے لگا کر بار بار
ہو سکے کوئی نہ جب تدبیر اُس کے صبر کی — خاک لاکے تم چٹا دینا ہماری قبر کی

قرض لے کے میں نے اک کرتہ سیا ہے ریشمی — اور زردوزی کی منگوائی ہے ٹوپی مخملی
ننھے منے ہاتھ کے نازک کڑے بنوائے ہیں — ننھے ننھے پاؤں کے گھنگھرو بھی گن کر آئے ہیں
آج سب ہمسائیاں بن ٹھن کے آئیں گی یہاں — اچھے اچھے کپڑے پہنے ہونگے لڑکے لڑکیاں
غنچۂ ارماں شگفتہ ہو مری امید کا، — اسکو پہنا دو یہ کپڑے آج دن ہے عید کا

نرگسی آنکھوں میں تم کاجل لگا دو ایک بار
دیکھ لوں میں اپنے ننھے چاند کی آخر بہار

ہاتھ اُٹھیں، ہو کہاں طاقت یہ مجھ بیحال کی
دور ہی سے میں بلائیں لے لوں اپنے لال کی

تین دن فاقہ سے گذرے تم نے کچھ کھایا نہیں
میری بیماری میں اک لحظہ بھی سُکھ پایا نہیں

لائی میرے واسطے اک رحمدل عورت انار
وہ تمھارے واسطے محفوظ رکھا گلعذار

تم تو میرے دفن کا کرتے پھروگے انتظام
سارا دن تم پر گذر جائے گا بے آب و طعام

ناتوانی بھوک سے اب بڑھ رہی ہے دمبدم
ہاں اسے کھا لو! تمھیں میری محبت کی قسم!!

جانب گور غریباں جب تمھارا ہو گذر
میری ٹوٹی قبر پر بھی ڈالنا تم اک نظر

ہوک کی کوئی جو لو اُٹھے دل ناشاد میں
ایک ٹھنڈی سانس بھر لینا ہماری یاد میں

ہاتھ بہر فاتحہ اپنے اُٹھا دینا کبھی
قبر پر دو پھول تم آ کے چڑھا دینا کبھی

(باقی دارد)

تجلیات

چودھری سید نظیر الحسن صاحب فوق اسپشل مجسٹریٹ مہابن

سنگ دل تجھسا بھی کوئی اے ستم ایجاد ہے
ہر گھڑی تازہ ستم، ہر دم نئی بیداد ہے

سہو ہو جائے خیال عیش ایام شباب
باعث رنج و الم پیری میں تیری یاد ہے

رحم پر مائل ہو وہ بیداد گر ممکن... نہیں.....
جب ہیں نالے، بے نتیجہ، بے اثر فریاد ہے

یاد اپنی بھی زمانہ میں رہے گی حشر تک
جسطرح سے ذکر مجنوں، قصۂ فرہاد ہے

رنج و غم کی ہر بشر کے پاؤں میں زنجیر ہے
ورنہ کہنے کو تو دنیا میں ہراک آزاد ہے

آج تک بھولے نہیں ہم تم کو اے اہل عدم
لب پہ ہے آہ و فغاں دلمیں تمھاری یاد ہے

رحم کچھ جسمیں نہیں مطلق، وہ دل ہے آپ کا
کچھ نہیں تاثیر جس میں وہ مری فریاد ہے

فاتحہ کو آئے میری قبر پر غیروں کے ساتھ
بعد مرنے کے بھی ظالم کی وہی بیداد ہے

کون سا انسان ہے اے فوق شاداں خلق میں
کون ہے جو قید رنج و فکر سے آزاد ہے

مثنوی شادی و غم

(گذشتہ سے پیوستہ)

حکیم سید علی عباد صاحب فائق زنگی پوری

پیدا کیا ہم کو بہر طاعت ہر نفس پہ فرض ہے عبادت بھیجا ہے اُس نے انبیا کو
پہچان لیں تاکہ ہم خدا کو جتنے آئے یہاں پیمبر احمد ہیں اُن میں سب سے بہتر
جن کا ثانی ہوا نہ ہوگا ایسا تو وزیر ہے خدا کا کی آپ نے اس طرح ہدایت
باقی نہ رہی نبی کی حاجت وہ رتبہ انھیں دیا خدا نے جو پایا نہ اور انبیا نے
فرماتا ہے ان سے خالق پاک لولاک لما خلقت الافلاک تھی یہ بھی فضیلت پیمبر
بے سایہ تھا اُن کا جسم انور سایہ سے وہ جسم کیوں نہ ہو دُور جو خاص ہو ذوالجلال کا نور
جن آنکھوں نے مصطفےٰ کو دیکھا گویا نور خدا کو دیکھا گذری رہ حق میں عمر ساری
ہر بات تھی اُنکی وحی باری بےمثل تھے جس طرح پیمبر ویسے ہی تھے بے نظیر حیدر
ہم کس کو بڑھائیں اور کیونکر آنکھیں دونوں ہی ہیں برابر وہ مالک مسند نبوت
یہ ناظم کشور امامت محبوب خدا رسول مختار حیدر دونوں کے عاشق زار
احمد گل باغ آبرو ہیں حیدر مانند رنگ و بو ہیں آئینہ حق نما پیمبر
حیدر اُس آئینہ کے جوہر وہ نور جمال کبریا ہیں یہ نور نگاہ مصطفےٰ ہیں
وہ شمع جمال ہیں یہ لو ہیں وہ بدر کمال ہیں یہ ضو ہیں اس سے آگے نہیں رسائی
بعد اُن کے ہے رتبۂ خدائی پہچانا انھیں کہاں کسی نے ادراک خدا کے ہیں زینے
آل احمد کی کیا ثنا ہو ان کا مداح جب خدا ہو پر حیف نہ دہر نے وفا کی
ناحق ہر ایک پر جفا کی غربت میں یہاں بُلا کر کاٹا کسی بے گناہ کا سر
افسوس کسی پہ یہ کیا قہر جام شربت میں دے دیا زہر غافل آرام کی نہیں جا
عبرت کا مقام ہے یہ دُنیا نے کوئی رہا ہے نے رہے گا جو آیا فنا کا غم سہیگا

سلطان زماں ہو یا رعایا
اک قبر کی خود جگہ نہ پائیں
پہنے تھے جو حریر و دیبا
ہیں آج زمین کے برابر
دن رات تھی جنسے گرم صحبت
حسرت چادر چڑھا رہی ہے
بے گفت و شنید منتظر تھے
مُنھ دیکھ کے رہ گئے مُسافر
معدوم ہوا نشان شیریں
روتی ہے بیکسی لحد پر
یوں سنگ قضا سے ہو گیا چُور
کچھ کام نہ آیا وقت رحلت
شدّاد نے باغ گو بنایا
گم ہو گئی صورتِ سکندر
مٹّی میں ملے بلند اقبال
نظروں سے چھپا گیا تہہ خاک
تن میں جو ہیں اربع عناصر
جانا اک روز ہے تہہ خاک
کہتی ہر ہر نفس ہوا ہے
ہے نقش بر آب زندگانی

سب کو پیغام مرگ آیا
کل گھیرے تھے جنکو لاکھ محتاج
محتاج کفن ہے اُن کا لاشہ
گر ہیں بھی مکاں تو بے مکیں ہیں
وہ بھُول گئے نشان تربت
قبروں سے جو کوئی ہو کے گذرا
جب تک تھی اُمید منتظر تھے
جتنے ہیں یہاں کے آنیوالے
کھوئی لیلی نے جان شیریں
دارا نے لحد کا گھر بسایا
معدوم ہوا نشانِ فغفور
ناچار ہوا عدم کو راہی
لیکن افسوس پھل نہ پایا
پیتے ہی فنا کا جام فی الفور
کیا ہو گئی سطوت سلیمانؑ
جنکے لیے خلق آسماں ہوں
ہر اک سے فنا ہے تیری ظاہر
آتش کہتی ہے نیند سے جاگ
آنا جانا یوں ہی لگا ہے

کیا قہر ہے ملک جو بسائیں
وہ دست نگر ہیں غیر کے آج
کل تک جو مکان تھے فلک فر
رہنے والے تہہ زمیں ہیں
غربت آنسو بہا رہی ہے
وہ سمجھے کہ فاتحہ پڑھے گا
جب پائی نہ زاد راہ آخر
سب سوے عدم ہیں جانیوالے
ضحاک کی قبر دیکھ جا کر
مُنہ دیکھتی رہ گئی رعایا
کسریٰ کا وہ زور وہ حکومت
نے تخت رہا نہ تاج شاہی
آئینۂ موت میں اُتر کر
جمشید کا ختم ہو گیا دور
اندھیر ہے جسم شاہ کو لاک
وہ پردۂ خاک میں نہاں ہوں
مٹّی کا بیان ہے یہ غمناک
ہے آگ لگی مکان سے بھاگ
سُن غور سے کہہ رہا ہے پانی

(باقی آئندہ)

--------- ••◇(ﷺ)◇•• ---------

خالص اُردو

(حضرت آرزو لکھنوی)

سہارا بندھتا جاتا ہے لہو ارمان ہونے سے
جو اُن پر مرمٹا وہ بچ گیا ہلکان ہونے سے

کہاں پھر وہ اُمنگیں وہ ترنگیں جبکہ جی ڈوبا
سبھی مارے پڑے اس ایک کے ہلکان ہونے سے

بہت سیدھا ہے سچی چاہ کا رستا۔ جو آتا ہو
نئے ہم تھے کہ کھیڑیں پڑ گئیں انجان ہونے سے

چھری ڈیل اُن کا باڑہ پر ہے اب کہاں جینا
گلے تک آ گیا پانی چھری کا سان ہونے سے

نہ تھا جیسیں کوئی اُس آنکھ میں اب اک تمھیں تم ہو
یہ گھر سنسان ہو کر بچ گیا سنسان ہونے سے

نہ پایا بھید جب اُن کا اُنھیں پایا تو کیا پایا
کہ ملتا ہے تو ملتا ہے پتا پہچان ہونے سے

سُنی کی اَن سُنی کر دی یہاں کی اُلٹی سیدھی پر
جناب آرزو بہرے ہوئے ہیں کان ہونے سے

جذبات

(سیّد مسعود رضا صاحب جذب)

واماندوں پہ ہے شوق کا یہ تازہ ستم اور
ہر گام یہی دُھن ہے کہ دو چار قدم اور

ہاں جام دیے جا سحر و شام دیے جا
ساقی مری ٹوٹی ہوئی توبہ کی قسم اور

ہشیار۔ کسی کی نگہِ ناز سے ہشیار
اس لطف کے پردہ میں نہ ہو جائے ستم اور

رُکتا ہے کہاں دیکھ۔ وہ منزل ہے عدم کی
ہستی کے مسافر۔ ابھی دو چار قدم اور

لکھی ہے جہاں عہدِ جوانی کی حکایت
ہے نامۂ عصیاں میں وہاں زورِ قلم اور

کس دن کے لیے ہے مجھے رحمت پہ تری ناز
ہو اور مرا دامنِ عصیاں ابھی نم۔ اور

ہاں بیچ میں حائل ہے ابھی پردۂ ہستی
کہتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ تم اور نہ ہم اور

منزل پہ پہنچنا مری قسمت میں نہیں ہے
چلنے کی ہے جلدی تو بہکتے ہیں قدم اور

اے جذب مصیبت ہی میں آتا ہے خدا یاد
ہم اور سلجھتے ہیں۔ اُلجھتا ہے جو دم اور

آثارِ ادبیہ

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی آدیب ایم۔اے

منقبت

دریائے انما کا گہر مرتضیٰ علی
اشجارِ لافتیٰ کا شجر مرتضیٰ علی

نام و نسب جو پوچھا تو بولا یہ عقلِ کل
عمرانِ سیوعی کا پسر مرتضیٰ علی

زوجِ بتولِ فاطمہ خاتونِ دو جہاں
حق کے رسول کا ہے صہر مرتضیٰ علی

اخِ رسول نائبِ محبوبِ کردگار
حسنین سے ولی کا پدر مرتضیٰ علی

نارِ سقر سے کچھ نہیں مومن کو ہے خطر
دوزخ سے عاصیوں کی سپر مرتضیٰ علی

کشتِ امید سائلوں کا سبز کیوں نہ ہو
ہے بحرِ کرامت کا مطر مرتضیٰ علی

کیونکر دعا سے باز رہیں مومنیں مدام
ہے نخلِ مدعا کا ثمر مرتضیٰ علی

ضیقِ معاش کی شبیں سب دور ہوئینگی
ہے لیلِ مظلمہ کا سحر مرتضیٰ علی

روشن کریگا شب تری تاریک ضیق سے
برجِ اسد کا خاص قمر مرتضیٰ علی

اس گردشِ فلک سے نہیں مجکو کچھ خطر
ہے مالکِ زمان و دہر مرتضیٰ علی

معراج میں انیسِ پیمبر بجز خدا
کوئی نہ تھا بشر میں مگر مرتضیٰ علی

ہمسر رسول کا نہ فرشتہ کوئی ہوا
لیکن ہوا یہ خاص بشر مرتضیٰ علی

کیا مایاد؟؟ برتری میں مقابل ہو اس کے اور
ہے عرشِ کبریا کا قصر مرتضیٰ علی

محتاج زر کا اس کا موالی ہو کس لئے
ہے سکۂ مراد کا زر مرتضیٰ علی

مومن کو آخرت کا نہیں کچھ ہراس ہے
خلدِ بریں میں دیویں گے گھر مرتضیٰ علی

حبِ علی بغیر نہیں حج قبول ہے
ہے کعبۂ یقیں کا حجر مرتضیٰ علی

شہرِ علوم حضرتِ نبوی کی ذات ہے
اس شہرِ بے مثال کا در مرتضیٰ علی

نورِ ضیائے شمس میں اور ماہ میں ہو گیا
ہے نجمِ کن فکاں کا بدر مرتضیٰ علی

کب ذوالفقار اسکی کوئی روکے پہلواں
کاٹا ہے جبرئیل کا پر مرتضیٰ علی

بیر العلم میں سارے بنی جاں کہیں نہیں (؟) — ایسا اُنھوں کے دل میں ہے ڈر مرتضیٰ علی

خار و خسک تمام ہوں ریحان و یاسمن — گر خارزار میں ہو گذر مرتضیٰ علی

جنت ہے اُس طرف کو اِدھر نار ہو حریق — لیں گے پکار مجھکو اُدھر مرتضیٰ علی

کہتا ہوا قریب چلا جاؤں بے ہراس — ہرگز نہیں مجھے ہے خطر مرتضیٰ علی

کرتا ہوں اس لئے میں دعا شام اور سحر — دیں گے مری دعا کو اثر مرتضیٰ علی

حاجت مری ہر ایک روا ہوئے اس گھڑی — گر کر دیں مجکو ایک نظر مرتضیٰ علی

اپنے محب خاص کی ہر آن ہر گھڑی — لیتے ہیں بحر و بر میں خبر مرتضیٰ علی

بیشک کرے سکون تحرک سے چرخ پیر — اسکو کہیں ذرا کہ ٹھہر مرتضیٰ علی

مردے ہزار سال کے اک آن میں جئیں — کہدے زباں سے قم جو اگر مرتضیٰ علی

افواج کائنات کی گر ہوئے حملہ ور — کر دیوے سب کو زیر و زبر مرتضیٰ علی

قسّامِ رزق ہے وہ وصی نائبِ صمد — عالم ہے سارا دست نگر مرتضیٰ علی

کب جانے اسکی قدر کوئی جز خدا قدیر — ہے اسقدر وہ عالی قدر مرتضیٰ علی

لاکھوں جمع عدو ہوں اگر در پئے ضرر — کر دیوے دفع سارا ضرر مرتضیٰ علی

رو بہ صفت فرار ہو دشمن ہیں (؟) نکلے جب — دشت وغا میں مثل ببر مرتضیٰ علی

دہشت سے تیری تیغ کے ہر پیر و ہر جواں — کہتے ہیں الاماں و حذر مرتضیٰ علی

فرش نبی پہ خواب کیا بے ہراس ہو — بولے ملک کہ ہے یہ جگر مرتضیٰ علی

خیبر سی گر لڑائی ہو کب باقی رہتی ہے — عزم وغا جو باندھے کمر مرتضیٰ علی

رایت اگر بلند کرے از پئے قتال — پابوس ہووے فتح و ظفر مرتضیٰ علی

گر آتش غضب سے شرر بار ہے سقر — مومن بجھا دیں گے وہ شرر مرتضیٰ علی

ہو نامۂ حساب محبوں کا بے حساب — گر اسپہ لکھ دیں ایک سطر مرتضیٰ علی

جس نے کہ تجکو دیکھا فضیلت دی اور کو — خیرہ ہے اس کا نور بصر مرتضیٰ علی

کرتا ہوں لعن دشمنوں پر ہر گھڑی ترے — اس طرح ہو میری عمر بسر مرتضیٰ علی

لعنت کہوں نہ کس طرح ان [illegible] — جس نے کیا ہے تم سے غدر مرتضیٰ علی

تیرے محب خاص ہیں اے شاہ دوجہاں | خالی نہیں ہیں شہر و نگر مرتضےٰ علی
جو مارتے ہیں دم ترے ہر آن ہر گھڑی | ہو انکا ساتھ تیرے حشر مرتضےٰ علی
جو مدح تیری لکھتے ہیں مقبول ہے فقرہ | گو نظم ہووے یا کہ نثر مرتضےٰ علی
مجکو نہیں ہے آسرا تیرے بغیر اور | کہتا پھروں میں زید و بکر مرتضےٰ علی
تیرے بغیر مشکلوں کو کون حل کرے | "لولا" کے لفظ بولا عمر[1] مرتضےٰ علی
طاعات شیعیان نہیں رائیگاں کبھی | دلوائیں گے خدا سے اجر مرتضےٰ علی
میں لکھنؤ میں سخت مصیبت میں پھنسا | باہر نکال دیر نہ کر مرتضےٰ علی
میرے حوائجات ضروری ہوں سب روا | دے مجھکو اب خزانے سے زر مرتضےٰ علی
شوق لقائے اہل وطن ہے مجھے ضرور | پہنچا دے جلد اب مجھے گھر مرتضےٰ علی
قاسم علی رضا ہو تو سوئے کربلا | گردیویں مجکو زاد سفر مرتضےٰ علی

غزل مصحفی

طلا چاہو تم تو بہانے بہت ہیں | جگہ سیکڑوں ہیں ٹھکانے بہت ہیں
نہیں آدمیت کا دِلّی میں چرچا | جدھر دیکھو بھڑوے زنانے بہت ہیں
زمانے کا دیکھا ہے میں نے بہت کچھ | مجھے یاد ایسے زمانے بہت ہیں
نہ بیٹھو ابھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر | کمان ہاتھ میں لو نشانے بہت ہیں
اُٹھ اے مصحفی کیا یہی در ہے تجھکو | پٹکنے کو سر آستانے بہت ہیں

کسی پرانے شاعر کا مطلع

خیال خواب کہاں؟ سوز غم میں جلتے ہیں | تمام رات پڑے کروٹیں بدلتے ہیں

یقین کے دو شعر

جب سے بنی ہے یقیں شوخ زرنگین قبا | شور ہے غل ہے قیامت ہے گلستان کے بیچ
ایک دن ہاتھ لگا یا تھا ترے دامن کو | اب تلک سر بہ خجالت ہے گریبان کے بیچ

[1] حضرت عمر کے اس مشہور قول کی طرف اشارہ ہے - لولا علی لہلک عمر

عورتوں کی ماہواری کی شکایت کیلئے
شربت مفید النساء
بہت مفید دوا ہے
ماہواری کی شکایت جب کسی عورت کو ہوتی ہے تو بدن سوکھنے لگتا ہے۔ سر میں درد۔
پیر میں درد۔ کمر میں درد۔ اور ہاتھ پیر کے جوڑ میں تکلیف معلوم ہوتی ہے۔ بدن میں سستی اور چہرہ پر پیلا پن آجاتا ہے۔ مگر بے زبان عورتیں شرم سے کچھ کہہ نہیں سکتی ہیں جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ مرض جڑ پکڑ لیتا ہے اور بیماری بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ جب یہ حالت عورت کی ہو تو آپ
شربت مفید النساء جو عورتوں کی تندرستی قائم رکھنے کی لاجواب دوا ہے۔ استعمال کرائیں۔
ماہواری اگر تھوڑا آتا ہو۔ یا زیادہ ہوتا ہو یا بالکل بند ہو گیا ہو یا باقاعدگی سے دو ایک مہینہ آگیا پھر بند ہو گیا۔ الغرض شربت مفید النساء تمام شکایت کو جڑ سے نکال دیگا۔
ماہواری قاعدے کے مطابق ہونے لگے گا۔ بدن میں پھرتی آجائیگی چہرہ گلاب پھول کی طرح تازہ ہو جائیگا۔ قیمت فی شیشی دو روپیہ آٹھ آنہ۔ محصول علاوہ
سیکڑوں میں سے ایک تازہ سرٹیفکیٹ ملاحظہ فرمائیے
جناب ڈاکٹر محمد علی صاحب جہلم سے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ ایک شیشی شربت مفید النساء منگائی ہے جس سے بہت ہی فائدہ ہوا ہے۔ آپ کی دوا واقعی مفید ثابت ہوئی ہے۔ مہربانی فرما کر دو شیشی شربت مفید النساء اور روانہ فرما دیں۔ ممنون و مشکور ہونگا۔
سفید بال کو ۲ منٹ میں سیاہ کر دینے والا
رجسٹرڈ
مشکی خضاب
ہرن مارکہ

"ادب"

مرتبۂ

سید اعظم حسین

جلد ۲ بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۰ء نمبر ۱۲

پروفیسر لیمونٹ نے حال میں اُن ساٹھ مغربی ناولوں کی فہرست شایع کی ہے جو اُن کے خیال میں غیر فانی ہیں۔ چونکہ ناظرینِ "ادب" میں اکثر حضرات ایسے ہیں جو انگریزی سے واقف ہیں اِس لئے اِس فہرست کا شایع کرنا کچھ بیجا نہ ہوگا۔ وہ حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) فیلڈنگ "ٹام جونس" سنہ ۱۷۴۹ء
(۲) گوئٹے "ولیم میسٹرس اپرنٹس شپ" سنہ ۱۷۹۵ء
(۳) آسٹن "پرائڈ اینڈ پریجوڈس" سنہ ۱۸۱۳ء
(۴) اسکاٹ "گائی مینرنگ" سنہ ۱۸۱۵ء
(۵) اسکاٹ "ہارٹ آف مڈلوتھین" سنہ ۱۸۱۸ء
(۶) کوپر "لاسٹ آف دی موہیکنس" سنہ ۱۸۲۶ء
(۷) منزونی "دی بیٹروتھڈ" سنہ ۱۸۲۷ء
(۸) ہیوگو "نوٹرڈیم" سنہ ۱۸۳۱ء
(۹) ہیوگو "لی مزریبل" سنہ ۱۸۶۲ء
(۱۰) بیلزک "پیرے گوریٹ" سنہ ۱۸۳۴ء
(۱۱) بیلزک "کزن بٹی" سنہ ۱۸۴۶ء
(۱۲) بیول "روگ اِٹ نوائر" سنہ ۱۸۳۰ء
(۱۳) ڈوما "تھری مسکیٹیرس" سنہ ۱۸۴۴ء
(۱۴) برونٹے "جین آئر" سنہ ۱۸۴۷ء
(۱۵) برونٹے "وودرنگ ہائٹس" سنہ ۱۸۴۷ء
(۱۶) تھیکرے "وینٹی فیئر" سنہ ۱۸۴۸ء
(۱۷) تھیکرے "ہنری اسمنڈ" سنہ ۱۸۵۲ء
(۱۸) ڈکنس "ڈیوڈ کاپر فیلڈ" سنہ ۱۸۵۰ء
(۱۹) ڈکنس "گریٹ اکسپکٹیشنز" سنہ ۱۸۶۱ء
(۲۰) ہاتھورن "اسکارلٹ لیٹر" سنہ ۱۸۵۰ء
(۲۱) ملولی "موبی ڈک" سنہ ۱۸۵۱ء
(۲۲) فریٹاگ "ڈیبٹ اینڈ کریڈٹ" سنہ ۱۸۵۵ء
(۲۳) فلوبرٹ "میڈیم بوری" سنہ ۱۸۵۷ء
(۲۴) فلوبرٹ "سلیمبو" سنہ ۱۸۶۲ء
(۲۵) الیٹ "ایڈم بیڈ" سنہ ۱۸۵۹ء
(۲۶) ریڈ "کلائسٹر اینڈ دی ہرتھ" سنہ ۱۸۶۱ء
(۲۷) ترگنیو "فادرس اینڈ سنس" سنہ ۱۸۶۱ء
(۲۸) ترگنیو "ورجن سوائس" سنہ ۱۸۷۶ء
(۲۹) دوستفسکی "کرائم اینڈ پنشمنٹ" سنہ ۱۸۶۶ء
(۳۰) دوستفسکی "برادرز کرمیزوف" سنہ ۱۸۸۰ء

(۳۱) ٹالسٹائے "وار اینڈ پیس" ۱۸۶۹ء

(۳۲) ٹالسٹائے "انا کرینینا" ۱۸۶۹ء

(۳۳) جیمس "دی امریکن" ۱۸۷۷ء

(۳۴) ہارڈی "ریٹرن آف دی نیٹیو" ۱۸۷۸ء

(۳۵) ہارڈی "ٹس آف ڈی اربرویل" ۱۸۹۱ء

(۳۶) میریڈتھ "دی ایگوئسٹ" ۱۸۷۹ء

(۳۷) زولا "جرمن" ۱۸۸۵ء

(۳۸) فرانس "کرائم آف سلوسٹر بونارڈ" ۱۸۸۱ء

(۳۹) ٹوین "ہکلبری فن" ۱۸۸۴ء

(۴۰) ہولس "رائز آف سائلس لیپھیم" ۱۸۸۵ء

(۴۱) سدرمن "ڈیم کیر" ۱۸۸۸ء

(۴۲) ورگا "ہاؤس بائی دی میڈلر ٹری" ۱۸۹۰ء

(۴۳) لیگر لوف "گوسٹا برلنگس ساگا" ۱۸۹۱ء

(۴۴) ہیمسن "ہنگر" ۱۸۹۰ء

(۴۵) رولینڈ "جین کرسٹوفی" مسلسل ۱۹۱۲ء

(۴۶) کونریڈ "نوسٹرومو" ۱۹۰۴ء

(۴۷) وہارٹن "ہاؤس آف مرتھ" ۱۹۰۵ء

(۴۸) بینٹ "اولڈ وائیوز ٹیلس" ۱۹۰۸ء

(۴۹) ڈریزر "جینی گرہارٹ" ۱۹۱۱ء

(۵۰) پراؤسٹ "سوانس وے" ۱۹۱۳ء

(۵۱) لارنس "سنس اینڈ لورز" ۱۹۱۳ء

(۵۲) موگھم "آف ہیومن بونڈیج" ۱۹۱۵ء

(۵۳) [illegible] "دی [illegible]" ۱۹۱۷ء

(۵۴) کیبل "جرگن" ۱۹۱۹ء

(۵۵) واسرمن "ورلڈز الیوژن" ۱۹۲۰ء

(۵۶) ہیمسن "گروتھ آف دی سوائل" ۱۹۲۰ء

(۵۷) انڈسٹ "دی برائڈل رینچ" ۱۹۲۰ء

(۵۸) گالسورتھی "دی فورسائٹ ساگا" ۱۹۲۵ء

(۵۹) گلاسگو "بیرن گراؤنڈ" ۱۹۲۵ء

(۶۰) زوئیگ "دی کیس آف سرجنٹ گریشا" ۱۹۲۷ء

چونکہ پروفیسر صاحب انگریز ہیں اس لئے فطرتاً انگریزی اور امریکن ناولوں کی تعداد زیادہ ہے پھر بھی انگریزی مصنفین میں سے اکثر کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے مثلاً اس فہرست میں "آر جی سٹیونسن" اور "انیفی جوپ" کا نام نہیں دکھائی دیتا - امریکن فسانہ نویسوں میں بھی "واشنگٹن ارونگ" کا نام غائب ہے - فرانس کے مصنفین میں "اناتول فرانس" کا جو درجہ ہے وہ ظاہر ہے - اسکی تصنیفات میں سے صرف "کرائم آف سلوسٹر بونارڈ" کا انتخاب اور اسکی بہترین تصنیف "پنگوئن آئلینڈ" کو چھوڑ جانا حد درجہ نا انصافی ہے - جرمن اور اطالوی مصنفین کے ساتھ بھی اسی طرح کی ناانصافی کی گئی ہے -

باوجود ان معائب کے یہ فہرست پھر بھی بڑی حد تک مکمل ہے - اور اس سے وہ پڑھنے

یہ سب کتابیں یقینی غیر فانی ہیں۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ اردو داں پبلک کے لئے اس فہرست میں سے مزید انتخاب کرکے ان کتابوں کے ترجمے شایع کئے جائیں؟ ہماری دانست میں ہندوستانی اکاڈمی کو اس طرف توجہ کرنا چاہئے۔ اور اس طرح کے ناولوں اور ڈراموں کی ایک فہرست شایع کرنا چاہئے۔ جن کے ترجمے اسکے نزدیک اردو اور ہندی زبانوں کی ترقی کے لئے مفید ہونگے۔

"ادب" کے خریداروں میں زیادہ تر اصحاب ایسے ہیں جنکی مدت خریداری اسی نمبر میں ختم ہو جائیگی۔ ان حضرات سے امید ہے کہ وہ "ادب" کو اپنے بابرکت سایہ میں مزید ترقی و سربلندی کا موقع عنایت فرمائیں گے۔ خدا معلوم "ادب" آپ اپنی سفارش ہے یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اسکے مخلص خریداروں کی ہمدردیاں ابتک اسکی بقا کی ضامن رہی ہیں۔ اور جس یگانگی و ہم آہنگی کی بدولت نظام عالم قائم ہے۔ اسی کی ایک جھلک شیرازہ "ادب" کو انتشار سے بچائے ہوئے ہے۔

ذوق کی پستی یا انصاف کی کمی "ادب" کے پرچوں کو قرب بے معنی سمجھے تو سمجھے لیکن جہاں تک ارباب نظر کے دیدۂ امتیاز کا تعلق ہے ہم بخوبی کہہ سکتے ہیں کہ ملک کے مستند ادبا و فضلا نے اس ناچیز پرچے کی دل سے قدر فرمائی۔ اور اگر ہم ان بزرگوں کے ان تمام گرامی ناموں کی نقل شایع کریں جن میں "ادب" کی خدمتوں کا اعتراف کیا گیا ہے تو وہ یقیناً ایک بیحد گراں قدر ذخیرہ ہوگا۔ جو "ادب" کے پرچے کو اشتہاری دنیا میں بھی بہت زیادہ گراں کر دیگا لیکن ہمارا مسلک یہ نہیں ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ

"اہل ہوس کی تنگی دل ادنیٰ سی ہے۔ دنیا فریب لذت کام و دہن ہی سے ہے"

"ادب" کی خدمت گذاری اور ہے۔ تجارت کی گرم بازاری اور ہے! اور سچ تو یوں ہے کہ اگر ہم "ادب" کی تجارتی گرم بازاری چاہیں بھی تو ہم۔ اس لئے کہ ہم اشتہاری دنیا سے نابلد ہیں۔ جب تک اسکی مشاطگی میں جاکر رات دن کی جانفشانی برداشت نہ کی جائے اسکے ہنر سے واقف ہونا دشوار ہے اور بغیر اس واقفیت کے تجارتی دنیا میں سرسبز ہونا معلوم۔ اسی لئے

ہمیں یہ تمنا نہیں ہے کہ ساری دنیا "ادب" کی خریدار ہو جائے اور ہر کس وناکس اسکے مضامین کو پڑھ کر جھومے۔ ہمیں تو ایسے ہی مختصر لیکن با فہم طبقہ کی ضرورت ہے جسکے افراد ابتک احاطۂ ادب میں آ چکے ہیں۔ یہی گروہ ہماری درخواست پر لبیک کہنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اسی سے جو کچھ کہنا ہے کہتے ہیں ؎

کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھکو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے　　(اقبال)

رسائل کی دنیا میں یہ بھی ایک رسم ہو گئی ہے کہ سال میں کم از کم ایک بار ضرور کوئی خاص نمبر شائع کیا جائے۔ اِس رسم کی پابندی ہم پر بھی فرض ہے اس لئے ہم نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ جنوری ۱۹۳۱ء کے "ادب" کو امتیازی حیثیت سے نکالیں گے۔ اس سلسلے میں زیادہ مفید و کار آمد تو غالباً وہ پرچہ ہو سکتا ہے جو کسی عنوان کے ماتحت نکالا جائے۔ تمام مضامین اُسی سے متعلق ہوں اور اس طرح اس مجموعہ پر وہ ایک مستقل کتاب ہو جائے لیکن وقت کی تنگی اور مصروفیتوں کی زیادتی کی وجہ سے ابکے "ادب" کا کوئی نمبر اس طرح کا نہیں نکالا جا سکتا۔ جنوری ۱۹۳۱ء کا پرچہ خاص نمبر ہوگا اور اس بنا پر ہوگا کہ اُس کا ہر مضمون بذات خود ایک خصوصیت کا حامل ہوگا۔ مختلف نکات علمی و ادبی گوناگوں لطائف و ظرائف معمول سے کہیں زیادہ صفحات پر بکھیر دئیے جائینگے اور ارباب ادب کو بقدر ذوق لذت یاب ہونے کی دعوت دیدی جائیگی!

بیجا نہیں اگر ہم اس سلسلے میں ملک کے ممتاز صاحبانِ قلم کو خاص طور سے توجہ دلاتے ہوئے عرض کریں کہ "ادب" کے خاص نمبر کو کامیاب بنانا آپ ہی حضرات کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آپ حضرات نے اپنے قیمتی وقت کے کچھ حصہ کو "ادب" کے لئے وقف نہ کیا تو پھر کچھ نہ ہوا۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ذرّہ نواز بزرگ بھی جو "ادب" کی قلمی اعانت کبھی کبھی کرتے رہتے ہیں! اور وہ کرم فرما اصحاب بھی جو ابتک ہمیں وعدہ ہی پر چلاتے رہے ہیں ہماری اس ضروری درخواست کو نظر انداز نہ فرمائیں گے۔

مضامین نظم و نثر ماہ اکتوبر کے آخر تک دفتر میں موصول ہو جانا چاہئے تاکہ ہمیں پرچے کی ترتیب کا موقع مل سکے

سلطان ایل تتمش کی سرگزشت

بلبن کی زبانی

(جناب سید حسن صاحب برنی بی اے - ایل ایل بی وکیل ایڈووکیٹ)

بلبن نامہ کا ایک باب

میرا مضمون "بلبن نامہ کی دستیابی" شائع ہونے کے بعد قدرتی طور پر اکثر احباب کو اس عجیب و غریب کتاب کے مضامین سے واقفیت حاصل کرنے کا اشتیاق پیدا ہوگیا ہے اس لئے اس کتاب کے چند دلچسپ مقامات شائع کر دینا مناسب ہے - فی الحال تعلیقات و حواشی اور نقد و تبصرہ سے قصداً محترز رہونگا - اور ان کے لئے ناظرین کو اصل کتاب کی اشاعت کا انتظار کرنا پڑیگا - البتہ اس دوران میں ناظرین کو کتاب کی نوعیت کا اندازہ اور اس بات پر غور کرنے کا موقع مل جائے گا کہ آیا یہ کتاب بلبن کی تصنیف سے ہے - یا اس بارہ میں کسی شک و شبہہ کی گنجایش ہوسکتی ہے -

"سید حسن برنی"

ایک روز میں سلطان معظم (سلطان شمس الدین ایل تتمش) انار اللہ برہانہ کی خدمت میں حاضر تھا - گرمی کا موسم تھا - چاندنی رات تھی - بادشاہ کوشک فیروزی کی چھت پر سیج پہ لیٹا ہوا تھا - اس نے مجھ سے کہا "اے بلبن! تجھے یاد ہے کہ اس مغربی سیاح نے جو آج

نماز جمعہ کے بعد ماذنہ جامع (منارۂ مسجد[1]) کے قریب دستبوس ہوا تھا کیا کہا تھا؟ "میں نے عرض کیا" "خداوند سلطان کی زندگانی دراز ہو! اُس نے کہا تھا کہ یہ مسجد بالخصوص یہ ماذنہ دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتے، جس طرح کہ خداوند سلطان آج دنیا میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ میں نے اقصائے عالم کا گشت کیا ہے لیکن نہ ایسا عجیب ماذنہ دیکھا ہے نہ ایسا عجیب سلطان۔ ہمارے ملک میں ماذنے مربع شکل کے ہوتے ہیں، اور قرطبہ و اشبیلیہ کے ماذنے بہت اچھے ہیں لیکن وہ بھی اسکی خوبیوں کو نہیں پہونچتے"

سلطان نے فرمایا "اے طبن! میں اپنے خالق کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے اس عجیب ماذنہ کو میرے ہاتھوں پورا کرانے کی توفیق بخشی۔ خدا رحمت کرے فضل ابن ابو المعالی کی روح پر جو ابتدا میں اس ماذنہ اور جامع (مسجد) کا متولی تھا۔ وہ مہندسی اور تعمیرات کے فن میں دُنیا میں اپنی مثال نہیں رکھتا تھا جس وقت دہلی فتح ہو چکی، تو سلطان معزالدنیا والدین ابو المظفر محمد بن سام انار اللہ برہانہ نے اِس مسجد اور ماذنہ کی تعمیر کا حکم صادر فرمایا، اور فضل بن ابو المعالی کو اس کام کے لئے انتخاب کیا۔ اُس نے پہلے اسکا ایک نمونہ بنا کر پیش کیا تو سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ اور جب اُس نے اُس کی پیمائشیں بتائیں تو اور بھی حیرت ہوئی لیکن فی الواقع ہندوستان کے سنگ تراش بھی دُنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اُن کے ہاتھوں میں پتھر موم بن کر رہ جاتا ہے۔ کتبہ نگار اور نقاش بھی ایسے ہی فراہم ہو گئے۔ اکثر جہاں گرد سیاحوں سے سُنا ہے کہ ایسے کتبے اور نقش و نگار جیسے اس ماذنہ میں کام آئے ہیں روئے زمین کی کسی عمارت میں موجود نہیں۔ اُس کے گرد اسمائے حسنیٰ، آیات کلام الٰہی اور القاب سلطانی اس طرح لگائے گئے ہیں کہ اُن سے اسکا جمال اور بھی بڑھ گیا ہے۔

فضل بن ابو المعالی کو اس کے بنوانے میں بڑی شیفتگی تھی۔ گرمی کی کڑی دھوپ میں بھی وہ آرام نہ جانتا تھا اور ہر گھڑی نگرانی میں ہی مصروف نظر آتا تھا۔ یہاں تک کہ

---

[1] اہل تحقیق کی مراد اس ماذنہ سے قطب مینار ہے۔ ماذنہ کے معنی ہیں اذان دینے کا مقام۔ قدیم منارہ ہائے مسجد اسی کام کے لئے بنائے جاتے تھے۔

اُس کی عبا اور عمامہ پسینے میں تر ہو کر رہ جاتے تھے۔ اسی طرح موسم سرما کی سخت سردی، اور برسات کی بارشیں اُسے اپنے کام سے نہیں روک سکتی تھیں۔ اُس نے بڑا بُردبار اور شگفتہ مزاج پایا تھا۔ وہ پیر مرد کام کرنے والوں پر باپ سے زیادہ مہربان تھا۔ کبھی کام سے نہیں اُکتاتا تھا۔ اور سب اُس کی وجہ سے اپنے کاموں میں دل و جان سے لگے رہتے تھے۔ اور ہر وقت فضل بن ابوالمعالی متولی ہشتاد کھائی دیتا تھا۔

اے بلبن! خداوند مرحوم (سلطان ایبک) کو اس کی بڑی آرزو تھی کہ یہ ماذنہ اُسکی زندگی میں ختم ہو جائے لیکن اُسکی حیات نے وفا نہیں کی۔ اور اُس کے سامنے اس کا کام ایک منزل سے آگے نہ بڑھ سکا۔ میں نے اس کام کو جاری رکھا اور تیسرے درجے کے بننے سے پہلے فضل بن ابوالمعالی بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا لیکن اُسکا بنایا ہوا نمونہ ہمارے پاس تھا۔ اور اُسکے خیالات اور منصوبوں سے واقفیت تھی۔ محمد امیر کوہ اور میرے دوسرے ملازموں نے بھی اس کام کو اُسی خوبی اور انہماک کے ساتھ جاری رکھا۔ اس طرح محراب ہائے مسجد اور جملہ درجہائے ماذنہ بفضل ایزدی تکمیل کو پہونچ کر اذان و اقامت صلوٰۃ کے قابل ہو گئے۔

اے بلبن! جیسا کہ تو جانتا ہے، حیات کو دوام نہیں اور موت شاہ و گدا کے لئے یکساں طور پر آنے والی چیز ہے۔ اور بادشاہ بھی اس چندروزہ حکومت کے بعد اُسی چند گز کے گڑھے میں سونے پر مجبور ہے۔ کہاں ہیں سلطان المعظم ابوالمظفر محمد بن سام ناصر امیرالمومنین انار اللہ برہانہ۔ اور خداوند مغفور سلطان قطب الدین ایبک المعزی رحمۃ اللہ علیہ؟ کہاں ہیں اُنکے جاہ و جلال اور تزک و احتشام؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک کہانی تھی، جو صرف لوگوں کی زبان پر رہ گئی ہے۔ یہی دن ہمیں بھی پیش آنے والا ہے۔ ایک دن ہوگا جب لوگوں کی زبان پر ہمارے نام رہ جائیں گے۔ اور ہمارے جسم خاک میں مل چکے ہونگے۔ اور ہماری روحیں اپنے اعمال کی سزا و جزا بھگتنے میں مصروف ہونگی۔ آثار خیر البتہ کچھ عرصہ تک دنیا میں باقی رہ جاتے ہیں۔ اور انہیں کے ذریعے آدمی کا نام نیک جاری رہتا ہے۔ لیکن آدمی کے قائم کئے ہوئے آثار کو بھی خود اُسکی طرح ثبات و دوام حاصل نہیں ہے۔ اور ایک وقت وہ بھی مٹ جاتے ہیں۔ لیکن مٹنے سے پہلے وہ لوگوں کے دلوں میں اپنا نقش

چھوڑ جاتے ہیں - اور اُس نقش سے وہ تازہ نقوش بناتے رہتے ہیں اور اس طرح اچھے اور نیک کاموں اور عمدہ خیالوں کی سنت ہمیشہ کے لئے جاری ہو جاتی ہے - جو آگے بڑھتی رہتی ہے -

اے بلبن! شاید عبادت الٰہی کے علاوہ حیات انسانی کا یہی مآل ہے، اور اُسکے کاروبار کا یہی منشا، اور بنی آدم کے وجود خاکی کا یہی مقصود، اور انبیا علیہم السلام کی بعثت اور رہادیان دین کے ارشاد و تلقین کی یہی غرض"

یہ کہہ کر سلطان آبدیدہ ہونے لگا - میں نے دست بستہ ہو کر عرض کیا "خداوند سلطان کی زندگانی دراز ہو - ہر گھڑی خداوند سلطان کے پیش نظر اچھے خیالات اور اچھے کام رہتے ہیں، اور زندگی کی ہر ساعت عبادت الٰہی، حمایت دین، حفاظت و رعایت خلق اللہ اور اشاعت عدل و احسان میں صرف ہوتی ہے - خداوند سلطان کے آثار خیر سے ایک جہان مملو ہے، اور کیا کارہائے نیک، اور کیا بناہائے خیر، اور کیا عدل و بخشش، ہر طرح کے آثار حسنہ خداوند سلطان سے یادگار زمانہ ہیں، اور ایک عالم خداوند سلطان کی درازی عمر اور ازدیاد جاہ کے لئے دست بدعا - یہ سب امور خداوند عالم کی فلاح دین و دنیا کے ضامن ہیں"

سلطان نے کہا "اے بلبن! تو جو کچھ کہتا ہے وہ بیشک تیری نیک دلی اور خلوص کو ظاہر کرتے ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ تو ہمارا ہوا خواہ و جاں نثار بندہ ہے لیکن بخششیں اور کارہائے و بناہائے خیر جن کا تو نے ذکر کیا محض حسن توفیق کا نام ہیں - ورنہ اُنکا حقیقی منبع دوسرا ہی ہے خزانۂ شاہی کے تمام مداخل رعایا سے ہی حاصل ہوتے ہیں - اور اُنکے حقیقی مستحق بھی وہی ہیں - رہا عدل وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز راستہ ہے - جسے صرف امداد و فیضان الٰہی سے ہی عبور کرنے کی امید کی جاسکتی ہے - ورنہ اس گذار میں خطرہائے کثیر پیش آتے ہیں، اور اُن مہالک سے صحیح سالم نکل جانا بسا اوقات قوت بشری سے بالا ثابت ہوتا ہے - ایک سلطان کی زندگی، جسے خلق اللہ کی گردنوں کا مالک بنایا جاتا ہے اور اُن کے امور جزوی و کلی اُسکی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں اتنی آسان نہیں -

جس دن میدان حشر میں میزان عدل قائم ہوگی، اور نامۂ اعمال پیش ہونگے، اور

زندگی کے نیک و بد کا حساب کیا جائیگا۔ اُس روز حقیقت حال منکشف ہوگی۔ میں جب اپنے گذرے ہوئے زمانہ کا خیال کرتا ہوں تو میرا جسم تھرّانے لگتا ہے اور میری روح کانپنے لگتی ہے! بار آلہا! میں کس طرح اپنی جوابدہی میں کامیاب ہوسکونگا؟ - اگر اُن انعام آلہی پر غور کروں جو شروع زندگی سے جس وقت میں نے اپنی ماں کی گود میں آنکھ کھولی تھی مجھ پر آج تک بلا استحقاق نازل ہوئے تو وہ بھی شمار سے باہر ہیں۔ بلکہ میری تمام زندگی جو اس وقت تک گذری ایک طرف افضال و اکرام الٰہی اور فتوحات غیبی کا ایک حیرت انگیز سلسلہ ہے اور دوسری طرف کوتاہیوں و اگذاشتوں، اور غلطیوں کی ایک کبھی ختم نہ ہونے والی عبرتناک داستان۔

اے بلبن! آج جب کہ خلوت ہے، اور تجھے میری بارگاہ میں تقرب خاص حاصل، میں چاہتا ہوں کہ تجھے اپنی زندگی کے واقعات سناؤں، تاکہ تو غور کرسکے کہ کارساز حقیقی ایک ناچیز انسان کو کن کن حیرتناک طریقوں سے مختلف مدارج طے کراتا اور ایک ادنیٰ خادم کو سلطان اعظم کے درجے پر پہونچا دیتا ہے"۔

یہ کہکر سلطان اپنی سیج پر سنبھل کر بیٹھ گیا، اُس نے اپنے دامن سے اپنی نمناک آنکھوں کو پونچھا۔ اور اپنی زندگی کی سرگذشت بیان کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اسی تذکرہ میں سپیدۂ صبح نمودار ہوگیا، اور ماذنۂ جامع سے موذن کی صدائے "اللہ اکبر" بلند ہوئی۔ خادم "زندگانی خداوند سلطان دراز باد! ہنگام صلوٰۃ صبح رسید" کہتا ہوا حاضر خدمت ہوکر زمیں بوس ہوا۔ اور میں سلطان سے اجازت لیکر نماز کے لئے مسجد جامع کی طرف روانہ ہوا۔

"باقی آیندہ"

فارسی ڈراما

(منظور حسین صاحب موسوی ایم اے - لکچرار فارسی عربک کالج دہلی)

ڈراما کیلئے فارسی زبان میں "تمثیل" یا "تقلید" اور زبان عربی میں "مقامات"[1] مستعمل ہیں - لیکن یہ دونوں الفاظ ڈراما کے وہ معانی جن میں کہ یہ زبان انگریزی میں مستعمل ہے نہیں ادا کر سکتے اسوقت چونکہ ہمارا منشا فن تمثیل کے متعلق کچھ ذکر کرنا ہے اسلیئے لفظی بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم معنویت اور اصل مطلب کیطرف متوجہ ہوتے ہیں -

سنگتراشی، مصوری، شعر، اور موسیقی دراصل ایک ہی عظیم الشان فن کی مختلف صورتیں ہیں - تمثیل (ڈراما) کو گویا شعر اور موسیقی کے بین بین تصور کرنا چاہیئے - مصور کسی جاندار یا غیر جاندار کی شکل کاغذ پر کھینچتا ہے اسمیں تمام ضروری چیزیں کمال کی نہیں پائی جاتیں مثلاً یہ کہ تصویر گو مکمل ہوتی ہے مگر کلام نہیں کر سکتی اور معمولی ضرب سے خراب برباد ہو جاتی ہے - اس سے آگے بڑھیئے تو آپکو سنگتراشی کی فوقیت معلوم ہوگی - اسمیں بھی اول الذکر کے سارے اوصاف موجود ہیں - مگر اسکو مصوری پر ان معنوں میں فضیلت حاصل ہے کہ اسمیں دیرپائی کی خصوصیت بھی موجود ہے - لیکن اس تصویر میں بھی خاموشی موجود ہے جسے دیکھکر انسانی طبیعت نہیں پسند کرتی - اور آگے بڑھئے اور علم موسیقی سے دوچار ہو جیئے - یہ علم ایسا بحر بے پایاں ہے کہ جس میں غوطہ لگاکر انسان عجب مناظر قدرت کا تماشا دیکھتا ہے یہ انسان کے سامنے تصویر بھی پیدا کر دیتا ہے اور انکو بولتا ہوا بھی دکھا دیتا ہے مگر ادہر ذہن اسکی طرف سے ہٹا اور ادہر تمام لطائف و کوائف غائب ہوئے - کمال کی اس سے بہتر صورت فن شعر میں نظر آتی ہے لیکن اس سے بھی آگے چلکر آپ ایسے مقام پر پہنچینگے جہاں آپکو اپنی تلاش کی معراج حاصل ہو جائیگی - یہی مقام تمثیل یا تقلید کہلاتا ہے تمثیل کے ذریعہ مرد اور عورت عالم حیات میں رنجیدہ و غمگین کبھی خوش و خرم کبھی خاموش اور کبھی گویا کبھی تنہائی میں اپنے دل سے باتیں کرتے ہوئے اور کبھی دوسروں سے اظہار خیال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تھوڑی دیر کیلئے ہم اپنے آپکو انکی تکلیفوں سے رنجیدہ اور ان کی خوشیوں سے محظوظ پاتے ہیں، اور اس عرصے میں ہم بالکل بھول جاتے ہیں کہ وہ واقعات جو ہمارے سامنے پیش ہو رہے ہیں ان کی حقیقت ایک قصہ اور کہانی سے زیادہ نہیں ہے - ہم جانتے ہیں کہ افراد مجلس کی تکالیف حقیقت میں تکلیفیں نہیں مگر پھر بھی ہم ان سے متاثر ہو کر افسوس کرتے ہیں اور اکثر رو بھی دیتے ہیں، اور جب ان پر آثار خوشی دیکھتے ہیں تو ہم بھی بے اختیار خوش ہوتے ہیں اور ہمارا دل باغ باغ ہو جاتا ہے یہ تمام حالات فطرت انسانی سے وابستہ ہیں، اور ہر شخص اگر اس میں ذرہ برابر بھی انسانیت پائی جاتی ہے ایسے واقعات سے ضرور متاثر ہوگا - اس قسم کے کارناموں کو کمال کرکے دکھلانیوالا

[1] گو حقیقت یہ ہے کہ عربی کے "مقامات" بہت بڑی حد تک ڈراما کی حقیقت اور کیفیت سے خارج ہیں

ہے معرب مرب

شخص ماہر فن تمثیل سمجھا جاتا ہے۔

انسان میں فطری طور پر خوشی اور رنج کا مادہ موجود ہے۔ ان طبعی کیفیات کو مختلف طریقوں سے ابھارا جا سکتا ہے۔ انہی طریقوں میں سے ایک طریقہ فن تمثیل بھی ہے۔ ایران میں فن تمثیل کا آغاز بمقابلہ یورپ کے بہت ہی دیر میں ہوا۔ لوگ جس طرح دوسرے معاملات میں یورپ والوں کے مقابلہ میں ترقی نہ کر سکے اس میں بھی پیچھے رہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انکا گوشہ عافیت میں بیٹھا رہنا اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانے میں پرہیز کرنا ہی انکی ترقی کو روکتا رہا۔

ایران کے قدیم ہنحامنی اور ساسانی بادشاہوں کے زمانہ میں فن تمثیل سے کوئی واقف نہ تھا چنانچہ پہلوی کتابوں میں اسکا بالکل پتہ نہیں ملتا۔ اسوجہ سے ہم باطمینان کہہ سکتے ہیں کہ فن تمثیل عربوں کی آمد کے پہلے ایران میں نہیں پایا جاتا تھا۔ عربوں نے اہل ایران کو کچھ اسطرح اپنا گرویدہ بنایا کہ انھوں نے اپنا قدیم مذہب ترک کر کے عربوں کا لایا ہوا اسلام قبول کر لیا۔ اور ان ہی کے رنگ میں رنگ گئے۔ فنون لطیفہ کی بدنصیبی سے اسلام کے علماء نے اس امر پر زور دیا کہ تماشا اور تمثیل، غنا اور مصوری ناجائز افعال ہیں۔ غالباً یہ اس امر کا ایک بڑا سبب ہے کہ مسلمان دوسری قوموں سے اس بڑی صنعت میں بہت ہی پیچھے رہے۔ خود عربوں نے تمثیل کے فن میں جو کچھ ترقی کی وہ انکے "مقامات" کی صورت میں ہے "مقامات" لفظ مقامہ کی جمع ہے جس کے لغوی معنی "کھڑے ہونے کی جگہ" کے ہیں۔ زمانہ قدیم میں علماء و فضلا ایک مقام خاص پر (مثلاً کسی امیر کے دربار میں) جمع ہو کر اپنے علم کے کارنامے پیش کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے پر فوق حاصل کر کے انعام و اکرام اور قبول عام حاصل کیا کرتے تھے۔ اس کی مثال آج کل بھی ہمارے مشاعروں کی صحبتوں میں نظر آتی ہے۔ علوم عرب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قسم کی پہلی صحبت خوارزمی اور ہمدانی کی ایجاد ہے۔ ہمدانی نے قصوں اور کہانیوں کی تصنیف شروع کی جسکا نام اس نے مقامات رکھا۔ یہ مقامات مسجع نثر میں ہیں۔ مقامات میں دو افراد ہوتے ہیں جن میں ایک تو قصہ بیان کرنے والا ہوتا ہے اور دوسرا اس قصہ کا ہیرو۔ "مقامات" کی ایک خصوصی شان یہ ہے کہ مصنف حکایات اور واقعات کو پس پشت ڈال کر طرز تحریر اور صنعت لفظی پر تمام تر وقت اور ہمت صرف کر دیا کرتے تھے۔ اس سے کچھ اندازہ اس امر کا ہو سکتا ہے کہ عربوں نے ایرانیوں کو فن تمثیل میں کتنی مدد دی ہوگی! تقریباً کچھ بھی نہیں۔ اس لئے یہ کہنا کسی طرح بیجا نہ ہوگا کہ اہل ایران کا فن تمثیل قریب قریب تمام تر مغربی علوم اور ان کے مطالعہ اور اہل مغرب سے تعلق اور میل جول کا نتیجہ ہے۔

ایرانیوں کو قصص و حکایات سے بہت دلچسپی تھی چنانچہ اسی کی بنا پر ان کے یہاں قصہ خواں ہوتے تھے

لوگ بھی اپنی حیثیت کے موافق قصہ خوانی سے لطف اٹھانے میں کچھ نہ کچھ صرف کرنے لگے قصہ خوانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ خود ہی قصہ بیان کرتے تھے۔ اور خود ہی اپنے چہرہ اور ہاتھ پاؤں کے حرکات سے کیفیت کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی آوازیں تبدیل کرکے عورت اور مرد کی گفتگو بھی کیا کرتے۔ اکثر غصہ کی حالت کو بیان کرتے ہوئے آواز میں ایک مہیب کیفیت پیدا کر دیتے، جو فوراً ہی دوسری کیفیت کے اظہار کے وقت تبدیل ہو جاتی۔ ان لوگوں کیلئے نہ تو کوئی خاص مقام کی قید تھی، اور نہ کسی خاص وقت کی۔ مگر زیادہ تر یہ دلچسپیاں شب ہی کیوقت ہوا کرتی تھیں۔ ہم کو قصہ خوانی کا پتہ ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے درباروں میں بھی ملتا ہے۔ صرف نام کا فرق ہے، ورنہ ہندوستان کے داستان گو اور ایران کے قصہ خوان ایک ہی کام کرتے تھے۔ قصہ خوان ایک شخص واحد ہوا کرتا تھا۔ مگر اسکے علاوہ ایک اور بھی گروہ ایران میں پایا جاتا تھا۔ جسے لوطی کہتے ہیں۔ یہ گروہ تماشا کرنے والوں کا ہوتا تھا جو ایک مقام سے دوسرے مقام پر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ سفر کیا کرتا تھا اور کسی گاؤں یا شہر میں کچھ دنوں سے زیادہ قیام نہیں کرتا تھا۔ یہ لوگ کسی ایک قصے میں مختلف افراد قصہ کا کردار آپس میں علحدہ علحدہ تقسیم کر لیا کرتے تھے، اور کبھی کبھی لباس بھی تبدیل کر لیا کرتے تھے۔ مگر قصے اکثر و بیشتر محض ہنسنے اور حظ اٹھانے کیلئے ہوا کرتے تھے۔ ان قصوں کو تماشا کہتے ہیں۔ ایسے قصے زیادہ تر ایران کے جہلا اور معمولی لوگ سنا اور دیکھا کرتے تھے۔ شریف اور سنجیدہ مزاج لوگ اسمیں حصہ نہیں لیتے تھے۔ آج بھی ہندوستان میں نوٹنکی یا سوانگ کے نام سے ایسے ہی قصے سنائے جاتے ہیں۔ نوٹنکی یا سوانگ بھی ایک قسم کی تمثیل ہوتی ہے جو بغیر کسی اسٹیج، پردہ اور سین کے تماشا دکھاتی ہے اس میں بھی غربا اور جہلا ہی زیادہ حصہ لیتے ہیں۔

ایرانی نہ صرف تماشے اور قصص کے دلدادہ تھے بلکہ وہ علاوہ خوشکن کیفیات کے رنج والم کا مجمع بھی پسند کرتے تھے جس طرح قصہ خوان ہوا کرتے تھے اسی طرح ایک گروہ "روضہ خواں" بھی ہوتا تھا۔ یہ روضہ خوان حضرت امام حسنؑ و امام حسینؑ اور انکی اولاد کی شہادت اور تکالیف بیان کرتے تھے اور سامعین پر ایسا اثر پیدا کرتے تھے کہ ڈاڑھیں مار مار کے رونے لگتے تھے۔۔ روضہ خوانی کا سلسلہ سلاطین صفویہ کے زمانہ سے شروع ہوا۔ سلاطین صفویہ نے سولھویں صدی عیسوی میں ایران کی فرمانروائی حاصل کرکے مذہب شیعہ کی اشاعت تبلیغ اور توسیع میں بڑی مدد دی چونکہ وہ خود شیعہ تھے، اسلئے رعایا کی ایک معقول تعداد نے اس مذہب کو قبول کیا۔ اور اسمیں ترقی ہونے لگی۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے واقعات ہر ہر گھر میں بغیر کسی روک ٹوک کے بیان ہونے لگے ہر وہ شخص جو یہ واقعات بیان کر سکتا تھا روضہ خواں کہلانیکا مستحق تھا۔ مگر کچھ لوگوں نے روضہ خوانی کو پیشہ بنا لیا تھا۔

[illegible]

اور اس طرح یہ بھی ایک علیحدہ گروہ متصور ہونے لگا۔ اس کے علاوہ ایرانیوں نے ایک اور طریقہ اختیار کیا جس میں روضہ خوان کی طرح صرف ایک شخص شریک نہ ہوتا بلکہ متعدد اشخاص مکروہات کربلا بیان کرتے ۔ اور سامعین رو دیتے اس قسم کے ذکر کو اہل ایران تعزیہ کہتے ہیں تعزیہ عموماً کسی مسجد کے صحن یا امام باڑے میں ہوا کرتا تھا مگر اور مقام پر بھی کر لیا کرتے تھے۔ اس کیلئے ایک چبوترا ہوتا تھا جس کے چاروں طرف لکڑی کے کٹہرے لگائے جاتے تھے چبوترے پر افراد مجلس اور کٹہرے کے چاروں طرف سامعین جمع ہوتے تھے۔ افراد مجلس کو ایک ایک کردار تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اُن کو ایک خاص واقعہ دیدیا جاتا تھا لیکن وہ خاص الفاظ جو ان کو کہنا پڑتے نہیں بتائے جاتے تھے، بلکہ وقت پر وہ الفاظ خود ہی اپنی طبیعت سے ادا کیا کرتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ پوشاک بھی تبدیل کر لی جاتی تھی تعزیے کے شروع ہونیکی اطلاع کرنے کے لئے اکثر بندوق سر کی جاتی تھی۔ جس کے بعد ہی بہشتی آتے اور لوگوں کو پانی پلاتے اس سے شہدائے کربلا کی پیاس یاد دلانا مقصود ہوتا تھا اور حاضرین میں ایک رونے کا غل بپا ہو جاتا۔ اس کے بعد ہی افراد مجلس یکے بعد دیگرے حسب ضرورت چبوترے پر آتے اور وہ واقعہ جس کی تصویر انہیں حاضرین کے سامنے پیش کرنا ہوتی، بیان کرتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ حاضرین اور تعزیہ والوں میں تمیز مشکل ہوتی تھی بہر حال اس میں لوگ روتے بھی تھے اور ماتم بھی کرتے تھے۔ یزید کی فوج اور امام حسینؑ کے دشمنوں کا کردار اکثر قیدیوں کو دیا جاتا تھا، اور لوگ اُن کو بُرا بھلا کہکر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔ اس قسم کی تمثیل مذہب سے تعلق رکھتی تھی اس کے ساتھ ہی ہمکو یہ بھی دیکھنا ہے کہ علاوہ اس کے ایران میں کسی اور قسم سے بھی فن تمثیل میں اضافہ کیا گیا یا نہیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں قاچاریوں کے زمانہ میں یورپ سے زیادہ تعلقات پیدا ہو گئے ۔ ناصرالدین شاہ قاچار کا سفر یورپ ایران کے لئے کچھ کم فائدہ بخش نہیں ثابت ہوا۔ سیکڑوں نئے الفاظ فارسی زبان کو مل گئے ایرانیوں نے بھی ایک وجدانی کیفیت کا اظہار کیا اور دکھا دیا کہ وہ قوم جسے لوگ اسوقت مردہ کہا کرتے تھے، زندہ کہلانے کی مستحق بن سکتی ہے تقریباً ۱۸۷۰ عیسوی میں فرانس کے مشہور تمثیل نگار مولیر کے تین فرانسیسی تمثیلوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ اس ترجمے کی تخصیص بس یہی تھی کہ یہ صرف ترجمہ ہی تھا۔ لیکن چونکہ یہ ترجمے روزمرہ کی زبان میں تھے اس لئے ان سے موجودہ ایران کے فارسی محاورات اور استعمالات کا پتہ چلتا ہے تمثیل کے افراد ضرور مفرس کر لئے گئے تھے۔ اگرچہ اس سے کوئی خاص لطف نہیں اٹھایا گیا اور لوگوں نے صرف توجہ نہیں کی، لیکن موجودہ قسم کے فن تمثیل کی بنیاد پڑ گئی۔

۱۸۷۴ء عیسوی کے آغاز میں طہران سے ایک ضخیم کتاب شایع ہوئی" جس میں سات تمثیلیں درج تھیں۔ اس کے ساتھ اسکے مولف مرزا جعفر مزاجہ داغی نے ایک چھوٹا سا مقدمہ بھی لکھا تھا۔ یہ تمثیلیں پہلے آذربائیجان ترکی میں تحریر کیگئی تھیں انکے مولف فتح علی میرزا نے ان کو سنہ ۱۸۶۱ء میں تفلس سے شایع کیا تھا۔ ان میں ذیل کی تمثیلیں شامل تھیں :۔

(۱) وزیر خاں لنکران۔ اسکا اصلی نام وزیر خان سراب تھا سنہ ۱۸۸۲ء میں مسٹر ہیگرڈ اور لی اسٹرینج نے اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔ اور نام تبدیل کرکے وزیر خاں لنکران رکھا سنہ ۱۸۸۶ء میں اسی تمثیل کو مسٹر سیلیر نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اور کچھ ہی دنوں کے بعد ایک جرمن عالم مسٹر وارمنڈ نے جرمنی زبان میں ترجمہ کیا

(۲) موسیٰ ژوردان حکیم نباتات۔ اسکو عرف میں مست علی شاہ جادوگر بھی کہتے ہیں۔ یہ تمثیل سنہ ۱۸۵۱ء میں لکھی گئی اور سنہ ۱۸۸۹ء میں ایک جرمن عالم مسٹر وارمنڈ نے اسکا ترجمہ جرمنی زبان میں کیا۔ اسکے بعد ہی مسٹر راجرس نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا اور سنہ ۱۹۰۶ء میں مسٹر لوسین بووٹ نے ترکی زبان سے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔

(۳) وکلاء مرافعہ :۔ یہ تمثیل سنہ ۱۸۵۶ء میں تصنیف ہوئی جسے مسٹر راجرس نے انگریزی زبان میں اور مسٹر سیلیر نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرکے شایع کیا۔

(۴) مرد خسیس :۔ یہ سنہ ۱۸۵۲ء میں لکھی گئی اور مسٹر بووٹ نے جنرل ایشیاٹک میں فارسی زبان میں ترجمہ کرکے سنہ ۱۹۰۹ء میں شایع کیا

(۵) ملا ابراہیم کیمیاگر : سنہ ۱۸۵۱ء میں تحریر ہوئی۔ جنوری سنہ ۱۸۸۶ء میں پروفیسر باربیر ڈی مینیرڈ نے جنرل ایشیاٹک میں اسکا فرانسیسی ترجمہ شایع کیا۔

(۶) یوسف شاہ سراج :۔ یہ تمثیل سنہ ۱۸۵۶ء میں لکھی گئی اور مسٹر بووٹ نے اسکا فرانسیسی ترجمہ مع اصل آذری نسخے کے سنہ ۱۹۰۳ء میں جنرل ایشیاٹک میں شایع کیا۔

(۷) خرس قلدورباسان :۔ اس تمثیل کو مسٹر راجرس نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ پروفیسر مینیرڈ نے فرانسیسی زبان میں اسی کا ترجمہ سنہ ۱۸۸۹ء میں پیرس سے شایع کیا۔

ان تمام تمثیلوں میں تقریباً ایک ہی سے قصے ہیں جو زیادہ تر عشق و محبت سے بھرے ہوئے ہیں۔ اکثر قصوں میں شکسپیر کی طرح جادو بھوت اور اجنہ سے مافوق انسانی کام لئے گئے ہیں جو یقینی اہل ایران کے عقائد کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً قصہ موسیٰ ژوردان میں ایک لڑکی اپنے چچازاد بھائی سے منسوب ہے۔ شادی کا زمانہ نزدیک ہی مگر لڑکا

پیرس جانے کو اسوقت کی شادی پر ترجیح دیتا ہے۔ لڑکی کی ماں گویا جادو کے ذریعہ سے شہر پیرس کو تباہ و برباد کرا دیتی ہے اور وہ لڑکا مجبوراً پیرس نہیں جاتا ہے۔ اور شادی ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ واقعہ فرانس کے انقلاب عظیم کے زمانے کا ہے اور اتفاق یوں ہوتا ہے کہ جادو کرنے کے بعد ہی ایران میں پیرس کی بربادی کی اطلاع ہوتی ہے اور یہ واقعہ جادو کے اثر پر مبنی سمجھا جاتا ہے اسی سے ملتا جلتا واقعہ خرس قلدور باسان کا ہے جس میں لوگ مسٹر فوق ایک یورپین سیاح اور نگہبان جانوران کو جن تصور کرتے ہیں۔ اور یہ بالکل ناممکن سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص بھالو بندر اور اسی طرح کے دوسرے جانور بکس میں بند کرکے گاڑی میں رکھکر ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجا سکتا ہے۔ موجودہ انگریزی تمثیلوں کا قاعدہ ہے کہ ان میں ایک اصل قصہ ہوتا ہے جس کے ماتحت چھوٹے چھوٹے ایک یا دو قصے اور بھی ہوتے ہیں اور یہ چھوٹے قصے درمیان میں حائل ہو کر اصل قصے کو تھوڑی دیر روک کر لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ گو فارسی تمثیلوں میں یہ بات تقریباً مفقود ہے۔ اس میں ایک ہی قصہ ہے جو شروع سے آخر تک بیان کیا جاتا ہے نہ اس میں انگریزی تمثیلوں کی طرح درست آغاز ہوتا ہے اور نہ ایک عمدہ معراج بلکہ انکا انجام بھی ایک معمولی طریقہ پر کر دیا جاتا ہے جس سے حظ میں نمایاں کمی محسوس ہوتی ہے۔

۱۹۰۵ء میں طہران سے ایک اخبار تیاتر شایع ہوا جو ہفتہ میں دو بار نکلتا تھا۔ اس کا کام غالباً اسوقت کی شخصی سلطنت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا تھا۔ اس نے بھی فارسی زبان میں چند نئی تمثیلوں کا اضافہ کیا لیکن ان تمثیلوں میں بجز وقتی سیاسیات کے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے کچھ پیشتر پرنس میلکم خاں نے جو کسی زمانے میں لندن میں سفیر ایران رہے تھے چند تمثیلیں لکھی تھیں۔ ان کل تصانیف کو یکجا کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایران میں فن تمثیل بہت جلد ایک اچھے درجہ پر پہونچ جائے گا۔ آجکل یہ فن نمایاں ترقی کر رہا ہے۔ اگر اسی رفتار سے ترقی ہوتی رہی تو یہ امید بیجا نہیں ہے کہ وہ بہت جلد ایسے بلند مقام پر پہونچ جائیگا جہاں ارباب فن اسکی تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے!

سلطان محمد تغلق عادل شاہ

گزشتہ سے پیوستہ

(۶)

مشیر احمد صاحب علوی بی۔ اے۔ علیگ

سنہ ۷۴۱ھ کے رمضان و شوال میں بارش کافی ہوئی جس سے قحط کے دور ہونے کی امید پڑی۔ اس زمانہ میں کچھ خائن اور بددیانت اہلکار اودھ و ظفر آباد میں سلطان کے خوف سے پناہ گزیں ہوئے۔ سلطان نے عین الملک صوبہ دار کو حکم دیا کہ تم ان خائنوں کو دربار میں بھیجدو سنا ہے کہ تمہارے بھائیوں نے انکو جاگیریں عطا کی ہیں عین الملک نے بموجب حکم سلطانی ان مجرمین کو سیاست کیلئے دربار شاہی میں بھیجنے کا ارادہ کرلیا۔ اتفاق سے اس زمانہ میں عین الملک کو ایک خاص ضرورت سے دارالخلافت جانا پڑا تو سلطان نے اس سے کہا "میں تم کو عنقریب دکن کی صوبہ داری پر تبدیل کرنے والا ہوں اس ترقی مراتب سے یقیناً تم کو خوشی ہوگی"۔ بات ختم ہوگئی عین الملک حاکم ظفر آباد و اودھ واپس چلا گیا لیکن اسکو اسکے بھائیوں اور مفرور شدہ خائنوں نے بہکایا کہ سلطان تم کو اس ملک سے بیدخل کرکے سزا دینا چاہتا ہے کیونکہ تم نے ان مصیبت زدہ افراد کو پناہ دی ہے (مجرمین کو) بہتر یہ ہے کہ بغاوت کردو۔ اور اودھ کا علاقہ نکال لو۔ چنانچہ سنہ ۷۴۲ھ میں عین الملک نے بغاوت کی سلطان نے بنفس نفیس اس بغاوت کو فرو کرنیکا ارادہ کیا۔ اور خود ان باغیوں پر حملہ کردیا اور بانگر مئو کے قریب لڑائی ہوئی عین الملک کے بھائی جنگ میں کام آئے۔ اور عین الملک گرفتار ہوکر حاضر دربار کیا گیا۔ مگر اسکی شرافت نسب دیرینہ خدمات علو مراتب کا لحاظ کرتے ہوئے سلطان نے اسکو دربار میں اپنے تخت کے برابر جگہ دی۔ اور کہا کہ:-

"عین الملک کی طبیعت میں فساد و بغاوت مطلق نہیں ہے اسکو مجرمین نے بہکایا ہے اسلئے میں اسکی دیرینہ وفاداریاں ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اسکو معاف کرتا ہوں اور خلعت فاخرہ سے سرفراز کرتا ہوں"

واقعہ بھی یہی تھا کہ عین الملک ان خائنوں کو تادیب کیلئے دربار میں بھیجنے کیلئے تیار تھا لیکن قسمت میں ذلت مقدر تھی۔ وہ مجبور ہوگیا سلطان نے ترحم خسروانہ سے کام لیکر عین الملک کو معاف کردیا۔ اور شاہی باغات کا مہتمم مقرر

کیا۔ لیکن اس بغاوت کے جملہ مصنفین و مولفین کو سخت سزاؤں کے بعد قتل کیا۔

اس مرتبہ سلطان بہرائچ تک ان باغیوں کی فکر میں گیا اور اسی دورہ میں سید سالار مسعود غازی[1] کی درگاہ پر بھی حاضری دی اور مجاوروں کو مالا مال کر دیا چنانچہ مقبرہ و قدم رسول اسی کی اولوالعزمی کی یادگار ہے مزار پر جو عمارت موجود ہے اُس میں بجائے پانی کے خمیر میں کیوڑہ گلاب اور دیگر قیمتی اشیا ڈالی گئی تھیں۔ یہ زندہ یادگار اس عادل شہنشاہ کی سیر چشمی کی آج بھی بہرائچ میں موجود ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ [illegible]ھ کا ہے جسکو آج تقریباً ۶۰۰ برس کا زمانہ گزر چکا ہے۔

[1] سید سالار مسعود غازی۔ آپکا یہاں بغرض جہاد تشریف لانا اور بہرائچ میں شہادت پانا اسقدر شہرت پذیر ہے کہ بچہ بچہ آپکے اسم گرامی سے واقف ہے اور اودھ کے بہت کم مقامات ایسے ہیں جہاں آپکے ساتھی جہاد کرنے نہ گئے ہوں مگر افسوس ہے کہ باوجود کوشش کے کسی تاریخ میں آپکے یہاں تشریف لانیکا زمانہ اور جنگ کے واقعات ہمکو نہیں ملے مجبوراً مرات مسعودی سے بطور تبرک یہ حالات ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔ آپکی ولادت ۱۲ رجب ۴۰۵ھ کو اتوار کے دن اجمیر میں ہوئی آپکے والد ماجد حضرت سالار ساہو مظفر خاں کی مدد کو جنکو اجمیر کے راجہ نے تنگ کر رکھا تھا آئے تھے۔ آپنے دس برس کی عمر میں ظاہری علم سے فراغت کر کے خدا سے لو لگائی۔ اسی زمانہ میں آپکے والد بحکم سلطان محمود غزنوی کاہیلر تشریف لائے اور اسے فتح کر کے یہاں بود و باش اختیار کی ۴۱۵ھ میں جب سلطان محمود سومنات کی فتح کرنیکو ہندوستان آیا تو آپکے والد کو شرکت جنگ کے واسطے طلب کیا۔ چونکہ آپ سلطان محمود کے بھانجے تھے لہذا ماموں سے ملنے کے واسطے والد کے ہمراہ گئے اور سومنات کے معرکہ میں شریک ہو کر سلطان کے ہمراہ غزنین تشریف لے گئے تھوڑے دنوں غزنیں میں قیام کر کے حسب اجازت سلطان محمود ہندوستان تشریف لائے اور لاہور میں ان مجاہدوں کے علاوہ جو آپکے ساتھ غزنیں سے آئے تھے اور بہت سے جانباز مجاہد آپکے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ یہ فوج جمع کر کے آپ آگے بڑھے اور دہلی کے سامنے پڑاؤ ڈالا۔ راجہ مہپال راجہ دہلی لڑائی میں مارا گیا اور آپ نے آگے بڑھ کے میرٹھ کے راجہ کو اطاعت پر مجبور کیا پھر قنوج کو مطیع کر کے گنگا کو عبور کیا اور ستر کھ کی آب و ہوا پسند کر کے اسکو مستقر بنایا۔ یہاں سے اطراف میں فوجیں روانہ کیں۔ اسی زمانہ میں آپکے والد بزرگوار بھی تشریف لائے انہیں آپنے مستقر پر چھوڑا خود اُن کی اجازت سے ۴۲۳ھ (۱۰۳۲ء) میں بہرائچ تشریف لیگئے اور دشمنوں کو شکست دی پندرھویں شوال ۴۲۳ھ (۱۰۳۲ء) کو حضرت سید سالار ساہو نے آپکی عدم موجودگی میں سفر آخرت کیا تھوڑے دنوں بعد ایک

ابھی چند سال کا واقعہ ہے کہ درگاہ شریف میں ایک جدید دروازہ کی ضرورت محسوس ہوئی جسوقت دیوار شہید کی گئی تو
قاضی سمیع علیخان عباسی سابق تحصیلدار بہرائچ کے قول کے مطابق تیز خوشبو کا ایک زبردست لپکا نکلا کہ حاضرین اس

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۔ اور فوج جسمیں بہت سے راجہ شامل تھے کٹھلا ندی کے کنارے جمع ہوئی اور آپنے اسے بھی شکست دی

اب مجاہدین نے چاروں طرف پھیل کے دُور دُور کے علاقوں کو زیروزبر کرنا شروع کیا۔ دشمنوں نے
اب مجبور ہوکر مکروفریب سے آپ کو شہید کرنا چاہا مگر انہیں بھی ناکامی ہوئی۔ ہاں ایک حجام نابکار کا داؤ
چل گیا مگر خداوند کریم نے اس سے بھی نجات دی۔ اس نائی نے یہ حرکت کی کہ ایک زہر میں بجھی ہوئی ناخن
گیر آپ کو دے گیا۔ آپنے اُس سے ناخن تراشے تو زہر جسم مبارک میں سرایت کر گیا۔ مگر خدا نے اُسکو
جلد زائل کر دیا۔ اکثر ساحروں نے بھی اپنے عمل سے کام لیا۔ مگر اُنکی بھی نہ چلی۔ اب پھر دشمنوں نے
دُور و دراز کے راجاؤں کے پاس قاصد بھیجکر لشکر طلب کئے۔ آپکے لشکر میں مجاہدوں کے دُور رہنے کیوجہ
سے اور دارالسلطنت سے بھی نئی فوج کے نہ آسکنے کے باعث بہت کمی اور پریشانی تھی۔ اسکے علاوہ اکثر
مجاہدین اطراف و جوانب کی لڑائیوں میں بھی روز شہید ہوتے رہتے تھے جن کیوجہ سے روز بروز آپ کی
قوت گھٹتی جاتی تھی۔ اسی حال میں دشمنوں کا بہت بڑا گروہ جمع ہو گیا۔ اور بہرائچ کے قریب لڑائی
شروع ہوئی۔ دو تین روز کی لڑائی میں نامی گرامی مجاہد شہید ہوئے ہنوز لڑائی کا فیصلہ نہ ہوا تھا کہ
آپ کی شہ رگ پر ایک تیر پڑا۔ اس کاری زخم نے آپکو گھوڑے پر سنبھلنے نہ دیا۔ خدمت گار نے
گھوڑے سے اُتار کے قریب ہی ایک مہوے کے درخت کے نیچے زمین پر لٹا دیا۔ اور کلمۂ شہادت پڑھکر ۱۹ سال
کی عمر میں ۱۴ رجب ۴۲۴ھ کو اتوار کے دن آپنے شربت شہادت پیا۔ تاریخ وصال "بل احیاء
عند ربہم" مجاہدوں نے آپکی شہادت کا حال سُنا تو بدحواس و بے دست و پا ہو گئے۔ اور اسی بدحواسی
میں سب کے سب شہید ہو گئے آپنے قیام گاہ پر کچھ لشکر حفاظت کی غرض سے سید ابراہیم کی سرداری
میں چھوڑا تھا۔ یہ بزرگ آپکی شہادت کا حال سنکر دوسرے دن صبح کو جائے شہادت پر تشریف لائے
اور جہاں تک ممکن ہوا شہداء کو کنوؤں تالابوں اور گڈھوں میں دفن کرکے حضرت امیر الشہداء کے جسم
اقدس کو سورج کنڈ میں سپرد خاک کیا اور لڑائی میں مشغول ہو گئے۔ اور راجہ سہردیو کو جسکا تیر حضرت
سید سالار مسعود غازی کے لگا تھا مقابلہ پر بلایا اور اسے ہلاک کرکے خود بھی باقی ماندہ لشکر کے
ساتھ شہید ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خوشبو سے بیتاب ہو گئے! بہت سے افراد نے صاحب مزار کی کرامت پر اس واقعہ کو محمول کیا لیکن تاریخی جرح و قدح کے بعد محققین کی جماعت اس نتیجہ پر پہنچی کہ خمیر میں عرقیات کا عنصر غالب تھا جس کی خوشبو اسوقت تک موجود ہے۔ واللہ عالم بحقیقۃ الحال ملفوظات قاضی فضلی امیٹھوی۔ مخطوطات انجمن اخوان الصفا قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ۔
..... توسط مولانا خادم حسین صاحب علوی العثمانی ایڈوکیٹ لکھنؤ۔

سلطان محمد تغلق نے قحط سے فراغت پاکر ان اسباب پر غور کیا کہ آخر قحط کیوں ہوتا ہے اور اس لئے آبنی تکالیف کو دور کرنے کیلئے زراعت میں ایجادات کیں ایک محکمہ زراعت کا قائم کیا۔ اور ایک ناظم اعلیٰ کے سپرد کیا۔ جسکو دیوان امیر کوہی کہا جاتا تھا اسی عہدہ کو انگریزی میں ڈائرکٹر آف اگری کلچر کہتے ہیں۔ محکمہ انہار قائم کیا جس سے بہت سی نہریں نکالی گئیں۔ جملہ کھیتوں میں کنوئیں بنائے گئے ان کنوؤں سے پانی نکالنے کیلئے چرس اختراع کئے گئے ورنہ اس سے قبل چرس کا استعمال ہندوستان میں نہیں تھا۔

"...... سلطان در ازدیاد زراعت اسلوبہا اختراع می کرد ہر چہ در ازدیاد زراعت در تصور سلطان میگذشتہ در دہ قلم می آمد آنرا اسلوب نام می شد۔ کہ اگر آں اسالیب متصورہ واقع شدے۔ ازازدیاد زراعت و حیثیت زراعت جہاں پر از نعمتہائے گوناگوں گشتے و در خزائن گنجہا آمدے ...... و در معاملہ ازدیاد زراعت دیوانے وضع شد و آں دیوان را دیوان امیر کوہی نام کردند و عہدہ داراں نصیب شدند۔ ہر چند سلطان محمد در باب جد می فرمود و چاہا کادا بندن فرمان شد و خلق نمی توانست و از زبان مردماں چیزے بیروں می آمد و تقصیر و اہمال می رفت بسیار آں سیاست می پیوستند[1] ...."

اسی عرصہ میں نظام پاین ایک بادہ گو دہرزہ کار احول نے فساد برپا کردیا عین الملک نے اسکو قتل کیا

بقیہ مضمون صفحہ ۲۰- سید سالار مسعود غازی اور ان کے فتوحات اگرچہ کسی مستند اور قابل وثوق تاریخ میں نہیں ملتی مگر اس نام کے ایک زبردست بہادر کے حملہ آور ہونے اور ان کے بہرائچ میں آکر شہید ہونیکا واقعہ متواترات میں سے ہے جو کسی تاریخی ثبوت کا محتاج نہیں ہاں ان کے حالات کی جو تفصیل بیان کیجاتی ہے وہ قطعاً مشتبہ اور تاریخ کے درجہ سے گری ہوئی ہے آپکا مزار اور قدم رسول کی عمارت اسی باعظمت سلطان نے بنوائی ہے اس روایت کو مولانا خادم حسن علوی نے بیان کیا ہے میں انکا متشکر ہوں

[1] فیروز شاہی ضیاء الدین برنی۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ مخطوطات ... حلقۃ التصنیف اورنگ آباد دکن دفاتر خاندانی [illegible] ... لکھنؤ۔ کتب خانہ خاندانی مولانا ابو الحسنات مولوی عبد الرشید فرنگی محلی۔ کتبخانہ لطیفیہ مولوی عبد اللطیف ... و گامن [illegible]

سلطان محمد تغلق اس شخص سے ناواقف تھا اس لئے کوئی جواب نہ دیا بلکہ دہلی کے شحنہ (کوتوال) امیر یوسف ملک کو لکھنوتی کا حاکم مقرر کیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ راہ میں ملک عدم کو سدھارا۔

علی مبارک لکھنوتی کا حاکم بن بیٹھا۔ اور سلطان علاء الدین کے لقب سے نواح بنگال پر حکومت کرنے لگا۔ لیکن یہ قصہ ابھی طے نہ ہوا تھا کہ ملک الیاس جو اس نواح میں ایک با اثر رئیس تھا اُس نے علاء الدین کو قتل کر دیا اور لکھنوتی پر قابض ہو گیا۔ اور سلطان محمد تغلق کو ان واقعات کی اطلاع دی ۷۴۴ھ میں سلطان نے خود بنگال کی جانب کوچ کیا۔ سنارگاؤں پہنچکر فخر الدین (ملک فخرہ) باغی کو زندہ گرفتار کر کے لکھنوتی میں قتل کیا اور حاجی الیاس کو شمس الدین کا خطاب عطا کر کے بنگال کی حکومت سپرد کی یہیں یہ خبر ملی کہ مالوہ کے ہندوؤں نے شورش مچائی ہے اسلئے وہ بھیلسہ اور رائسین گیا اور مالوہ کے متمردین کو زک دی اور دونوں صوبوں کو ساگر کی سرکار میں شامل کر کے ان جدید فتنوں کو فرو کیا اور دار الخلافت واپس چلا گیا۔

جب دہلی پہنچ گیا تو سکندر سلطان (امیران صدہ) کو حکم دیا کہ امیٹھی کا پرگنہ ہندوؤں سے فتح کر کے اودھ کی سرکار میں شامل کرو۔ سکندر سلطان نے پرگنہ فتح کیا اور ایک قلعہ بنام قلعہ امیٹھی تعمیر کر کے ملک علی کو اس پرگنہ کی حکومت سپرد کی۔ اور منصب قضاۃ کیلئے سلطان کی نظر انتخاب شیخ معروف عثمانی پر پڑی۔ شیخ تارک الدنیا تھے بہ لطائف الحیل اس خدمت کو ٹالنا چاہتے تھے اور بہت بچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن سلطان محمد تغلق نے حاکم اودھ کو حکم دیا کہ شیخ معروف سے کہو کہ وہ خدمت دینی قبول کرے ورنہ پابہ زنجیر حاضر عدالت کرو۔

"او عالم دین است اگر بار دگر ازیں خدمت دینی انکار کند کشاں کشاں بدار السلطنت آرند"[1]

حاکم اودھ نے شیخ معروف کو بہت سمجھایا زمانہ کا نشیب فراز دکھایا چنانچہ شیخ معروف نے عہدۂ قضاۃ منظور کیا۔ اب اس قلعہ کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ لیکن اُس کے شکستہ آثار متصل گوشائیں گنج (لکھنو) اب بھی موجود ہیں جو اپنے بنانے والوں کی اولو العزمی کی شہادت دے رہے ہیں۔ سچ ہے باقی رہے نام اللہ کا۔

(باقی - باقی)

[1] ریاض عثمانی۔ قاضی خادم حسن بی۔ اے ایل بی عثمانی۔ ایڈوکیٹ لکھنو مطبوعہ نیر پریس پاٹا نالہ باہتمام مولوی حامد حسن دبیر کامل لکھنو۔ مولوی خادم حسن شیخ معروف کی اولاد میں اب بھی عہدۂ قضاۃ پر مامور ہیں۔

فلسفۂ اخلاق
اور
راحت و تکلیف

سید مقبول حسین صاحب احمد پوری۔ بی۔ اے

راحت و تکلیف کا احساس قوتِ حاسّہ پر مبنی ہے۔ راحت کا احساس حواسِ خمسہ اور جذباتِ قلب کی تفریح اور جسمانی عیش و آرام سے ممکن ہے۔ راحت کا ذریعہ دولت بھی ہے، ہنر بھی، علم بھی اور محبت و اتحاد بھی۔ شہرت سے خوشی حاصل ہوتی ہے اس لئے وہ بھی ذریعۂ راحت ہے۔ طاقت و قوت سے ایک قسم کا اطمینانِ قلب رہتا ہے۔ اس لئے وہ بھی راحت کا سبب ہیں۔ راحت پرہیزگاری اور تقدس میں بھی ہے۔ فیّاضی اور سخاوت میں بھی، حُسنِ خیال اور مشاہدۂ جمال میں بھی۔ کسی کی یاد اور اُس یاد کی بیداری میں بھی، راحت شمعِ اُمید کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں بھی ہے اور کسی تکلیف سے نجات حاصل ہونے میں بھی۔ درد و محبت سے قلب کو راحت ہوتی ہے اور سوزِ عشق سے دل کو الفت۔ احساس و جذبات پر غلبہ کرنے والا سب سے بڑا ذریعۂ راحت "سکون" ہے اور سکون کے مختلف مدارج ہیں۔ بقول شاعر ؎

بقدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن، رفتن، ایستادن، نشستن، خفتن و مُردن

تکلیف کیا ہے؟ - ناکامیابی، حرماں نصیبی، قیدِ خیال، قیدِ جسم، امراض اور دیگر جسمانی تکالیف مثلاً تشنگی و گرسنگی وغیرہ - احساس و جذبات کی تکلیف جیسے روحانی تکالیف

شامل ہیں ایک بڑی تکلیف ہے۔ حواس خمسہ کو تکلیف ہونا جیسے کانٹا چبھنا، گرج، چمک، بدبو، تلخی، ترشی وغیرہ اور دماغی تکلیف جیسے ندامت، خوف، بدصورتی کا خیال، بدنامی کا خیال اور گالی گلوج کی یاد۔ دشمن کا ڈر، جرم و معصیت کا خوف، فرائض نہ ادا ہونے کا خیال حسد و بغض کا غلبہ وغیرہ سب دماغی و قلبی تکلیفیں ہیں۔ بیم و ہراس اور حسرت و یاس بھی تکالیف کا ذریعہ ہیں۔ یاد رفتگاں جذبات سے متعلق تکلیف ہے اور درد فراق سے قلبی و روحانی تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں سب لوگ راحت کے جویا ہیں۔ مگر زیادہ تر تکالیف ہی کا سامنا ہوتا ہے۔

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

تکلیف و راحت کے مدارج کا معیار ان میں سے ہر ایک کی شدت، وسعت اور عرصہ قیام پر مبنی ہے۔ اکثر اوقات تکلیف و راحت کا معیار یقین پر مبنی ہوتا ہے۔ کبھی واقفیت اور ناواقفیت پر، کبھی نزدیکی و دوری پر، کبھی اتفاقات زمانہ پر، کبھی موقع و مناسبت پر۔ یا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اجتماع ضدین میں کوئی ایک متضاد حالت تکلیف و راحت کا ذریعہ ہو جاتی ہے۔ اور بیشتر ایسا ہوا ہے کہ ایک چیز جو ایک جگہ یا کسی مخصوص وقت پر ذریعۂ تکلیف ہے تو دوسری جگہ یا کسی دوسرے وقت وہی چیز ذریعۂ راحت ہے۔ کسی نے خوب لکھا ہے ؎

کبھی ہے اس درد دل میں لذت، کبھی ہے اس درد دل سے وحشت
عجیب شے ہے ہمارا دل بھی کبھی نہیں جس کی ایک حالت

اور اسی موضوع پر میر صاحب بھی فرماتے ہیں ؎

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں   تحفۂ روزگار ہم بھی ہیں

اس کارگاہ عالم میں قدرت نے راحت و تکلیف کی تقسیم کچھ ایسی طرح کی ہے کہ کوئی بشر نہ تو کامل طور سے عیش و راحت کا دعویٰ کر سکتا ہے نہ تکلیف کی شکایت۔ کیونکہ نہ تو ہم بغیر تکلیف اٹھائے دنیا میں رہ سکتے ہیں نہ بغیر آرام کئے کچھ کام چل سکتا ہے۔ ہماری راحت ہمارے بھائی کی تکلیف پر مبنی ہے اور ہماری تکلیف سے دوسروں کو راحت۔ ہماری خوشی ہمارے ہمجنس کے لئے غم کا سبب ہے اور دوسروں کا غم ہماری خوشی کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ دنیا کی

زندگی ایک امتحان مقابلہ یا معرکۂ کشمکش ہے۔ جس میں فاتح و کامیاب کی خوشی مفتوح کی شکست و ناکامی میں مستور ہے۔ ہم شکار کھیلنے کو کھیل کہتے ہیں۔ مگر وہ ایک مخلوق کے لئے وبال جان ہے۔

"کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری"

تکلیف و راحت کی اس فطری مگر پیچیدہ ترتیب نے "گوتم سدھارتھ" کو خیالی کشمکش میں ڈال کر دنیا سے برگشتہ کر دیا تھا لیکن اس پیچیدگی کو سلجھانے میں کوئی کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ قانون فطرت ہے اور اسی قانون پر تمام موجودات کی ترتیب ہے۔ اگر بہار زمانۂ عیش و عشرت ہے تو خزاں دورِ تکلیف و عسرت۔ اگر دن محنت و تکلیف کے لئے ہے تو رات راحت و آرام کے لئے۔ دن اور رات کی تبدیلیاں تو دراصل ؎

"دنیا کی کروٹیں ہیں۔ تاریک اور روشن"

تکلیف و راحت کے اس احساس کو مدنظر رکھ کر فلسفۂ اخلاق کہتا ہے کہ ؎

بھوکا ہے اگر کوئی　　مرتا ہے اگر کوئی
بیمار ہے گر کوئی　　لاچار ہے گر کوئی

آؤ کہ بنیں ہمدم ہمسایہ و ہمخانہ

اور عیش و راحت کا جو یا یہ ہو کر فلسفۂ اخلاق خواہاں ہے کہ دنیا اور اہل دنیا کے درمیان سے غیریت کے پردے اٹھا دے۔ اس لئے آپس میں ہمدردی کا رواج دینا فلسفۂ اخلاق کو انتہائے کمال تک پہونچانا ہے۔ ؎

"یہ غیر، یہ اپنا ہے"　　یہ تفرقہ بیجا ہے
بیکار کا جھگڑا ہے　　اک وزر جو مرنا ہے

جب بند ہوئیں آنکھیں کوئی نہیں بیگانہ

بقول مرزا غالب[1] دنیا میں انسان کا وجود ہی آرام و تکلیف کی دو متضاد حیثیتوں میں سے موخر الذکر کو برداشت کرنے کے لئے ہوا ہے۔ اور چونکہ انسان کا وجود اسکے فنا کی دلیل ہے اس لئے ہمارا ہر آرام تکلیف کا پیش خیمہ ہے اور ہر تکلیف سے آرام کی امید کی جا سکتی ہے

---

[1] مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ؛ ہیولا برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا ؛

لاؤ اور لیجاؤ کا بازار گرم ہے - اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح بغیر تاریکی کے روشنی کا لطف نہیں اسی طرح بغیر آرام کے تکلیف کا مزا نہیں - سچ ہے -

"نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا"

مگر چونکہ دُنیا کی چہل پہل اسی احساس تکلیف یعنی موت پر مبنی ہے - اِس لئے اگر اس چہل پہل کو انسانی خدمت میں سوارت کیا جائے اور اس سے آپس کی ہمدردی قائم رکھی جائے تو تکلیف بھی ذریعۂ راحت ہو سکتی ہے - فلسفۂ اخلاق اسی اصول کو مدنظر رکھ کر مستفسر ہے کہ ؎

کیا ہم جو محبت کی اقلیم کے سلطاں ہیں ۔ کیا ہم جو بصیرت کی مشعل کے نگہباں ہیں
کیا ہم جو صحیح معنی میں محرم عرفاں ہیں ۔ کیا ہم جو اس عالم میں کچھ روز کے مہماں ہیں

اِس دولتِ دنیا پر یہ جان گنوائیں گے
انساں کی مصیبت میں ہم کام نہ آئیں گے

الغرض وہ کون سے ایسے وجوہ ہیں جن پر راحت و تکلیف کا احساس مبنی ہے اور جو ہر دو احساسات میں مشترک ہیں ؟ -

اُن وجوہ کا سبب تندرستی، قوت و طاقت، محنت و مشقت، علوم و فنون کی مقدار و خاصیت، ذہن و ادراک کی برکت اور استقلالِ دماغ پر مبنی ہے - رجحان طبیعت اور خواہشات نفس بھی راحت و تکلیف کے مشترک وجوہ ہو سکتے ہیں، مذہب و ملت اور معاشرت و اخلاق کا بھی ہر دو احساسات پر بڑا اثر پڑتا ہے - اگر ہم جذبات کے بندے ہیں اور ہم میں ہمدردی کا مادہ بہت ہے تو ہم عشق روحانی سے راحت حاصل کر سکتے ہیں مگر جسمانی راحت کو ایسی حالت میں خیرباد کہنا چاہیے - اگر ہم دولتمند ہیں تو جسمانی راحت ہماری غلام ہے - مگر راحت قلب و عیش روحانی سے ناامید ہونا چاہئے - غرض دولت و ثروت، حسن و جمال اور سن و سال پر راحت و تکلیف کا معیار قائم کیا جا سکتا ہے - اسی طرح ہماری عمر، ہماری جنس (یعنی امتیاز تذکیر و تانیث) ہماری تعلیم و تربیت، خاندان اور حکومت و قومیت کو بھی راحت و تکلیف کا مشترک سبب سمجھنا چاہئے - لیکن حقیقت کا اگر دوسرا رخ دیکھیے تو ہمارے ہی کام، ہمارے ہی کردار، اور ہماری ہی خواہشات تکلیف و

راحت کا ذریعہ ہیں۔ نیکی و بدی، مدح وذم اور صحیح وغلط کا امتیاز ہمارے کاموں ہی پر مبنی ہے۔ اور اس امتیاز میں بھی راحت و تکلیف کے احساس کا بہت کچھ حصہ شامل ہے۔

چونکہ ہر شخص دنیا میں راحت و آرام کا متمنی ہے اس لئے اس "آرام طلبی" کو مدّنظر رکھ کر فلسفۂ افادیت[1] کو راحت و تکلیف کے تضاد سے وابستہ کیا گیا ہے۔ اِس فلسفہ کی رو سے "وہ کام اچھے اور صحیح ہیں جو خوشی پیدا کرنے اور اُسکی مقدار بڑھانے یا خوشی کی توسیع کرنے کے لئے عمل میں آئیں۔ اگر کسی کام سے خوشی کے خلاف کچھ وقوع میں آئے تو وہ کام بُرا اور غلط ہے یہاں خوشی سے مراد راحت ہے اور ناخوشی سے تکلیف[2]"۔ یعنی خوشی وراحت محض انفرادی خوشی وراحت ہی نہو بلکہ اس سے جمہور کی فلاح بھی مقصود ہو۔ کیونکہ ہر علم جمہور کے لئے علم ہے اسی لئے فلسفۂ انبساط اور افادیت کو بھی انفرادی حیثیت سے دیکھنا گویا ان کو محدود کرنا ہے۔ غرض فلسفۂ افادیت کا اخلاقی مقصد خوشی وراحت کا حصول ہے۔

تکلیف وراحت جسم وروح کے اعتبار سے حقیقی وغیر حقیقی تقسیم میں آسکتے ہیں غیر حقیقی تکلیف وراحت کے بابت اوپر بہت کچھ کہا گیا۔ اب حقیقی پہلو پر غور کرنا چاہیئے۔ چنانچہ حقیقی تکلیف وہی ہے جس سے ہمارے ضمیر یعنی احساس ایمانی کو تکلیف پہونچے۔ یہ احساس بعض ہستیوں میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ غرض سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ضمیر انسانی کیا ہے؟۔ وہ ایک قوت ہے جو نفس لوامہ کے ذریعہ سے انسان کو ہر بُرائی سے کشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسکی راحت کو "نفس مطمئنہ" کہا گیا ہے۔ "نفس امّارہ" اسکی تکلیف ہے ضمیر وہ قوت ایمانی ہے جس کا مطمح نظر آرام ہے۔ مگر وہ ایسا آرام ہے جسکے حصول میں خواہ جسمانی و نفسانی تکالیف ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑے وہ آرام عیش قلب ومسرت روحانی کا باعث ہوگا۔ غرض روحانی مسرت کو تلف کرنے والی تکلیف حقیقی تکلیف ہے۔ اور ایسی کسی تکلیف سے نجات حقیقی آرام۔

آرام کیا ہی پیارا نام ہے۔ یہ ہمارے کانوں کو نغمہ، ہمارے دل کی راحت، اور روح کی مسرت ہے۔ آرام امیدوں بھری اُمنگوں اور خوشی پیدا کرنے والے ولولوں کا

---

(1) Utilitarianism. (2) J. S. Mill.

پیش خیمہ ہے۔ آرام ہمارے جسم کی فرحت اور جان کی راحت ہے۔ یہ جسم میں صحت ہوکر دوڑتا ہے روح میں مسرّت ہوکر چمکتا ہے۔ آرام ایسی چیز نہیں جیسے کہ کوئی شے زمین پر رکھی ہو، نہ ایسی جو نفسانی دنیا میں حکمراں ہے۔ بلکہ حقیقی آرام جو تقدیس و دعا کے بعد عالمِ قدس سے نورِ رحمت ہوکر ہمارے قلب پر متبسّم ہو، اور ہمکو دنیا ہی میں عالم قدس کی یاد دلا دے۔ وہ دن حقیقی عیش و راحت کا دن ہوگا جب گناہوں سے نجات پائیں گے۔ عبادت سے نہیں، رنج و غم سے سبکدوشی حاصل کرینگے، محبّت سے نہیں۔ کیا ہی مبارک دن ہوگا جب ہم "انا للّٰہ" کے دعوے پر "انا الیہ راجعون" ہوجائیں گے۔ جب خود حمد و محبّت ہوکر عالمِ قدس کی فضائے بسیط میں نورِ ایماں ہوکر ہر طرف محیط ہوجائیں گے۔ اور "مکانًا علیًّا" میں ایک لاہوتی روشنی ہوکر جا چمکیں گے۔ جب ہم "جوہرِ تخلیق" ہونے کا ثبوت دے چکیں گے اور ترانہ عیش آغوشِ رحمت میں گاتے ہونگے۔ ؎

کہیں ہم نور ہونگے اور کہیں خوشبو محبت کی
کہیں توحید برحق اور کہیں تفسیر وحدت کی

دکھائینگے کرشمے جنت الماویٰ کے باغوں میں
کھلینگے پھول بن کر طوبیٰ و سدرہ کی شاخوں میں

یونہی آغوش رحمت میں خوشی کے گیت گائیں گے
سنینگے آپ خود اور آپ ہی خود کو سنائیں گے

غزل حضرت فرخ بنارسی

فریبِ آرزو لے چشمِ فتنہ کار نہ دے
نگاہِ یاس کو تکلیفِ انتظار نہ دے

مرے ہیں کشمکشِ انتظار کے دل کو
تو اپنے وعدوں میں اب تک اعتبار نہ دے

چمن میں طرح تو ڈالی ہے پھر نشیمن کی
مگر یہ ڈر ہے کہ دھوکا کہیں بہار نہ دے

کرے بہت نہ کوئی ناز جامۂ زیبی پر
اجل حیات کا خلعت کہیں اتار نہ دے

مجھے تو حشر میں بھی ہے نگاہِ ناز سے خوف
دبی دبائی کوئی چوٹ پھر ابھار نہ دے

بقدر ظرف کہاں کیف میکشی ساقی
جو تو سرور باندازۂ خمار نہ دے

تمام عمر رہی شرمِ معصیت کی خلش
اب اور کوئی سزا مجھکو کردگار نہ دے

بدل سکے تو بدل دے جنوں کی فطرت کو
کہ جوش میں کوئی پھر آکے کچھ پکار نہ دے

نہ بھول بادۂ ہستی کے کیف میں فرخ
یہی سرور کہیں تلخیِ خمار نہ دے

صیغۂ تعلیم کی بے پروائی

گزشتہ سے پیوستہ

(مولانا سید سبط الحسن صاحب فاضل ادب سابق لکچرار کرسچین کالج الہ آباد)

قواعد اُردو حصۂ دوم (جمال الدین حیدر) کی غلطیاں

(۱) کتاب بھر میں جمع غائب کے صیغوں میں "وے" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے (ملاحظہ ہوں گردانیں صفحہ ۹۴ سے صفحہ ۹۶ تک کی) حالانکہ "وے" اُردو میں اب بالکل مستعمل نہیں ہے، جمع کے لئے بھی "وہ" مستعمل ہے۔ بجائے اس کے کہ قواعد سے بچّوں کی زبان درست کی جائے اور خراب کی گئی ہے۔

(۲) جمع متکلم کے صیغوں میں تذکیر و تانیث میں کچھ فرق نہیں ہوتا یعنی مرد بھی کہتے ہیں کہ ہم آئے تھے اور عورتیں بھی یہی کہتی ہیں۔ لیکن اِس قواعد میں جمع متکلم کے صیغے سب خلاف محاورہ لکھے گئے ہیں یعنی ماضی مطلق میں ہم لائیں۔ ماضی قریب میں ہم لائی ہیں۔ ماضی بعید میں ہم لائی تھیں۔ ماضی احتمالی میں ہم لائی ہوں وغیرہ۔ غرض تمام فعلوں میں اسی طرح خلاف محاورہ صیغے لکھے گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۹۴ سے صفحہ ۹۶ تک کی گردانیں)

(۳) صفحہ ۸۵ میں صفت ضعفی کے بیان میں ہے۔

صفت ضعفی وہ ہے کہ عدد کو دوچند کرکے اپنے محدود کو اِس صفت میں خاص کردے

تنقید۔ دُگنا، تگنا، چوگنا، دس گنا وغیرہ صفت اضعافی ہیں۔ لہذا دوچند کی تخصیص غلط ہے کیونکہ تگنا، چوگنا، دس گنا سے دوچند نہیں سمجھا جائیگا۔

(۴) صفحہ ۳۰ میں جمع کے قاعدوں میں ہے۔

جب کسی اسم مفرد کے آخر میں الف یا ہائے مختفی نہ ہوگی اور کوئی حرف معنوی بھی اسکے آخر میں نہ ہوگا تو لفظاً اس کی جمع نہ ہوگی بلکہ ان کی جمعیت ان کے فعلوں سے ظاہر ہوگی۔

تنقید۔ یہ قاعدہ مذکر الفاظ کے لئے خاص ہے لہذا اس کو ظاہر کردینا چاہیے تھا اسکی تخصیص نہ کرنے سے قاعدہ غلط ہوگیا۔ کیونکہ مونث الفاظ میں یہ قاعدہ جمع کا نہیں ہے۔

(۵) صفحہ ۵۹ میں مذکر و مونث غیر حقیقی کے بیان میں ہے۔

۴۔ عربی کا مصدر یا حاصل مصدر جسکے آخر میں الف ہے مذکر ہوگا۔ جیسے التجا، تمنا، استدعا، دعا، جفا۔ مگر تماشا مستثنیٰ ہے۔

تنقید۔ بالکل اُلٹی بات بیان کی گئی ہے۔ التجا، تمنا، استدعا، دعا، جفا سب مونث ہیں۔ اور تماشا مذکر ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ کتابت کی غلطی ہے یعنی بجائے مونث کے مذکر لکھ گیا۔ تو بچوں کے لئے ایسی کتابت کی غلطی اہم غلطی ہے۔ علاوہ اس کے اُس حالت میں بھی یہ غلطی رہیگی کہ صرف تماشا ہی کا استثنا صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ اور مصادر بھی کثرت سے ہیں۔ جیساکہ اور قواعد کی غلطیوں میں لکھ چکا ہوں۔

(۶) صفحہ ۱۰۳ میں حاصل مصدر کے بیان میں ہے۔

امر حاضر کے آخر۔ آن ۔ پ ۔ بڑھادو جیسے اُڑان ۔ ملاپ

تنقید۔ امر حاضر کے آخر میں ۔پ ۔ بڑھانے سے ملاپ حاصل مصدر نہیں بنتا۔ وہ تو ملپ ہوتا ہے۔ جو مہمل لفظ ہے بلکہ ماضی مطلق کے صیغہ واحد مذکر غائب پر ۔پ بڑھانے سے ملاپ حاصل ہوتا ہے۔

(۷) اسم ظرف کے بیان میں صفحہ ۱۰۴ میں ہے۔

مصدر کے آخر میں۔ لفظ گاہ بڑھادو۔ جیسے دیدن گاہ، خفتن گاہ۔

تنقید۔ دیدن گاہ، خفتن گاہ۔ بالکل خلاف محاورہ الفاظ ہیں اور اُردو کے اسم ظرف میں ہرگز ان کا استعمال نہیں ہے۔

(۸) ۱۳۶ میں انواع جملہ کے بیان میں ہے۔

جملہ اسمیہ	جملہ فعلیہ
محمود بیٹھا۔ مسعود سویا	موہن شریر ہے۔ سوہن نیک ہے
منصور ذہین ہے۔ غفور غبی ہے	بدری آتا ہے۔ گوری جائے گا۔

تنقید۔ محمود بیٹھا۔ مسعود سویا۔ جملہ اسمیہ نہیں ہیں بلکہ جملہ فعلیہ ہیں۔ اسی طرح موہن شریر ہے۔ سوہن نیک ہے۔ جملہ فعلیہ نہیں ہیں بلکہ جملہ اسمیہ ہیں کیونکہ ہے فعل ناقص موجود ہے اور شریر اور نیک خبر ہیں۔ اور یہی شناخت جملہ اسمیہ کی اِس قواعد میں بتائی گئی ہے۔ طوالت کے خیال سے بہت سے غلط مسائل چھوڑ دئے گئے۔ مثالاً چند مسائل لکھے گئے ہیں۔

رسالہ قواعد اُردو حصہ دوم کی غلطیاں

(۱) صفحہ ۳۱ کے حاشیہ ذیل میں ہے۔

واؤ معدولہ عربی لفظوں میں نہیں آتا۔ اور زیادہ تر فارسی لفظوں میں "خ" کے بعد آتا ہے۔

تنقید۔ زیادہ تر سے معلوم ہوتا ہے کہ کم تر اور حرفوں کے بعد بھی آتا ہے۔ حالانکہ واو معدولہ ہمیشہ خ کے بعد آتا ہے اور حرفوں کے بعد آتا ہی نہیں۔

(۲) جمع مونث متکلم کے صیغے سب گردانوں میں غلط لکھے ہیں۔ اُردو زبان میں جمع مذکر متکلم اور جمع مونث متکلم کے صیغوں میں کوئی فرق نہیں جیسا کہ میں اور قواعدوں کی غلطیاں میں لکھ چکا۔

(۳) صفحہ ۳۹ میں حاصل مصدر میں پیٹ۔ لین۔ حاصل مصدر بیان کئے گئے ہیں۔

تنقید۔ خالی پیٹ۔ یا لین حاصل مصدر نہیں ہیں۔ بلکہ مار پیٹ۔ لین دین حاصل مصدر ہو سکتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ وہاں پیٹ ہو رہی ہے۔ بلکہ یوں کہینگے کہ مار پیٹ ہو رہی ہے۔

(۴) صفحہ ۲۱ میں صفت کی گردان میں ہے۔

۴۔ صفت	مثالیں	کیفیت
صفت تعدادی	پہلا یا دوسرا لڑکا۔ پہلے یا دوسرے لڑکے پہلی یا دوسری لڑکی۔ پہلی یا دوسری لڑکیاں	تبدیلی ہوئی ہے

پانچواں یا ساتواں لڑکا پانچویں یا ساتویں لڑکے

پانچویں یا ساتویں لڑکی پانچویں یا ساتویں لڑکیاں

تنقید۔ پہلی یا دوسری لڑکیاں۔ پانچویں یا ساتویں لڑکیاں۔ یہ بالکل غلط ہے اسکا مفہوم ہی نہیں۔ اگر جمع بنائی گئی ہے تو غلط بنائی گئی ہے۔

بہ نظر اختصار بہت سی غلطیاں ترک کی گئی ہیں۔ مثالاً یہ غلطیاں لکھی گئی ہیں۔

مبادی القواعد کی غلطیاں

(۱) یہ کتاب انگلو ورناکیولر مدارس کے پانچویں اور چھٹے درجہ میں داخل نصاب ہے۔ اس سے نیچے کے درجے میں یعنی تیسرے اور چوتھے درجے میں جتنی گریمریں داخل نصاب ہیں اُن سب میں کلمے کی پانچ قسمیں بتائی گئی ہیں اور اس کتاب میں عربی قواعد کے مطابق کلمہ تین قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے جسکی وجہ سے اتنے اختلافات نیچے کے درجوں کی گریمروں سے ہو گئے ہیں کہ بچے تو درکنار بڑے لوگوں کی عقل چکر میں آجاتی ہے اور کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہوتی۔ قریب قریب وہ سب اختلافات میں جو میں نے تہذیب القواعد کے سلسلے میں شروع مضمون میں لکھے ہیں اور اس لئے اُن کا دوبارہ اعادہ کرنا طوالت سمجھتا ہوں۔ ناظرین اگر دیکھیں گے تو خود ان پر ظاہر ہو جائیگا۔ ایسی تعلیم جس قدر مضر ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

(۲) ترتیب بھی اس قواعد کی نیچے کے درجوں کی کتابوں سے بالکل مختلف ہے۔ بالعموم ہر قواعد میں دو حصے ہوتے ہیں۔ پہلے حصہ میں صرف کا بیان ہوتا ہے۔ دوسرے حصے میں نحو کا۔ اس کتاب کے پہلے حصے یعنی صرف میں علم نحو کے مسائل بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے حصے یعنی نحو میں علم صرف کے مسائل بیان کئے گئے ہیں یہاں تک کہ گردانیں بھی صیغوں کی دوسرے حصے میں بیان کی گئی ہیں جو علم صرف سے متعلق ہیں۔

(۳) مذکر و مونث کے بیان میں صفحہ ۱۶ میں ہے۔

فائدہ۔ مذکر اور مونث کی عام نشانی یہ ہے کہ مذکر کے آخر میں الف یا ہ ہوتی ہے اور مونث کے آخر میں ی۔

تنقید - عام نشانی یہ ہرگز نہیں ہے بلکہ اس میں مستثنیات ہیں یا تو بطور اکثریہ قاعدہ بیان کیا جاتا بطور کلیہ نہ لکھا جاتا یا مستثنیات لکھ دیئے جاتے۔ لطف یہ کہ اسکے بعد ہی مشق میں مذکر اور مؤنث الفاظ کی نسبت جو سوال ہے اُس میں - دہی، موتی - آنکھ، کی تذکیر و تانیث بھی پوچھی گئی ہے - اس قاعدہ کو بطور کلیہ بغیر استثنا لکھنے سے لڑکے یقیناً دہی اور موتی کو مؤنث اور آنکھ کو مذکر بتائیں گے -

(۴) صفحہ ۲۲ میں - غائب - مخاطب - متکلم فعل کی قسموں میں بتائے گئے ہیں - اور صفحہ ۷۵ میں ضمیر کی قسموں میں ہیں -

(۵) صفحہ ۹۵ میں حرف ندا کے بیان میں ہے -

فائدہ - ہوت اور الف جو فارسی کے حروف ندا ہیں یہ دونوں ہمیشہ منادی کے بعد آتے ہیں -

تنقید - اِس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوت بھی فارسی کا حرف ندا ہے - حالانکہ ہوت فارسی نہیں ہے -

چونکہ یہ قواعد اصولاً نیچے کے اور نیز اوپر کے درجوں کی قواعد سے ترتیب میں بالکل علیحدہ ہے - لہٰذا مسائل کی زیادہ غلطیاں نہیں لکھی جاتیں لیکن میرے نوٹ میں بارہ غلطیاں مسائل کی بھی لکھی ہیں جو محض اُلٹ پلٹ کر جا بجا دیکھنے سے ملی ہیں -

فضل القواعد کی غلطیاں

(۱) یہ کتاب ساتویں اور آٹھویں درجہ میں داخل ہے - اس کتاب کی ترتیب مبادی القواعد سے بہت مختلف ہے یعنی پہلے حصہ میں علم صرف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں علم نحو کے مبادی القواعد کی طرح مخلوط نہیں کر دیئے گئے - حالانکہ مصنف دونوں قواعد کا ایک ہی شخص ہے - بہرحال مبادی القواعد سے ترتیب میں یہ کتاب علیحدہ ہے - اور تیسرے چوتھے درجہ کی گریمروں سے بھی مختلف ہے یعنی اس میں بھی کلمے کی تین قسمیں قرار دی گئی ہیں غرضکہ نہ تیسرے چوتھے درجے کی کتابوں سے موافق ہے اور نہ مبادی القواعد سے - جس سے لڑکوں کے دماغ پریشان ہوتے ہیں -

(۲) صفحہ ۴۸ میں اسم ظرف کے بیان میں ہے۔
کبھی اسم کے آخر میں واڑی ۔ سال ۔ یال ۔ بڑھا کر ظرف مکاں کے معنی لیتے ہیں۔
جیسے پھلواڑی ۔ ٹکسال ۔ ننھیال ۔
تنقید ۔ پھُل ۔ ٹک ۔ ننھ ۔ کوئی اسم نہیں ہیں جس پر واڑی ۔ سال ۔ یال ۔ بڑھا کر
پھلواڑی ٹکسال ننھیال ۔ اسم ظرف بنائے گئے ۔

(۳) صفحہ ۵۰ میں صفت نسبتی کے بیان میں ہے۔
(۲) اگر اسم کے آخر ہ ہونے کی صورت میں تیسرا حرف ی ہو ۔ یا ہ سے پہلے ی ہو تو
ہ اور ی دونوں حذف ہو جاتے ہیں ۔ جیسے مدینہ سے مدنی ۔ برطانیہ سے برطانوی ۔
تنقید ۔ یہ کلیہ بھی صحیح نہیں ہے ۔ نگینہ میں بھی آخر میں ہ ہے اور تیسرا حرف ی ہے
لیکن صفت نسبتی نگینوی آتی ہے ۔ دیکھ لیجئے کہ ی حذف نہیں ہوئی ۔

(۴) صفحہ ۵۵ میں عدد ضعفی کے بیان میں ہے۔
دُگنا تگنا ۔ اور دس گنا سے عدد کا دو چند ہونا پایا جاتا ہے
تنقید ۔ صرف دُگنا سے عدد کا دو چند ہونا پایا جاتا ہے ۔ تگنا سے عدد کا سہ چند ہونا
اور دس گنا سے عدد کا دہ چند ہونا پایا جاتا ہے ۔

(۵) صفحہ ۸۳ میں بے جان چیزوں کی تذکیر کے ذکر میں یہ قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ
جن اسموں کے آخر میں الف ہوتا ہے وہ مذکر ہوتے ہیں اس میں جو الفاظ مستثنےٰ کئے گئے ہیں
اُس میں لفظ مالا بھی ہے یعنی مالا مؤنث بنایا گیا ہے ۔ مالا دہلی اور اُسکے اطراف میں بیشک
مؤنث ہے لیکن لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں بلا اختلاف بالعموم مذکر بولا جاتا ہے ۔ یہ کتاب
یو ۔ پی ۔ کے مدارس میں داخل کی گئی ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ یو ۔ پی ۔ میں زیادہ تر لکھنؤ کی زبان کا
تتبع کیا جاتا ہے ۔ اِس لئے اس کو یا تو مذکر بتاتے یا مختلف فیہ یعنی مؤنث لکھتا اور لکھنؤ کی
زبان کو غلط ٹھہرانا مناسب نہیں ہے ۔ ع

رشک	لے شہادت میں نہیں طالب جڑاؤ ہار کا	چاہئے زیور میں مالا تیغ جوہر دار کا
ناسخ	بتا مالا نہ تیلوں کا قتل کرتا ہے مجھے	اے پری مالا سرو ہی کا یہ مالا ہو گیا

(۶) اسی سلسلے میں اور اسی صفحہ میں ہے۔

عربی مصدر جو اوزان مندرجۂ ذیل پر آتے ہیں مذکر استعمال کئے جاتے ہیں (۱) جو اِفعال اور انفعال اور افتعال کے وزن پر آئیں۔ جیسے اکرام، انعام، انحصار، التوا، اعتبار، اختلاف۔ مگر اصلاح، افراط، ابتدا، انتہا، احتیاط، التجا، مستثنےٰ ہیں۔

تنقید۔ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ استثنا کا حصر انہیں الفاظ پر کر دیا گیا۔ کیونکہ وغیرہ کا یا اور کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ اور مصادر بھی مستثنےٰ ہیں۔ حالانکہ بہت سے مصادر ایسے ہیں کہ جو انھیں وزنوں پہ مونث ہیں۔ مثلاً احتیاج۔ اعتنا۔ التماس۔ امداد۔ امتداد وغیرہ۔

(۷) صفحۂ ۸۶ میں بے جان چیزوں کی تانیث کے بیان میں ہے۔

اُردو کے مصدر بھی جب کہ ان کے ساتھ مفعول مُونث مذکور ہو مونث ہوتے ہیں۔ جیسے بات سُنی۔ چٹھی لکھنی۔

تنقید۔ یہ ایک اختلافی بحث ہے اور اس کا ایک طرفہ فیصلہ کسی صورت سے جائز نہیں ہو سکتا۔ امیر و نیز جلال لکھنوی نے ایک مکمل اور طولانی بحث اسکی بابت کی ہے کہ علامت مصدر کسی زبان میں نہیں بدلتی اور کوئی قواعد نویس یہ نہیں لکھ سکتا کہ علامت مصدر اُردو میں سوائے نا کے تی بھی ہے۔ لہٰذا مصدر کسی حالت میں مُونث نہیں مستعمل ہو سکتا اور فصحائے لکھنؤ اسی کے پابند ہیں۔ اگر لڑکوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ اگر مفعول مُونث ہو تو مصدر بھی مونث ہی مستعمل ہوگا تو کسی حالت میں یہ تعلیم صحیح نہ ہوگی اور تمام کلام فصحائے لکھنؤ کے انکو غلط معلوم ہونگے۔ لہٰذا اس مسئلے کو اختلافی صورت میں دکھانا چاہئے۔ پنجاب کی حمایت کر کے لکھنؤ کے فصحا کا کلام غلط ٹھہرانا ہرگز مناسب نہیں ہے خصوصاً اُس حالت میں جبکہ یو۔ پی۔ میں زیادہ تر لکھنؤ کی زبان کا تتبع کیا جاتا ہے۔ اور یہ گرامر بھی یو۔ پی۔ کے لڑکوں کو پڑھائی جاتی ہے تو ان کو یہ تعلیم دینا کہ تمہاری زبان غلط ہے اور پنجاب اور دہلی کی زبان صحیح ہے میرے نزدیک بہت نامناسب تعلیم ہے۔ یہ قواعد پنجاب کے لئے لکھی گئی ہے۔ وہیں کے لڑکوں کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ لکھنؤ و نیز اطراف لکھنؤ میں مصدر مُونث نہیں بولا جاتا۔ —

عزیز پہلے اپنے دل کی قوت آزمانا چاہیئے پھر حریم ناز کا پردہ اُٹھانا چاہئے

کرنا۔ بتانا۔ سکھانا۔ یہ مصدر کہلائیں گے۔ کرنی۔ بتانی۔ سکھانی کو کوئی مصدر نہ کہیگا۔

(۸) صفحہ ۸۸ میں مذکر کی جمع کے سلسلے میں لفظ سماں کی جمع سمیں بتائی گئی ہے اور یہ قاعدہ لکھا گیا ہے کہ جس لفظ کے آخر میں نون غنہ اور اُس سے پہلے الف ہو تو اُس کی جمع میں بھی الف یائے مجہول سے بدل جاتا ہے۔

تنقید۔ یہ قاعدہ شاید پنجابی زبان میں ہو۔ لکھنؤ اور دہلی کے زباں داں تو ہرگز اس قاعدہ کا استعمال نہیں کرتے یعنی جوآن کی جمع جوین۔ نشاں کی جمع نشیں۔ سماں کی جمع سمیں مکاں کی جمع مکیں کسی اُردو داں کی زبان پر نہیں آتی۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب پنجاب والے۔ یو۔ پی۔ کے مصنفین کی کتابیں اپنے مدارس میں نہیں داخل کرتے حالانکہ یو۔ پی۔ کی زبان مستند بھی مانتے ہیں تو پھر یو۔ پی کے مدارس میں پنجاب کے مصنفین کی کتابیں کیوں داخل ہوتی ہیں۔ دراں حالیکہ پنجاب کی زبان یو۔ پی میں مستند نہیں مانی جاتی۔

(۹) صفحہ ۹۱ میں ہے۔

اسم صفت کی جمع مؤنث دو طرح سے آتی ہے۔ ایک الف اور نون غنہ کے ساتھ۔ دوسرے صرف نون غنہ کے ساتھ۔ جیسے ترچھی۔ ترچھیاں۔ ترچھیں۔

تنقید۔ اسم صفت کی جمع اب شاید پنجاب میں بنی ہو۔ اہل لکھنؤ و دہلی تو نہیں بناتے اور کوئی فصیح یہ نہیں بولتا کہ نگاہیں ترچھیاں پڑتی ہیں یا ترچھیں پڑتی ہیں۔ لطف یہ کہ حال کی زبان بتائی گئی ہے پرانی زبان بھی نہیں۔

غرض اس قسم کی کچھ غلطیاں میرے نوٹ میں ہیں جو بنظر اختصار ترک کی جاتی ہیں۔

مصباح القواعد کی غلطیاں

(۱) صفحہ ۹ میں حروف تہجی کی بحث میں ہے۔ تمام وہ حروف جن میں ہ کی آواز ملی ہوتی ہے۔ خاص ہندوستانی زبان کے حروف ہیں اس لئے کہ یہ حروف نہ عربی میں آتے ہیں نہ

فارسی میں صرف ہندوستانی زبان میں بولے جاتے ہیں۔

تنقید۔ ہائے مخلوط فارسی زبان میں کہیں کہیں مستعمل ہے۔ جیسے بھیاز (سانڈ گھوڑا) زردھشت (آتش پرستوں کے پیغمبر کا نام) دیکھو برہان قاطع

(۲) صفحہ ۲۶ میں مصدر اصلی و جعلی کی بحث میں ہے کبھی فارسی مصدر سے اُردو مصدر بناتے ہیں اور اُس سے فعل مشتق کرتے ہیں جیسے نواختن سے نوازنا۔

تنقید۔ نوازنا نوازیدن سے بنا ہے نواختن سے نہیں بنا۔

(۳) صفحہ ۳۲ میں فاعل و مفعول کی بحث میں ہے فعل لازم کے فاعل کے ساتھ نے کبھی نہیں آتا۔ جیسے حامد چلا۔ محمود گیا۔

تنقید۔ ہگنا۔ موتنا۔ تھوکنا فعل لازم ہیں اور انکے فاعل کے ساتھ نے آتا ہے جیسے عمرو نے ہگا۔ بکر نے موتا۔ حامد نے تھوکا۔

(۴) صفحہ ۹۲ میں مفعول کے بنانے کے طریقوں میں ہے۔ ماضی مطلق پر کبھی لفظ ہوا کی جگہ لفظ گیا لگاکر مفعول کا صیغہ بنا لیتے ہیں۔ جیسے لایا گیا۔ مارا گیا۔

تنقید۔ لایا گیا اور مارا گیا ماضی مجہول کے صیغے ہیں نہ کہ مفعول کے۔

(۵) اُسی صفحہ میں ہے۔ اسم مفعول فعل متعدی سے آتا ہے کبھی فعل لازم سے بھی آجاتا ہے۔ جیسے آیا ہوا۔ گیا ہوا۔ بیٹھا ہوا۔ اُٹھا ہوا وغیرہ۔

تنقید۔ اسم مفعول فعل لازم سے آہی نہیں سکتا ورنہ فعل لازم کی تعریف غلط ہوجائے کیونکہ فعل لازم وہی ہے جو صرف فاعل کو چاہے۔ جو مثالیں دی گئی ہیں یہ کسی حالت میں مفعول نہیں ہوسکتیں۔ آیا ہوا۔ گیا ہوا۔ اسم فاعل کے معنی دے سکتے ہیں جیسے آئے ہوئے نے کھانا کھایا یعنی آنے والے نے۔ گئے ہوئے کا نشان ملا یعنی جانے والے کا۔ اُٹھا ہوا بیٹھا ہوا اسم حالیہ ہیں۔

(۶) صفحہ ۹۹۔ حاشیہ۔ باندھنا متعدی ہے اور بندھنا اسکا لازم۔

تنقید۔ بندھنا متعدی بنفسہ ہے منسوب بمفعول اور باندھنا منسوب بفاعل۔

(۷) صفحہ ۱۳۷۔ اسم ظرف کی فارسی مثالوں میں لفظ نشست گاہ بیٹھنے کی جگہ کے معنوں میں لکھا ہے۔

تنقید۔ نشست گاہ فارسی میں اسم ظرف نہیں ہے بلکہ فارسی میں نشست گاہ اُس حصۂ جسم کو کہتے ہیں
جس پر بیٹھا جاتا ہے یعنی چوتڑ کی ہڈی۔ بیٹھنے کی جگہ کو نشیمن یا نشستن گاہ کہتے ہیں۔

(۸) صفحہ ۱۷۵ میں الفاظ تنکیر کی بحث میں ہے۔ جب انکے بعد حروف عامل یا توابع عامل آئیں
تو انکی تبدیلی کسی سے ہو جاتی ہے جیسے کسی سے کچھ امید نہ رکھو۔ مگر بعض اوقات کوئی بدستور رہتا ہے
اور حرف عاملہ اُس میں کچھ عمل نہیں کرتے۔ جیسے ؎

آتا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے مہلت   پھر دیکھیے آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا

تنقید۔ اس مثال میں حرف عامل یعنی کی لفظ دم پر آیا ہے نہ کہ لفظ کوئی پر۔ کوئی ہمیشہ
حروف عاملہ آنے سے کسی سے بدل جاتا ہے۔ کوئی کی نہیں کہتے کسی کی کہتے ہیں۔

(۹) صفحہ ۱۷۴ میں وجہ شبہ کی صراحت میں ہے جیسے طعنہ کا نیزہ یعنی طعنہ جو دل میں جاکر
لگنے اور زخم کر دینے میں نیزے کے مانند ہے۔

تنقید۔ طعنہ ظاہری طور پر نہ دل میں لگتا ہے نہ زخم پیدا کرتا ہے بلکہ نیزے کے لگنے سے جو تکلیف ہوتی
ہے ویسے ہی طعنے سے ہوتی ہے۔ لہذا وجہ شبہ تکلیف ہے۔ نہ کہ دل میں لگنا اور زخم کرنا۔

(۱۰) صفحہ ۱۷۷ میں اضافت توصیفی کی بحث میں ہے۔ کبھی ایک لفظ کو اُسکی طرف مضاف
کرتے ہیں اور اُس سے تمام کے معنی لیتے ہیں۔ جیسے حالی۔

غرض عیب اپنے بیاں کیجے کیا کیا   کہ بگڑا ہوا یاں ہے آوے کا آوا

تنقید۔ آوے کا آوا میں اضافت نہیں ہے یعنی کا علامت اضافت اسمیں نہیں ہے
بلکہ حرف شمول ہے۔ یہ عام مسئلہ ہے کہ نسبت تساوی اور نسبت عموم و خصوص مطلق میں اضافت نہیں ہوتی۔

(۱۱) صفحہ ۱۷۶ میں اضافت توصیفی کی بحث میں ہے۔ مضاف نکرہ بھی ہوتا ہے اور معرفہ بھی۔

تنقید۔ اس حیثیت سے کہ وہ مضاف ہے نکرہ نہیں ہوتا ورنہ اضافت کی غرض فوت ہو جائیگی
یہ لکھنا چاہیے کہ مضاف ہونے سے نکرہ معرفہ ہو جاتا ہے۔

(۱۲) صفحہ ۲۰۷ میں ہے بعض صورتوں میں کو علامت مفعول مفعول کے ساتھ نہیں آتی۔
(۲) اگر مصدر مفعول ہو عام اس سے کہ اردو کا ہو یا کسی اور زبان کا۔ جیسے زید نے کھانا کھایا۔

تنقید۔ اس مثال میں کھانا طعام کے معنی میں ہے خوردن کے معنی میں نہیں ہے لہذا

مصدر نہیں ہے۔ بلکہ اسم ہے۔ صرف یہ مثال غلط ہے۔

(۱۳) صفحہ ۲۴۴ میں استدراک کے حروف میں مگر ہاں ہے۔ اسکی مثال ہے ؎

مگر ہاں وہ سرمایۂ دین و دنیا   کہ اک ایک لمحہ ہے انمول جس کا

تنقید۔ صرف مگر استدراک کے لئے ہے اور ہاں تنبیہ و تاکید کے لئے۔ ہاں استدراک کے مگر کے ساتھ نہیں آتا۔

(۱۴) صفحہ ۲۵۰ میں حرف جزا کی بحث میں ہے۔ جزا مقدم ہو تو حرف شرط واجب الحذف ہوتا ہے۔ جیسے۔ غالب۔ ؎

نہ سنو گر برا کہے کوئی   نہ کہو گر برا کرے کوئی

تنقید۔ ان مثالوں میں حرف جزا تو حذف ہوا ہے نہ کہ حرف شرط۔ حرف شرط گر موجود ہے۔

(۱۵) صفحہ ۲۳۰ میں حروف جار میں سے حرف سے کے جو متعدد استعمال بتائے ہیں یہاں لکھتے ہیں۔

۸۔ بیان کے لئے جیسے احمد کو کھانے۔ پینے۔ پیسے۔ کپڑے سے کچھ کمی نہیں۔

تنقید۔ اُردو میں یوں کہتے ہیں۔ احمد کو کھانے پینے، روپیہ پیسے۔ کپڑے لتے کی کچھ کمی نہیں۔

۹۔ تفضیل کے لئے۔ جیسے زید خالد سے عالم ہے۔

تنقید۔ اُردو میں یوں کہینگے۔ زید خالد سے زیادہ پڑھا ہے۔ یا زید خالد سے زیادہ عالم ہے۔

۱۰۔ استبعاد کے لئے۔ جیسے ع تیر نکلا جو کماں سے تو گریزاں نکلا

تنقید۔ اِس مثال میں سے ابتدا کے لئے ہے نہ کہ استبعاد کے لئے۔ کیونکہ نکلنے کے بعد گریزاں نکلنا تحصیل حاصل ہے۔

(۱۶) صفحہ ۲۴۳۔ الفاظ۔ بے۔ بن۔ بجز۔ بغیر۔ جوں۔ طرح۔ مانند۔ سب کو حروف جر میں لکھا ہے۔

تنقید۔ بے اور بن حروف نفی ہیں اور بجز اور بغیر حسب استعمال استثنا کے لئے آتے ہیں۔ جوں۔ طرح۔ مانند تشبیہ کے لئے۔ مثالیں بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔

اسی طرح کی باون غلطیاں سائل کی میرے نوٹ میں ہیں۔ اگر کتاب بالاستیعاب دیکھی جائے تو شاید زیادہ غلطیاں نکلیں۔

(باقی آیندہ)

کلامِ ہادی

از سید اطہر حسین صاحب جعفری مقیم بھوپال

عالی جناب خان بہادر سید محمد ہادی صاحب سابق ڈپٹی کمشنر و کلکٹر و مجسٹریٹ اضلاع اودھ و آئین - حال ڈائرکٹر محکمۂ زراعت ریاست عالیہ بھوپال کی وہ بزرگ ہستی ہے جو کسی حلقہ میں عام اس سے کہ علمی ہو یا ادبی، محتاج تعارف نہیں - دنیا میں جتنے صاحبان کمال گزرے ہیں - انمیں سے ہر ایک کی طبیعت کا جولانگاہ صرف ایک مخصوص شعبہ رہا ہے - چاہے وہ علم سائنس ہو، یا ادب (لٹریچر) لیکن برخلاف اس کے قدرتِ کاملہ نے جناب ممدوح کو دونوں شعبوں میں یکساں کمال عطا فرمایا ہے - آپ نے سائنس کی طرف توجہ کی تو "انڈین شوگر انڈسٹری" (Indian Sugar Industry) ایسی بیمثل و بےنظیر کتاب لکھ کر دنیائے "شکر" میں ایک ہلچل مچا دی - اور ماہرینِ فن شکر سازی سے اپنی خداداد قابلیت کا اعتراف کرا ہی لیا - ادبیات کی جانب التفات کی تو بڑے بڑے ادبائے روزگار سے داد سخن لے کر رہے - آپ کی شاعری کا طرز تمام اردو شعرا سے نرالا ہے - بڑے بڑے فلسفہ، سائنس اور نباتات کے دقیق مسائل اور اُلجھے ہوئے واقعات جس طرح آسان الفاظ اور صاف صاف بندش میں ایک کم مایہ اردو زبان کے سانچہ میں سید صاحب ڈھال دیتے ہیں اُس کو سُن کر اہلِ ذوق کے دل بار ہا تڑپ گئے ہیں - اور یہ معلوم ہونے لگا ہے کہ اردو میں بھی سب کچھ نظم ہو سکتا ہے - زمانہ کے ساتھ شاعری کا مذاق بھی بدل گیا - اس لئے سید صاحب گل و بلبل اور جام و سبو والی شاعری کی جھلک اپنے بعض پچھلے کلام میں دکھا کر ایک نئے جادے پر نکل آئے - بلکہ یوں کہئے کہ ایک بیہڑ بیابان اور بے گیاہ صحرا میں سے ایک نئی راہ سب سے الگ نکال لی اور اس راہ پر آئندہ چلنے والوں کے ہادی ہو گئے - کلام میں غضب کی سادگی تو موجود ہی ہے - مگر اس میں کیا نہیں ہے - دقیق بین نگاہیں جب غور کرینگی تو وہ اس نتیجہ پر آ جائینگی -

"جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی"

ہم ان چند سطروں میں اس خاص بات کو بیان بھی نہیں کر سکتے اور نہ زمانہ اسکے سننے کو ابھی تیار ہے۔ مگر یہ بات بھولنے کے قابل نہیں کہ علوم مغربی کے چشموں سے تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھا کر جب ایک آنے والے دور میں اپنی بزم صحبت کے لئے کلام کو اپنے مذاق کے مطابق ڈھونڈھینگے تو وہ اسی قسم کا کلام ہوگا جو آج کبھی موتی مسجد میں کبھی جج کی صحبتوں میں ایک سادہ مزاج ایک فلسفہ داں عالم نباتات کی زبان سے سُن لیا جاتا ہے اس رنگ میں وہی جھلک ہے جو ایک حسین یورپین کو لکھنؤ کے پاکیزہ لباس پہنا دینے سے پیدا ہو جاتی ہے۔

مندرجہ ذیل نظم میں آپ نے پہلے تو ایام جاہلیت (زمانۂ قبل از اسلام) کی مختصر سی تاریخ لکھ کر اس جہالت کے تاریک پردہ کا منظر دکھلایا ہے جو صرف عرب ہی پر نہیں بلکہ کل روئے زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد اس میں اس آفتاب ہدایت کے طلوع کا ذکر ہے جسکی پُر نور شعاعوں نے اس کفر و جہالت کی تاریکی کو دُور کر کے اطراف و اکناف عالم کو انوار ہدایت سے معمور کر دیا۔ اور اُن اقوام کو جو قرنوں سے کفر، شرک، بغض، نفاق، کینہ۔ حسد وغیرہ غرضکہ جملہ اقسام کی برائیوں میں مبتلا رہ چکی تھیں پستی کے گڈھے سے نکال کر ترقی کی چوٹی پر پہونچا دیا۔ جو بذات خود ایک زبردست معجزہ ہے۔ اسکے بعد جناب سرور کائنات صلعم کے سب سے بڑے معجزے قرآن کے اس زبردست دعوے لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین کو بدلائل و براہین اس اختصار کے ساتھ ثابت کیا ہے اور قرآن کے دیگر محامد اس خوبی سے بیان کئے ہیں کہ اگر ایک زبردست علم کلام کا جاننے والا انہیں باتوں کو اسی تفصیل سے بیان کرنا چاہے تو شاید متعدد جلدیں بھی اسکے لئے کافی نہ ہونگی۔ بعد ازاں مدینۂ علم اور باب مدینہ کے فضائل و مناقب ایسے صداقت سے بھرے ہوے الفاظ میں بیان کئے ہیں کہ انہیں پڑھ کر ان مقدس ہستیوں کی عظمت و جلالت کا سکہ دل پر بیٹھ جاتا ہے۔ باوجود اس درجہ قادر الکلامی کے آپ نے اپنے کلام کو شایع کرنے کی نسبت کبھی توجہ نہیں

---

* تمہید از حضرت ممتاز جونپوری بر "کلام ہادی" از نشریات دفتر شیعہ کالج لکھنؤ۔

فرمائی - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود آپ کے پاس اپنے کلام کا بہت کم حصہ باقی رہ گیا ہے۔ چونکہ مجھے ایک عرصۂ دراز سے جناب ممدوح کی حاشیہ بوسی کا فخر حاصل ہے - اس لئے میں نے اپنی کوشش سے آپ کے کلام کا ایک بڑا حصہ اپنے پاس فراہم کر رکھا ہے جس میں متعدد قصائد اور قریب ۲۰۰ کے رباعیاں اور چند غزلیں شامل ہیں - اگر وقت نے مساعدت کی تو آپ کے کلام کے انتخابات اسی محترم جریدۂ "ادب" کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً ہدیۂ ناظرین ہوتے رہینگے۔

قصیدہ

عقل حیراں ہے کہ آخر وہ بشر تھے یا دواب — تھی عرب کی جاہلیت آپ ہی اپنا جواب
کینہ پرور گر نہ ہوتے وہ تو تھی حیرت کی بات — تھا شتر سے فطرۃً اُن کو مقامی انتساب
بیوفا ایسے کہ طوطے سے نہ جھپکے اُن کی آنکھ — ہوشیار اتنے کہ چالیں لے اُڑے ان سے غراب
اس قدر سُرتے کہ بھولے سے کبھی غوطہ نہ کھائیں — آب زیر کاہ ہو یا چاہ زیر سطح آب
اُنکے نعمت خانہائے سادگی کے زیب و زین — جَو کی گھُری روٹیاں بھیڑوں کے ادھ کچے کباب
متی جرگوں میں بے سرپاؤں کی باتوں میں جنگ — ہڈیوں پر جس طرح لڑتے ہیں آپس میں کلاب
یہ خطا، وہ جرم، یہ بیداد نو، وہ تازہ ظلم — رات کو اقدام اسکا دن میں اُسکا ارتکاب
دشت میں بیٹھے ہوئے کچے گھڑے کی کوئی شے — شیر مادر جان کر پیتے تھے وہ خانہ خراب
اِس نرالی سرزمیں میں گردشِ لیل و نہار — پردۂ کتماں سے لائی اک انوکھا انقلاب
گھر کے مُرجھائے ہوئے کھیتوں کے اوپر آگیا — آب رحمت پاش افضالِ الٰہی کا سحاب
اندریں افراد پیدا می شود پیغمبرے — ایں چنیں امرے نمی باشد مگر شئیٔ عجاب
آمنہؓ کا مایۂ نازش - ابوطالبؓ کا فخر — حمزہؓ و جعفرؓ کی صبحِ آرزو کا آفتاب
حق پرستی کی صفا آگیں چمن کا تازہ گل — معرفت کے موج زن دریا کا لولوئے خوشاب
دفتر تبلیغ کے مجموعۂ افراد میں — نقش بند کاف نوں کا سب سے پچھلا انتخاب
ماہِ نَو کو جسکی ملّت کے نشاں بننے پہ ناز — اوجِ معراجِ رسالت کا وہ تاباں ماہتاب

پند جسکی بے بدل تسلیح جس کی بے غرض
زہد جس کا بے ریا جس کا تورع لاجواب

تم جسے سمجھے ہوئے ہو رحمۃ للعالمیں
ہم جسے مانے ہوئے ہیں شافعِ یوم الحساب

آسماں پر جا کے جن لایا وہی استاد خلق
واں کے سرکاری کتبخانے سے چھٹی کی کتاب

اسکا ہاتھ آنا کہ اس اُمی کے ہاتھوں ہو گیا
فیضِ ما علمتنا سے اک زمانہ بہرہ یاب

ایک ہی نسخہ سے سکھلایا ادب معنی بیاں
فقہ منطق فلسفہ تاریخ طب حکمت حساب

کفر کے بیہوش بیماروں کی آنکھیں کھل گئیں
اپنے دینی کارخانے کا جہاں چھڑکا گلاب

دو ہی فقرے کہکے ہستی کی حقیقت کھول دی
ما بنیتم للخراب - ما ولدتم للتراب

اُنہیں حکمت کی کوئی لم تھی جہاں فرما گئے
یہ حلال اور وہ حرام - اسمیں گنہ اسمیں ثواب

تھا تفرس کا کوئی نکتہ جہاں یہ کہہ دیا
اسمیں لازم انہاک اور اس سے احوط اجتناب

آج یورپ کی تمنا ہے کہ چل جائے وہاں
اس کا فرمودہ کہ بھولے سے نہ تو پینا شراب

آب زر سے ٹانک لے اسکو کہیں پر اے حکیم
بند اک کا انسرا قوا میں ہے ترا آدھا نصاب

درد مایوسی کا یہ بتلا دیا حکمی علاج
تم دعا مانگو - کوئی ہے - وہ کریگا مستجاب

نہی منکر - امر بالمعروف اُسکے دو نقیب
پردہ بردارانِ نقصانِ خطا حسنِ صواب

کلیہ فرما دیا خذ ما صفا دع ما کدر
توڑ لو کانٹے ہٹا کر ہر گلستاں سے گلاب

چن لئے ہر کھیت سے اخلاق کے خوش رنگ پھول
بیٹھ کر جنگل میں ان پھولوں سے ٹپکایا شہاب

جامۂ تہذیب دنیا پر چڑھایا پھر وہ رنگ
جسمیں چوکھا پن قیامت کا بلا کی آب و تاب

جن کتابوں کا جو قائل ہو اُنہیں سے انکار د
تھا حریفوں کے لئے ترکی کا ترکی میں جواب

معجزہ یہ تھا کہ ہو جاتے تھے ساکت مدعی
بات کو اسکی اُلٹ دیتے نہ تھی انکی یہ تاب

کلیے کیسے - کہ سکھلائے یہاں تک جزئیات
یوں نہاؤ - یوں کرو مسواک - یوں باندھو خضاب

دیدیا اک رہبر خاموش قرآن میں
ہر سخن کا جو دیتا ہے جواب با صواب

یوں ملے ہیں آیۂ تطہیر والے اُسکے ساتھ
جس طرح یکجا ہوں شیر و شکر قند و گلاب

بھیجئے اور بھیجئے اور بھیجئے اُس پر درود
اے غلامانِ غلامانِ غلامانِ جناب

اے معانی گسترانِ نکتۂ صلوا علیہ
اے خبر دارانِ حکمِ حضرتِ ختمی مآب

چاہیے آلِ پیمبر سے تولّا چاہیے
امتثالِ امر سمجھو اس کو یا کارِ ثواب

عشق تھا جس سے نبی کو کھل چلا آخر وہ باغ
شاہدِ مقصود نے رخسار سے اُلٹا نقاب

کوند اُٹھی اس گھپ اندھیرے میں جو برقِ اتفاق
ہر بشر کے دل میں پیدا ہو گیا اک پیچ و تاب

آ چکا تھا نورِ ایمانِ حقیقی سامنے
اُٹھ چکا تھا عہدِ گمراہی کا ظلمت زا حجاب

وہ اُبھرتی قوم - وہ اَلسّعی مِنّا پہ عمل
چل پڑے اُس نور کے بقعہ کی جانب شیخ و شاب

طرّ قوا کا شور اور ہر جادہ پیما کی یہ دُھن
سب سے پہلے ہم ہوں اس دینی دوش میں کامیاب

جوش کی گرمی کا پارا چڑھتے چڑھتے چڑھ گیا
اُن خطوں تک جن سے ہے نزدیک حدِ التہاب

کر دکھایا اسکو اُن جاگے ہوئے افراد نے
گو ہوا کچھ دیر میں لیکن ہوا پورا یہ خواب

ارضِ بطحا پہ یہ رنگیں کارنامے اُسکے ہیں
نام ہے جسکا محمدؐ - مصطفےٰ جسکا خطاب

اور اک پُتلا بنا اُس خاکِ مردم خیز سے
جلوہ آرا یوں ہوا کعبہ میں نورِ بوتراب

وہ تمدّن کی نئی دُنیا - نئے ارض و سما
وہ مدینہ علم کا اور اس مدینہ کا یہ باب

اُس زمیں پر آ گیا اک حکمراں - اک پیشدست
اُس فلک کو مل گیا اک آفتاب - اک ماہتاب

دونوں چمکیلے - مگر اک نور پاش - اک نور چیں
چاند کو سورج سے لازم تھا ضیا کا اکتساب

تازہ گل پھوٹے بہارِ مجمع البحرین سے
بن گیا خطّہ وہ اک فیضانِ رحمت کا دوآب

سر کو اسکے کیا نہ بخشا تھا خدا نے جز غرور
کون سا جذبہ نہ تھا اس دل میں الّا اضطراب

اُس ڈرانی رات میں مولا کی وہ بھرپور نیند
بسترِ گل بن گیا خیر الوریٰ کا فرشِ خواب

وہ سکت پنجہ میں جس پر ہے یداللّٰہی کو ناز
زور وہ بازو میں جس سے کھل سکے خیبر کا باب

بزمِ اربابِ متانت میں خود اک حبل المتین
بذلہ سنجوں کی جماعت میں بڑے حاضر جواب

دیکھنا سامانِ دسترخوانِ مولیٰ دیکھنا
اک نمک کی کنکری - اک نانِ جَو - اک جام آب

بخش دی مولیٰ کو مولیٰ نے کنیزی کے لئے
فاطمہؓ سی مقتدر معصومہ عفت مآب

اُس سے پیدا ہیں شہیدِ کربلاؑ - جن پر نثار
آپ کا دُکھتا ہوا دل - آپ کی چشمِ پُر آب

وقت بھی کم تھا زمیں بھی سخت تھی - ہادی - مگر
یہ اچھوتی نظم اپنے رنگ میں ہے لاجواب

حضرت عیسیٰ مسیحؑ کی کچھ چھوٹے بچوں سے بات چیت

(چودھری جگت موہن لال صاحب رواں ایڈوکیٹ افاؤ)

ذیل میں حضرت عیسیٰ مسیح کے کچھ اقوال نقل کئے جاتے ہیں۔ اُمید ہے کہ ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہونگے۔

"فصل بہت کافی ہے۔ بہت وسیع ہے۔ بہت اچھی ہے لیکن افسوس کہ اُس کے کاٹنے والے۔ کام کرنے والے کم ہیں۔ اس لئے اے بچو دعا کرو کہ خداوند تعالیٰ فصل کاٹنے والے بہم پہنچائے۔ اور کام کرنے والوں کو کام کی توفیق دے۔

جاؤ۔ اپنے راستے جاؤ۔ میں تمہیں اس طرح باہر بھیجتا ہوں کہ جیسے کوئی میمنوں کو بھیڑیوں کے سامنے ڈال دے۔

جاؤ۔ لیکن اپنے ساتھ روپیہ پیسہ یا کوئی قیمتی چیز نہ لے جاؤ۔ راستہ میں تم کو کسی کے سامنے سرِ نیاز خم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جس کسی گھر میں تم داخل ہونا ہمیشہ یہ کہہ کر داخل ہونا کہ خدا اس گھر پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ اگر اُس کا مکین اس قابل ہے تو خیر ورنہ خود تم پر خدا کی رحمت نازل ہوگی۔ اور اس دعا کا ثواب تمہیں حاصل ہوگا۔ مکان میں رہ کر جو کچھ بھی تمہیں صاحب خانہ دے تمہیں کھا پی لینا چاہئیے۔ مزدور کو اس کی اُجرت ملنی چاہئیے۔ دروازے دروازے پھرنے کی تم کو ضرورت نہیں ہے۔

بچو۔ جس شہر میں بھی جانے کا اتفاق ہو اور وہاں تمہاری خاطر ہو اور جو کچھ بھی تمہارے سامنے پیش کیا جائے اُسے بخوشی قبول کرنا۔ جو لوگ تکلیف میں ہوں اُنکی تکلیف رفع کرنے کی

کوشش کرنا۔ اور اُن کو یہ کہکر ڈھارس دینا کہ اللہ تعالیٰ درماندوں کی مدد کرتا ہے۔ اگر تم کسی ایسے شہر میں داخل ہونا۔ جہاں تمہارا کوئی پرسان حال نہ ہو تو اُس کو بُرا نہ ماننا اور رنجیدہ نہ ہونا۔ گلیوں میں جاکر اہل شہر سے کہنا کہ ہم تمہارے شہر کی خاک بھی اپنے کپڑوں میں لیجانا نہیں چاہتے۔ لیکن ہمارے عدم تواضع سے تمہارا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ خدا تمہاری مدد کرے۔

جو تمہاری بات سُنتا ہے وہ گویا میری خاطر کرتا ہے۔ جو تم سے نفرت کرتا ہے وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ اور جو مجھ سے نفرت کرتا ہے وہ گویا اُس سے نفرت کرتا ہے جس نے مجھے اِس دُنیا میں امن وسکون قلب کا پیام لے کر بھیجا ہے۔

بچو۔ جو کوئی تم کو قتل کی دھمکی دے۔ اُس سے ڈر نہ جانا۔ کیونکہ قتل کرنے کے بعد پھر تمہارے ساتھ اور کوئی بُرائی نہیں کرسکتا۔ ہاں اگر کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہوگی تو میں تم کو بتادوں گا کہ کس سے ڈرنا چاہئے۔ چار آنہ کی چار چڑیاں بکتی ہیں لیکن کسی چڑیا کے حقوق خداوند عالم کے سامنے فراموش نہیں کئے جاسکتے۔ اُس نے ایک ایک رونگھٹے کا شمار کیا ہے۔ اور ایک ایک رونگھٹے کی اُس کی نگاہوں میں قدر ہے۔ تم کو ڈرنے کا کوئی سبب نہیں۔ جب وہ چڑیوں کے حقوق فراموش نہیں کرتا تو تم انسانوں کو وہ کیسے بھول سکتا ہے۔ یقین کرو کہ جو شخص باڑے کے اندر دروازے سے داخل نہیں ہوتا اور دیوار پھاندنے یا نقب لگانے کی کوشش کرتا ہے وہ چور اور مجرم ہے۔ لیکن جو باڑے کے دروازے سے داخل ہوتا ہے وہ گلہ بان کے گلے میں شامل ہوجاتا ہے۔ گلہ بان اُنکی نگہداشت کرتا ہے۔ اُن کے رکھ کھاؤ اور عافیت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ گلا پتے گلہ بان کی آواز پہچانتا ہے اور گلہ بان گلہ کی خیر وعافیت اپنی خیر وعافیت سمجھتا ہے یقین کرو بچو کہ جس باڑے میں تم کو داخل ہونا چاہئے میں اُس کا دروازہ ہوں۔ میرے سامنے وہ بھی آتے ہیں جو دروازے سے داخل ہونے کے خواہشمند ہیں اور چور اور نقب زن بھی آتے ہیں۔ جو دروازے سے داخل ہونگے وہ ہری گھاس کے مستحق ہونگے اور اُس سے پرورش پائینگے۔ چور، ڈاکو ہمیشہ قتل وغارت کی فکر میں رہتے ہیں۔ میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ میں تم کو نور اور حیات کا پیام دوں۔ میں رحم دل گلہ بان ہوں۔ میں اپنے میمنوں کے لئے اپنی جان تک قربان کردیتا اپنا

فرض سمجھتا ہوں - جو رحم دل گلّہ بان نہیں ہے محض صنوعی محافظ ہے وہ اپنے میمنوں کو چھوڑ دیتا ہے اور بھیڑئے کو اُن کی طرف آتا دیکھ کر خود خوف زدہ ہو کر اُس جگہ سے ہٹ جاتا ہے چاہے بھیڑیا میمنوں کو شکار ہی کیوں نہ کرلے - خدا کے نزدیک معصوم دل سب سے زیادہ رحم اور عنایت کا مستحق ہے - اِس لئے اے بچو چاہے تم کتنے ہی بڑے اور سیانے کیوں ہو جاؤ تم اپنے دل کو بچوں کی طرح معصوم رکھنا جس شخص کا دل سب سے چھوٹے بچے کی طرح معصوم ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں سب سے بڑا ہے - بچو یاد رکھنا جس طرح کوئی گلہ بان اپنے گلّے کا ایک میمنا بھی کھونا پسند نہیں کرتا - اور اگر کوئی کھو جاتا ہے تو بقیہ کو چھوڑ اُس کھوئے ہوئے کی تلاش میں جاتا ہے اور جب محنت مشقت کرکے اُسے ڈھونڈھ نکالتا ہے تو اسکی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی - اسی طرح اگر سو آدمیوں میں ایک گناہگار ہے اور بالآخر اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو خدائے کریم خوش ہو کر اُس کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دیتا ہے - جس طرح کوئی غریب عورت اگر اس کا ایک پیسہ گر پڑتا ہے تو چراغ جلا کر گھنٹوں ڈھونڈھتی ہے - اور جب تک اپنا پیسہ تلاش نہیں کرلیتی اُس کے دل کو تسلی نہیں ہوتی - اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے کھوئے ہوئے بندے کو کھویا ہوا نہیں سمجھتا - اللہ تعالیٰ اپنے ایک ایک گناہگار پر نظر رکھتا ہے "

غزل سید سرفراز حسین صاحب خبیر رضوی لکھنوی شاگرد حضرت آوج مغفور

سر جھکا بھی ہے کے لئے - سجدہ ترے در کے لئے ۔۔۔ ہم سے نسبت ہے آپ کی نسبت سے مقدر کے لئے

ہاتھ ساقی کا جو کانپا تو گرا جام شراب ۔۔۔ یہ بھی الزام تھا میرے دل مضطر کے لئے

آ کے ہستی میں بھی دل سے نہ گئی یاد عدم ۔۔۔ روح بیتاب ہی چھوٹے ہوئے گھر کے لئے

منتِ غیر سے نفرت جو طبیعت کو رہی ۔۔۔ کام چھوڑا نہ کوئی ہم نے مقدر کے لئے

مژدۂ اجر شہادت جو سنا عاشق نے ۔۔۔ دہنِ زخم سے بوسے لبِ خنجر کے لئے

خونِ دل ہو چکا - باقی ہے فقط خونِ اُمید ۔۔۔ اک ستم اور سہی طبع ستمگر کے لئے

دل کو ہے رحمتِ شبیر سے آرام خبیر ۔۔۔ اب غزل کہنا مصیبت ہے ثناگر کے لئے

آسمانِ شاعری کا آفتاب

(فاطمہ بیگم صاحبہ منشی)

محترمہ فاطمہ بیگم اُن خوش نصیب بہنوں میں ہیں جن کے علم و ادب کے فطری ذوق کو تحصیل علم کا موقع ملا ہے۔ اور وہ طلب علم میں لگی ہوئی ہیں۔ ذیل کا مضمون اُنکی نثر نگاری کی ابتدائی کوششوں کا ثبوت ہے۔ صورتِ حال امید افزا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم اسے صفحات "ادب" میں خوشی کے ساتھ جگہ دے رہے ہیں۔ اگرچہ ایسے بلند مرتبہ شاعر کے لئے اتنا مختصر سا مضمون بہت تشنہ ہے لیکن پھر بھی ہمیں اُمید ہے کہ اس سے شاد کی روح ضرور شاد ہوگی۔ اور وہ اس لئے کہ اسکی لکھنے والی خود شاعر کی "نواسی" ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ موصوفہ اپنے اس قابل قدر شغلے کو جاری رکھینگی اور بہت جلد کافی مشق بہم پہونچالینگی۔ "ادب" ایسی بہنوں کے مضامین شایع کرنا اپنے مقصد کی تکمیل سمجھتا ہے اس لئے اسکی طرف سے یہ صلائے عام ہے۔ (مدیر)

سیّد علی محمد صاحب المتخلص بہ شاد عظیم آباد پٹنہ کی مردم خیز سرزمین سے سنہ ۱۸۴۶ء میں اُٹھے تھے۔ وہیں بڑھے پلے۔ وہیں شاعری کو فروغ دیا۔ آپ کے والد کا نام سیّد عباس مرزا تھا۔ آپ کا خاندان رُوسا عظیم آباد کے معزز و مقتدر خاندانوں میں سے تھا۔

ذوق شاعری آپ کو فطرت کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ پانچ برس کے سن میں آپ کو فارسی اور اُردو کے اچھے اچھے اشعار یاد تھے۔ آگے چل کر خود بھی مشق سخن فرمانے لگے لیکن آپ کی شاعری کا ستارہ اُس وقت اوجِ فلک پر چمکا جب آپ شاعروں میں اپنے زورِ طبع کا جوہر دکھانے لگے۔ سخن شناس آپ کا کلام سُن کر تعریفیں کرتے اور صاحبانِ فہم آپکے کمالات کے معترف ہوتے تھے۔

لیکن دُنیا کا قاعدہ ہے کہ جب کسی لائق فرد کے کمالات کا اعتراف کیا جانے لگا۔ اور اُسکے علمی و ادبی کارنامے محبّت کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے تو بعض حلقوں سے فوراً اُس کے خلاف حسد کی نمایش کا آغاز ہوگیا۔ اور اُس کے کمال کے آفتاب پر خاک ڈالی جانے لگی۔ کیونکر ممکن تھا کہ حضرتِ شاد حاسدوں کی آنکھوں میں نہ کھٹکتے۔ ابتدا میں ان لوگوں نے آپکی شاعری کو حاسدانہ نکتہ چینیوں سے مٹانا چاہا لیکن یہ کوشش بیکار تھی حقیقی کمال ان اوچھے حربوں سے نہیں دَبتا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ جو پہلے شاد کے کلام کی خوبیوں کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے تھے وہ بھی اپنی روش بدلنے پر مجبور ہوئے اور اس شاہ سخن نے دشمنوں سے بھی خراج تحسین وصول کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاد نے اُردو شاعری کی تجدید میں کافی حصہ لیا ہے اور بہت کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ آپ غزل گوئی میں جس طرح اُستاد یگانہ تھے اُسی طرح مرثیہ گوئی میں بھی فرد فرید تھے۔ گلشن غزل کا یہ باغبان لالہ زار مرثیہ کی بھی آبیاری کرتا تھا اور دونوں بہارستانوں کی سیر میں مشغول رہتا تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ میر انیس مغفور جب عظیم آباد کی مجلس پڑھنے آتے اور اُن کے کلام کے شیدائی جمع ہوکر داد دیتے تو حضرت شاد کی زبان سے جو شائستہ الفاظ نکلتے میر صاحب اُن کی دل سے قدر کرتے تھے۔

حضرت شاد کی شاعری مجازی حسن وعشق کے چوچلوں کی تصویر کشی نہیں کرتی۔ اُس کا روئے سخن عشق حقیقی کی طرف ہوتا ہے

آپ کے کلام کے خزانہ میں اخلاق، فلسفہ، تصوف، توحید، ہر طرح کے خوش آب جواہر موجود ہیں تخئیل و محاکات بہت زیادہ ہیں تغزل میں میر کے انداز پائے جاتے ہیں مرثیہ میں مضمون آفرینی، سلاست بیان، فصاحت، چستی، بندش، صفائی، لب ولہجہ حد درجہ قابل داد ہے۔

آپ جس پایہ کے شاعر تھے۔ اُسی پایہ کے نثار بھی تھے۔ اُردو کا سب سے پہلا اخلاقی ناول "صورت الخیال" مشتمل بر حصص آپ ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس ناول کی ہندوستانی اور انگریزی اخباروں نے بہت کچھ تعریفیں کی ہیں۔ اسکے علاوہ آپ کے تصنیفات کی فہرست بہت سی فارسی اور اُردو کی عمدہ مصنفات پر مشتمل ہے۔

آپ نے ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر چند دلپذیر اشعار کہہ کر ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھیجے تھے انھیں یہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ مدت تک شاہی محل میں آویزاں رہے اور خصوصیت سے ملکہ نے ان اشعار کے شکریہ کا خط آپ کو لکھا۔

سنہ ۱۹۰۸ء میں حکومت کی طرف سے آپ کو "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا تھا اور بتیس ۳۲ برس تک آپ مکمل اختیارات کے ساتھ آنریری مجسٹریٹ اور چودہ برس تک میونسپل کمشنر رہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر تھا۔

آپ کی سیرت نہایت عمدہ تھی۔ عادات و اطوار میں پرانی شرافت کے آثار پورے طور سے نمایاں تھے۔ آپ کے خیالات میں وسعت تھی، رواداری آپ کا مخصوص شیوہ تھا۔ دوست دشمن کے ساتھ یکساں ملتے اور حافظ شیرازی کا یہ شعر ہر وقت پیش نظر رکھتے تھے۔؎

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف است　　　با دوستان تلطف با دشمنان مدارا

اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ شاد مرحوم نے اپنی شاعری کے معجزوں اور دوسری بیش بہا تصنیفوں کے ذریعہ سے ملک اور ابنائے وطن کی جو خدمتیں کی ہیں وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔

افسوس کہ ۷ جنوری سنہ ۱۹۲۷ء کو اس چہکتے ہوئے بلبل کی زبان بند ہوئی اور دنیا جن زمزموں کو کان لگائے سن رہی تھی اُن سے وہ یک بیک محروم ہوگئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

آپ کا کچھ کلام ہدیۂ ناظرین ہے:۔؎

نہ پوچھو شان اپنے میکدہ کی　　　یہاں ہر مغبچہ پیر مغاں تھا
کریں جاکر کہاں یارب بسیرا　　　گئی وہ شاخ جس پر آشیاں تھا
بچھا کر جو گیا بستر پہ کانٹے　　　وہی ظالم مرا آرام جاں تھا
دل مضطر کا شکوہ کیا کروں شادؔ　　　کہ دشمن تک ہمارا رازداں تھا

ستم ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا　　　زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا
خیال وصل کو اب آرزو جھولے جھلاتی ہے　　　قریب آنا دل مایوس کے پھر دور ہو جانا
سبو ساقی کا ہو ساقی کی میکش کی رہے زندہ　　　ستم ہے دوسرے کے مال پر مغرور ہو جانا

دے کے تہی سبو مجھے صبر کا حوصلہ دیا
جس کی طلب تھی ساقیا اُس سے کہیں سوا دیا

بیٹھے بٹھائے باغ خلد مجھکو یہیں دکھا دیا
اُسکی زباں پہ میں نثار جس نے ترا پتا دیا

مل نہ گیا ہو ساقیا دُرد کہیں زلال سے
مجھکو دکھا کے جام مے تو نے عبث ہلا دیا

بخش دیا تھا عشق کو صبر گریز پا اگر
حُسن کو تو نے کس لئے غمزۂ دلربا دیا

چارہ گر کون مانے ہے چارا کس کا؟
آپ تو اپنا سہارا ہے سہارا کس کا؟

یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا
ہنسے گئے خود اس چمن پہ غنچے زمانہ آئے نہ ذرا منہ کا

کسیکو آب و ہوا موافق ہوئی نہ افسوس اس چمن کی
ہمیشہ مرغ چمن کو لہکے ہمیشہ غنچوں نے خون تھوکا

جو دل سے دنیا کو چھوڑ بیٹھے انہیں کے تھے مستقل ارادے
جو اسکی جانب سے منہ کو پھیرا تو پھر نہ اس بیوفا کو تھوکا

پکار کر چشم گل سے کہہ دو بہار کے دن بھی ہیں غنیمت
قبا کے دامن کو ٹانک تو لیں اگر نہ موقع ملے رفو کا

فلک پہ رنگ شفق کو دیکھو بھگو دیا اشکوں سے شاد دامن
جما ہوا خوں اسے سمجھ لو کسی کی نازک رگ گلو کا

کٹے تیغ سے بھی اگر گلا ترے ظلم کا نہ کروں گلا
کہوں وجد میں یہی برملا کہ انا الشہید بہ کربلا

ترا نور جب ہے ہوا عیاں ہوا آشکار جو تھا نہاں
چمک اٹھے دشت و جبال و در و تشعشعا متزلزلا

مرا سر ہے جو سر سناں مرا تن ہے خاک پہ خونچکاں
لب زخم سے یہ کروں عیاں کہ انا قتیل محمدا

رہ عشق میں جو رکھا قدم چلے اس طرح سے بخوف غم
چلیں حاج جیسے سوئے حرم متساعیاً متہرولا

جو رضا تری ہے تو شکر اسکا ہی تو سکون صبر میں اسکے گل
ہے عجیب چیز نہاں غم نہ ہمیں کو شاد مگر بھلا

مری عمر شاد تمام تر اسی گو مگو میں ہوئی بسر
نہ کلام کرنے سے غم گھٹا نہ خموشیوں سے کٹی بلا

محو ہیں اپنی جگہ آسودگان کوئے دوست
آرزو دل میں ہے دل آنکھوں میں آنکھیں سوئے دوست

زندگی تا چند محراب دعا میں کاٹیے
کاش اک دن کھینچ کر چھوڑے خم ابروئے دوست

نکلے آتے ہیں زمیں سے پھول کس کس رنگ کے
شعبدے دکھلا رہی ہے نرگس جادوئے دوست

لاشۂ عریانِ عاشق کا کوئی دیکھے وقار
ڈھانکتی ہے اُٹھ کے کس الفت سے خاکِ کوئے دوست

دیکھئے کب ہو پذیرا ہم گنہگاروں کی عرض
داغ بھرے ہاتھوں کے اوپر ہیں نظر ہی سوئے دوست

دہر میں کیا کیا ہوئے ہیں انقلاباتِ عظیم
آسماں بدلا زمیں بدلی نہ بدلی خوئے دوست

شاد اہلِ شماتت یہ نہیں شک میں پڑے رہ جائینگے
ہم انہیں آنکھوں سے اک دن دیکھ لینگے روئے دوست

سر پہ کلاہ کج دھرے زلف دراز خم بہ خم
آہوئے چشم ہے غضب ترکِ نگاہ ہے ستم

عشوۂ دلگداز وہ ذبح کرے جو بے چھری
ناز وہ دشمنِ وفا رحم کی جس کو ہے قسم

وقتِ عزیز جو گیا اُس کا محال ہے وجود
جتنے زمانے طے کئے طے ہوئی منزلِ عدم

نرگسِ پرخمار یار کرتی ہے کام زہر کا
بادۂ خوشگوار میں گھول دیا کسی نے سم

نہ آئینے کا قصہ اور نہ حالِ شانہ کہتے ہیں
حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

ہنسانا اور رُلانا بیوفا دنیا کی خصلت ہے
ہم اس انداز کو اندازِ معشوقانہ کہتے ہیں

ازل سے اپنی گردن پر ہے احساں اپنے چلو کا
خدا جانے کسے ساغر کسے پیمانہ کہتے ہیں

انہیں غزلوں پہ حال آتے ہیں میخانے میں رندوں کو
انہیں شعروں کو میکش نعرۂ مستانہ کہتے ہیں

چھپاؤ لاکھ پر صورت پرستی سے نہیں خالی
جو ہیں اہلِ نظر کعبہ کو بھی بتخانہ کہتے ہیں

تعلق لاکھ ہو پھر بھی جہاں سے بے تعلق ہیں
اسی کو تیرے عاشق ہمتِ مردانہ کہتے ہیں

بسے ہیں کیسے کیسے ذی شرف گورِ غریباں میں
بڑے بے درد ہیں بستی کو جو ویرانہ کہتے ہیں

ناز کرشمہ ساز کیوں غمزۂ دلنواز کیوں
سب تو ہیں تیرے مبتلا اس پہ یہ امتیاز کیوں

ہم سے اگر ہوا نہ ضبط ہم نے کیا جو کچھ کیا
ہم پہ اگر نہ تھا وثوق ہم سے بیانِ راز کیوں

قامتِ فتنہ خیز کو خواہشِ حشر کس لئے
بازوئے تو کی فکر میں نرگسِ نیم باز کیوں

شاد سخن کی جان ہے بادۂ نغمۂ سرور
آپ تو شعر کہتے ہیں آپ کو احتراز کیوں

نہ میری قبر پہ جب بے نقاب آنے لگے — چراغ جتنے لحد پر تھے جھلملانے لگے
وہ نیم جاں ہمیں مقتل میں چھوڑ کر جو چلے — ہزاروں وسوسے کم بخت دل میں آنے لگے
اثر اب اس سے زیادہ وفا کا کیا ہوگا — قسم ہماری محبت کی لوگ کھانے لگے
بہت دنوں پہ جو محشر میں وہ نظر آئے — سب اپنی اپنی کہانی انہیں سنانے لگے
بروز حشر بڑھا یہ جلالِ حسن اُن کا — کہ انبیائے اُلوالعزم تھرتھرانے لگے
انیس سے بھی سخن سنج نے ثنا کی شاد — یہ چند شعر جو مونس کو ہم سنانے لگے

ترے میہماں ہیں جہاں بٹھا سرِ عرش روئے زمیں سہی
ہمیں بیٹھ رہنے سے کام ہے کوئی جا نہیں تو نہیں سہی
ہمہ شب زخیل کروبیاں رسد ایں صدائے پہیمنے
کہ مرے محاسبہ سے ڈرو مری بخششوں کا یقیں سہی
درِ میکدہ کے شگاف سے تجھے جھانک لیں یہی تھی ہوس
یہ نہ ہو تو پھر درِ صومعہ جو قریب ہو تو وہیں سہی
نہ مٹیگی دل سے یہ آرزو کہ لگا کے آنکھوں سے چوم لوں
ترے پاؤں تک نہیں دسترس ترے آستاں کی زمیں سہی
جسے پاک رکھنے کی تھی ہوس وہ تو تیرے در پہ پہونچ گئی
یہ جو مشتِ خاک زمیں پہ ہے اسے پھینک آؤ کہیں سہی
لمعاتُ وَجہِکَ اَشرَقَتْ وشعاعُ طلعتکَ اعتلےٰ
کہ سب اس میں جل کے فنا ہوئے خسِ کفر و خرمنِ دیں سہی
ملے شاد کچھ تو ہمیں مزہ کوئی ماحصل بھی تو شعر کا
جسے جذب کرلے مذاقِ دل نہ مٹھاس ہو نمکیں سہی

دیکھنا غافل ذرا دنیا کو پہچانے ہوئے — کل جو قصے پیش پا تھے آج افسانے ہوئے

ساکنِ شہرِ خموشاں تیرے دیوانے ہوئے | بستیاں سونی ہوئیں آباد ویرانے ہوئے
ہوش جبتک تھے نہ دی ساقی نے بھر بھر کر شراب | میرے بیخود ہوتے ہی لبریز پیمانے ہوئے
کچھ تو راحت دے ہمیں اے گوشۂ تاریک و تنگ | آئے ہیں سارے بیابانِ جنوں چھانے ہوئے
اک یہ دل ہے جسکی حالت آج تک ہے ایک سی | شہر کتنے بس گئے اور کتنے ویرانے ہوئے
دیکھ کر کعبہ کی صورت کیوں نہ حیرت دل کو ہو | کیسے کیسے اے فلک ویران بتخانے ہوئے
دشتِ وحشت میں کسی جانب نظر کرتا نہیں | تیرا دیوانہ چلا جاتا ہے کچھ ٹھانے ہوئے
منزلِ عرفاں سے کوئی مست گزرا ہے ضرور | جا بجا رستے میں کیوں آباد میخانے ہوئے

جب چلے دنیا سے پھر کر ہم نے دیکھا بھی نہ شاد
اقربا کی کیا خطا ہم آپ بیگانے ہوئے

ستم ڈھائیگا کیا حکمت سے مل کر نفس امارہ

(حضرت نجم آفندی۔ اکبر آبادی)

کہا اک مہرباں نے کچھ خبر ہے آپ کو حضرت | بجا رکھا ہے کیا سائنس نے دنیا میں نقارہ
یہ رفتارِ ترقی جانے کس نقطہ پہ دم لے گی | کہ تیغِ دہریت سے دل ہوئے جاتے ہیں چوپارہ
کبھی کا اہلِ مغرب نے خدا کو کر دیا رخصت | مگر مذہب کے پھندے میں ابھی مشرق ہے بیچارہ
بدل جاتی ہے اب انسان کی پیری جوانی سے | ستم ڈھائے گا کیا حکمت سے مل کر نفس امارہ
سنا ہے ایک دن دست و گریباں ہونے والا ہے | فضا میں صانعِ قدرت کے سیارہ سے طیارہ
مسخر حضرتِ انساں نے کی ہیں قوتیں کتنی | تعجب ہے نہ ہو گر حکمت و قدرت میں بٹوارہ
خدا کو آپ مانیں گے کہاں تک دیکھنا یہ ہے | ہمیں تو اب سوا انکار کرنے کے نہیں چارہ

کہا میں نے کہ پیرو آپ کے ہو جائیں گے ہم بھی
مگر جب موت کا موقوف ہو جائے گا ہرکارہ

"پاگل؟"

(سیّد علی عباس صاحب حسینی ایم-اے)

مظفر پاگل ہے۔ یقینی پاگل ہے۔ اسکے پاگل ہونے میں اور لوگ شک کریں تو کریں مگر اُس شخص کو تو مظفر کی دیوانگی کا یقین ہی کرنا پڑیگا جس نے اُسے دن کے دو بجے اور رات کے بارہ بجے چٹیل میدانوں اور سُنسان ویرانوں میں "رُپہلا پانی، سنہرا پانی" گاتے سُنا ہے۔ خود مظفر کو نہ ان فقروں کی مہملیت کا احساس ہوتا ہے اور نہ اپنی آواز کی عدم موسیقیت کا۔ وہ گھنٹوں جھوم جھوم کر "رُپہلا پانی، سنہرا پانی" کہتے سے ملتی جلتی آواز میں اس خوش الحانی سے گایا کرتا ہے کہ بھولے بھٹکے راستہ چلنے والے کانوں میں اُنگلیاں دے لیتے ہیں۔ اور آس پاس کی ہری ہری گھاس چرنے والے چوپائے بھڑک کر دور بھاگ جاتے ہیں۔

اسکی وضع قطع بھی پاگلوں کی سی ہے۔ سر اور داڑھی کے لمبے لمبے بالوں میں مَنوں گرد بیٹھی ہوئی۔ بڑی بڑی خون کبوتر آنکھوں میں کیچڑ بھری ہوئی اور موٹے موٹے ہونٹوں کی باچھوں میں کف کی دھڑی جمی ہوئی ہے۔ سر پر میلی چکٹ ٹوپی۔ بدن میں لمبا متعفن کُرتا۔ اور ٹانگوں میں موٹا مارکین کا پائجامہ ہے جسکی بھی یہ حالت کہ گھٹنوں تک ہر وقت کیچڑ میں اٹا رہتا اور اکثر ٹخنوں سے نیچا ہو کر موزے کا کام دیتا ہے۔ پاؤں میں جوتا خواہ نیا ہو یا پرانا۔ چپڑا ضرور کر دیا جاتا ہے اور اسے اس طرح زمین پر کھینچا جاتا ہے جیسے راہ چلنا اور جھاڑو دینا دونوں کام بہ یک وقت ضروری ہیں۔ بھلا ان باتوں کے بعد کون کہیگا کہ مظفر پاگل نہیں ہے؟ سارا گاؤں اسے پاگل سمجھتا اور پکارتا ہے۔ آپ بھی یہی کہینگے اور یہی سمجھیں گے۔ مگر..... مگر مظفر کی ماں ہر شخص سے لڑنے کے لئے تیار ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ وہ اُسکی آنکھوں کا تارا، زندگی کا سہارا ہے۔ نہ شوہر زندہ ہے، نہ بھائی اور نہ دوسرے اعزا۔ نہیں یہ درست نہیں۔ اعزا ایسے اعزا جن سے اُس سے خونی رشتہ ہے ضرور زندہ و سلامت ہیں۔ دیور بھی ہے بھاوج

بھی۔ بھائی کے لڑکے بھی ہیں اور بہن کی اولاد بھی۔ ہاں مگر ایسا عزیز جو اس بیوہ کے دُکھ درد میں شریک ہو۔ جو اس سے یہ پوچھے کہ "بی بی تمہارے دل پر کیا گزرتی ہے۔ تم اپنے دن کیسے کاٹتی ہو" کوئی نہیں۔

اسی لئے اُس کی ساری دُنیا سمٹ کر مظفر میں محدود ہو گئی ہے۔ وہی اُسکی ساری کائنات ہے۔ پیری اور بیوگی۔ اپنی کوکھ کا پیدا۔ اُسی طرح گود کا پالا اور کھلایا ہوا جس طرح دنیا جہان کے بیٹے ہوتے ہیں۔ وہ بیٹے بھی جو ماں باپ کو سونے چاندی کے محلوں میں رکھتے ہیں۔ اور وہ فرزند بھی جو بیویوں کے کہنے میں آکر والدین کے جنازے کو کاندھا تک نہیں دیتے۔ پھر بھلا مظفر کو دیکھکر اس بڑھیا کی چھاتی مامتا سے کیوں نہ پھٹنے لگے؟ اور وہ اسے پاگل پکارنے والوں کو کیوں نہ پانی پی پیکر کوسے؟

اور بھئی ایمان ہے تو جہان ہے۔ مظفر سب کے لئے پاگل ہو تو ہو۔ مگر اپنی بیوہ ماں کے لئے تو وہ ہزاروں "ہشیاروں" سے اچھا ہے۔ جہاں ماں نے کوئی کام بتایا اور وہ سر آنکھوں سے اُسے بجا لانے کے لئے دوڑا۔ اور حرف حرف پورا کیا۔ کیا مجال کہ ذرا سا فرق تو ہو جائے۔ مینہہ پڑتا ہو، یا اولے گرتے ہوں۔ گرمیوں کی دوپہر ہو یا جاڑوں کی رات۔ گاؤں ہی میں کام ہو یا دو چار کوس کے فاصلے پر۔ مظفر اس وقت تک دم نہیں لے سکتا ہے جب تک کہ ماں کا حکم نہ پورا ہو جائے!

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مدتوں کے وطن آوارہ جب مکان پلٹتے ہیں تو مظفر کی ماں بیٹے سے سلام کہلا بھیجتی ہے۔ مظفر ڈیوڑھی میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ چیخ چیخ کر نام لیتا جاتا ہے اور "اماں نے سلام کہا ہے، اماں نے سلام کہا ہے" کی رٹ اُس وقت تک جاری رکھتا ہے جب تک کہ مخاطب صحیح سامنے نہ آجائے اور اسے جواب سلام نہ دیدے۔ لوگ ایسا بھی کرتے ہیں کہ مظفر سے غلط طور پر یہ کہہ دیتے ہیں کہ "بھیا وہ اس وقت یہاں نہیں ہیں" وہ ذرا کھانس کر پوچھتا ہے "اماں نے اُن کو سلام کہا ہے۔ کہاں ہیں؟" پھر اگر کسی دوسرے گاؤں سے متعلق کوئی کام ہوا کہہ دیا "فلاں گاؤں گئے ہیں" مظفر فوراً وہاں جانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ جب دو چار قدم چل لیتا ہے تو دھوکا دینے والا جلدی سے کہتا ہے "ہاں

تو مظفر تم وہاں جا ہی رہے ہو ذرا یہ کام بھی کرتے آنا" مظفر غریب محض ماں کا سلام پہونچانے کے لئے کوس دو کوس کے فاصلے پر دوسرے گاؤں تک ضرور چلا جاتا ہے اور خواہ پیامبری کے فرائض نہ ادا ہوں اور اسے مایوس واپس آنا پڑے لیکن بیوقوف بنانے والے کا کام تو انجام پا جاتا ہے۔ یقینی حد درجہ حماقت۔ سادگی اور دیوانگی ہے مگر——— مگر!———

ایک بار برسات میں جب کہ ندی نالے۔ دریا سب کے سب اُمڈے ہوئے تھے اور پانی ہفتوں سے متواتر برس رہا تھا کسی شادی کے سلسلے میں مظفر کی ماں کو ایک جگہ برادری میں جانا تھا۔ شادی بیاہ کا معاملہ تھا۔ نئے کپڑے اور نیا جوتہ ہونا چاہئے۔ کپڑے تو خیر بکس میں موجود تھے مگر جوتہ کیونکر آئے؟ کئی وقت فاقے کئے گئے اور "اِن سے اُن سے" قرض اُدھار لیکر دام جمع ہوئے پانی الگ دم لینے نہ دیتا تھا۔ انتظار ہونے لگا کہ وہ رکے تو مظفر شہر بھیجا جائے اور جوتہ آئے۔ خدا خدا کر کے ساتویں دن تھوڑی دیر کے لئے بالکل اس طرح کھل گیا جیسے کوئی غمزدہ روتے روتے تھک کر چپ ہو جاتا ہے۔ بڑی بی جلدی سے ہمسائی سے اُنکی جوتی مانگ لائیں اور اسے مظفر کو دکھا کر بولیں "دیکھو بیٹا! یہ جوڑا ہمسائی کے میاں سوا دو روپے میں شہر سے لے آئے ہیں۔ تم بھی وہاں سے جا کر میرے لئے خرید لاؤ"

مظفر نے ہمسائی کی جوتی اُلٹ پلٹ کر دیکھی۔ اپنے پائجامے کو ٹخنوں کے پاس سے موڑ کر گھٹنوں تک چڑھایا۔ ماں سے روپے لیکر ازار بند میں باندھے اور کئی گرہیں دے کر ازار بند کمر میں کھونس لیا ——— کھانستا، تھوکتا اور "سہرا پانی، پہلا پانی" گاتا ہوا گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

تین کوس کی مسافت پیدل طے کرنا تھی، وہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے کر ڈالی۔ شہر میں داخل ہوا۔ ہر دکان پر خواہ وہ میوہ فروش کی ہو یا ترکاری بیچنے والے کی۔ پوچھتا چلا "اماں نے جوتہ مانگا ہے تمہارے پاس ہے؟" کوئی اُسکی صورت دیکھتا اور چپ رہ جاتا۔ کوئی شائستگی سے سیدھا سادا جواب دیدیتا۔ مگر بعض شریر دیوانہ سمجھ کر پھبتیاں بھی کستے۔ فقرے بھی چست کرتے اور چھیڑ بھی دیتے۔ جب کوئی بہت سختی سے ڈانٹتا تو یہ نہایت سادگی سے کہتا "ارے بھائی کاہے کو خفا ہوتے ہو۔ اماں نے کہا ہے۔ جوتہ لیں گے!" اور زیر لب کچھ بڑبڑاتا آگے بڑھ جاتا!۔

آخر کار ایک جوتوں کی دوکان مل ہی گئی۔ وہاں بھی یہی سوال کیا گیا۔ دوکاندار نے

اسکی صورت پر نظر کی۔ پھر پوچھا "دام لائے ہو" مظفر نے جلدی سے دام ازار بند سے کھول کر دکھا دیئے۔ اُس نے بھی جوتے دکھانا شروع کئے۔ مگر پاگل سمجھ کر ایک کا ڈیڑھ مانگتا۔ مظفر کہتا "نہیں یہ ویسا نہیں جیسا اماں نے مانگا ہے! یہ تو مہنگا ہے" بارے اسیطرح کا ایک جوڑہ دکھائی دیا جیسا کہ بی ہمسائی کا تھا مظفر نے جلدی سے اُسے آگے گھسیٹ لیا اور اُسکے وحشت زدہ چہرے پہ مسرت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ دکاندار کو وہی سوا دو روپے جو گھر سے لیکر چلا تھا جلدی سے نکال کر دیئے۔ اُس نے کہا "ڈھائی سے کم نہ لونگا۔ لینا ہو تو لو ورنہ دوسری دکان دیکھو!" مظفر نے خوشامد شروع کی۔ دوکاندار اور بھی اکڑ گیا اور اُس نے جوڑہ بکس میں بند کر کے رکھنا شروع کیا مظفر کو یہ محسوس ہوا جیسے ماں کا محبوب جوتہ کوئی چھینے لیتا ہے۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا کر کہا "دیدو بھیا۔ اماں نے مانگا ہے۔ انکو شادی میں جانا ہے!" دکاندار نے خفا ہو کر سختی سے دھتکارا اور دکان سے نکال دیا۔

مظفر کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ اتنی دوکانوں پر پوچھنے کے بعد وہ جوتہ ملا تھا جو اُسکی "اماں" نے مانگا تھا۔ مگر دوکاندار "بے ایمانی" سے نہ دیتا تھا۔ اب "اماں" کیسے شادی میں جائینگی! برادری والے کیا کہینگے۔ سب سمجھینگے سوا دو روپیہ والا جوتہ نہ پہن سکیں۔ لوگ ذلیل کرینگے۔ ماں کی اس طرح کی رسوائی ہو اور مظفر دیکھے یہ ناممکن تھا! مگر یہ دوکاندار کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ نہ یہ بات ذہن میں آئی کہ دوسری دوکانیں دیکھے۔ اور نہ یہی کہ گھر پلٹ جائے۔ ماں نے جو جوتہ مانگا تھا وہ اسی دوکان پر موجود تھا۔ وہ سامنے ہی بکس میں رکھا تھا۔ اُسے کیونکر چھوڑ کر جا سکتا تھا؟ ماں کو کیا جواب دیگا؟ بے بس ہو کر وہیں سڑک پہ دوکان کے سامنے بیٹھ گیا۔ سارا دن بیٹھا رہا۔ دھوپ تھی اور اس طرح کی تیز دھوپ جس میں ہرن کالے ہوتے ہیں مگر اُسے نہ تمازت آفتاب کی پرواہ تھی اور نہ جلتی ہوئی سڑک کی۔ اسکی "اماں" والا جوتہ سامنے دوکان میں رکھا تھا۔ اس پر نظر جمی تھی۔ اس جوڑے کو کسی نے اب تک خریدا نہ تھا۔ اسے کوئی چھوتا نہ تھا۔ اتنا ہی تسکین کے لئے کافی تھا۔ ہر گھنٹے دو گھنٹے پہ دوکاندار سے لجاجت سے کہتا "اماں کا جوتہ دیدو" اور جب وہ ڈانٹ دیتا تو چپ ہو جاتا۔ دوکان پہ گاہک آتے۔ نئے نئے جوڑے دیکھتے۔ دام چکاتے۔ پیسے دیتے اور جوتے کا

بکس بغل میں دبا کر چلے جاتے تھے۔ یہ اسی طرح ٹکٹکی باندھے اُسی ڈبّے کو دیکھ رہا تھا جس میں "اُس کی امّاں" کا جوتہ رکھا تھا!۔

دن ڈھلنے لگا۔ دیہاتی اور قصباتی سودا سلف خرید چکے تھے۔ ایک ایک دو دو کرکے گھر جانے لگے۔ مظفر اسی طرح سڑک پر بیٹھا تھا کہ ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ابر محیط آیا۔ برق چمکی اور رعد نے گرج کر بادلوں کا جگر پانی کر دیا۔ موٹی موٹی بوندیں گرنا شروع ہوگئیں۔ سڑک سے لوگ بھاگنے لگے۔ جن کے پاس چھتریاں تھیں اُنہوں نے چھتریاں کھول لیں۔ جن کے پاس برساتیاں تھیں اُنہوں نے برساتیاں پہن لیں اور ہر ایک لمبے لمبے قدم رکھتا جائے پناہ ڈھونڈھنے لگا۔ مظفر بھی گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر جاتا کہاں؟ سامنے ہی دوکان میں تو اُسکی ماں کی پسند والا جوتہ رکھا تھا۔ زمین نے پاؤں پکڑ لئے۔ مظفر نے دوکاندار کو بڑی لجاجت سے دیکھا اُس نے منہ پھیر لیا۔ معلوم ہوا مظفر کی ٹانگوں کی طاقت دفعتہً سلب کر لی گئی، بعد سے پھر سڑک پر بیٹھ گیا۔ ہوا اور تیز ہوئی۔ ہر قطرہ اب جسم پر تیر کی طرح آکر لگنے لگا۔ مگر مظفر پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اسے تو جوتے کی دُھن لگی تھی۔ اس پر باد وباراں کا کیا اثر۔ ہوا اور تیز ہوئی۔ اور انڈے کے برابر اولے "پڑ۔ پڑ۔ پڑ۔ پڑ" گرنے لگے۔ ہر ایک مظفر کے سر و سینہ پر اس طرح آکر لگتا جیسے کوئی پتھر کھینچ کھینچ کر مار رہا ہو۔ مگر وہ ستون کی طرح اپنی جگہ قائم رہا۔ ماں کا جوتہ سامنے تھا۔ اسی دوکان میں!۔ اسے نہ ہوا ہلا سکتی تھی اور نہ پانی اور اولے اس پر اثر کر سکتے تھے!۔

وہ اسی طرح دوکان کے سامنے سڑک پر بیٹھا رہا۔ سارے کپڑے بھیگ گئے۔ سردی کے اثر سے دانت بجنے لگے۔ مگر جوتوں پر سے نگاہ نہ ہٹی بیکسی اور لجاجت سے اسکے بکس کو دیکھا کیا یہاں تک کہ اولے بھی رُکے۔ پانی بھی کُھلا اور پھر سڑک پر آمد و رفت جاری ہوگئی۔ دوکاندار نے آخر عاجز آ کر اپس بلایا۔ سوا دو روپے لئے اور اُس کی ماں کا جوڑہ حوالے کر دیا!۔

مطلع صاف تھا۔ ابر کے ٹکڑے ہوا کے دوش پر مشرق سے مغرب جا چکے تھے۔ مگر ہوا میں اب تک سردی بہت کافی تھی۔ مظفر کے سر و سینہ پر اس نے اثر کیا۔ جوڑ جوڑ میں درد ہونے لگا۔ دن بھر کے فاقے سے چکر بھی آنے لگا۔ مگر ماں کا فدائی نئے جوڑے کو سینے سے لگائے کھانستا تھوکتا اور "رہیلا پانی، سنہرا پانی" گاتا لمبے لمبے قدم رکھتا گھر کی سمت چلا جا رہا تھا!۔

ہاں ہاں مظفر پاگل ہے یقینی پاگل ہے اس لئے...... اس لئے کہ جب وہ اس طرح وحشت زدہ کیچڑ میں لت پت گھر میں داخل ہوا تو اُس نے اُس سوا دو روپیہ کے جوتے کو اس مسرت اور انبساط سے ماں کی خدمت میں پیش کیا گویا وہ اس بیوہ کے لئے ایک سلطنت جیت کر لایا ہے اور اسکی ماں اپنے لعل کا متعفن سر سینہ سے لگائے، اُسکے اُلجھے خاک آلودہ بال اپنی سوکھی اُنگلیوں سے برابر کرتی رہی اور تیل کی جگہ اُن پر اپنی بے نور آنکھوں سے آنسو ٹپکا کر بار بار "میرا دیوانہ! میرا دیوانہ! اپنی زبان سے کہتی رہی!!

"مجلۂ مکتبہ"

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ ہے جو دارالسلطنت حیدرآباد (دکن) سے ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں زیر ادارت جناب محمد عبدالقادر صاحب سروری ام، اے - ال، ال، بی - ہندوستان کے مشاہیر اہل قلم کی بہترین علمی اور ادبی کاوشوں سے مزین ہوکر شایع ہوتا ہے - اس میں خاصان ادب کے لئے ادبیات عالیہ اور محققانہ مقالے، اور لطیف مذاق کے لئے ادب لطیف کے دلچسپ اور چٹ پٹے مضامین کا ذخیرہ وسیع بوقلمونیوں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے حسب ضرورت عکسی تصویریں بھی شایع کی جاتی ہیں -

یہ مجلہ دنیائے صحافت میں اپنے رنگ کا اکیلا ہے جو سالانہ للعہ اور ششماہی عہ چند کی قلیل رقم میں سال بھر تک اپنی گوناگوں علمی دلچسپیوں اور سنجیدہ مسائل سے علم و ادب کی خدمت کریگا - اگر آپ کو اتنے سستے اور مفید و دلچسپ و بلند پایہ مجلہ کی خریداری منظور ہے تو براہ کرم ایک کارڈ لکھ کر کارپردازان رسالہ کو اپنی سرپرستی سے نوازیئے - اور اسکے مقاصد کی توسیع اور استقلال اغراض میں حصہ لیکر علم پروری کا ثبوت دے دیجئے -

کتابت و طباعت دیدہ زیب - حجم کم از کم (۶۴) صفحے - نمونہ کا پرچہ ۶/

منتظم مجلہ مکتبہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ - اسٹیشن روڈ - حیدرآباد دکن

تبصرہ

حیاتِ جلیل

فاضل محترم سید مقبول احمد صاحب مقبول صمدنی نے یہ کتاب لکھ کر اُردو زبان پر خاص احسان کیا ہے۔ کہنے کو تو یہ حضرت علامہ شہیر میر عبدالجلیل بلگرامی کی سوانح عمری ہے لیکن حقیقت میں معلومات کا ایک بہت بڑا گنجینہ اور اٹھارویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے تمدنی حالات اور سیاسی انقلابات کا آئینہ ہے۔ اصل کتاب میں تو مصنف علام نے غیر معمولی محنت کی ہے لیکن حواشی میں اس سے بھی زیادہ داد تحقیق دی ہے۔ کتاب میں جتنے لوگوں اور جتنے شہروں کے نام آگئے ہیں اُنکے متعلق سیکڑوں حاشیے اِس تحقیق اور اس تفصیل سے لکھے گئے ہیں کہ مصنف کی وسعت نظر، استقلال مزاج اور ذوق تجسس پر حیرت ہوتی ہے۔ انہیں حاشیوں نے کتاب کو جغرافی، تاریخی اور سوانحی حالات کا خزانہ بنا دیا ہے۔

آج کل ایسے کتاب سازوں کی کمی نہیں ہے جو بے سروپا باتوں کا طومار باندھ کر مصنفوں کی فہرست میں شامل ہو جانا چاہتے ہیں لیکن حقیقت میں تصنیف و تالیف کا حق حضرت مقبول ہی کے سے فاضل بزرگوں کو پہنچتا ہے جو اس اہم کام کی ذمہ داریوں کو بخوبی سمجھتے ہیں اور تحقیق و تلاش کی دشوار گزار منزل میں تھکنا جانتے ہی نہیں۔ موصوف کی زیر تبصرہ کتاب پر بھی اگر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے تو تحقیق کی کمی کا نہیں بلکہ زیادتی کا۔

معنوی خوبیوں کے علاوہ لفظی محاسن کے اعتبار سے بھی یہ کتاب ادبِ اُردو میں بلند پایہ رکھتی ہے۔ اسکی عبارت عالمانہ متانت اور شاعرانہ شگفتگی کا دلکش مجموعہ ہے۔ جن لوگوں نے فاضل اور زندہ دل مصنف کی زیارت کی ہے اُن کو تو تحریر میں محرر کی تصویر نظر آتی ہے۔

ہم حضرت مصنف کو ایسی قابل قدر عالمانہ تصنیف پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

کتاب دو حصوں میں شائع ہوئی ہے۔ مجموعی حجم پانچ سو صفحے سے زائد اور قیمت صرف ۳ روپے ہے۔

ملنے کا پتہ یہ ہے:۔ رام نراین لال کتب فروش۔ الہ آباد۔

(سید مسعود حسن رضوی۔ ادیب۔ ایم۔ اے)

''داغ''

(حضرت راز بلگرامی)

یہ داغ سینۂ عاشق کی یادگار ہوا
یہ داغ زخمِ تمنا کا سوگوار ہوا

یہ داغ دل کے لئے باعث حیات ہوا
یہ داغ سجدۂ آدم کی کائنات ہوا

یہ داغ حُسن ہے دامان و آستیں کے لئے
یہ داغ شان ہے اک قشقۂ جبیں کے لئے

یہ داغ پھولوں میں بدنام عاشقی نکلا
یہ داغ لالہ میں انجام عاشقی نکلا

یہ داغ میری سیہ بختیوں کو پیارا ہے
یہ داغ میری شب غم کا ایک تارا ہے

نشانِ حد ہے یہ دنیاء آرزو کے لئے
یہ داغ شمع ہے منزل کی جستجو کے لئے

یہ دودِ آہ ہے عاشق کے دُکھ بھرے دل کا
یہ اک چراغ ہے بجھتا سا میری محفل کا

نویدِ وادیِ ایمن کی داستاں بن کر
چمک اُٹھا کفِ موسیٰ میں بجلیاں بن کر

مٹا سکے نہ جسے کوئی یہ وہ دھبا ہے
یہ تیرہ بخت محبت کی ایک دنیا ہے

نگاہِ حسن اسے کعبۂ جہاں سمجھی
جبینِ عشق اسے سنگِ آستاں سمجھی

یہ رنگ لائیگا رنگینیٔ وفا بن کر
یہ اور اُبھرے گا اب نقشِ مدعا بن کر

بنا ہوا ہے نشانہ یہ تیرِ قاتل کا
یہ اک نتیجہ ہے عاشق کے خونشدہ دل کا

تمام رازِ نہاں آہِ سوگوار میں ہے
یہ داغ ایک جلے دل کی یادگار میں ہے

خالص اُردو

(حضرت آرزو لکھنوی)

ہوگئیں کیاریاں ہری جیسے کہ رُت پلٹ چلی
کون یہ مسکرا دیا ہنسنے لگی کلی کلی

کھلنے کی آس میں یہاں ڈال گئے تھے اک کلی
رو کے اُٹھا رہے ہیں آج پنکھڑیاں ملی دلی

تاروں کو دیکھتے ہیں سب اور یہ دیکھتا ہوں میں
آئی کہاں سے یہ چمک کس کی ہے یہ جھلاجھلی

سب سے بڑا ہوا تھا دن آئے تھے دیکھنے سبھی
آنکھیں جو چوندھیا گئیں مچ گئی جیسے کھلبلی

دن کی بھی آس ہے یہاں رات کی مگر چاندنی
کتنی رُتیں پلٹ گئیں ڈال کبھی نہ یہ پھلی

چاہ کے ساتھ جی کی تھاہ پائی ہے اور نہ پاؤ گے
ایک ہے دوسرے کا آڑ دونوں ہیں یُیں گھلی ملی

دن جو پہاڑ سا بھی ہے رات سے ہے ملا ہوا
اُٹھ کہ سماں ایا ورہے جو نہ کہ دھوپ ڈھل چلی

آنکھ میں اور دھیان میں لاگ کے ساتھ بیر ہے
پاس ہیں دونوں بتیاں ایک بجھی کہ اک جلی

اُس کے لئے کہ آرزو ہنستا ہوا تھا ساتھ ساتھ
ڈھونڈھ تھکا ہے ہر کہیں بن بن چھان پھر اگلی گلی

غزل محترمہ نور جہاں آرزو بنت مرزا علی محمد خاں مرحوم و مغفور سابق وائس چانسلر بمبئی یونیورسٹی

شب فراق کا کچھ ماجرا سنو تو سہی
کسی کے دل پہ گزرتی ہے کیا سنو تو سہی

شکن جبیں پہ ہے کیوں کیا ہوا سنو تو سہی
بتا بھی دو مجھے میری خطا سنو تو سہی

کبھی حکایتِ اہل وفا سنو تو سہی
کسی کے عشق میں ہوتا ہے کیا سنو تو سہی

ہمیں سے آنکھ چرانا تھا سائے مقتل میں
ادھر بھی تیغ سنبھالو ذرا سنو تو سہی

جفا کی مشق ہو لیکن وفا کے پردے میں
کہے نہ خلق تمہیں بیوفا سنو تو سہی

نشانہ تیر جفا کا جسے بنایا تھا
وہ آج تم پہ فدا ہو گیا سنو تو سہی

یہ دیکھنا ہے کہ سوتے ہو چین سے کیونکر
مری زباں سے مرا ماجرا سنو تو سہی

کسی کے غم کی کہانی عجب کہانی ہے
خدا کے واسطے تم بھی ذرا سنو تو سہی

کہاں کا غم ہے جو کڑھتی ہو نازؔ تم دن رات
یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں کیا ہوا سنو تو سہی

غزل حضرت رمز تلہری

اپنا افسانہ تھا اور آپ سُنایا نہ گیا
ہم سے ہنستی ہوئی دنیا کو رُلایا نہ گیا

غیرتِ عشق کو مانع نہ ہوئی سطوتِ حسن
سر جھکایا تھا مگر ہاتھ بڑھایا نہ گیا

رکھ لیا حشر کا پردہ مری بربادی نے
یوں مٹا تھا کہ قیامت سے اُٹھایا نہ گیا

اللہ اللہ تری بارگہ حُسن کی شان
آنکھ اُٹھائی نہ گئی پاؤں بڑھایا نہ گیا

دل کو سمجھا کے اُٹھائے گئے بستر اپنا
ظلم جب آپ کے درباں کا اُٹھایا نہ گیا

عشق کیا ہم کو ترے حسن کی عزت تھی عزیز
غیر کے در پہ سرِ سجدہ جھکایا نہ گیا

میں گنہگار الٰہی مجھے دوزخ بھی قبول
مجھ سے لکھا ترے ہاتھوں کا مٹایا نہ گیا

حشر میں آئے ہیں ہنستے ہوئے وہ دل والے
جن سے دُنیا میں کسی دل کو دُکھایا نہ گیا

شمع جلتی رہی آغوش میں پروانوں کے
اُس کو ان سوختہ بختوں سے بجھایا نہ گیا

رمز کچھ سوچ کے ہم پی گئے آنسو شبِ غم
خونِ دل دیدہ و دانستہ بہایا نہ گیا

غزل رگھوپتی سہائے صاحب فراق ایم اے، گورکھپوری

نکلا تو ہوں بچا کے میں برقِ نظر تری
لیکن مٹا کے رکھ دے اگر رہگذر تری

اک وقت ہوگا ہم سے جو دیکھا نہ جائیگا
ہم جانتے ہیں اے شبِ ہجراں سحر تری

موجِ ہوا کے ہاتھ میں ہے دامنِ بہار
سر پیٹتا ہے کوئی کھڑا راہ پر تری

کیفیتوں میں ڈوبی ہوئی اے نگاہِ مست
کیا رکھیں تیرے دیکھنے والے خبر تری

ناکامیاں ملی ہیں کچھ اے جلوہ گاہِ ناز
ہم تیرہ بخت آئے تھے اُمید پر تری

کچھ لٹ کھڑا رہی ہے نسیمِ بہار بھی
اُٹھتی چلی ہے سوئے گلستاں نظر تری

یہ سوز و ساز اے غمِ ہستی ترے نثار
تصویر ہو کے رہ گئی شمعِ سحر تری

صبحِ شبِ فراق ہوئی۔ اور ابھی فراق
بیٹھا ہے اپنے گھر کو کئے رہگذر تری

غزل حضرت میرزا ثاقب لکھنوی

شامِ فراق کچھ نہیں آتا نظر مجھے
چھپ کر جلائیں کیوں مرے داغِ جگر مجھے

برسوں سے شامِ ہجر ہے کحلِ بصر مجھے
دیکھی تو تھی پہ یاد نہیں ہے سحر مجھے

چپ رہتا قیدِ غم میں مگر میرے ہمصفیر
کرتے ہیں محوِ نالہ کشی چھیڑ کر مجھے

تم دُور ہو تو کس لئے دل میں مقام ہے
میں پاس ہوں تو کیوں نہیں اپنی خبر مجھے

بگڑا ہے حسن و عشق کے ہاتھوں نظامِ دہر
بیجا خیال ہے اُدھر اُن کو ادھر مجھے

نقشِ قدم میں نقشِ وفا دیکھ دیکھ کر
کرتی ہے یاد کھو کے مری رہگذر مجھے

قائل ہوں میں کہ محفلِ تقدیر تھی جواد
حصّہ ملا سبھوں کو خوشی کا مگر مجھے

پردے سے باہر آگیا اب زندگی کا راز
دیکھو تو دیکھ جاؤ کبھی اک نظر مجھے

دل والے جانتے ہیں مگر کہ رہا ہوں میں
تڑپا رہی ہے شدّتِ دردِ جگر مجھے

کیا قبر پر جلائے ہیں احباب نے چراغ
اس سمت سے تو کچھ نہیں آتا نظر مجھے

درباں کی نظر میں ہوں میں اجنبی تو کیا
مدّت سے جانتا ہے ترا سنگِ در مجھے

کیا جانوں کوئی کُند چھری تھی کہ اور کچھ
اک چیز ذبح کرتی رہی رات بھر مجھے

غربت میں راہ کٹتی ہے ثاقب مرے سبب
قصّہ سمجھ رہا ہے مرا ہمسفر مجھے

(قطعہ از ممدوح صدر)

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

برگشتہ ہوئی دنیا رسم و رہِ الفت سے
اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

آثارِ ادبیّہ

(پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے)

ادب کے گذشتہ پرچہ میں "آثار ادبیہ" کے تحت میں ایک منقبت شایع ہوئی تھی اُسکے ہر شعر سے زبان کی قدامت ظاہر ہوتی تھی اور نظم کے آخر میں شاعر کا تخلص نہیں بلکہ پورا نام "قاسم علی خاں" بھی موجود تھا پھر بھی بعض حضرات اُس منقبت کو میری تصنیف سمجھے۔ ایسے خوش فہموں کو قصیدۂ ذیل کے عنوان کی عبارت کے یا دوہ شاید یہ بتا دینا ضرور ہے کہ قصیدہ میرا کہا ہوا نہیں ہے عنوان کی عبارت بھی میری نہیں کاتب قصیدہ کی ہے اور بجنسہٖ نقل کر دی گئی ہے۔ ادیب۔

قصیدہ منہ تصنیف نادر علی نادر فی المنقبت نواب مستطاب معلّی القاب فلک جناب عرش آشیاں ثریا مکاں، دارادرباں، سلیماں شاں اعنی نواب شمس الدولہ[1] بہادر دام اقبالہٗ

سو گیا شب کو جو بستر غم میں لاچار
حرص کہتے ہیں جسے مجھکو جگا وہ ایکبار

بیٹھ بالیں کے مرے پاس یہ بولی مجھ سے
اُٹھ کھڑا ہو تو شتاب اس گھڑی اے دل افگار

قطع اوّل سُن کے یہ میرا سوال اب مجھے دے اسکا جواب
جھوٹ مت بولیو پر مجھ سے سچ سچ اقرار

کیا کرے مجھ سے اگر ہو تو امیر الامرا
مجھکو کیا دیوے کرے تجھکو جو خالق سرکار

کیا عجب ہے کہ تو ہو مالکِ گنج قارون
اور ترے ساتھ وہ ہو فوج نہ جسکا ہو شمار

گھوڑے وہ ہوویں ترے گھر جو سنے ہوں نہ کہیں
دیکھے جو کوئی تو وہ نہیں ہوویں گے وہ نقش دیوار

باد پا کہئے اُنھیں یا کہ چھلاوا کہئے
چلتے تو دکھیں نظر آئے نہ پھر انکا غبار

فیل وہ ہوویں سواری کو مہیا تیری
پیل تن سے نہ ہو وصف جنھوں کا اظہار

کہئے وصف انکے کیا یا حوضوں کی خوبی کہئے
یا چلن انکا بیاں کیجے اب یا رفتار

خیمے وہ ہوویں ترے گھر جو نہ دیکھے نہ سُنے
لا دیئے گر تو فلک سے نہ اُٹھے انکا بار

بیٹھے اُن خیموں میں تو مسند زریں پہ جب
دیکھئے اس گھڑی نادر ترا آکر دربار

بیٹھتے کتنے ہیں بن تیرے مصاحب سدم
کتنے رہتے ہیں کھڑے پیش نظر خدمتگار

---

[1] شمس الدولہ خطاب تھا نواب سعادت علی خاں فرمانروائے اودھ کے منجھلے بیٹے احمد علی خاں کا۔ ان کی قابلیت اور حسن انتظام کی بنا پر سعادت علی خاں نے ان کو اپنا ولی عہد قرار دیا تھا لیکن نواب کے انتقال کے بعد رزیڈنٹ نے اُنکے بڑے بیٹے غازی الدین حیدر کو تخت پر بٹھا دیا۔ ادیب

کون ہے ان میں دُرِ بحرِ سخندانی اور　　پڑھتا نادر کے ہے دیوان کے چیدہ اشعار
عظمِ شاں جب کہ یہ اللہ کرے تجھکو نصیب　　مجھ سے کس طرح تو پیش آویگا بتلا اے یار
تجھ سے یہ عرض ابھی سے میں کئے رکھتی ہوں　　کیجو نائب مجھے اور آپ تو بنیو مختار
قطع دوم　گفتگو حرص کی یہ سُن کے کہا تب میں نے　　ہٹ مرے سامنے سے مجھکو ہے تجھ سے انکار
میں نہیں حارص نہیں جو حرص ہو مجھ پر غالب　　حرص کے نام پہ میں مارتا ہوں سو پیزار
خوف کھاتا ہوں خدا کا جو نہیں کچھ کہتا　　میل زر دل لیتی ہے باتیں نہ بنا اے مُردار
طعن کیونکر نہ کروں تجھ پہ سہ حرفی ہے تو　　دیتی جُل آکے عبث مجھکو ہے تو اے کفتار
رکھتا وہ آقا ہوں اس کے وہ دنیا پر ہیں　　اُنکی تفصیل ہے تو سُن تو کروں میں اظہار
وہ جو آقا ہے بڑا میرا امامِ کونین　　پدرِ حضرتِ حسنین و حبیبِ غفّار
شان میں جسکے یہ مطلع ہے رقم نادر کا　　طبعِ رنگین کے پڑھنے کو بخطِّ گلذار
مطلع دوم　ہے علی رونقِ اشجار و علی برگ و بار　　ہے علی زینتِ گلزار و علی کلکِ بہار
رکنِ دیں جانِ نشیں قوتِ جبریلِ امیں　　حضرتِ احمدِ مختار کے گھر کا مختار
صاحبِ تیغِ دو سر معرکہ آرائے نبرد　　فاتحِ قلعۂ خیبر شہ ذی عز و وقار
میرِ میدانِ وغا بیشۂ جرأت کا شیر　　سب میں مشہور وہ کرار ہے غیر فرار
بحرِ الفت سے نکال اور کوئی مطلعِ نو　　نادر اب لینا اگر ہے تجھے دُرِ شہوار
مطلع سوم　اُسکی میں ہمتِ عالی کو کروں کیا اظہار　　بات میں بخش دے سائل کو جو اونٹوں کی قطار
قطع سوم　حاسدوں کا ابھی اکبار زحل سو ٹکڑے　　اُسکی گر تیغ کی لاؤں میں زباں پر گفتار
برش اسکی ہے عیاں ماہ سے تا ماہی　　ایسی تلوار ہی دیکھی نہیں اے خورد و کبار
ذکرِ انساں کا تو کیا کوہ پہ گر جا بیٹھے　　تو نکل جائے وہ یوں جیسے کہ صابن سے تار
دست جس کا کہ ید اللہ کہاوے یارو　　تیغ سے مانگیں پناہ اسکی نہ کیونکر کفار
کیا حق نے ہے اُسے عقدہ کشائے عالم　　کہتی ہے قوم نصیری اُسے اللہ پکار
وصف جس سرورِ دیں کے یہ سنائے میں نے　　کافی اُسکی مجھے عقبیٰ کے لئے ہو سرکار
لاکھ ہونگا میں گنہگار وہ بخشائے گا　　رکھتا یہ اُس سے توقع ہوں میں در روز شمار
دشمن اُسکے جو ہیں لعنت ہوں میں اُن پر کرتا　　کہتا رحمت ہوں محبوں کو میں اُنکے ہر بار

خواہشِ دیں تو ہوئی خواہشِ دنیا بھی سن | مختصر کہتا ہوں ہو طول سخن سے بیزار
وہ جو آقا مرا چھوٹا ہے برب الکعبہ | کیا کہوں کیسا سخی ہے وہ حبیب غفار
کہتے ہیں شمس و قمر تک اُسے شمس الدولہ | خور ہی ساں نام بھی روشن ہے بہر شہر و دیار
وصف میں اُسکی سخاوت کے پڑھوں وہ مطلع | نام حاتم کوئی لے پھر نہ زباں سے زنہار

مطلع چہارم

صاحبِ جود و سخا جیسا ہے وہ عالی مقدار | خلق خالق نے کیا ہی نہیں کوئی لے یار
کب ہے لاحول و لا ہمتِ حاتم ایسی | آ تو اس صاحب ہمت سے کرے چشم دوچار
جتنے جو مانگا کیا وہی عنایت اُس نے | جو لیا جس نے، کہا "لیجئے" حاضر تیار
جس سے وعدہ کرے کیا خلف ہو وہ ایفا | ذکر کیا کرکے جو اقرار کرے وہ انکار
سن کے جود اسکی نکلتا ہی نہیں کان سے لعل | اس لئے بخشش کسی کو وہ نہ دے بے تکرار
فیض پر آتا ہے جس وقت وہ خورشید سخا | لعل کر دیتا ہے پتھر کو نظر کر ایکبار
باغ جنت میں بنے اسکے لئے ہیں ایواں | بے سخاوت بھی وہاں ہوتے مکاں ہیں تیار
آبرو بخشے صدف کو جو نہ وہ ابر کرم | ہووے پیدا نہ کبھی اُس میں سے دُرِ شہوار
شمس وہ یں کا ہی کیونکر نہ فلک اُس پہ کرے | روز خورشید کے بھر تھال میں زر اُس پہ نثار
گر شجاعت کا کروں ذکر میں اُس اشجع کی | آب ہو جائے ابھی زہرۂ رستم ہزار
تیغ جب قبضہ میں گہتا ہے وہ عالم کی پناہ | کیا کہوں ہوتا ہے کیا گرم اجل کا بازار
بادپا کی کہوں کیا اُسکے میں اب چالاکی | ہے ہوا کے تئیں ساتھ اُسکے پہنچنا دشوار
یوں زمیں سے وہ فلک سیر اڑا ہے بہ فلک | مردماں جیوں ہو نظر شیشۂ عینک کے پار
یہ ہلال اُسکی ہے نعلِ سُمِ توسن کا نقش | ہیں وہ میخوں کے نشاں جو کہ ہیں اختر لے یار
اُسکا مداح کہاتا ہوں جہاں میں اللہ | جسکے اوصاف حمیدہ کئے ہیں اظہار
جس کا اس طرح کا ہو صاحب ہمت آقا | اُسکو کاہے کے لئے ہووے گا پھر کچھ درکار
کون سی چیز میسر ہے نہیں اب مجھ کو | چاہتا جو ہوں وہ دیتا ہے مجھے بے تکرار
ایسا مستغنی الاحوال جو ہووے اے حرص | تو ہی بتلا کہ وہ کاہے کو حرص بیکار

قطع چہارم

ہاں جو خواہش ہے مری تو یہی خواہش ہے مری | وہ جو آقا ہے مرا عزت اعزاز و وقار
نکلے اُن ہاتھیوں پہ بیٹھ سوار اب جو فیل | شان و شوکت میں فلک سے ہو [illegible]

شرق اور غرب کو اک لحظہ میں کر ڈالیں طے
باد پا ایسے ہوں جن گھوڑوں پہ وہ ہو وے سوار

بیٹھے اُن خیموں میں جا کر وہ امیر الامرا
پال جن آگے کھاوے فلکِ کج رفتار

فوج وہ اُسکے ہو ہمراہ نہ ہو جسکی حد
گنیئے تو ہو سکے اُس فوج کا ہرگز نہ شمار

ہو سلامی کو کھڑی باندھ کے وہ صف جبدم
خلق کی چشم میں آ جائے نظر ابرِ بہار

روز و شب توسنِ خامۂ وہ اُسکا رواں
جو پیادہ نظر اُسکی پڑے ہو جائے سوار

یا الٰہی ہو زیادہ اس سے بھی اُسکا رتبہ
فضل سے اپنے تو رکھ شاد اُسے لیل و نہار

ہو وے اُس صاحبِ ہمت کی سلیماں سی شان
جاہ و حشمت میں ہو وہ جم کی طرح وہ سردار

دور اُس نخلِ سخاوت سے رہے بادِ خزاں
باغِ ہستی میں یونہیں وہ رہے اُسپہ بہار

تا رہے جان جہاں میں رہے وہ جانِ جہاں
مجھ سے عاصی کی دعا کر یہ قبول اے غفار

اُسکی ایسی ہو مبارک اُسے یہ عید الفطر
دور تا فاقہ کشی ہو یہ مری اے دادار

قطعہ پنجم

اور خواہاں میں کسی چیز کا اُس سے ہوں نہیں
چاہتا ہوں تو یہ ہوں چاہتا میں دل افگار

زاد و رہ ایسی کرے مجھکو عطا اب وہ سخی
دیکھوں جا روضۂ شبیر کو چھوڑ اپنا دیار

قطعہ ششم

اور جو اس عرض کو سمجھے وہ سخن ہائے فریب
تو قسم کھاتا ہوں اُسکی برسولِ مختار

ہوتی تن پروری منظور جو اپنی مجھ کو
یوں نہ لے سکتا تھا لاچاری سُنا میں لاچار

عرض جو کرتا کہ میں جاتا زیارت کو ہوں
دیجئے کچھ مجھے اے دین نبی کے دیندار

قطعہ ہفتم

بخدا سچ یہ مری عرض ہے اے میرے کریم
جھوٹ مت اسکو سمجھ تو بخدا اے غفار

جو عطا کرنا ہو سو جلد عطا کر مجھ کو
مت لگا دیر کہ ہوتا ہے مرا آخر کار

قطعہ ہشتم

طالبِ شاہِ اُمم طالبِ شہ ہوتے نہیں
طالبِ شاہ کو یہ فقر نہیں ہے درکار

کر روا مجھ سے گدا کو تو نہ طالبِ شہ سات
بے وساطت شہ دیں کا مجھے دکھلا دربار

حسب دلخواہ مری آرزو یہ تو بر لا
پھر ارواحِ نبیؐ دیر نہ کر اب زنہار

ہو گا اے شاہ شہاں تجھ کو بڑا اجر عظیم
میں اگر جا کے بنا سبطِ نبیؐ کا زوار

قطعہ نہم

اختصار آگے کر اب طولِ سخن کو نادر
یہ قصیدہ ہے کہ عرضی ہو دیا ہو طومار

رکھ لے قرطاس پہ خامہ کو دعا کر یہ رقم
تا قیامت تو سلامت رکھ اسے یا ستار

سمن بنابر انفصال مقدمہ

(آرڈر ۵ - قاعدہ ۱ و ۵)

نمبر مقدمہ ۱۸۱۸ سنہ ۱۹۳۰ء

بعدالت جناب خانصاحب سید اظہار حسن صاحب ایم اے، ایل ایل بی اسپشل منصف محلہ چاپ شہر الہ آباد

جنگی لال ولد گنگئی قوم کلوار ساکن محلہ موٹی گنج شہر الہ آباد .... مدعی

بنام

ہیرا ولد بندا قوم دھوبی ساکن حال نمبر ۳۴ مولا علی کی درگاہ شہر کلکتہ .... مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے آپ کے نام ایک نالش بابت ماعہ کے دائر کی ہے۔ لہذا آپ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ بتاریخ ۸ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء وقت دس بجے دن کے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حالات سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جسکے ساتھ کوئی اور شخص ہو کہ جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہوں اور جوابدہی دعوے کی کریں۔ اور ہرگاہ وہی تاریخ جو آپکے احضار کے لئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس آپ کو لازم ہے کہ اُسی روز اپنے جملہ گواہوں کو جن کی شہادت پر و نیز تمام دستاویزات کو جن پر آپ اپنی جوابدہی کے تائید میں استدلال کرنا چاہتے ہوں پیش کریں۔ آپکو اطلاع دیجاتی ہے کہ اگر بروز مذکور آپ حاضر نہ ہونگے تو مقدمہ بغیر حاضری آپکے مسموع اور فیصل ہوگا۔

بثبت میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۹ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء جاری کیا گیا۔

دستخط حاکم — یعقوب حسین پیشکار — مہر عدالت

سمن بغرض انفصال مقدمہ

(آرڈر ۵- قاعدہ ۱ و ۵)

ابتدائی مقدمہ خفیفہ نمبر ۱۷۳ سنہ ۱۹۳۰ء-

بعدالت جناب سید حسن ارشاد صاحب بہادر بی اے- ایل ایل بی- جج خفیفہ مقام اکبرپور ضلع فیض آباد-

جگیشر کورمی ولد بھکیا کورمی ساکن موضع پورہ پرتن پرگنہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد . . . . . . مدعی

بنام

بھگوتی مصر ولد روپی مصر ساکن موضع مکندا پور پرگنہ ٹانڈا ضلع فیض آباد . . . . . . مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت دلاپانے مبلغ ۱۸/۔ کے دائر کی ہے لہذا تمکو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ سولہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء بوقت دن کے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جسکے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعوی مدعی مذکور کی کرو- اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمہارے احضار کے لئے مقرر ہے- واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے- پس تمکو لازم ہے کہ اپنے جواب دعوی کی تائید میں جن گواہوں کی شہادت پر یا جن دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو اسی روز ان کو پیش کرو-

مطلع رہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہوگا-

آج بتاریخ گیارہ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا-

مہر عدالت   دستخط حاکم بخط انگریزی

سمن بنا بر انفصال مقدمہ

(آرڈر ۵ - قاعدہ ۱ و ۵)

نمبر مقدمہ ۱۷۸۴ سنہ ۱۹۲۹ء

بعدالت جناب جان صاحب سید اظہار حسن صاحب ایم اے - ایل ایل بی اسپشل منصف محلہ چاک شہر الہ آباد

بابادین ولد بالادین قوم بقال ساکن موضع سرائے نیب پرگنہ چائل ضلع الہ آباد .... مدعی

بنام

میوہ لال ولد دوارکا قوم کلوار ساکن موضع باون پرگنہ چائل ضلع الہ آباد حال مقیم دوکانداری آبکاری بلدی بازار ڈاکخانہ و اسٹیشن انوپ پور ریاست ریواں .... مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے آپکے نام ایک نالش بابت ۔۔۔ کے دائر کی ہے - لہذا آپ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ بتاریخ ۸ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء وقت دس بجے دن کے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حالات سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کُل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جسکے ساتھ کوئی اور شخص ہو کہ جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہوں اور جوابدہی دعوی کی کریں - اور ہرگاہ وہی تاریخ جو آپکے احضار کے لئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس آپ کو لازم ہے کہ اسی روز اپنے جملہ گواہوں کو جنکی شہادت پر و نیز تمام دستاویزات کو جن پر آپ اپنی جوابدہی کے تائید میں استدلال کرنا چاہتے ہوں پیش کریں - آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگر بروز مذکور آپ حاضر نہ ہونگے تو مقدمہ بغیر حاضری آپ کے مسموع و منفصل ہوگا -

بثبت میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۹ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء جاری کیا گیا -

مہر عدالت — یعقوب حسین پیشکار — دستخط حاکم

سمن بنا بر انفصال مقدمہ

(آرڈر ۵ - قاعدہ ۱-۵ د)

نمبر مقدمہ ۳۱۶۸ سنہ ۱۹۳۰ء

بعدالت خان صاحب سید اظہار حسن صاحب ام اے ایل ایل بی اسپشل منصف محلہ چاک شہر الہ آباد

روڑکی انجینیرنگ ورکس بذریعہ پنڈت رامیشر پرشاد شکل ساکن نمبر ۱۲ کیننگ روڈ شہر الہ آباد مدعی

بنام

جگ جیون داس رئیس ٹانڈا ساکن قصبہ ٹانڈا ضلع فیض آباد .... مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے آپکے نام ایک نالش بابت ۱۰ عہ ۳/۶ کے دائر کی ہے لہذا آپ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ بتاریخ ۸ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء بوقت دس بجے دن کے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حالات سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے - یا جسکے ساتھ کوئی اور شخص ہو کہ جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہوں اور جوابدہی دعوی کی کریں - اور ہرگاہ یہی تاریخ جو آپ کے احضار کے لئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس آپ کو لازم ہے کہ اُسی روز اپنے جملہ گواہوں کو جن کی شہادت پر و نیز تمام دستاویزات کو جن پر آپ اپنی جوابدہی کے تائید میں استدلال کرنا چاہتے ہوں پیش کریں - آپ کو اطلاع دیجاتی ہے کہ اگر بروز مذکور آپ حاضر نہ ہونگے تو مقدمہ بغیر حاضری آپ کے مسموع اور فیصل ہوگا -

بثبت میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۹ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء جاری کیا گیا -

دستخط حاکم	یعقوب حسین پیشکار

مہر عدالت

عورتوں کی ماہواری کی شکایت کیلئے
شربت مفید النساء
بہت مفید دوا ہے
ماہواری کی شکایت جب کسی عورت کو ہوتی ہے تو بدن سوکھنے لگتا ہے۔ سر میں درد۔
پیڑو میں درد۔ کمر میں درد۔ اور ہاتھ پیر کے جوڑ میں تکلیف
معلوم ہوتی ہے۔ بدن میں سستی اور چہرہ پر پیلاپن آجاتا ہے۔ مگر بے زبان عورتیں شرم سے کچھ کہہ نہیں سکتی ہیں
جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ مرض جڑ پکڑ لیتا ہے اور بیماری بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ جب یہ حالت عورت کی ہو تو آپ
شربت مفید النساء عورتوں کی تندرستی قائم رکھنے کی لاجواب دوا ہے۔ استعمال کرائیں۔
ماہواری اگر تھوڑا آتا ہو۔ یا زیادہ ہوتا ہو یا بالکل بند ہوگیا ہو یا باقاعدگی سے دو ایک مہینہ آکر پھر
بند ہوگیا۔ الغرض شربت مفید النساء تمام شکایت کو جڑ سے نکال دیگا۔
ماہواری قاعدہ کے مطابق ہونے لگے گا۔ بدن میں پھرتی آجائیگی چہرہ گلاب پھول کی طرح تازہ
ہوجائیگا۔ قیمت فی شیشی دو روپیہ آٹھ آنہ۔ محصول علاوہ
سیکڑوں میں سے ایک تازہ سرٹیفکیٹ ملاحظہ فرمائیے
جناب ڈاکٹر محمد علی صاحب جہلم سے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ ایک شیشی شربت مفید النساء منگائی ہے
جس سے بہت ہی فائدہ ہوا ہے۔ آپ کی دوا واقعی مفید ثابت ہوئی ہے۔ مہربانی فرما کر دو شیشی
شربت مفید النساء اور روانہ فرمادیں۔ ممنون و مشکور ہونگا۔
سفید بال کو دو منٹ میں سیاہ کردینے والا
رجسٹرڈ
مشکی خضاب
ہیئر ڈائی
قیمت فی شیشی آٹھ آنہ
ایک سفوف صرف ٹھنڈے پانی میں گھول کر لگائیے
مشکی خضاب صرف ۲ منٹ میں دودھ جیسے سفید بال کو اصلی سیاہ بالوں کے مثل کالا کردیتا ہے۔ اسکے لگانے میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہے صرف ایک پوڈر ٹھنڈے پانی میں گھول کر لگالیں۔ اسکا رنگ چھ سات روز تک قائم رہیگا۔ اور اس خضاب کے لگانے سے چہرے پر داغ۔ دھبہ نہیں آتا ہے۔ بڑی خوبی یہ کہ اس میں سے مشک کی خوشبو آتی ہے۔ قیمت فی شیشی آٹھ آنہ محصول علاوہ۔
پتہ ایس۔ آئی۔ بی بخشی اینڈ کمپنی کوٹھی نمبر ۷ کولوٹولا اسٹریٹ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۱ کلکتہ

"ادب"

مرتبہ

سید اعظم حسین

جلد ۲ بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء نمبر ۱۲

پروفیسر لیمونٹ نے حال میں اُن ساٹھ مغربی ناولوں کی فہرست شایع کی ہے جو اُن کے خیال میں غیر فانی ہیں۔ چونکہ ناظرینِ "ادب" میں اکثر حضرات ایسے ہیں جو انگریزی سے واقف ہیں اس لئے اِس فہرست کا شایع کرنا کچھ بیجا نہ ہوگا۔ وہ حسب ذیل ہے:-

(۱) فیلڈنگ "ٹام جونس" سنہ ۱۷۴۹ء
(۲) گوئٹے "ولیم میسٹرس اپرنٹس شپ" سنہ ۱۷۹۶ء
(۳) آسٹن "پرائڈ اینڈ پریجوڈس" سنہ ۱۸۱۳ء
(۴) اسکاٹ "گائی مینرنگ" سنہ ۱۸۱۵ء
(۵) اسکاٹ "ہارٹ آف مڈلوتھین" سنہ ۱۸۱۸ء
(۶) کوپر "لاسٹ آف دی موہیکنس" سنہ ۱۸۲۶ء
(۷) منزونی "دی بیٹروتھڈ" سنہ ۱۸۲۷ء
(۸) ہیوگو "نوٹرڈیم" سنہ ۱۸۳۱ء
(۹) ہیوگو "لی مزریبل" سنہ ۱۸۶۲ء
(۱۰) بیلزک "پیرے گوریٹ" سنہ ۱۸۳۴ء
(۱۱) بیلزک "کزن بیٹی" سنہ ۱۸۴۶ء
(۱۲) گوگول "ڈیڈ سولز" سنہ ۱۸۴۲ء
(۱۳) ڈوما "تھری مسکیٹیرس" سنہ ۱۸۴۴ء
(۱۴) برونٹے "جین آئر" سنہ ۱۸۴۷ء
(۱۵) برونٹے "وَدرنگ ہائٹس" سنہ ۱۸۴۷ء
(۱۶) تھیکرے "وینیٹی فیر" سنہ ۱۸۴۸ء
(۱۷) تھیکرے "ہنری اسمنڈ" سنہ ۱۸۵۲ء
(۱۸) ڈکنس "ڈیوڈ کوپر فیلڈ" سنہ ۱۸۵۰ء
(۱۹) ڈکنس "گریٹ اکس پکٹیشن" سنہ ۱۸۶۱ء
(۲۰) ہاتھورن "اسکارلٹ لٹر" سنہ ۱۸۵۰ء
(۲۱) میلولی "موبی ڈک" سنہ ۱۸۵۱ء
(۲۲) فریٹاگ "ڈبٹ اینڈ کریڈٹ" سنہ ۱۸۵۵ء
(۲۳) فلوبرٹ "میڈم بوویری" سنہ ۱۸۵۷ء
(۲۴) فلوبرٹ "سلیمبو" سنہ ۱۸۶۲ء
(۲۵) الیٹ "ایڈم بیڈ" سنہ ۱۸۵۹ء
(۲۶) ریڈ "دی کلاسٹر اینڈ دی ہرتھ" سنہ ۱۸۶۱ء
(۲۷) ٹرگنیو "فادرس اینڈ سنس" سنہ ۱۸۶۲ء
(۲۸) ٹالسٹائی "وار اینڈ پیس" سنہ ۱۸۶۹ء
(۲۹) ڈوسٹفسکی "کرائم اینڈ پنشمنٹ" سنہ ۱۸۶۶ء
(۳۰) ڈوسٹفسکی "برادرز کرامازوو" سنہ ۱۸۸۰ء

(۳۱) ٹالسٹائے "وار اینڈ پیس" ۱۸۶۹ء
(۳۲) ٹالسٹائے "اناکرنینا" ۱۸۶۹ء
(۳۳) جیمس "دی امریکن" ۱۸۷۷ء
(۳۴) ہارڈی "ریٹرن آف دی نیٹیو" ۱۸۷۸ء
(۳۵) ہارڈی "ٹس آف ڈی اربرولی" ۱۸۹۱ء
(۳۶) میریڈتھ "دی اگوئسٹ" ۱۸۷۹ء
(۳۷) زولا "ژمین" ۱۸۸۰ء
(۳۸) فرانس "کرائم آف سلوسٹر بونارڈ" ۱۸۸۱ء
(۳۹) ٹوین "ہکلبری فن" ۱۸۸۴ء
(۴۰) ہولس "رائز آف سائلس لیپہیم" ۱۸۸۵ء
(۴۱) سدرمین "ڈیم کیر" ۱۸۸۷ء
(۴۲) ورگا "ہاؤس بائی دی میڈلر ٹری" ۱۸۹۰ء
(۴۳) لیگرلوف "گوسٹا برلنگس ساگا" ۱۸۹۴ء
(۴۴) مین "بڈنبروک" ۱۹۰۱ء
(۴۵) رولینڈ "جین کرسٹوفی" حصہ اول ۱۹۰۴ء
(۴۶) کونریڈ "نوسٹرومو" ۱۹۰۴ء
(۴۷) وہارٹن "ہاؤس آف مرتھ" ۱۹۰۵ء
(۴۸) بینٹ "اولڈ وائیوز ٹیلس" ۱۹۰۸ء
(۴۹) ڈریزر "جینی گرہارٹ" ۱۹۱۱ء
(۵۰) پراؤسٹ "سوانس وے" ۱۹۱۳ء
(۵۱) لارنس "سنس اینڈ لورز" ۱۹۱۳ء
(۵۲) موگھم "آف ہیومن بونڈیج" ۱۹۱۵ء
(۵۳) نکسو "پلی دی کونکرر" ۱۹۱۶ء
(۵۴) کیبل "جرگن" ۱۹۱۹ء
(۵۵) واسرمن "ورلڈس الیوزن" ۱۹۲۰ء
(۵۶) ہمسن "گروتھ آف دی سوائل" ۱۹۲۰ء
(۵۷) انڈسیٹ "دی برائڈل ریتھ" ۱۹۲۱ء
(۵۸) گالسورڈی "دی فورسائٹ ساگا" ۱۹۲۲ء
(۵۹) گلاسگو "بیرن گراونڈ" ۱۹۲۵ء
(۶۰) زویگ "کیس آف سرجنٹ گریسکا" ۱۹۲۸ء

چونکہ پروفیسر صاحب انگریز ہیں اس لئے فطرۃً انگریزی اور امریکن ناولوں کی تعداد زیادہ ہے پھر بھی انگریزی مصنفین میں سے اکثر کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے مثلاً اس فہرست میں "ایچ جی ولز" "ہچنسن" اور "انتھنی ہوپ" کا نام نہیں دکھائی دیتا۔ امریکن فسانہ نویسوں میں بھی "واشنگٹن ارونگ" کا نام غائب ہے۔ فرانس کے مصنفین میں "اناتول فرانس" کا جو درجہ ہے وہ ظاہر ہے۔ اسکی تصنیفات میں سے صرف "کرائم آف سلوسٹر بونارڈ" کا انتخاب اور اسکی بہترین تصنیف "پنگوئن آئلینڈ" کو چھوڑ جانا حد درجہ ناانصافی ہے۔ جرمن اور اطالوی مصنفین کے ساتھ بھی اسی طرح کی ناانصافی کی گئی ہے۔

باوجود ان معائب کے یہ فہرست پھر بھی بڑی حد تک مکمل ہے۔ اور سوائے دو چار کے

یہ سب کتابیں یقینی غیر فانی ہیں۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ اُردو داں پبلک کے لئے اس فہرست میں سے مزید انتخاب کرکے ان کتابوں کے ترجمے شایع کئے جائیں؟ ہماری دانست میں ہندوستانی اکاڈمی کو اس طرف توجہ کرنا چاہئے۔ اور اس طرح کے ناولوں اور ڈراموں کی ایک فہرست شایع کرنا چاہئے۔ جن کے ترجمے اسکے نزدیک اُردو اور ہندی زبانوں کی ترقی کے لئے مفید ہونگے۔

"ادب" کے خریداروں میں زیادہ تر اصحاب ایسے ہیں جنکی مدت خریداری اسی ستمبر میں ختم ہوجائیگی۔ ان حضرات سے امید ہے کہ وہ "ادب" کو اپنے بابرکت سایہ میں مزید ترقی و سربلندی کا موقع عنایت فرمائیں گے۔ خدا معلوم "ادب" آپ اپنی سفارش ہے یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اسکے مخلص خریداروں کی ہمدردیاں اب تک اسکی بقا کی ضامن رہی ہیں۔ اور جس یگانگی و ہم آہنگی کی بدولت نظام عالم قائم ہے۔ اسی کی ایک جھلک شیرازۂ "ادب" کو انتشار سے بچائے ہوئے ہے۔

ذوق کی پستی یا انصاف کی کمی "ادب" کے پرچوں کو دفتر بے معنی سمجھے تو سمجھے لیکن جہاں تک ارباب نظر کے دیدۂ امتیاز کا تعلق ہے ہم فخریہ کہہ سکتے ہیں کہ ملک کے مستند ادبا و فضلا نے اس ناچیز پرچے کی دل سے قدر فرمائی۔ اور اگر ہم ان بزرگوں کے اُن تمام گرامی ناموں کی نقل شایع کریں جن میں "ادب" کی خدمتوں کا اعتراف کیا گیا ہے تو وہ یقیناً ایک ایسا گراں قدر ذخیرہ ہوگا۔ جو "ادب" کے پرچے کو اشتہاری دنیا میں بھی بہت زیادہ گراں کر دیگا لیکن ہمارا مسلک یہ نہیں ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ

"اہل ہوس کی کشتیٔ دل اومن میں ہے۔ دنیا فریب لذت کام و دہن میں ہے"

"ادب" کی خدمت گذاری اور ہے۔ تجارت کی گرم بازاری اور ہے! اور سچ تو یوں ہے کہ اگر ہم "ادب" کی تجارتی گرم بازاری چاہیں بھی تو ہو۔ اس لئے کہ ہم اشتہاری دنیا سے نابلد ہیں۔ جب تک اسکی منڈی میں جاکر رات دن کی جانفشانی برداشت نہ کی جائے اسکے "گر" سے واقف ہونا دشوار ہے اور بغیر اس واقفیت کے تجارتی دنیا میں سرسبز ہونا معلوم۔ اسی لئے

ہمیں یہ تمنا نہیں ہے کہ ساری دنیا "ادب" کی خریدار ہو جائے اور ہر کس و ناکس اسکے مضامین کو پڑھ کر جھومے۔ ہمیں تو ایسے ہی مختصر لیکن با فہم طبقہ کی ضرورت ہے جسکے افراد ابتک ادب کے حلقۂ ادب میں آ چکے ہیں۔ یہی گروہ ہماری درخواست پر لبیک کہنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اسی سے جو کچھ کہنا ہے کہتے ہیں۔ ؎

کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھکو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے (اقبال)

رسائل کی دنیا میں یہ بھی ایک رسم ہو گئی ہے کہ سال میں کم از کم ایک بار ضرور کوئی خاص نمبر شایع کیا جائے۔ اِس رسم کی پابندی ہم پر بھی فرض ہے اِس لئے ہم نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ جنوری ۱۹۳۱ء کے "ادب" کو امتیازی حیثیت سے نکالیں گے۔ اس سلسلے میں زیادہ مفید و کارآمد تو غالباً وہ پرچہ ہو سکتا ہے جو کسی عنوان کے ماتحت نکالا جائے۔ تمام مضامین اُسی سے متعلق ہوں اور اس طرح اس موضوع پر وہ ایک مستقل کتاب ہو جائے لیکن وقت کی تنگی اور مصروفیتوں کی زیادتی کی وجہ سے اپکے "ادب" کا کوئی نمبر اس طرح کا نہیں نکالا جا سکا۔ جنوری ۱۹۳۱ء کا پرچہ خاص نمبر ہوگا اور اس بنا پر ہوگا کہ اُس کا ہر مضمون بذات خود ایک خصوصیت کا حامل ہوگا مختلف نکات علمی و ادبی گوناگوں لطائف و ظرائف معمول سے کہیں زیادہ صفحات پر بکھیر دیئے جائینگے اور ارباب ادب کو بقدر ذوق لذت یاب ہونے کی دعوت دیدی جائیگی!

بیجا نہیں اگر ہم اس سلسلے میں ملک کے ممتاز صاحبانِ قلم کو خاص طور سے توجہ دلاتے ہوئے عرض کریں کہ "ادب" کے خاص نمبر کو کامیاب بنانا آپ ہی حضرات کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آپ حضرات نے اپنے قیمتی وقت کے کچھ حصہ کو "ادب" کے لئے وقف نہ کیا تو پھر کچھ نہ ہوا۔

ہمیں امید ہے کہ وہ ذرہ نواز بزرگ بھی جو "ادب" کی قلمی اعانت کبھی کبھی کرتے رہتے ہیں، اور وہ کرم فرما اصحاب بھی جو ابتک صرف وعدہ ہی پر ٹالتے رہے ہیں ہماری اس ضروری درخواست کو نظر انداز نہ فرمائیں گے۔

مضامین نظم و نثر ماہ اکتوبر کے آخر تک دفتر میں موصول ہو جانا چاہئے تاکہ ہمیں پرچے کی ترتیب کا موقع مل سکے۔

سلطان ایل تتمش کی سرگزشت

بلبن کی زبانی

(جناب سید حسن صاحب برنی بی اے - ایل ایل بی وکیل ایڈوکیٹ)

بلبن نامہ کا ایک باب

میرا مضمون "بلبن نامہ کی دستیابی" شائع ہونے کے بعد قدرتی طور پر اکثر احباب کو اُس عجیب و غریب کتاب کے مضامین سے واقفیت حاصل کرنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے اس لئے اُس کتاب کے چند دلچسپ مقامات شائع کر دینا مناسب ہے - فی الحال تعلیقات و حواشی اور نقد و تبصرہ سے قصداً محترز رہونگا - اور اُن کے لئے ناظرین کو اصل کتاب کی اشاعت کا انتظار کرنا پڑیگا - البتہ اس دوران میں ناظرین کو کتاب کی نوعیت کا اندازہ اور اس بات پر غور کرنے کا موقع مل جائے گا کہ آیا یہ کتاب بلبن کی تصنیف سے ہے - یا اس بارہ میں کسی شک و شبہہ کی گنجایش ہو سکتی ہے -

"سید حسن برنی"

ایک روز میں سلطان معظم (سلطان شمس الدین ایل تتمش) انار اللہ برہانہ کی خدمت میں حاضر تھا - گرمی کا موسم تھا - چاندنی رات تھی - بادشاہ کوشک فیروزی کی چھت پر سیج پر لیٹا ہوا تھا - اُس نے مجھ سے کہا "اے بلبن! مجھے یاد ہے کہ اُس مغربی سیاح نے جو آج

نماز جمعہ کے بعد ماذنۂ جامع (منارۂ مسجد)[1] کے قریب دستبوس ہوا تھا کیا کہا تھا ؟ "میں نے عرض کیا " خداوند سلطان کی زندگانی دراز ہو ! اُس نے کہا تھا کہ یہ مسجد بالخصوص یہ ماذنہ دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتے، جس طرح کہ خداوند سلطان آج دنیا میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ میں نے اقصائے عالم کا گشت کیا ہے لیکن نہ ایسا عجیب ماذنہ دیکھا ہے نہ ایسا عجیب سلطان۔ ہمارے مُلک میں ماذنے مربع شکل کے ہوتے ہیں، اور قرطبہ اور اشبیلیہ کے ماذنے بہت اچھے ہیں لیکن وہ بھی اسکی خوبیوں کو نہیں پہونچتے "۔

سلطان نے فرمایا " اے طبن ابن میں اپنے خالق کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے اس عجیب ماذنہ کو میرے ہاتھوں پورا کرانے کی توفیق بخشی۔ خدا رحمت کرے فضل ابن ابو المعالی کی روح پر جو ابتدا میں اس ماذنہ اور جامع (مسجد) کا متولی تھا۔ وہ مہندسی اور تعمیرات کے فن میں دُنیا میں اپنی مثال نہیں رکھتا تھا جس وقت دہلی فتح ہو چکی، تو سلطان ہبرور معز الدنیا والدین ابو المظفر محمد بن سام انار اللہ برہانہ نے اِس مسجد اور ماذنہ کی تعمیر کا حکم صادر فرمایا، اور فضل بن ابو المعالی کو اس کام کے لئے انتخاب کیا۔ اُس نے پہلے اسکا ایک نمونہ بنا کر پیش کیا تو سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ اور جب اُس نے اُس کی پیمائشیں بتائیں تو اور بھی حیرت ہوئی لیکن فی الواقع ہندوستان کے سنگ تراش بھی دُنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اُن کے ہاتھوں میں پتھر موم بن کر رہ جاتا ہے۔ کتبہ نگار اور نقاش بھی ایسے ہی فراہم ہو گئے۔ اکثر جہانگرد سیاحوں سے سُنا ہے کہ ایسے کتبے اور نقش و نگار جیسے اس ماذنہ میں کام آئے ہیں روئے زمین کی کسی عمارت میں موجود نہیں۔ اُس کے گرد اسمائے حسنیٰ آیات کلام الٰہی اور القاب سلطانی اس طرح لگائے گئے ہیں کہ اُن سے اسکا جمال اور بھی بڑھ گیا ہے۔

فضل بن ابو المعالی کو اس کے بنوانے میں بڑی شیفتگی تھی۔ گرمی کی کڑی دھوپوں میں بھی وہ آرام نہ جانتا تھا اور ہر گھڑی نگرانی میں ہی مصروف نظر آتا تھا۔ یہاں تک کہ

---

[1] ایل تُتمش کی مراد اس ماذنہ سے قطب مینار ہے۔ ماذنہ کے معنی ہیں اذان دینے کا مقام۔ قدیم منارہ ہائے مسجد اسی کام کے لئے بنائے جاتے تھے۔

اُس کی عبا اور عمامہ پسینے میں تر ہو کر رہ جاتے تھے۔ اسی طرح موسم سرما کی سخت سردی، اور برسات کی بارشیں اُسے اپنے کام سے نہیں روک سکتی تھیں۔ اُس نے بڑا بُردبار اور شگفتہ مزاج پایا تھا۔ وہ پیرمرد کام کرنے والوں پر باپ سے زیادہ مہرباں تھا۔ کبھی کام سے نہیں اُکتاتا تھا۔ اور سب اُس کی وجہ سے اپنے کاموں میں دل و جان سے لگے رہتے تھے۔ اور ہر وقت فضل بن ابوالمعالی متولی ہنستا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

اے بلبن! خداوند مرحوم (سلطان ایبک) کو اس کی بڑی آرزو تھی کہ یہ مازنہ اُسکی زندگی میں ختم ہو جائے لیکن اُسکی حیات نے وفا نہیں کی۔ اور اُس کے سامنے اس کا کام ایک منزل سے آگے نہ بڑھ سکا۔ میں نے اس کام کو جاری رکھا اور تیسرے درجے کے بننے سے پہلے فضل بن ابوالمعالی بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ لیکن اُسکا بنایا ہوا نمونہ ہمارے پاس تھا۔ اور اُسکے خیالات اور منصوبوں سے واقفیت تھی۔ محمد امیر کوہ اور میرے دوسرے ملازموں نے بھی اس کام کو اُسی خوبی اور انہماک کے ساتھ جاری رکھا۔ اس طرح محراب ہائے مسجد اور جملہ درجہائے مازنہ بفضل ایزدی تکمیل کو پہونچ کر اذان و اقامت صلوۃ کے قابل ہو گئے۔

اے بلبن! جیسا کہ تو جانتا ہے، حیات کو دوام نہیں اور موت شاہ و گدا کے لئے یکساں طور پر آنے والی چیز ہے۔ اور بادشاہ بھی اس چند روزہ حکومت کے بعد اُسی چند گز کے گڑھے میں سونے پر مجبور ہے۔ کہاں ہیں سلطان المعظم ابوالمظفر محمد بن سام ناصر امیر المومنین انار اللہ برہانہ، اور خداوند مغفور سلطان قطب الدین ایبک المعزی رحمۃ اللہ علیہ کہاں ہیں اُنکے جاہ و جلال اور تزک و احتشام؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک کہانی تھی، جو صرف لوگوں کی زبان پر رہ گئی ہے۔ یہی دن ہمیں بھی پیش آنے والا ہے۔ ایک دن ہوگا جب لوگوں کی زبان پر ہمارے نام رہ جائیں گے۔ اور ہمارے جسم خاک میں مل چکے ہونگے اور ہماری روحیں اپنے اعمال کی سزا و جزا بھگتنے میں مصروف ہونگی۔ آثار خیر البتہ کچھ عرصہ تک دنیا میں باقی رہ جاتے ہیں۔ اور انہیں کے ذریعہ سے آدمی کا نام تک جاری رہتا ہے۔ لیکن آدمی کے قائم کئے ہوئے آثار کو بھی خود اُسکی طرح ثبات و دوام حاصل نہیں ہے۔ اور ایک وقت وہ بھی مٹ جاتے ہیں۔ لیکن مٹنے سے پہلے وہ لوگوں کے دلوں میں اپنا نقش

چھوڑ جاتے ہیں۔ اور اُس نقش سے وہ تازہ نقوش بناتے رہتے ہیں اور اس طرح اچھے اور نیک کاموں اور عمدہ خیالوں کی سنت ہمیشہ کے لئے جاری ہو جاتی ہے۔ جو آگے بڑھتی رہتی ہے۔

اے بلبن! شاید عبادت الٰہی کے علاوہ حیات انسانی کا یہی مآل ہے، اور اُسکے کاروبار کا یہی منشا، اور بنی آدم کے وجود خاکی کا یہی مقصود، اور انبیا علیہم السلام کی بعثت اور رہادیان دین کے ارشاد و تلقین کی یہی غرض۔"

یہ کہکر سلطان آبدیدہ ہونے لگا۔ میں نے دست بستہ ہوکر عرض کیا "خداوند سلطان کی زندگانی دراز ہو۔ ہر گھڑی خداوند سلطان کے پیش نظر اچھے خیالات اور اچھے کام رہتے ہیں، اور زندگی کی ہر ساعت عبادت الٰہی، حمایت دین، حفاظت و رعایت خلق اللہ اور اشاعت عدل و احسان میں صرف ہوتی ہے۔ خداوند سلطان کے آثار خیر سے ایک جہان مملو ہے، اور کیا کارہائے نیک، اور کیا بناہائے خیر، اور کیا عدل و بخشش، ہر طرح کے آثار حسنہ خداوند سلطان سے یادگار زمانہ ہیں، اور ایک عالم خداوند سلطان کی درازی عمر اور ازدیاد جاہ کے لئے دست بدعا۔ یہ سب امور خداوند عالم کی فلاح دین و دنیا کے ضامن ہیں۔"

سلطان نے کہا "اے بلبن! تو جو کچھ کہتا ہے وہ بیشک تیری نیک دلی اور خلوص کو ظاہر کرتے ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ تو ہمارا بہوا خواہ و جاں نثار بندہ ہے لیکن بخششیں اور کارہائے و بناہائے خیر جن کا تو نے ذکر کیا محض حسن توفیق کا نام ہیں۔ ورنہ اُنکا حقیقی منبع دوسرا ہی ہے۔ خزانۂ شاہی کے تمام مداخل رعایا سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ اور اُنکے حقیقی مستحق بھی وہی ہیں۔ رہا عدل وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز راستہ ہے۔ جسے صرف امداد و فیضان الٰہی سے ہی عبور کرنے کی امید کی جاسکتی ہے۔ ورنہ اس گذار میں خطرہائے کثیر پیش آتے ہیں، اور اُن مہالک سے صحیح سالم نکل جانا بسا اوقات قوت بشری سے بالا ثابت ہوتا ہے۔ ایک سلطان کی زندگی، جسے خلق اللہ کی گردنوں کا مالک بنایا جاتا ہے اور اُن کے امور جزوی و کلی اُسکی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں اتنی آسان نہیں۔ جس دن میدان حشر میں میزان عدل قائم ہوگی، اور نامۂ اعمال پیش ہونگے، اور

زندگی کے نیک و بد کا حساب کیا جائیگا۔ اُس روز حقیقت حال منکشف ہوگی۔ میں جب اپنے گذرے ہوئے زمانہ کا خیال کرتا ہوں تو میرا جسم تھرّانے لگتا ہے اور میری روح کانپنے لگتی ہے! بار آلہا! میں کس طرح اپنی جوابدہی میں کامیاب ہوسکونگا؟ - اگر اُن انعام الٰہی پر غور کروں جو شروع زندگی سے جس وقت میں نے اپنی ماں کی گود میں آنکھ کھولی تھی مجھ پر آج تک بلا استحقاق نازل ہوئے تو وہ بھی شمار سے باہر ہیں۔ بلکہ میری تمام زندگی جو اس وقت تک گذری ایک طرف افضال و اکرام الٰہی اور فتوحات غیبی کا ایک حیرت انگیز سلسلہ ہے اور دوسری طرف کوتاہیوں واگذاشتوں، اور غلطیوں کی ایک کبھی ختم نہ ہونے والی عبرتناک داستان۔

اے بلبن! آج جب کہ خلوت ہے، اور تجھے میری بارگاہ میں تقرّب خاص حاصل، میں چاہتا ہوں کہ تجھے اپنی زندگی کے واقعات سُناؤں، تاکہ تو غور کرسکے کہ کارساز حقیقی ایک ناچیز انسان کو کن کن حیرتناک طریقوں سے مختلف مدارج طے کراتا اور ایک ادنیٰ خادم کو سلطان اعظم کے درجے پر پہونچا دیتا ہے"۔

یہ کہکر سلطان اپنی سیج پر سنبھل کر بیٹھ گیا، اُس نے اپنے دامن سے اپنی نمناک آنکھوں کو پونچھا۔ اور اپنی زندگی کی سرگذشت بیان کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اسی تذکرہ میں سپیدۂ صبح نمودار ہوگیا، اور مأذنۂ جامع سے موذن کی صدائے "اللہ اکبر" بلند ہوئی۔ خادم "زندگانیٔ خداوند سلطان دراز باد! ہنگام صلوٰۃ صبح رسید" کہتا ہوا حاضر خدمت ہو کر زمیں بوس ہوا۔ اور ہیں سلطان سے اجازت لیکر نماز کے لئے مسجد جامع کی طرف روانہ ہوا۔

"باقی آئندہ"

فارسی ڈراما

(منظور حسین صاحب موسوی ایم اے۔ لکچرار فارسی عربک کالج دہلی)

ڈراما کیلئے فارسی زبان میں "تمثیل" یا "تقلید" اور زبان عربی میں "مقامات"[1] مستعمل ہیں۔ لیکن یہ دونوں الفاظ ڈراما کے وہ معانی، جن میں کہ یہ زبان انگریزی میں مستعمل ہے، نہیں ادا کر سکتے اسوقت چونکہ ہمارا منشا فن تمثیل سے متعلق کچھ ذکر کرنا ہے اسلیئے لفظی بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم معنویت اور اصل مطلب کیطرف متوجہ ہوتے ہیں۔

سنگتراشی، مصوری، شعر، اور موسیقی دراصل ایک ہی عظیم الشان فن کی مختلف صورتیں ہیں۔ تمثیل (ڈراما) کو گویا شعر اور موسیقی کے بین بین تصور کرنا چاہیئے مصور کسی جاندار یا غیر جاندار کی شکل کاغذ پر کھینچتا ہے اسمیں تمام ضروری چیزیں کمال کی نہیں پائی جاتیں مثلاً یہ کہ تصویر گو مکمل ہوتی ہے مگر کلام نہیں کر سکتی اور معمولی صدمے سے خراب و برباد ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے بڑھئے تو آپکو سنگتراشی کی فوقیت معلوم ہوگی۔ اسمیں بھی اول الذکر کے سے اوصاف موجود ہیں۔ مگر اسکو مصوری پر ان معنوں میں فضلیت حاصل ہے کہ اسمیں دیرپائی کی خصوصیت بھی موجود ہے۔ لیکن اس تصویر میں بھی خاموشی موجود ہے جسے دیکھکر انسانی طبیعت نہیں پسند کرتی۔ اور آگے بڑھئے اور علم موسیقی سے دوچار ہو جئے۔ یہ علم ایسا بحر بے پایاں ہے کہ جس میں غوطہ لگا کر انسان عجب مناظر قدرت کا تماشا دیکھتا ہے یہ انسان کے سامنے تصویر بھی پیدا کر دیتا ہے، اور انکو بولتا ہوا بھی دکھا دیتا ہے مگر ادہر ذہن اسکی طرف سے ہٹا اور ادہر تمام لطائف و کوائف غائب ہوئے۔ کمال کی اس سے بہتر صورت فن شعر میں نظر آتی ہے لیکن اس سے بھی آگے چلکر آپ ایسے مقام پر پہنچینگے جہاں آپکو اپنی تلاش کی معراج حاصل ہو جائیگی۔ یہی مقام تمثیل یا تقلید کہلاتا ہے۔ تمثیل کے ذریعہ مرد اور عورت عالم حیات میں رنجیدہ و غمگین، کبھی خوش و خرم، کبھی خاموش، اور کبھی گویا، کبھی تنہائی میں اپنے دل سے باتیں کرتے ہوئے اور کبھی دوسروں سے اظہار خیال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تھوڑی دیر کیلئے ہم اپنے آپکو انکی تکلیفوں سے بچیدہ اور ان کی خوشیوں سے محظوظ پاتے ہیں، اور اس عرصے میں ہم بالکل بھول جاتے ہیں کہ وہ واقعات جو ہمارے سامنے پیش ہو رہے ہیں اُن کی حقیقت ایک قصہ اور کہانی سے زیادہ نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ افراد مجلس کی تکالیف حقیقت میں تکلیفیں نہیں مگر پھر بھی ہم ان سے متاثر ہو کر افسوس کرتے ہیں اور اکثر رو بھی دیتے ہیں، اور جب ان پر آثار خوشی دیکھتے ہیں تو ہم بھی بے اختیار خوش ہوتے ہیں اور ہمارا دل باغ باغ ہو جاتا ہے یہ تمام حالات فطرت انسانی سے وابستہ ہیں، اور ہر شخص اگر اس میں ذرہ برابر بھی انسانیت پائی جاتی ہے ایسے واقعات سے ضرور متاثر ہوگا۔ اس قسم کے کارناموں کو کمال کرکے دکھلا دینا

[1] گو حقیقت یہ ہے کہ عربی کے "مقامات" بہت بڑی حد تک ڈراما کی حقیقت اور کیفیت سے خارج ہیں

شخص ماہر فن تمثیل سمجھا جاتا ہے۔

انسان میں فطری طور پر خوشی اور رنج کا مادہ موجود ہے۔ ان طبعی کیفیات کو مختلف طریقوں سے ابھارا جا سکتا ہے۔ انہی طریقوں میں سے ایک طریقہ فن تمثیل بھی ہے۔ ایران میں فن تمثیل کا آغاز بمقابلہ یورپ کے بہت ہی دیر میں ہوا۔ لوگ جس طرح دوسرے معاملات میں یورپ والوں کے مقابلہ میں ترقی نہ کر سکے اس میں بھی پیچھے رہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انکا گوشہ عافیت میں بیٹھا رہنا اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانے میں پرہیز کرنا ہی انکی ترقی کو روکتا رہا۔

ایران کے قدیم ہخامنی اور ساسانی بادشاہوں کے زمانہ میں فن تمثیل سے کوئی واقف نہ تھا۔ چنانچہ پہلوی کتابوں میں اسکا بالکل پتہ نہیں ملتا۔ اسوجہ سے ہم باطمینان کہہ سکتے ہیں کہ فن تمثیل عربوں کی آمد کے پہلے ایران میں نہیں پایا جاتا تھا۔ عربوں نے اہل ایران کو کچھ اسطرح اپنا گرویدہ بنایا کہ انھوں نے اپنا قدیم مذہب ترک کر کے عربوں کا لایا ہوا اسلام قبول کر لیا۔ اور ان ہی کے رنگ میں رنگ گئے۔ فنون لطیفہ کی بدنصیبی سے اسلام کے علمار نے اس امر پر زور دیا کہ تماشا اور تمثیل، غنا اور مصوری ناجائز خیال ہیں۔ غالباً یہ اس امر کا ایک بڑا سبب ہے کہ مسلمان دوسری قوموں سے اس بڑی صنعت میں بہت ہی پیچھے رہے۔ خود عربوں نے تمثیل کے فن میں جو کچھ ترقی کی وہ انکے "مقامات" کی صورت میں ہے۔

"مقامات" لفظ مقامہ کی جمع ہے جس کے لغوی معنی "کھڑے ہونیکی جگہ" کے ہیں۔ زمانہ قدیم میں علمار و فضلا ایک مقام خاص پر، مثلاً کسی امیر کے دربار میں، جمع ہو کر اپنے علم کے کارنامے پیش کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے پر فوق حاصل کر کے انعام و اکرام اور قبول عام حاصل کیا کرتے تھے۔ اس کی مثال آج کل بھی ہمارے مشاعروں کی صحبتوں میں نظر آتی ہے۔ علوم عرب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قسم کی پہلی صحبت خوارزمی اور ہمدانی کی ایجاد ہے۔ ہمدانی نے قصوں اور کہانیوں کی تصنیف شروع کی جسکا نام اس نے مقامات رکھا۔ یہ مقامات مسجع نثر میں ہیں۔ مقامات میں دو افراد ہوتے ہیں جن میں ایک تو قصہ بیان کرنے والا ہوتا ہے اور دوسرا اس قصہ کا ہیرو۔ "مقامات" کی ایک خصوصی شان یہ ہے کہ مصنف حکایات اور واقعات کو پس پشت ڈال کر طرز تحریر اور صنعت لفظی پر تمام تر وقت اور ہمت صرف کر دیا کرتے تھے۔ اس سے کچھ اندازہ اس امر کا ہو سکتا ہے کہ عربوں نے ایرانیوں کو فن تمثیل میں کتنی مدد دی ہوگی! تقریباً کچھ بھی نہیں۔ اس لئے یہ کہنا کسی طرح بے جا نہ ہوگا کہ اہل ایران کا فن تمثیل قریب قریب تمام تر مغربی علوم اور ان کے مطالعہ اور اہل مغرب سے تعلق اور میل جول کا نتیجہ ہے۔

ایرانیوں کو قصص و حکایات سے بہت دلچسپی تھی چنانچہ اسی کی بنا پر ان کے یہاں قصہ خواں ہوتے تھے جو بادشاہوں، رئیسوں اور امیروں کو قصے اور حکایتیں سنایا کرتے تھے۔ اس کا رواج اس قدر ہو گیا تھا کہ معمولی درجے

لوگ بھی اپنی حیثیت کے موافق قصہ خوانی سے لطف اٹھانے میں کچھ نہ کچھ صرف کرنے لگے قصہ خوانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ خود ہی قصہ بیان کرتے تھے۔ اور خود ہی اپنے چہرہ اور ہاتھ پاؤں کے حرکات سے کیفیت کا اظہار بھی کیا کرتے تھے کبھی کبھی آوازیں تبدیل کرکے عورت اور مرد کی گفتگو بھی کیا کرتے۔ اکثر غصہ کی حالت کو بیان کرتے ہوئے آواز میں ایک عجیب کیفیت پیدا کردیتے جو فوراً ہی دوسری کیفیت کے اظہار کے وقت تبدیل ہو جاتی۔ ان لوگوں کیلئے نہ تو کوئی خاص مقام کی قید تھی اور نہ کسی خاص وقت کی۔ مگر زیادہ تر یہ دلچسپیاں شب ہی کیوقت ہوا کرتی تھیں ہم کو قصہ خوانی کا پتہ ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے درباروں میں بھی ملتا ہے۔ صرف نام کا فرق ہے ورنہ ہندوستان کے داستان گو اور ایران کے قصہ خوان ایک ہی کام کرتے تھے قصہ خوان ایک شخص واحد ہوا کرتا تھا۔ مگر اسکے علاوہ ایک اور بھی گروہ ایران میں پایا جاتا تھا جسے لوطی کہتے ہیں۔ یہ گروہ تماشا کرنے والوں کا ہوتا تھا جو ایک مقام سے دوسرے مقام پر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ سفر کیا کرتا تھا اور کسی گاؤں یا شہر میں کچھ دنوں سے زیادہ قیام نہیں کرتا تھا۔ یہ لوگ کسی ایک قصے میں مختلف افراد قصہ کا کردار آپس میں علیحدہ علیحدہ تقسیم کرلیا کرتے تھے، اور کبھی کبھی لباس بھی تبدیل کرلیا کرتے تھے۔ مگر قصے اکثر اور بیشتر محض ہنسنے اور حظ اٹھانے کیلئے ہوا کرتے تھے۔ ان قصوں کو تماشا کہتے ہیں۔ ایسے قصے زیادہ تر ایران کے جہلا اور معمولی لوگ سنا اور دیکھا کرتے تھے۔ شریف اور سنجیدہ مزاج لوگ اسمیں حصہ نہیں لیتے تھے۔ آج بھی ہندوستان میں نوٹنکی یا سوانگ کے نام سے ایسے ہی قصے سنائے جاتے ہیں۔ نوٹنکی یا سوانگ بھی ایک قسم کی تمثیل ہوتی ہے جو بغیر کسی اسٹیج، پردہ اور سین کے تماشا دکھاتی ہے اس میں بھی غربا اور جہلا ہی زیادہ حصہ لیتے ہیں۔

ایرانی نہ صرف تماشے اور قصص کے دلدادہ تھے بلکہ وہ علاوہ خوشکن کیفیات کے رنج والم کا مجسمہ بھی پسند کرتے تھے جس طرح قصہ خوان ہوا کرتے تھے اسی طرح ایک گروہ "روضہ خواں" بھی ہوتا تھا۔ یہ روضہ خوان حضرت امام حسنؑ و امام حسینؑ اور انکی اولاد کی شہادت اور تکالیف بیان کرتے تھے اور سامعین پر ایسا اثر پیدا کرتے تھے کہ ڈاڑھیں مار مار کے رونے لگتے تھے۔ روضہ خوانی کا سلسلہ سلاطین صفویہ کے زمانہ سے شروع ہوا۔ سلاطین صفویہ نے سولھویں صدی عیسوی میں ایران کی فرمانروائی حاصل کرکے مذہب شیعہ کی اشاعت تبلیغ اور توسیع میں بڑی مدد دی چونکہ وہ خود شیعہ تھے، اسلئے رعایا کی ایک معقول تعداد نے اس مذہب کو قبول کیا۔ اور اسمیں ترقی ہونے لگی حضرت امام حسین کی شہادت کے واقعات ہر ہر گھر میں بغیر کسی روک ٹوک کے بیان ہونے لگے ہر وہ شخص جو یہ واقعات بیان کرسکتا تھا روضہ خوان کہلانیکا مستحق تھا۔ مگر کچھ لوگوں نے روضہ خوانی کو پیشہ بنالیا تھا۔

اور اس طرح یہ بھی ایک علیحدہ گروہ متصور ہونے لگا۔ اس کے علاوہ ایرانیوں نے ایک اور طریقہ اختیار کیا جس میں روضہ خوان کی طرح صرف ایک شخص شریک نہ ہوتا بلکہ متعدد اشخاص ملکر وقعات کربلا بیان کرتے۔ اور سامعین رونے
اس قسم کے ذکر کو اہل ایران تعزیہ کہتے ہیں تعزیہ عموماً کسی مسجد کے صحن یا امام باڑے میں ہوا کرتا تھا مگر اور مقام پر بھی کرلیا کرتے تھے۔ اس کیلئے ایک چبوترا ہوتا تھا جس کے چاروں طرف لکڑی کے کٹہرے لگائے جاتے تھے چبوترے پر افراد مجلس اور کٹہرے کے چاروں طرف سامعین جمع ہوتے تھے۔ افراد مجلس کو ایک ایک کردار تقسیم کردیا جاتا تھا۔
اکثر ایسا ہوتا کہ اُن کو ایک خاص واقعہ دیدیا جاتا تھا لیکن وہ خاص الفاظ جو ان کو کہنا پڑتے نہیں بتائے جاتے تھے۔ بلکہ وقت پر وہ الفاظ خود ہی اپنی طبیعت سے ادا کیا کرتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ پورا تعزیہ اُسی وقت تبدیل کرلی جاتی تھی تعزیہ کے شروع ہونیکی اطلاع کرنے کے لئے اکثر بندوق سر کی جاتی تھی۔ جس کے بعد ہی بھشتی آتے اور لوگوں کو پانی پلاتے اس سے شہدائے کربلا کی پیاس یاد دلانا مقصود ہوتا تھا اور حاضرین میں ایک رونے کا غل بپا ہوجاتا۔
اس کے بعد ہی افراد مجلس یکے بعد دیگرے حسب ضرورت چبوترے پر آتے اور وہ واقعہ جس کی تصویر انہیں حاضرین کے سامنے پیش کرنا ہوتی بیان کرتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ حاضرین اور تعزیہ والوں میں تمیز مشکل ہوتی تھی بہرحال اس میں لوگ روتے بھی تھے اور ماتم بھی کرتے تھے۔ یزید کی فوج اور امام حسین ع کے دشمنوں کا کردار اکثر قیدیوں کو دیا جاتا تھا اور لوگ اُن کو بُرا بھلا کہکر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔ اس قسم کی تمثیل مذہب سے تعلق رکھتی تھی اس کے ساتھ ہی ہمکو یہ بھی دیکھنا ہے کہ علاوہ اس کے ایران میں کسی اور قسم سے بھی فن تمثیل میں اضافہ کیا گیا یا نہیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں قاچاریوں کے زمانہ میں یورپ سے زیادہ تعلقات پیدا ہوگئے۔ ناصرالدین شاہ قاچار کا سفر یورپ ایران کے لئے کچھ کم فائدہ بخش نہیں ثابت ہوا۔ سیکڑوں نئے الفاظ فارسی زبان کو مل گئے ایرانیوں نے بھی ایک وجدانی کیفیت کا اظہار کیا اور دکھا دیا کہ وہ قوم جسے لوگ اسوقت مردہ کہا کرتے تھے زندہ کہلانے کی مستحق بن سکتی ہے تقریباً ۱۸۷۰ عیسوی میں فرانس کے مشہور تمثیل نگار مولیر کے تین فرانسیسی تمثیلوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ اس ترجمے کی خصوصیت بس یہی تھی کہ صرف ترجمہ ہی تھا۔ لیکن چونکہ یہ ترجمے روزمرہ کی زبان میں تھے اس لئے ان سے موجودہ ایران کے فارسی محاورات اور مخاطبات کا پتہ چلتا ہے تمثیل کے افراد ضرور محسوس کرلئے گئے تھے۔ اگرچہ اس سے کوئی خاص لطف نہیں اُٹھایا گیا اور لوگوں نے ادھر توجہ نہیں کی لیکن موجودہ قسم کے فن تمثیل کی بنیاد پڑ گئی۔

۱۸۷۴ عیسوی کے آغاز میں طہران سے ایک ضخیم کتاب شایع ہوئی جس میں سات تمثیلیں درج تھیں۔ اس کے ساتھ اسکے مولف مرزا جعفر مزاجہ داغی نے ایک چھوٹا سا مقدمہ بھی لکھا تھا۔ یہ تمثیلیں پہلے آذربائجانی ترکی میں تحریر کیگئی تھیں انکے مولف فتح علی میرزا نے ان کو ۱۸۶۱ء میں تفلس سے شایع کیا تھا۔ ان میں ذیل کی تمثیلیں شامل تھیں:-

(۱) وزیر خاں لنکران۔ اسکا اصلی نام وزیر خان سراب تھا ۱۸۸۲ء میں مسٹر ہیگیرڈ اور لی اسٹرینج نے اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔ اور نام تبدیل کرکے وزیر خاں لنکران رکھا ۱۸۸۸ء میں اسی تمثیل کو مسٹر سیلیر نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اور کچھ ہی دنوں کے بعد ایک جرمن عالم مسٹر وارمنڈ نے جرمنی زبان میں ترجمہ کیا

(۲) موسیٰ ژوردان حکیم نباتات۔ اسکو عرف میں مست علی شاہ جادوگر بھی کہتے ہیں۔ یہ تمثیل ۱۸۵۰ء میں لکھی گئی اور ۱۸۸۹ء میں ایک جرمن عالم مسٹر وارمنڈ نے اسکا ترجمہ جرمنی زبان میں کیا۔ اسکے بعد ہی مسٹر راجرس نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا اور ۱۹۰۶ء میں مسٹر لوسین بودٹ نے ترکی زبان سے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔

(۳) وکلا مرافعہ:- یہ تمثیل ۱۸۵۵ء میں تصنیف ہوئی جسے مسٹر راجرس نے انگریزی زبان میں اور مسٹر سیلیر نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرکے شایع کیا۔

(۴) مرد خسیس:- یہ ۱۸۵۲ء میں لکھی گئی اور مسٹر بودٹ نے جنرل ایشیاٹک میں فارسی زبان میں ترجمہ کرکے ۱۹۰۶ء میں شایع کیا

(۵) ملا ابراہیم کیمیاگر: ۱۸۵۰ء میں تحریر ہوئی جنوری ۱۸۸۶ء میں پروفیسر باربیر ڈی مینیرڈ نے جنرل ایشیاٹک میں اسکا فرانسیسی ترجمہ شایع کیا۔

(۶) یوسف شاہ سراج:- یہ تمثیل ۱۸۵۶ء میں لکھی گئی اور مسٹر بودٹ نے اسکا فرانسیسی ترجمہ مع اصل آذری نسخے کے ۱۹۰۳ء میں جنرل ایشیاٹک میں شایع کیا۔

(۷) خرس قلدرباسان:- اس تمثیل کو مسٹر راجرس نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ پروفیسر مینیرڈ نے فرانسیسی زبان میں اسی کا ترجمہ ۱۸۸۹ء میں پیرس سے شایع کیا۔

ان تمام تمثیلوں میں تقریباً ایک ہی سے قصے ہیں جو زیادہ تر عشق و محبت سے بھرے ہوئے ہیں۔ اکثر قصوں میں شکسپیر کی طرح جادو بھوت اور اخباث سے مافوق انسانی کام لئے گئے ہیں جو یقینی اہل ایران کے عقائد کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً قصہ موسیٰ ژوردان میں ایک لڑکی اپنے چچازاد بھائی سے منسوب ہے۔ شادی کا زمانہ نزدیک ہے مگر لڑکا

پیرس جانے کو اسوقت کی شادی پر ترجیح دیتا ہے - لڑکی کی ماں گویا جادو کے ذریعہ سے شہر پیرس کو تباہ و برباد کرا دیتی ہے اور وہ لڑکا مجبوراً پیرس نہیں جاتا ہے - اور شادی ہو جاتی ہے - در اصل یہ واقعہ فرانس کے انقلاب عظیم کے زمانے کا ہے اور اتفاق یوں ہوتا ہے کہ جادو کرنے کے بعد ہی ایران میں پیرس کی بربادی کی اطلاع ہوتی ہے اور یہ واقعہ جادو کے اثر پر مبنی سمجھا جاتا ہے اسی سے ملتا جلتا واقعہ خرس قلدور باسان کا ہے جس میں لوگ مسٹر فوق ایک یورپین سیاح اور نگہبان جانوران کو جن تصور کرتے ہیں - اور یہ بالکل ناممکن سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص بھالو بندر اور اسی طرح کے دوسرے جانور بکس میں بند کر کے گاڑی میں رکھکر ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجا سکتا ہے - موجودہ انگریزی تمثیلوں کا قاعدہ ہے کہ ان میں ایک اصل قصہ ہوتا ہے جس کے ماتحت چھوٹے چھوٹے ایک یا دو قصے اور بھی ہوتے ہیں اور یہ چھوٹے قصے درمیان میں حائل ہو کر اصل قصے کو تھوڑی دیر روک کر لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ کر دیتے ہیں - مگر فارسی تمثیلوں میں یہ بات تقریباً مفقود ہے - اس میں ایک ہی قصہ ہے جو شروع سے آخر تک بیان کیا جاتا ہے نہ اس میں انگریزی تمثیلوں کی طرح درست آغاز ہوتا ہے اور نہ ایک عمدہ معراج بلکہ انکا انجام بھی ایک عمولی طریقہ پر کر دیا جاتا ہے جس سے حظ میں نمایاں کمی محسوس ہوتی ہے -

۱۹۰۸ء میں طہران سے ایک اخبار تیاتر شایع ہوا جو ہفتہ میں دو بار نکلتا تھا - اس کا کام غالباً اسوقت کی شخصی سلطنت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا تھا - اس نے بھی فارسی زبان میں چند نئی تمثیلوں کا اضافہ کیا لیکن ان تمثیلوں میں بجز وقتی سیاسیات کے کچھ معلوم نہیں ہوتا - اس سے کچھ پیشتر پرنس میلکم خاں نے جو کسی زمانے میں لندن میں سفیر ایران رہے تھے چند تمثیلیں لکھی تھیں - ان کل تصانیف کو یکجا کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایران میں فن تمثیل بہت جلد ایک اچھے درجہ پر پہونچ جائے گا - آجکل یہ فن نمایاں ترقی کر رہا ہے - اگر اسی رفتار سے ترقی ہوتی رہی تو یہ امید بیجا نہیں ہے کہ وہ بہت جلد ایسے بلند مقام پر پہونچ جائیگا جہاں ارباب فن اسکی تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے !

سُلطان محمد تغلق عادل شاہ

گزشتہ سے پیوستہ

(۶)

مشیر احمد صاحب علوی بی۔ اے۔ علیگ

سنہ ۷۴۱ھ کے رمضان و شوال میں بارش کافی ہوئی جس سے قحط کے دُور ہونے کی اُمید پڑی۔ اس زمانہ میں کچھ خائن اور بددیانت اہلکار اودھ و ظفرآباد میں سلطان کے خوف سے پناہ گزیں ہوئے۔ سلطان نے عین الملک صوبہ دار کو حکم دیا کہ تم ان خائنوں کو دربار میں بھیجدو سنا ہے کہ تمہارے بھائیوں نے انکو جاگیریں عطا کی ہیں عین الملک نے بموجب حکم سلطانی ان مجرمین کو سیاست کیلئے دربار شاہی میں بھیجنے کا ارادہ کرلیا۔ اتفاق سے اُس زمانہ میں عین الملک کو ایک خاص ضرورت سے دارالخلافت جانا پڑا تو سلطان نے اُس سے کہا "میں تم کو عنقریب دکن کی صوبہ داری پر تبدیل کرنے والا ہوں اس ترقی مراتب سے یقیناً تم کو خوشی ہوگی"۔ بات ختم ہوگئی عین الملک حاکم ظفرآباد و اودھ واپس چلا گیا لیکن اسکو اُسکے بھائیوں اور مفرور شدہ خائنوں نے بہکایا کہ سلطان تم کو اس ملک سے بیدخل کرکے سزا دینا چاہتا ہے کیونکہ تم نے ان مصیبت زدہ افراد کو پناہ دی ہے (مجرمین کو) بہتر ہے کہ بغاوت کردو۔ اور اودھ کا علاقہ نکال لو۔ چنانچہ سنہ ۷۴۱ھ ۱۳۴۰ء میں عین الملک نے بغاوت کی سلطان نے بنفس نفیس اس بغاوت کو فرو کرنیکا ارادہ کیا۔ اور خود ان باغیوں پر حملہ کردیا اور بانگرمئو کے قریب لڑائی ہوئی عین الملک کے بھائی جنگ میں کام آئے۔ اور عین الملک گرفتار ہوکر حاضر دربار کیا گیا۔ مگر اسکی شرافت نسب دیرینہ خدمات علو مراتب کا لحاظ کرتے ہوئے سُلطان نے اُسکو دربار میں اپنے تخت کے برابر جگہ دی۔ اور کہا کہ:۔

"عین الملک کی طبیعت میں فساد و بغاوت مطلق نہیں ہے اسکو مجرمین نے بہکایا الہذا میں اُسکی دیرینہ وفاداریاں مدنظر رکھتے ہوئے اسکو معاف کرتا ہوں اور خلعت فاخرہ سے سرفراز کرتا ہوں"

واقعہ بھی یہی تھا کہ عین الملک ان خائنوں کو تادیب کیلئے دربار میں بھیجنے کیلئے تیار تھا لیکن قسمت میں ذلت مقدر تھی۔ وہ ہوکر رہی۔ سلطان نے ترحم خسروانہ سے کام لیکر عین الملک کو معاف کردیا۔ اور شاہی باغات کا مہتمم مقرر

[illegible]

گیا۔ لیکن اس بغاوت کے جملہ مصنفین و مولفین کو سخت سزاؤں کے بعد قتل کیا۔

اس مرتبہ سلطان بہرائچ تک ان خائنوں کی فکر میں گیا اور اسی دورہ میں سید[1] سالار مسعود غازی کی درگاہ پر بھی حاضری دی اور مجاوروں کو مالا مال کر دیا چنانچہ مقبرہ و قدم رسول اُسی کی اولوالعزمی کی یادگار ہے۔ مزار پر جو عبارت موجود ہے اُس میں بجائے پانی کے خمیر میں کیوڑا گلاب اور دیگر قیمتی اشیا ڈالی گئی تھیں۔ یہ زندہ یادگار اس عادل شہنشاہ کی سیر چشمی کی آج بھی بہرائچ میں موجود ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ۷۳۶ھ کا ہے جسکو آج تقریباً ۶۰۰ برس کا زمانہ گزر چکا ہے۔

[1] سید سالار مسعود غازی۔ آپکا یہاں بغرض جہاد تشریف لانا اور بہرائچ میں شہادت پانا اسقدر شہرت پذیر ہے کہ بچہ بچہ آپکے اسم گرامی سے واقف ہے اور اودھ کے بہت کم مقامات ایسے ہیں جہاں آپکے ساتھی جہاد کرنے نہ گئے ہوں۔ مگر افسوس ہے کہ باوجود کوشش کے کسی تاریخ میں آپکے یہاں تشریف لانیکا زمانہ اور جنگ کے واقعات ہمکو نہیں ملے۔ مجبوراً امرات سعودی سے بطور تبرک یہ حالات ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔ آپکی ولادت ۱۲ رجب ۴۰۵ھ کو اتوار کے دن اجمیر میں ہوئی آپکے والد ماجد حضرت سالار ساہو مظفر خاں کی مدد کو جنکو اجمیر کے راجہ نے تنگ کر رکھا تھا آئے تھے۔ آپنے دس برس کی عمر میں ظاہری علم سے فراغت کر کے خدا سے لو لگائی۔ اسی زمانہ میں آپکے والد بحکم سلطان محمود غزنوی کاہیر تشریف لائے اور اسے فتح کر کے یہاں بود و باش اختیار کی ۴۱۶ھ میں جب سلطان محمود سومنات کو فتح کرنیکو ہندوستان آیا تو آپکے والد کو شرکت جنگ کے واسطے طلب کیا۔ چونکہ آپ سلطان محمود کے بھانجے تھے لہذا ماموں سے ملنے کے واسطے والد کے ہمراہ گئے اور سومنات کے معرکہ میں شریک ہو کر سلطان کے ہمراہ غزنین تشریف لے گئے تھوڑے دنوں غزنین میں قیام کر کے حسب اجازت سلطان محمود ہندوستان تشریف لائے اور لاہور میں ان مجاہدوں کے علاوہ جو آپکے ساتھ غزنین سے آئے تھے اور بہت سے جانباز مجاہد آپکے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ یہ فوج جمع کر کے آپ آگے بڑھے اور دہلی کے سامنے پڑاؤ ڈالا۔ راے مہپال راجہ دہلی لڑائی میں مارا گیا اور آپ نے آگے بڑھ کے میرٹھ کے راجہ کو اطاعت پر مجبور کیا پھر قنوج کو مطیع کر کے گنگا کو عبور کیا اور ستر کھ کی آب و ہوا پسند کر کے اسکو مستقر بنایا۔ یہاں سے اطراف میں فوجیں روانہ کیں۔ اسی زمانہ میں آپکے والد بزرگوار بھی تشریف لائے اُنہیں آپنے مستقر پر چھوڑا خود اُن کی اجازت سے ۴۲۳ھ میں بہرائچ تشریف لیگئے اور دشمنوں کو شکست دی پندرھویں شوال ۴۲۴ھ کو حضرت سید سالار ساہو نے آپکی عدم موجودگی میں سفر آخرت کیا تھوڑے دنوں بعد ایک

ابھی چند سال کا واقعہ ہے کہ درگاہ شریف میں ایک جدید دروازہ کی ضرورت محسوس ہوئی جسوقت دیوار شہید کی گئی تو قاضی سمیع علیخان عباسی سابق تحصیلدار بہرائچ کے قول کے مطابق تیز خوشبو کا ایک زبردست لپکا نکلا کہ حاضرین اس

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۔ اور فوج جسمیں بہت سے راجہ شامل تھے گھاگرا ندی کے کنارے جمع ہوئی اور آپنے اسے بھی شکست دی

اب مجاہدین نے چاروں طرف پھیل کے دور دور کے علاقوں کو زیر و زبر کرنا شروع کیا۔ دشمنوں نے اب مجبور ہو کر مکر و فریب سے آپ کو شہید کرنا چاہا مگر اسمیں بھی ناکامی ہوئی۔ ہاں ایک حجام ناہنجار کا داؤ چل گیا مگر خداوند کریم نے اس سے بھی نجات دی۔ اس نائی نے یہ حرکت کی کہ ایک زہر میں بجھی ہوئی ناخن گیر آپ کو دے گیا۔ آپنے اُس سے ناخن تراشے تو زہر جسم مبارک میں سرایت کر گیا۔ مگر خدا نے اُسکو جلد زائل کر دیا۔ اکثر ساحروں نے بھی اپنے عمل سے کام لیا۔ مگر اُنکی بھی نہ چلی۔ اب پھر دشمنوں نے دور و دراز کے راجاؤں کے پاس قاصد بھیجکر لشکر طلب کی۔ آپکے لشکر میں مجاہدوں کے دور ہونے کیوجہ سے اور دارالسلطنت سے بھی نئی فوج کے نہ آسکنے کے باعث بہت کمی اور پریشانی تھی۔ اسکے علاوہ اکثر مجاہدین اطراف و جوانب کی لڑائیوں میں بھی روز شہید ہوتے رہتے تھے جن کیوجہ سے روز بروز آپ کی قوت گھٹتی جاتی تھی۔ اسی حال میں دشمنوں کا بہت بڑا گروہ جمع ہو گیا۔ اور بہرائچ کے قریب لڑائی شروع ہوئی۔ دو تین روز کی لڑائی میں نامی گرامی مجاہد شہید ہوئے ہنوز لڑائی کا فیصلہ نہ ہوا تھا کہ آپ کی شہ رگ پر ایک تیر پڑا۔ اس کاری زخم نے آپکو گھوڑے پر سنبھلنے نہ دیا۔ خدمت گار نے گھوڑے سے اُتار کے قریب ہی ایک مہوے کے درخت کے نیچے زمین پر لٹا دیا۔ اور کلمۂ شہادت پڑھکر ۱۹ سال کی عمر میں ۱۴ رجب ۴۲۴ھ کو اتوار کے دن آپنے شربت شہادت پیا۔ تاریخ وصال "بل احیاء عند ربہم" مجاہدوں نے آپکی شہادت کا حال سُنا تو بدحواس و بے دست و پا ہو گئے۔ اور اسی بدحواسی میں سب کے سب شہید ہو گئے آپنے قیام گاہ پر کچھ لشکر حفاظت کی غرض سے سید ابراہیم کی سرداری میں چھوڑا تھا۔ یہ بزرگ آپکی شہادت کا حال سُنکر دوسرے دن صبح کو جائے شہادت پر تشریف لائے اور جہانتک ممکن ہوا شہدا کو کنوؤں تالابوں اور گڈھوں میں دفن کر کے حضرت امیر الشہداء کے جسم اقدس کو مع برج گنبد میں سپرد خاک کیا اور لڑائی میں مشغول ہو گئے۔ اور راجہ سُہر دیو کو جسکا تیر حضرت سید سالار مسعود غازی کے لگا تھا مقابلہ پر بلایا اور اسے ہلاک کر کے خود بھی باقی ماندہ لشکر کے ساتھ شہید ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

خوشبو سے بیتاب ہو گئے! بہت سے افراد نے صاحب مزار کی کرامت پر اس واقعہ کو محمول کیا لیکن تاریخی جرح و قدح کے بعد محققین کی جماعت اس نتیجہ پر پہنچی کہ خمیر میں عرقیات کا عنصر غالب تھا جس کی خوشبو اسوقت تک موجود ہے۔

واللہ عالم بحقیقۃ الحال ملفوظات قاضی فضل اٹھوی۔ مخطوطات انجمن اخوان الصفا قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ۔

.....توسط مولانا خادم حسین صاحب علوی العثمانی ایڈوکیٹ لکھنؤ۔

سلطان محمد تغلق نے قحط سے فراغت پاکر ان اسباب پر غور کیا کہ آخر قحط کیوں ہوتا ہے اور اس لئے ارضی تکالیف کو دور کرنے کیلئے زراعت میں ایجادات کیں ایک محکمہ زراعت کا قائم کیا۔ اور ایک ناظم اعلیٰ کے سپرد کیا۔ جسکو دیوان امیر کوہی کہا جاتا تھا اسی عہدہ کو انگریزی میں ڈائریکٹر آف اگریکلچر کہتے ہیں۔ محکمہ انہار قائم کیا جس سے بہت سی نہریں نکالی گئیں۔ جملہ کھیتوں میں کنوئیں بنائے گئے ان کنوؤں سے پانی نکالنے کیلئے چرس اختراع کئے گئے ورنہ اس سے قبل چرس کا استعمال ہندوستان میں نہیں تھا۔

"......سلطان در ازدیاد زراعت اسلوبہا اختراع می کرد ہر چہ در ازدیاد زراعت و تعمیر سلطان می گذشتہ و در قلم می آمد آنرا اسلوب نام می شد۔ کہ اگر آں اسالیب متصورہ واقع شدے۔ از ازدیاد زراعت و حیثیت زراعت جہاں پر از نعمتہائے گوناگوں گشتے و در خزائن گنجہا آمدے......و در معاملۂ ازدیاد زراعت دیوانے وضع شد و آں دیوان را دیوان امیر کوہی نام کردند و عہدہ داراں از آں نصیب شدند... ہر چند سلطان محمد در باب جد می فرمود و چاہا کاوا بندن فرمان شد و خلق نمی توانست و از زبان مرداں چیزے بیروں می آمد و تقصیر و اہمال می رفت بسیاراں سیاست می پیوستند۔[1] ...."

اسی عرصہ میں نظام پاین ایک بادہ گو دہرزہ کار احول نے فساد برپا کر دیا عین الملک نے اسکو قتل کیا

بقیہ مضمون صفحہ ۲۔ سید سالار مسعود غازی اور ان کے فتوحات اگرچہ کسی مستند اور قابل وثوق تاریخ میں نہیں ملتی مگر اس نام کے ایک زبردست بہادر کے حملہ آور ہونے اور ان کے بہرائچ میں آکر شہید ہونے کا واقعہ متواترات میں سے ہے جو کسی تاریخی ثبوت کا محتاج نہیں ہاں ان کے حالات کی جو تفصیل بیان کیجاتی ہے وہ قطعاً مشتبہ اور تاریخ کے درجہ سے گری ہوئی ہے آپکا مزار اور قدم رسول کی عمارت اسی باعظمت سلطان نے بنوائی ہے اس روایت کو مولانا خادم حسن علوی نے بیان کیا ہے میں انکا متشکر ہوں

[1] فیروز شاہی ضیاء الدین برنی۔ رائل ایشیاٹک سوسائیٹی بنگالہ مخطوطات ... جلقہ دار التصنیف اورنگ آباد دکن دفائر خاندانی انجمن اخوان الصفا کاکوری لکھنؤ کتب خانہ خاندانی مولانا ابوالحسنات مولوی عبدالرشید فرنگی محلی کتبخانہ لطیفیہ مولوی عبداللطیف۔ دکاکوری

اور اُسکا سر کاٹ کے دربار شاہی میں پیش کیا۔ اسی زمانہ میں دکن سے پرچہ گذرا کہ نصرت خاں نے بیدر میں بغاوت شروع کردی ہے اور علی شاہ جو امیران[1] صدہ میں تھا اُس نے بھی (دکن) اورنگ آباد کے گرد و نواح میں سر اٹھایا ہے۔ اور گلبرگہ کے حاکم کو قتل کر کے ملک میں شورش مچا رکھی ہے اور بیدر کے نائب امیر الممالک کو بھی قتل کر دیا ہے۔ سلطان نے فوج بھیجی علی شاہ کو شکست فاش نصیب ہوئی۔ اور زندہ گرفتار ہو کر حاضر دربار کیا گیا۔ بادشاہ نے ازراہ ترحم خسروانہ جاں بخشی کی اور اُسکو ہندوستان سے باہر غزنی میں بھیجدیا۔ لیکن اپنی شامت اعمال سے وہ دوبارہ حدود غزنی سے باہر آگیا لہذا قتل ہوا۔

سلطان کا بہرائچ سے واپسی کا ارادہ تھا کہ دار الخلافت سے ہرکارہ نے آکر اطلاع دی کہ مخدومہ جہاں (والدہ) علیل ہیں۔ سلطان فوراً دہلی واپس چلا گیا۔ اور اپنی والدہ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ لیکن اسی کے ساتھ قحط کے خیال سے کاشتکاروں کو تقاوی بانٹنا شروع کی اور یہیں دار الحکومت میں ملک ایاز نے ان مجرمین کو گرفتار کر کے حاضر دربار کیا اور ثبوت بہم پہنچنے کے بعد اُن کو سخت از سخت سزائیں دیں۔ یہ وہ مجرمین تھے جنہوں نے قحط کے زمانہ میں مفلسوں کو دق کیا تھا۔ اس میں بہت سے اُمرا اور ذی مقدرت عہدہ دار بھی تھے۔ اغلب گمان یہ ہے کہ برنی اسی لئے سلطان محمد تغلق سے خفا ہو گیا تھا کیونکہ ان اُمرا میں بہت سے برنی کے اعزہ اور احبا بھی تھے۔ اسی زمانہ میں ملتان میں بھی خفیف جھگڑا ہوا اس کی شان نزول یہ ہے کہ شاہو افغان نے بہزاد خاں کو قتل کر کے ملتان پر خود قبضہ کر لیا۔ اور قوام الملک نو مسلم گورنر کو ورغلایا۔ ملک قوام الملک خدمت سلطان میں حاضر ہوا۔ سلطان قوام الملک کے تیور دیکھ کر ملتان چلنے کیلئے بنفس نفیس تیار ہو گیا۔ لیکن شاہو افغان کا معذرت نامہ رستہ میں ملا اور وہیں یہ خبر وحشت اثر بھی ملی کہ دہلی میں مخدومہ جہاں نے جو حد درجہ عابدہ اور زاہدہ تھی۔ انتقال کر گئی۔ سلطان کو اس خبر سے انتہائی قلق ہوا۔

"بادشاہ از دہلی سامان لشکر نمودہ بجانب ملتان نہضت فرمود و یک منزل پیش نرفتہ بود کہ والدۂ او مخدومۂ جہاں کہ نظام والتیام تمام خاندان تغلق شاہیہ باو وابستہ بود در دہلی سایہ رحمت حق پیوست سلطان متالم و محزون شدہ بفرمود تا در شہر (دہلی) بروح او طعام و صدقات داد ند و خود روانہ شد چوں نزدیک ملتان رسید شاہو افغان عریضے مشتمل بر ندامت و بازگشت فرستاد و خود ملتان را گذاشتہ

[1] امیران صدہ مغلوں میں وہ امیر کہلاتے تھے جنکے تحت میں ۱۰۰ سوار رہا کرتے تھے۔ یہ ایک فوجی کمیشن تھا جسطرح آجکل کپٹین۔ لفٹننٹ اور کرنل ہوا کرتے ہیں اُس عہد کا فوجی نظام بہت مکمل تھا۔

بافغانستان رفت [۱]"

دہلی میں کہرام مچ گیا۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ اسکی وجہ سے سیکڑوں گھر آباد تھے اور ہزارہا اشخاص کی آرام و راحت سے زندگی بسر ہوتی تھی تقریباً ۱۴۰۰ اولیاءاللہ اور فقرا کی اس کے محل سے خدمت کی جاتی تھی۔ دولت آباد میں بھی اس عفت مآب خاتون نے بہت سے افراد کے ساتھ سلوک کیا تھا۔ ہر شخص مخدومہ جہاں کیلئے اسطرح روتا تھا کہ گویا ہر شخص کی حقیقی ماں کا انتقال ہوگیا ہے۔ سلطان اپنی ماں کی بیحد عزت کرتا تھا اس حادثہ میں وہ بالکل خاموش ہوگیا۔ لیکن فرائض منصبی کے انصرام سے کبھی بھی قاصر نہ رہا۔ اسی حالت میں ملتان چلا گیا۔ شاہو افغان نے معذرت نامہ کے ذریعہ سے غاشیہ اطاعت دوش پر رکھا اور پشیمانی اور ندامت کا اظہار مناسب الفاظ میں کیا۔ اور حتمی وعدہ کر گیا کہ آیندہ ایسی نازیبا حرکت اُس سے سرزد نہیں ہوگی وہ افغانستان معہ اپنے متعلقین کے چلا گیا۔ اور سلطان محمد تغلق نے دارالخلافت میں آکر خلق اللہ کی بہبودی کے وسائل پر غور کرنے کیلئے کچھ دنوں قیام کیا۔ جسوقت سلطان دارالخلافت میں داخل ہوا ہے تو جوق جوق لوگ سلطان کے پاس تعزیت کیلئے آتے تھے اور ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق سلطان سے اس حادثہ میں اظہار غم کرتا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد سلطان کو علم ہوا کہ حاکم سنارگاؤں (ملک بہرام خاں) کا انتقال ہوگیا ہے (۱۳۳۹ء) اور ملک فخرو (فخرالدین) نے علم بغاوت بلند کیا ہے۔ سنارگاوں۔ چٹ گاؤں (چٹگام) (چٹاگانگ) اور لکھنوتی اُسکے قبضہ میں آگئے ہیں اور فخرالدین سلطان کے لقب سے اُس نے سلطنت شروع کردی ہے۔

سلطان نے لکھنوتی کے حاکم قدرخاں کو ملک فخرو کی فہمائش کے لئے مامور کیا۔ قدرخاں سے ملک فخرو سے جنگ ہوئی اور فخرو کو شکست ہوئی اور وہ جنگلوں میں روپوش ہوگیا۔ قدرخاں فاتح کی حیثیت سے برسات کے ختم ہونیکا انتظار کررہا تھا اور تحصیل وصول میں مشغول تھا۔ کہ ملک فخرو نے اُسے قتل کرادیا۔ اور سنارگاؤں کو دوبارہ دارالخلافت بنایا اور حکومت باقاعدہ شروع کردی اور اپنے منظور نظر غلام مخلص خاں کو ایک بڑا لشکر دے کر لکھنوتی کے انتظام کیلئے بھیجا۔ علی مبارک کہ قدرخاں کے لشکر کا عارض میر بخشی تھا۔ اُس نے ہمت و مردانگی کر کے ایک جماعت کو اپنا ہم نوا بنا کر مخلص خاں کو شکست دی اور سلطان محمد تغلق کی خدمت میں فتح کی مبارکباد بھیجی۔ اور عریضہ بدین مضمون بھی ارسال خدمت کیا کہ اگر ظل اللہ کا حکم عالی ہو تو یہ تابعدار لکھنوتی پر حکومت کرے

[۱] فیروز شاہی۔ ضیاءالدین برنی ص۴۸۴۔ ۴۸۵ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ تاریخ فرشتہ جلد ۱۔ مقالہ دوم۔ ذکر سلطان محمد تغلق کتب خانہ مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے۔ ڈپٹی ایس۔ پی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ وجج۔ امر تل کاکوری۔ لکھنؤ

سلطان محمد تغلق اس شخص سے ناواقف تھا اس لئے کوئی جواب نہ دیا بلکہ دہلی کے شحنہ (کوتوال) امیر یوسف ملک کو لکھنوتی کا حاکم مقرر کیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ راہ میں ملک عدم کو سدھارا۔

علی مبارک لکھنوتی کا حاکم بن بیٹھا۔ اور سلطان علاءالدین کے لقب سے نواح بنگال پر حکومت کرنے لگا۔ لیکن یہ قصہ ابھی طے نہ ہوا تھا کہ ملک الیاس جو اس نواح میں ایک با اثر رئیس تھا اُس نے علاءالدین کو قتل کر دیا اور لکھنوتی پر قابض ہو گیا۔ اور سلطان محمد تغلق کو ان واقعات کی اطلاع دی ۷۴۲ھ میں سلطان نے خود بنگال کی جانب کوچ کیا۔ سنار گاؤں پہنچکر فخرالدین (ملک فخرہ) باغی کو زندہ گرفتار کر کے لکھنوتی میں قتل کیا اور حاجی الیاس کو شمس الدین کا خطاب عطا کر کے بنگال کی حکومت سپرد کی یہیں یہ خبر ملی کہ مالوہ کے ہندوں نے شورش مچائی ہے اسلئے وہ بھیلسہ راور رائے سین گیا اور مالوہ کے متمردین کو زک دی اور دونوں صوبوں کو ساگر کی سرکار میں شامل کر کے ان جدید فتنوں کو فرو کیا اور دارالخلافت واپس چلا گیا۔

جب دہلی پہنچ گیا تو سکندر سلطان (امیران صدہ) کو حکم دیا کہ امیٹھی کا پرگنہ ہندوں سے فتح کر کے اودھ کی سرکار میں شامل کرو۔ سکندر سلطان نے پرگنہ فتح کیا اور ایک قلعہ بنام قلعہ امیٹھی تعمیر کر کے ملک علی کو اس پرگنہ کی حکومت سپرد کی۔ اور منصب قضاۃ کیلئے سلطان کی نظر انتخاب شیخ معروف عثمانی پر پڑی۔ شیخ تارک الدنیا تھے بہ لطائف الحیل اس خدمت کو ٹالنا چاہتے تھے اور بہت بچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن سلطان محمد تغلق نے حاکم اودھ کو حکم دیا کہ شیخ معروف سے کہو کہ وہ خدمت دینی قبول کرے ورنہ پابہ زنجیر حاضر عدالت کرو۔

"او عالم دین است اگر بار دگر ازیں خدمت دینی انکار کند کشاں کشاں بدارالسلطنت آرند" [1]

حاکم اودھ نے شیخ معروف کو بہت سمجھایا زمانہ کا نشیب فراز دکھایا چنانچہ شیخ معروف نے عہدۂ قضاۃ منظور کیا۔ اب اس قلعہ کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ لیکن اُس کے شکستہ آثار متصل گوشائیں گنج (لکھنؤ) اب بھی موجود ہیں جو اپنے بنانے والوں کی اولوالعزمی کی شہادت دے رہے ہیں۔ سچ ہے باقی رہے نام اللہ کا۔

(باقی - باقی)

[1] ریاض عثمانی۔ قاضی خادم حسن بی۔ اے ایل ایل بی عثمانی۔ ایڈوکیٹ لکھنؤ مطبوعہ نیر پریس پاٹا نالہ باہتمام مولوی حامد حسن دبیر کامل لکھنؤ مولوی خادم حسن شیخ معروف کی اولاد میں اب بھی عہدۂ قضاۃ پر مامور ہیں۔

فلسفۂ اخلاق
اور
راحت و تکلیف

سید مقبول حسین صاحب احمد پوری - بی - اے

راحت و تکلیف کا احساس قوتِ حاسّہ پر مبنی ہے - راحت کا احساس حواسِ خمسہ اور جذباتِ قلب کی تفریح اور جسمانی عیش و آرام سے ممکن ہے - راحت کا ذریعہ دولت بھی ہے، ہنر بھی، علم بھی اور محبت و اتحاد بھی - شہرت سے خوشی حاصل ہوتی ہے اس لئے وہ بھی ذریعۂ راحت ہے - طاقت و قوت سے ایک قسم کا اطمینان قلب رہتا ہے - اس لئے وہ بھی راحت کا سبب ہیں - راحت پرہیزگاری اور تقدس میں بھی ہے - فیاضی اور سخاوت میں بھی، حُسنِ خیال اور مشاہدۂ جمال میں بھی - کسی کی یاد اور اُس یاد کی بیداد میں بھی، راحت شمع اُمید کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں بھی ہے اور کسی تکلیف سے نجات حاصل ہونے میں بھی - درد محبت سے قلب کو راحت ہوتی ہے اور سوز عشق سے دل کو الفت - احساس و جذبات پر غلبہ کرنے والا سب سے بڑا ذریعۂ راحت "سکون" ہے اور سکون کے مختلف مدارج ہیں - بقول شاعر ؎

بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن رفتن ایستادن نشستن خفتن و مردن

تکلیف کیا ہے؟ - ناکامیابی، حرماں نصیبی، قید خیال، قید جسم، امراض اور دیگر ...نی تکالیف مثلاً تشنگی و گرسنگی وغیرہ - احساس و جذبات کی تکلیف جیسے روحانی تکالیف

شامل ہیں ایک بڑی تکلیف ہے۔ حواس خمسہ کو تکلیف ہونا جیسے کانٹا چبھنا، گرج، چمک، بدبو، تلخی، ترشی وغیرہ اور دماغی تکلیف جیسے ندامت، خوف، بدصورتی کا خیال، بدنامی کا خیال اور گالی گلوچ کی یاد۔ دشمن کا ڈر، جرم و معصیت کا خوف، فرائض نہ ادا ہونے کا خیال حسد و بغض کا غلبہ وغیرہ سب دماغی و قلبی تکلیفیں ہیں۔ بیم و ہراس اور حسرت و یاس بھی تکالیف کا ذریعہ ہیں۔ یادِ رفتگاں جذبات سے متعلق تکلیف ہے اور درد فراق سے قلبی و روحانی تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں سب لوگ راحت کے جویا ہیں۔ مگر زیادہ تر تکالیف ہی کا سامنا ہوتا ہے۔

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

تکلیف و راحت کے مدارج کا معیار ان میں سے ہر ایک کی شدت، وسعت اور عرصہ قیام پر مبنی ہے۔ اکثر اوقات تکلیف و راحت کا معیار یقین پر مبنی ہوتا ہے۔ کبھی واقفیت اور ناواقفیت پر، کبھی نزدیکی و دوری پر، کبھی اتفاقات زمانہ پر، کبھی موقع و مناسبت پر۔ یا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اجتماع ضدین میں کوئی ایک متضاد حالت تکلیف و راحت کا ذریعہ ہو جاتی ہے۔ اور بیشتر ایسا ہوا ہے کہ ایک چیز جو ایک جگہ یا کسی مخصوص وقت پر ذریعۂ تکلیف ہے تو دوسری جگہ یا کسی دوسرے وقت وہی چیز ذریعۂ راحت ہے۔ کسی نے خوب لکھا ہے ؎

کبھی ہے اس دردِ دل میں لذت، کبھی ہے اس دردِ دل سے وحشت
عجیب شے ہے ہمارا دل بھی کبھی نہیں جس کی ایک حالت

اور اسی موضوع پر میر صاحب بھی فرماتے ہیں ؎

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں   تحفۂ روزگار ہم بھی ہیں

اس کارگاہ عالم میں قدرت نے راحت و تکلیف کی تقسیم کچھ ایسی طرح کی ہے کہ کوئی بشر نہ تو کامل طور سے عیش و راحت کا دعویٰ کر سکتا ہے نہ تکلیف کی شکایت۔ کیونکہ نہ تو ہم بغیر تکلیف اٹھائے دنیا میں رہ سکتے ہیں نہ بغیر آرام کئے کچھ کام چل سکتا ہے۔ ہماری راحت ہمارے بھائی کی تکلیف پر مبنی ہے اور ہماری تکلیف سے دوسروں کو راحت۔ ہماری خوشی ہمارے ہمجنس کے لئے غم کا سبب ہے اور دوسروں کا غم ہماری خوشی کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ دنیا کی

زندگی ایک امتحان مقابلہ یا معرکۂ کشمکش ہے - جس میں فاتح و کامیاب کی خوشی مفتوح کی شکست و ناکامی میں مستور ہے - ہم شکار کھیلنے کو کھیل کہتے ہیں - مگر وہ ایک مخلوق کے لئے وبال جان ہے -

"کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری"

تکلیف و راحت کی اس فطری مگر پیچیدہ ترتیب نے "گوتم سدھارتھ" کو خیالی کشمکش میں ڈال کر دنیا سے برگشتہ کر دیا تھا لیکن اس پیچیدگی کو سلجھانے میں کوئی کامیاب نہ ہو سکا - یہ قانون فطرت ہے اور اسی قانون پر تمام موجودات کی ترتیب ہے - اگر بہار زمانۂ عیش و عشرت ہے تو خزاں دورِ تکلیف و عسرت - اگر دن محنت و تکلیف کے لئے ہے تو رات راحت و آرام کے لئے - دن اور رات کی تبدیلیاں تو در اصل ؎

"دنیا کی کروٹیں ہیں - تاریک اور روشن"

تکلیف و راحت کے اس احساس کو مدنظر رکھ کر فلسفۂ اخلاق کہتا ہے کہ ؎

بھوکا ہے اگر کوئی
مرتا ہے اگر کوئی
بیمار ہے گر کوئی
لاچار ہے گر کوئی
آؤ کہ بنیں ہمدم ہمسایہ و ہمخانہ

اور عیش و راحت کا جویا یہ کہ فلسفۂ اخلاق خواہاں ہے کہ دنیا اور اہل دنیا کے درمیان سے غیریت کے پردے اٹھا دے - اس لئے آپس میں ہمدردی کا رواج دینا فلسفۂ اخلاق کو انتہائے کمال تک پہونچاتا ہے - ؎

"یہ غیر، یہ اپنا ہے
یہ تفرقہ بیجا ہے
بیکار کا جھگڑا ہے
اک سا وہ جو مرنا ہے
جب بند ہوئیں آنکھیں کوئی نہیں بیگانہ

بقول مرزا غالب دنیا میں انسان کا وجود ہی آرام و تکلیف کی دو متضاد خاصیتوں میں سے مؤخر الذکر کو برداشت کرنے کے لئے ہوا ہے - اور چونکہ انسان کا وجود اسکے فنا کی دلیل ہے اس لئے ہمارا ہر آرام تکلیف کا پیش خیمہ ہے اور ہر تکلیف سے آرام کی امید کی جا سکتی ہے

---

[1] مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی + ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

لاؤ اور لیجاؤ کا بازار گرم ہے۔ اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح بغیر تاریکی کے روشنی کا لطف نہیں اسی طرح بغیر آرام کے تکلیف کا مزا نہیں۔ سچ ہے۔

"نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا"

مگر چونکہ دُنیا کی چہل پہل اسی احساس تکلیف یعنی موت پر مبنی ہے۔ اِس لئے اگر اس چہل پہل کو انسانی خدمت میں سوارت کیا جائے اور اس سے آپس کی ہمدردی قائم رکھی جائے تو تکلیف بھی ذریعۂ راحت ہو سکتی ہے۔ فلسفۂ اخلاق اسی اصول کو مدِ نظر رکھ کر مستفسر ہے کہ ؎

کیا ہم جو محبت کی اقلیم کے سلطاں ہیں — کیا ہم جو بصیرت کی مشعل کے نگہباں ہیں

کیا ہم جو صحیح معنیٰ میں محرمِ عرفاں ہیں — کیا ہم جو اس عالم میں کچھ روز کے مہماں ہیں

اِس دولتِ دنیا پر یہ جان گنوائیں گے

انساں کی مصیبت میں ہم کام نہ آئیں گے

الغرض وہ کون سے ایسے وجوہ ہیں جن پر راحت و تکلیف کا احساس مبنی ہے اور جو ہر دو احساسات میں مشترک ہیں؟۔

اُن وجوہ کا سبب تندرستی، قوت و طاقت، محنت و مشقت، علوم و فنون کی مقدار و خاصیت، ذہن و ادراک کی برکت اور استقلالِ دماغ پر مبنی ہے۔ رجحان طبیعت اور خواہشات نفس بھی راحت و تکلیف کے مشترک وجوہ ہو سکتے ہیں، مذہب و ملت اور معاشرت و اخلاق کا بھی ہر دو احساسات پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اگر ہم جذبات کے بندے ہیں اور ہم میں ہمدردی کا مادہ بہت ہے تو ہم عشق روحانی سے راحت حاصل کر سکتے ہیں مگر جسمانی راحت کو ایسی حالت میں خیرباد کہنا چاہیے۔ اگر ہم دولتمند ہیں تو جسمانی راحت ہماری غلام ہے۔ مگر راحت قلب و عیش روحانی سے نا اُمید ہونا چاہئے۔ غرض دولت و ثروت، حسن و جمال اور سن و سال پر راحت و تکلیف کا میار قائم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہماری عمر، ہماری جنس (یعنی امتیاز تذکیر و تانیث) ہماری تعلیم و تربیت، خاندان اور حکومت و قومیت کو بھی راحت و تکلیف کا مشترک سبب سمجھنا چاہئے۔ لیکن حقیقت کا اگر دوسرا رُخ دیکھیے تو ہمارے ہی کام، ہمارے ہی کردار، اور ہماری ہی خواہشات تکلیف و

راحت کا ذریعہ ہیں۔ نیکی و بدی، مدح و ذم اور صحیح و غلط کا امتیاز ہمارے کاموں ہی پر مبنی ہے۔ اور اس امتیاز میں بھی راحت و تکلیف کے احساس کا بہت کچھ حصہ شامل ہے۔

چونکہ ہر شخص دنیا میں راحت و آرام کا متمنّی ہے اس لئے اس "آرام طلبی" کو مدنظر رکھ کر فلسفۂ افادیت[1] کو راحت و تکلیف کے تضاد سے وابستہ کیا گیا ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے "وہ کام اچھے اور صحیح ہیں جو خوشی پیدا کرنے اور اُسکی مقدار بڑھانے یا خوشی کی توسیع کرنے کے لئے عمل میں آئیں۔ اگر کسی کام سے خوشی کے خلاف کچھ وقوع میں آئے تو وہ کام بُرا اور غلط ہے یہاں خوشی سے مراد راحت ہے اور ناخوشی سے تکلیف[2]"۔ یعنی خوشی و راحت محض انفرادی خوشی و راحت ہی نہو بلکہ اس سے جمہور کی فلاح بھی مقصود ہو۔ کیونکہ ہر علم جمہور کے لئے علم ہے اسی لئے فلسفۂ انبساط اور افادیت کو بھی انفرادی حیثیت سے دیکھنا گویا ان کو محدود کرنا ہے۔ غرض فلسفۂ افادیت کا اخلاقی مقصد خوشی و راحت کا حصول ہے۔

تکلیف و راحت جسم و روح کے اعتبار سے حقیقی و غیر حقیقی تقسیم میں آسکتے ہیں۔ غیر حقیقی تکلیف و راحت کے بابت اوپر بہت کچھ کہا گیا۔ اب حقیقی پہلو پر غور کرنا چاہیئے۔ چنانچہ حقیقی تکلیف وہی ہے جس سے ہمارے ضمیر یعنی احساس ایمانی کو تکلیف پہونچے۔ یہ احساس بعض ہستیوں میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ غرض سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ضمیر انسانی کیا ہے؟ وہ ایک قوت ہے جو نفس لوّامہ کے ذریعہ سے انسان کو ہر برائی سے کشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسکی راحت کو "نفس مطمئنہ" کہا گیا ہے۔ "نفس امّارہ" اسکی تکلیف ہے ضمیر وہ قوت ایمانی ہے جس کا مطمح نظر آرام ہے۔ مگر وہ ایسا آرام ہے جسکے حصول میں خواہ جسمانی و نفسانی تکالیف ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑے وہ آرام عیش قلب و مسرت روحانی کا باعث ہوگا۔ غرض روحانی مسرت کو تلف کرنے والی تکلیف حقیقی تکلیف ہے۔ اور ایسی کسی تکلیف سے نجات حقیقی آرام۔

آرام کیا ہی پیارا نام ہے۔ یہ ہمارے کانوں کو نغمہ، ہمارے دل کی راحت، اور روح کی مسرت ہے۔ آرام امیدوں بھری اُمنگوں اور خوشی پیدا کرنے والے ولولوں کا

(1) Ulilitarianism. (2) J. S. Mill.

پیش خیمہ ہے۔ آرام ہمارے جسم کی فرحت اور جان کی راحت ہے۔ یہ جسم میں صحت ہو کر دوڑتا ہے روح میں مسرت ہو کر چمکتا ہے۔ آرام ایسی چیز نہیں جیسے کہ کوئی شئے زمین پر رکھی ہو، نہ ایسی جو نفسانی دنیا میں حکمراں ہے۔ بلکہ حقیقی آرام جو تقدیس دعا کے بعد عالمِ قدس سے نورِ رحمت ہو کر ہمارے قلب پر متبسّم ہو، اور ہمکو دنیا ہی میں عالم قدس کی یاد دلا دے۔ وہ دن حقیقی عیش و راحت کا دن ہوگا جب گناہوں سے نجات پائیں گے۔ عبادت سے نہیں، رنج و غم سے سبکدوشی حاصل کرینگے، محبّت سے نہیں۔ کیا ہی مبارک دن ہوگا جب ہم "انا للہ" کے دعوے پر "الیہ راجعون" ہو جائیں گے۔ جب خود جزوِ محبّت ہو کر عالمِ قدس کی فضائے بسیط میں نورِ ایماں ہو کر ہر طرف محیط ہو جائیں گے۔ اور "مکاناً علیّاً" میں ایک لاہوتی روشنی ہو کر جا چمکیں گے۔ جب ہم "جوہرِ تخلیق" ہونے کا ثبوت دے چکیں گے اور ترانۂ عیشِ آغوشِ رحمت میں گاتے ہونگے۔ ؎

کہیں ہم نور ہونگے اور کہیں خوشبو محبت کی
کہیں توحیدِ برحق اور کہیں تفسیر وحدت کی

دکھائینگے کرشمے جنت الماویٰ کے باغوں میں
کھلینگے پھول بن کر طوبیٰ و سدرہ کی شاخوں میں

یونہی آغوشِ رحمت میں خوشی کے گیت گائیں گے
سنینگے آپ خود اور آپ ہی خود کو سنائیں گے

غزل حضرت فرخ بنارسی

فریبِ آرزو لے چشمِ فتنہ کار نہ دے
نگاہِ یاس کو تکلیفِ انتظار نہ دے

مرے ہیں کشمکشِ انتظار کے دل کو
تو اپنے وعدوں میں اک رنگ اعتبار نہ دے

چمن میں طرح تو ڈالی ہے پھر نشیمن کی
مگر یہ ڈر ہے کہ دھوکا کہیں بہار نہ دے

کرے بہت نہ کوئی ناز جامۂ زیست پر
اجل حیات کا خلعت کہیں اتار نہ دے

مجھے تو حشر میں بھی ہے نگاہِ ناز سے خوف
دبی دبائی کوئی چوٹ پھر ابھار نہ دے

بقدرِ ظرف کہاں کیفِ میکشی ساقی
جو توسرورِ باندازۂ خمار نہ دے

تمام عمر رہی شرمِ معصیت کی خلش
اب اور کوئی سزا مجھکو کردگار نہ دے

بدل سکے تو بدل دے جنوں کی فطرت کو
کہ جوش میں کوئی پھر آکے کچھ پکار نہ دے

نہ بھول بادۂ مستی کے کیف میں فرخ
کبھی سرور کہیں تلخیٔ خمار نہ دے

صیغۂ تعلیم کی بے پروائی

(گزشتہ سے پیوستہ)

(مولانا سید سبط الحسن صاحب فاضل ادب سابق لکچرار کرسچین کالج الٰہ آباد)

قواعد اُردو حصّۂ دوم (جمال الدین حیدر) کی غلطیاں

(۱) کتاب بھر میں جمع غائب کے صیغوں میں "وے" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے (ملاحظہ ہوں گردانیں صفحہ ۴۹ سے صفحہ ۹۶ تک کی) حالانکہ "وے" اُردو میں اب بالکل مستعمل نہیں ہے، جمع کے لئے بھی "وہ" مستعمل ہے۔ بجائے اس کے کہ قواعد سے بچّوں کی زبان درست کی جائے اور خراب کی گئی ہے۔

(۲) جمع متکلم کے صیغوں میں تذکیر و تانیث میں کچھ فرق نہیں ہوتا یعنی مرد بھی کہتے ہیں کہ ہم آئے تھے اور عورتیں بھی یہی کہتی ہیں۔ لیکن اِس قواعد میں جمع متکلم کے صیغے سب خلاف محاورہ لکھے گئے ہیں یعنی ماضی مطلق میں ہم لائیں۔ ماضی قریب میں ہم لائی ہیں۔ ماضی بعید میں ہم لائی تھیں۔ ماضی احتمالی میں ہم لائی ہوں وغیرہ۔ غرض تمام فعلوں میں اسی طرح خلاف محاورہ صیغے لکھے گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۴۹ سے صفحہ ۷۹ تک کی گردانیں)

(۳) صفحہ ۴۵ میں صفت ضعفی کے بیان میں ہے۔

صفت ضعفی وہ ہے کہ عدد کو دوچند کرکے اپنے محدود کو اِس صفت میں خاص کردے

تنقید۔ دُوگنا، تگنا، چوگنا، دس گنا وغیرہ صفت اضافی ہیں۔ لہٰذا دوچند کی تخصیص غلط ہے کیونکہ تگنا، چوگنا، دس گنا سے دوچند نہیں سمجھا جائیگا۔

(۴) صفحہ ۴۸ میں جمع کے قاعدوں میں ہے۔

جب کسی اسم مفرد کے آخر میں الف یا ہائے مختفی نہ ہوگی اور کوئی حرف معنوی بھی اُسکے آخر میں نہ ہوگا تو لفظاً اس کی جمع نہ ہوگی بلکہ ان کی جمعیت ان کے فعلوں سے ظاہر ہوگی۔

تنقید۔ یہ قاعدہ مذکر الفاظ کے لئے خاص ہے لہذا اس کو ظاہر کر دینا چاہیے تھا کی تخصیص نہ کرنے سے قاعدہ غلط ہوگیا۔ کیونکہ مونث الفاظ میں یہ قاعدہ جمع کا نہیں ہے۔

(۵) صفحہ ۵۹ میں مذکر و مونث غیر حقیقی کے بیان میں ہے۔

۴۔ عربی کا مصدر یا حاصل مصدر جسکے آخر میں الف ہے مذکر ہوگا۔ جیسے التجا، تمنا، استدعا، دعا، جفا۔ مگر تماشا مستثنیٰ ہے۔

تنقید۔ بالکل اُلٹی بات بیان کی گئی ہے۔ التجا، تمنا، استدعا، دعا، جفا سب مونث ہیں۔ اور تماشا مذکر ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ کتابت کی غلطی ہے یعنی بجائے مُونث کے مذکر لکھ گیا۔ تو بچوں کے لئے ایسی کتابت کی غلطی اہم غلطی ہے۔ علاوہ اس کے اُس حالت میں بھی یہ غلطی رہیگی کہ صرف تماشا ہی کا استثنا صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ اور مصادر بھی کثرت سے ہیں۔ جیساکہ اور قواعد کی غلطیوں میں لکھ چکا ہوں۔

(۶) صفحہ ۱۰۳ میں حاصل مصدر کے بیان میں ہے۔

امر حاضر کے آخر۔ آن۔ پ۔ بڑھا دو جیسے اُڑان۔ ملاپ

تنقید۔ امر حاضر کے آخر میں۔ پ۔ بڑھانے سے ملاپ حاصل مصدر نہیں بنتا۔ وہ تو ملپ ہوتا ہے۔ جو مہمل لفظ ہے بلکہ ماضی مطلق کے صیغۂ واحد مذکر غائب پر۔ پ بڑھانے سے ملاپ حاصل ہوتا ہے۔

(۷) اسم ظرف کے بیان میں صفحہ ۱۰۴ میں ہے۔

مصدر کے آخر میں۔ لفظ گاہ بڑھا دو۔ جیسے دیدن گاہ خفتن گاہ۔

تنقید۔ دیدن گاہ۔ خفتن گاہ۔ بالکل خلاف محاورہ الفاظ ہیں اور اُردو کے اسم ظرف میں ہرگز ان کا استعمال نہیں ہے۔

(۸) ۱۳۶ میں انواع جملہ کے بیان میں ہے۔

جملہ اسمیہ	جملہ فعلیہ
محمود بیٹھا ۔ مسعود سویا	موہن شریر ہے ۔ سوہن نیک ہے
منصور ذہین ہے ۔ غفور غبی ہے	بدری آتا ہے ۔ گوری جائے گا ۔

تنقید ۔ محمود بیٹھا ۔ مسعود سویا ۔ جملہ اسمیہ نہیں ہیں بلکہ جملہ فعلیہ ہیں ۔ اسی طرح موہن شریر ہے ۔ سوہن نیک ہے ۔ جملہ فعلیہ نہیں ہیں بلکہ جملہ اسمیہ ہیں کیونکہ ہے فعل ناقص موجود ہے اور شریر اور نیک خبر ہیں ۔ اور یہی شناخت جملہ اسمیہ کی اس قواعد میں بتائی گئی ہے ۔ طوالت کے خیال سے بہت سے غلط مسائل چھوڑ دیئے گئے ۔ مثلاً چند مسائل لکھے گئے ہیں ۔

رسالہ قواعد اردو حصہ دوم کی غلطیاں

(۱) صفحہ ۱۳ کے حاشیہ ذیل میں ہے ۔

واؤ معدولہ عربی لفظوں میں نہیں آتا ۔ اور زیادہ تر فارسی لفظوں میں خ کے بعد آتا ہے ۔

تنقید ۔ زیادہ تر سے معلوم ہوتا ہے کہ کم تر اور حرفوں کے بعد بھی آتا ہے ۔ حالانکہ واو معدولہ ہمیشہ خ کے بعد آتا ہے اور حرفوں کے بعد آتا ہی نہیں ۔

(۲) جمع مونث متکلم کے صیغے سب گردانوں میں غلط لکھے ہیں ۔ اردو زبان میں جمع مذکر متکلم اور جمع مونث متکلم کے صیغوں میں کوئی فرق نہیں جیسا کہ میں اور قواعدوں کی غلطیاں میں لکھ چکا ۔

(۳) صفحہ ۳۹ میں حاصل مصدر میں پیٹ ۔ لین ۔ حاصل مصدر بیان کئے گئے ہیں ۔

تنقید ۔ خالی پیٹ ۔ یا لین حاصل مصدر نہیں ہیں ۔ بلکہ مار پیٹ لین دین حاصل مصدر ہوسکتے ہیں ۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ وہاں پیٹ ہو رہی ہے ۔ بلکہ یوں کہینگے کہ مار پیٹ ہو رہی ہے ۔

(۴) صفحہ ۲۱ میں صفت کی گردان میں ہے ۔

۳ ۔ صفت	مثالیں	کیفیت
صفت تعدادی	پہلا یا دوسرا لڑکا ۔ پہلے یا دوسرے لڑکے پہلی یا دوسری لڑکی ۔ پہلی یا دوسری لڑکیاں	تبدیلی ہوئی ہے

پانچواں یا ساتواں لڑکا	پانچویں یا ساتویں لڑکے

پانچویں یا ساتویں لڑکی	پانچویں یا ساتویں لڑکیاں

تنقید - پہلی یا دوسری لڑکیاں - پانچویں یا ساتویں لڑکیاں - یہ بالکل غلط ہے اسکا مفہوم ہی نہیں - اگر جمع بنائی گئی ہے تو غلط بنائی گئی ہے -

بہ نظر اختصار بہت سی غلطیاں ترک کی گئی ہیں - مثالاً یہ غلطیاں لکھی گئی ہیں -

مبادی القواعد کی غلطیاں

(۱) یہ کتاب انگلو ورناکیولر مدارس کے پانچویں اور چھٹے درجہ میں داخل نصاب ہے - اس سے نیچے کے درجے میں یعنی تیسرے اور چوتھے درجے میں جتنی گریمریں داخل نصاب ہیں اُن سب میں کلمے کی پانچ قسمیں بتائی گئی ہیں اور اس کتاب میں عربی قواعد کے مطابق کلمہ تین قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے جسکی وجہ سے اتنے اختلافات نیچے کے درجوں کی گریمروں سے ہو گئے ہیں کہ بچے تو درکنار بڑے لوگوں کی عقل چکر میں آجاتی ہے اور کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہوتی - قریب قریب وہ سب اختلافات ہیں جو میں نے تہذیب القواعد کے سلسلے میں شروع مضمون میں لکھے ہیں اور اس لئے اُن کا دوبارہ اعادہ کرنا طوالت سمجھتا ہوں - ناظرین اگر دیکھیں گے تو خود ان پر ظاہر ہو جائیگا - ایسی تعلیم جس قدر مضر ہے وہ محتاج بیان نہیں -

(۲) ترتیب بھی اس قواعد کی نیچے کے درجوں کی کتابوں سے بالکل مختلف ہے - بالعموم ہر قواعد میں دو حصے ہوتے ہیں - پہلے حصہ میں صرف کا بیان ہوتا ہے - دوسرے حصے میں نحو کا - اس کتاب کے پہلے حصے یعنی صرف میں علم نحو کے مسائل بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے حصے یعنی نحو میں علم صرف کے مسائل بیان کئے گئے ہیں یہاں تک کہ گردانیں بھی صیغوں کی دوسرے حصے میں بیان کی گئی ہیں جو علم صرف سے متعلق ہیں -

(۳) مذکر و مونث کے بیان میں صفحہ ۱۶ میں ہے -

فائدہ - مذکر اور مونث کی عام نشانی یہ ہے کہ مذکر کے آخر میں الف یا ہ ہوتی ہے - اور مونث کے آخر میں ی -

تنقید - عام نشانی یہ ہرگز نہیں ہے بلکہ اس میں مستثنیات ہیں یا تو بطور اکثریہ قاعدہ بیان کیا جاتا بطور کلیہ نہ لکھا جاتا یا مستثنیات لکھ دیئے جاتے۔ لطف یہ کہ اسکے بعد ہی مشق میں مذکر اور مؤنث الفاظ کی نسبت جو سوال ہے اُس میں - دہی، موتی - آنکھ، کی تذکیر و تانیث بھی پوچھی گئی ہے - اس قاعدہ کو بطور کلیہ بغیر استثنا لکھنے سے لڑکے یقیناً دہی اور موتی کو مؤنث اور آنکھ کو مذکر بتائیں گے -

(۴) صفحہ ۲۲ میں - غائب - مخاطب - متکلم فعل کی قسموں میں بتائے گئے ہیں - اور صفحہ ۷۵ میں ضمیر کی قسموں میں ہیں -

(۵) صفحہ ۹۵ میں حرف ندا کے بیان میں ہے -

فائدہ - ہوت اور آلف جو فارسی کے حروف ندا ہیں یہ دونوں ہمیشہ منادی کے بعد آتے ہیں۔

تنقید - اِس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوت بھی فارسی کا حرف ندا ہے - حالانکہ ہوت فارسی نہیں ہے -

چونکہ یہ قواعد اصولاً نیچے کے اور نیز اوپر کے درجوں کی قواعد سے ترتیب میں بالکل علیحدہ ہے - لہذا مسائل کی زیادہ غلطیاں نہیں لکھی جاتیں لیکن میرے نوٹ میں بارہ غلطیاں مسائل کی بھی لکھی ہیں جو محض اُلٹ پلٹ کر جا بجا دیکھنے سے ملی ہیں -

افضل القواعد کی غلطیاں

(۱) یہ کتاب ساتویں اور آٹھویں درجہ میں داخل ہے - اس کتاب کی ترتیب مبادی القواعد سے بہت مختلف ہے یعنی پہلے حصہ میں علم صرف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں علم نحو کے مبادی القواعد کی طرح مخلوط نہیں کر دیئے گئے - حالانکہ مصنف دونوں قواعد کا ایک ہی شخص ہے - بہر حال مبادی القواعد سے ترتیب میں یہ کتاب علیحدہ ہے - اور تیسرے چوتھے درجہ کی گرامروں سے بھی مختلف ہے یعنی اس میں بھی کلمے کی تین قسمیں قرار دی گئی ہیں غرضکہ نہ تیسرے چوتھے درجے کی کتابوں سے موافق ہے اور نہ مبادی القواعد سے - جس سے لڑکوں کے دماغ پریشان ہوتے ہیں -

(۲) صفحہ ۴۸ میں اسم ظرف کے بیان میں ہے۔

کبھی اسم کے آخر میں واڑی - سال - یال - بڑھاکر ظرف مکاں کے معنی لیتے ہیں۔ جیسے پھلواڑی۔ ٹکسال۔ ننھیال۔

تنقید- پھل۔ ٹک۔ ننھ۔ کوئی اسم نہیں ہیں جس پر واڑی - سال - یال - بڑھاکر پھلواڑی۔ ٹکسال۔ ننھیال۔ اسم ظرف بنائے گئے۔

(۳) صفحہ ۵۰ میں صفت نسبتی کے بیان میں ہے۔

(۲) اگر اسم کے آخر ہ ہونے کی صورت میں تیسرا حرف ی ہو۔ یا ہ سے پہلے ی ہو تو ہ اور ی دونوں حذف ہوجاتے ہیں۔ جیسے مدینہ سے مدنی۔ برطانیہ سے برطانوی۔

تنقید- یہ کلیہ بھی صحیح نہیں ہے۔ نگینہ میں بھی آخر میں ہ ہے اور تیسرا حرف ی ہے لیکن صفت نسبتی نگینوی آتی ہے۔ دیکھ لیجئے کہ ی حذف نہیں ہوئی۔

(۴) صفحہ ۵۵ میں عدد ضعفی کے بیان میں ہے۔

دُگنا۔ تگنا۔ اور دس گنا سے عدد کا دوچند ہونا پایا جاتا ہے

تنقید- صرف دُگنا سے عدد کا دوچند ہونا پایا جاتا ہے۔ تگنا سے عدد کا سہ چند ہونا اور دس گنا سے عدد کا دہ چند ہونا پایا جاتا ہے۔

(۵) صفحہ ۸۳ میں بے جان چیزوں کی تذکیر کے ذکر میں یہ قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ جن اسموں کے آخر میں الف ہوتا ہے وہ مذکر ہوتے ہیں اُس میں جو الفاظ مستثنےٰ کئے گئے ہیں اُس میں لفظ مالا بھی ہے یعنی مالا مؤنث بتایا گیا ہے۔ مالا دہلی اور اُسکے اطراف میں بیشک مؤنث ہے لیکن لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں بلا اختلاف بالعموم مذکر بولا جاتا ہے۔ یہ کتاب یو۔پی۔ کے مدارس میں داخل کی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یو۔پی۔ میں زیادہ تر لکھنؤ کی زبان کا تتبع کیا جاتا ہے۔ اِس لئے اس کو یا تو مذکر بتاتے یا مختلف فیہ محض مؤنث لکھنا اور لکھنؤ کی زبان کو غلط ٹھہرانا مناسب نہیں ہے۔

رشک	اے شہادت میں نہیں طالب جڑاؤ ہار کا	چاہئے زیور میں مالا تیغ جوہر دار کا
ناسخ	تیرا مالا موتیوں کا قتل کرتا ہے مجھے	اسے پری مالا سروہی کا یہ مالا ہوگیا

(۶) اسی سلسلے میں اور اسی صفحہ میں ہے۔

عربی مصدر جو اوزان مندرجۂ ذیل پر آتے ہیں مذکر استعمال کئے جاتے ہیں (۱) جو اِفعال اور انفعال اور افتعال کے وزن پر آئیں۔ جیسے اکرام، انعام، انحصار، التوا، اعتبار، اختلاف۔ مگر اصلاح، افراط، ابتدا، انتہا، احتیاط، التجا، مستثنےٰ ہیں۔

تنقید۔ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ استثنا کا حصر انہیں الفاظ پر کر دیا گیا۔ کیونکہ وغیرہ کا یا اور کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ اور مصادر بھی مستثنےٰ ہیں۔ حالانکہ بہت سے مصادر ایسے ہیں کہ جو انھیں وزنوں پر مونث ہیں۔ مثلاً احتیاج۔ اعتنا۔ التماس۔ امداد۔ اعتداد وغیرہ۔

(۷) صفحۂ ۸۶ میں بے جان چیزوں کی تانیث کے بیان میں ہے۔

اُردو کے مصدر بھی جب کہ ان کے ساتھ مفعول مُونث مذکور ہو مونث ہوتے ہیں۔ جیسے بات سُننی۔ چِٹھی لکھنی۔

تنقید۔ یہ ایک اختلافی بحث ہے اور اس کا یک طرفہ فیصلہ کسی صورت سے جائز نہیں ہو سکتا۔ امیر و نیز جلال لکھنوی نے ایک مکمل اور طولانی بحث اسکی بابت کی ہے کہ علامت مصدر کسی زبان میں نہیں بدلتی اور کوئی قواعد نویس یہ نہیں لکھ سکتا کہ علامت مصدر اُردو میں سوائے نا کے نی بھی ہے۔ لہذا مصدر کسی حالت میں مُونث نہیں مستعمل ہو سکتا اور فصحائے لکھنؤ اسی کے پابند ہیں۔ اگر لڑکوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ اگر مفعول مُونث ہو تو مصدر بھی مُونث ہی مستعمل ہوگا تو کسی حالت میں یہ تعلیم صحیح نہ ہوگی اور تمام کلام فصحائے لکھنؤ کے انکو غلط معلوم ہونگے۔ لہذا اس مسئلے کو اختلافی صورت میں دکھانا چاہئے۔ پنجاب کی حمایت کرکے لکھنؤ کے فصحا کا کلام غلط ٹھہرانا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ خصوصاً اُس حالت میں جبکہ یو۔ پی۔ میں زیادہ تر لکھنؤ کی زبان کا تتبع کیا جاتا ہے۔ اور یہ گرامر بھی یو۔ پی۔ کے لڑکوں کو پڑھائی جاتی ہے تو ان کو یہ تعلیم دینا کہ تمہاری زبان غلط ہے اور پنجاب اور دہلی کی زبان صحیح ہے۔ میرے نزدیک بہت نامناسب تعلیم ہے۔ یہ قواعد پنجاب کے لئے لکھی گئی ہے۔ وہیں کے لڑکوں کے لئے موزوں ہو سکتی ہے۔ لکھنؤ و نیز اطراف لکھنؤ میں مصدر مؤنث نہیں بولا جاتا۔۔۔۔

عزیز پہلے اپنے دل کی قوت آزمانا چاہیئے پھر حریم ناز کا پردہ اٹھانا چاہئے
کرنا۔ بتانا۔ سکھانا۔ یہ مصدر کہلائیں گے۔ کرنی۔ بتانی۔ سکھانی کو کوئی مصدر نہ کہیگا۔

(۸) صفحہ ۸۹ میں مذکر کی جمع کے سلسلے میں لفظ سماں کی جمع سمیں بتائی گئی ہے اور یہ قاعدہ لکھا گیا ہے کہ جس لفظ کے آخر میں نون غنہ اور اس سے پہلے الف ہو تو اس کی جمع میں بھی الف یائے مجہول سے بدل جاتا ہے۔

تنقید۔ یہ قاعدہ شاید پنجابی زبان میں ہو۔ لکھنؤ اور دہلی کے زباں داں تو ہرگز اس قاعدہ کا استعمال نہیں کرتے یعنی جواں کی جمع جوین۔ نشاں کی جمع نشیں۔ سماں کی جمع سمیں مکاں کی جمع مکیں۔ کسی اُردو داں کی زبان پر نہیں آتی۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب پنجاب والے۔ یو۔ پی۔ کے مصنفین کی کتابیں اپنے مدارس میں نہیں داخل کرتے حالانکہ یو۔ پی۔ کی زبان مستند بھی مانتے ہیں تو پھر یو۔ پی کے مدارس میں پنجاب کے مصنفین کی کتابیں کیوں داخل ہوتی ہیں۔ دراں حالیکہ پنجاب کی زبان یو۔ پی میں مستند نہیں مانی جاتی۔

(۹) صفحہ ۹۱ میں ہے۔

اسم صفت کی جمع مؤنث دو طرح سے آتی ہے۔ ایک الف اور نون غنہ کے ساتھ۔ دوسرے صرف نون غنہ کے ساتھ۔ جیسے ترچھی۔ ترچھیاں۔ ترچھیں۔

تنقید۔ اسم صفت کی جمع اب شاید پنجاب میں بنی ہو۔ اہل لکھنؤ و دہلی تو نہیں بناتے اور کوئی فصیح یہ نہیں بولتا کہ نگاہیں ترچھیاں پڑتی ہیں یا ترچھیں پڑتی ہیں۔ لطف یہ کہ حال کی زبان بتائی گئی ہے جو پرانی زبان بھی نہیں۔

غرض اس قسم کی بہت سی غلطیاں میرے نوٹ میں ہیں جو بنظر اختصار ترک کی جاتی ہیں۔

مصباح القواعد کی غلطیاں

(۱) صفحہ ۹ میں حروف تہجی کی بحث میں ہے۔ تمام وہ حروف جن میں ہ کی آواز ملی ہوتی ہے۔ خاص ہندوستانی زبان کے حروف ہیں اس لئے کہ یہ حروف نہ عربی میں آتے ہیں نہ

فارسی میں صرف ہندوستانی زبان میں بولے جاتے ہیں۔

تنقید۔ ہائے مخلوط فارسی زبان میں کہیں کہیں مستعمل ہے۔ جیسے بھیاز (سانڈ گھوڑا) زردھشت (آتش پرستوں کے پیغمبر کا نام) دیکھو برہان قاطع

(۲) صفحہ ۲۶ میں مصدر اصلی و جعلی کی بحث میں ہے۔ کبھی فارسی مصدر سے اردو مصدر بناتے ہیں اور اُس سے فعل مشتق کرتے ہیں جیسے نواختن سے نوازنا۔

تنقید۔ نوازنا نوازیدن سے بنا ہے نواختن سے نہیں بنا۔

(۳) صفحہ ۳۲ میں فاعل و مفعول کی بحث میں ہے۔ فعل لازم کے فاعل کے ساتھ نے کبھی نہیں آتا۔ جیسے حامد چلا۔ محمود گیا۔

تنقید۔ ہگنا۔ موتنا۔ تھوکنا فعل لازم ہیں اور انکے فاعل کے ساتھ نے آتا ہے جیسے عمرو نے ہگا۔ بکر نے موتا۔ حامد نے تھوکا۔

(۴) صفحہ ۹۲ میں مفعول کے بنانے کے طریقوں میں ہے۔ ماضی مطلق پر کبھی لفظ ہوا کی جگہ لفظ گیا لگا کر مفعول کا صیغہ بنا لیتے ہیں۔ جیسے لایا گیا۔ مارا گیا۔

تنقید۔ لایا گیا اور مارا گیا ماضی مجہول کے صیغے ہیں نہ کہ مفعول کے۔

(۵) اُسی صفحہ میں ہے۔ اسم مفعول فعل متعدی سے آتا ہے کبھی فعل لازم سے بھی آجاتا ہے۔ جیسے آیا ہوا۔ گیا ہوا۔ بیٹھا ہوا۔ اُٹھا ہوا وغیرہ۔

تنقید۔ اسم مفعول فعل لازم سے آ ہی نہیں سکتا ورنہ فعل لازم کی تعریف غلط ہو جائے کیونکہ فعل لازم وہی ہے جو صرف فاعل کو چاہے۔ جو مثالیں دی گئی ہیں یہ کسی حالت میں مفعول نہیں ہو سکتیں۔ آیا ہوا۔ گیا ہوا۔ اسم فاعل کے معنی دے سکتے ہیں۔ جیسے آئے ہوئے نے کھانا کھایا یعنی آنے والے نے۔ گئے ہوئے کا نشان ملا یعنی جانے والے کا۔ اُٹھا ہوا بیٹھا ہوا اسم حالیہ ہیں۔

(۶) صفحہ ۹۹۔ حاشیہ۔ باندھنا متعدی ہے اور بندھنا اسکا لازم۔

تنقید۔ بندھنا متعدی بنفسہٖ ہے منسوب بہ مفعول اور باندھنا منسوب بہ فاعل۔

(۷) صفحہ ۱۳۷۔ اسم ظرف کی فارسی مثالوں میں لفظ نشست گاہ بیٹھنے کی جگہ کے معنوں میں لکھا ہے۔۔

تنقید: نشست گاہ فارسی میں اسم ظرف نہیں ہے بلکہ فارسی میں نشست گاہ اُس حصۂ جسم کو کہتے ہیں
جس پر بیٹھا جاتا ہے یعنی چوتڑ کی ہڈی۔ بیٹھنے کی جگہ کو نشیمن یا نشستن گاہ کہتے ہیں۔

(۸) صفحہ ۱۶۵ میں الفاظ تنکیر کی بحث میں ہے جب انکے بعد حروف عامل یا توابع عامل آئیں
تو انکی تبدیلی کسی سے ہو جاتی ہے جیسے کسی سے کچھ امید نہ رکھو۔ مگر بعض اوقات کوئی بدستور رہتا ہے
اور حرف عاملہ اُس میں کچھ عمل نہیں کرتے۔ جیسے ؎

آتا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے مہلت ۔۔۔ پھر دیکھیے آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا

تنقید۔ اس مثال میں حرف عامل یعنی کی نفظ دم پر آیا ہے نہ کہ لفظ کوئی پر۔ کوئی ہمیشہ
حروف عاملہ آنے سے کسی سے بدل جاتا ہے۔ کوئی کی نہیں کہتے کسی کی کہتے ہیں۔

(۹) صفحہ ۱۷۴ میں وجہ شبہ کی صراحت میں ہے جیسے طعنہ کا نیزہ یعنی طعنہ جو دل میں جاکر
لگنے اور زخم کردینے میں نیزے کے مانند ہے۔

تنقید۔ طعنہ ظاہری طور پر نہ دل میں لگتا ہے نہ زخم پیدا کرتا ہے بلکہ نیزے کے لگنے سے جو تکلیف ہوتی
ہے ویسے ہی طعنے سے ہوتی ہے۔ لہٰذا وجہ شبہ تکلیف ہے۔ نہ کہ دل میں لگنا اور زخم کرنا۔

(۱۰) صفحہ ۱۷۷ میں اضافت توصیفی کی بحث میں ہے۔ کبھی ایک لفظ کو اُسکی طرف مضاف
کرتے ہیں اور اُس سے تمام کے معنی لیتے ہیں۔ جیسے حالی۔

غرض عیب اپنے بیاں کیجے کیا کیا ۔۔۔ کہ بگڑا ہوا یاں ہے آوے کا آوا

تنقید۔ آوے کا آوا میں اضافت نہیں ہے یعنی کا علامت اضافت اسمیں نہیں ہے
بلکہ حرف شمول ہے۔ یہ عام مسئلہ ہے کہ نسبت تساوی اور نسبت عموم و خصوص مطلق میں اضافت نہیں ہوتی۔

(۱۱) صفحہ ۱۷۶ میں اضافت توصیفی کی بحث میں ہے۔ مضاف نکرہ بھی ہوتا ہے اور معرفہ بھی۔

تنقید۔ اِس حیثیت سے کہ وہ مضاف ہے نکرہ نہیں ہوتا ورنہ اضافت کی غرض فوت ہو جائیگی
یہ لکھنا چاہیے کہ مضاف ہونے سے نکرہ معرفہ ہو جاتا ہے۔

(۱۲) صفحہ ۲۰۷ میں ہے بعض صورتوں میں کو علامت مفعول مفعول کے ساتھ نہیں آتی
(۲) اگر مصدر مفعول ہو عام اس سے کہ اُردو کا ہو یا کسی اور زبان کا۔ جیسے زید نے کھانا کھایا۔

تنقید۔ اس مثال میں کھانا طعام کے معنی میں ہے خوردن کے معنی میں نہیں ہے لہٰذا

مصدر نہیں ہے۔ بلکہ اسم ہے۔ صرف یہ مثال غلط ہے۔

(۱۳) صفحہ ۲۴۶ میں استدراک کے حروف میں مگر ہاں ہے۔ اسکی مثال ہے ؎

مگر ہاں وہ سرمایۂ دین و دنیا　　　که اک ایک لمحہ ہے انمول جس کا

تنقید۔ صرف مگر استدراک کے لئے ہے اور ہاں تنبیہ و تاکید کے لئے۔ ہاں استدراک کے مگر کے ساتھ نہیں آتا۔

(۱۴) صفحہ ۲۵۰ میں حرف جزا کی بحث میں ہے۔ جزا مقدم ہو تو حرف شرط واجب الحذف ہوتا ہے۔ جیسے۔ غالب ؎

نہ سنو گر برا کہے کوئی　　　نہ کہو گر برا کرے کوئی

تنقید۔ ان مثالوں میں حرف جزا تو حذف ہوا ہے نہ کہ حرف شرط۔ حرف شرط گر موجود ہے۔

(۱۵) صفحہ ۲۳۸ میں حروف جارہ میں سے حرف سے کے جو متعدد استعمال بتائے ہیں۔ یہاں لکھتے ہیں۔

۸۔ بیان کے لئے جیسے احمد کو کھانے۔ پینے۔ پیسے۔ کپڑے سے کچھ کمی نہیں۔

تنقید۔ اُردو میں یوں کہتے ہیں۔ احمد کو کھانے پینے، روپیہ پیسے۔ کپڑے لتے کی کچھ کمی نہیں۔

۹۔ تفضیل کے لئے۔ جیسے زید خالد سے عالم ہے۔

تنقید۔ اُردو میں یوں کہینگے۔ زید خالد سے زیادہ پڑھا ہے۔ یا زید خالد سے زیادہ عالم ہے۔

۱۰۔ استبعاد کے لئے۔ جیسے ع تیر نکلا جو کماں سے تو گریزاں نکلا ۸

تنقید۔ اِس مثال میں سے ابتدا کے لئے ہے نہ کہ استبعاد کے لئے۔ کیونکہ نکلنے کے بعد گریزاں نکلنا تحصیل حاصل ہے۔

(۱۶) صفحہ ۲۴۳۔ الفاظ۔ بے۔ بن۔ جز۔ بغیر۔ جوں۔ طرح۔ مانند۔ سب کو حروف جر میں لکھا ہے۔

تنقید۔ بے اور بن حروف نفی ہیں اور جز اور بغیر حسب استعمال استثنا کے لئے آتے ہیں۔ جوں۔ طرح۔ مانند تشبیہ کے لئے۔ مثالیں بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔

اسی طرح کی باون غلطیاں مسائل کی میرے نوٹ میں ہیں۔ اگر کتاب بالاستیعاب دیکھی جائے تو شاید زیادہ غلطیاں نکلیں۔

(باقی آیندہ)

کلامِ ہادی

از سید اطہر حسین صاحب جعفری مقیم بھوپال

عالی جناب خان بہادر سید محمد ہادی صاحب سابق ڈپٹی کمشنر و کلکٹر و مجسٹریٹ اضلاع اودھ وآئین۔ حال ڈائرکٹر محکمۂ زراعت ریاست عالیہ بھوپال کی وہ بزرگ ہستی ہے جو کسی حلقہ میں عام اس سے کہ علمی ہو یا ادبی، محتاجِ تعارف نہیں۔ دنیا میں جتنے صاحبانِ کمال گزرے ہیں۔ انہیں سے ہر ایک کی طبیعت کا جولانگاہ صرف ایک مخصوص شعبہ رہا ہے۔ چاہے وہ علم سائنس ہو، یا ادب (لٹریچر) لیکن برخلاف اس کے قدرتِ کاملہ نے جناب ممدوح کو دونوں شعبوں میں یکساں کمال عطا فرمایا ہے۔ آپ نے سائنس کی طرف توجہ کی تو "انڈین شوگر انڈسٹری" (Indian Sugar Industry) ایسی بیمثل و بینظیر کتاب لکھ کر دنیائے 'شکر' میں ایک ہلچل مچادی۔ اور ماہرینِ فنِ شکر سازی سے اپنی خداداد قابلیت کا اعتراف کرا ہی لیا۔ ادبیات کی جانب التفات کی تو بڑے بڑے ادبائے روزگار سے دادِ سخن لے کر رہے۔ آپ کی شاعری کا طرز تمام اردو شعرا سے نرالا ہے۔ بڑے بڑے فلسفہ، سائنس اور نباتات کے دقیق مسائل اور الجھے ہوئے واقعات جس طرح آسان الفاظ اور صاف صاف بندش میں ایک کم مایہ اردو زبان کے سانچہ میں سید صاحب ڈھال دیتے ہیں اس کو سن کر اہلِ ذوق کے دل بار ہا تڑپ گئے ہیں۔ اور یہ معلوم ہونے لگا ہے کہ اردو میں بھی سب کچھ نظم ہوسکتا ہے۔ زمانہ کے ساتھ شاعری کا مذاق بھی بدل گیا۔ اس لئے سید صاحب گل و بلبل اور جام و سبو والی شاعری کی جھلک اپنے بعض پچھلے کلام میں دکھا کر ایک نئے جادے پر نکل گئے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ایک بے پیر بیابان اور بے گیاہ صحرا میں سے ایک نئی راہ سب سے الگ نکال لی اور اس راہ پر آیندہ چلنے والوں کے ہادی ہو گئے۔ کلام میں غضب کی سادگی تو موجود ہی ہے، مگر اس میں کیا نہیں ہے۔ دقیق بین نگاہیں جب غور کریں گی تو وہ اس نتیجہ پر آجائینگی۔

"جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی"

ہم ان چند سطروں میں اس خاص بات کو بیان بھی نہیں کر سکتے اور نہ زمانہ اُسکے سُننے کو ابھی تیار ہے۔ مگر یہ بات بھُولنے کے قابل نہیں کہ علوم مغربی کے چشموں سے تشنگانِ علم اپنی پیاس بُجھاکر جب ایک آنے والے دَور میں اپنی بزم صحبت کے لئے کلام کو اپنے مذاق کے مطابق ڈھونڈھینگے تو وہ اسی قسم کا کلام ہوگا جو آج کبھی موتی مسجد میں کبھی ہائیکورٹ کی صحبتوں میں ایک سادہ مزاج ایک فلسفہ داں عالم نباتات کی زبان سے سُن لیا جاتا ہے اس رنگ میں وہی جھلک ہے جو ایک حسین یورپین کو لکھنؤ کے پاکیزہ لباس پہنادینے سے پیدا ہو جاتی ہے۔

مندرجہ ذیل نظم میں آپ نے پہلے تو ایام جاہلیت (زمانۂ قبل از اسلام) کی مختصر سی تاریخ لکھ کر اُس جہالت کے تاریک پردہ کا منظر دکھلایا ہے جو صرف عرب ہی پر نہیں بلکہ کل روئے زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد اس میں اُس آفتاب ہدایت کے طلوع کا ذکر ہے جسکی پُرنور شعاعوں نے اِس کفر و جہالت کی تاریکی کو دُور کرکے اطراف و اکناف عالم کو انوار ہدایت سے معمور کر دیا۔ اور اُن اقوام کو جو قرنوں سے کفر، شرک، بغض، نفاق، کینہ۔ حسد وغیرہ غرضکہ جملہ اقسام کی بُرائیوں میں مبتلا رہ چکی تھیں پستی کے گڈھے سے نکال کر ترقی کی چوٹی پر پہونچا دیا۔ جو بذات خود ایک زبردست معجزہ ہے۔ اسکے بعد جناب سرور کائنات صلعم کے سب سے بڑے معجزے قرآن کے اس زبردست دعوےٰ کو "لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین" کو بدلائل و براہین اس اختصار کے ساتھ ثابت کیا ہے اور قرآن کے دیگر محامد اس خوبی سے بیان کئے ہیں کہ اگر ایک زبردست علم کلام کا جاننے والا انہیں باتوں کو اسی تفصیل سے بیان کرنا چاہے تو شاید متعدد جلدیں بھی اسکے لئے کافی نہ ہونگی۔ بعد ازاں مدینۂ علم اور باب مدینہ کے فضائل و مناقب ایسے صداقت سے بھرے ہوے الفاظ میں بیان کئے ہیں کہ انہیں پڑھ کر ان مقدس ہستیوں کی عظمت و جلالت کا سکہ دل پر بیٹھ جاتا ہے۔ باوجود اس درجہ قادر الکلامی کے آپ نے اپنے کلام کو شایع کرنے کی نسبت کبھی توجہ نہیں

ؔ تمہید از حضرت تمنا جونپوری بر "کلام ہادی" از نشریات دفتر شیعہ کالج لکھنؤ۔

فرمائی - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود آپ کے پاس اپنے کلام کا بہت کم حصہ باقی رہ گیا ہے۔ چونکہ مجھے ایک عرصہ دراز سے جناب ممدوح کی حاشیہ بوسی کا فخر حاصل ہے۔ اس لئے میں نے اپنی کوشش سے آپ کے کلام کا ایک بڑا حصہ اپنے پاس فراہم کر رکھا ہے جس میں متعدد قصائد اور قریب ۲۰۰ کے رباعیاں اور چند غزلیں شامل ہیں۔ اگر وقت نے مساعدت کی تو آپ کے کلام کے انتخابات اسی محترم جریدۂ "ادب" کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً ہدیۂ ناظرین ہوتے رہینگے۔

قصیدہ

عقل حیراں ہے کہ آخر وہ بشر تھے یا دواب
تھی عرب کی جاہلیت آپ ہی اپنا جواب

کینہ پرور گر نہ ہوتے وہ تو تھی حیرت کی بات
تھا شتر سے فطرۃً اُن کو مقامی انتساب

بیوفا ایسے کہ طوطے سے نہ جھپکے اُن کی آنکھ
ہوشیار اتنے کہ چالیں لے اُڑے ان سے غراب

اس قدر ڈرتے کہ بھولے سے کبھی غوطہ نہ کھائیں
آب زیر کاہ ہو - یا چاہ زیر سطح آب

اُنکے نعمت خانہ لے سادگی کے زیب و زین
جَو کی کُھری روٹیاں بھیڑوں کے ادھ کچے کباب

متحد جرگوں میں بے سر پاؤں کی باتوں میں جنگ
ہڈیوں پر جس طرح لڑتے ہیں آپس میں کلاب

یہ خطا، وہ جرم، یہ بیداد نو، وہ تازہ ظلم
رات کو اقدام اسکا دن میں اُسکا ارتکاب

دشت میں بیٹھے ہوئے کچے گھڑے کی کوئی شے
شیر ما در جان کر پیتے تھے وہ خانہ خراب

اِس نرالی سرزمیں میں گردشِ لیل و نہار
پردۂ کتماں سے لائی اک انوکھا انقلاب

گھر کے مرجھائے ہوے کھیتوں کے اوپر آگیا
آب رحمت پاش افضالِ الٰہی کا سحاب

اندریں افراد پیدا می شود پیغمبرے
ایں چنیں امرے نمی باشد مگر شئی عجاب

آمنہؓ کا مایۂ نازش - ابوطالبؑ کا فخر
حمزہؓ و جعفرؓ کی صبح آرزو کا آفتاب

حق پرستی کی صفا آگیں چمن کا تازہ گل
معرفت کے موج زن دریا کا لولوئے خوشاب

دفتر تبلیغ کے مجموعۂ افراد میں
نقش بند کاف و نوں کا سب سے پچھلا انتخاب

ماہِ نو کو جسکی ملت کے نشاں بننے پہ ناز
اوج معراج رسالت کا وہ تاباں ماہتاب

پند جسکی بے بدل تبلیغ جس کی بے غرض ۔۔۔ زہد جس کا بے ریا جس کا ورع لاجواب
تم جسے سمجھے ہوئے ہو رحمۃ للعالمیں ۔۔۔ ہم جسے مانے ہوئے ہیں شافع یوم الحساب
آسماں پر جا کے چن لایا وہی اسناد خلق ۔۔۔ واں کے سرکاری کتبخانے سے چوٹی کی کتاب
اسکا ہاتھ آنا کہ اس اُمّی کے ہاتھوں ہو گیا ۔۔۔ فیض مَا عَلَّمْتَنَا سے اک زمانہ بہرہ یاب
ایک ہی نسخہ سے سکھلایا ادب معنی بیاں ۔۔۔ فقہ منطق فلسفہ تاریخ طب حکمت حساب
کفر کے بیہوش بیماروں کی آنکھیں کھل گئیں ۔۔۔ اپنے دینی کارخانے کا جہاں چھڑکا گلاب
وہ ہی فقرے کہ کے ہستی کی حقیقت کھول دی ۔۔۔ ما بنیتم للخراب - ما ولدتم للتراب
اُسمیں حکمت کی کوئی لم تھی جہاں فرما گئے ۔۔۔ یہ حلال اور وہ حرام - اسمیں گنہ - اسمیں ثواب
تھا تفرس کا کوئی نکتہ جہاں یہ کہ دیا ۔۔۔ اسمیں لازم انہماک اور اس سے احوط اجتناب
آج یورپ کی تمنا ہے کہ چل جائے وہاں ۔۔۔ اس کا فرمودہ کہ بھولے سے نہ تو پینا شراب
اب ذرے سے ٹانک لے اسکو کہیں پر اسے حکیم ۔۔۔ بند اک لاانتہا قوا میں ہے تراآدھا انصاب
درد مایوسی کا یہ بتلا دیا حکمی علاج ۔۔۔ تم دعا مانگو - کوئی ہے - وہ کریگا مستجاب
نہی منکر - امر بالمعروف اُسکے دو نقیب ۔۔۔ پردہ برداران نقصان خطا حسن صواب
کلّیہ فرما دیا خذ ما صفا - دع ما کدر ۔۔۔ توڑ لو کانٹے ہٹا کر ہر گلستاں سے گلاب
چن لئے ہر کھیت سے اخلاق کے خوش رنگ پھول ۔۔۔ بیٹھ کر جنگل میں ان پھولوں سے ٹپکایا شہاب
جامۂ تہذیب دنیا پر چڑھایا پھر وہ رنگ ۔۔۔ جسمیں چوکھا پن قیامت کا بلا کی آب و تاب
جن کتابوں کا جو قائل ہو - انہیں سے انکار د ۔۔۔ تھا حریفوں کے لئے ترکی کا ترکی میں جواب
معجزہ یہ تھا کہ ہو جاتے تھے ساکت مدعی ۔۔۔ بات کو اسکی الٹ دیتے نہ تھی انکی یہ تاب
کلیے کیسے - کہ سکھلائے یہاں تک جزئیات ۔۔۔ یوں نہاؤ - یوں کرو مسواک - یوں باندھو خضاب
دیدیا اک رہبر خاموش قرآن مبیں ۔۔۔ ہر معمے کا جو دیتا ہے جواب باصواب
یوں ملے ہیں آیۂ تطہیر والے اسکے ساتھ ۔۔۔ جس طرح یکجا ہوں شیر و شکر و قند و گلاب
بھیجئے اور بھیجئے اور بھیجئے اُس پر درود ۔۔۔ اے غلامان غلامان غلامان جناب
اے معانی گستران نکتہ صلّوا علیہ ۔۔۔ اے خبر داران حکم حضرت ختمی مآب

چاہیے آلِ پیمبر سے تولّا چاہیے
امتثالِ امر سمجھو اس کو یا کارِ ثواب

عشق تھا جس سے نبی کو کھل چلا آخر وہ باغ
شاہدِ مقصود نے رخسار سے اُلٹا نقاب

کوند اُٹھی اس گھپ اندھیرے میں جو برقِ اتفاق
ہر بشر کے دل میں پیدا ہو گیا اک پیچ و تاب

آ چکا تھا نورِ ایمانِ حقیقی سامنے
اُٹھ چکا تھا عہدِ گمراہی کا ظلمت زا حجاب

وہ اُبھرتی قوم - وہ السّعیُ مِنّا پر عمل
چل پڑے اُس نور کے بقعہ کی جانب شیخ و شاب

طرّہ قُوا کا شعار اور ہر جادہ پیما کی یہ دُھن
سب سے پہلے ہم ہوں اس دینی دوڑ میں کامیاب

جوش کی گرمی کا پارا چڑھتے چڑھتے چڑھ گیا
اُن خطوں تک جن سے ہے نزدیک حدِّ التہاب

کر دکھایا اسکو اُن جاگے ہوئے افراد نے
گو ہوا کچھ دیر میں لیکن ہوا پورا یہ خواب

ارضِ بطحا پر یہ رنگیں کارنامے اُسکے ہیں
نام ہے جسکا محمدؐ - مصطفےٰ جسکا خطاب

اور اک پتلا بنا اُس خاکِ مردم خیز سے
جلوہ آرا یوں ہوا کعبہ میں نورِ بو تراب

وہ تمدّن کی نئی دُنیا - نئے ارض و سما
وہ مدینہ علم کا اور اس مدینہ کا یہ باب

اُس زمیں پر آ گیا اک حکمراں - اک پیشدست
اُس فلک کو مل گیا اک آفتاب - اک ماہتاب

دونوں چمکیلے - مگر اک نور پاش - اک نور چیں
چاند کو سورج سے لازم تھا ضیا کا اکتساب

تازہ گُل پھوٹے بہارِ مجمع البحرین سے
بن گیا خطّہ وہ اک فیضانِ رحمت کا دُوآب

سر کو اسکے کیا نہ بخشا تھا خدا نے جز غرور
کون سا جذبہ نہ تھا اس دل میں الّا اضطراب

اُس ڈرانی رات میں مولا کی وہ بھرپور نیند
بسترِ گُل بن گیا خیر الورٰی کا فرشِ خواب

وہ سکت پنجہ میں جس پر ید اللّٰہی کو ناز
زور وہ بازو میں جس سے کھل سکے خیبر کا باب

بزمِ اربابِ متانت میں خود اک جبل متین
بذلہ سنجوں کی جماعت میں بڑے حاضر جواب

دیکھنا سامانِ دسترخوانِ مولیٰ دیکھنا
اک نمک کی کنکری - اک نانِ جو - اک جامِ آب

بخش دی مولیٰ کو مولیٰ نے کنیزی کے لئے
فاطمہ زہرا سی مقتدر معصومہ عفّت مآب

اُس سے پیدا ہیں شہیدِ کربلاؑ جن پر نثار
آپ کا دُکھتا ہوا دل - آپ کی چشمِ پُر آب

وقت بھی کم تھا زمیں بھی سخت تھی - ہادی مگر
یہ اچھوتی نظم اپنے رنگ میں ہے لاجواب

حضرت عیسیٰ مسیحؑ کی کچھ چھوٹے بچوں سے بات چیت

(چودھری جگت موہن لال صاحب رواں ایڈوکیٹ اناؤ)

ذیل میں حضرت عیسیٰ مسیح کے کچھ اقوال نقل کئے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہونگے۔

"فصل بہت کافی ہے۔ بہت وسیع ہے۔ بہت اچھی ہے لیکن افسوس کہ اُس کے کاٹنے والے۔ کام کرنے والے کم ہیں۔ اس لئے اے بچو دعا کرو کہ خداوند تعالیٰ فصل کاٹنے والے بہم پہونچائے۔ اور کام کرنے والوں کو کام کی توفیق دے۔

جاؤ۔ اپنے راستے جاؤ۔ میں تمہیں اس طرح باہر بھیجتا ہوں کہ جیسے کوئی میمنوں کو بھیڑیوں کے سامنے ڈال دے۔

جاؤ۔ لیکن اپنے ساتھ روپیہ پیسہ یا کوئی قیمتی چیز نہ لے جاؤ۔ راستہ میں تم کو کسی کے سامنے سرِ نیاز خم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جس کسی گھر میں تم داخل ہونا ہمیشہ یہ کہکر داخل ہونا کہ خدا اس گھر پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ اگر اُس کا مکین اس قابل ہے تو خیر ورنہ خود تم پر خدا کی رحمت نازل ہوگی۔ اور اس دعا کا ثواب تمہیں حاصل ہوگا۔ مکان میں رہ کر جو کچھ بھی تمہیں صاحب خانہ دے تمہیں کھا پی لینا چاہئیے۔ مزدور کو اس کی اُجرت ملنی چاہئیے۔ دروازے' دروازے پھرنے کی تم کو ضرورت نہیں ہے۔

بچو۔ جس شہر میں بھی جانے کا اتفاق ہو اور وہاں تمہاری خاطر ہو اور جو کچھ بھی تمہارے سامنے پیش کیا جائے اُسے بخوشی قبول کرنا۔ جو لوگ تکلیف میں ہوں اُنکی تکلیف رفع کرنے کی

کوشش کرنا - اور اُن کو یہ کہکر ڈھارس دینا کہ اللہ تعالیٰ درماندوں کی مدد کرتا ہے - اگر تم کسی ایسے شہر میں داخل ہونا - جہاں تمہارا کوئی پرسان حال نہ ہو تو اُس کو بُرا نہ ماننا اور رنجیدہ نہ ہونا - گلیوں میں جاکر اہل شہر سے کہنا کہ ہم تمہارے شہر کی خاک بھی اپنے کپڑوں میں لیجانا نہیں چاہتے لیکن ہمارے عدم تواضع سے تمہارا کوئی نقصان نہ ہوگا - خدا تمہاری مدد کرے -

جو تمہاری بات سُنتا ہے وہ گویا میری خاطر کرتا ہے - جو تم سے نفرت کرتا ہے وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے - اور جو مجھ سے نفرت کرتا ہے وہ گویا اُس سے نفرت کرتا ہے جس نے مجھے اِس دُنیا میں امن و سکون قلب کا پیام لے کر بھیجا ہے -

بچو - جو کوئی تم کو قتل کی دھمکی دے - اُس سے ڈر نہ جانا - کیونکہ قتل کرنے کے بعد پھر تمہارے ساتھ اور کوئی بُرائی نہیں کر سکتا - ہاں اگر کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہوگی تو میں تم کو بتادوں گا کہ کس سے ڈرنا چاہئے - چار آنہ کی چار چڑیاں بکتی ہیں لیکن کسی چڑیا کے حقوق خداوند عالم کے سامنے فراموش نہیں کئے جا سکتے - اُس نے ایک ایک رونگٹے کا شمار کیا ہے - اور ایک ایک رونگٹے کی اُس کی نگاہوں میں قدر ہے - تم کو ڈرنے کا کوئی سبب نہیں - جب وہ چڑیوں کے حقوق فراموش نہیں کرتا تو تم انسانوں کو وہ کیسے بھول سکتا ہے - یقین کرو کہ جو شخص باڑے کے اندر دروازے سے داخل نہیں ہوتا اور دیوار پھاندنے یا نقب لگانے کی کوشش کرتا ہے وہ چور اور مجرم ہے - لیکن جو باڑے کے دروازے سے داخل ہوتا ہے وہ گلہ بان کے گلے میں شامل ہو جاتا ہے - گلہ بان اُنکی نگہداشت کرتا ہے - اُن کے رکھ رکھاؤ اور عافیت کا ذمہ دار ہوتا ہے - یہ گلہ اپنے گلہ بان کی آواز پہچانتا ہے اور گلہ بان گلہ کی خیر و عافیت اپنی خیر و عافیت سمجھتا ہے - یقین کرو بچو کہ جس باڑے میں تم کو داخل ہونا چاہئے میں اُس کا دروازہ ہوں - میرے سامنے وہ بھی آتے ہیں جو دروازے سے داخل ہونے کے خواہشمند ہیں اور چور اور نقب زن بھی آتے ہیں - جو دروازے سے داخل ہونگے وہ ہری گھاس کے مستحق ہونگے اور اُس سے پرورش پائینگے - چور، ڈاکو ہمیشہ قتل و غارت کی فکر میں رہتے ہیں - میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ میں تم کو نور اور حیات کا پیام دوں - میں رحم دل گلہ بان ہوں - میں اپنے میمنوں کے لئے اپنی جان تک قربان کر دینا اپنا

فرض سمجھتا ہوں - جو رحم دل گلہ بان نہیں ہے محض مصنوعی محافظ ہے وہ اپنے میمنوں کو چھوڑ دیتا ہے اور بھیڑئیے کو اُن کی طرف آتا دیکھ کر خود خوف زدہ ہو کر اُس جگہ سے ہٹ جاتا ہے چاہے بھیڑیا میمنوں کو شکار ہی کیوں نہ کرلے - خدا کے نزدیک معصوم دل سب سے زیادہ رحم اور عنایت کا مستحق ہے - اِس لئے اے بچو چاہے تم کتنے ہی بڑے اور سیانے کیوں نہ ہو جاؤ تم اپنے دل کو بچوں کی طرح معصوم رکھنا جس شخص کا دل سب سے چھوٹے بچے کی طرح معصوم ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں سب سے بڑا ہے - بچو یاد رکھنا جس طرح کوئی گلہ بان اپنے گلے کا ایک میمنا بھی کھونا پسند نہیں کرتا - اور اگر کوئی کھو جاتا ہے تو بقیہ کو چھوڑ اُس کھوئے ہوئے کی تلاش میں جاتا ہے اور جب محنت مشقت کرکے اُسے ڈھونڈھ نکالتا ہے تو اُسکی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی - اسی طرح اگر سو آدمیوں میں ایک گناہگار ہے اور بالآخر اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو خدائے کریم خوش ہو کر اُس کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دیتا ہے - جس طرح کوئی غریب عورت اگر اُس کا ایک پیسہ گر پڑتا ہے تو چراغ جلا کر گھنٹوں ڈھونڈھتی ہے - اور جب تک اپنا پیسہ تلاش نہیں کرلیتی اُس کے دل کو تسلی نہیں ہوتی - اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے کھوئے ہوئے بندے کو کھویا ہوا نہیں سمجھتا - اللہ تعالیٰ اپنے ایک ایک گناہگار پر نظر رکھتا ہے "

غزل سید سرفراز حسین صاحب خبیر رضوی لکھنوی شاگرد حضرت آوج مغفور

سر تھا سجدے کے لئے - سجدہ تیرے در کے لئے
ہم نے بوسے اسی نسبت سے مقدر کے لئے

ہاتھ ساقی کا جو کانپا تو گرا جام شراب
یہ بھی الزام تھا میرے دل مضطر کے لئے

آکے ہستی میں بھی دل سے نہ گئی یاد عدم
روح بیتاب ہے چھوٹے ہوئے گھر کے لئے

منتِ غیر سے نفرت جو طبیعت کو رہی
کام چھوڑا نہ کوئی ہم نے مقدر کے لئے

مژدۂ اجر شہادت جو سنا عاشق نے
دہنِ زخم سے بوسے لب خنجر کے لئے

خون دل ہو چکا - باقی ہے فقط خونِ اُمید
اک ستم اور سہی طبع ستمگر کے لئے

دل کو ہے مدحتِ شبیر سے آرام خبیر
اب غزل کہنا مصیبت ہے ثنا گر کے لئے

آسمانِ شاعری کا آفتاب

(فاطمہ بیگم صاحبہ منشی)

محترمہ فاطمہ بیگم اُن خوش نصیب بہنوں میں ہیں جن کے علم و ادب کے فطری ذوق کو تحصیل علم کا موقع ملا ہے۔ اور وہ طلب علم میں لگی ہوئی ہیں۔ ذیل کا مضمون انکی نثر نگاری کی ابتدائی کوششوں کا ثبوت ہے۔ صورتِ حال امید افزا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم اسے صفحات "ادب" میں خوشی کے ساتھ جگہ دے رہے ہیں۔ اگرچہ ایسے بلند مرتبہ شاعر کے لئے اتنا مختصر سا مضمون بہت تشنہ ہے لیکن پھر بھی ہمیں اُمید ہے کہ اس سے شاد کی روح ضرور شاد ہوگی۔ اور وہ اس لئے کہ اسکی لکھنے والی خود شاعر کی "نواسی" ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ موصوفہ اپنے اس قابل قدر شغلے کو جاری رکھینگی اور بہت جلد کافی مشق بہم پہونچا لینگی۔ "ادب" ایسی بہنوں کے مضامین شایع کرنا اپنے مقصد کی تکمیل سمجھتا ہے اس لئے اسکی طرف سے یہ صلائے عام ہے۔ (مدیر)

سیّد علی محمد صاحب متخلص بہ شاد عظیم آباد پٹنہ کی مردم خیز سرزمین سے ۱۸۴۶ء میں اُٹھے تھے۔ وہیں بڑھے پلے۔ وہیں شاعری کو فروغ دیا۔ آپ کے والد کا نام سیّد عباس مرزا تھا۔ آپ کا خاندان رُوسائے عظیم آباد کے معزز و مقتدر خاندانوں میں سے تھا۔

ذوق شاعری آپ کو فطرت کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ پانچ برس کے سن میں آپ کو فارسی اور اُردو کے اچھے اچھے اشعار یاد تھے۔ آگے چل کر خود بھی مشق سخن فرمانے لگے لیکن آپ کی شاعری کا ستارہ اُس وقت اوجِ فلک پر چمکا جب آپ مشاعروں میں اپنے زورِ طبع کا جوہر دکھانے لگے۔ سخن شناس آپ کا کلام سُن سُن کر تعریفیں کرتے اور صاحبانِ فہم آپ کے کمالات کے معترف ہوتے تھے۔

لیکن دُنیا کا قاعدہ ہے کہ جب کسی لائق فرد کے کمالات کا اعتراف کیا جانے لگا۔ اور اُسکے علمی و ادبی کارنامے محبّت کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے تو بعض حلقوں سے فوراً اُس کے خلاف حسد کی نمایش کا آغاز ہوگیا۔ اور اُس کے کمال کے آفتاب پر خاک ڈالی جانے لگی۔ کیونکر ممکن تھا کہ حضرت شاد حاسدوں کی آنکھوں میں نہ کھٹکتے۔ ابتدا میں ان لوگوں نے آپکی شاعری کو حاسدانہ نکتہ چینیوں سے مٹانا چاہا لیکن یہ کوشش بیکار تھی حقیقی کمال ان اوچھے حربوں سے نہیں کھوتا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ جو پہلے شاد کے کلام کی خوبیوں کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے تھے وہ بھی اپنی روش بدلنے پر مجبور ہوے اور اس شاہ سخن نے دشمنوں سے بھی خراج تحسین وصول کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاد نے اُردو شاعری کی تجدید میں کافی حصہ لیا ہے اور بہت کارہاے نمایاں کئے ہیں۔ آپ غزل گوئی میں جس طرح اُستاد یگانہ تھے اُسی طرح مرثیہ گوئی میں بھی فردِ فرید تھے۔ گلشنِ غزل کا یہ باغبان لالہ زار مرثیہ کی بھی آبیاری کرتا تھا اور دونوں بہارستانوں کی سیر میں مشغول رہتا تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ میر انیس مغفور جب عظیم آباد کی مجلس پڑھنے آتے اور اُن کے کلام کے شیدائی جمع ہوکر داد دیتے تو حضرت شاد کی زبان سے جو ستائشی الفاظ نکلتے میر صاحب اُن کی دل سے قدر کرتے تھے۔

حضرت شاد کی شاعری مجازی حسن و عشق کے چونچلوں کی تصویر کشی نہیں کرتی۔ اُس کا روے سخن عشق حقیقی کی طرف ہوتا ہے

آپ کے کلام کے خزانہ میں اخلاق، فلسفہ، تصوف، توحید، ہر طرح کے خوش آب جواہر موجود ہیں تخئیل و محاکات بہت زیادہ ہیں۔ تغزل میں میر کے انداز پائے جاتے ہیں مرثیہ میں مضمون آفرینی۔ سلاست بیان، فصاحت، چستی، بندش، صفائی، لب و لہجہ حد درجہ قابل داد ہے۔

آپ جس پایہ کے شاعر تھے۔ اُسی پایہ کے نثّار بھی تھے۔ اُردو کا سب سے پہلا اخلاقی ناول "صورت الخیال" مشتمل بر سہ حصص آپ ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس ناول کی ہندوستانی اور انگریزی اخباروں نے بہت کچھ تعریفیں کی ہیں۔ اسکے علاوہ آپ کے تصنیفات کی فہرست بہت سی فارسی اور اُردو کی عمدہ مصنفات پر مشتمل ہے۔

آپ نے پہلی جوبلی کے موقع پر چند دلپذیر اشعار کہہ کر ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھیجے تھے اُنھیں یہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ مدت تک شاہی محل میں آویزاں رہے اور خصوصیت سے ملکہ نے ان اشعار کے شکریہ کا خط آپ کو لکھا۔

سنہ ۱۸۹۱ء میں حکومت کی طرف سے آپ کو "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا تھا اور بتیس ۳۲ برس تک آپ مکمل اختیارات کے ساتھ آنریری مجسٹریٹ اور چودہ برس تک میونسپل کمشنر رہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر تھا۔

آپ کی سیرت نہایت عمدہ تھی۔ عادات واطوار میں پرانی شرافت کے آثار پورے طور سے نمایاں تھے۔ آپ کے خیالات میں وسعت تھی، رواداری آپ کا مخصوص شیوہ تھا۔ دوست دشمن کے ساتھ یکساں ملتے اور حافظ شیرازی کا یہ شعر ہر وقت پیش نظر رکھتے تھے۔ ؎

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است　　با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

اِس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ شاد مرحوم نے اپنی شاعری کے معجزوں اور دوسری بیش بہا تصنیفوں کے ذریعہ سے ملک اور ابنائے وطن کی جو خدمتیں کی ہیں وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔

افسوس کہ ۷ جنوری سنہ ۱۹۲۷ء کو اس چہکتے ہوئے بلبل کی زبان بند ہوئی اور دنیا جن زمزموں کو کان لگائے سُن رہی تھی اُن سے وہ یک بیک محروم ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کا کچھ کلام ہدیۂ ناظرین ہے:۔ ؎

نہ پوچھو شان اپنے میکدہ کی　　یہاں ہر مغبچہ پیرِ مغاں تھا
کریں جاکر کہاں یارب بسیرا　　گئی وہ شاخ جس پر آشیاں تھا
بچھا کر جو گیا بستر پہ کانٹے　　وہی ظالم مرا آرامِ جاں تھا
دلِ مضطر کا شکوہ کیا کروں شاد　　کہ دشمن تک ہمارا راز داں تھا

ستم ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا　　زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا دُور ہو جانا
خیالِ وصل کو اب آرزو جھولے جھلاتی ہے　　قریب آنا دلِ مایوس کے پھر دُور ہو جانا
سبو ساقی کا ہے ساقی کی میکش کون ہے رندو　　ستم ہے دوسرے کے مال پر مغرور ہو جانا

دے کے تھی سبو مجھے صبر کا حوصلہ دیا جس کی طلب تھی ساقیا اُس سے کہیں سوا دیا
بیٹھے بٹھائے باغ خلد مجھکو یہیں دکھا دیا اُسکی زباں پہ میں نثار جس نے ترا پتا دیا
مل نہ گیا ہو ساقیا دُرد کہیں زلال سے مجھکو دکھا کے جام مے تو نے عبث ہلا دیا
بخش دیا تھا عشق کو صبر گریز پا اگر حُسن کو تو نے کس لئے غمزۂ دلربا دیا

چارہ گر کون زمانے میں ہے چارا کس کا؟ آپ تو اپنا سہارا ہے سہارا کس کا؟

یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا ہنسو گے خود اس چمن پہ غنچو زمانہ آنے دو فرامُو کا
کسیکو آب و ہوا موافق ہوئی نہ افسوس اس چمن کی ہمیشہ مرغِ چمن کراہے ہمیشہ غنچوں نے خون تھوکا
جو دل سے دنیا کو چھوڑ بیٹھے اُنہیں کے تھے مستقل ارادے جو اسکی جانب سے منہ کو پھیرا تو پھر نہ اس بیوفا کو تھوکا
پکار کر وحشیوں سے کہہ دو بہار کے دن بھی ہیں غنیمت قبا کے دامن کو ٹانک تو لیں اگر نہ موقع ملے رفو کا
فلک پہ رنگِ شفق کو دیکھو بھگو دو اشکوں سے شاد دامن جما ہوا خوں اسے سمجھ لو کسی کی نازک رگِ گلو کا

کٹے تیغ سے بھی اگر گلا ترے ظلم کا نہ کروں گلا کہوں جا میں یہی برملا کہ انا الشہید بہ کربلا
ترا نور جب سے ہوا عیاں ہوا آشکار جو تھا نہاں چمک اُٹھے دشت و جبال و دمن شعشعا متزلزلا
مرا سر ہے جو سرِ سناں مرا تن ہے خاک پہ خوں چکاں لبِ خم سے یہ کروں عیاں کہ انا القتیل حُسن ملا
رہِ عشق میں جو رکھا قدم چلے اس طرح سے بخوف غم چلیں حاج جیسے سوئے حرم متساعیا متہرولا
جو رضا تری ثمر اسکا ہی تو سکون صبر میں اسکے گل ہے عجیب چیز نہاں غم نہ ہمیں کو شاد مگر یہ بھلا
مری عمر شاد تمام تر اسی گومگو میں ہوئی بسر نہ کلام کرنے سے غم گھٹا نہ خموشیوں سے کٹی بلا

محو ہیں اپنی جگہ آسودگانِ کوئے دوست آرزو دل میں ہے واں آنکھیں کھلیں سوئے دوست
زندگی تا چند محراب دعا میں کاٹیے کاش اک دن تیغ کر چھوڑے خمِ ابروئے دوست
نکلے آتے ہیں زمیں سے پھول کس کس رنگ کے شعبدے دکھلا رہی ہے نرگسِ جادوئے دوست

لاشۂ عریانِ عاشق کا کوئی دیکھے وقار
ڈھانکتی ہے اُٹھ کے کس الفت سے خاکِ کوئے دوست

دیکھئے کب ہو پذیرا ہم گنہگاروں کی عرض
داغ بھرے ہاتھوں کے اوپر ہیں نظر ہیں سوئے دوست

دہر میں کیا کیا ہوئے ہیں انقلاباتِ عظیم
آسماں بدلا زمیں بدلی نہ بدلی خوئے دوست

شادؔ اہلِ شماتت نہیں شک میں پڑے رہ جائینگے
ہم انہیں آنکھوں سے اک دن دیکھ لینگے روئے دوست

سر پہ کلاہ کج دھرے زلف دراز خم بہ خم
آہوئے چشم ہے غضب ترک نگاہ ہے ستم

عشوۂ دلگداز وہ ذبح کرے جو بے چھری
ناز وہ دشمنِ وفا رحم کی جس کو ہے قسم

وقتِ عزیز جو گیا اُس کا محال ہے وجود
جتنے زمانے طے کئے طے ہوئی منزلِ عدم

نرگسِ پُر خمارِ یار کرتی ہے کام زہر کا
بادۂ خوشگوار میں گھول دیا کسی نے سم

نہ آئینے کا قصہ اور نہ حالِ شانہ کہتے ہیں
حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

ہنسانا اور رُلانا بیوفا دنیا کی خصلت ہے
ہم اس انداز کو اندازِ معشوقانہ کہتے ہیں

ازل سے اپنی گردن پر ہے احساں اپنے چلو کا
خدا جانے کسے ساغر کسے پیمانہ کہتے ہیں

انہیں غزلوں پہ حال آتے ہیں میخانے میں رندوں کو
انہیں شعروں کو میکش نعرۂ مستانہ کہتے ہیں

چھپاؤ لاکھ پر صورت پرستی سے نہیں خالی
جو ہیں اہلِ نظر کعبہ کو بھی بتخانہ کہتے ہیں

تعلق لاکھ ہو پھر بھی جہاں سے بے تعلق ہیں
اسی کو تیرے عاشق ہمتِ مردانہ کہتے ہیں

بسے ہیں کیسے کیسے ذی شرف گورِ غریباں میں
بڑے بے درد ہیں بستی کو جو ویرانہ کہتے ہیں

ناز کرشمہ ساز کیوں غمزۂ دلنواز کیوں
سب تو ہیں تیرے مبتلا اس پہ یہ امتیاز کیوں

ہم سے اگر ہوا نہ ضبط ہم نے کیا جو کچھ کیا
ہم پہ اگر نہ تھا وثوق ہم سے بیانِ راز کیوں

قامتِ فتنہ خیز کو خواہشِ حشر کس لئے
بازوئے نو کی فکر میں نرگسِ نیم باز کیوں

شادؔ سخن کی جان ہے بادۂ نغمہ و سرور
آپ تو شعر کہتے ہیں آپ کو احتراز کیوں

وہ میری قبر پہ جب بے نقاب آنے لگے — چراغ جتنے لحد پر تھے جھلملانے لگے

وہ نیم جاں ہمیں مقتل میں چھوڑ کر جو چلے — ہزاروں وسوسے کم بختِ دل میں آنے لگے

اثر اب اس سے زیادہ وفا کا کیا ہوگا — قسم ہماری محبت کی لوگ کھانے لگے

بہت دنوں پہ جو محشر میں وہ نظر آئے — سب اپنی اپنی کہانی انہیں سنانے لگے

بروزِ حشر بڑھا یہ جلالِ حسن اُن کا — کہ انبیائے اُلوالعزم تھرتھرانے لگے

انہیں سے بھی سخن سنج نے ثنا کی شاد — یہ چند شعر جو مونس کو ہم سنانے لگے

ترے مہماں ہیں جہاں بٹھا سرِ عرش روئے زمیں سہی
ہمیں بیٹھے رہنے سے کام ہے کوئی جا نہیں تو نہیں سہی

ہمہ شب زخیل کرو بیاں رسدایں صدائے مہیمنے
کہ مرے محاسبہ سے ڈرو مری بخششوں کا یقیں سہی

درِ میکدہ کے شگاف سے تجھے جھانک لیں یہی ٹھنی ہوئیں
یہ نہ ہو تو پھر درِ صومعہ جو قریب ہو تو وہیں سہی

نہ مٹیگی دل سے یہ آرزو کہ لگا کے آنکھوں سے چوم لوں
ترے پاؤں تک نہیں دسترس ترے آستاں کی زمیں سہی

جسے پاک رکھنے کی تھی ہوس وہ تو تیرے در پہ پہنچ گئی
یہ جو مشتِ خاک زمیں پہ ہے اسے پھینک آؤ کہیں سہی

لمعاتُ وجہکَ اشرقتْ وشعاعُ طلعتکَ اعتلےٰ
کہ سب اس میں جل کے فنا ہوئے خسِ کفر و خرمنِ دیں سہی

طے شاد کچھ تو ہمیں مزہ کوئی ماحصل بھی تو شعر کا
جسے جذب کر لے مذاقِ دل نہ مٹھاس ہو نمکیں سہی

دیکھنا غافل ذرا دنیا کو پہچانے ہوئے — کل جو قصے پیش پا تھے آج افسانے ہوئے

ساکنِ شہرِ خموشاں تیرے دیوانے ہوئے
بستیاں سونی ہوئیں آباد ویرانے ہوئے

ہوش جبتک تھے نہ دی ساقی نے بھربھر کر شراب
میرے بیخود ہوتے ہی لبریز پیمانے ہوئے

کچھ تو راحت دے رہیں اے گوشۂ تاریکِ تنگ
آئے ہیں سارے بیابانِ جنوں چھانے ہوئے

اک یہ دل ہی جسکی حالت آج تک ہے ایک سی
شہر کتنے بس گئے اور کتنے ویرانے ہوئے

دیکھ کر کعبہ کی صورت کیوں نہ حیرت دل کو ہو
کیسے کیسے اے فلک ویران بتخانے ہوئے

دشتِ وحشت میں کسی جانب نظر کرتا نہیں
تیرا دیوانہ چلا جاتا ہے کچھ ٹھانے ہوئے

منزلِ عرفاں سے کوئی مست گزرا ہے ضرور
جابجا رستے میں کیوں آباد میخانے ہوئے

جب چلے دنیا سے پھر کر ہم نے دیکھا بھی نہ شاد
اقربا کی کیا خطا ہم آپ بیگانے ہوئے

ستم ڈھائیگا کیا حکمت سے مل کر نفس امّارہ

(حضرت نجم آفندی۔ اکبرآبادی)

کہا اک مہرباں نے کچھ خبر ہے آپ کو حضرت
بجا رکھا ہے کیا سائنس نے دنیا میں نقارہ

یہ رفتارِ ترقی جانے کس نقطہ پہ دم لے گی
کہ تیغ دہر سے دل ہوئے جاتے ہیں چوپارہ

کبھی کا اہلِ مغرب نے خدا کو کردیا رخصت
مگر مذہب کے پھندے میں ابھی مشرق ہے بیچارہ

بدل جاتی ہے اب انسان کی پیری جوانی سے
ستم ڈھائے گا کیا حکمت سے مل کر نفس امّارہ

سُنا ہے ایک دن دست و گریباں ہونے والا ہے
فضا میں صانعِ قدرت کے سیّارہ سے طیّارہ

مسخر حضرتِ انساں نے کی ہیں قوتیں کتنی
تعجب ہے نہ ہو گر حکمت و قدرت میں بٹوارہ

خدا کو آپ مانیں گے کہاں تک دیکھنا یہ ہے
ہمیں تو اب سوا انکار کرنے کے نہیں چارہ

کہا میں نے کہ پیرو آپ کے ہو جائیں گے ہم بھی
مگر جب موت کا موقوف ہو جائے گا ہرکارہ

"پاگل؟"

(سید علی عباس صاحب حسینی ایم۔اے)

مظفر پاگل ہے۔ یقینی پاگل ہے۔ اسکے پاگل ہونے میں اور لوگ شک کریں تو کریں مگر اُس شخص کو تو مظفر کی دیوانگی کا یقین ہی کرنا پڑیگا جس نے اُسے دن کے دو بجے اور رات کے بارہ بجے چٹیل میدانوں اور سنسان ویرانوں میں "زہیلا پانی، سنہرا پانی" گاتے سُنا ہے۔ خود مظفر کو نہ ان فقروں کی مہملیت کا احساس ہوتا ہے اور نہ اپنی آواز کی عدم موسیقیت کا۔ وہ گھنٹوں جھوم جھوم کر "زہیلا پانی، سنہرا پانی" کہتے سے ملتی جلتی آواز میں اس خوش الحانی سے گایا کرتا ہے کہ بھولے بھٹکے راستہ چلنے والے کانوں میں اُنگلیاں دے لیتے ہیں۔ اور آس پاس کی ہری ہری گھاس چرنے والے چوپائے بھڑک بھڑک کر دُور بھاگ جاتے ہیں۔

اسکی وضع قطع بھی پاگلوں کی سی ہے۔ سر اور داڑھی کے لمبے لمبے بالوں میں منوں گرد بیٹھی ہوئی۔ بڑی بڑی خون کبوتر آنکھوں میں کیچڑ بھری ہوئی اور موٹے موٹے ہونٹوں کی باچھوں میں کف کی دھڑی جمی ہوئی ہے۔ سر پر میلی چکٹ ٹوپی۔ بدن میں لمبا متعفن کرتا۔ اور ٹانگوں میں موٹا ارکین کا پائجامہ ہے۔ اُسکی بھی یہ حالت کہ گھٹنوں تک ہر وقت کیچڑ میں اٹا رہتا اور ٹخنوں سے نیچا ہو کر موزے کا کام دیتا ہے۔ پاؤں میں جوتا خواہ نیا ہو یا پُرانا۔ چپٹا ضرور کر دیا جاتا ہے اور اسے اس طرح زمین پر کھینچا جاتا ہے جیسے راہ چلنا اور جھاڑو دینا دونوں کام بیک وقت ضروری ہیں۔ بھلا ان باتوں کے بعد کون کہیگا کہ مظفر پاگل نہیں ہے؟ سارا گاؤں اسے پاگل سمجھتا اور پکارتا ہے۔ آپ بھی یہی کہینگے اور یہی سمجھیں گے۔ مگر..... مگر مظفر کی ماں ہر شخص سے لڑنے کے لئے تیار ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ وہ اُسکی آنکھوں کا تارا، زندگی کا سہارا ہے۔ نہ شوہر زندہ ہے، نہ بھائی اور نہ دوسرے اعزا۔ نہیں یہ درست نہیں۔ اعزا ایسے اعزا جن سے اُس سے خونی رشتہ ہے ضرور زندہ و سلامت ہیں۔ دیور بھی ہے بھاوج

بھی۔ بھائی کے لڑکے بھی ہیں اور بہن کی اولاد بھی۔ ہاں مگر ایسا عزیز جو اس بیوہ کے دکھ درد میں شریک ہو۔ جو اس سے یہ پوچھے کہ "بی بی تمہارے دل پر کیا گزرتی ہے۔ تم اپنے دن کیسے کاٹتی ہو" کوئی نہیں۔

اسی لئے اُس کی ساری دُنیا سمٹ کر مظفر میں محدود ہو گئی ہے۔ وہی اُسکی ساری کائنات ہے۔ پیری اور بیوگی۔ اپنی کوکھ کا پیدا۔ اُسی طرح گود کا پالا اور کھلایا ہوا جس طرح دنیا جہان کے بیٹے ہوتے ہیں۔ وہ بیٹے بھی جو ماں باپ کو سونے چاندی کے محلوں میں رکھتے ہیں۔ اور وہ فرزند بھی جو بیویوں کے کہنے میں آکر والدین کے جنازے کو کاندھا تک نہیں دیتے۔ پھر بھلا مظفر کو دیکھکر اِس بُڑھیا کی چھاتی مامتا سے کیوں نہ پھٹنے لگے؟ اور وہ اسے پاگل پکارنے والوں کو کیوں نہ پانی پی پی کر کوسے؟

اور بھئی ایمان ہے تو جہان ہے۔ مظفر سب کے لئے پاگل ہو تو ہو۔ مگر اپنی بیوہ ماں کے لئے تو وہ ہزاروں "ہشیاروں" سے اچھا ہے۔ جہاں ماں نے کوئی کام بتایا اور وہ سر آنکھوں سے اُسے بجا لانے کے لئے دوڑا۔ اور حرف حرف پورا کیا۔ کیا مجال کہ ذرا سا فرق تو ہو جائے۔ مینہہ پڑتا ہو، یا اولے گرتے ہوں۔ گرمیوں کی دوپہر ہو یا جاڑوں کی رات۔ گاؤں ہی میں کام ہو یا دو چار کوس کے فاصلے پر مظفر اس وقت تک دم نہیں لے سکتا ہے جب تک کہ ماں کا حکم نہ پورا ہو جائے!

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مدتوں کے وطن آوارہ جب مکان پلٹتے ہیں تو مظفر کی ماں بیٹے سے سلام کہلا بھیجتی ہے مظفر ڈیوڑھی میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ چیخ چیخ کر نام لیتا جاتا ہے اور "اماں نے سلام کہا ہے، اماں نے سلام کہا ہے" کی رٹ اُس وقت تک جاری رکھتا ہے جب تک کہ مخاطب صحیح سامنے نہ آجائے اور اسے جواب سلام نہ دیدے۔ لوگ ایسا بھی کرتے ہیں کہ مظفر سے غلط طور پر یہ کہہ دیتے ہیں کہ "بھیا وہ اس وقت یہاں نہیں ہیں" وہ ذرا کھانس کر پوچھتا ہے "اماں نے اُن کو سلام کہا ہے۔ کہاں ہیں؟" پھر اگر کسی دوسرے گاؤں سے متعلق کوئی کام ہوا کہہ دیا "فلاں گاؤں گئے ہیں" مظفر فوراً وہاں جانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ جب دو چار قدم چل لیتا ہے تو دھوکا دینے والا جلدی سے کہتا ہے "ہاں

تو مظفر تم وہاں جا ہی رہے ہو ذرا یہ کام بھی کرتے آنا" مظفر غریب محض ماں کا سلام پہونچانے کے لئے کوس دو کوس کے فاصلے پر دوسرے گاؤں تک ضرور چلا جاتا ہے اور خواہ پیامبری کے فرائض نہ ادا ہوں اور اسے مایوس واپس آنا پڑے لیکن بیوقوف بنانے والے کا کام ضرور انجام پا جاتا ہے۔ یقینی حد درجہ حماقت۔ سادگی اور دیوانگی ہے مگر—— مگر!——

ایک بار برسات میں جب کہ ندی نالے۔ دریا سب کے سب اُمڈے ہوئے تھے اور پانی ہفتوں سے متواتر برس رہا تھا کسی شادی کے سلسلے میں مظفر کی ماں کو ایک جگہ برادری میں جانا تھا۔ شادی بیاہ کا معاملہ تھا۔ نئے کپڑے اور نیا جوتہ ہونا چاہئے۔ کپڑے تو خیر بکس میں موجود تھے مگر جوتہ کیونکر آئے؟ کئی وقت فاقے کئے گئے اور "اِن سے اُن سے" قرض اُدھار لیکر دام جمع ہوئے پانی الگ دم لینے نہ دیتا تھا۔ انتظار ہونے لگا کہ وہ کھلے تو مظفر شہر بھیجا جائے اور جوتہ آئے۔ خدا خدا کرکے ساتویں دن تھوڑی دیر کے لئے بالکل اس طرح کھُل گیا جیسے کوئی غمزدہ روتے روتے تھک کر چپ ہو جاتا ہے۔ بڑی بی جلدی سے ہمسائی سے اُنکی جوتی مانگ لائیں اور اسے مظفر کو دکھا کر بولیں "دیکھو بیٹا! یہ جوڑا ہمسائی کے میاں سوا دو روپیے میں شہر سے لے آئے ہیں۔ تم بھی وہاں سے جاکر میرے لئے خرید لاؤ"

مظفر نے ہمسائی کی جوتی اُلٹ پلٹ کر دیکھی۔ اپنے پائجامے کو ٹخنوں کے پاس سے موڑ کر گھٹنوں تک چڑھایا۔ ماں سے روپے لیکر ازار بند میں باندھے اور کئی گرہیں دے کر ازار بند کمر میں کھونسا یا۔ ہنستا، کھانستا، تھوکتا اور "ستھرا پانی، پہلا پانی" گاتا ہوا گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

تین کوس کی مسافت پیدل طے کرنا تھی، وہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے کر ڈالی۔ شہر میں داخل ہوا۔ ہر دکان پر خواہ وہ میوہ فروش کی ہو یا ترکاری بیچنے والے کی۔ پوچھتا چلا "اماں نے جوتہ مانگا ہے تمہارے پاس ہے؟" کوئی اُسکی صورت دیکھتا اور چپ رہ جاتا۔ کوئی نیک دل سے سیدھا سادھا جواب دیدیتا۔ مگر بعض شریر دیوانہ سمجھ کر پھبتیاں بھی کستے۔ فقرے بھی چست کرتے اور چھیڑ بھی دیتے۔ جب کوئی بہت سختی سے ڈانٹتا تو یہ نہایت سادگی سے کہتا "ارے بھائی کاہے کو خفا ہوتے ہو۔ اماں نے کہا ہے۔ جوتہ لیں گے!" اور زیر لب کچھ بڑبڑاتا آگے بڑھ جاتا!۔

آخر کار ایک جوتوں کی دوکان مل ہی گئی۔ وہاں بھی یہی سوال کیا گیا۔ دوکاندار نے

اسکی صورت پر نظر کی۔ پھر پوچھا "دام لائے ہو" مظفر نے جلدی سے دام ازار بند سے کھول کر
دکھا دیئے۔ اُس نے بھی جوتے دکھانا شروع کئے۔ مگر پاگل سمجھ کر ایک کا ڈیڑھ مانگتا۔
مظفر کہتا "نہیں یہ ویسا نہیں جیسا اماں نے مانگا ہے! یہ تو مہنگا ہے" ایسے اُسی طرح
کا ایک جوڑہ دکھائی دیا جیسا کہ پڑوسانی کا تھا مظفر نے جلدی سے اُسے آگے گھسیٹ لیا اور
اُسکے وحشت زدہ چہرے پہ مسرت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ دکاندار کو وہی سوا دو روپے جو
گھر سے لیکر چلا تھا جلدی سے نکال کر دیئے۔ اُس نے کہا "ڈھائی سے کم نہ لونگا۔ لینا ہو تو لو
ورنہ دوسری دکان دیکھو!" مظفر نے خوشامد شروع کی۔ وہ دکاندار اور بھی اکڑ گیا اور اُس نے
جوڑہ بکس میں بند کر کے رکھنا شروع کیا۔ مظفر کو یہ محسوس ہوا جیسے ماں کا محبوب جوتہ کوئی چھینے
لیتا ہے۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا کر کہا "دیدو بھیا۔ اماں نے مانگا ہے۔ انکو شادی میں
جانا ہے!" دکاندار نے خفا ہو کر سختی سے دھتکارا اور دکان سے نکال دیا۔

مظفر کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ اتنی دوکانوں پر پوچھنے کے بعد وہ جوتہ
ملا تھا جو اسکی "اماں" نے مانگا تھا۔ مگر دکاندار "بے ایمان" سے نہ دیتا تھا۔ اب "اماں"
کیسے شادی میں جائینگی! برادری والے کیا کہینگے۔ سب سمجھینگے سوا دو روپیہ والا جوتہ نہ پہن سکیں۔
لوگ ذلیل کرینگے۔ ماں کی اس طرح کی رسوائی ہو اور مظفر دیکھے یہ ناممکن تھا! مگر یہ دکاندار کسی طرح
مانتا ہی نہ تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ نہ یہ بات ذہن میں آئی کہ دوسری دکانیں دیکھے۔
اور نہ یہی کہ گھر پلٹ جائے۔ ماں نے جو جوتہ مانگا تھا وہ اسی دکان پر موجود تھا۔ وہ سامنے ہی
بکس میں رکھا تھا۔ اُسے کیونکر چھوڑ کر جا سکتا تھا؟ ماں کو کیا جواب دیگا؟ بے بس ہو کر وہیں سڑک پہ
دکان کے سامنے بیٹھ گیا۔ سارا دن بیٹھا رہا۔ دھوپ تھی اور اس طرح کی تیز دھوپ جس میں
ہرن کالے ہوتے ہیں مگر اُسے تمازت آفتاب کی پرواہ نہ تھی اور نہ جلتی ہوئی سڑک کی۔
اسکی "اماں" والا جوتہ سامنے دکان میں رکھا تھا۔ اس پر نظر جمی تھی۔ اس جوڑے کو کسی نے
اب تک خریدا نہ تھا۔ اسے کوئی چھوتا نہ تھا۔ اتنا ہی تسکین کے لئے کافی تھا۔ ہر گھنٹے دو گھنٹے پہ
دکاندار سے بلجاجت سے کہتا "اماں کا جوتہ دیدو" اور جب وہ ڈانٹ دیتا تو چپ ہو جاتا۔
دکان پر گاہک آتے۔ نئے نئے جوڑے دیکھتے۔ دام چکاتے۔ پیسے دیتے اور جوتے کا

بکس بغل میں دبا کر چلے جاتے تھے۔ یہ اسی طرح ٹکٹکی باندھے اُسی ڈبے کو دیکھ رہا تھا جس میں اُس کی "اماں" کا جوتہ رکھا تھا!۔

دن ڈھلنے لگا۔ دیہاتی اور قصباتی سودا سلف خرید چکے تھے۔ ایک ایک دو دو کرکے گھر جانے لگے۔ مظفر اسی طرح سڑک پر بیٹھا تھا کہ ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ابر محیط آ گیا۔ برق چمکی اور رعد نے گرج کر بادلوں کا جگر پانی کر دیا۔ موٹی موٹی بوندیں گرنا شروع ہو گئیں۔ سڑک سے لوگ بھاگنے لگے۔ جن کے پاس چھتریاں تھیں انہوں نے چھتریاں کھول لیں۔ جن کے پاس برساتیاں تھیں انہوں نے برساتیاں پہن لیں اور ہر ایک لمبے لمبے قدم رکھتا جائے پناہ ڈھونڈنے لگا۔ مظفر بھی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر جاتا کہاں؟ سامنے ہی دوکان میں تو اُسکی ماں کی پسند والا جوتہ رکھا تھا۔ زمین نے پاؤں پکڑ لئے۔ مظفر نے دوکاندار کو بڑی لجاجت سے دیکھا اُس نے منہ پھیر لیا۔ معلوم ہوا مظفر کی ٹانگوں کی طاقت دفعتہً سلب کر لی گئی، بجد سے پھر سڑک پر بیٹھ گیا۔ ہوا اور تیز ہوئی۔ ہر قطرہ اب جسم پر تیر کی طرح آ کر لگنے لگا۔ مگر مظفر پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اسے تو جوتے کی دُھن لگی تھی۔ اس پر باد و باراں کا کیا اثر۔ ہوا اور تیز ہوئی۔ اور اندھے کے برابر اولے "پڑ۔ پڑ۔ پڑ۔ پڑ" کرنے لگے۔ ہر ایک مظفر کے سر و سینہ پر اس طرح آ کر لگتا جیسے کوئی پتھر کھینچ کھینچ کر مار رہا ہو۔ مگر وہ ستون کی طرح اپنی جگہ قائم رہا۔ ماں کا جوتہ سامنے تھا۔ اسی دوکان میں!۔ اسے نہ ہوا ہلا سکتی تھی اور نہ پانی اور اولے اس پر اثر کر سکتے تھے!۔

وہ اسی طرح دوکان کے سامنے سڑک پر بیٹھا رہا۔ سارے کپڑے بھیگ گئے۔ سردی کے اثر سے دانت بجنے لگے۔ مگر جوتوں پر سے نگاہ نہ ہٹی بلکہ اور لجاجت سے اسکے بکس کو دیکھا کیا یہاں تک کہ اولے بھی رکے۔ پانی بھی کھلا اور پھر سڑک پر آمد و رفت جاری ہو گئی۔ دوکاندار نے آخر عاجز آ کر پاس بلایا۔ سوا دو روپے لئے اور اُس کی ماں کا جوڑہ حوالے کر دیا!۔

مطلع صاف تھا۔ ابر کے ٹکڑے ہوا کے دوش پر مشرق سے مغرب جا چکے تھے۔ مگر ہوا میں اب تک سردی بہت کافی تھی۔ مظفر کے سر و سینہ پر اس سے اثر کیا۔ جاڑا جاڑا میں دیئے لگا۔ دن بھر کے فاقے سے چکر بھی آنے لگا۔ مگر ماں کا فدائی نئے جوڑے کو سینے سے لگائے کھانستا تھوکتا اور "نہ پیا پانی، نہ ستھرا پانی" گاتا لمبے لمبے قدم رکھتا گھر کی سمت چلا جا رہا تھا!۔

ہاں ہاں مظفر پاگل ہے یقینی پاگل ہے اس لئے...... اس لئے کہ جب وہ اسطرح وحشت زدہ کیچڑ میں لت پت گھر میں داخل ہوا تو اُس نے اُس سواد و روپیہ کے جوتے کو اس مسرّت اور انبساط سے ماں کی خدمت میں پیش کیا گویا وہ اس بیوہ کے لئے ایک سلطنت جیت کر لایا ہے اور اسکی ماں اپنے لعل کا متعفن سر سینہ سے لگائے۔ اُسکے اُلجھے خاک آلودہ بال اپنی سوکھی اُنگلیوں سے برابر کرتی رہی اور تیل کی جگہ اُن پر اپنی بے نور آنکھوں سے آنسو ٹپکا کر بار بار "میرا دیوانہ! میرا دیوانہ!" اپنی زبان سے کہتی رہی!!

"مجلّۂ مکتبہ"

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ ہے جو دارالسلطنت حیدرآباد (دکن) سے ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں زیر ادارت جناب محمد عبدالقادر صاحب سروری ام، اے - ال، ال، بی - ہندوستان کے مشاہیر اہل قلم کی بہترین علمی اور ادبی کاوشوں سے مزین ہو کر شایع ہوتا ہے - اس میں خاصانِ ادب کے لئے ادبیات عالیہ اور محققانہ مقالے، اور لطیف مذاق کے لئے ادب لطیف کے دلچسپ اور چٹ پٹے مضامین کا ذخیرہ وسیع بوقلمونیوں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے حسب ضرورت عکسی تصویریں بھی شایع کی جاتی ہیں -

یہ مجلّہ دنیائے صحافت میں اپنے رنگ کا اکیلا ہے جو سالانہ للعہ اور ششماہی ۱؎ چند کی قلیل رقم میں سال بھر تک اپنی گوناگوں علمی دلچسپیوں اور سنجیدہ مسائل سے علم و ادب کی خدمت کریگا - اگر آپ کو اتنے سستے اور مفید و دلچسپ بلند پایہ مجلّہ کی خریداری منظور ہے تو براہ کرم ایک کارڈ لکھ کر کارپردازان رسالہ کو اپنی سرپرستی سے نوازیئے - اور اسکے مقاصد کی توسیع اور استقلال اغراض میں حصہ لیکر علم پروری کا ثبوت دے دیجئے -

کتابت و طباعت دیدہ زیب - حجم کم از کم (۶۴) صفحے - نمونہ کا پرچہ ۶/

منتظم مجلّہ مکتبہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ - اسٹیشن روڈ - حیدرآباد دکن

قبرستان

(سید ہاشم رضا صاحب)

"اماں! تم روتی کیوں ہو؟ مالن کی لڑکی کل کہتی تھی کہ تمہاری ماں روتے روتے جان دیدیگی
اماں! تم نہ رویا کرو۔ مجھے کپڑے پہنا دو اور میری چھوٹی چھڑی ڈھونڈھ دو۔ میں ابا کو ڈھونڈھ لاؤنگا"
"ابا کا گھر کہاں ہے؟ تم نے کل بتایا تھا میں بھول گیا۔ قبرستان میں نا؟ اچھا میں جاتا ہوں۔
محلے والوں سے پتہ پوچھ لونگا۔ زور زور سے پکارونگا۔ میری آواز سن کر وہ خود ہی آجائینگے اور
مجھے گود میں اٹھا لینگے۔ میں انکی انگلی پکڑ کے سیدھا تمہارے پاس لے آؤنگا۔ پھر تو نہ روؤگی؟
اماں میں جاتا ہوں" ماں چیخ چیخ کے رونے لگی۔ بچہ لپٹ گیا۔

"میرے لال! آٹھ روز سے تیرا بدن بخار میں پھنک رہا ہے۔ اور نیند نہیں آئی۔
میرے بچے سو رہ۔ شام کا وقت ہے۔ اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے۔ اپنے باپ کے گھر کل جانا"
"نہیں اماں اندھیرا ہوا کرے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میرے ابا کے گھر میں چراغ نہ ہوگا؟ میری
اماں مجھے جانے دو"

ماں نے بچے کو گود میں لیا اور قبرستان کی طرف چل دی۔ آبادی سے دور برگد اور پیپل کے
درختوں کے نیچے کچھ ٹوٹے پھوٹے مزار تھے۔ ماں وہیں ٹھہر گئی۔
"اماں یہاں کون لوگ بستے ہیں؟ دیکھتی ہو کیسا سناٹا ہے۔ سب سر شام سو گئے۔ اماں
یہیں ابا کا گھر ہے؟ تم کہتی تھیں کہ وہاں عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔ بوڑھے بھی ہیں اور
بچے بھی۔ اماں یہ سب کہاں ہیں"
"اماں تم روتی کیوں ہو۔ مجھے چھپا لو کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔ سنتی ہو یہ کون چڑیا بول رہی ہے؟
کیسی ڈراونی آواز ہے۔ بھاگ چلو، بھاگ چلو، اماں مجھے ڈر لگتا ہے"
بچہ پھر اپنے گھر آگیا۔ رات بھر قبرستان کے خواب دیکھے اور کئی بار چونک اٹھا۔ بخار بڑھتا
گیا اور ماں کے آنسو گرتے رہے۔ باپ کے ڈھونڈھنے والے کو موت نے ڈھونڈھ لیا۔ دوسری
رات کو بچہ اسی گھر میں سویا جہاں اسے ڈر لگتا تھا!۔

تبصرہ

حیاتِ جلیل

فاضل محترم سید مقبول احمد صاحب مقبول صمدنی نے یہ کتاب لکھ کر اُردو زبان پر خاص احسان کیا ہے۔ کہنے کو تو یہ حضرت علامہ شہیر میر عبد الجلیل بلگرامی کی سوانح عمری ہے لیکن حقیقت میں معلومات کا ایک بہت بڑا گنجینہ اور اٹھارویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے تمدنی حالات اور سیاسی انقلابات کا آئینہ ہے۔ اصل کتاب میں تو مصنف علام نے غیر معمولی محنت کی ہے لیکن حواشی میں اس سے بھی زیادہ دادِ تحقیق دی ہے۔ کتاب میں جتنے لوگوں اور جتنے شہروں کے نام آ گئے ہیں اُنکے متعلق سیکڑوں حاشیے اِس تحقیق اور اس تفصیل سے لکھے گئے ہیں کہ مصنف کی وسعت نظر، استقلال مزاج اور ذوق تجسس پر حیرت ہوتی ہے۔ انہیں حاشیوں نے کتاب کو جغرافی، تاریخی اور سوانحی حالات کا خزانہ بنا دیا ہے۔

آج کل ایسے کتاب سازوں کی کمی نہیں ہے جو بے سر و پا باتوں کا طومار باندھ کر مصنفوں کی فہرست میں شامل ہو جانا چاہتے ہیں لیکن حقیقت میں تصنیف و تالیف کا حق حضرت مقبول ہی کے سے فاضل بزرگوں کو پہنچتا ہے جو اس اہم کام کی ذمہ داریوں کو بخوبی سمجھتے ہیں اور تحقیق و تلاش کی دشوار گزار منزل میں تھکنا جانتے ہی نہیں۔ موصوف کی زیر تبصرہ کتاب پر بھی اگر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے تو تحقیق کی کمی کا نہیں بلکہ زیادتی کا۔

معنوی خوبیوں کے علاوہ لفظی محاسن کے اعتبار سے بھی یہ کتاب ادبِ اردو میں بلند پایہ رکھتی ہے۔ اسکی عبارت عالمانہ متانت اور شاعرانہ شگفتگی کا دلکش مجموعہ ہے۔ جن لوگوں نے فاضل اور زندہ دل مصنف کی زیارت کی ہے اُن کو تو تحریر میں محرر کی تصویر نظر آتی ہے۔

ہم حضرت مصنف کو ایسی قابل قدر عالمانہ تصنیف پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

کتاب دو حصوں میں شائع ہوئی ہے۔ مجموعی حجم پانچ سو صفحے سے زائد اور قیمت صرف ۳ روپے ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:۔ رام نراین لال کتب فروش - الہ آباد۔

(سید مسعود حسن رضوی - ادیب - ایم - اے)

"داغ"

(حضرت راز بلگرامی)

یہ داغ سینۂ عاشق کی یادگار ہوا
یہ داغ زخم تمنا کا سوگوار ہوا

یہ داغ دل کے لئے باعث حیات ہوا
یہ داغ سجدۂ آدم کی کائنات ہوا

یہ داغ حسن ہے دامان و آستیں کے لئے
یہ داغ شان ہے اک قشقۂ جبیں کے لئے

یہ داغ پھولوں میں بدنام عاشقی نکلا
یہ داغ لالہ میں انجام عاشقی نکلا

یہ داغ میری سیہ بختیوں کو پیارا ہے
یہ داغ میری شب غم کا ایک تارا ہے

نشان حد ہے یہ دنیائے آرزو کے لئے
یہ داغ شمع ہے منزل کی جستجو کے لئے

یہ وہ آہ ہے عاشق کے دکھ بھرے دل کا
یہ اک چراغ ہے بجھتا سا میری محفل کا

نوید وادی ایمن کی داستاں بن کر
چمک اٹھا کف موسیٰ میں بجلیاں بن کر

مٹا سکے نہ جسے کوئی یہ وہ دھبا ہے
یہ تیرہ بخت محبت کی ایک دنیا ہے

نگاہ حسن اسے کعبۂ جہاں سمجھی
جبین عشق اسے سنگ آستاں سمجھی

یہ رنگ لائیگا رنگینیٔ وفا بن کر
یہ اور ابھرے گا اب نقش مدعا بن کر

بنا ہوا ہے نشانہ یہ تیر قاتل کا
یہ اک نتیجہ ہے عاشق کے خوں شدہ دل کا

تمام راز نہاں آہ سوگوار میں ہے
یہ داغ ایک جلے دل کی یادگار میں ہے

خالص اُردو

(حضرت آرزو لکھنوی)

ہوگئیں کیاریاں ہری جیسے کہ رُت پلٹ چلی
کون یہ مُسکرا دیا ہنسنے لگی کلی کلی

کھلنے کی آس میں یہاں ڈال گئے تھے اک کلی
رو کے اُٹھا رہے ہیں آج پنکھڑیاں ملی دلی

تاروں کو دیکھتے ہیں سب اور یہ دیکھتا ہوں میں
آئی کہاں سے یہ چمک کس کی ہے یہ جھلا جھلی

سب سے بدا ہوا تھا دن آئے تھے دیکھنے سبھی
آنکھیں جو چوندھیا گئیں مچ گئی جیسے کھل بلی

دن کی بھی آس ہے یہاں رات کی مگر چاندنی
کتنی رُتیں پلٹ گئیں ڈال کبھی نہ یہ پھلی

چاہ کے ساتھ جی کی تھاہ پائی ہے اور نہ پاؤ گے
ایک ہے دوسرے کا آڑ دونوں ہیں یُوں گھلی ملی

دن جو پہاڑ سا بھی ہے رات سے ہے ملا ہوا
اُٹھ کہ سماں اب اور ہے چونک کہ دھوپ ڈھل چلی

آنکھ میں اور دھیان میں لاگ کے ساتھ بیر ہے
پاس ہیں دونوں بتیاں ایک بجھی کہ اک جلی

اُس کے لئے کہ آرزو ہنستا ہوا تھا ساتھ ساتھ
ڈھونڈھ ڈھونڈھ تھکا ہے بھر کے بن چھان پھر اگلی گلی

غزل محترمہ نور جہاں تاج بنت مرزا علی محمد خاں مرحوم و مغفور سابق وائس چانسلر بمبئی یونیورسٹی

شب فراق کا کچھ ماجرا سنو تو سہی
کسی کے دل پہ گزرتی ہے کیا سنو تو سہی

شکن جبیں پہ ہے کیوں کیا ہوا سنو تو سہی
بتا بھی دو مجھے میری خطا سنو تو سہی

کبھی حکایتِ اہلِ وفا سنو تو سہی
کسی کے عشق میں ہوتا ہے کیا سنو تو سہی

ہمیں سے آنکھ چرانا تھا سارے مقتل میں
ادھر بھی تیغ سنبھالو ذرا سنو تو سہی

جفا کی مشق ہو لیکن وفا کے پردے میں
کہے نہ خلق تمہیں بیوفا سنو تو سہی

نشانہ تیرِ جفا کا جسے بنایا تھا
وہ آج تم پہ فدا ہو گیا سنو تو سہی

یہ دیکھنا ہے کہ سوتے ہو چین سے کیونکر
مری زباں سے مرا ماجرا سنو تو سہی

کسی کے غم کی کہانی عجیب کہانی ہے
خدا کے واسطے تم بھی ذرا سنو تو سہی

کہاں کا غم ہے جو گھٹتی ہو تاج رات دن
یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں کیا ہوا سنو تو سہی

غزل حضرت رمز تلہری

اپنا افسانہ تھا اور آپ سنایا نہ گیا
ہم سے ہنستی ہوئی دنیا کو رلایا نہ گیا

غیرتِ عشق کو مانع نہ ہوئی سطوتِ حسن
سر جھکایا تھا مگر ہاتھ بڑھایا نہ گیا

رکھ لیا حشر کا پردہ مری بربادی نے
یوں مٹا تھا کہ قیامت سے اٹھایا نہ گیا

اللہ اللہ تری بارگہِ حسن کی شان
آنکھ اٹھائی نہ گئی پاؤں بڑھایا نہ گیا

دل کو سمجھا کے اٹھائے گئے بستر اپنا
ظلم جب آپ کے درباں کا اٹھایا نہ گیا

عشق کیا ہم کو ترے حسن کی عزت تھی عزیز
غیر کے در پہ سرِ سجدہ جھکایا نہ گیا

میں گنہگار الٰہی مجھے دوزخ بھی قبول
مجھ سے لکھا ترے ہاتھوں کا مٹایا نہ گیا

حشر میں آئے ہیں ہنستے ہوئے وہ دل والے
جن سے دنیا میں کسی دل کو دکھایا نہ گیا

شمع جلتی رہی آغوش میں پروانوں کے
اس کو ان سوختہ بختوں سے بجھایا نہ گیا

رمز کچھ سوچ کے ہم پی گئے آنسو شبِ غم
خونِ دل دیدہ و دانستہ بہایا نہ گیا

غزل رگھوپتی سہائے صاحب فراق ایم اے گورکھپوری

نکلا تو ہوں بچا کے میں برقِ نظر تری
لیکن مٹا کے رکھ دے اگر رہگذر تری

اک وقت ہوگا ہم سے جو دیکھا نہ جائیگا
ہم جانتے ہیں اے شبِ ہجراں سحر تری

موجِ ہوا کے ہاتھ میں ہے دامنِ بہار
سر پیٹتا ہے کوئی کھڑا راہ پر تری

کیفیتوں میں ڈوبی ہوئی اے نگاہِ مست
کیا رکھیں تیرے دیکھنے والے خبر تری

ناکامیاں ملی ہیں کچھ اے جلوہ گاہِ ناز
ہم تیرہ بخت آئے تھے امید پر تری

کچھ لٹ کھڑا رہی ہے نسیمِ بہار بھی
اٹھتی چلی ہے سوئے گلستاں نظر تری

یہ سوز و ساز اے غمِ ہستی ترے نثار
تصویر ہو کے رہ گئی شمعِ سحر تری

صبحِ شبِ فراق ہوئی - اور ابھی فراق
بیٹھا ہے اپنے گھر کو کئے رہگذر تری

غزل حضرت میرزا ثاقب لکھنوی

شامِ فراق کچھ نہیں آتا نظر مجھے
چھپ کر جلائیں کیوں مرے داغِ جگر مجھے

برسوں سے شامِ ہجر ہے کحل بصر مجھے
دیکھی تو تھی پہ یاد نہیں ہے سحر مجھے

چپ رہتا قیدِ غم میں اگر میرے ہمصفیر
کرتے ہیں محوِ نالہ کشی چھیڑ کر مجھے

تم دور ہو تو کس لئے دل میں مقام ہے
میں پاس ہوں تو کیوں نہیں اپنی خبر مجھے

بگڑا ہے حسن و عشق کے ہاتھوں نظامِ دہر
بیجا خیال ہے اُدھر اُن کو ادھر مجھے

نقشِ قدم میں نقشِ وفا دیکھ دیکھ کر
کرتی ہے یاد کھو کے مری رہگذر مجھے

قائل ہوں میں کہ محفلِ تقدیر تھی جداد
حصّہ ملا سبھوں کو خوشی کا مگر مجھے

پردے سے باہر آگیا اب زندگی کا راز
دیکھو تو دیکھ جاؤ کبھی اک نظر مجھے

دل والے جانتے ہیں مگر کہہ رہا ہوں میں
تڑپا رہی ہے شدّتِ دردِ جگر مجھے

کیا قبر پر جلائے ہیں احباب نے چراغ
اس سمت سے تو کچھ نہیں آتا نظر مجھے

درباں کی نظر میں ہوں میں اجنبی تو کیا
مدّت سے جانتا ہے ترا سنگِ در مجھے

کیا جانوں کوئی کُند چُھری تھی کہ اور کچھ
اک چیز ذبح کرتی رہی رات بھر مجھے

غربت میں راہ کٹتی ہے ثاقب مرے سبب
قصّہ سمجھ رہا ہے مرا ہمسفر مجھے

(قطعہ از ممدوح صدر)

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سنّاٹا آواز نہیں آتی
برگشتہ ہوئی دنیا رسم و رہِ الفت سے
اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

آثارِ ادبیہ

(پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے)

ادب کے گذشتہ پرچہ میں "آثار ادبیہ" کے تحت میں ایک منقبت شایع ہوئی تھی اُسکے ہر شعر سے زبان کی قدامت ظاہر ہوتی تھی اور نظم کے آخر میں شاعر کا تخلص نہیں بلکہ پورا نام "قاسم علی خاں" بھی موجود تھا پھر بھی بعض حضرات اُس منقبت کو میری تصنیف سمجھے۔ ایسے خوش فہموں کو قصیدۂ ذیل کے عنوان کی عبارت کے باوجود شاید یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ قصیدہ میرا کہا ہوا نہیں ہے عنوان کی عبارت بھی میری نہیں کاتب قصیدہ کی ہے اور بجنسہ نقل کر دی گئی ہے۔ ادیب۔

قصیدہ منقبت تصنیف نادر علی نادر فی المنقبت نواب مستطاب معلّی القاب فلک جناب عرش آشیاں ثریا مکاں، دارا درباں، سلیمان شاں اعنی نواب شمس[1] الدولہ بہادر دام اقبالہ

سو گیا شب کو جو بستر غم میں لاچار ۔۔۔ حرص کہتے ہیں جسے مجھکو جگا دہ ایکبار

بیٹھ بالیں کے مرے پاس یہ بولی مجھ سے ۔۔۔ اُٹھ کھڑا ہو تو شتاب اس گھڑی اے دل افگار

قطعہ اوّل سُن کے یہ میرا سوال اب مجھے نے اسکا جواب ۔۔۔ جھوٹ مت بولیو پر کیجیو سچ اقرار

کیا کرے مجھ سے اگر ہو تو امیر الامرا ۔۔۔ مجھکو کیا دیوے کرے تجھکو جو خالق مختار

کیا عجب ہے کہ تو ہو مالکِ گنج قاروں ۔۔۔ اور ترے ساتھ وہ ہو فوج نہ جسکا ہو شمار

گھوڑے وہ ہوویں ترے گھر جو سنے ہوں کہیں ۔۔۔ دیکھے جو کوئی انہیں ہو وے وہ نقش دیوار

بادپا کہئے انہیں یا کہ چھلاوا کہئے ۔۔۔ چلتے تو دیکھیں نظر آئے نہ پھر انکا غبار

فیل وہ ہوویں سواری کو مہیا تیری ۔۔۔ پیل خامہ سے نہ ہو وصف جنہوں کا اظہار

کہئے وصف انکے کہ یا حوضوں کی خوبی کہئے ۔۔۔ یا چلن انکا بیاں کیجئے یا رفتار

خیمے وہ ہوویں ترے گھر جو نہ دیکھے نہ سُنے ۔۔۔ لا دیئے گر تو فلک سے نہ اُٹھے انکا بار

بیٹھے اُن خیموں میں تو مسندِ زرّیں پہ جب ۔۔۔ دیکھئے اس گھڑی نادر ترا آکر دربار

بیٹھتے کتنے ہیں بن ترے مصاحب سدم ۔۔۔ کتنے رہتے ہیں کھڑے پیش نظر خدمتگار

---

[1] شمس الدولہ خطاب تھا نواب سعادت علی خاں فرمانروائے اودھ کے منجھلے بیٹے احمد علی خاں کا۔ ان کی قابلیت اور حسن انتظام کی بنا پر سعادت علی خاں نے ان کو اپنا ولی عہد قرار دیا تھا لیکن نواب کے انتقال کے بعد ریذیڈنٹ نے اُنکے بڑے بیٹے غازی الدین حیدر کو تخت پر بٹھا دیا۔ ادیب

کون ہے ان میں دُرِ بحرِ سخندانی اور
پڑھتا ناؔدر کے ہے دیوان کے چیدہ اشعار

عظمِ شاں جب کہ یہ اللہ کرے تجھکو نصیب
مجھ سے کس طرح تو پیش آویگا بتلا اے یار

تجھ سے یہ عرض ابھی سے ہیں کئے دیتی ہوں
کیجیو نائب مجھے اور آپ تو بنیو مختار

قطعِ دوم

گفتگو حرص کی یہ سُن کے کہا قنبر نے
ہٹ مرے سامنے سے مجھکو ہے تجھ سے انکار

میں تو حارص نہیں ہے حرص مجھ پہ غالب
حرص کے نام پہ میں مارتا ہوں سو پیزار

خوف کھاتا ہوں خدا کا جو نہیں کچھ کہتا
میلا دل لیتی ہے باتیں نہ بنا اے مُردار

لعن کیونکر نہ کروں تجھ پہ سہ حرفی ہے تو
دیتی جُل آ کے عبث مجھکو ہے تو اے کفتار

رکھتا وہ آقا ہوں اس کی وہ دنیا پہ ہیں
اُنکی تفصیل ہے تو سُن تو کروں میں اظہار

وہ جو آقا ہے بڑا امیرِ امامِ کونین
پدرِ حضرتِ حسنین و حبیبِ غفّار

شان میں جسکے یہ مطلع ہے رقم ناؔدر کا
طبعِ رنگین کے پڑھنے کو بحظِ گلذار

مطلعِ دوم

ہے علی رونقِ اشجار و علی برگ و بار
ہے علی زینتِ گلزار و علی گلِ بہار

رکنِ دیں جائے نشیں قوتِ جبریلِ امیں
حضرتِ احمدِ مختار کے گھر کا مختار

صاحبِ تیغِ دوسر معرکہ آرائے بدر
فاتحِ قلعۂ خیبر شہِ ذی عزّ و وقار

میرِ میدانِ وغا بیشۂ جرأت کا شیر
سب میں مشہور وہ کرّار ہے غیر فرّار

بحرِ الفت سے نکال اور کوئی مطلعِ نو
ناؔدر اب لینا اگر ہے تجھے دُرِ شہوار

مطلعِ سوم

اُسکی ہیں ہمتِ عالی کو کروں کیا اظہار
بات میں بخش دے سائل کو جو اونٹوں کی قطار

قطعِ سوم

حاسدوں کا ابھی اکیبارہ دل سو ٹکڑے
اُسکی گر تیغ کی لاؤں میں زباں پر گفتار

برش اسکی ہے عیاں ماہ سے لے تا ماہی
ایسی تلوار ہی دیکھی نہیں اے خود دو کیا

ذکر انساں کا تو کیا کوہ پہ گر جا بیٹھے
تو نکل جائے وہ یوں جیسے کہ صابن سے تار

دست جس کا کہ ید اللہ کہا وے یارو
تیغ سے مانگیں پناہ اسکی نہ کیونکر کفار

کیا حق نے ہے اُسے عقدہ کشائے عالم
کہتی ہے قومِ نصیری اُسے اللہ پکار

وصف جس سرورِ دیں کے بیاں ہیں تجھ سے
کافی اُسکی مجھے عقبیٰ کے لئے ہے سرکار

لاکھ ہونگا میں گنہگار وہ بخشا لے گا
رکھتا اُس سے توقع ہوں میں در روزِ شمار

دشمن اُسکے جو ہیں لعنت ہوں میں اُن پر کرتا
کہتا رحمت ہوں محبوں کو میں اُسکے ہر بار

خواہش دین تو ہوئی خواہش دنیا بھی سن | مختصر کہتا ہوں ہو طول سخن سے بیزار

وہ جو آقا مرا چھوٹا ہے برب الکعبہ | کیا کہوں کیسا سخی ہے وہ حبیب غفار

کہتے ہیں شمس و قمر جسکا اُسے شمس الدولہ | مہر ہی سا نام بھی روشن ہے بہر شہر و دیار

وصف میں اُسکی سخاوت کے پڑھوں وہ مطلع | نام حاتم کوئی لے پھر نہ زباں سے زنہار

مطلع چہارم

صاحب جود و سخا جیسا ہے وہ عالی مقدار | خلق خالق نے کیا ہی نہیں کوئی اے یار

کب ہے لاحول ولا ہمت حاتم ایسی | آ تو اس صاحب ہمت کے کرے چشم دو چار

جتنے جو مانگا کیا وہی عنایت اُس نے | جو لیا جس نے کہا لیجئے حاضر تیار

جس سے وعدہ کرے کیا دخل ہو وہ لیفا | ذکر کیا کرکے جو اقرار کرے وہ انکار

سن کے جود اُسکی نکلتا ہی نہیں کان سے لعل | اس لئے بخشش کسی کو وہ نہ دے بے تکرار

فیض پر آتا ہے جس وقت وہ خورشید سخا | لعل کر دیتا ہے پتھر کو نظر کر اکبار

باغ جنت میں بنے اُسکے لئے ہیں ایواں | ہے سخاوت بھی وہاں ماتے مکاں ہیں تیار

آبرو بخشے صدف کو جو نہ وہ ابر کرم | ہوں نہ پیدا کبھی اُس میں سے دُر شہوار

شمس دیں کا ہو کیونکر نہ فلک سپہ کرے | روز خورشید کے بھر تھال میں زر انثار

گر شجاعت کا کروں ذکر میں اُس اشجع کی | آب ہو جائے ابھی زہرۂ رستم جرار

تیغ جب قبضہ میں لیتا ہے وہ عالم کی پناہ | کیا کہوں ہوتا ہے کیا گرم اجل کا بازار

بادپا کی کہوں کیا اسکے میں یاں چالاکی | ہے ہوا کے بھی سا تھ اُسکے پہنچنا دشوار

یوں زمیں سے وہ فلک سیر ہو اُن پہ فلک | مر وہاں جیوں ہو نظر شیشۂ عینک کے پار

یہ ہلال اُسکی ہے نعل سم توسن کا نقش | ہیں وہ بجلی کے نشاں جو کہیں خنجر لے یار

اُسکا مداح کہاتا ہوں جہاں میں اللہ | جسکے اوصاف حمیدہ کئے ہیں اظہار

جس کا اس طرح کا ہو صاحب ہمت آقا | اُسکو کاہے کے لئے ہوویگا پھر کچھ درکار

کون سی چیز میسر ہے نہیں اب مجھ کو | چاہتا جو ہوں وہ دیتا ہے مجھے بے تکرار

ایسا مستغنی الاحوال ہو جو کے اے حرص | تو ہی بتلا کرے وہ کاہے کو حرص بیکار

مقطع چہارم

ہاں جو خواہش ہے مری تو یہی خواہش ہے مری | وہ جو آقا ہے مرا عزت و اعزاز و وقار

[illegible]

شرق اور غرب کو اک لمحہ میں کر ڈالیں طے — بادپا ایسے ہوں جن گھوڑوں پہ وہ ہووے سوار

بیٹھے اُن خیموں میں جا کر وہ امیر الامرا — پال جن کے کہا وے فلکِ کج رفتار

فوج وہ اُسکے ہو ہمراہ نہ ہو جسکی حد — گنیئے تو ہو سکے اُس فوج کا ہرگز نہ شمار

ہو سلامی کو کھڑی باندھ کے وہ صف جس دم — خلق کی چشم میں آ جائے نظر ابرِ بہار

روز و شب توسنِ خامہ ہو وہ اسکا رواں — جو پیادہ نظر اُسکی پڑے ہو جائے سوار

یا الٰہی ہو زیادہ اس سے بھی اُسکا رتبہ — فضل سے اپنے تو رکھ شاد اُسے لیل و نہار

ہوئے اس صاحبِ ہمت کی سلیماں سی شان — جاہ و حشمت میں ہو اب جم کی طرح وہ سردار

دور اُس نخلِ سخاوت سے رہے بادِ خزاں — باغِ ہستی میں یونہیں وہ رہے اُس پہ بہار

تا رہے جان جہاں میں رہے وہ جانِ جہاں — مجھ سے عاصی کی دعا کر یہ قبول اے غفار

ایکی ایسی ہو مبارک اُسے یہ عید الفطر — دور تا فاقہ کشی ہو یہ مری اے دادار

قطعہ پنجم

اور جو اہاں میں کسی چیز کا اُس سے ہوں نہیں — چاہتا ہوں تو یہ ہوں چاہتا میں دل افگار

زاد و رہ ایسی کرے مجھکو عطا آپ وہ سخی — دیکھوں جا روضۂ شبیر کو چھوڑ اپنا دیار

قطعہ ششم

اور جو اس عرض کو سمجھے وہ سخنہائے فریب — تو قسم کھاتا ہوں اُسکی برسولِ مختار

ہوتی تن پروری منظور جو اپنی مجھ کو — یوں نہ لے سکتا تھا لاچار ہی سنا میں لاچار

عرض جو کرتا کہ میں جاتا زیارت کو ہوں — دیجئے کچھ مجھے اے دین نبی کے دیندار

قطعہ ہفتم

بخدا سچ یہ مری عرض ہے اے میرے کریم — جھوٹ مت اسکو سمجھ تو بخدا اے غفار

جو عطا کرنا ہو سو جلد عطا کر مجھ کو — مت لگا دیر کہ ہوتا ہے مرا آخر کار

قطعہ ہشتم

طالبِ شاہِ اُمم طالبِ شہ ہوتے نہیں — طالبِ شاہ کو یہ فقر نہیں ہے درکار

کر رواں مجھ سے گدا کو تو نہ طالبِ شہ ساحت — بے وساطت شہِ دیں کا مجھے دکھلا دربار

حسبِ دلخواہ مری آرزو یہ تو بر لا — بھر ازوارِ نبیؐ ورنہ کر اب زنہار

ہو گا اے شاہِ شہاں تجھ کو بڑا اجرِ عظیم — میں اگر جا کے بنا سبطِ نبیؐ کا زوار

قطعہ نہم

اختصار آگے کر اب طولِ سخن کو نادر — یہ قصیدہ ہے کہ عرضی ہے دیا ہو طومار

رکھ لے قرطاس پہ خامہ کو دعا کر یہ رقم

تا قیامت تو سلامت رکھ اُسے یا ستار

سمن بنابر انفصال مقدمہ

(آرڈر ۵ - قاعدہ (۵))

نمبر مقدمہ ۱۸۱۸ سنہ ۱۹۳۰ء

بعدالت جناب خانصاحب سید اظہار حسن صاحب ایم اے، ایل ایل بی اسپیشل منصف محلہ چاپ شہر الہ آباد
جنگی لال ولد گنگئی قوم کلوار ساکن محلہ موٹی گنج شہر آگرہ آباد .... مدعی

بنام

ہیرا ولد بندا قوم دھوبی ساکن حال نمبر ۳۴ مولا علی کی درگاہ شہر کلکتہ ..... مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے آپ کے نام ایک نالش بابت ما عسہ ر کے دائر کی ہے - لہٰذا آپ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ بتاریخ ۸ ماہ اکتوبر ۱۹۳۰ء وقت دس بجے دن کے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حالات سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو کہ جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہوں اور جوابدہی دعوے کی کریں - اور ہرگاہ وہی تاریخ جو آپ کے احضار کے لئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس آپ کو لازم ہے کہ اسی روز اپنے جملہ گواہوں کو جن کی شہادت پر و نیز تمام دستاویزات کو جن پر آپ اپنی جوابدہی کی تائید میں استدلال کرنا چاہتے ہوں پیش کریں - آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگر بروز مذکور آپ حاضر نہ ہونگے تو مقدمہ بغیر حاضری آپ کے مسموع اور فیصل ہوگا۔

بثبت میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۹ ماہ ستمبر ۱۹۳۰ء جاری کیا گیا۔

دستخط حاکم　　یعقوب حسین پیشکار　　[مہر عدالت]

سمن بغرض انفصال مقدمہ

(آرڈر ۵- قاعدہ ۱ و ۵)

ابتدائی مقدمہ خفیفہ نمبر ۱۷۳ سنہ ۱۹۳۰ء۔

بعدالت جناب سید حسن ارشاد صاحب بہادر بی اے- ایل ایل بی- جج خفیفہ مقام اکبرپور ضلع فیض آباد۔

جگیشر کوری ولد بھکمیا کوری ساکن موضع پورہ پرسن پرگنہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مدعی

بنام

بھگوتی مصر ولد روپی مصر ساکن موضع نامدا پور پرگنہ ٹانڈا ضلع فیض آباد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مدعاعلیہ

ہرگاہ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت دلاپانے مبلغ …… کے دائر کی ہے لہٰذا تمکو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ سولہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء بوقت دس بجے کے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جسکے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعویٰ مدعی مذکور کی کرو۔ اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمہارے احضار کے لئے مقرر ہے۔ واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس تمکو لازم ہے کہ اپنے جواب دعویٰ کی تائید میں جن گواہوں کی شہادت پر یا جن دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو اسی روز ان کو پیش کرو۔

مطلع رہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہوگا۔

آج بتاریخ گیارہ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

دستخط حاکم بخط انگریزی

(مہر عدالت)

سمن بنا بر انفصال مقدمہ

(آرڈر ۵ - قاعدہ ۱ و ۵)

نمبر مقدمہ ۱۷۸۴ سنہ ۱۹۲۹ء

بعدالت جناب خان صاحب سید اظہار حسن صاحب ایم اے - ایل ایل بی ایڈیشنل منصف محلہ چاک شہر الہ آباد
بابادین ولد بالادین قوم بقال ساکن موضع سرائے عیب پرگنہ چائل ضلع الہ آباد .... مدعی

بنام

میوہ لال ولد ونارکا قوم کلوار ساکن موضع بادن پرگنہ چائل ضلع الہ آباد حال مقیم دوکانداری آبکاری بلدی بازار ڈاکخانہ و اسٹیشن انوپ پور ریاست ریواں .... مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے آپکے نام ایک نالش بابت مبلغ کے دائر کی ہے - لہذا آپ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ بتاریخ ۸ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء وقت دس بجے دن کے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حالات سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جسکے ساتھ کوئی اور شخص ہو کہ جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہوں اور جوابدہی دعوی کی کریں - اور ہرگاہ وہی تاریخ جو آپکے احضار کے لئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس آپ کو لازم ہے کہ اسی روز اپنے جملہ گواہوں کو جنکی شہادت پر و نیز تمام دستاویزات کو جن پر آپ اپنی جوابدہی کے تائید میں استدلال کرنا چاہتے ہوں پیش کریں - آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگر بروز مذکور آپ حاضر نہ ہونگے تو مقدمہ بغیر حاضری آپ کے مسموع اور فیصل ہوگا -

بثبت میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۹ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء جاری کیا گیا -

دستخط حاکم یعقوب حسین پیشکار [مہر عدالت]

سمن بنابر انفصال مقدمہ

(آرڈر ۵ - قاعدہ ۱ - و ۵)

نمبر مقدمہ ۸ ۳۱۶ سنہ ۱۹۳۰ء

بعدالت خان صاحب سید اظہار حسن صاحب ایم اے ایل ایل بی اسپشل منصف محلہ چک شہر الہ آباد رڈکی انجینئرنگ ورکس بذریعہ پنڈت رامیشر پرشاد شکل ساکن نمبر ۱۴ کیننگ روڈ شہر الہ آباد مدعی

بنام

جگ جیون داس رئیس ٹانڈا ساکن قصبہ ٹانڈا ضلع فیض آباد .... مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے آپکے نام ایک نالش بابت ... کے دائر کی ہے لہٰذا آپ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ بتاریخ ۸ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء وقت دس بجے دن کے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حالات سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے - یا جسکے ساتھ کوئی اور شخص ہو کہ جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہوں اور جوابدہی دعوی کی کریں -

اور ہرگاہ یہی تاریخ جو آپ کے احضار کے لئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس آپ کو لازم ہے کہ اسی روز اپنے جملہ گواہوں کو جن کی شہادت پر نیز تمام دستاویزات کو جن پر آپ اپنی جوابدہی کے تائید میں استدلال کرنا چاہتے ہوں پیش کریں - آپ کو اطلاع دیجاتی ہے کہ اگر بروز مذکور آپ حاضر نہ ہونگے تو مقدمہ بغیر حاضری آپ کے مسموع اور فیصل ہوگا -

بثبت میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۹ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء جاری کیا گیا -

دستخط حاکم	یعقوب حسین پیشکار

مہر عدالت

ادب

مرتبۂ

سید اعظم حسین

جلد ۲ بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء نمبر ۱۳

بزم ادب

دنیا میں بہت کم ایسے صاحبان علم و فن گزرے ہیں جنہیں بقدر شوق، تصنیف و تالیف ایجاد و اختراع کا موقع ملا ہو۔ بیماری و رنجوری، عسرت و تنگدستی ہمیشہ علم و ادب کی دشمن رہی ہیں یہی وہ آفتیں ہیں جنہوں نے صاحبان کمال کے جوہروں کو پورے طور سے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ انھیں کے ہاتھوں اُن کے تصنیفی و تالیفی حوصلے پست ہو کر رہ گئے۔ کامل سے کامل ہستیاں زمانہ کی ناقدرشناسی کا رونا روتے روتے اس دنیا سے چلی گئیں۔ باکمال موجدین و مصنفین میں بادہ فردیں ایسی ہی ملینگی جنھیں تمام عمر پیٹ بھر کھانا بھی نہ ملا۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں جہاں کہ فضیلت کی دستار پر تونگری و ثروت کا طرہ بھی نظر آئے۔ اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ جنکی زبانیں اور قلم دانش و بینش کے خوشاب موتی فیاضی سے تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے نصیب میں چمکنے والے لعل و جواہر بہت کم ہوتے ہیں۔

ایران و ہندوستان کے صاحبان کمال فردوسی، میر تقی میر، مصحفی وغیرہم کو چھوڑ دیجئے ان میں سے اکثر کے افلاس کے ساتھ تاریخی واقعات و حوادث شریک ہیں علم دوست انگلستان و اسکاٹلینڈ کو لے لیجئے۔ وہاں بھی علمی ناقدری کے اسی افسانہ درد کا اعادہ نظر آئیگا۔

مارلو سا تمثیل نگار آلام و تفکرات کی نذر ہوا۔ الیور گولڈاسمتھ سے ادیب نے ہمیشہ شکستہ حالی میں بسر کی۔ اور رابرٹ برنس سے شاعر کی ساری زندگی تہیدستی میں گزری یہی تو وجہ تھی کہ جب برنس کے مرنے پر اُسکے مختلف مجسمے بطور یادگار کے کھڑے کئے گئے تو اُسکی ماں بیساختہ چیخ اُٹھی تھی "ہائے رابرٹ تو ان سے روٹی مانگتا تھا اور انھوں نے تجھے پتھر دیا"

آج کل کا افلاس زدہ اور ادبار کا تباہ کردہ مشرق اس طرح کی ہزاروں مثالیں پیش کرتا رہتا ہے۔ یہاں گلاب و قند کا شربت دوسروں ہی کا حصہ ہے۔ قلم و کاغذ کے دلدادوں کو تو اپنی تشنگی بجھانے کے لئے گرم پانی بھی مشکل سے ملتا ہے بلکہ اکثر اُن کی روزی کا خمیر "خون جگر" ہی سے ہوتا ہے۔ نہ اب سلطنت و حکومت باقی ہے کہ شاہی دربار "نورتن" سے مزین کیا جائے۔ اور نہ اس دولت و امارت کا نشان ملتا ہے کہ ہر رئیس صاحبان علم و فن کے ایک ایک گروہ کی سرپرستی کرے۔ البتہ جب موجودہ سرکار نظام کا خیال آجاتا ہے تو کچھ اشک شوئی ہو جاتی ہے خدا زندہ و سلامت رکھے شہریار دکن کو کہ اُنکی علم دوستی و ادب پروری اب بھی بکرماجیت اور اکبر کے کارنامے یاد دلاتی ہے۔ حضور نے کروروں روپیوں کے صرف سے حیدرآباد میں یونیورسٹی کھولی لاکھوں روپیہ کے خرچ سے ایک وسیع اور منظم دارالترجمہ قائم کیا۔ بڑے بڑے وظائف دے کر اپنے ملک کے ہونہار طلبہ کو مغربی ممالک میں تعلیم کے لئے بھیجا۔ اور سیکڑوں ادیبوں، محققوں، اور عالموں کو ہندوستان کے گوشے گوشے سے بلا کر اپنے ظل عاطفت میں جگہ دی۔

حضور کو اُردو سے جو شغف ہے وہ اسی سے ظاہر ہے کہ اس جامعہ میں تصنیف و تالیف ترجمہ و تعلیم کا جتنا کام ہو رہا ہے وہ سب اسی زبان میں۔ اور اُردو کے جتنے بلند پایہ رسالے اور اخبار اس خطہ سے جاری ہوتے ہیں وہ سب اسی سرکار کی سرپرستی میں۔

حال ہی میں ہمارے موقر معاصر "اُردو" اورنگ آباد دکن" کے مشہور اڈیٹر مولوی عبدالحق صاحب بی اے کو حضور نظام نے دس برس کے لئے ایک ہزار ماہوار کا عطیہ اُردو زبان کے ایک لغت کی تدوین کے لئے عطا فرمایا ہے۔

مولوی صاحب کی علمیت قابلیت اور وسیع النظری کی دنیا قائل ہے وہ ہر طرح اس کام کی اہلیت و صلاحیت رکھتے ہیں ہم اُنکی خدمت میں حضور نظام کے اس عطیہ پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی تدوین لغت کے کام کی اہمیت و وسعت کا لحاظ کرتے ہوئے ہم حضور نظام کی خدمت میں باادب یہ عرض کرنے کی جسارت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ کام ایک فرد واحد کے انجام دینے کا نہیں ہے۔ بہتر ہوتا کہ حضور اس کام کے لئے ماہرین زبان کی ایک کمیٹی بنا دیتے اور اسے کم از کم چار پانچ ممبروں کی ایک جماعت کے سپرد فرما دیتے۔

اس سلسلہ میں ہمارے پیش نظر دو تین ایسے نام موجود ہیں جن سے زبان اُردو کے لغت کی تدوین میں مدد نہ لینا حقیقی تکمیل میں رکاوٹیں ڈالیگا۔

ہماری مراد مولانا نورالحسن صاحب مؤلف نوراللغات۔ علامہ مرزا محمد ہادی صاحب رسوا۔ اور نواب حیدر یار جنگ صاحب طبا طبائی سے ہے۔ مولانا نورالحسن صاحب خود ایک لغت کی تدوین میں مصروف ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اُن سے زاید اس کام سے کون واقف ہوگا۔ نواب حیدر یار جنگ صاحب وہ فاضل بزرگ ہیں کہ جنھوں نے اُردو زبان واجدعلی شاہ مرحوم کے دربار میں سیکھی ہے۔ اور علامہ محمد ہادی اُن ماہرین السنہ میں ہیں جنکی نظیر اس وقت ہندوستان میں موجود نہیں ہے۔ اگر حضور نظام نے ہماری اس عرض کو شرف قبول بخشا تو ہمیں یقین ہے کہ ان فضلاء و علماء کی کوششوں سے اُردو میں بھی "انسائیکلوپیڈیا" تیار ہو جائیگی۔ خدا کرے حضور تک ہماری یہ نحیف آواز پہنچ بھی جائے!

مغرب کو اپنی ہمہ دانی پر بڑا ناز ہے وہ اپنے کو دنیا کے سارے علوم کا میدار و مخزن "موجد و محقق سمجھتا ہے۔ وہ گزشتہ تہذیبوں پر ہنستا ہے اور ازمنہ وسطی کے قبل کے دور کو زمانہ جہالت کے نام سے پکارتا ہے لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو موجودہ علم و حکمت کی ترقیاں پچھلی تہذیبوں کی مرہون منت ہیں۔ مغرب نے انھیں گزشتہ باتوں کی تجدید کی ہے۔ بلکہ اکثر شعبوں میں ابھی تک پچھلی تہذیبوں سے بہت کچھ پیچھے ہے۔

مارک ٹوین امریکہ کا مشہور ترین مصنف مصر کی سیاحت کے بعد اپنے سفرنامہ "انوسنٹس ابروڈ" میں اسی مضمون کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے۔

"ہمیں اس امر کی مسرت تھی کہ ہم نے اس ملک کو دیکھ لیا جو تہذیب کا گہوارہ تھا جو یونان کا معلم تھا۔ اور یونان کے ذریعہ سے روما کا اور روما کے ذریعہ سے سارے عالم کا! ....

ہمیں خوشی تھی کہ ہم نے ایسے ملک کو دیکھ لیا کہ جس میں اس زمانے میں جب کہ بنی اسرائیل کے مذہب تک میں بھی عالم مابعد کا ذکر نہ تھا۔ ایک ایسا شایستہ مذہب رائج تھا جسمیں بعد الموت سزا و جزا کے خیالات موجود تھے۔ ہمیں مسرت تھی کہ ہم نے اس ملک کی زیارت کرلی جہاں انگلستان سے تین ہزار برس قبل

شیشہ موجود تھا۔ اور جو شیشہ پر اس طرح کے نقش و نگار بنا سکتا تھا جیسے ہمیں آج بھی نانصیب نہیں جو تین ہزار برس قبل جراحی اور طب کے بارے میں قریب قریب تمام اُن امور سے واقف تھا جو سائنس نے اب معلوم کئے ہیں۔ جن میں جراحی کے تمام وہ عجیب و غریب آلات موجود تھے جو سائنس نے اب ایجاد کئے ہیں۔ جسمیں اعلیٰ ترین تہذیب کی آسائش و آرام ضرورت و حاجت کی وہ ہزاروں چیزیں موجود تھیں جنھیں ہم نے آہستہ آہستہ ہم پہنچایا ہے اور جن کے متعلق ہم اسکے دعویدار ہیں کہ وہ پہلے پہل دنیا میں دکھائی دی ہیں۔ جسمیں ہمارے خواب و خیال میں آنے سے نامعلوم صدیوں پہلے کاغذ موجود تھا اور فوارے بھی جب کہ ہماری عورتوں کو اسکا وہم و گمان تک نہ تھا۔ جسمیں عام مدارس کا مکمل رواج ہمارے فخر کرنے کے اس قدر قبل موجود تھا کہ اس مدت کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے جو اپنے مُردوں کو اس طرح محفوظ رکھتا تھا کہ گوشت و پوست بھی قریب قریب غیر فانی بن گیا تھا۔ اور یہ ہم سے ناممکن ہے۔ جس نے اس طرح کے منار بنائے جو فنا کرنے والے زمانے پر ہنستے ہیں اور جو ہماری بڑی سے بڑی عمارتوں کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ وہ پُرانا ملک جسے وہ سب آتا تھا جو ہمیں اب آتا ہے۔ بلکہ شاید ہم سے کچھ زائد بھی.............!"

ہمارے لئے یہ امر باعث فخر و سبب مسرت ہے کہ "ادب" کے تین سرپرست گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے مدعو کئے گئے۔ مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب تعلقہ دار محمود آباد لکھنؤ سے۔ سر مرزا محمد اسمٰعیل صاحب دیوان میسور سے۔ اور سر سلطان احمد صاحب وائس چانسلر پٹنہ سے ہم "ادب" کے ان تینوں سرپرستوں کی خدمت میں باادب ملتجی ہیں کہ

بہ سفر رفتنت مبارکباد   بہ سلامت روی و باز آئی

ہم اپنے محسنین خاص نواب اود سید محمد مہدی رضوی صاحب رئیس اعظم پٹنہ۔ راجہ سر محمد مہدی صاحب تعلقہ دار پہتی پور۔ راجہ سید احمد علی صاحب علوی تعلقہ دار سلیم پور۔ چودھری سید محمد علی صاحب تعلقہ دار رودولی۔ اور سید علی ظہیر صاحب بیرسٹر لکھنؤ کی خدمت میں ان کے انتخاب کونسل پر ہدیہ تہنیت و تبریک پیش کرتے ہیں۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ یہ حضرات اپنے دور قانون سازی

اپنی مادری زبان کے حقوق کی حفاظت فرمائینگے، اور اسکی ترقی و نشوونما کا وسیلہ و ذریعہ بنیں گے۔
بیجا نہ ہوگا اگر اسی سلسلے میں ہم یہ عرض کرتے چلیں کہ سوائے الہ آباد یونیورسٹی کے بہار اور یوپی کی کسی یونیورسٹی میں اُردو بی اے کے درجے کے آگے نہیں پڑھائی جاتی اور نہ اب تک دوسری یونیورسٹیوں میں ایم اے۔ کے درجے ان زبان میں کھولے گئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے محسنین اس خدمت کو ضرور انجام دینگے۔ اور پٹنہ، لکھنؤ اور آگرہ یونیورسٹیوں میں اُردو میں ایم اے کے درجے کھلوانے کی سعی بلیغ فرمائیں گے۔

ہمارے لئے یہ امر بھی کم باعث مسرت نہیں ہے کہ ہمارے محترم و معاون و سرپرست جناب پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے، لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی کے ریڈر اور شعبۂ فارسی و اُردو کے صدر مقرر ہوگئے۔ یونیورسٹی کی منتخب کرنے والی جماعت نے پروفیسر صاحب موصوف کو اس عہدہ پر مامور کرکے اس حق پسندی و علم دوستی کا ثبوت دیا ہے جو بعض اوقات جماعت بندیوں کی نذر ہو جایا کرتا ہے۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ پروفیسر رضوی صاحب اس شعبہ کا کھویا ہوا وقار پھر سے قائم کردینگے اور یہ ثابت کردینگے کہ "مشرقیات" کا ماہر ہونے کے لئے آکسفورڈ اور کیمبرج کی سندوں کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے اور نہ مغربی طرز معاشرت و اخلاق و عادات کا اختیار کرنا اس شعبے کے افسر اعلیٰ کی حقیقی کامیابی کے لئے ضروری و لابدی ہے۔

"ادب"، کے **خاص نمبر** کے ارادہ کے ساتھ ہی علالتوں نے آگھیرا ہے۔ کاتبوں کے بعد اب کارکنوں کی باری ہے۔ مینیجر صاحب تو ماشاءاللہ جھیل لے گئے۔ مگر اب ہمارے دم پر آبنی ہے۔ خیر "ایں ہم بگزرد"۔ لیکن اس اطلاع سے ہماری غرض صرف اتنی ہے کہ ہم سے ہمدردی ظاہر کرنے اور عیادت کرنے کے بدلے خاص نمبر کے لئے افاضل و اکابر سے مضامین نظم و نثر حاصل کئے جائیں اور "ادب"، کے حلقۂ اشاعت کو وسیع سے وسیع تر بنانے کی کوشش کی جائے۔
ہمیں دیکھنا ہے کہ ہمارے ناظرین کرام ہم سے کہاں تک حقیقی ہمدردی فرماتے ہیں۔ اور ہماری عیادت کے اخلاقی فرض سے کیونکر سبکدوش ہوتے ہیں۔ خدا کرے ہمارا تجربہ تلخ نہ نکلے!

داستانِ اُردو

ادب سنسکرت

(نواب سیّد نصیر حسین خانصاحب خیالؔ)

"عام شکایت ہے کہ ہماری تخئیل اور ہماری زبان ملکی سے زیادہ غیر ملکی یعنی بدیسی دکھائی دیتی ہے! اسکی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ ہمارے ادیب و شعراء اب تک بزار عکاظ اور سوق بغداد کا خواب دیکھ رہے ہیں اور اب رکنا باد و گلگشت مصلّا کی سیر فرمارہے اور ریحوں و جیحوں میں اس طرح غرق ہیں کہ اپنے وطن کی پیش پا افتادہ چیزیں بھی اُنہیں نظر نہیں آتیں! اس زمین کے دفینے اگر نکالے جائیں تو ہم گنج قاروں کو بھی بھول جائیں! اگرچہ کہ اس میں زحمت و محنت ہے، یہ کانیں کھدیں کیونکر اور نکلیں کس طرح؟ ملک بھر میں چند ہی ایسے بزرگوار ملیں گے جنہوں نے اس عام شکایت کو سمجھا اور اُسکے دور کرنے کا رستہ نکالا ہو۔ "داستانِ اُردو" میں جس کا ایک باب "ادب" میں قبل شائع ہوا۔ اس کا خاص لحاظ نظر آتا اور وہ ہماری دلیل نگاہ بن سکتی ہے۔ اس لحاظ سے کہ ملک اپنی چیزوں سے باخبر ہو اور اپنی زبان کو سمجھے ہم نے اس داستان کا ایک اور باب (جو ادب سنسکرت کے متعلق ہے) حاصل کر کے اُسے بذریعۂ رسالہ "ادب" شائع کرنا موزوں تصور کیا ہے۔

اس بیان میں یوں تو اکثر باتیں قابل لحاظ و لائق آموز اور ہمارے معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔ مگر دو چیزیں خاص طور پر لائق توجہ ہیں۔ اوّل یہ کہ شاید ہی کسی مسلمان

اہل قلم نے ادب سنسکرت کا اپنے کسی بیان میں اتنا ادب لحاظ رکھا اور اسلامی بے تعصبی کی ایسی مثال وشان دکھائی ہو۔ دوسرے یہ کہ قصۂ شکنتلا اُس انداز و زبان میں نہرایا گیا ہو جو اُس کا اقتضا ہو۔ حسیات و جذبات کی لفظوں میں وہ تصویر کھینچی گئی ہو کہ نثر نظم معلوم ہوتی ہے۔

(سید مجتبےٰ حسین خاں)

مہا بھارت و رامائن کی سی تصنیفوں کے بعد ممکن نہ تھا کہ ملک و قوم کی حالت نہ بدلتی اور اُن میں اہل قلم پیدا نہ ہو جاتے۔ یہ اُن لاجواب مثنویوں ہی کا اثر تھا کہ آخر یہاں قسم قسم کی نظمیں شروع ہو گئیں۔ سنسکرت اور اُس وقت کی بھاشا (جو طبقۂ اوسط کی زبان تھی) دونوں میں ادیب و شعرا اپنی طبیعت کا زور دکھانے اور خواص و عوام کو لبھانے لگے۔

ناٹک (ڈراما) بھی اُسی دور کے باغ ادب کا وہ میوہ ہے جو اب بھی تازہ ہے۔ گو یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اصل کس زمین پر اس کی قلم لگائی گئی؟ مگر ویدوں میں اس پھل کا ذکر موجود اور نٹوں (ناچنے گانے والے) کا جا بجا ذکور ہے۔ یہ گویّے اور ان کے ناٹک یہاں بہت عام اور مرغوب تھے۔ امیروں کی محفلوں اور راجاؤں کے درباروں تک بھی اُن کی رسائی تھی۔ اور اس وجہ سے ملک میں اس (ناٹک) کی آواز بہت بلند رہی۔

اسی سنسکرتی دور میں کالی داس پیدا ہوئے۔ یہ بکرماجیت کے مشہور نورتن کے وہ جواہر ہیں جس کی چھوت آج تک پڑتی اور نظر کو خیرا کرتی ہے۔ ان کی رتو سنہار (بارہ ماسا) اور میگھ دوتا (ابر قاصد) کی سی موسمی نظمیں، اس زمین پر برس پڑیں اور زبان اور گلوں کے رستہ سے ملک پر چھا گئیں۔ پھر رگھو بنسا تصنیف کی۔ اس میں رگھو رامچندر جی کے مورثا کے بنس (خاندان) کا مفصل حال لکھا۔ اور وہ دیوتاؤں کے ذکر کی وجہ سے سر آنکھوں پر رکھی گئی۔ ان کی نظمیں بہت مشہور اور مقبول ہوئیں لیکن جس خاص چیز نے ہمارے اس ملکی شاعر کو ملک الشعرا بھی منوا دیا وہ ان کا لاجواب ڈراما سکنتلا ہے!

سکنتلا — یہ قصہ ایک راجہ کے رنواس (محل) سے شروع ہوتا اور ایک غریب کی

چھوپڑی میں ختم ہوتا ہے۔

„ دشنتو کمار" اتفاقاً ایک جنگل میں جا نکلتے ہیں۔ اور وہاں سکنتلا "
„ نام ایک پری زاد ہستی پر عاشق ہو کر اس سے بیاہ کر لیتے ہیں۔ کچھ دن وہاں "
„ رہنے کے بعد انھیں اپنا سماج یاد آتا اور سکنتلا کو اپنی نشانی کا چھلا دے کر اور "
„ پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوتے ہیں۔ "

„ ادھر کمار گھر پہنچ کر جنگل کا قصہ اور اپنی سکنتلا کو بھول جاتے ہیں۔ ادھر "
„ اس غریب کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے جسے وہ دکھوں سے پالتی اور دشنتو کی "
„ یاد میں دن گذارتی ہے۔ "

„ بہت دن بیت گئے! جنگل بڑھا، کٹا، چھٹا، صاف ہوا، اور "
„ پھر بھرا! آس پاس کے کھیت لہلہائے، مرجھائے، اٹھائے اور پھر لگائے "
„ گئے! گاؤں کا تلاؤ بھرا، سوکھا، پانی پڑا، اور پھر ہاتھی ڈوب ہوگیا! "
„ اسکے کنارے کنول پھوٹے، نکلے اور پھولے۔ بھنورے بھن بھن کرتے "
„ اڑے، دوڑے، متوالے، چکراتے، چکر کاٹتے۔ اسکے پھول پر بیہوش "
„ بیہوش گرے، اور وہیں ڈھیر ہو گئے! سکنتلا، قدرت کے یہ تماشے دیکھتیں "
„ اور کنول اور بھونرے کی کشش اور وفا پر سر دھنتیں اور اپنے دشنتو کی "
„ یاد میں ڈوب جاتیں! بچہ پلا، بڑھا، کھیلنے لگا، اور اب ہشیار ہوگیا! یہ سب "
„ ہوا مگر کمار اب بھی نہیں لوٹے! یہ اب بہت اکتائیں تو خاوند کی ڈھونڈھ "
„ میں نکلیں۔ بخت کی خوبی، ستارے کی گردش۔ لو، عین وقت پر نشانی کا "
„ وہ چھلا بھی گم ہوگیا! روئیں کہ اب کیا لیکر اور کس منہ سے کمار تک جائیں؟ "
„ مگر ہمت نہ ہاریں۔ دل کڑا کر کے اور لڑکے کا ہاتھ پکڑ چل کھڑی ہوئیں اور کسی طرح "
„ راجہ (دشنتو) کے دربار تک پہونچیں! "

„ دشنتو جی نے نہیں پہچانا۔ لڑکا پیش کیا گیا۔ اسے بھی غیر جانا۔ بہت "
„ کچھ یاد دلایا گیا تو ذرا چونکے۔ مگر چھلا مانگا۔ وہ کہاں؟! سکنتلا بھرے دربار میں "

" چھوٹی بنیں نکلیں! لیکن صبر کیا اور اُسی شہر میں رہنے لگیں۔ کچھ دن بعد دشنتو "
" چونکے۔ غریبوں کی یاد آئی۔ بلاہٹ ہوئی۔ دن پھر چکے تھے۔ بھیجئے وہ نشانی (چھلّا) "
" بھی مل گئی! سکنتلا ہنستی کھیلتی دربار کو چلیں۔ پہونچیں۔ راجہ کے سامنے آئیں۔ "
" کشمش ہوئی۔ پہچانا! مگر دشنتو پھر راجہ ہیں۔ سنبھلے رہے اور اپنی نشانی "
" (چھلّا) کا سوال کیا۔ انھوں (سکنتلا) نے مسکرا کر پیش کر دیا۔ راجہ بےچین "
" ہو کر گدّی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جوش میں اُن کا ہاتھ پکڑ بغل میں بٹھلا لیا!۔ "
" لڑکا سامنے آیا۔ دیکھا اور محبت کی فطرت نے اُسے گود تک پہونچا دیا! پیار کیا۔ "
" بھرت نام رکھا۔ بچھڑے ملے اور پھر ہنسی خوشی رہنے لگے!! "

یہ وہی بھرت ہیں جو بڑھ کر بھرت جی کہلائے اور چندر بنسیوں کے پُرکھا (مورث) اور اُس نسل کے بانی مانے گئے۔

یہ نادر ڈراما بھی اُس وقت کے پنڈتوں کی زبان یعنی سنسکرت میں ہے۔ مگر چونکہ اُسکی سبھا میں راجہ، پرجا، عالم، جاہل، اور خاص و عام سب آتے اور یونانی[1] گائنیں تک ناچتی گاتی ہیں اس وجہ سے اُس کے خاص ایکٹروں کی زبان تو دیوبانی (سنسکرت) ہے مگر اوروں کی بولی وہی پراکرت ہے جو اُس وقت کے بزار کا رائج سکہ اور پرجا کے گھروں کا کھرا مال تھا۔ اور اس سے ظاہر ہے کہ کالی داس کے سے جوہری کو بھی یہاں کے اصلی و ملکی سنگ ریزوں کو اپنے ذخیرے میں جگہ دیئے بغیر چارا اور چھٹکارا نہ تھا!

یہ نظمیں اور یہ تصنیفیں گھر گھر پھیلیں اور خواص پر عوام کی بولی اور عوام پر خواص کی زبان کا اثر پڑتا اور بڑھتا چلا۔ مرچھ چھکٹی (رتھ کھلونا) کا ناٹک بھی اُسی زمانہ کی یادگار اور قصور وار کو پکڑنے اور بے قصور کو چھوڑنے کا جائز و فطری قانون سکھا کر انسان کو منصف بناتا اور خدا کو یاد دلاتا ہے۔

---

[1] ہند و شام و فلسطین اور یونان کے تعلقات بہت قدیم ہیں۔ ورجل (رومن شاعر) اور ہومر (یونانی شاعر) کی نظموں سے ان دو ملکوں کے رواسم کا پتہ چلتا ہے۔ سکندر کی وجہ سے یہ رابطہ اور بڑھا اور اس کا سبب یونانی اثر کسی قدر تک چھا رہا۔ کالی داس کے وقت میں یہ اثر اتنا گہرا تھا کہ سقراط اور ارسطو کا فلسفہ و منطق [illegible]

پھر نَل دَمنَ (نَل دَمنتا) کی سی مثنوی لکھی گئی - اس میں ایک جواری راجہ (نَل نام) کی مدہوشی اور اندھے جوے کی پر درد داستان، اُنکی بے پناہ ہار (۵ راجہ نل سلطنت ہی ہارا) اور اُن کی رانی دَمنتا کی وفا وہشیاری کی حکایت سُنا کر بڑے سبق دیئے گئے ہیں - یہ وہی دلچسپ نظم ہے جسے **فیضی** کے سے علامہ نے **اکبر** کی فرمائش پر **فارسی** کا جامہ پہنایا اور ہم سے روشناس کرایا۔

پنچھ تنترا بھی اُسی مبارک دَور کی ایک نئی مزیدار، مسلسل اور **قصہ در قصہ حکائت** ہے - یہ جانوروں کی ایک **بولتی** ہوئی تصویر ہے - مگر کیسے جانور اور کیسا ہوش ربا قصہ؟ یہ اُن طلسمی **بے زبانوں** کی وہ جادو بھری کہانی ہے جو اُن کی زبانی **آدم ذات** کو سنائی جاتی اور باتوں باتوں میں اُسے **انسان** بناتی ہے! یہ قصہ نہ صرف اس ملک میں عام ہوا بلکہ اسکا چرچا دُور دُور پھیلا - پہلوی (قدیم فارسی) میں بھی وہ حیوان گویا ہوے اور **کلیلہ و دمنہ** کی زبان سے عرب میں بھی ناطق سمجھے گئے! پھر نئے **فارس** اور **نئی فارسی** کے آسمان شہرت پر ملا حسین واعظ کے قلم سے وہ (قصہ) **انوار سہیلی** بن کر چمکا - اور بعد کو **اکبر** کے سے ہوشمند کے اشارہ پر **ہندی فارسی** کا خلعت اور **عیار دانش** لقب پا کر ہماری محفل کو بھی خرد افزا بنانے اور سرفراز کرنے لگا!!

ادب:- جناب خیال کے گزشتہ مضمون (داستان اُردو - بودھ مت، جین مت اور سنسکرت) کے ساتھ شائع کرنے کے لئے ہمیں اُن کتابوں کے نام بھی موصول ہوے تھے جو اس باب کے لکھتے وقت فاضل مصنف کے پیش نظر تھیں - یہ فہرست گزشتہ پرچے میں شائع نہ ہو سکی اس لئے اس مرتبہ یہاں درج کی جاتی ہے:-

(۱) ویبر = تاریخ ادب سنسکرت = (۲) میکس مُلر = تاریخ قدیم ادب سنسکرت =

(۳) جون میور = ترجمہ غیر مطبوعہ کتب سنسکرت = (۴) پروفیسر رہز ڈیوڈ = بودھ مت گوتم جی کی پیدائش

لہ سنسکرت کی اکثر تصنیفیں کہانیوں اور ساکھانیوں کے وقت میں دَرسی و پہلوی میں ترجمہ ہوئیں پنچھ تنترا نے بھی اُسی عہد میں قدیم فارسی (پہلوی) کا جامہ پہنا - عربوں نے اس تحفہ کو بھی الف لیلا کی طرح، آخر اپنا کر لیا۔

(۵) بشپ بگنیڈٹ = سوانح و قصص متعلق بہ گوتم بودھ =
(۶) سنارٹ = مضمون حکایات دربارۂ بدھا =
(۷) میکس ڈنکر = تاریخ ہند قدیم =
(۸) میکس ملر = مقدس کتب ہائے مشرق =
(۹) رسالہ مہا بدھا سوسائٹی = کلکتہ سنہ ۱۸۹۲ء
(۱۰) جنرل کننگھم = جغرافیہ ہند قدیم =
(۱۱) پروفیسر وہلی = راز غلامی = ترجمہ از جرمن انگریزی امریکہ =
(۱۲) پروفیسر ڈوزلا = کنعان و کنعانیان = فرنچ =
(۱۳) پروفیسر لیبرگ = تعلیمات موسیٰ عیسیٰ = جرمن =
(۱۴) پروفیسر گنیری = لغویات مذہب = انگریزی امریکہ =
(۱۵) عبداللہ مصری = فراعنہ مصر - عربی مطبوعہ سنہ ۱۸۷۱ء =
(۱۶) جرجی زیدان = بابل و شام - عربی مطبوعہ بیروت سنہ ۱۹۱۰ء
(۱۷) ابوالقاسم فرشتہ = تاریخ فرشتہ، تاریخ ہند =

سلطان جلال الدین خلجی

(مہدی حسین صاحب ایم - اے - پروفیسر آگرہ کالج)

نہایت رحم دل، خدا ترس، فیاض اور انصاف پسند تھا - بادشاہ ہو کر بھی وہ اپنے قدیم مربی اور محسن غیاث الدین بلبن کو نہ بھولا ہمیشہ اسکا لحاظ کرتا رہا - اس محل میں جو بلبن کا بنوایا ہوا تھا کبھی سوار ہو کر نہ جاتا تھا - تخت پر نہ بیٹھتا - بلکہ بلبنی دربار میں قدیم سے جو جگہ اُسکے لئے مقرر تھی اُسی پر جا کر کھڑا ہو جاتا - جلال الدین بات کا سچا اور معاملے کا صاف تھا - ظاہر و باطن اسکا ایک تھا - چال ڈھال اسکی سیدھی سادھی تھی - تاجپوشی کے بعد بھی وہ اپنے پُرانے ملنے والوں سے پہلے کی طرح ملتا رہا - اُس نے بلبن کا نام و نشان باقی رکھنے کی بڑی کوشش کی بلبن کے بھتیجے ملک چھجو کو جو حقیقت میں ایک حریف اور دشمن تھا کڑے اور مانک پور کا حاکم بنایا - جب چھجو نے بغاوت کی اور بادشاہ کے بڑے بیٹے ارکلی خاں نے اسے شکست دے کر زندہ گرفتار کر لیا تو جلال الدین نے چھجو کو مع اسکے سرداروں کے رہا کر دیا اور کچھ جاگیر بھی دی - اور اس کے مددگاروں کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آیا - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کی بنیاد کمزور ہو گئی اور انتظام میں فرق آ گیا - ملک میں فساد ہونے لگا - راستوں میں لٹیروں نے بدامنی پھیلا دی اور باغیوں نے راہیں بند کر دیں - اگرچہ جلال الدین نے کہیں کہیں سرکوبی کی لیکن فسادیوں باغیوں کے ساتھ سخت گیر بادشاہوں کی طرح پیش نہ آیا - اس لئے فتنہ و فساد کی چنگاریاں اُسکے بجھائے بجھ نہ سکیں -

سلطان جلال الدین کے عہد میں علاء الدین کے کارنامے قابل ذکر ہیں - علاء الدین سلطان جلال الدین کا بھتیجا اور داماد تھا سلطان نے اُسے کڑے کا حاکم بنایا دیا تھا - مگر علاء الدین اپنی بیوی کی مخالفت سے تنگ آ گیا تھا - اور اپنی خوشدامن ملکۂ جہاں سے بھی عاجز

تھا۔ ان باتوں کو وہ سلطان سے کہہ نہ سکتا تھا۔ رات دن اسی فکر میں رہتا تھا کہ جنگلوں اور
پہاڑوں کو طے کر کے کسی دوسری ولایت میں نکل جائے۔ دیوگڑھ کی دولت کی خبریں سُن سُن کر
اُسکا حوصلہ بلند ہوا۔ بادشاہ سے اپنا ارادہ مخفی رکھکر چندیری اور مالوے کو فتح کرنے کی اجازت
طلب کی۔ بادشاہ نے اجازت دے دی۔ تو ۱۲۹۴ء میں آٹھ ہزار سواروں کو لے کر نکلا اور
بندھیاچل پہاڑ کو طے کر کے دیوگڑھ پہونچ گیا۔ دیوگڑھ کا راجہ اُس وقت رام دیو تھا جو دکن کے
کل راجاؤں میں بڑا گنا جاتا تھا اور اسی سبب سے مہاراجہ کہلاتا تھا۔ اُس زمانے میں اچانک حملہ
کرنے کا دستور نہ تھا اور اچانک حملہ کرنے والے کو بہت بُرا جانتے تھے۔ مہاراجہ رام دیو کو کسی
غنیم کے حملے کا گمان بھی نہ تھا۔ نہ وہ جنگ کے لئے تیار تھا۔ جس دن علاءالدین نے اُس پر
حملہ کیا۔ رام دیو کے پاس فوج بھی نہ تھی۔ ضیاءالدین برنی کا بیان ہے کہ "مہاراجہ کی کل فوج
کو لے کر اس کا بیٹا کسی دوسری سمت چلا گیا تھا۔ علاءالدین دیوگڑھ میں داخل ہوا، تو نئی فوجوں
کے آنے سے ایک شور اُٹھا۔ جس کو سُن کر راجہ کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ وقت بہت نازک
تھا۔ جس طرح بن پڑا کچھ فوج جمع کی اور شہر کے باہر آکر علاءالدین کا مقابلہ کیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر
میں اسکی فوج کا دل چھوٹ گیا اور پاؤں اُکھڑ گئے۔ رام دیو بھاگا۔ اور ایک پہاڑی قلعے میں
پہونچ کر پناہ لی۔ دشمن وہیں پہونچ گئے اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ علاءالدین نے یہ خبر مشہور کر دی کہ
میں تو تھوڑی سی فوج لے کر بطور ہراول کے آیا ہوں۔ بادشاہ دہلی کا بڑا لشکر پیچھے سے آرہا ہے
یہ سُن کر راجہ نے صلح کا پیغام بھیجا۔ علاءالدین نے بہت سی دولت مانگی جس کا ایک تہائی
دینے پر راجہ راضی ہو گیا۔ کئی سو من سونا، موتی اور جواہرات علاءالدین کے ہاتھ آئے۔ دولت
سے مالا مال ہو کر علاءالدین نے قلعے کا محاصرہ اُٹھا دیا۔ اور کڑے کا رُخ کیا۔

اس وقت سلطان جلال الدین گوالیار میں تھا بھتیجے کے کارنامے سُنے تو دل باغ باغ
ہو گیا۔ خوشی خوشی دہلی واپس آیا۔ وزیروں نے سلطان کو رائے دی کہ علاءالدین کو کڑے
جانے سے پہلے راستے ہی میں روک لینا چاہئے۔ مگر اُس نے کسی کی نہ سُنی۔ اور علاءالدین کڑے
پہونچ گیا۔ وہاں ایک بڑی فوج تیار کر کے خاموشی کے ساتھ بادشاہ کے قتل کی تیاریاں کرنے لگا۔
سلطان جلال الدین کے پاس پیغام بھیجا کہ "اکثر ہاتھی اور گھوڑے اور بہت کچھ نقدی اور

زیورات وغیرہ دکن سے لایا ہوں اور یہ سب بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن
حضور کی بغیر اجازت چلا گیا تھا، اس سبب جہاں پناہ کی ناراضگی کا خوف ہے۔ اگر حضور
ایک معافی نامہ ارسال فرمائیں تو اطمینان ہو جائے"۔ بادشاہ نے اپنے دو خاص درباریوں
کے ذریعے علاءالدین کے نام ایک خط بھیجا جس میں اپنے خلوص اور محبت کا اظہار کیا۔ علاءالدین
نے خط لے کر اُن دونوں درباریوں کو قید کر دیا۔ اور پھر ایک عرضی بادشاہ کی خدمت میں بھیجی۔
اُس میں تحریر کیا کہ "اگر حضور میرے گناہ معاف کرنے کی نظر سے کڑہ مانک پور تک تنہا تشریف
لے آئیں تو میں حضور کی قدمبوسی حاصل کروں۔ ورنہ اسی غم میں جان دے دونگا۔ یا اپنی بدنصیبی پہ
روتا ہوا جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف نکل جاؤنگا"۔ جلال الدین بہت ہی سیدھا آدمی تھا اُسنے
یہ بھی منظور کر لیا۔ علاءالدین اپنی فوج لے کر کڑے سے چلا۔ دریا کو عبور کیا اور مانک پور پہونچا۔
بظاہر تو اپنے بھائی الماس بیگ کو بادشاہ کے استقبال کے لئے روانہ کیا لیکن تاکید کر دی
کہ جہاں تک ممکن ہو بادشاہ کو تنہا میرے پاس لانا۔ اُدھر سے جلال الدین بھی کڑے مانک پور
کی طرف روانہ ہو چکا تھا جب گنگا کے کنارے کڑے کے حدود میں پہونچا تو رمضان کی سترہ تاریخ
تھی۔ اور سلطان کا سترہواں روزہ تھا۔ علاءالدین کی فوجیں دریا کے دونوں کناروں پر
پرے جمائے مسلح کھڑی تھیں۔ مگر جلال الدین ایسا سادہ لوح تھا کہ فوجوں کو دیکھ کر بھی معاملہ کو
نہ سمجھا۔ وہ سمجھا تو بس یہ سمجھا کہ میری پیشوائی کے لئے علاءالدین کی فوجیں آئی ہیں۔ اُس وقت
الماس بیگ نے بڑھ کر بادشاہ سے عرض کیا "اگر حضور آج اِدھر تشریف نہ لاتے تو علاءالدین
حضور کی ناراضگی کا خوف کھا کر آوارہ وطن ہو جاتا اور اب بھی اُسکا دل حضور کے دبدبے اور غصے
کے خوف سے تھرا رہا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ جب اس قدر فوج جو حضور کے ساتھ ہے دیکھیگا تو
علاءالدین دہشت کھا کر بھاگ جائیگا۔ میری تو حضور سے درخواست ہے کہ فوجیں یہیں رہیں اور
صرف حضور کی کشتی مانک پور چلے۔ بادشاہ اُس وقت قرآن شریف پڑھ رہا تھا۔ الماس بیگ نے
جو کچھ کہا، اُس نے فوراً منظور کر لیا۔ چنانچہ سلطان کی کشتی مانک پور کو چلی اور تقریباً چار بجے دن کے
مانک پور پہونچ گئی۔ بادشاہ گنگا کے کنارے کشتی ہی میں تھا کہ علاءالدین مع چند ہمراہیوں کے
کشتی میں بیٹھ کر قدمبوسی کے لئے بڑھا اور جب بادشاہ کی کشتی کے برابر پہونچا تو بادشاہ کے قدموں پر گر پڑا۔

بادشاہ نے اُٹھا کر پیار کرنا شروع کیا۔ اُسکی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "بیٹا علاءالدین تمہاری محبت میرے دل میں سب عزیزوں اور رفیقوں سے زیادہ ہے۔ کیونکر ہو سکتا ہے کہ میں تم سے ناراض ہوں؟ ابھی تک تمہارے پیشاب کی بو بھی میرے کپڑوں سے نہیں گئی ہے" بادشاہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ علاءالدین نے اپنے ایک سپاہی محمود بن سام ساکن سامانہ کو اشارہ کیا اس نے فوراً سلطان جلال الدین پر تلوار کا وار کیا۔ سلطان کا سر کٹ کر دریا میں گر پڑا اور تن کشتی میں رہ گیا۔

"آئینہ اودھ" نے "ظہور قطبی" اور "ملفوظات خواجہ کڑک" کے حوالے سے ایک اور روایت لکھی ہے جسکی تائید تاریخ فرشتہ سے بھی ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب علاءالدین دیوگڑھ سے فتح پاکر کڑے واپس آیا۔ تو بادشاہ کے ڈر سے کڑے کے ایک کامل مرشد اور ولی خواجہ کرک اللہ کے پاس اکثر جایا کرتا تھا اور اُن سے مدد چاہتا تھا۔ ایک روز خواجہ نے علاءالدین کو بادشاہت کی مبارکباد دی۔ اور یہ اشعار پڑھے۔ ؎

مرحبا اے بادشاہِ دہلوی　　　گشت مغلوبِ ترا خصمِ قوی

من ترا دادم سریر و سلطنت　　　بر زدم بر خاکِ تاجِ دشمنت

یعنی اے علاءالدین! تیرا نصیبہ جاگا، تو دہلی کا بادشاہ ہو گیا۔ میں نے تجھے تخت بھی دیا اور حکومت بھی۔ اور تیرے دشمن کے تاج کو میں نے خاک میں ملا دیا۔ اور پھر خواجہ نے دشمن کے قتل ہو جانے کی یوں خبر دی۔ ؎

ہر کہ آید بر سرِ جنگ　　　تن در کشتی سر در گنگ

یعنی اے علاءالدین جو تجھ سے جنگ کرنے کیلیے آرہا ہے وہ قتل ہوگا۔ اُس کا سر تو کٹ کر دریائے گنگا میں جا پڑیگا اور دھڑ کشتی میں رہ جائے گا[1]۔ جلال الدین کا سر دریا میں بہتا ہوا ایک مقام پر

---

[1] اگرچہ تاریخ کی اکثر کتابوں میں جلال الدین کے قتل کا واقعہ اس طرح لکھا ہے کہ وہ دریا کے کنارے کشتی سے اُترا اور خشکی میں قتل کیا گیا مگر ہمعصر اور ولی کے اشعار جو اوپر درج کئے گئے ہمارے بیان کو سچا ثابت کر رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ جلال الدین کشتی میں قتل کیا گیا۔ یہ ممکن ہے کہ خواجہ صاحب نے نظم میں جواب نہ دیا ہو اور یہ شعر اُن کے نہ ہوں۔ اور بعد میں بنا دیئے گئے ہوں لیکن خواجہ صاحب نے ایسی پیشین گوئی کی ضرور تھی۔ مجھے خواجہ صاحب کے مفصل حالات معلوم کرنے کی بڑی لگن ہے۔ آئینہ اودھ میں جو کچھ ہے وہ ناکافی ہے۔ چنانچہ گذشتہ ہولی کی تعطیل میں (صفحہ ۱۸ ملاحظہ ہو)

گم ہوگیا۔ اسی وجہ سے اس مقام کا نام گُمسرا پڑگیا جو بعد میں کھمسرا مشہور ہوا اور تاج پانی میں بہتا ہوا دریا کے دوسرے کنارے پر پہونچ گیا۔ اور وہاں چند ملّاحوں کے ہاتھ آیا۔ وہ خوش خوش اُسے علاء الدین کی خدمت میں لے کر آئے۔ علاء الدین نے اُسکے صلے میں گنگا پار کی زمین کو جہاں تاج ملا تھا انہیں ملّاحوں کو معافی میں دے دی۔ اس وجہ سے وہ مقام تاج ملّاح کے نام سے مشہور ہوگیا۔ کھمسرا[1] اور تاج ملّاح دونوں مقام اب بھی موجود ہیں اور انہیں ناموں سے مشہور ہیں۔

اس بات کی تائید امپیریل گزیٹر[2] سے بھی ہوتی ہے۔ قابل مؤلف نے لکھا ہے کہ سلطان جلال الدین خلجی کھمسیا کے گاؤں میں دفن کیا گیا جو مانک پور سے ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔" معلوم ہوتا ہے کہ کھمسیا وہی جگہ ہے جو اب کھمسرا کے نام سے مشہور ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷) کچھ وقت ملا تو دریافت کرتا ہوا مانک پور پہونچا۔ اور وہاں سے بذریعہ کشتی گنگا کے کچھ حصے کو عبور کرکے کڑے میں داخل ہوا۔ پہلے دریا کے کنارے مزار حضرت خواجگی علیہ الرحمہ کو دیکھا جس سے جناب سید کبیر الدین احمد رئیس کڑہ کا پتہ چلا۔ سید صاحب حضرت خواجگی علیہ الرحمہ کی اولاد میں سے ہیں۔ پھر میں نے خواجہ صاحب کے مزار کی زیارت کی۔ مزار بہت بڑا اور پر رونق ہے۔ تقریباً ۱۰ فٹ لمبا اور ۵ فٹ چوڑا مستطیل بنا ہوا ہے۔ اس پر چھت ہے جو سولہ کھمبوں پر قائم ہے۔ قبر مبارک پر ایک چادر پڑی رہتی ہے۔ مزار پر ایک مجاور موجود تھا معلوم ہوا کہ کانی پور اور تین اور کے گاؤں مزار کے انتظام کے لئے شاہی زمانہ سے معافی میں دیئے گئے ہیں۔ کڑے میں خواجہ صاحب "خواجہ کڑک" مشہور ہیں۔ خواجہ صاحب کا نام نامی سید احمد سبزواری تھا۔ کڑے آنے کے بعد شاہ کڑک" غالباً اس سبب سے مشہور ہوگئے کہ آپ کی آواز کرخت تھی۔

[1] کھمسرا مانک پور سے دو میل کے فاصلے پر شیخ ازہر حسین صاحب رئیس بہلواں ضلع پرتاپ گڑھ کی زمینداری میں ہے۔ اور وہیں دریا کے کنارے قبر بھی ہے جسے کھمسرا کے کسان اب تک بادشاہ کی قبر بتاتے ہیں میں وہاں گیا۔ کڑے اور مانک پور کے درمیان دریا کے کنارے قبر کو دیکھا اور محکمہ آثار قدیمہ کی توجہ اس طرف مبذول کرادی۔

[2] Imperial Gazetteer.

سلطان محمد تغلق عادل شاہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

(مشیر احمد صاحب علوی بی اے۔ (علیگ)

باب پنجم

شہنشاہ کے عمدہ تدابیر

ملک میں بظاہر کوئی بے چینی کے آثار نہ تھے۔ شہنشاہ نے حکم دیا کہ دواب کا ملک چونکہ بہت زرخیز ہے اِس لئے ہنگامی ضرورتوں کے لئے وہاں مزارعین و زمینداروں سے ایک مناسب رقم لے لی جائے۔ آسودہ حال رعایا نے سرکشی کی۔ اور بالخصوص ہندوؤں نے جو مرفہ حال اور اہل دول تھے انہوں نے سرکشی کی۔ عادل سلطان نے پہلے تو چشم پوشی کی لیکن جب ان باغیوں نے افواج سلطانی پر شبخون مارنا شروع کیا تو مجبوراً تادیب و گوشمالی کا حکم دیا گیا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں دہقانوں نے اپنی جبلّی شرارت سے کھلیانوں (خرمنوں) میں آگ لگادی اور خود جنگلوں میں جاکر روپوش ہوگئے اور راہ گیروں کو دق کرنا شروع کردیا۔ اب مجبوراً سلطان نے عنانِ خیال اس طرف موڑی اور امن و امان کی خاطر ان امن سوز افراد کو سزا دینے کا ارادہ کیا۔ جس کے لئے آج وہ بیسویں صدی میں بدنام ہے۔

حکومت کا اولین فرض یہی ہے کہ وہ اپنی رعایا پر حکومت کرے اور امن و امان کی محافظ رہے۔ قطاع الطریق اور باغیوں کو سزائیں دے۔ اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو ایک دن بھی حکومت قائم نہیں رہ سکتی اور خصوصیت سے آٹھویں صدی کے ابتدائی عشرہ میں جبکہ حریت کے جذبات ہنوز

زندہ تھے۔ اور مردہ شخص جو گھوڑے پر سوار ہو کر نیزہ بازی کر سکتا، شمشیر چلا سکتا سلطان بنجانے کا اہل تصور کیا جاتا تھا

"ہندوان خرمنہائے غلہ را آتش می زدند و می سوختند۔ و مواشی را از خانہ ہا بیرون می کردند۔ و سلطان شقداران و فوجداران را فرمودہ تا دست در نہب و تاراج زدند۔ بعضے فوطان و مقدمان می کشتند و بعضے را کور می کردند۔ و انانکہ خلاص می یافتند جمعیتہا می کردند۔ و در جنگلہا می خزیدند و ولایت خراب می شد۔ و ہمدراں ایام سلطان محمد تغلق بر طریق شکار در ولایت برن رفت[1] "

یہاں پر ایک لطیف سوال پیدا ہوتا ہے کہ دواب کس کو کہتے ہیں؟ دواب سے ہمیشہ گنگ و جمن کا دوابہ مراد لیا جاتا ہے۔ مگر یہ خیال ہے کہ صوبہ میان دواب کا مفہوم ہر زمانہ میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس زمانہ میں صوبہ میان دواب وہ وسیع علاقہ کہلاتا تھا جو مشرقی جانب گنگا اور مغربی جانب ستلج سے محدود تھا۔ اسکی شمالی حد ہمالیہ اور جنوبی حدود خط تھا جو قنوج سے آگرہ ہوتا ہوا راجپوتانہ کو خشک بے آب و گیاہ ریگستان تک چلا جاتا ہے۔ اس صوبہ میں ہندو راجپوتوں کی آبادی تھی جو اپنے حسن صورت اور شجاعت کے لئے مشہور تھے جنکی خواتین کی بہادری و قربانیوں کے لاثانی افسانوں سے ریگستان کا ذرہ ذرہ شاہد ہے۔ اسی خطہ میں شریر اور خود سر قبائل کی مذکورہ بالا شرارت سے صوبہ میان دواب کا وہ خطہ جو دہلی سے جنوب و مشرق کی جانب برن (بلند شہر) سے قنوج و ڈلمو تک پھیلا ہوا ہے زیادہ ماؤف ہوا۔

دواب میں جو مالگذاری پر اضافہ کیا گیا تھا وہ یہ تھا۔

"خراج ولایت میان دواب یکے بدہ و یکے بہ بست میباید شد[2] "

جسکا مفہوم یہ ہے کہ دس گنا و بیس گنا اضافہ ہوا تھا جو قطعاً افترا ہے۔ یہ فقرہ لغوی حیثیت تک

---

[1] فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

مختصر تغلق نامہ ــــ احمد عمر و قلمی ــــ گیان پور ــــ مسلم سوسائٹی علی گڈھ

[2] فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

پہونچ گیا ہے۔

میرے خیال میں اس کا مقصد یہ ہے کہ ½ یا ⅓ اضافہ ہنگامی ضروریات کے لئے کیا گیا تھا۔ ایلیٹ (Elliot) نے بھی ۵ فی صدی یا زیادہ سے زیادہ دس فی صدی اضافہ تسلیم کیا ہے۔ اور یہ قرین قیاس بھی ہے جو ایک زرخیز ملک کے وسائل آمدنی کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ نہیں ہے اور اس اضافہ سے مزارعین پر کوئی خاص نمایاں اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ اسکے خلاف آج کل سائکل ٹیکس۔ ٹرمنل ٹیکس۔ کتا ٹیکس۔ جانور ٹیکس۔ گھرواره وغیره وغیره۔ خدا معلوم کس قدر ٹیکس فی کس ادا کرنا پڑتے ہیں اور کوئی مورخ اُن کو بُرا نہیں کہتا بلکہ ملک کی عمرانی اور معاشرتی تعمیر کے لئے ان ٹیکسوں کو لازمی ولابدی تصور کیا جاتا ہے۔

باعظمت سلطان برن سیر وشکار کے لئے گیا ہوا تھا لیکن وہاں جاکر بغاوت کا حال سُنا تو متمردین کی گوشمالی کا ارادہ کیا۔ اور سزا دی۔ ایک طرف بغاوت فرو ہوئی تھی کہ سرکار قنوج میں شورش کے آثار رونما ہوے لیکن شریرین چکے تھے کہ سلطان برن کے جنگلوں میں شکار کھیلنے کے لئے آیا ہوا ہے اور وہیں سرکشوں کو کافی سزائیں بھی دے چکا ہے۔ اس لئے وہ سب جنگلوں میں روپوش ہو گئے جب سلطان قنوج پہونچا تو اس نے باغیوں کی جستجو میں آدمی دوڑائے جب یہ یقین ہو گیا کہ یہ شریر جنگل میں پوشیدہ ہیں اپنی فوج کو جنگل کے محاصره کا حکم دے دیا۔ جو حقیقتاً مجرم تھے اُن کو گرفتار کر کے عدالت میں اُن پر باقاعده مقدمات چلائے گئے اور سزائیں دی گئیں۔ اور جو خون وقتل کے مجرمین تھے اُن کو قتل بھی کیا گیا۔ اس میں کسی قسم کی رو و رعایت نہ کی گئی ———— برنی نے اس واقعہ کو بہت عظیم الشان طریقے سے مختلف رنگ آمیزیوں کے بیان کیا ہے۔ ایک تاریخ میں ایک جگہ یہ اشتباہ بھی پایا جاتا ہے کہ برن اور قنوج کے فسادات میں ضیاء الدین برنی کے اعزہ و احباب نے بھی حصہ لیا تھا۔

باعظمت سلطان شعبان (جون) ۷۴۲ھ میں قنوج و ڈلمو کے مفسدوں کی تادیب واقعی کے بعد دارالخلافت واپس چلا گیا۔ ابن بطوطہ نے بھی اسی قسم کا آدمیوں کے شکار کا افسانہ تراشا ہے۔ جسکی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ جو سراسر لغو اور بے بنیاد ہے۔ کیا آج کل دورِ حاضره کے متمدن اقوام میں مالگذاری وصول کرتے وقت کوئی رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے؟ ۔ اکثر

بدقسمتوں کو باوجود خوشامدوں کے جیل جانا پڑتا ہے۔ جائدادیں نیلام ہوتی ہیں۔ غرض کہ کیا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ اُس دورِ جہالت کے متعلق کچھ بھی کہنا عبث اور لاحاصل ہوگا۔ کیونکہ وہ ہر آئینہ دورِ حاضرہ کے مقابلہ میں لاسلکی ۔ تار ۔ برقی روشنی ۔ نشر الصوت ۔ ہوائی جہازوں اور مشین گنوں کی برکات سے یقیناً محروم تھا !!!

حقیقت یہ ہے کہ اب تک کسی نے اس بدنصیب شہنشاہ پر قلم اُٹھانے کی ہمت ہی نہیں کی اگر کسی نے کچھ لکھا بھی تو اُسکے خلاف ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ابھی تک باوجود اس قدر تحقیقات و انکشافات کے عالمگیر ذوق و شوق کے بھی سلطان محمد تغلق کے حالات زندگی ابھی تک بالکل ظلمت و تاریکی میں ہیں۔ مورخین نے اسکے صفات حمیدہ کی طرف توجہ تک بھی نہ کی۔ بلکہ جب کبھی انہوں نے اسکے زمانہ کی تاریخ پر قلم اُٹھایا تو اُسکو متضاد صفات کا مجموعہ بنا کر عوام کے سامنے پیش کر دیا کہیں وہ ظالم و بے رحم ہے کہیں دیوانہ اور کہیں اُسکے دماغ میں جنون غرضکہ مختلف عیوب نکالے گئے ہیں۔

سلطان محمد تغلق پر اسکے مہربان مؤرخین نے جو الزامات عائد کئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اُنکی تشریح سے پہلے میں اس راز کا انکشاف کروں جسکی بنا پر مورخین کو اُسکی شکایت کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آگیا ہے۔

محمد تغلق کے عہد حکومت میں ہندوستانی دو جماعتیں تھیں جو زمام سلطنت کو متضاد سمتوں میں کھینچ رہی تھیں۔ ایک جماعت اُن افراد کی تھی جن کا خیال تھا کہ ہندو یا مسلمان پارسی یا یہودی جو بھی حکومت کے فرائض انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو، اچھے سے اچھے عہدے پر جسکو وہ بخوبی نباہ سکتا ہو مقرر کیا جائے۔ اس جماعت کا سب سے بڑا رکن یا صدر خود سلطان محمد تغلق تھا۔ وہ نہ ہندوؤں کا پرستار تھا نہ مسلمانوں کا غلام، نہ ملکیوں کا طرفدار نہ غیر ملکیوں کا دشمن۔ کابل و ایران کے غیر ملکی اور ہندو اور دکن کے ملکی، خواہ کسی ملت کے پیرو ہوں اسکی نگاہ میں بالکل برابر تھے۔ ہر شخص کو اُسکی استعداد کے مطابق کاروبار سلطنت میں حصہ دیا جاتا اور اُس سے سرکاری خدمت لی جاتی تھی۔ دوسری جماعت اُن غیر ملکیوں کی تھی جو چاہتے تھے کہ جس قدر طرفداری ممکن ہو وہ پردیسی مسلمانوں کے ساتھ برتی جائے اور خطرناک ہندیوں کو ملک کے کسی انتظام میں حصہ دیا جائے۔ اسی جماعت کے ہواخواہوں اور نمک خواروں میں سے برنی بھی ہے۔ جو بدقسمتی سے محمد تغلق کے عہد کا سب سے زیادہ معتبر مورخ مانا جاتا ہے۔

"ولیکن قلم در کفِ دشمن است"

(باقی آئندہ)

تعینِ اصطلاحات کا طریقہ

(محمد فخر الزماں صاحب بی۔ اے)

ہماری زبان کی سب سے بڑی کمزوری جیسا کہ عام خیال ہے تکوینی نہیں بلکہ تدوینی ہے۔ دوسرے لفظوں میں علمی اور خالص ادبی نقطۂ نظر سے جو تنگی اردو میں محسوس کی جاتی ہے اُسکا سبب محض لغات کا قحط نہیں ہے بلکہ اُن میں کسی قسم کے تعین و انتظام کا فقدان۔ الفاظ کے ذخیروں پر نظر کیجیے تو ہماری زبان کچھ ایسی زیادہ مفلس نہیں لیکن مفاہیم کے دائروں میں فکر کو پھرائیے تو یکسر اختلال و بدنظمی سے اکثر دو چار ہونا پڑتا ہے۔ ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ایک لفظ جو اصطلاحاً صرف ایک خاص مفہوم کے ادا کرنے پر قادر ہوسکتا تھا توڑ مروڑ کر دوسر معانی کا بھی ترجمان بنایا گیا ہے۔ دوسری طرف اس سے بھی زیادہ ادبی بدسلیقگی "اسراف بیجا" کی صورت اختیار کرتی ہے یعنی ایک ہی مطلب کے لئے مختلف موقعوں پر مختلف لفظوں سے کام لیا جاتا ہے۔ گویا ان میں کوئی فرق کوئی امتیاز نہیں ہے مصنف مترادف الفاظ کا ڈھیر دیکھکر اپنی قوت تمیزی کھو بیٹھتا ہے اور انھیں جا بیجا استعمال کرتے وقت اُسے یہ خیال نہیں رہتا کہ کسی زبان میں دو لفظ حقیقتاً ہم معنی نہیں ہوسکتے خواہ بظاہر کتنے ہی ملتے جلتے کیوں نہ ہوں۔ دونوں کے معانی میں باریک سہی فرق ضرور ہوگا۔ غرض یہ کہ ہمارے خزانے میں انمول جواہر ریزوں کی کمی نہیں لیکن ہم محل استعمال سے ناواقف ہونے کے باعث اُن کی قدر نہیں جان سکتے۔

اس نقص کا احساس سب سے پہلے اُس شخص کو ہوتا ہے جو اُردو میں کوئی علمی مضمون یا ادبی مضمون علمی اصول سے لکھنے بیٹھتا ہے۔ بیشتر موقعوں پر اصطلاحات معین نہ ہونے سے اُسکا ایک لفظی خلفشار میں مبتلا ہوجانا ناگزیر ہے۔ عموماً اس مشکل کے حل کے دو طریقے ہوتے ہیں۔

(۱) اکثر تو یہ دیکھا گیا ہے کہ وہی غیر ذمہ دارانہ روش جسکا ذکر اوپر آچکا ہے وہ بھی اختیار کرنے پر

مجبور ہو جاتا ہے اور اس طرح ہماری زبان میں وہ اضافہ جو مختلف اصطلاحات کی صورت میں ہونے والا تھا اور جسکی اس ارتقائی دور میں سخت ضرورت ہے اُسکی تصنیف کے ذریعے نہیں ہو سکتا۔

(۳) لیکن جب کبھی اس قسم کا کوئی بڑا کام آپڑتا ہے تو یہ تدبیر کارگر نہیں ہوتی اور مصنف کو مقبول عوام طرز چھوڑ کر اپنی "لفظ تراشی" کی قابلیت پر اعتماد کرنا ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آج کل جو کتابیں علمی موضوعوں پر لکھی جاتی ہیں اُن کے آخر میں اصطلاحات کی ایک فرہنگ شامل ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس زمانے میں علمبرداران علم و روشنی اہل مغرب ہیں اور ہمارے ماخذ انگریزی اس لئے اس فرہنگ میں ہر لفظ کے سامنے اُس کا انگریزی مرادف لکھدیا جاتا ہے تاکہ نئے وضع کئے ہوئے لفظ کا اصلی مفہوم سمجھنے میں پڑھنے والے کا ذہن بھٹکتا نہ پھرے۔

اس میں شک نہیں کہ اس طریقے کو رواج دینے والی جماعت اب تک اُردو کی مختلف حیثیتوں سے بہت کچھ خدمت کر چکی ہے اور اُسکا احسانمند نہ ہونا ادبی اور اخلاقی ناسپاسی ہوگی لیکن جہاں تک اس خاص طریقے کا تعلق ہے مجھے کئی وجہوں سے اختلاف کی جرأت ہوتی ہے پہلی وجہ جس پر ہر شخص کی نظر فوراً جاتی ہے یہ ہے کہ کتاب پڑھتے وقت پڑھنے والے کو ہر نئے لفظ کے سمجھنے کے لئے بار بار فرہنگ الٹنی پڑتی ہے جس سے وہ پرسکون فضا اور یکسوئی جو سنجیدہ مطالعے کے لئے ضروری ہے قائم نہیں رہتی۔ برعکس اسکے پریشانی دماغ کا اچھا خاصا سامان ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح بہت سا قیمتی وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس طریقے کی حمایت میں کوئی ذی عقل شخص پڑھنے والے سے اسکی اُمید نہیں کر سکتا کہ ان تکلیفوں سے بچنے کے لئے وہ اصل کتاب شروع کرنے سے قبل فرہنگ کو حفظ کر لیگا۔

ممکن ہے یہ اعتراض اُس صورت میں باقی نہ رہے کہ بجائے آخر میں فرہنگ شامل کرنے کے ہر صفحے کے نئے الفاظ حاشیے پر نیچے لکھدیئے جائیں لیکن مذکورہ بالا نقص محض خارجی حیثیت رکھتے ہیں اور اسکا دفعیہ اس اعتراض کو نہیں مٹا سکتا جو اس طریقے کے داخلی پہلو پر عائد ہوتا ہے۔ یہ الفاظ کی ٹکسالی قیمت سے متعلق ہے۔ انجمن ترقی اُردو یا دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ارکان کی قابلیت جانچنا یا اُنکے کارناموں پر فرداً فرداً تنقید کرنا میری بحث سے خارج ہے۔ مجھے صرف اصولی بنا پر اس طریقے سے مخالفت ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ایک شخص کا فیصلہ بہت سے

لوگوں کے فیصلے کی نسبت زیادہ صائب نہیں ہوسکتا - اور وضع اصطلاحات کا کام ایسا نہیں
جو ایک شخص یا چند اشخاص قابل اطمینان طور پر انجام دے سکیں خواہ وہ آکسفورڈ اور کیمبرج سے
کتنی ہی سندیں لیکر نکلے ہوں - میرے خیال میں ہر نئی اصطلاح پر اُردو بولنے والی دنیا کے سر آوردہ
اہل زبان کی مُہر تصدیق ثبت ہونا چاہیئے - الفاظ کے داخل یا خارج کرنے میں مطلق العنانی سے
کام نہیں لیا جاسکتا - اسکے لئے ضروری ہے کہ مسلّمہ زباندانوں کے ایک طبقے سے استصواب کیا
جائے - کیونکہ بغیر اسکے نہ صحت الفاظ کا پورا یقین ہوسکتا ہے اور نہ انکا دائرہ اثر وسیع - ہمارے ملک
میں اب بھی ایسے افاضل و اکابر موجود ہیں جنھیں طنزاً "لکھنوی" یا "دہلوی" کہا جاتا ہے - جو
"لکیر کے فقیر" یا "دقیانوسی خیال کے لوگ" سمجھے جاتے ہیں - اور جن کو اس قسم کے مشورے میں
شریک کرنا علوم جدیدہ کی توہین کرنا ہے - اگر تعصب کی عینک اُتار کر رکھدی جائے تو اسی گروہ میں
وہ حضرات ملیں گے جو علم اللسان کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ زمانۂ حال کی رو سے کافی متاثر ہوچکے
ہیں جنھوں نے انگریزی زبان اور جدید علوم میں بھی تھوڑی بہت مہارت پیدا کرلی ہے اور جو ہماری
سرگرمیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں لیکن یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ انکی قابلیت سے مستفید ہونا کفر
سمجھا جاتا ہے -

میرے نزدیک بہترین اصول یہ ہوگا کہ اصطلاحات وضع کرنے والے حضرات موضوعہ الفاظ
اور انگریزی مترادفات کی فہرست اُردو کے کسی ممتاز رسالے میں شائع کراکے پہلے اہل زبان کی
رائے طلب کیا کریں - اس موقعہ پر ان مستند ادیبوں اور فاضلوں کا فرض ہوگا کہ اپنے مفید مشورے
سے دریغ نہ کریں - یہ لوگ اختلاف کی صورت میں اُسکے وجوہ لکھیں گے اور ناپسندیدہ الفاظ کا
بدل تجویز کرینگے - اس طرح استفسار کرنے والے کے سامنے بہت سے نئے الفاظ آجائیں گے جن میں سے
اُسے انتخاب کا اچھا موقع ملیگا - وہ سب سے زیادہ موزوں الفاظ چن لیگا - پھر اُس کا یہ فرض ہونا چاہیئے
کہ اپنے فیصلہ کو خواہ انجمن ترقی اُردو کے شعبۂ متعلقہ یا اس نوعیت کے کسی اور بورڈ کے سامنے
پیش کردے - اُن لوگوں کے نزدیک اگر کوئی لفظ نامناسب یا غلط ہو تو اُس پر واضع اصطلاح سے
زبانی یا بذریعہ خط و کتابت بحث کرلیں اور اُسکے مطابق ضروری ردّ و بدل کردی جائے - اس کانٹ
چھانٹ اور چھان بین کے بعد جو اصطلاح آخری بار مقرر ہو اُس سے اُنھیں رسائل کے ذریعے

پبلک کو روشناس کر دینا چاہیئے۔ تاکہ لوگ اُس کا استعمال آزادی کے ساتھ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اسکے بعد پھر فرہنگ کی حاجت باقی نہ رہیگی۔

اس میں کئی فائدے ہیں۔ مثلاً ذمہ داری تمام تر ایک ہی شخص کے سر نہ ہوگی، غلطی کا احتمال کم ہوگا، اور سب سے بڑا فائدہ جو ہمارا مقصود اصلی ہے یہ ہوگا کہ اکثر علما، کی تائید حاصل ہونے کی وجہ سے، زیادہ صحیح ہونے کی وجہ سے اور "عام سلامتی طبع" سے قریب تر ہونے کے باعث ان الفاظ کو عام مقبولیت حاصل ہو جائیگی، اور لوگوں کی زبانوں پر وہ حکومت کرنے لگیں گے ہماری زبان کی رفتار ترقی حال سے کہیں زیادہ تیز ہو جائیگی، اور عجب نہیں کہ اس طرح بہت جلد وہ رکاوٹیں جو اُردو کے علمی زبان بننے کے راستے میں حائل ہیں دُور ہو جائیں۔

یہاں ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں بڑی طوالت اور جھنجھٹ ہے۔ بیشک یہ طریقہ صبر آزما ہے اور اس میں وقت زیادہ لگے گا لیکن کام کی اہمیت دیکھتے ہوے اور فوائد کو ملحوظ رکھتے ہوے یہ اعتراض کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اس تجویز کو کامیاب بنانے کے لئے مدیر رسالہ کے تعاون کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ وسیلہ ہوگا اظہار آرا، کا اور ذریعہ ہوگا افراد متعلقہ کے درمیان رشتۂ اتحاد قائم کرنے کا۔

میں اپنی تجویز کی عملی اعانت کے سلسلے میں یہاں مثال کے طور پر چند الفاظ جو ایک حد تک ہم معنی کہے جا سکتے ہیں لکھتا ہوں۔ اُردو میں افسانے سے متعلق بہت سے لفظ ہیں۔ مثلاً قصہ، کہانی، داستان، سرگزشت وغیرہ جنھیں درحقیقت افسانے کی مختلف قسموں کے لئے مقرر ہو جانا چاہیئے لیکن اُن کے استعمال میں بہت کم امتیاز کیا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگریزی الفاظ فکشن (Fiction)، فیبل (Fable)، اسٹوری (Story)، وغیرہ کے مقابل ہیں۔ ہم کو کوئی مخصوص اور معینہ لفظ اُردو میں نہیں ملتے۔ میں نے اس طرح کے قریب قریب سب الفاظ یکجا کر دیئے ہیں اور ان کے مفہوم کے تعین و تحدید کے لئے پہلے انگریزی لفظ اور اسی کے سامنے اُس کا اُردو مرادف جو میرے ذہن میں سب سے زیادہ موزوں ہو سکتا تھا درج کر دیا ہے۔ امید ہے کہ ملک کے فاضل ادیب ان پر غور کریں گے اور اس طرح

مجوزہ کام کو شروع کرکے اپنی زبان کی خدمت کا فخر حاصل کرینگے۔

(۱) افسانہ	(1) *Fiction*
(۲) اساطیر	(2) *Mythology*
(۳) حکایت	(3) *Fable*
(۴) روایتی قصّہ	(4) *Legend*
(۵) کہانی	(5) *Tale*
(۶) قصّہ	(6) *Story*
(۷) داستان	(7) *Romance*
(۸) ناول	(8) *Novel*
(۹) مختصر افسانہ	(9) *Short-story*

غزل حضرت کوکب شاہجہانپوری

اہلِ ہوس کی تنگیٔ دلہا و من میں تھی　　دُنیا فریب لذتِ کام و دہن میں تھی

گلچیں کا خوف اور نہ اندیشۂ خزاں　　یعنی نمودِ فطرتِ اہلِ چمن میں تھی

برباد کر دیا دلِ آوارہ گرد نے　　ورنہ نشاطِ روح تو اُس انجمن میں تھی

ظاہر پرست اہلِ خرد کچھ کہیں مگر　　معراج مستِ عشق تو دارو رسن میں تھی

اب تاک بھی ہیں تارِ رگِ جاں کی جنبشیں　　کیا بات لحنِ شاہدِ شیریں سخن میں تھی

کس طرح برقرار رہیگا جو نہ رہی　　وہ بات اب کہاں جو دلِ پرمحن میں تھی

گو حاصلِ کشاکشِ باہم تھا آئینہ　　کیا کیجئے کہ لذت دلہا و من میں تھی

محرومیوں میں اپنی نظر کا قصور تھا　　ورنہ نمودِ حُسن تو ہر پیرہن میں تھی

کوکب تمام عمر کٹی اضطراب میں
آشفتگی وہ عرصۂ دار المحن میں تھی

صیغۂ تعلیم کی بے پروائی

(گزشتہ سے پیوستہ)

(مولانا سید سبط الحسن صاحب فاضل ادب سابق لکچرار کرسچین کالج الہ آباد)

اساس[1] اُردو کی غلطیاں

(۱) صفحہ ۷ میں فعل سے اسمائے کیفیت (حاصل مصدر) بنانے کے طریقوں میں لکھا ہے۔

(۲) امر کے دوسرے حرف کے بعد الف یا ی بڑھاکر جیسے چال، ٹال، میل۔

تنقید۔ امر کے دوسرے حرف کے بعد الف یا ی اگر بڑھائینگے تو مثالوں میں چلا، ٹلا، ملی ہوگا۔ ان میں سے کوئی اسم کیفیت (حاصل مصدر) نہیں ہے۔ قاعدہ کچھ اور بتایا ہے۔ مثال کچھ اور دی ہے۔

(۲) اسی صفحہ میں اور اسی سلسلے میں اسم سے اسمائے کیفیت (حاصل مصدر) بنانے کے قاعدے میں ہے۔

(۳) اسم پر پن، ی، پا، پنا بڑھاکر جیسے لڑکپن، دوستی، دشمنی، بچپن، دیوانہ پن بچپنا، گنوارپنا، چھٹپنا۔ بڑھاپا۔ مٹاپا۔

تنقید۔ لڑک اور بچ کوئی اسم نہیں ہے جس پر پن بڑھاکر لڑکپن اور بچپن کیا گیا۔ یا پنا بڑھاکر بچپنا کیا گیا اور نہ چھٹ، بڑھا، مٹا کوئی اسم ہیں جس پر پنا بڑھاکر چھٹپنا یا پا بڑھاکر بڑھاپا یا مٹاپا کیا گیا۔

---

[1] یہ کتاب منشی کے امتحان میں بھی داخل ہے اور ہائی اسکول اگزامنیشن میں بھی ۱۲

(۳) صفحہ ۲۰ میں اسم آلہ کے بیان میں اسم سے اسم آلہ بنانے کا طریقہ بیان کیا ہے۔

(۲) اسم سے الف۔ نون۔ یل۔ کے اضافہ سے جیسے ہتوڑا۔ دنون۔ نکیل۔

تنقید۔ ہتوڑ۔ دنو۔ نک۔ کوئی اسم نہیں ہیں۔ جن پر الف۔ ن۔ یل۔ اضافہ ہو کر ہتوڑا۔ دنون۔ نکیل۔ اسم آلہ بنے۔ اصل میں اسم میں کچھ تغیر کر کے اور یہ علامات بڑھا کر اسم آلہ بناتے ہیں۔

(۴) صفحہ ۲۲ میں ہے۔

فائدہ۔ پیشہ وروں کے نام بھی اسم فاعل کہلاتے ہیں۔ جیسے نائی۔ درزی۔ بڑھئی۔ جولاہا۔ کنجڑا۔ کمہار۔ لوہار۔ دھوبی۔

تنقید۔ اسم فاعل مشتق ہوتا ہے اور یہ اسما کسی سے مشتق نہیں ہیں۔ لوہار اور دھوبی میں تو خیر کچھ اشتقاق کی صورت ہو سکتی ہے لیکن نائی۔ درزی وغیرہ مشتق نہیں ہیں۔ عربی میں پیشہ وروں کے نام بیشک اسم فاعل ہیں۔ کیونکہ سب مشتق ہیں اور صیغۂ مبالغہ کے وزن پر ہیں۔ جیسے خیاط۔ حجام۔ صباغ وغیرہ۔ اسی سے عربی میں اسم فاعل کہلاتے ہیں لیکن اردو میں اسم فاعل نہیں ہیں۔

(۵) صفحہ ۲۴ میں اسم مفعول کے بنانے کا یہ طریقہ لکھا ہے کہ ماضی مطلق کے صیغۂ واحد مذکر کے آخر میں ہوا۔ ہوے۔ ہوئی۔ ہوئیں۔ لگانے سے بنتا ہے۔ جیسے لکھا ہوا۔ لکھے ہوے لکھی ہوئی۔ لکھی ہوئیں۔

تنقید۔ لکھے۔ لکھی۔ واحد مذکر کا صیغہ نہیں ہیں۔ ماضی کے صیغہ واحد مذکر پر ہوے۔ ہوئی۔ ہوئیں۔ لگانے سے اسم مفعول کے صیغے کیسے بنیں گے۔ وہ تو یوں ہونگے۔ لکھا ہوے۔ لکھا ہوئی۔ لکھا ہوئیں۔ جو بالکل مہمل ہیں۔ قاعدہ کچھ بیان کیا ہے مثال کچھ دی ہے۔

(۶) پھر صفحہ ۲۴ میں ہے

فائدہ۔ اسم مفعول اکثر فعل متعدی سے آتا ہے کبھی فعل لازم سے بھی آ جاتا ہے۔ جیسے آیا ہوا۔ گیا ہوا۔ اُٹھا ہوا۔ بیٹھا ہوا۔

تنقید۔ اسم مفعول فعل لازم سے آ ہی نہیں سکتا۔ ورنہ فعل لازم کی تعریف غلط ہو جائیگی۔ کیونکہ فعل لازم وہی ہے جو صرف فاعل کو چاہے جو مثالیں دی ہیں وہ کسی حالت میں اسم مفعول

نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ آیا ہوا یا تو اسم فاعل کے معنی دیگا۔ جیسے آئے ہوے نے کھانا کھایا۔ یعنی آنے والے نے۔ یا ہوا زائد ہوکر ماضی ہوگا۔ جیسے وہ آیا ہوا ہے۔ کیا ہوا لازم نہیں ہے اور اگر یہ گیا ہوا ہے تو اسکی حالت بھی آیا ہوا کی سی ہے۔ اُٹھا ہوا۔ بیٹھا ہوا اسم حالیہ ہیں۔ مصنف نے نقل کرنے میں غلط صحیح نہیں دیکھا۔ چونکہ مصباح القواعد میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی لہذا وہی نقل کردی۔

(۷) صفحہ ۲۵ میں اسم حالیہ کے بنانے کا یہ طریقہ بتایا ہے کہ مصدر کی علامت نا نکال کر ہوا۔ ہوے۔ ہوئی۔ ہوئیں۔ یا تا۔ تے۔ تی تیں۔ یا تا ہوا۔ تے ہوے۔ تی ہوئی تیں ہوئیں زیادہ کر دیتے ہیں۔ اور ہوا۔ ہوے وغیرہ کی مثال میں مرا ہوا۔ مرے ہوے۔ مری ہوئی۔ مری ہوئیں لائے ہیں۔

تنقید۔ مصدر کی علامت نا نکال کر ہوا وغیرہ لگانے سے جو الفاظ بنتے ہیں وہ مہمل ہوتے ہیں۔ اسم حالیہ نہیں ہوتے۔ مثلاً مرہوا۔ مرہوے۔ مرہوئی۔ مرہوئیں۔ سب مہمل ہیں۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ تیں ہوئیں کسی صیغہ میں نہیں لگتا۔ بلکہ جمع مؤنث میں بھی تی ہوئیں لگتا ہے جب کہ خود مثال وہی ہے یعنی کھیلتی ہوئی۔ کھیلتی ہوئیں۔

(۸) صفحہ ۲۵ میں ہے۔ **فائدہ**۔ ہوا۔ ہوے۔ وغیرہ نکالنے سے حالیہ تام بنتا ہے اور تا یا ہوا سے حالیہ ناتام۔

تنقید۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس میں سے ہوا یا تا یا تا ہوا وغیرہ نکالنے سے اسم حالیہ تام یا ناتام بنتا ہے۔ یہ مسئلہ بالکل مہمل ہے۔

(۹) بے جان کی تذکیر و تانیث لکھتے ہوے صفحہ ۴۳ میں لکھتے ہیں۔

۴۔ عربی الفاظ کی جمع جب قواعد کی رو سے آئے تو جمع ہر حالت میں لکھنو والوں کے نزدیک مذکر ہوگی چاہے واحد مذکر ہو یا مونث۔ جیسے شئے۔ کیفیت۔ دلیل مؤنث ہیں۔ ان کی جمع اشیا۔ کیفیات۔ دلائل۔ مذکر ہیں۔ جیسے کیفیات سُنے گئے۔ دلائل قائم کئے گئے۔ اشیا خریدے گئے۔ مگر معرفت۔ حقیقت۔ مودت۔ شفقت۔ مونث ہیں۔ انکی جمع معارف۔ حقائق قوی۔ اشفاق۔ مذکر ہیں یہ اس قاعدے سے مستثنے ہیں۔

تنقید۔ اوّل تو شے کی جمع اشیا مذکر نہیں ہے اور نہ کوئی شخص یہ بولتا ہے کہ اشیار خریدے گئے۔ دوسرے مگر سے جو استثنا کیا گیا ہے یہ بالکل مہمل ہے۔ اس لئے کہ جو الفاظ مستثنےٰ کئے گئے ہیں وہ مستثنےٰ نہیں ہیں بلکہ اُس قاعدے کے اندر ہیں۔

(۱۰) صفحہ ۳۵ میں ہے۔ ستاروں۔ سیاروں کے نام مذکر ہیں۔

تنقید۔ زہرہ۔ مشتری۔ برجیس۔ ناہید۔ مؤنث ہیں۔

(۱۱) صفحہ ۳۵ میں ہے۔ گنجفہ کی بازیوں کے نام۔ شراب کے نام سوائے بادہ کے مذکر ہیں۔

تنقید۔ غلط مسائل لکھنے میں مؤلف بہت جسور ہے۔ گنجفہ کی آٹھوں بازیوں کے نام مؤنث ہیں۔ اور شراب کے بھی سب نام مؤنث ہیں سوائے بادہ کے فارسی میں اور پھول کے اُردو میں کہ یہ دونوں مذکر ہیں۔

(۱۲) صفحہ ۳۶ قاعدہ ۲۰ میں۔ عربی مصادر جو مذکر ہیں وہ لکھے ہیں۔ اُسمیں توحید بھی ہے۔

تنقید۔ توحید مؤنث ہے۔

(۱۳) بے جان کی تذکیر و تانیث لکھتے ہوئے صفحہ ۳۲ میں لکھتے ہیں۔

۱۔ جن لفظوں کے آخر میں الف۔ یا ہ ہے۔ وہ اکثر مذکر ہونگے۔ اسکے مستثنیات میں لکھتے ہیں۔ عربی سہ حرفی الفاظ جن کے آخر میں الف ہو جیسے آدا۔ قضا۔ خطا۔ مؤنث ہیں۔

تنقید۔ یہ استثنا بطور کلیہ کے نہ ہونا چاہیے۔ ایسے بہت سے الفاظ مذکر ہیں۔ سُہا[1]۔ غنا۔ ربا۔ عصا۔ طلا۔ سما۔ وغیرہ۔

(۱۴) صفحہ ۴۱ میں ہے۔ ۹۔ جس لفظ کے آخر میں۔ وس۔ کار۔ س۔ ن۔ نی۔ ہو وہ مؤنث ہے۔

تنقید۔ لباس۔ قیاس۔ قرطاس۔ وسواس۔ نفس۔ جرس۔ ناقوس۔ جلوس آبنوس۔ مکان۔ احسان۔ ایمان۔ خون۔ شگون۔ جنون۔ کھن۔ سالن۔ آنگن سیکڑوں الفاظ ہیں۔ جن کے آخر میں سین یا نون ہے وہ مذکر ہیں۔ شکار بھی مذکر ہے

(۱۵) صفحہ ۴۷ میں ہے۔ اردو کی جمع کی چھ علامتیں ہیں۔ یائے مجہول۔ واو مجہول

---

[1] نام ستارہ۔ ۱۲ سہو

وَن - وُں - آن - ین -

تنقید - چھ نہیں سات علامتیں ہیں - ایک یائے مجہول معہ ہمزہ و نون غنہ (ئین) بھی ہے - چنانچہ اسی قواعد میں اکثر الفاظ کی جمع اِس علامت سے بنائی گئی ہے - ادائیں - جفائیں - مائیں - وغیرہ -

(۱۶) صفحہ ۵۰ میں - جمع بنانے کے عام قاعدے میں لکھا ہے کہ حرف مغیرہ کے آنے سے جمع واو مجہول اور نون غنہ سے بنتی ہے لیکن اگر اسم کے آخر الف یا ہ ہو تو حذف ہو جاتی ہے اس میں استثنا کیا گیا ہے کہ بعض اسم ایسے ہیں کہ ان میں الف یا ہ حذف نہیں ہوتی - اور وَن سے پہلے ایک ہمزہ زیادہ کر کے جمع بناتے ہیں - جیسے راجاؤں - دریاؤں وغیرہ -

تنقید - یہ مسئلہ صحیح نہیں ہے ہ ہمیشہ حذف ہو جاتی ہے خواہ بالکل حذف ہو جائے - خواہ حذف ہو کر الف سے بدل جائے - ایسی کوئی مثال نہیں دی کہ جسمیں ہ ہو اور وہ حذف نہ ہوئی ہو - اگر راجا کے آخر میں ہ تصور کی جائے اُس وقت بھی مثال میں حذف ہو گئی ہے -

(۱۷) صفحہ ۵۱ میں مذکر کی جمع کے قاعدوں میں ہے -

ا - جس اسم کے آخر میں الف یا ہ حالت فاعلیت میں آئے اُسکو یائے مجہول سے بدل کر بناتے ہیں - جیسے تماشا - تماشے الی آخرہ - اسکے بعد چند مستثنیات لکھے ہیں - پھر لکھتے ہیں اور حالت مفعولیت میں یا جب حرف مغیرہ میں سے کوئی حرف اُسکے بعد آئے تو ہ یا الف کو حذف کر کے وَن سے جمع بناتے ہیں جیسے گھوڑوں کو - پردوں کو - نسخوں کو - شہروں میں - مُردوں کے ساتھ - بچوں نے -

تنقید - پہلی غلطی تو یہ ہے کہ حالت فاعلیت کی تخصیص نہیں ہے - حالت مفعولیت میں بھی پہلا قاعدہ جاری ہے مثلاً زید نے گھوڑے بیچے - لڑکے بلائے گئے وغیرہ - دوسری غلطی یہ ہے کہ حالت مفعولیت میں بغیر حرف مغیرہ آئے وَن سے جمع نہیں بنتی - جو مثالیں اس ٹکڑے میں دی گئی ہیں وہ سب حرف مغیرہ کے ساتھ ہیں - اور عبارت یہ ہے کہ حالت مفعولیت میں یا جب حرف مغیرہ آئے حالانکہ حالت مفعولیت میں بغیر حرف مغیرہ کے ے کے ساتھ جمع آتی ہے نہ کہ وَن کے ساتھ جیسا کہ مثال دے دی گئی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو جمع کا عام قاعدہ

جو مصنف نے صفحہ ۵۰ میں بیان کیا ہے وہ غلط ہو جاتا۔ تیسری غلطی یہ ہے کہ شہر کی جو مثال دی گئی ہے یہ اس قاعدے کے اندر نہیں ہے۔ کیونکہ اسکے آخر میں نہ الف ہے نہ ہ۔

(۱۸) اسی سلسلے میں صفحہ ۵۲ میں ہے۔

۳۔ آخر میں عین ہو تو جمع کی صورت میں صرف عین سے پہلے زبر دیتے ہیں۔ جیسے مطلع۔ مصرع۔ مرقع۔ مطبع۔ حالت مفعولیت میں یا جب حروف مغیرہ میں سے کوئی حرف اسکے بعد آئے تو عین کو برقرار رکھکر اُسکی جمع وں سے لاتے ہیں جیسے مصرعوں کو مطلعوں کو۔

تنقید۔ حالت مفعولیت کی جو مثالیں دی گئی ہیں وہ سب حرف مغیرہ کے ساتھ ہیں۔ کیونکہ کو بھی حرف مغیرہ ہے اور خود مصنف نے بھی صفحہ ۲۹ میں اس کو حرف مغیرہ لکھا ہے۔ یہ مسئلہ بھی صحیح نہیں ہے۔ حالت مفعولیت میں بھی بغیر حرف مغیرہ کے جمع میں یا کسرہ دینگے یا ے اضافہ کر دینگے۔ جیسے مطلعے پڑھے گئے۔ مصرعے لگائے گئے۔ دیکھیے مثالوں میں گو مطلع اور مصرع حالت مفعولیت میں ہیں لیکن جمع میں وں نہیں اضافہ ہوا۔ مصنف کو یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ جمع کے عام قاعدے میں کیا لکھ آئے ہیں اور اب اسکے خلاف کیا لکھ رہے ہیں۔

(۱۹) اسی صفحہ میں اسکے بعد بھی جو مسئلہ بیان کر کے آخر میں یہ لکھا ہے:۔

"مگر حالت مفعولیت میں وہی نون زیادہ کر دیتے ہیں۔" یہ بھی غلط ہے جب کہ اوپر کے مسئلے میں بیان کیا گیا کہ بغیر حرف مغیرہ آئے اسم خواہ حالت فاعلیت میں ہو خواہ حالت مفعولیت میں وں سے اسکی جمع نہیں بنتی۔

(۲۰) مؤنث کی جمع بنانے کے قاعدے میں صفحہ ۵۳ میں لکھتے ہیں۔

۳۔ جن کے آخر میں یا ہو تو اُس میں صرف نون بڑھا کر جمع بناتے ہیں اور اسکے استثنا میں لکھتے ہیں "کہ غیر زبانوں کے الفاظ جن کے آخر میں یا ہے۔ اسکی جمع اس قاعدے سے نہیں بنتی۔ بلکہ وں یا ئیں سے بنتی ہے جیسے دریا۔ حیا۔ سے دریاؤں۔ حیاؤں۔ حیائیں۔

تنقید۔ دریا مؤنث نہیں ہے بلکہ مذکر ہے اور یہ قاعدہ جمع مؤنث کے بنانے کا بتایا گیا ہے۔

(۲۱) پھر اسی سلسلے میں اسی صفحہ میں ہے۔

۳۔ اگر آخر میں واو یا الف یا ہ یا نون غنہ ہو۔ اور اسکے پہلے الف یا واو ہو تو ہمزہ

اور یائے مجہول اور نون غنہ زیادہ کرینگے جیسے خوشبوئیں۔ جوروئیں۔ جوئیں۔ صدائیں۔ بلائیں۔ ادائیں۔ جفائیں۔ فاحشائیں۔

تنقید۔ جتنی مثالیں دی گئی ہیں باستثنا رجوں کے اور کسی لفظ میں حرف آخر کے پہلے نہ الف ہے نہ واو۔ مصنف قاعدہ کچھ بیان کرتا ہے اور مثالیں کچھ دیتا ہے۔ اصل میں یہ دو مسئلے تھے جو ایک میں ملانے سے بالکل غلط ہوگئے۔

۱۔ اگر اسم مونث کے آخر میں واو یا الف یا ہ ہو تو اُس کی جمع ہمزہ معہ یائے مجہول و نون غنہ یعنی (ئیں) کے بڑھانے سے بنتی ہے لیکن ہ الف سے بدل جاتی ہے جیسے خوشبوئیں۔ صدائیں۔ فاحشائیں۔

۲۔ اگر آخر میں نون غنہ ہو اور اُسکے پہلے الف یا واو ہو تو اُس کی جمع بھی (ئیں) بڑھانے سے بنتی ہے لیکن نون غنہ اصل لفظ کا حذف ہوجاتا ہے جیسے ماں سے مائیں۔ جوں سے جوئیں۔

(۲۲) مؤنث کی جمع کے قاعدے صفحہ ۲۵ سے صفحہ ۲۶ تک بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے قاعدہ نمبر ۲ تا ۵ کو مونث کی جمع سے کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ ان قاعدوں کی مثالوں میں بھی اکثر الفاظ ایسے ہیں جو مذکر ہیں۔

(۲۳) صفت ذاتی کے بیان میں صفحہ ۱۶ میں ہے۔

تنبیہ۔ بے فارسی اور غیر عربی علامت ہے۔ فارسی علامت فارسی لفظ پر اور عربی علامت عربی لفظ پر لگاتے ہیں۔ ہندی لفظ پر نہیں لگاتے۔

تنقید جس قاعدے کے نیچے یہ تنبیہ لکھی ہے اُسی کی مثالوں میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ بے دھڑک۔ بے سرا۔ بے جوڑ۔ کیا دھڑک۔ سرا۔ جوڑ ہندی لفظ نہیں ہیں۔

(۲۴) صفحہ ۲۰ میں صفت ذاتی کے بیان میں ہے۔

۳۔ کبھی فارسی علامت عربی الفاظ پر لگا کر جیسے سعادت مند۔ سمجھ دار۔ لوچ دار۔

تنقید۔ مصنف کے نزدیک سمجھ۔ لوچ۔ عربی الفاظ ہیں جو فارسی لفظ دار پر لگائے گئے ہیں۔

(۲۵) ضمیر اشارہ کے بیان میں صفحہ ۲۸ میں ہے۔

فائدہ۔ ضمیر اشارہ جب آنکھ کے سامنے ہو تو حذف کر دیتے ہیں اور کبھی محذوف نہیں

ہوتی مگر ہاں جب ایک بار ذکر کردی گئی تو کلام میں بار بار نہیں لاتے۔

تنقید۔ ضمیر اشارہ کبھی محذوف نہیں ہوتی۔ مشارٌ الیہ جب سامنے ہوتا ہے تو محذوف ہوجاتا ہے۔ مثلاً بہت سے کپڑے سامنے رکھے ہوں تو کہیں گے کہ یہ اچھا نہیں یہ اچھا ہے۔ اس میں جو کپڑا مشارٌ الیہ ہے وہ محذوف ہوا۔ اور یہ ضمیر اشارہ محذوف نہ ہوئی۔

(۲۶) پھر اسی صفحہ میں ہے۔ فائدہ۔ مشارٌ الیہ کبھی مقدم بھی ہوتا ہے۔ جیسے

صبر و سکوں سے ہمکو یہ بھی نہیں میسر ہووے　　تھوڑی سی رہ گئی ہے لے کاہش نہانی

تنقید۔ مثال غلط ہے۔ اس مثال میں یہ ضمیر اشارہ مقدم ہے اور عمر جو محذوف ہے وہ مشارٌ الیہ موخر ہے۔

اسی طرح سے چھیانوے مسائل اور مثالیں غلط ہیں جن کے نوٹ میرے پاس موجود ہیں بخیال طوالت نہیں لکھے گئے۔ لیکن اس پر حصر نہیں ہوسکتا کہ اسی قدر مسائل غلط ہیں۔ ممکن ہے کہ میری نظر نہ پڑی ہو۔ کیونکہ الٹ پلٹ کر سرسری طور پر کتاب دیکھی گئی ہے۔ بالاستیعاب نہیں دیکھی گئی۔

قواعد اردو جمال الدین حصہ سوم کی غلطیاں

(۱) کتاب بھر میں جمع غائب کے صیغوں میں وے کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ وے بیٹھے ہیں۔ وے بیٹھے تھے وغیرہ (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۹ سے صفحہ ۱۸۲ تک کی گردانیں) حالانکہ وے اردو میں بالکل مستعمل نہیں ہے۔ جمع غائب کے صیغوں میں بھی وہ مستعمل ہے۔ بجائے اسکے کہ قواعد سے بچوں کی زبان درست کی جائے اور خراب کی گئی ہے۔

(۲) جمع متکلم کے صیغوں میں تذکیر و تانیث کا کوئی فرق نہیں ہوتا اور بالاتفاق لکھنؤ اور دہلی کے فصحا کی زبانوں پر یکساں جاری ہیں یعنی مرد بھی کہتے ہیں کہ "ہم آتے تھے ہم بیٹھے تھے۔ ہم دیکھتے تھے" اور عورتیں بھی کہتی ہیں۔ لیکن اس قواعد میں جمع مؤنث متکلم کے صیغے سب خلاف محاورہ لکھے گئے ہیں یعنی ماضی مطلق میں ہم بیٹھیں۔ ماضی بعید میں ہم بیٹھی تھیں۔ ماضی احتمالی میں ہم بیٹھی ہونگی۔ ماضی استمراری میں ہم بیٹھتی تھیں۔ غرض تمام فعلوں میں غلط صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ جس سے لڑکوں کی زبان خراب ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہوں گردانیں صفحہ ۱۴۹ سے صفحہ ۱۸۲ تک)

(۳) صفحہ ۲۵ میں ہے - ضمیر استفہام جس سے سوال کیا جاتا ہے اُسکے لئے دو لفظ موضوع ہیں - کون اور کیا - پہلا جان دار کے لئے ہے - دوسرا بے جان کے لئے - جیسے کون آیا - کیا مانگتے ہو -

تنقید - اول تو صرف دو ہی لفظ ضمیر استفہام کے لئے موضوع نہیں ہیں بلکہ اور الفاظ بھی ہیں - کون سا - کاہے - کتنا - کَے - دوسرے یہ غلط ہے کہ کون جاندار کے لئے مخصوص ہے بلکہ کون محض آدمی کے لئے مخصوص ہے اور کون سا علاوہ آدمی کے ہر جاندار و غیر جاندار کے لئے آتا ہے - جیسے ان دو گلاسوں میں کون سا تمھیں پسند ہے - کون سا پیالہ ٹوٹا - کون سا گھوڑا لوگے - کیا محض غیر معمولی اشیا کے لئے مخصوص ہے -

(۴) صفحہ ۱۶ میں اسم مصغر بنانے کے قاعدے میں لکھا ہے - کبھی اسم کے آخر یا بڑھا کر جیسے ٹوا سے ٹیا - آنکھ سے انکھیا - ڈبا سے ڈبیا - باٹ سے بٹیا - ہاٹ سے ہٹیا -

تنقید - اسم کے آخر یا بڑھا کر اسم مصغر نہیں بناتے بلکہ اسم میں کچھ تغیر بھی کرتے ہیں - جیسا کہ مثالوں سے ظاہر ہے - لٹ - ڈب - بٹ - ہٹ - جن کے آگے یا بڑھا کر لٹیا - ڈبیا بٹیا - ہٹیا - بنایا گیا ہے کوئی اسم نہیں ہیں -

(۵) اسی اسم مصغر کے بیان میں صفحہ ۱۶ میں ہے - کبھی اسم کے آخر میں الفاظ ڑی - ڑی وا بڑھا کر جیسے پٹرا سے پٹڑی - پلنگ سے پلنگڑی - مرد سے مردوا -

تنقید - پہلی مثال میں لفظ ڑی نہیں بڑھایا گیا بلکہ الف ی سے بدل گیا ہے - اگر ڑی بڑھتا تو پٹراڑی ہوتا جو مہمل لفظ ہے -

(۶) اسی سلسلے میں صفحہ ۲۶ میں ہے - کبھی آخر میں یائے معروف بڑھا کر جیسے شیشہ سے شیشی - کونڈا سے کونڈی - ڈنڈا سے ڈنڈی - کڑا سے کڑی - پتیلا سے پتیلی - پیالہ سے پیالی -

تنقید - مثالوں سے ظاہر ہے کہ محض یائے معروف نہیں بڑھی بلکہ الف یا ہ دونوں حذف بھی ہو گئے ہیں -

(۷) صفحہ ۵۷ میں صفت نسبتی بنانے کے قاعدے میں ہے -

۲ - اگر اسم میں تیسرا حرف (ی) ہو تو وہ بھی گر جائیگی - جیسے مدینہ سے مدنی -

تنقید۔ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ نگینہ میں بھی آخر میں ہ ہے اور تیسرا حرف ی۔ لیکن ی نہیں گرتی اور صفت نسبتی نگینوی آتی ہے ایسے قاعدے بطور کلیہ نہیں بیان کئے جاتے بلکہ بعض وغیرہ کے الفاظ لگا دیئے جاتے ہیں یا استثنا کر دیا جاتا ہے۔

(۸) صفحہ ۸۴ میں ذی روح کے تذکیر و تانیث کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک حقیقی دوسرے غیر حقیقی۔ اور غیر حقیقی کی مثالوں میں قلم اور کتاب وغیرہ کی مثالیں دی گئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قلم اور کتاب بھی ذی روح ہے حالانکہ مؤنث و مذکر حقیقی محض ذی روح میں ہوتا ہو مذکر و مؤنث غیر حقیقی ذی روح کی قسم نہیں ہے بلکہ مذکر و مؤنث غیر حقیقی سے مراد بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث ہے،

(۹) صفحہ ۸۷ میں ہے جس اسم مذکر کے آخر میں الف ہوتا ہے اسکی تانیث کرنے میں ین بڑھاتے ہیں۔ جیسے بنیاین۔ کبتا سے کبتاین۔

تنقید۔ کبتا۔ شاعری یا شعر کے معنوں میں ہے۔ شاعر کے معنوں میں نہیں ہے جسکی تانیث کبتاین شاعرہ کے معنوں میں آئے۔ دوسرے سیکڑوں ایسے اسم ذی روح ہیں جنکے آخر میں الف ہے اور اسکی تانیث ین سے نہیں بنتی۔ مثلاً لڑکا۔ دادا۔ چچا۔ بکرا۔ گدھا وغیرہ۔

(۱۰) مؤنث و مذکر غیر حقیقی کے بیان میں صفحہ ۹۰ میں ہے۔

۲۔ جس اسم کے آخر میں یائے معروف ہوگی وہ مؤنث ہوگا۔ جیسے روٹی۔ ٹوپی۔ الیٰ آخرہ۔ باستثنائے گھی۔ دہی۔ موتی۔ جی۔ ہاتھی۔ پانی۔ کے کہ یہ الفاظ مذکر ہیں۔

تنقید۔ ہاتھی مذکر غیر حقیقی نہیں ہے بلکہ جاندار چیز ہے اس لئے مذکر حقیقی ہے۔

(۱۱) اسی بحث کے سلسلے میں صفحہ ۹۱ میں ہے۔ (۱۲) جس مصدر یا حاصل مصدر عربی کے آخر میں الف ہو وہ مؤنث ہوتا ہے۔ جیسے التجا۔ تمنا۔ استدعا۔ دعا۔ جفا وغیرہ۔ تماشا اس سے مستثنیٰ ہے۔

تنقید۔ یہ کلیہ بھی صحیح نہیں۔ علاوہ تماشا کے بہت سے مصادر عربی کے مذکر ہیں۔ مثلاً احیا۔ اخفا۔ اجرا۔ استقرا۔ استہزا۔ غنا وغیرہ۔

(۱۲) اسی سلسلے میں صفحہ ۹۱ میں ہے۔ جس لفظ کے آخر میں دراز (ت) ہو وہ مؤنث ہے۔ جیسے قدرت۔ نعمت۔ عزت۔ عنایت۔ شکایت وغیرہ۔

تنقید۔ سیکڑوں لفظ ایسے ہیں کہ جنکے آخر میں ت ہے اور وہ مذکر بولے جاتے ہیں۔ خلعت۔ رتبت۔ شربت۔ لغت۔ ثبوت۔ سکوت وغیرہ۔ ایسے مسائل بطور کلیہ لکھنا غلطی ہے۔

شاعری و مصوری

(جعفر مہدی صاحب آزم رودولوی)

تصویر اور شعر دو لفظ ہیں مگر مفہوم ایک ہی ہے۔ مابہ الامتیاز بعض نازک اور لطیف مواقع ہیں ورنہ کوئی ایسا فرق نہیں ہے۔

کچھ مناظر ایسے ہیں جن کو الفاظ چھو نہیں سکتے۔ مگر کچھ ایسے بھی مناظر ہیں جہاں مصور کی سحرکاریاں مفلوج نظر آتی ہیں۔ اسے شاعر ہی بیان کر سکتا ہے مصور اسکی مرقع کشی نہیں کر سکتا۔ شاعر سے میری مراد وہ فرد ہے جو کلام موزوں کے قالب میں ایسی روح پھونک دے کہ سننے والے کے سامنے تصویر کھنچ جائے مصور بھی یہی کرتا ہے۔ ایک نازک سا فرق ہے۔ مادہ تخلیق دونوں کا ایک ہے۔ خیال کے نمود کی روش یکساں ... طریقہ اظہار بدلا ہوا ہے لامحالہ جو خصوصیات جس صنعت کی ہونگی وہ اپنے حدود کے باہر نہیں مل سکینگی۔ چونکہ دونوں کا مرکز ایک ہی ہے۔ لہذا کوئی تعجب کی بات نہیں اگر کوئی شعر تصویر بھی ہو سکے اور کوئی تصویر شعر۔ سامنے کی بات ہے کہ شعر کو سنکر محظوظ ہو سکتے ہیں مگر تصویر نہیں سُنی جا سکتی، جب تک تصویر سامنے نہ آئے بحیثیت مجموعی مصور کے خیالات سے لطف اندوز ہونا معلوم۔ میرا مفہوم چند مثالوں سے واضح ہوگا۔ دیکھئے مصور فطرت قاآنی موسم بہار کی منظر کشی کر رہا ہے۔

• نرمک نرمک نسیم زیر گلاں می خزد   غبغب این می مکد عارض آں می مزد
سنبل این میکشد گردن آن می گزد   گہ بہ چمن می چمد گہ بہ سمن می وزد
گاہ بہ شاخ درخت گہ بہ لب جویبار

"نسیم کے نرم و خنک جھونکے پھولوں سے اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے آئے۔ اس پھول کی ٹھڈی چوس لی، اُس پھول کا منہ چوم لیا، اس سنبل کے بال کھینچ لئے، اسکی گردن کاٹی۔

کبھی چمن میں مستانہ وار آئے کبھی چنبیلی کے پاس جا پہونچے، کبھی شاخ درخت پر جھولے کبھی جوہی کے قریب آگئے"

مصور اگران خیالات کو آب و رنگ سے صفحۂ کاغذ پر ابھار بھی دے پھر بھی جو ترنم الفاظ سے برس رہا ہے کہاں سے لائیگا؟

دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ میر انیس مرحوم فرماتے ہیں۔

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آبِ دانہ بند ۔۔۔ دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند ۔۔۔ چمکارتے تھے حضرت عباسؑ ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

حضرت عباس علیہ السلام لڑتے ہوئے فرات پر پہونچے فوجیں بھاگ چکی ہیں۔ اس وقت آپ بیشۂ شجاعت ترابی کا تنہا مالک ہے۔ عربی النسل گھوڑا زیر ران ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب حسینؑ کے اطفال دو دن سے العطش العطش کر رہے تھے پانی کہاں کہ سواریوں کو پلایا جائے۔ گھوڑا بھی پیاسا ہے اور سوار بھی۔ پیاسے جانور کی فطرت پر نظر رہے۔ سامنے دریا لہراتا ہوا نظر آیا۔ گھوڑا ہنہنا کے دیکھنے لگا۔ پیاس کی شدت پانی کی قربت نے بے قابو کر دیا۔ اعضا میں تشنجی کیفیت پیدا ہو گئی بند بند کانپتا تھا اور سمٹتا تھا۔ سوار نے بے زبان کی یہ حالت دیکھی چمکارا۔ آبشار کے شور نے گھوڑے نے بیتابانہ سوار کی طرف گردن پھرا کر دیکھا یعنی (بے زبان اپنے مالک کے منشا کو دریافت کرنا چاہتا ہے) تیسرے مصرع میں شاعر جوڑ بند بھی کہہ سکتا تھا مگر تکرار نے جو مزہ دیا ہے اسے ذوق سلیم ہی محسوس کر سکتا ہے۔ ناظرین مجھے معذور سمجھیں اگر اشعار بالا کا مطلب مناسب الفاظ میں نہ بیان کر سکا، لیکن میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اس بند کی لطافت باقی رکھتے ہوئے کوئی شخص نثر میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔

ایک مقام پہ فرماتے ہیں "حضرت حُر میدان جنگ کو جا رہے ہیں منظر کشی ہے یا اعجاز۔ ملاحظہ ہو"

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے ۔۔۔ دست فولاد دبا جاتا تھا دستانوں سے
برچھیوں اڑ جاتا تھا دبکے نرس رانوں سے ۔۔۔ آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

چوتھا مصرع تو جذبات نگاری کے صفحہ پر سنہرے حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے۔ ہے کوئی مصور جو یہ منظر کھینچ سکے۔

ایک بند اور ملاحظہ ہو۔

بھرتا تھا دم سرد پریشاں کوئی ہو کے		دامن سے ہوا دیتا تھا منہ کو کوئی دھو کے
بچتا تھا کوئی لوں سے ردا چہرے پہ رو کے		رکھ لیتا تھا سر پہ کوئی رومال بھگو کے
پڑتی تھیں جو چھینٹیں تو مزا دیتا تھا پانی
جھک کر کوئی چلو ہی سے پی لیتا تھا پانی

حسینؑ سفر کر رہے ہیں گرمی کے دن ہیں۔ عربی قافلہ اس عالم میں جا رہا ہے راستہ کے مناظر کھینچتے ہوئے میر صاحب نے قیامت کی مصوری کی ہے ہر مصرع ایک خاص قسم کی کیفیت کا حامل و مظہر ہے۔ ایک ہی موسم کے مختلف اثرات اس خوبی سے بیان ہوگئے ہیں جیسے کوئی "آپ بیتی" کہتا ہے۔ پہلا مصرع، ایک بردبار اور متحمل ضابط شخص کو پیش آرہا ہے جو گرمی کے تاثرات صرف دم سرد کھینچ کر ٹال رہا ہے۔ دوسرا مصرع، ایک جوان شخص کی فطرت دکھاتا ہے جو گرمی کے دفعیہ کی متعدد صورتیں اختیار کرتا ہے۔ تیسرا مصرع، ایک جہاں دیدہ تجربہ کار طبیعت اور مزاج کا مظہر ہے۔ گرمی کے تاثرات جو وقتی ہیں اسے نظر انداز کر کے لوں کا اثر جو ایک موذی چیز ہے اس کا تحفظ مقدم سمجھتا ہے۔ چوتھا مصرع، نوجوان گرمی سے تنگ ہو کر رومال بھگو کر خنکی حاصل کرتا ہے۔ یہ ایک نوجوان ہی کرتا ہے۔ بیت کے دونوں مصرع میں "پانی کی چھینٹیں اور جھک کر چلو سے پانی کا ذکر کر کے کس قدر بدیع البیانی سے گرمی کی شدت اور طبیعتوں کی بے چینی کی تصویر کھینچی ہے۔ جو آرٹ اس میں پیش کیا گیا ہے وہ شاعر کی شیوا بیانی اور باریک بینی کا بیک وقت ناظر ہے۔ اقرار لے سکتا ہے مصور کے لئے اتنے مختلف مناظر بیک وقت پیش کرنا قریب قریب محال ہے۔

میر صاحب کے یہاں ایسے نادرات کیا نہیں ہیں جو مرثیہ اٹھا لیجئے کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است"...... ابھی اور باکمال ہستیاں باقی ہیں۔ ذرا مرزا دبیر کی قوت مصوری دیکھئے۔ حضرت علی اصغر کو پانی پلانے لے چلے ہیں اس وقت باپ اور حسینؑ ایسے باپ کے دلی خیالات دکھانے کے بعد شاعر یہ بند لکھتا ہے۔ خط کشیدہ الفاظ خصوصیت سے ملاحظہ ہوں۔ ~

پہونچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے   چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے   چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے

آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

ان مصرعوں میں مرزا ائے مرحوم نے ایک داستان کہ دی حسین ایسے غیرت مند پر ایسا وقت پڑ گیا ہو جو عالم بیان ہو سکتا تھا وہ ایسے انمول الفاظ میں اعجازانہ انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ سچے فطرتی جذبات میں صرف یہی بند مرزا صاحب کے خدائے سخن ہونے پر نص قطعی ہے۔ مطالب کی عظمت، الفاظ کی برجستگی، اجازت نہیں دیتی کہ میں شرح کروں۔ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں، جو خوبیاں ان چند لفظوں میں جمع کر دی گئی ہیں ان کی مرقع کشی مصور کے بس کی بات نہیں۔

دو ایک مثالیں اور ملاحظہ ہوں۔

عرفی کا ایک مشہور قصیدہ ہے جسکا یہ مطلع ہے۔

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم   گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

یہاں شاہ و گدا کی مسرت متحد طور پر کس قدر خوبی سے بیان کی ہے۔ اس قصیدہ میں دنیا کو خوش و خورم دکھاتے ہیں اور اسی قسم کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ناگہاں ایک مژدہ سنتا ہوں۔ یعنی شہزادہ سلیم بلاتا ہے۔ اٹھے۔ چلے۔ راستے کے اور جلدی کے مناظر کھینچنے کے بعد سامنے آ گئے۔ یہاں پر دو شعر لکھ دیئے ہیں۔

بگفت من بشنیدم ہر آنچہ گفتنی داشت   کہ در بیان نگہش کرد بر زبان تقدیم
بش چوں نوبت خود از نگاہ باز گرفت   فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

یہ دو شعر شاعرانہ مصوری کے امثلہ عظیم میں سے ہیں۔ اسے عرفی ہی ایسا رموز محبت جاننے والا محسوس کر سکتا تھا اور ایسے مناسب الفاظ میں کہنا بس اسی کا کام ہے۔ صرف یہی دو شعر تو عرفی کے بقائے دوام کے ضامن ہیں۔ علاوہ ان کے اور اشعار بھی پیش کیے جا سکتے ہیں محبت کے اسرار کی اس خوبی سے تصویر کشی کی ہے کہ دل وجد کرتا ہے۔ مانی و بہزاد ارژنگ چین و اہرمن نقش

دنیا کے سارے مصور "مگفت و من بشنیدم" کی تصویر نہیں بنا سکتے۔ خود شاعروں میں ان لطیف جذبات کے سمجھنے والے بہت کم ہیں۔ سچ ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

منوچہری نے ایک مقام پر برسات کا سماں دکھایا ہے۔ پانی برس رہا ہے۔ ایک بوند جو سبزہ پر گرتی ہے اسکی کیا صورت ہو جاتی ہے۔ کلی پر پھول پر پتے پر شاخ پر کیا شکل اختیار کرلیتی ہے۔ غرض نہایت تفصیل و بداہت سے بیان کرتا ہے۔ پھر بھی سب کچھ بہت ہی مختصر الفاظ میں کہتا ہے۔ چند اشعار نقل کئے دیتا ہوں۔

آں قطرہ باراں بیں از ابر چکیدہ گشتہ سر برگ ازاں قطرہ بہ آثار
آویختہ چوں ریشہ و دستار چہ سبز سیمیں گرہے بر سر ہر ریشہ و دستار
یا ہمچو زبرجد گوں یک شئہ سوسن اندر سر ہر سوزن یک لولوئے شہوار

یوہیں امثلہ سے کام لیکر منظر پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ آگے بڑھ کر کہتا ہے۔

واں قطرہ باراں کہ چکد از بر لالہ گرد طرف لالہ ازاں باراں نگار
پنداری تبخالہ خرد ک بدمید است برگرد عقیقین دو لب دلبر عیار
واں دائرہ بنگر اندر شہر آب ہر گہ کہ دراں آب چکد قطرہ امطار
چوں مرکز پرکار ست آں قطرۂ باراں واں دائر آب بسان خط پرکار

اس خاص سین کے کھینچنے کے بعد کہتا ہے کہ اگر زور کی بارش ہونے لگے تو کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے۔

واں گہ کہ خرد بار د باراں بہ قوت گیرد شکن آب دگر صورت آثار
گردد شمرایدوں چو یکے دام کبوتر دیدار ز یک حلقہ بسے سیمیں منقار

دیکھئے کس قدر سادگی سے سامنے کی باتیں بیان کر دی ہیں۔ یہی سہل الممتنع کہلاتا ہے۔ مثالوں کی جدت ایک روح دوڑا رہی ہے۔ اس قدر صاف بندش کے ساتھ مصوری سحر طرازی نہیں تو پھر کیا ہے۔ آپنے دیکھا ہوگا کہ ہدہد جب سر کو اٹھاتا اور جھکاتا ہے تو کلغی پھیلتی اور سمٹتی ہے بظاہر معمولی سی بات ہے۔ مگر منوچہری اس خوبصورتی سے نظم کرتا ہے کہ سنتے ہی ایک دلکش تصویر سامنے آجاتی ہے ملاحظہ کیجیے:۔

بو بویک پیک کہ نامہ زدہ اندر سر خویش　　　نامہ گہ باز کند گہ شکند بر شکنا

ایسی مثالیں اردو فارسی اور دوسری زبانوں میں بھی مل سکتی ہیں۔ یہ مناظر ایسے ہیں جنھیں شاعر ہی صفحہ پر آب و رنگ الفاظ سے کھینچ سکتا ہے۔ یہ راستہ اس قدر باریک اور لطیف ہے کہ سب سلامت روی سے نہیں طے کر سکتے۔ ملخص یہ کہ شاعر (جذبات یعنی رنج و خوشی وغیرہ) یا (زخم کی کسک کھٹک چمک وغیرہ) یا آواز کے مختلف انداز کی تصویریں کھینچ سکتا ہے۔ مگر مصور کی بوقلمونی یہاں مفلوج نظر آتی ہے۔ مثلاً یہ مصرع

"ہوئے فریاد کے پہلو عیاں لحن تکلم سے"

لے لیجئے۔

اوّل تو مطلق آواز ہی کی تصویر نا ممکن۔ ثانیاً فریاد کا پہلو لئے ہوئے آواز! یہی وہ منزل ہے کہ شاعر کو مصور سے بلند کرتی ہے۔ اور ایسے ہی مواقع کے لئے کہا گیا ہے۔ ؎

شاعری جزویست از پیغمبری

متذکرہ بالا مثالوں کو آپ نے خیال کیا ہو گا کہ بعض مقام پر شعر اور تصویر متحد۔ اور بعض مقامات پر شاعر مصور کی سحر طرازی پر ہنستا ہوا آگے نکل گیا ہے یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچکر شاعر فانی زندگی کی قبا اُتار کر بقائے دوام کا خلعت جسم پر آراستہ کر لیتا ہے اور دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

میر وحید اور اُن کی شاعری

(سید جواد صاحب شکیل)

میر وحید اور اُنکی شاعری کا بیان بہت شرح و بسط کا مستحق ہے۔ اس لحاظ سے ذیل کا
مضمون بہت زیادہ ناکافی اور تشنہ ہے پھر بھی اسکی یہ خصوصیت ہے کہ اسکے لکھنے والے خود خاندان
میر وحید کے ایک ہونہار فرد ہیں ضرورت ہے کہ لائق مضمون نگار اور دیگر صاحبانِ قلم اس مفید و
دلچسپ سلسلے کو قائم رکھیں اور میر وحید مرحوم کو دنیائے ادب کے سامنے اُسی تفصیل و شان سے
پیش کریں جسکے وہ مستحق ہیں۔ (مدیر)

ہندوستان کی خاک سے یوں تو بہت سے مرثیہ گو پیدا ہوئے لیکن ان میں چار بڑے باکمال ہوئے
ان میں سے ایک ذات سید ہادی صاحب وحید کی بھی تھی۔ یہ میر انس رح کے بیٹے اور میر انیس رح کے بھتیجے تھے۔
ان بزرگواروں کے علاوہ اگر کوئی بام فلک تک پہونچا تو وہ میر وحید ہی کی ذات تھی۔
میر وحید کے کلام کی جس قدر تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ خان بہادر سید امداد امام صاحب
اپنی کتاب "بہارستان سخن" جلد دوم کے صفحہ ۴۰ پر یوں تحریر فرماتے ہیں۔ "اگر شعرائے لکھنؤ رزمی
شاعری میں ایسا کمال پیدا نہیں کرتے تو محض غزل سرائی اور مثنوی نگاری کی بنیاد پر انکو شعرائے دہلی پر
کسی طرح کی ترجیح حاصل نہ ہوتی۔ اس صنف شاعری کے فروغ دینے والے میر مونس صاحب بھی تھے۔ پھر
میر وحید صاحب نے تو میر انیس کے زمانہ کو زندہ ہی کرنا شروع کیا تھا"
حافظ حاجی حفیظ الدین احمد صاحب اپنی کتاب "میر انیس صاحب مرحوم لکھنوی" میں تحریر فرماتے
ہیں۔ "میر انس صاحب کے صاحبزادے میر محمد ہادی صاحب وحید بھی اپنے خاندان میں وحید العصر نکلے۔
ان کا کلام پایۂ معراج تک پہونچا اور وہ اپنے خاندان میں خوب چمکے"

ان حضرات کے بیان سے ظاہر ہے کہ میر وحید مرحوم کی منزلت انکی نظروں میں کس قدر تھی۔
میر وحید مرحوم کی قدرت بیان کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً مرثیہ، سلام، قصیدہ، تاریخ، واسوخت اور غزل وغیرہ۔

اس وقت چونکہ میر وحید کی مرثیہ گوئی پر صرف روشنی ڈالنا مقصود ہے لہذا دیگر اصناف شاعری سے کوئی بحث کرنا ضروری نہیں میر وحید کی شاعری ہر حیثیت سے کامیاب کہی جا سکتی ہے۔ بندش کی چستی، کلام کی صفائی تو انکی خاندانی خصوصیت تھی۔ ترکیب کی دلاویزی اور الفاظ کا حسن وتناسب ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا۔ اُن کا سینہ محاورات، استعارات وتشبیہات کا مخزن تھا۔ سلاست کلام اُنکی نگاہیں دیکھا کرتی اور ربط کلام کی لڑیاں ہر وقت اُنکے سامنے آویزاں رہتی تھیں۔

جہاں تک اندازہ کیا گیا ہے ہر شاعر کا میلان کسی خاص پیرا یۂ نظم کی طرف ہوتا ہے۔ مثلاً اگر قومی نظم کی طرف زیادہ رجحان ہے تو طبیعت اُسی کی طرف متوجہ رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اس قدر رہار ہو جاتی ہے کہ دیگر صنف شاعری میں اُسکو کوئی افضلیت نہیں ہو سکتی۔ حالی، سرسید، آزاد وغیرہ اس دعوی میں پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن میر وحید کی شاعری کو ہم اس عام قاعدے سے مستثنٰے پاتے ہیں۔ اُنکی ہر صنف شاعری پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک صنف میں وہ ویسے ہی کامل تھے جتنا وہ مرثیہ گوئی میں تھے۔

خاندانی مرثیہ گو ہونے کی وجہ سے میر وحید نے اسی کو اپنا پیشہ مقرر کر لیا تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر خود فرماتے ہیں۔ ؎

کامل اُٹھے دُنیا سے تو پیدا ہوے اکمل　　شمشیر فصاحت پہ ہے یہ پانچویں صیقل

اس وقت میر وحید مرحوم کے کسی واقعہ یا اُنکے سوانح سے کوئی بحث منظور نہیں ہے۔ اسکے لئے بہت زیادہ وقت کی ضرورت ہے۔ اس وقت اُنکے کلام کا کچھ انتخاب پیش کرنا منظور ہے۔

حضرت علیؑ کی سیرت کا نقشہ میر وحید نے بہت سے مراثی میں کھینچا ہے۔ ایک مرثیہ میں ایک واقعہ بہت دلاویز اور دلچسپ پیرایہ میں نظم فرمایا ہے۔

حضرت علیؑ کو خلافت ظاہری مل چکی تھی اور شہر کوفہ اپنی پوری جوانی پر تھا۔ شہر کو آپ نے ۔۔۔ انصاف و عدل سے بھر دیا تھا ہر شخص خوش و خرم بندگی و عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ وہیں

کسی محلہ میں ایک خوش اعتقاد پیرزن رہتی تھی ۔ ۵

تھا ذائقہ سے شوق نہ لذت سے کام تھا　　دن رات عابدہ کو عبادت سے کام تھا

دنیاوی ذخیرہ سے اُسکے پاس کچھ نہ تھا۔ مال و متاع سے کوسوں دُور، کم مائیگی و بیوگی مصاب۔
غریب کو سوائے شکر پروردگار اور عبادت کسی چیز سے علاقہ نہ تھا

رکھتی تھی دختر سمن اندام و نازنیں　　لیلیٰ ادا و رشک حسینانِ مہ جبیں
وہ حسن دلفریب کہ پریاں ہوں شرمگیں　　قتال آنکھ غیرتِ چشمانِ حورعیں

وحشت بڑھے غزال کو گر اشتیاق ہو
دیکھے تو ایک چشم زدن ہجر شاق ہو

تھی ماہ چاردہ ابھی وہ غیرتِ پری　　محروم دیکھنے سے مگر چشم مشتری
آشوبِ ہر چشم کی گردش سراسری　　ہر دم قدم پہ ملتی تھی آنکھوں کو دلبری

مدنظر حجاب نگاہِ خیال سے
محفوظ خیرہ چشمیٔ عین الکمال سے

ہر وقت پاک بیں کی نظر تھی سوے آلہ　　مردم کو شک ہو گر تو ہے عین الیقیں گواہ
رہتی تھی سات پردوں میں شام و سحر نگاہ　　مشتاق کو نہ سوجھتی تھی دیکھنے کی راہ

قدغن تھا چشم بد کی رسائی کے واسطے
حاضر حیا تھی چشم نمائی کے واسطے

اک دن قضائے کار وہ دیدار خوش سیر　　مادر کے ساتھ جاتی تھی مہماں کسی کے گھر
چادر میں بچی ن تھا نہاں اُس کا سر　　پوشیدہ ابر میں ہو کبھی جس طرح قمر

ظاہر نہ کوئی عضو تھا فرطِ حجاب سے
لیکن عیاں تھے دیدۂ حق بیں نقاب سے

دو چار گام گھر سے چلی جب وہ جانِ جاں　　ناگاہ ایک شخص ہوا سامنے عیاں
خوش وضع خوش طبیعت و خوش خلق و خوش بیاں　　خوش رو و خوش مزاج و طرحدار و نوجواں

اہلِ دل تھا خلق سے بے احتیاج تھا
موسم جو تھا شباب کا عاشق مزاج تھا

اسکے بعد دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ ؎

ڈالا قضا نے غیرتِ یوسف کی چاہ میں ۔۔۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں عین راہ میں

وہ جوان عاشق ہوجاتا ہے اسے اس پیرایہ میں لکھتے ہیں

آنکھیں جُھکا کے یہ تو ہوئی دل ہیں شرمسار ۔۔۔ اور تیرِ عشق دل سے ہوا نوجوان کے پار

کوہِ الم گرا جگرِ دردناک پر

اک آہ کر کے بیٹھ گیا فرش خاک پر

~~~~

اک پل میں زندگی کا چمن خار ہوگیا

نرگس کا پھول دیکھ کے بیمار ہوگیا

لڑکی تو آناً فاناً چلی گئی لیکن وہ جوان دل تھام کر گھر آیا۔ جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو قاصد روانہ کیا۔ جب اُس مہ پارہ کے پاس پہونچا تو کہنے لگا۔ ؎

شیدا ہے تیرا اک گل اندام و لالہ فام ۔۔۔ فرقت میں وہ تمام ہے اب اے مہ تمام

اٹکی ہے روح آنکھوں میں دم کا شمار ہے

تیری نگاہِ لطف کا امیدوار ہے

جب اُس نے یہ سُنا تو اپنا مُنہ پیٹ لیا اور کہنے لگی۔ ؎

دیکھا کہاں تھا اس نے مجھے وا مصیبتا ۔۔۔ کیوں اشک ہیں رواں سببِ شور و شر ہے کیا

کس عضو پر ہے شیفتہ مدِ نظر ہے کیا؟

اسکے جواب میں میر وحید قاصد کی زبانی لکھتے ہیں۔

تقدیر کی نظر سے اُتارا ہوا ہے وہ

سُنتا ہوں میں کہ چشم کا مارا ہوا ہے وہ

بولی اک آہ کھینچ کے وہ رشکِ آفتاب ۔۔۔ آنکھوں سے دیکھ دیتی ہوں اس بات کا جواب

یہ کہہ کے اُٹھ کھڑی ہوئی با دیدۂ پُر آب ۔۔۔ پوشیدہ ماں سے پردے میں آئی بصد شتاب

گزلک[1] اُٹھا کے چار طرف دیکھ بھال کے

رکھے طبق میں دیدے کھٹ سے نکال کے

[1] گزلک بمعنی چُھری ۱۲
~~~~

وہ طبق قاصد کو دیتے ہوئے کہتی ہے ۔

کہنا مرا پیام کہ اے بندۂ الٰہ — آنکھیں یہ وہ ہیں جن پہ پڑی تھی تری نگاہ

دوری میں ایک پل تجھے راحت اگر نہیں

قرب ان کا آج سے مجھے مدِ نظر نہیں

عینِ خطا ہے حوصلہ اس سے جو ہو زیاد — آنکھوں پہ کہہ انہیں کہ یہ آئی تری مراد

آیا اگر پیام مکرر اسی طرح

بھیجونگی تیرے سامنے پھر سر اسی طرح

قاصد اُس طرف کو لیکر روانہ ہوا جب اُس عاشق نامراد کے پاس پہونچا تو وہ ظرف پیش کیا۔ اُسے دیکھتے ہی اُسکی عجیب حالت ہوگئی اُس کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں ۔

آنکھوں کو مل کے آنکھوں سے کہتا تھا دمبدم — اے چرخ پیر تو نے دکھایا یہ کیا ستم

دردِ فراق یار نہ تھا میرے حق میں کم

واحسرتا کن آنکھوں سے دیکھوں تازہ غم

اس واقعہ کے بعد وہ عاشق حضرت علیؑ کے دربار میں حاضر ہوا اور اپنا تمام واقعہ حضرت کے سامنے بیان کیا۔ آپ نے اس ضعیفہ اور اُسکی لڑکی کو طلب فرمایا۔ طرفۃ العین میں وہ دونوں حاضر ہوئیں۔ آپ نے اُس لڑکی کو قریب بُلایا اور اُسکی ہمت و عصمت کی بہت تعریف فرمائی۔ پھر خدا کی مدد سے یہ معجزہ دکھایا ۔

حلقوں میں آنکھیں رکھنے لگے جب شہ غیور — پلکوں نے دست شوق بڑھایا بصد سرور

عالم تھا ایک چشم زدن میں یہ نور کا — جو رنگ ڈھنگ پہ ہو نگینہ بلور کا

پہلے سے روشنی کہیں ان میں سوا ہوئی — اندھے نگیں ہوئے تھے دوبارہ پیدا ہوئی

اب ہم یہاں میر وحید کے ایک مرثیہ سے انتخاب کرکے ایک ایسی ہستی کی سیرت پیش کرتے ہیں جو شہید اعظم (امام حسینؑ) کی حیثیت سے مدد معاون تھی حضرت عباسؑ اسدؑ کے چشم و چراغ

اور شہید اعظم کے قوت بازو تھے - بہادری اور اطاعت کا مادہ آپ میں اس قدر تھا جسکی مثال ڈھونڈے نہیں مل سکتی - امام حسینؑ کا سارا اہتمام جنگ آپ ہی کے سپرد تھا۔

اب یہ وہ وقت تھا کہ یزیدی لشکر (جس میں نہ معلوم کس کس شہر اور کن کن قریوں کے لوگ جمع تھے) اس چھوٹے سے دستہ کو (جس میں بعض اس قدر عمر رسیدہ تھے کہ اُن کی پلکیں آنکھوں پر جُھک آئی تھیں اور بعض ایسے نوعمر تھے جن کے گلزار شباب میں تازہ بہار آئی تھی اور چند ایسے صغیر سن تھے جنھوں نے سوائے ماں کی گود یا گھر کی چوکھٹ کے باہر قدم بھی نہ رکھا تھا) تیروں اور پتھروں سے ڈرا رہا تھا - ہر عقیدت مند مجاہد قتل ہوچکا صرف حضرت عباسؑ و حضرت علی اکبرؑ باقی ہیں - دوپہر قریب ہے آفتاب منزل نصف النہار سے قریب ہوتا جاتا ہے - گویا آگ کے شعلے برس رہے ہیں - بچّوں کے ننھے ننھے دل گرمی کی حدت سے جلے جاتے ہیں - بچّوں کی بیتابی دیکھ کر حضرت عباسؑ میدان کا ارادہ کرتے ہیں اس مقام کو میر وحید یوں تحریر فرماتے ہیں -

عباسؑ سر جھکائے ہوئے گھر میں آئے جب　　دیکھا کہ بچے اس و پریشاں ہیں سب کے سب
پیاسی سکینہ تشنہ لبی سے ہے جاں بلب　　جھولے میں توڑتا ہے دم اصغر بصد تعب
لب ہیں کبود ضعف سے منکا ڈھلا ہوا
ہیں مٹھیاں بندھی ہوئی اور مُنہ کھلا ہوا

غصہ کی حالت یوں دکھائی ہے -

غصہ میں یوں ٹہلتے ہیں جس طرح شیر نر　　گہ آستیں چڑھائی کبھی چُست کی کمر
دھیان اپنی ضرب کا بہ تہور کیا کبھی
کشتوں کے لوٹنے کا تصور کیا کبھی
آنسو ٹپک پڑے کبھی غیرت پہ شاہ کی　　چابے کبھی لب اور کبھی سرد کھینچ کے آہ کی
گہ تھم کے جھومے شان سے شیر الٰہ کی　　دشمن کی فوج پر کبھی تن کر نگاہ کی
اُٹھی جو آنکھ پاؤں بھی تھرا کے رہ گیا
دیکھا قوی تنوں کو تو ہاتھ اُٹھ کے رہ گیا

حضرت عباسؑ کی تو غصہ میں یہ حالت ہے جب امام حسینؑ انکو دیکھتے ہیں - تو از حد قلق ہوتا ہے

حضرت عباس یاس آفریں کلام زبان سے نکال رہے ہیں۔ امام مطلب سمجھ جاتے ہیں لیکن اجازت نہیں دیتے حضرت عباسؑ چپ ہو جاتے ہیں۔ اس مقام کو دو مصرعوں میں میر وحید یوں لکھتے ہیں ؎

دُھن ہے وغا کی آپ میں لشکر شکن نہیں

داجب ہے عرض حال پہ تاب سخن نہیں

امام حسینؑ بمشکل اجازت دے دیتے ہیں تب حضرت عباسؑ خیمہ میں حضرت زینبؑ کی خدمت میں رخصت کے لئے آتے ہیں لیکن وہ رخصت نہیں دیتیں بلکہ روکتی ہیں اسے یوں تحریر فرمایا ہے ۔؎

معصوم جاں بلب ہیں تمہیں ہوں کچھ نہ بھیا لاؤ؟ کیا آب نہر تم سے ہے بہتر تمہیں بتاؤ؟

تلوار کھینچو جان پہ کھیلو وغا کرو

اچھا نصیب میں ہو نہ پانی تو کیا کرو؟

اسکے بعد حضرت زینب تاکید فرماتی ہیں کہ تم اب مجھ سے رخصت نہ مانگنا۔ اسکو ایک مصرع میں فرماتی ہیں۔

قرباں جاؤں کیجو نہ اب مجھ سے یہ سوال

اسکے جواب میں حضرت عباس عرض کرتے ہیں۔ ع "دی عرض سر جھکا کے جری نے کہ کیا مجال"

بچوں کی تشنگی سے جو تھا دل کو اضطراب مشکیزہ لے لیا تھا کہ شاید بہم ہو آب

مرضی اگر نہیں ہے تو کیا عذر کی ہے تاب یہ مشک رکھے دیتا ہوں اے بنت بوتراب

نام وغا بھی مُنہ سے نہ اب لوں جو حکم ہو

تیغ و سپر بھی کھول کے رکھدوں جو حکم ہو

ارشاد ہو تو جاؤں نہتّہ حضور شاہ ڈر کر ہٹیں جو سامنے ہو کثرت سپاہ

ٹوکے جو نام لے کے مرا کوئی روسیاہ چہرہ ہو زرد سر کو جھکا لوں با شکل آہ

کہ دوں عدو ل حکم گوارا نہیں مجھے

رکھ دی ہے تیغ جنگ کا یارا نہیں مجھے

جناب زینبؑ مجبور ہو گئیں اور رخصت دے دی۔ باہر جاتے وقت جناب سکینہؑ سامنے آجاتی ہیں آپ گود میں اٹھا لیتے ہیں۔ وہ رونے لگتی ہیں۔ آپ یوں سمجھاتے ہیں ۔؎

مُنہ چوم کر کہا کہ نہ آہ و بکا کرو

بی بی ہماری فتح کی تم بھی دعا کرو

یہ سن کے اُتری گود سے وہ پارۂ جگر — سر ننگے روبہ قبلہ سوئے چرخ کی نظر
ننھے سے ہاتھ اُٹھائے کہا یہ بچشم تر — یارب میرے چچا کو لعینوں پہ دے ظفر
مشکیزہ بھر کے نہر سے لانا نصیب ہو
پھر گھر میں اُنکو خیر سے آنا نصیب ہو

اسکے بعد حضرت عباسؑ باہر تشریف لے جاتے ہیں اور صبا رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں تشریف لے جاتے ہیں۔ یزیدی لشکر حضرت کی جلالت و رعب دیکھکر کانپ اُٹھتا ہے۔ اس خوف اور ڈر کی حالت کو یوں لکھتے ہیں۔

آتا ہے ضیغم اسد حق ترائی میں — فوجوں کا رنگ خوف سے ہے فق ترائی میں
دل کوئی مطمئن نہیں مطلق ترائی میں — شیروں کے ہو رہے ہیں جگر شق ترائی میں
بدلا ہے اضطراب میں دریا کا رنگ بھی
زہرے ہیں آب آب میں چھپے ہیں نہنگ بھی

اوپر کے بند میں تو ذی روح کے خوف کی حالت دکھائی ہے۔ غیر ذی روح پر جو ہیبت تھی اُسکا خاکہ یوں کھینچتے ہیں۔

ذرے زمیں سے اُٹھتے تھے ہر مرتبہ بہم — مطلب یہ تھا کہ یہاں کی زمیں پر رہیں نہ ہم
خورشید جھک کے کہتا تھا ہر دم یہ دمبدم — غیظ ابن بوتراب کا بیشک نہیں ہے کم
چڑھ آؤ خوف گر ہے بہت اُس شجاع کا
زینہ لگا دیا ہے خطوط شعاع کا

اک سمت الاماں کی چمن میں پکار تھی — اک تازہ انتشار میں فصل بہار تھی
بلبل کا دل پھڑکتا تھا دیوانہ وار تھی — مانند نبض ہر رگ گل بیقرار تھی
تسکین کسی کلی کو بھی دشوار ہو گئی
نرگس تو مارے خوف کے بیمار ہو گئی

سبزہ تھا پیچ و تاب میں مانند زعفراں — اُڑ اُڑ کے بھاگتی تھیں نہالوں کی پتیاں
سوسن کا رنگ ڈر سے ہوا جاتا تھا دھواں — سہمی ہوئی لطافت گلشن بھی تھی رواں
کچھ کہہ دیا صبا نے جو منہ موڑ موڑ کے
بھاگی شمیم پسلیاں غنچوں کی توڑ کے

میر وحید خاندانی مرثیہ گو تھے اُن کا کام زیادہ تر مرثیہ گوئی تھا لیکن طبیعت کی رنگینی خاندانی حصار کی منزلوں کو طے کر کے اپنے جذبات اور خداداد زور قلم دکھائے بغیر نہ رہی حضرت علیؑ کا معجزہ اور نوجوان عاشق اور کمسن لڑکی کا جو واقعہ نظم کیا ہے وہ ایک مذہبی حد میں متصور ہے لیکن فاضل شاعر نے ایک ایسے واقعہ میں جو سیدھے سادے الفاظ میں بھی بیان ہو سکتا تھا اپنی روانی طبع اور شوخی قلم سے کوٹ کوٹ کے حسن و نزاکت بھر دی۔ یہ اُنکی اعلیٰ درجہ کی اُستادی تھی کہ اس واقعہ کو ایسے الفاظ سے سجایا ہے کہ موجودہ تہذیب کے دلدادہ اُنکی عقیدت میں جس قدر بھی ارادت کیشی کے ہار پھول چڑھائیں وہ کم ہے حسن و نزاکت کے ساتھ ہی ساتھ ایک بات اور بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ واقعہ کا پلاٹ بالکل اُسی طرح باقی رہا جس طرح سیدھے سادے الفاظ کے ساتھ بیان کرنے میں باقی رہ سکتا تھا۔ اُنکی اس قسم کی نظم میں بھی شوخی اور حسن اُسی طرح قائم ہے جس طرح اُن کے تمام کلام میں یہ باتیں خصوصیات سے ہیں۔

اعلیٰ انشا پردازی و شاعری کا انحصار انتخاب پر مبنی ہوتا ہے۔ شاعر کسی واقعہ کو تفصیل سے پیش کرنے کے بجائے صرف ایسا پہلو پیش کر دیتا ہے جس سے تمام واقعہ کی تصویر کھنچ جائے۔ مثلاً یہ بند جس کے آخری دو مصرعے یہ ہیں۔ ؎

لب ہیں کبود ضعف سے منکا ڈھلا ہوا
ہیں مٹھیاں بندھی ہوئی اور منہ کھلا ہوا

اس میں میر وحید نے جو کیفیت علی اصغرؑ کی دکھائی ہے وہ حضرت سکینہؑ کی نہیں دکھائی۔ کیونکہ اُن پر اپنے چھوٹے بھائی سے پیاس کی شدت کم تھی۔ اوّل تو ماں کا دودھ خشک ہو گیا تھا۔ دوسرے اُن میں برداشت کا مادہ حضرت سکینہ سے کم تھا۔ لہذا میر وحید نے ایک ایسی فرد کا انتخاب کیا جسکی تکلیف سے دوسری فردوں کی تکلیف کا اندازہ ہو گیا یعنی جب علی اصغر ایسے کم سن بچے کو پانی نہ مل سکا تو اہلبیت کو اور زیادہ نہ مل سکا ہوگا۔

اس میں ایک بات اور قابل ذکر ہے وہ یہ کہ حضرت عباس کے لئے رخصت طلب کرتے میں سہولت پیدا ہو گئی کیونکہ جب وہ امام سے یہ کہیں گے کہ "پیاسی سکینہ تشنہ لبی سے ہے جاں بلب" یا (علی اصغر کی بابت) "لب ہیں کبود ضعف سے منکا ڈھلا ہوا ؎ ہیں مٹھیاں بندھی ہوئی اور منہ کھلا ہوا"

تو امام یقیناً اس امید پر کہ پانی آنے سے شاید بچوں کی جان بچ جائے رخصت دیدینگے - یہی ایسی صناعیاں ہیں جو شاعر کو زبردست شاعر بنا دیتی ہیں۔

متکلم کے کلام کا اثر سامع پر اس وقت زیادہ گہرا پڑتا ہے جس وقت متکلم کلام کی نوعیت سے الفاظ کی ادائیگی کرے یعنی اگر وہ کسی افسوسناک واقعہ کا اظہار کر رہا ہے تو ایسے الفاظ اس میں سموے تاکہ ہر ہر جزو غم کی داستان بن جائے - اگر کسی خوشی کا اظہار ہے تو ایسے الفاظ استعمال کرے جس سے مسرت اور خوشی ٹپک رہی ہو - اس بند میں ؎

آتا ہے ضیغم اسدِ حق ترائی میں فوجوں کا رنگ خوف سے ہے فق ترائی میں
دل کوئی مطمئن نہیں مطلق ترائی میں شیروں کے ہو رہے ہیں جگر شق ترائی میں
بدلا ہے اضطراب میں دنیا کا رنگ بھی
زہرے ہیں آب تہ میں چھپے ہیں نہنگ بھی

میر وحید مرحوم نے اسی التزام کا خیال رکھا ہے - چونکہ اس بند میں ہیبت دکھانا مقصود تھی لہٰذا ہیبت ناک الفاظ استعمال کئے ہیں جس سے کلام میں رعب پیدا ہو گیا ہے یہی بلاغت ہے "فوجوں کا رنگ خوف سے فق ہونا"، "شیروں کا جگر شق ہونا"، "نہنگ کا پانی کی تہ میں چھپ جانا" نہائی ہیبت اور خوف کا نمونہ پیش کر رہے ہیں۔

میر وحید مرحوم نے جس جس مقام پر حضرت عباسؑ کی معرکہ آرائی دکھائی ہے - رزمیہ نگاری کو پایۂ معراج تک پہونچا دیا ہے - حضرت عباسؑ کی لڑائی کا بسیط تذکرہ رزمیہ نگاری کی بحث سے تعلق رکھتا ہے - ہمیں یہاں پر جنگ کا کوئی خاکہ کھینچنا مقصود نہ تھا صرف فاداری اطاعت اور اُسی کے ساتھ آپ کے غصہ سے ذی روح وغیر ذی روح پر جو اثر پڑا دکھانا منظور تھا - دُنیا میں آج ہم کو کوئی ایسی مثال نہیں مل سکتی - جس نے اپنی شخصیت کو اس عاشقی اور اطاعت کے ساتھ اپنے بھائی پر نثار کر دی - درحصل حضرت عباس نے دنیا والوں کے لئے ایک زندہ جاوید مثال چھوڑی ہے خدا ان پر اپنی رحمت کے سدا بہار پھول برسائے۔

ساون کا جھولا

سیّد ہاشم رضا صاحب

(۱)

ساون کا پہلا دن ختم ہوا اور انپورنا کا جھولا نہ پڑا۔ پچھلے سال تک اساڑھ کے ختم ہونے سے پہلے ہی انپورنا اپنے جھولنے کے درخت تجویز کرنے لگتی۔ اس کا باپ بزار سے رسّی لا دیا کرتا تھا، اسکی ماں اس کے ساتھ جاکر برگد یا آم کے ٹہنے میں جھولا ڈال دیتی۔ اسکے ساتھ کی لڑکیاں جمع ہو جاتیں اور انپورنا ہوا کے تھپیڑوں میں ہچکولے لیتی، اسکی ساری کبھی کبھی اونچی ٹہنیوں سے مس ہوتی اور وہ بڑی خوش ہوتی۔ برسات کا انپورنا بے چینی سے انتظار کیا کرتی۔ ساون آگیا لیکن ابکی بار انپورنا کا باپ رسّی نہ لایا، انپورنا کی ماں نے جھولا نہ ڈالا۔

(۲)

انپورنا سارے دن مضمحل رہی۔ دوپہر کو وہ اپنے گھر میں جھاڑو دے رہی تھی۔ کالی گھٹا اٹھی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے سامنے کا دروازہ کھول دیا۔ انپورنا کی نگاہ کھلی فضا میں پھرنے لگی، کھیتوں میں پانی بھرا تھا۔ دُور گاؤں کی لڑکیاں جھولے پر لانبے لانبے پینگ لے رہی تھیں۔ کبھی کبھی جھولا روک لیا جاتا اور سب ٹپکے ہوے آم اٹھانے کے لئے لپکتیں۔ انپورنا دُور سے ان کے گیت نہ سن سکی مگر یقیناً ان میں ساون کا خیر مقدم ہوگا۔ ہوا کے جھونکوں نے دروازہ پھر بند کر دیا۔ انپورنا نے جھاڑو رکھدی اور رونے لگی۔ اسمانی قطرے پانی میں مل رہے تھے اور وہ بے حس مین جس میں سیکڑوں ارمان والے دل دفن ہیں انپورنا کے آنسوں کو جذب کر رہی تھی۔

(۳)

ماں نے یہ آنسو دیکھ لئے، دُور کا جھولا اسے بھی نظر آیا تھا اور وہ سمجھ گئی۔ انپورنا سے کہا "انپورنا! تو کیسی ناسمجھ لڑکی ہے۔ جھولے کے لئے روتی ہے۔ یہ بچّے ہیں۔ انھیں پانی میں کھیلنے دے۔ تیرا بھی جب سن تھا تو تو یوں ہی دن دن بھر جھولے پر رہتی۔ تیرے بیاہ کے تین دن باقی ہیں۔ گاؤں والے آپس میں کہینگے "دیکھو انپورنا کیسی بے شرم ہے" میری انپورنا میں یہ کس طرح سن سکونگی۔ آنسو

پوچھے گھر کے دھندے میں مشغول ہو جا کہ باغوں میں پھرنے کے دن ہو گئے۔ انپورنا نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ وہ بچپن کی حدوں سے گزر گئی تھی۔

(۴)

شام کو گاؤں کی لڑکیاں انپورنا سے ملنے آئیں۔ وہ بہت دیر سے آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن نم ہونے کی وجہ سے لکڑیاں نہ جلتی تھیں۔ ساری لڑکیاں انپورنا کے گرد جمع ہو گئیں اور پوچھا "انپورنا آج کیسے بادل اُٹھے تھے۔ ہم سب تمہارا انتظار کرتے رہے اور تم نہ آئیں۔ تمہارے بغیر بڑا سناٹا تھا۔ ہم نے بہت سے آم چُنے، کچھ تمہارے لئے بھی لائے ہیں۔ انپورنا نے گود پھیلا دی آموں پر آنسوؤں کی بارش ہوئی۔ انپورنا سب سے لپٹ لپٹ کے رونے لگی۔ ساون کا آخری دن گذر گیا اور انپورنا کا جھولا نہ پڑا۔

غربت کی مار

سید اعظم حسین مدیر "ادب"

کہنے والے کہتے تھے کہ شریف کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تو اچھا ہوا۔ بچارہ خود ہی غریب ہے لڑکے بالے ہوتے تو انھیں کہاں سے کھلاتا۔ کہاں سے پہناتا۔ سال بھر خون پسینہ ایک کرنے کے بعد تو اتنا اناج ہوتا ہے کہ مشکل سے میاں بیوی جَو کی روٹی اور مٹر کی دال صبح و شام کھا لیتے ہیں اور جب کبھی سیلاب آجاتا ہے یا سوکھا پڑ جاتا ہے تو پھر فاقے ہونے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں بھلا دوسروں کی فکر اُن کے سر ہوتی تو کیا کرتے۔ لیکن کوئی ان دونوں سے تو پوچھتا۔ شادی کو پانچ برس ہوگئے تھے مگر اب تک ماں باپ کی گود خالی تھی۔ آنکھوں کی خنکی اور دل کا ٹکڑا نہیں تھا۔ ہر گھر میں لڑکے لڑکیاں ہنستے روتے کھیلتے کودتے کھاتے پیتے تھے۔ اُنکے یہاں بالکل اُداسی تھی۔

چکّی کی آواز کے سوا اکیلے مکان سے دن اور رات میں کوئی آواز ہی نہیں آتی تھی! گھر ویرانہ معلوم ہوتا تھا! کسے کھلاتے کس سے دل بہلاتے۔ کون "ہوں ہوں" کرکے اُن سے مچلتا، گاؤں والے الگ طعنہ زن ہوتے۔ طرح طرح کے قصّے مشہور کرتے غرض نہ گھر میں چین تھا اور نہ باہر آرام عجیب مصیبت تھی!

لیکن کچھ ہی دنوں بعد مشیت ایزدی نے کروٹ لی۔ دوا، دعا، تعویذ نہ معلوم کس نے اثر کیا کہ شریف اور شریف بہو کی شاخ اُمید میں ثمر آیا اور انھیں سرخرو ہونے کا موقع ملا!!۔

ماں اور باپ اپنے چاند ہی کا مُنہ دیکھ کر رات کو سوتے اور اپنے آفتاب ہی کا چہرہ دیکھکر صبح کو اُٹھتے تھے کھیت پہ ہنسی خوشی جاتے، دل لگا کر ہل چلاتے، پانی بھرتے، گوڑتے، سینچتے، اور پھر خوش خوش واپس آتے تھے۔ راستہ میں کوئی مل جاتا تو دونوں اُنھیں مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے۔ سب ان پر ہنس چکے تھے۔ اب اُنکے ہنسنے کی باری تھی!

غرض غفور کی وجہ سے اُن کے مصیبت کے دن گویا مسرت کے ایام ہوگئے تھے۔ دونوں

دن رات محنت کرتے، خود روکھی سوکھی کھاتے لیکن اپنے بچے کو کوئی تکلیف نہ ہونے دیتے۔ اُسے دودھ دہی کھلاتے!!

(۲)

آج تک کسی کو نہ معلوم ہوا کہ قدرت کو ان فقیروں کا اپنی کملی میں مست رہنا کیوں پسند نہ آیا غفور دس برس کا مشکل سے ہوا تھا کہ موضع میں طاعون آیا اور شریف اور اُسکی بیوی یکے بعد دیگرے اپنے دلبند پر حسرت ویاس کی نگاہیں ڈالتے ہوئے دنیا سے چلے گئے!

دس برس کی جان، نہ کوئی بزرگ اور نہ کوئی سرپرست! گاؤں میں مارا مارا پھرنے لگا۔ چار دن اِنکے گھر رہتا، چار دن اُنکے گھر۔ جو کھانے کو دیتا جان توڑ محنت بھی لیتا۔ بھلا اتنا فارغ البال اور پُرخلوص کون تھا جو اسے بٹھا کر ماں باپ کی طرح کھلاتا اور خوش ہوتا؟

غفور بڑی مصیبتوں سے سال بھر تک گاؤں میں رہا۔ آخر ایک دن پریشان ہو کر وہاں سے نکلا۔ ٹھوکریں کھاتا ہوا لکھنؤ پہونچا۔ شہر میں اس کا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ وہاں کی ہر چیز اسکے لئے اجنبی تھی۔ غریب اور پھر یتیم عجب بیکسی کا عالم تھا! کہاں جاتا، کیا کرتا؟ ادھر اُدھر پھر رہا تھا کہ ایک بوڑھا یکہ بان ایک بڑے مکان کے پاس اپنا یکہ درست کرتا ہوا دکھائی دیا۔ غفور نے اس سے بڑی لجاجت سے پینے کے لئے پانی مانگا۔ یکہ بان نے اُسے بغور دیکھا، قریب بلایا اور پانی پلا کر بہت سے سوال کئے۔ بوڑھے کے چہرے سے شک کے آثار آہستہ آہستہ زائل ہوئے اور اطمینان کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں! اس نے نرم آواز میں غفور سے کہا "تم میرے یکے پر رہو۔ ہانکنا سیکھ لو اور خود چلاؤ۔ محنت و ایمان داری سے کام کرو۔ میرے کوئی لڑکا نہیں ہے۔ اگر تم نے مجھے خوش رکھا تو میں تمہیں جیتے جی اپنے یہاں سے نہ جانے دونگا"

غفور کے لئے یہ سامان غیب سے ہو گیا تھا۔ اُسکی نگاہوں میں یکہ بان فرشتۂ رحمت تھا وہ اپنے مہربان سے وفاداری کا اقرار کرکے اسکے ساتھ رہنے لگا۔

(۳)

شہر کے اور لڑکوں کی طرح غفور کو گلی کوچوں میں گھومنے کی فرصت نہ تھی۔ وہ ہر وقت کام کرتا۔ گھر سے یکہ لیکر علی الصباح نکل جاتا اور ایک بجے رات تک واپس آتا۔ روز نہ معلوم کہ کہیں

کن کن حصوں میں جاتا اور کیسے کیسے لوگوں سے ملتا۔

کچھ دنوں بعد مشاہدے اسکے دماغ پر اثر ڈالنے لگے۔ اور تجربے اسکے دل کو ملول کرنے لگے۔ جب بھلے آدمی صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہوئے آتے اور اسکے یکے پر بیٹھ جاتے تو اسے اس وقت انکے پاس بیٹھکر یکہ ہانکتے ہوئے حجاب و غصہ معلوم ہوتا۔ وہ انھیں دیکھتا اپنی چھوٹی سی میلی کچیلی دھوتی اور پھٹی ہوئی بنڈی پر نظر کرتا اور پھر دل ہی دل میں کہتا "یہ لوگ اپنے کپڑے اور جسم مجھ سے الگ کیوں رکھتے ہیں؟ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں مجبور ہوں"۔ وہ بہت سے ایسے لوگوں کو بھی دیکھتا جو اسکے یکے پر بیٹھنا اپنی ذلت خیال کرتے تھے۔ اور جو صرف تانگے پر سوار ہوتے تھے اسے کچھ ان سے بھی زیادہ بڑے آدمی معلوم ہوئے جو موٹر کے علاوہ کسی دوسری سواری کی طرف رخ بھی نہ کرتے تھے۔ ان کے لئے تانگے پر بیٹھنا بھی ذلت تھا۔ غفور یکہ ہانکتا اور دن دن بھر یہی سوچتا۔ کوئی اتنا امیر، کوئی اس قدر غریب! دیکھنے میں سب ایک ہی طرح کے انسان ہیں ایک ہی طرح پیدا ہوتے اور ایک ہی طرح مرتے ہیں۔ ایک ہی شہر میں رہتے اور ایک ہی طرح سے کھاتے پیتے سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے اور ہنستے روتے بھی! بار ہا رئیسوں کو دیکھا انکے بھی دو پاؤں دو ہاتھ ناک کان غرض سارے عضو ویسے ہی تھے جیسے ایک غریب کے ہوتے ہیں۔ وہ دیہات کا رہنے والا تھا کھیتوں میں باغوں میں اور چراگاہوں میں گھوما تھا۔ اس نے ہزاروں سرسبز و شاداب خوشوں کو ایک ساتھ ہوا کے جھونکوں سے جھکتے اور اٹھتے دیکھا تھا۔ اس نے گائے بھینس بیل بکری سب کو ایک ساتھ کلیلیں کرتے اور چرتے چگتے دیکھا تھا۔ اس نے جھنڈ کی جھنڈ چڑیوں کو ایک ہی درخت پر چہچہاتے اور بسیرا کرتے دیکھا تھا۔ وہ جاہل تھا۔ غیر تعلیم یافتہ تھا۔ نہ تو اس اختلاف و افتراق کے فلسفہ کو سمجھتا تھا اور نہ یہ جانتا تھا کہ اسے اس قدر حقیر و ذلیل کیوں بنایا گیا۔ وہ صرف اپنے آس پاس کی دنیا دیکھتا، دل ہی دل میں کڑھتا اور سائیسی کے فرائض انجام دیتے وقت اپنے بے زبان رفیق کی پیٹھ پر دو آنسو گرا کر کچھ دل ٹھنڈا کر لیتا!۔

۴

غفور کو شہر میں سال ہی بھر گزرا تھا کہ بوڑھے بٹیالے کو ایک مہینہ کے بخار نے دنیا سے رخصت ہونے پر مجبور کیا۔ مرتے وقت اس بوڑھے نے اپنا ٹیرا تا یکہ اور دبلی پتلی گھوڑی

جو اُسکی کائنات تھی غفور کے سپرد کردی۔ غفور نے جو کچھ کما کر جمع کیا تھا سب میاں بھٹیارے کی دوا علاج میں خرچ کر دیا کفن دفن کے لئے بیس روپیے ایک دوسرے یکّہ بان سے لینا پڑے۔ اور دوسرے روز سے یہ حالت ہوگئی کہ جب دن بھر دھوپ اور لو میں ادھر اُدھر سے کما کر لاتا تو شام کو کچھ خرید کر کھاتا۔ اب اسکے اور اسکے یکہ گھوڑی کے رہنے کا کہیں ٹھکانا بھی نہ تھا اس لئے کہ بھٹیارے کے مرجانے کے بعد اس مکان کے مالک نے اِس سے خالی کرالیا۔ دن کی دھوپ اور رات کی اوس میں غفور صرف اس اُمید پر پڑا رہتا کہ دو ایک مہینے میں کما کر وہ کہیں کرایہ کا مکان لیگا۔

لیکن ایک ہفتہ ہی بعد سے اُسکی مصیبتوں میں ناقابل برداشت اضافہ ہونے لگا شہر کے ایک "لکھپتی"، کی ہوس زرا اور بڑھی۔ اب تک اس شہر میں یکے تانگے کے علاوہ موٹر کرایہ پر نہیں چلتی تھی۔ انھوں نے موقع کو مناسب سمجھ کر سیکڑوں "ٹیکسیاں" ولایت سے منگوالیں اور کرایہ یکے سے کم کرکے سڑکوں پر دوڑا دیں۔ پھر کیا تھا؟ ساری پبلک وقت، پیسے اور آرام کے خیال سے یکہ، تانگا چھوڑ کر موٹر ہی پر بیٹھنے لگی۔

غفور پہلے ہی دن سرمایہ داروں کی یہ اُپج دیکھ کر بہت متوحش ہوا۔ اسکی پریشاں حالی بالکل اُس مسافر کی سی تھی جو کسی چٹیل میدان میں تنہا جارہا ہو کہ دفعتہً اسے ایک طرف سے بہت سخت سیاہ آندھی آتی ہوئی دکھائی دے۔ دنیا اسکی نظروں میں اندھیر تھی!

جیسے جیسے دن بڑھتے گئے اُسی طرح موٹروں میں زیادتی اور غفور کی آمدنی میں کمی ہوتی گئی۔ بھلا برق رفتار سواریوں کے آگے یکّے کو کون پوچھتا۔ اور پھر یکّہ بھی کون؟ وہ یکہ جسکا چلانے والا عمر طبعی کو پہونچ کر مرچکا تھا۔ نہ پال درست نہ بم ٹھیک، جوت ٹوٹا ہوا۔ سارا جگہ جگہ سے رسی سے بندھا ہوا۔ اس پر اتنی ہی عمر کی گھوڑی، وہ بھی بے داشت۔ عجب بے سروسامانی تھی۔ سواریاں دور ہی سے دیکھ کر آنکھیں پھیر لیتیں!

آمدنی ایک روپیے سے بارہ آنے، اور بارہ آنے سے آٹھ آنے ہوگئی۔ مفلس غفور کے لئے یہ امارت کی چیرہ دستی ناقابل برداشت ہونے لگی اور وہ دنیا اور ایسی ناانصاف دنیا سے مایوس رہنے لگا!

موٹر کے ساتھ غفور کا ٹوٹا پھوٹا یکہ بہ مشکل دو ماہ تک چلا۔ آخر ایک دن غفور یکّہ لیکر دن بھر

مارا مارا پھرا، لیکن شام تک کچھ نہ ملا۔ وہ تمام دن خود بھی بھوکا رہا اور اُسکی گھوڑی بھی۔ اب کیا کرتا ؟ سر پکڑکر بیٹھ گیا۔ تھک کر چُور ہو گیا تھا۔ جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ نیم کے درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں بہت سخت بخار آ گیا اور وہ بے خبر ہو گیا !

خیال تھا کہ صبح تک بخار جاتا رہیگا۔ لیکن صبح کو بخار رات سے زیادہ ہوا اور طبیعت خراب ہی ہوتی گئی۔ نہ علاج تھا اور نہ تیمار دار۔ اُسے اپنی بیماری سے زیادہ اس بے زبان کی بھوک پیاس کا رنج تھا جو اپنے بے بس مالک کے ساتھ بے موت مَر رہا تھا !۔

تیسرا دن اتوار کا تھا۔ وہ صبح سویرے اُٹھا۔ گھوڑی اور تکّے کو لیکر گرتا پڑتا نخاس پہونچا۔ اب اُنکے گاہک بھی بازار میں بہت کم تھے۔ دوپہر تک دھوپ میں پڑے رہنے کے بعد ایک خریدار پیدا ہوا اور کسی نہ کسی طرح گھوڑی یکہ سب بیس روپیہ میں فروخت ہوا۔

غفور روپیے لیکر اُٹھا ہی تھا کہ سامنے سے اُس کا قرض خواہ یکہ بان آیا اور اپنے بچّوں کے بھوک سے مرنے کی مصیبتیں بیان کرکے روپیے کا طالب ہوا۔ غفور نے اسے دیکھا کچھ سوچا —— اور کل روپیے چپکے سے دیدیئے !

وہ وہاں سے دامن جھاڑ کر اُٹھا۔ بخار بہت تیز تھا۔ اُفتاں و خیزاں ایک طرف کو چلا۔ سر جھکا ہوا تھا اور قدم ٹیڑھے سیدھے پڑ رہے تھے۔ کچھ دُور چل کر جب وہ بیچوں بیچ چوراہے پر پہونچا تو اُسے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے موٹر کی کرخت آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔ اُس نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ سامنے سے تین ٹیکسیاں آدمیوں سے بھری ہوئی تیزی کے ساتھ چلی آ رہی تھیں۔ اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ ایک رئیس بغل میں ایک حور وش لئے موٹر بھگائے چلے آ رہے تھے۔ غفور کا سر چکر کھانے لگا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا۔ قدم آگے بڑھے، پھر پیچھے ہٹے اور وہ ابھی اسی کشمکش میں تھا کہ دونوں طرف کی موٹروں نے بڑھکر اُسکا کام تمام کر دیا !!

تبصرہ

شاہکار افسانے

جناب مولوی عبدالقادر سروری صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی اُردو کے اُن نئے محسنوں میں ہیں جو ہر وقت اسی فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اس زبان کے دامن کو دنیا کے جواہر پاروں سے بھر دیا جائے اور اسے جلد سے جلد مغربی زبانوں کے دوش بہ دوش کھڑا کر دیا جائے۔ مولوی صاحب کی اسی سعی مشکور کا نتیجہ یہ افسانوں کا سلسلہ ہے جو "دنیا کے شاہکار افسانے" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کے چودہ حصے ہیں اور دنیا کی تمام زبانوں کے منتخب افسانے اس میں شامل ہیں۔ ہمیں اس سلسلہ کے دو حصے یعنی "قدیم افسانے" اور "چین و جاپان کے افسانے" ریویو کے لئے موصول ہوئے ہیں۔ "قدیم افسانے" مولانا سروری نے خود ہی انتخاب و ترجمہ فرمائے ہیں۔ "چین اور جاپان کے افسانے" میں افتخار الدین و خواجہ معین الدین صاحبان کی اعانت بھی شریک ہے۔

دونوں مجموعے بہترین فسانوں کے حامل ہیں اور مولانا اپنی اس کامیاب سعی پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ شائقین اُردو ادب اس سلسلہ کو ضرور ملاحظہ فرمائینگے۔ اُردو کے فسانہ نویسوں کے لئے مولانا سروری کی اور تصنیفات کی طرح "دنیا کے شاہکار فسانے" کا مطالعہ بھی ضروری ہے جب تک کہ دوسری زبانوں کے شاہکار نظر سے نہ گزرے ہوں اُردو میں فسانہ نویس بن بیٹھنا عام طور سے دستور ہو چلا ہے مگر حقیقت میں یہ بڑی جسارت ہے۔ مولانا سروری ہمارے مصنفوں سے اسی عیب کو دور کرنے کی سعی فرما رہے ہیں اور یہ چودہ حصوں کا سلسلہ اسی سعی کی ایک کڑی ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سروری اپنی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے افتخار الدین و خواجہ معین الدین صاحبان کے ترجمہ کردہ فسانوں کو خود نہیں ملاحظہ فرما سکے ہیں۔ ان تراجم میں زبان و محاورہ کی غلطیاں بھی ہیں اور کتابت کی بھی۔ ایک دوسرا عیب یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ ترجمے میں اصل مصنفوں کی شخصیت اور ان کا انفرادی طرز تحریر غائب ہو گیا ہے۔ اور تمام مترجم

فسانے ایک ہی مصنف کی تصنیف معلوم ہونے لگے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ مولانا سروری زیر طبع حصص کو خود بغور ملاحظہ فرمائینگے تاکہ چین اور جاپان کے افسانے کے سے معائب اُن شہ پاروں کو برباد نہ کرسکیں اور یہ سلسلہ اُردو ادب میں ایک مستقل اضافے کی صورت اختیار کرے۔

مجموعی حیثیت سے کتابت وطباعت دیدہ زیب اور سلسلہ قابل تعریف ہے۔ ہم ناظرین "ادب" سے متدعی ہیں کہ وہ "دنیا کے شاہکار افسانے" کو اپنے کتبخانوں میں ضرور جگہ دیں۔

قیمت "قدیم افسانے" عہ؍ ـــ "چین اور جاپان کے افسانے" ۹؍

ملنے کا پتہ:۔ "انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

زنگاری بیگم (منظوم ڈراما)

مصنفہ مرزا جعفر علی خاں صاحب آثر بی اے لکھنوی پاکٹ سائز حجم ۶۸ صفحے مجلد قیمت عہ؍ مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔

یہ تین سین کا ایک مذاقیہ ڈراما ہے جسکو ڈاکٹر ایس، ایس، نہرو۔ ایم، اے ـ پی، ایچ، ڈی ـ آئی، سی، ایس ـ نے فرانسیسی زبان سے انگریزی زبان میں ماخوذ کیا۔ اور ہمارے محترم جناب نواب جعفر علی خان صاحب بی اے ڈپٹی کلکٹر نے اسے انگریزی سے اُردو نظم میں منتقل کرکے "دو آتشہ" بنایا ہے۔ حضرت آثر نے شروع میں ڈرامے کا پلاٹ اور تینوں سینوں کا خلاصہ نثر میں لکھ دیا ہے۔ جسکے مطالعے سے منظوم حصہ کا مطلب واضح اور لطف دوچند ہو جاتا ہے۔

نظم کی خوبیوں کے لئے حضرت آثر کا نام کافی ہے۔ سلاست و روانی۔ روزمرہ محاورے۔ زندہ دلی اور خوش طبعی کے بہترین نمونے اس مجموعے میں موجود ہیں۔ حضرت آثر جس طرح شرفاء کی زبان اور اُنکے محاوروں پر قدرت رکھتے ہیں۔ اُسی طرح وہ ارذال کی بول چال اور پھبتیوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ یہ ڈراما انکی اس خصوصیت کو نمایاں طور پر واضح کرتا ہے۔

ہمیں امید ہو کہ حضرت آثر مغربی ڈراما کے شاہکاروں کے ترجمے کی طرف جلد سے جلد توجہ فرمائیں گے۔ نظم و نثر اور زبان و محاورے پر اس طرح کی قدرت حاصل ہونے کے بعد مغربی ادب کے شاہکاروں کا اُردو میں منتقل نہ کرنا اپنی بے مایہ زبان پر ظلم کرنا ہے۔ خدا کرے ہماری بات بے اثر نہ نکلے!

"تعریف قلم"

(حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم)

صورت گر لیلائے سخن ہے قلم اپنا — ہے قوتِ بازو یہی سعی رقم اپنا
یہ سخت مراحل میں رہا ہم قدم اپنا — اک عمر سے ہمدم ہے یہ دلا ہم اپنا

اس دوست نے چھوڑا نہ کبھی ساتھ ہمارا
لغزش میں پکڑتا ہے یہی ہاتھ ہمارا

اک عمر سے ہے حامل الفاظ و معانی — باقی ہے یہی اگلے بزرگوں کی نشانی
پیری میں لہو ہوتا ہے جوں جوں کہ پانی — بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور اسکی جوانی

ہمت کے علاوہ مجھے طاقت بھی سوا دی
بجھنے لگی جب شمع تو لو اور بڑھا دی

شان اسکی سوا سب سے ہیں انداز نرالے — اکثر یہی لکھ دیتا ہے جنت کے قبالے
ہم راز نہ جس وقت تلک اپنا بنا لے — کیا منہ جو زباں سے کوئی اک حرف نکالے

طینت کو جو پوچھو تو عجب نیک ہے اسکی
دوہری تو زبانیں ہیں پہ بات ایک ہے اسکی

سرمایۂ عزت اسی ساتھی کی معیت — سرمایۂ دولت اسی منعم کی بدولت
قائم کیے رکھتا ہے یہی شانِ شرافت — بے اسکی مدد کے نہیں آتی ہے نجابت

بے بس ہے وہی اس سے جو منہ موڑ کے بیٹھا
روئیگا لکھے کو جو اسے چھوڑ کے بیٹھا

تابع اسی فہمی قدسی کے ہو غرب سے تا شرق — تیزی ہے یہ اس میں کہ افگندہ ہے برق
یہ سچ کی خبر لاتا ہے جس وقت ہوا غرق — سر کردہ قلم بات میں تو بھی نہ ہوا فرق

دنیا میں کسی کا نہ اں کو نہ چھوڑے
کٹ جائے پہ چلتے میں بیدار کو چھوڑے

خالص اُردو

(حضرت آرزو لکھنوی)

جھٹلاتے ہیں جو مجھکو بات اپنی وہ مکر کے
منہ اُنکا دیکھتا ہوں اک ٹھنڈی سانس بھر کے

مرنا کبھی ہے جی کے جینا کبھی ہے مر کے
پھاندا ہے چاہ میں جو ڈوبا اُبھر اُبھر کے

جینا ہی تھا وہ کتنا سب جسکے تین دن تھے
ادھیا چلے ہیں وہ بھی سونے میں رات بھر کے

برسوں کی ترسی آنکھیں پیاسی تھیں دیکھنے کی
اک سانس میں پیے ہیں دو دو کٹورے بھر کے

کہنے میں بھی جھجک تھی چُپ رہنے میں بھی اُلجھن
سکتے میں آگیا ہوں اک ٹھنڈی سانس بھر کے

آنکھیں بدل کے تونے اندھیر کر دیا ہے
راتیں یہ بڑھ چلی ہیں دن جا رہے ہیں ڈر کے

گر جانے پر گڑھے میں جو پوچھتے تھے مٹی
مٹی وہ بھر رہے ہیں مجھکو گڑھے میں دھر کے

سیچینیوں کے ہاتھوں پارا بنا ہوا ہوں
مرنے کا ڈر ہی کیا ہے پھر جی اُٹھونگا مر کے

بڑھنا او بال جی کا کیا جانے کب رُکیگا
اب تک تو کوئی چھالا بیٹھا نہیں اُبھر کے

او جی جلانے والے مُنہ تمتما اُٹھا کیوں
چُپ ہو رہا تھا میں تو اک ٹھنڈی سانس بھر کے

رونے کو رات دن کے آنسو کہاں سے آئیں
دو ایک بوندیں گرنا وہ بھی ٹھہر ٹھہر کے

بس آرزو کہ ملنا اُنکا ہے اُن کے بس کا
جتنے بڑھے تم آگے پیچھے وہ اور سر کے

غزل مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر بی اے ڈپٹی کلکٹر

بھول کر اُس نے اک نگاہ نہ کی
پرسشِ حالت تباہ نہ کی

کیا ہوا عرش تک گئے نالے
سنگدل تیرے دل میں راہ نہ کی

نہیں انسان وہ، ملک ہے تو ہو
معصیت جس نے گاہ گاہ نہ کی

یہ خلافِ اُمید اُس سے ہوا
بیکسی پر مری نگاہ نہ کی

گزری ہم غمزدوں پہ جو گزری
شکوہ کیسا اثر کہ آہ نہ کی

غزل نواب حیدر یار جنگ صاحب نظم طباطبائی

ایک دم کو حسن گل سے گلشن آرائی ہوئی
اک نظر اس باغ میں شبنم تماشائی ہوئی

اک قدم ہے اندرون خانہ اک بیرون در
سانس قالب میں جو آئی بھی تو گھبرائی ہوئی

مڑ کے میں دنیا و عقبیٰ کی طرف کیا دیکھتا
مانع وہم دو عالم تیری یکتائی ہوئی

باز آئے کب سیہ کاری سے ہم مثل قلم
مدتوں سجدے رہے برسوں جبیں سائی ہوئی

کوئے رسوائی تک آنے کو نہ اٹھتا تھا قدم
دستگیر آخر کمند ناشکیبائی ہوئی

شام سے سوز شب غم نے مجھے دہلا دیا
شمع کے منہ پر جو دیکھی مُردنی چھائی ہوئی

ہے وہی علت عدم کی جو ہے علت کا عدم
باعث ہنگامہ اپنی ناشناسائی ہوئی

غزل سید مسعود رضا صاحب جذب

کیا کریں گے لے کے ہم نام و نشان زندگی
بے نشانی خود بنی جاتی ہے شان زندگی

موت نکلی ہے عدم سے پیشوائی کے لئے
آ رہا ہے سوئے منزل کاروان زندگی

رحم کر اے یاس ضبط عشق کی ہمت نہ توڑ
اور کچھ دن ہے جوانی میہمان زندگی

کشمکش میں زندگی بدتر بنی ہے موت سے
موت پر مجھ کو گزرتا ہے گمان زندگی

پے بہ پے ناکامیوں پر شکر کے سجدے کروں
کوئی بتلا دو کدھر ہے آستان زندگی

وقت سے پہلے اجل آئے تو آ سکتی نہیں
زندگی اپنی ہے گویا پاسبان زندگی

دفعتہً پھر بڑھ گئیں دنیا کی دل آویزیاں
کیا ابھی باقی ہے کوئی امتحان زندگی

رفتہ رفتہ بے نیاز زندگی ہو جاؤں گا
ہوتے ہوتے ہو چلا ہوں رازدان زندگی

آؤ پھر اک بار دنیا سے بڑھائیں رسم و راہ
بھول جاؤ جذب پچھلی داستان زندگی

غزل چودھری سیّد نظیر الحسن صاحب رضوی فوقؔ مصنّف "المیزان" اسپیشل مجسٹریٹ بہار بن

ہمارے حالِ دل کی اُس ستمگر کو خبر کیا ہو
جو نالے بے نتیجہ ہوں تو پھر دل میں اثر کیا ہو

خدا دے جن کو اپنے فضل سے دولت قناعت کی
اُنھیں پروائے عز و جاہ و قدرِ مال و زر کیا ہو

نہ ہووے درمیاں جس وقت تک رشتہ محبت کا
کسی کے دل میں مثلِ دانۂ تسبیح گھر کیا ہو

نہیں ہے صبح سے تا شب بھروسہ زندگانی کا
نہیں ہے یہ خبر شب کو کہ ہنگامِ سحر کیا ہو

جگہ باقی نہیں رکھی ہے کچھ رنج و تفکر نے
دلِ محزوں میں جذباتِ مسرت کا گزر کیا ہو

ملا دیتا ہے دانہ آپ کو خاکِ مذلّت میں
بھلا پھر سربلندی کے سوا اس کا ثمر کیا ہو

کیا پردہ میں بیخود سیکڑوں کو حُسنِ جاناں نے
جو ہو بے پردہ روئے غیرتِ شمس و قمر کیا ہو

کھنچی ہے تیغ بھی تیار ہے شمشیر ابرو بھی
نہیں معلوم مقتل میں اُنھیں مدِ نظر کیا ہو

نبی کی آل خود جس کشتیٔ ایماں کی حافظ ہو
اُسے اے فوقؔ پھر گردابِ عصیاں کا خطر کیا ہو

غزل حضرت علی بھرسری مرحوم

در بے اثری دعائے خویشم
فریادیٔ نالہ ہائے خویشم

در روز وصال مہر سیما
با خندہ چو صبحہائے خویشم

در ہجر تو ہمچو شمع بزمت
بے شمع رخت غذائے خویشم

عریانیٔ من لباس گردید
چوں تازہ گلے قبائے خویشم

چوں نے کہ بہ نالہ زندہ گردد
دلدادۂ نالہائے خویشم

کس گوش نمیدہد بہ حرفم
شرمندۂ ماجرائے خویشم

در شوق لقائے آں پریرو
نالہ بر خصمہائے خویشم

شد حشر و منم بہ نیمہ راہے
منت کش پارہائے خویشم

مانند ظہیر من علیا

(ماخوذ از دیوان زیر طبع)

غزل مولوی غضنفر علی صاحب غضنفر زیدی

بلبل از چشم کشاید بہ گلِ رخسارش | ہر سحر چوں ثمرہ ام خوں چکد از منقارش
بہ قیامت نبود وعدۂ دیدار گر | مطلب آنست قیامت بکند دیدارش
وائے بر غمزدۂ خانہ خراب اے ناصح | کہ ز بدبختی او چوں تو بود غمخوارش
شیخ در دل ہوسِ دیر برہمن دارد | ہست در دانۂ تسبیح نہاں زنارش
بوالہوس در چمنم گو ہوسِ گل نہ کند | نیشتر بر جگر و دل بزند ہر خارش
مقصد و مطلبم از نالۂ شبگیر این ست | بخت خفتہ ست بخواہم کہ کنم بیدارش
مرد را تجربہ تنہا نہ بگفتار کند | بلکہ سنجند بمیزانِ خرد کردارش
یوسفِ من کہ بود روح و روانِ من پیر | ہر کجا ہست الٰہی بسلامت دارش
چوں غضنفر بہ دربار گہِ دوست رسید | گلہ نیست دگر از ستمِ اغیارش

رباعیات ممدوح صدر

آزادی و ذکر نیکنامی خوشتر | ہر شے کہ کند قدر گرامی خوشتر
بر ہمتِ پست تو دو صد نفرین است | میگوی ذلت و غلامی خوشتر

آتش بہ حریمِ خرد فرہنگ مزن | بر شیشۂ ناموس خرد سنگ مزن
با ہر کس و ناکس برہِ صلح برو | با مومن و برہمن در جنگ مزن

ہر برہمنی ز بت پرستی بگذشت | ہر بادہ کشی از سرِ مستی بگذشت
ہر کس در سیل زر پرستی غرق است | از سر طوفان تنگدستی بگذشت

زیں گونہ کہ دُرریز زبانِ گویاست | حقا کہ ہمہ عطیۂ فضل خدا ست
با پستیٔ من شعر بلندم بہ مثل | گوہر بصدف، صدف بقعر دریاست

آثارِ ادبیّہ

(۱۰)

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم-اے-

میر مہر علی اُنس لکھنوی کی ایک مثنوی

میر حسن اور اُنکے بیٹے، پوتے، پروتے اُردو کے نامی گرامی شعرا گزرے ہیں لیکن میر حسن کے سوا اور سب کی شہرت صرف مرثیہ گوئی میں ہوئی۔ اس صنف سخن میں انیس اور اُنکے دونوں بھائیوں یعنی اُنس و مونس نے خاص امتیاز حاصل کیا۔ آثار ادبیہ کے تجسس میں ان حضرت کے مرثیوں کے علاوہ شاعری کی دوسری صنفوں کے نمونے بھی خوش قسمتی سے مجھکو دستیاب ہوگئے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ یہ خانوادہ شاعری ہر طرح کی نظموں پر قدرت رکھتا تھا۔ فی الحال حضرت اُنس مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ نظم پیش کی جاتی ہے۔ یہ نظم کسی کمشنر اور اُسکی کوٹھی اور بنگلے کی تعریف میں کہی گئی ہے اور مثنوی کی شکل میں ہے۔ اہل نظر دیکھیں کہ مثنوی سحر البیان کے مصنف کا پوتا مثنوی نگاری میں کیا درجہ رکھتا ہے۔

اس نظم کا اصل مسودہ خود مصنف مرحوم کے قلم کا لکھا ہوا اُنکے پرنواسے سید محمد جواد صاحب شکیل لکھنوی کے پاس موجود ہے۔ اور اُنہیں کی عنایت سے اُسکی نقل مجھ کو بھی ملی ہے۔

اس نظم کے درمیانی چند شعر رسالہ "مبصر" بابت جولائی و اگست ۱۹۳۰ء میں شائع ہوچکے ہیں ذیل میں مکمل نظم نقل کی جاتی ہے۔ ادیب

مدح کمشنر صاحب

دلا کر مدح اُس والا حشم کی — جہاں میں دھوم ہے جسکے کرم کی
فلک رفعت قمر طلعت حق آگاہ — کمشنر صاحب ذی قدر و ذی جاہ
وہی ہے رونقِ گلزار اقبال — وہی ہے طرۂ دستار اقبال
رعیت پرور و یکتائے دوراں — عدالت گستر و ذی فیض و ذیشاں
نگین خاتمِ ملک جہاندار — امینِ گوہر یکتائے اسرار
شراب فیض سے اُسکی ہیں سب مست — نہیں گلشن میں کوئی گل تہی دست
نہ شاگھی ر سمے اوجِ سواری — جلوداری میں ہے بادِ بہاری

عیاں ہے اُسمیں یوں روئے منور — کہ جیسے چاند ہو بدلی سے باہر
نہیں پاتی سواری کو جو صرصر — تو کہتی ہیں یہ پریاں ہو کے ششدر
چلی ہے بوئے گل دوشِ صبا پر — سواری ہے سلیماں کی ہوا پر

تعریف کوٹھی

درِ دولت کی ہے تعظیم واجب — ادب درباں ہے اور اقبال حاجب
بنائی ہے وہ کوٹھی فیض بنیاد — زمانہ جسکے سائے میں ہے آباد
دیا ہے طاق کسرا برتری میں — فلک ششدر رہا اس بارہ دری میں
جو کمرہ ہے وہ اک برج شرف ہے — سپیدی بخت کی چاروں طرف ہے
منہ اُس میں دیکھ لے بنّائے خوش کار — کہ آئینہ ہے ایک ایک اُسکی دیوار
زمیں کا نور آنکھوں کی ضیا ہے — غبارِ صحن عالی توتیا ہے
لئے ہے آسماں جاروب زریں — مصفّا رہے صحن خوش آئیں
سجی ہے کیا قرینہ با قرینہ — بھرا ہے یہاں سلیماں کا خزینہ
کروں کس منہ سے اس کوٹھی کے اوصاف — زمیں جسکی ہے آئینہ سی شفاف
مصفا اس قدر کوٹھی کا ہے فرش — کہ جس پر لوٹ جاتا ہے دلِ عرش
ہر اک شے یوں دھری ہے باقرینہ — جڑا خاتم پہ ہو جیسے نگینہ
رکھے ہیں کس لطافت سے دل آویز — کہیں ڈنگل کہیں کوچ اور کہیں میز
کہیں ارگن کہیں گھڑیاں عیاں ہیں — ولایت کی کہیں الماریاں ہیں
پئے اجلاسِ معشوقانِ مے نوش — برابر کرسیاں کھولے ہیں آغوش
وہ آئینے ہیں دیواروں میں چسپاں — سکندر دیکھ کر ہو جن کو حیراں
لگے ہیں ہر طرف رنگیں جو یہ اوٹ — زرِ گلہائے احمر کے ہیں یہ نوٹ
یہ تصویریں نہیں ہر سو نمایاں — تماشے کو اُتر آئی ہیں پریاں
ثنا جھاڑوں کی کیا ہو چشم بد دور — ہر اک یہ جھاڑ ہے گلدستۂ نور
کنول گلدار ہیں وہ رشک گلشن — جنھیں دیکھے سے دل ہوتے ہیں روشن
چھتوں پر بھی وہ گلکاری ہے خوش رنگ — کہ جسکو دیکھ کر مانی بھی ہو دنگ
یہ پردے ہیں رخ عصمت سے آگاہ — یہ نکلے کمینہ رکے ہیں ہوا خواہ

ہر اک شے یہاں ہے نایاب زمانہ
نہیں دیکھا کہیں یہ کارخانہ

در تعریف بنگلہ

کرو بنگلے کی جانب اب نظارا
عجب خوبی سے ہے اُسکو سنوارا

رفیع الشان وہ بنگلہ بنا ہے
کہ جس سے گنبدِ گردوں دبا ہے

زہے شان اس مکانِ خوشنما کی
یہ بنگلہ ہے کہ ہے قدرت خدا کی

اُدھر ہے مثل کوٹھی کے عمارت
ادھر بنگلہ ہے کتنا خوبصورت

منبت کار ہے کیا سقف خوش کار
ہر اک پٹری ہے جسکی رشکِ گلزار

عجب بیلیں عجب گلکاریاں ہیں
چمن میں ایسی کب گلکاریاں ہیں

یہ پھول اک بیچ میں جو ہے طلائی
ثنا خواں جسکی ہے ساری خدائی

بھلا دیجے اُسے کس شے سے نسبت
بھٹکتی پھرتی ہے ہر سُو طبیعت

نئی تشبیہ سوجھی ہے یہ فی الحال
کہ اس بنگلے کا ہے یہ نجم اقبال

نہ کیوں ہو تازگی باغ سخن میں
گلُ خورشید پھولا ہے چمن میں

ارم کا در ہے بنگلے کا ہر اک در
ہوا ٹھنڈی چلی آتی ہے فر فر

کرو چشم بصیرت سے ذرا غور
تکلف ہے ہر اک کمرے میں اک اَور

کہ جس کمرے میں ہو جو چیز درکار
اُسی جاگہ وہ شے رکھی ہے تیار

زمانے کی وہیں چیزیں دھری ہیں
تمام اسباب سے میزیں بھری ہیں

کروں اوصاف اُن کمروں کے تاکے
طلب کرنے کی نہیں پڑتی کوئی شے

تکلف یہ نیا دیکھا ہے یہاں آج
نہیں کمرہ یہ اُس کمرے کا محتاج

بس اے اُنس اب دعا کر با صد اصرار
کہ ہے عیبِ فصاحت طول گفتار

دعا اس فیض گستر کی ہے واجب
کہ یہ سلطانِ لندن کا ہے نائب

رہیں آفاق میں شادان و خوشتر
باقبال و حشم صاحب کمشنر

فزوں ہو احتشام و رعب و اجلال
سدا روشن رہے خورشید اقبال

جہاں میں مرتبہ اُنکا ہو دہ چند
عدو پامال ہوں اور دوست خورسند

ب"

"ریختہ"

اس زلف جانگزا کو ستم کی بلا کہو — افعی کہو سیاہ کہو اژدہا کہو
ٹک واسطے خدا کے مرا عجز جا کہو — عاجز کہو غریب کہو خاکپا کہو
بخشا ہی تیغ زن نے مرے دل کو یہ خطاب — بسمل کہو شہید کہو جاں فدا کہو
عاشق کے دردِ دل کو سنانا نہیں صلاح — ہنس کر کہو پکار کہو برملا کہو
شاہِ نجف کے نام کو توں آبرو سے سیکھ — ہادی کہو امام کہو رہنما کہو

تضمین

کیف کیا دن تھے کہ کچھ غم کا نہ تھا مجھ پہ نشاں — حیرت آتی تھی جو کوئی کرتا تھا ہجراں کا بیاں
صدق اس بیت پہ ہے ہر لحظہ یہ ناطق ہے زباں — کہ ہمیشہ نہیں رہتا ہے زمانہ یکساں
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد — روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

رباعی

دل دِوانہ ہو گیا زلفوں سے اپنی پوچھ لو — ہوش کچھ باقی نہیں آنکھوں سے اپنی پوچھ لو
زخم پلکاں سے جگر دیکھو مرا سب چاک ہے — گر نہیں باور نہیں مژگوں سے اپنی پوچھ لو

"مناقب در راگنی از متخلص بہ یار"

میں اپنے سب مطالب سیدِ ابرار کو سونپا — متاعِ دین و دنیا حیدرِ کرار کو سونپا
مرے سب کام کے مختار جو چاہیں سو کر دیویں — علیٔ مشکلکشا کے دونوں برخوردار کو سونپا
مری یہ ناتوانی بیکسی اور بے بسی میری — شہیدِ کربلا کے عائدِ بیمار کو سونپا
حوالے کر دیا ناموس سب خاتونِ جنت کے — میں اپنا خانماں یہ فاطمہؑ اطہار کو سونپا
گدا ہوں تیرے در کا میں ازل سے یا شہِ مرداں — قضا نے ہاتھ سے میرا ترے دربار کو سونپا
مرے ان سب مطالب کا مرا مولا ہی ضامن ہے — بجا ہے دل جو اپنا فی سبیل اللہ کو سونپا
مری آرزوؤں کا علی اللہ مالک ہے — سرِ دشمن اسد اللہ کی تلوار کو سونپا
پھنسا ہوں غم کے دریا میں بنے قاسم خبر لو تم — ہمیں سے ان گنہگاروں کو لے غفار کو سونپا
خدا کی بات سن کر یار شک لاوے سو کافر ہو — حشر کا معاملہ سب احمدِ مختار کو سونپا

سمن بغرض قرارداد امور تنقیح طلب

ابتدائے مقدمہ نمبری ۱۵۰ سنہ ۱۹۳۰ء

عدالت جناب سید حسن ارشاد صاحب بہادر منصف مقام اکبرپور

ہری کشن پانڈے وغیرہ مدعیان بنام دیوکی نندن وغیرہ مدعا علیہم

بنام
۱- یال گوبند مصر ولد ٹھاکر مصر ساکن موضع قبول پور پرگنہ اکبرپور ضلع فیض آباد۔
۲- بدل پانڈے } پسران بندیسری پانڈے ساکن موضع سیدپور عمر پرگنہ اکبرپور ضلع فیض آباد
۳- سہدیو پانڈے }
مدعا علیہم

واضح ہو کہ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت دخلیابی کے دائر کی ہے لہٰذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ ۷ ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء وقت دس بجے دن کے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امورات اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جسکے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعوی مذکور کی کرو۔ اور تم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ جملہ دستاویزات کو جن پر تم بتائید اپنی جوابدہی کے استدلال کرنا چاہتے ہو پیش کرو۔

مطلع رہو کہ اگر بروز تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ تمہاری غیر حاضری میں مسموع اور فیصل ہوگا۔

آج بتاریخ ۱۵ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

دستخط حاکم بخط انگریزی | مہر عدالت

نقل عرضی دعوی یا مختصر بیان نوعیت دعوی یا جیسی صورت ہو (حسب قاعدہ ۲- آرڈر ۵- مجموعۂ ضابطہ دیوانی) وقت حاضری بدفتر منصفی اکبرپور ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک۔

جلد ۲ بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء نمبر ۱۳

دنیا میں بہت کم ایسے صاحبان علم و فن گزرے ہیں جنہیں "بقدر شوق" تصنیف و تالیف ایجاد و اختراع کا موقع ملا ہو۔ بیماری و رنجوری، عسرت و تنگدستی ہمیشہ علم و ادب کی دشمن رہی ہیں یہی وہ آفتیں ہیں جنہوں نے صاحبانِ کمال کے جوہروں کو پورے طور سے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اُنھیں کے ہاتھوں اُن کے تصنیفی و تالیفی حوصلے پست ہو ہو کر رہ گئے۔ کامل سے کامل ہستیاں زمانہ کی ناقدر شناسی کا رونا روتے روتے اس دنیا سے چلی گئیں۔ باکمال موجدین و مصنفین میں یاد فردیں ایسی ہی ملینگی جنھیں تمام عمر پیٹ بھر کھانا بھی نہ ملا۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں جہاں کہ فضیلت کی دستار پر تونگری و ثروت کا طرہ بھی نظر آئے۔ اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ جنکی زبانیں اور قلم دانش و بینش کے خوشاب موتی فیاضی سے تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے نصیب میں چمکنے والے لعل و جواہر بہت کم ہوتے ہیں۔

ایران و ہندوستان کے صاحبان کمال فردوسی، میر تقی میر، مصحفی وغیرہم کو چھوڑ دیجئے ان میں سے اکثر کے افلاس کے ساتھ تاریخی واقعات و حوادث شریک ہیں علم دوست انگلستان و اسکاٹلینڈ کو لے لیجئے۔ وہاں بھی علمی ناقدری کے اسی افسانہ درد کا اعادہ نظر آئیگا۔

مارلو سا تمثیل نگار آلام و تفکرات کی نذر ہوا۔ لیورگولڈ اسمتھ سا ادیب ہمیشہ شکستہ حالی میں بسر کی۔ اور رابرٹ برنس سے شاعر کی ساری زندگی تہیدستی میں گزری یہی تو وجہ تھی کہ جب برنس کے مرنے پر اسکے مختلف مجسمے بطور یادگار کے کھڑے کئے گئے تو اسکی ماں بیساختہ چیخ اُٹھی تھی "ہائے رابرٹ تو ان سے روٹی مانگتا تھا اور انھوں نے تجھے پتھر دیا۔"

آج کل کا افلاس زدہ اور ادبار کا تباہ کردہ مشرق اس طرح کی ہزاروں مثالیں پیش کرتا رہتا ہے۔ یہاں "گلاب و قند" کا شربت دوسروں ہی کا حصہ ہے۔ قلم و کاغذ کے دلدادوں کو تو اپنی تشنگی بجھانے کے لئے گرم پانی بھی مشکل سے ملتا ہے، بلکہ اکثر اُنکی روزی کا خمیر "خونِ جگر" ہی سے ہوتا ہے۔ نہ اب سلطنت و حکومت باقی ہے کہ شاہی دربار "نو رتن" سے مزین کیا جائے۔ اور نہ اس دولت و امارت کا نشان ملتا ہے کہ ہر رئیس صاحبانِ علم و فن کے ایک ایک گروہ کی سرپرستی کرے۔ البتہ جب موجودہ سرکارِ نظام کا خیال آجاتا ہے تو کچھ اشک شوئی ہو جاتی ہے خدا زندہ و سلامت رکھے شہریارِ دکن کو کہ اُنکی علم دوستی و ادب پروری اب بھی بکرماجیت اور اکبر کے کارنامے یاد دلاتی ہے۔ حضور نے کروروں روپیوں کے صرف سے حیدرآباد میں یونیورسٹی کھول لاکھوں روپیے کے خرچ سے ایک وسیع اور منظم دار الترجمہ قائم کیا۔ بڑے بڑے وظائف دے کر اپنے ملک کے ہونہار طلبہ کو مغربی ممالک میں تعلیم کے لئے بھیجا۔ اور سیکڑوں ادیبوں، محققوں، اور عالموں کو ہندوستان کے گوشے گوشے سے بُلا کر اپنے ظلِ عاطفت میں جگہ دی۔

حضور کو اُردو سے جو شغف ہے وہ اسی سے ظاہر ہے کہ اس جامعہ میں تصنیف و تالیف ترجمہ و تعلیم کا جتنا کام ہو رہا ہے وہ سب اسی زبان میں۔ اور اُردو کے جتنے بلند پایہ رسالے اور اخبار اس خطہ سے جاری ہوتے ہیں وہ سب اسی سرکار کی سرپرستی میں۔

حال ہی میں ہمارے موقر معاصر "اُردو" اورنگ آباد دکن" کے مشہور اڈیٹر مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے، کو حضور نظام نے دس برس کے لئے ایک ہزار ماہوار کا عطیہ اُردو زبان کے ایک لغت کی تدوین کے لئے عطا فرمایا ہے۔

مولوی صاحب کی علمیت، قابلیت اور وسیع النظری کی دنیا قائل ہے وہ ہر طرح اس کام کی اہلیت و صلاحیت رکھتے ہیں ہم اُنکی خدمت میں حضور نظام کے اس عطیہ پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی تدوین لغت کے کام کی اہمیت و وسعت کا لحاظ کرتے ہوئے ہم حضور نظام کی خدمت میں باادب یہ عرض کرنے کی جسارت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ کام ایک فردِ واحد کے انجام دینے کا نہیں ہے۔ بہتر ہوتا کہ حضور اس کام کے لئے ماہرینِ زبان کی ایک کمیٹی بنا دیتے اور اسے کم از کم چار پانچ ممبروں کی ایک جماعت کے سپرد فرما دیتے۔

اس سلسلہ میں ہمارے پیش نظر دو تین ایسے نام موجود ہیں جن سے زبان اُردو کے لغت کی تدوین میں مدد نہ لینا حقیقی تکمیل میں رکاوٹیں ڈالیگا۔

ہماری مراد مولانا نورالحسن صاحب مؤلف نوراللغات۔ علامہ مرزا محمد ہادی صاحب رسوا۔ اور نواب حیدر یار جنگ صاحب طباطبائی سے ہے۔ مولانا نورالحسن صاحب خود ایک لغت کی تدوین میں مصروف ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اُن سے زاید اس کام سے کون واقف ہوگا۔ نواب حیدر یار جنگ صاحب وہ فاضل بزرگ ہیں کہ جنھوں نے اُردو زبان واجدعلی شاہ مرحوم کے دربار میں سیکھی ہے۔ اور علامہ محمد ہادی اُن ماہرین السنہ میں ہیں جنکی نظیر اس وقت ہندوستان میں موجود نہیں ہے۔ اگر حضور نظام نے ہماری اس عرض کو شرف قبول بخشا تو ہمیں یقین ہے کہ ان فضلاء و علماء کی کوششوں سے اُردو میں بھی "انسائیکلوپیڈیا" تیار ہو جائیگی۔ خدا کرے حضور تک ہماری یہ نحیف آواز پہونچ بھی جائے!

مغرب کو اپنی ہمہ دانی پر بڑا ناز ہے وہ اپنے کو دنیا کے سارے علوم کا مبدا و مخزن، موجد و محقق سمجھتا ہے۔ وہ گزشتہ تہذیبوں پر ہنستا ہے اور ازمنہ وسطی کے قبل کے دور کو زمانہ جہالت کے نام سے پکارتا ہے لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو موجودہ علم و حکمت کی ترقیاں پچھلی تہذیبوں کی مرہون منت ہیں۔ مغرب نے انھیں گزشتہ باتوں کی تجدید کی ہے۔ بلکہ اکثر شعبوں میں ابھی تک وہ پچھلی تہذیبوں سے بہت کچھ پیچھے ہے۔

مارک ٹوین امریکہ کا مشہور ترین مصنف مصر کی سیاحت کے بعد اپنے سفرنامہ "انوسنٹس ابیروڈ" میں اسی مضمون کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے۔

"ہمیں اس امر کی مسرت تھی کہ ہم نے اس ملک کو دیکھ لیا جو تہذیب کا گہوارہ تھا، جو یونان کا معلم تھا۔ اور یونان کے ذریعہ سے روما کا اور روما کے ذریعہ سے سارے عالم کا!.........

ہمیں خوشی تھی کہ ہم نے ایسے ملک کو دیکھ لیا کہ جس میں اس زمانے میں جب کہ بنی اسرائیل کے مذہب میں بھی عالم مابعد کا ذکر نہ تھا۔ ایک ایسا شایستہ مذہب رائج تھا جسمیں بعد الموت سزا و جزا کے خیالات موجود تھے۔ ہمیں مسرت تھی کہ ہم نے اس ملک کی زیارت کرلی جہاں انگلستان سے تین ہزار برس قبل

شیشہ موجود تھا۔ اور جو شیشہ پر اس طرح کے نقش و نگار بنا سکتا تھا جیسے ہمیں آج بھی بنانا نصیب نہیں جو تین ہزار برس قبل جراحی اور طب کے بارے میں قریب قریب تمام اُن امور سے واقف تھا جو سائنس نے اب معلوم کئے ہیں جن میں جراحی کے تمام وہ عجیب و غریب آلات موجود تھے جو سائنس نے اب ایجاد کئے ہیں جسمیں اعلیٰ ترین تہذیب کی آسائش و آرام ضرورت و حاجت کی وہ ہزاروں چیزیں موجود تھیں جنھیں ہم نے آہستہ آہستہ ہم پہنچایا ہے اور جن کے متعلق ہم اسکے دعویدار ہیں کہ وہ پہلے پہل دنیا میں دکھائی دی ہیں جسمیں ہمارے خواب و خیال میں آنے سے نامعلوم صدیوں پہلے کاغذ موجود تھا اور فوارے بھی جب کہ ہماری عورتوں کو اسکا وہم و گمان تک نہ تھا جسمیں عام مدارس کا مکمل رواج ہمارے فخر کرنے کے اس قدر قبل موجود تھا کہ اس مدت کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے جو اپنے مُردوں کو اس طرح محفوظ رکھتا تھا کہ گوشت و پوست بھی قریب قریب غیر فانی بن گیا تھا۔ اور یہ ہم سے ناممکن ہے۔ جس نے اس طرح کے مندر بنائے جو فنا کرنے والے زمانے پر ہنستے ہیں اور جو ہماری بڑی سے بڑی عمارتوں کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ وہ پرانا ملک جسے وہ سب آتا تھا جو ہمیں اب آتا ہے۔ بلکہ شاید ہم سے کچھ زائد بھی.............!"

ہمارے لئے یہ امر باعث فخر و سبب مسرت ہے کہ "ادب" کے تین سرپرست گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے مدعو کئے گئے۔ مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب تعلقہ دار محمود آباد لکھنؤ سے۔ سر مرزا محمد اسمٰعیل صاحب دیوان میسور سے۔ اور سر سلطان احمد صاحب وائس چانسلر پٹنہ سے۔

ہم "ادب" کے ان تینوں سرپرستوں کی خدمت میں بادب ملتجی ہیں کہ

بہ سفر رفتنت مبارکباد　　　بہ سلامت روی و باز آئی

ہم اپنے محسنین خاص نواب اور سید محمد مہدی رضوی صاحب رئیس اعظم پٹنہ۔ راجہ سر محمد مہدی صاحب تعلقہ دار پیر پور۔ راجہ سید احمد علی صاحب علوی تعلقہ دار سلیم پور۔ چودھری سید محمد علی صاحب تعلقہ دار رودولی۔ اور سید علی ظہیر صاحب بیرسٹر لکھنؤ کی خدمت میں ان کے انتخاب کونسل پر ہدیہ تہنیت و تبریک پیش کرتے ہیں۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ یہ حضرات اپنے کو ودر قانون سازی

اپنی مادری زبان کے حقوق کی حفاظت فرمائینگے اور اسکی ترقی و نشو و نما کا وسیلہ و ذریعہ بنیں گے۔
بیجا نہ ہوگا اگر اسی سلسلے میں ہم یہ عرض کرتے چلیں کہ سوائے الٰہ آباد یونیورسٹی کے بہار اور یو۔پی کی کسی یونیورسٹی میں اُردو بی۔اے، کے درجے کے آگے نہیں پڑھائی جاتی اور نہ اب تک دوسری یونیورسٹیوں میں ایم۔اے۔ کے درجے اس زبان میں کھولے گئے ہیں ہمیں یقین ہے کہ ہمارے محسنین اس خدمت کو ضرور انجام دینگے۔ اور پٹنہ، لکھنؤ اور آگرہ، یونیورسٹیوں میں اُردو میں ایم۔اے، کے درجے کھلوانے کی سعی بلیغ فرمائیں گے۔

ہمارے لئے یہ امر بھی کم باعث مسرت نہیں ہے کہ ہمارے محترم و معاون و سرپرست جناب پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔اے، لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی کے ریڈر اور شعبہ فارسی و اردو کے صدر مقرر ہوگئے۔ یونیورسٹی کی منتخب کرنے والی جماعت نے پروفیسر صاحب موصوف کو اس عہدہ پر مامور کرکے اس حق پسندی و علم دوستی کا ثبوت دیا ہے جو بعض اوقات جماعت بندیوں کی نذر ہوجایا کرتا ہے ہمیں یقین کامل ہے کہ پروفیسر رضوی صاحب اس شعبہ کا کھویا ہوا وقار پھر سے قائم کردینگے اور یہ ثابت کردینگے کہ "مشرقیات" کا ماہر ہونے کے لئے آکسفورڈ اور کیمبرج کی سند کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے اور نہ مغربی طرز معاشرت و اخلاق و عادات کا اختیار کرنا اس شعبے کے افسر اعلیٰ کی حقیقی کامیابی کے لئے ضروری و لابدی ہے۔

"ادب" کے خاص نمبر کے ارادہ کے ساتھ ہی علالتوں نے آگھیرا ہے۔ کاتبوں کے بعد اب کارکنوں کی باری ہے منیجر صاحب تو انشاء اللہ جھیل لے گئے۔ مگر اب ہمارے دم پر آبنی ہے۔ خیر "این ہم بگزرد" لیکن اس اطلاع سے ہماری غرض صرف اتنی ہے کہ ہم سے ہمدردی ظاہر کرنے اور عیادت کرنے کے بدلے خاص نمبر کے لئے افاضل و اکابر سے مضامین نظم و نثر حاصل کئے جائیں اور "ادب" کے حلقہ اشاعت کو وسیع سے وسیع تر بنانے کی کوشش کی جائے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ ہمارے ناظرین کرام ہم سے کہاں تک حقیقی ہمدردی فرماتے ہیں۔ اور ہماری عیادت کے اخلاقی فرض سے کیونکر سبکدوش ہوتے ہیں۔ خدا کرے ہمارا فقرہ "طنز" نہ نکلے!

داستانِ اُردو

ادب سنسکرت

(نواب سید نصیر حسین خانصاحب خیال)

"عام شکایت ہے کہ ہماری تخیل اور ہماری زبان ملکی سے زیادہ غیر ملکی یعنی بدیسی دکھائی دیتی ہے! اسکی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ ہمارے ادیب و شعرا اب تک بزار عکاظ اور سوق بغداد کا خواب دیکھ رہے اور آب رکنا باد و گلگشت مصلّا کی سیر فرما رہے اور سیحوں و جیحوں میں اس طرح غرق ہیں کہ اپنے وطن کی پیش پا افتادہ چیزیں بھی انہیں نظر نہیں آتیں! اس زمین کے دفینے اگر نکالے جائیں تو ہم گنج قاروں کو بھی بھول جائیں! مگر چونکہ اس میں زحمت و محنت ہے، یہ کانیں کھدیں کیونکر اور نکلیں کس طرح؟ ملک بھر میں چند ہی ایسے بزرگوار ملیں گے جنھوں نے اس عام شکایت کو سمجھا اور اُسکے دُور کرنے کا رستہ نکالا ہو۔ "داستانِ اُردو" میں جس کا ایک باب "ادب" میں قبل شائع ہوا۔ اس کا خاص لحاظ نظر آتا اور وہ ہماری دلیل نگاہ بن سکتی ہے۔ اس لحاظ سے کہ ملک اپنی چیزوں سے باخبر ہو اور اپنی زبان کو سمجھے۔ ہم نے اس داستان کا ایک اور باب (جو ادب سنسکرت سے متعلق ہے) حاصل کر کے اُسے بذریعہ رسالہ "ادب" شائع کرنا موزوں تصور کیا ہے۔

اس بیان میں یوں تو اکثر باتیں قابل لحاظ و سبق آموز اور ہمارے معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔ مگر دو چیزیں خاص طور پر لائق توجہ ہیں۔ اوّل یہ کہ شاید ہی کسی مسلمان

اہل قلم نے ادب سنسکرت کا اپنے کسی بیان میں اتنا ادب لحاظ رکھا اور اسلامی بے تعصبی کی ایسی مثال و شان دکھائی ہو۔ دوسرے یہ کہ قصۂ **شکنتلا** اُس انداز و زبان میں دُہرایا گیا ہو جو اُس کا اقتضا ہو۔ حسیات و جذبات کی لفظوں میں وہ تصویر کھینچی گئی ہو کہ نثر نظم معلوم ہوتی ہے۔

(سید مجتبےٰ حسین خاں)

مہابھارت و **رامائن** کی سی تصنیفوں کے بعد ممکن نہ تھا کہ ملک و قوم کی حالت نہ بدلتی اور اُن میں اہل قلم پیدا نہ ہو جاتے۔ یہ اُن لاجواب مثنویوں ہی کا اثر تھا کہ آخر یہاں قسم قسم کی نظمیں شروع ہو گئیں۔ **سنسکرت** اور اُس وقت کی **بھاشا** (جو طبقۂ اوسط کی زبان تھی) دونوں میں ادیب و شعرا اپنی طبیعت کا زور دکھانے اور خواص و عوام کو لبھانے لگے۔

ناٹک (ڈراما) بھی اُسی دور کے باغ ادب کا وہ میوہ ہے جو اب بھی تازہ ہے۔ گو یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ **اصل** کس زمین پر اسکی قلم لگائی گئی؟ مگر ویدوں میں اس **پھل** کا ذکر موجود اور نٹوں (ناچنے گانے والے) کا جابجا مذکور ہے۔ یہ گوَیّے اور ان کے ناٹک یہاں بہت عام اور مرغوب تھے۔ امیروں کی محفلوں اور راجاؤں کے درباروں تک بھی اُن کی رسائی تھی۔ اور اس وجہ سے ملک میں اس (ناٹک) کی آواز بہت بلند رہی۔

اسی سنسکرتی دور میں **کالی داس** پیدا ہوئے۔ یہ **بکرماجیت** کے مشہور نورتن کے وہ جواہر ہیں جسکی چھوٹ آج تک پڑتی اور نظر کو خیرہ کرتی ہے۔ ان کی رتو سنہارا (بارہ ماسا) اور میگھ دوتا (ابر قاصد) کی سی موسمی نظمیں، اس زمین پر برس پڑیں اور زبان اور گلوں کے رستہ سے ملک پر چھا گئیں۔ پھر رگھو بنسا تصنیف کی۔ اس میں رگھو (رامچندر جی کے مورث) کے بنس (خاندان) کا مفصل حال لکھا۔ اور وہ دیوتاؤں کے ذکر کی وجہ سے سر آنکھوں پر رکھی گئی۔ ان کی نظمیں بہت مشہور اور مقبول ہوئیں لیکن جس خاص چیز نے ہمارے اس ملکی شاعر کو **ملک الشعرا** بھی منوا دیا وہ انکا لاجواب ڈراما سکنتلا ہے!

سکنتلا۔۔۔ یہ قصہ ایک راجہ کے رنگ محل (محل) سے شروع ہوتا اور ایک غریب کی

جھونپڑی میں ختم ہوتا ہے۔

"دشنتو کمار، اتفاقاً ایک جنگل میں جا نکلتے ہیں۔ اور وہاں سکنتلا
نام ایک پری زاد برہمنی پر عاشق ہو کر اُس سے بیاہ کر لیتے ہیں۔ کچھ دن وہاں
رہنے کے بعد اُنھیں اپنا سماج یاد آتا اور سکنتلا کو اپنی نشانی کا چھلا دے کر اور
پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوتے ہیں۔

اُدھر کمار گھر پہنچ کر، جنگل کا قصہ اور اپنی سکنتلا کو بھول جاتے ہیں۔ اِدھر
اس غریب کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے جسے وہ دُکھوں سے پالتی اور دشنتو کی
یاد میں دن گذارتی ہے۔

بہت دن بیت گئے! جنگل بڑھا، کٹا، چھٹا، صاف ہوا، اور
پھر بھرا! آس پاس کے کھیت لہلہائے، مُرجھائے، اُٹھائے اور پھر لگائے
گئے! گاؤں کا تلاؤ بھرا، سوکھا، پانی پڑا، اور پھر ہاتھی ڈوب ہو گیا!
اُسکے کنارے کنوَل پھوٹے، نکلے اور پھولے۔ بھنورے بھن بھن کرتے
اُڑے، دَوڑے، متوالے، چکراتے، چکّر کاٹتے۔ اُسکے پھول پر مدہوش
بیہوش گرے، اور وہیں ڈھیر ہو گئے! سکنتلا، قدرت کے یہ تماشے دیکھتیں
اور کنول اور بھونرے کی کشش اور وفا پر سر دُھنتیں اور اپنے دشنتو کی
یاد میں ڈوب جاتیں! بچہ پلا، بڑھا، کھیلنے لگا، اور اب ہشیار ہو گیا! سب
ہوا مگر کمار اب بھی نہیں لوٹے! یہ اب بہت اُکتائیں تو خاوند کی ڈھونڈھ
میں نکلیں۔ بخت کی خوبی، ستارے کی گردش۔ لُو، عین وقت پر نشانی کا
وہ چھلا بھی گم ہو گیا! روئیں کہ اب کیا لیکر اور کس مُنہ سے کمار تک جائیں؟
مگر ہمت نہ ہاریں۔ دل کڑا کر کے اور لڑکے کا ہاتھ پکڑ چل کھڑی ہوئیں اور کسی طرح
راجہ (دشنتو) کے دربار تک پہونچیں!

دشنتو جی نے نہیں پہچانا۔ لڑکا پیش کیا گیا۔ اُسے بھی غیر جانا۔ بہت
کچھ یاد دلایا گیا تو ذرا چیتے۔ مگر چھلا مانگا۔ وہ کہاں؟! سکنتلا بھرے دربار میں

" جھوٹی بنیں نکلیں! لیکن صبر کیا اور اُسی شہر میں رہنے لگیں۔ کچھ دن بعد دشنتو "
" چونکے۔ غریبوں کی یاد آئی۔ بلاہٹ ہوئی۔ دن پھر چکے تھے۔ یعنی وہ نشانی (چھلّا) "
" بھی مل گئی! سکنتلا ہنستی کھیلتی دربار کو چلیں۔ پہونچیں۔ راجہ کے سامنے آئیں۔ "
" کشش ہوئی۔ پہچانا! مگر دشنتو پھر راجہ ہیں۔ سنبھلے رہے اور اپنی نشانی "
" (چھلّا) کا سوال کیا۔ اِنھوں (سکنتلا) نے مسکرا کر پیش کر دیا۔ راجہ بیچین "
" ہو کر گدّی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جوش میں اُن کا ہاتھ پکڑ بغل میں بٹھلا لیا! "
" لڑکا سامنے آیا۔ دیکھا اور محبت کی نظر نے اُسے گود تک پہونچا دیا! پیار کیا۔ "
" بھرت نام رکھا۔ بچھڑے ملے اور پھر ہنسی خوشی رہنے لگے!! "

یہ وہی بھرت ہیں جو بڑھ کر بھرت جی کہلائے اور چندر بنسیوں کے پُرکھ (مورث) اور اُس بنس کے بانی مانے گئے۔

یہ نادر ڈراما بھی اُس وقت کے پنڈتوں کی زبان یعنی سنسکرت میں ہے۔ مگر چونکہ اُسکی سبھا میں راجہ پرجا، عالم، جاہل، اور خاص و عام سب آتے اور یونانی گائنیں ناچتی گاتی ہیں اس وجہ سے اُس کے خاص ایکٹروں کی زبان تو دیوبانی (سنسکرت) ہے مگر اوروں کی بولی وہی پراکرت ہے جو اُس وقت کے بزار کا رائج سکّہ اور پرجا کے گھروں کا کھراال تھا۔ اور اس سے ظاہر ہے کہ کالی داس کے سے جوہری کو بھی یہاں کے اصلی و ملکی سنگریزوں کو اپنے ذخیرے میں جگہ دیئے بغیر چارہ اور چھٹکارا نہ تھا!

یہ نظمیں اور یہ تصنیفیں گھر گھر پھیلیں اور خواص پر عوام کی بولی اور عوام پر خواص کی زبان کا اثر پڑتا اور بڑھتا چلا۔ مرچھ چھیکاٹی (رتھ کھلونا) کا سا ناٹک بھی اُسی زمانہ کی یادگار اور قصوروار کو پکڑنے اور بے قصور کو چھوڑنے کا جائز و فطری قانون سکھا کر انسان کو منصف بناتا اور خدا کو یاد دلاتا ہے۔

لے ہند و شام و فلسطین اور یونان کے تعلقات بہت قدیم ہیں۔ ورجل (رومن شاعر) اور ہومر (یونانی شاعر) کی نظموں سے ان دو ملکوں کے رواسم کا پتہ چلتا ہے۔ سکندر کی وجہ سے یہ ربط اور بڑھا اور اس ملک پر یونانی اثر ایک عرصہ تک چھایا رہا۔ کالی داس کے وقت میں یہ اثر اتنا گہرا تھا کہ سقراط اور ارسطو کا فلسفہ و منطق ہی نہیں بلکہ وہاں کی عام باتیں بھی یہاں گھر کر گئی تھیں

پھر نَل دَمنَ (نَل دَمَنتا) کی سی مثنوی لکھی گئی - اس میں ایک جواری راجہ (نَل نام) کی مدہوشی اور اندھے جوے کی پر درد داستان، انکی بے پناہ ہار (وہ راجہ نل سلطنت ہی ہارا) اور اُن کی رانی دَمنتا کی وفا وہشیاری کی حکایت سنا کر بڑے سبق دیئے گئے ہیں - یہ وہی دلچسپ نظم ہے جسے **فیضی** کے سے علامہ نے **اکبر** کی فرمائش پر **فارسی** کا جامہ پہنایا اور ہم سے روشناس کرایا۔

پنچ تنترا بھی اُسی مبارک دور کی ایک نئی مزیدار، مسلسل اور **قصہ در قصہ** حکایت ہے - یہ جانوروں کی ایک **بولتی** ہوئی تصویر ہے - مگر کیسے جانور اور کیسا ہوش ربا قصہ؟ یہ اُن طلسمی **بے زبانوں** کی وہ جادو بھری کہانی ہے جو اُن کی زبانی **آدم زاد** کو سنائی جاتی اور باتوں باتوں میں اُسے **انسان** بناتی ہے! یہ قصہ نہ صرف اس ملک میں عام ہوا بلکہ اسکا چرچا دُور دُور پھیلا - **پہلوی** (قدیم فارسی) میں بھی وہ حیوان گویا ہوے اور **کلیلہ و دمنہ** کی زبان سے عرب میں بھی ناطق سمجھے گئے[1]! پھر نئے **فارس** اور نئی **فارسی** کے آسمان شہرت پر **ملا حسین واعظ** کے قلم سے وہ (قصہ) **انوار سہیلی** بن کر چمکا - اور بعد کو **اکبر** کے سے ہوشمند کے اشارہ پر **ہندی فارسی** کا خلعت اور **عیار دانش** لقب پا کر ہماری محفل کو بھی **خرد افزا** اپنانے اور سرفراز کرنے لگا!!

ادب:- جناب خیال کے گزشتہ مضمون (داستان اردو - بودھ مت، جین مت اور سنسکرت) کے ساتھ شائع کرنے کے لئے ہمیں ان کتابوں کے نام بھی موصول ہوے تھے جو اس باب کے لکھتے وقت فاضل مصنف کے پیش نظر تھیں - یہ فہرست گزشتہ پرچے میں شائع نہ ہو سکی اس لئے اس مرتبہ یہاں درج کی جاتی ہے:-

(۱) ویبر = تاریخ ادب سنسکرت = (۲) میکس مُلر = تاریخ قدیم ادب سنسکرت =

(۳) جون میور = ترجمہ غیر مطبوعہ کتب سنسکرت = (۴) پروفیسر ہنز ڈیوڈ = بودھ مت گوتم جی کی پیدائش

---

[1] سنسکرت کی اکثر تصنیفیں کیانیوں اور ساسانیوں کے وقت میں دربار پہلوی میں ترجمہ ہوئیں۔ پنچ تنترا نے بھی اُسی عہد میں قدیم فارسی (پہلوی) کا جامہ پہنا - عربوں نے اس تحفہ کو بھی الف لیلا کی طرح آخر اپنا کر لیا۔

۵) بشپ بگنیڈنٹ = سوانح و قصص متعلق بہ گوتم بدھ = (۶) بنارٹ = مضمون حکایات دربارہ بدھا =

۷) میکس ڈنکر = تاریخ ہند قدیم = (۸) میکس مُلر = مقدس کتب ہائے مشرق =

۹) رسالہ بھابدھا سوسائٹی = کلکتہ سنہ ۹۲ء (۱۰) جنرل کننگھم = جغرافیہ ہند قدیم =

۱۱) پروفیسر ہیلی = راز غلامی = ترجمہ از جرمن انگریزی امریکہ (۱۲) پروفیسر ژُورلا = کنعان و کنعانیان = فرنچ =

۱۳) پروفیسر لمبرگ = تعلیمات موسیٰ و عیسیٰ = جرمن = (۱۴) پروفیسر گنیری = لغویات مذہب = انگریزی امریکہ

۱۵) عبد اللہ مصری = فراعنہ مصر - عربی مطبوعہ سنہ ۱۸۷۱ء = (۱۶) جرجی زیدان = بابل و شام - عربی مطبوعہ بیروت سنہ ۱۹۰۱ء

۱۷) ابو القاسم فرشتہ = تاریخ فرشتہ، تاریخ ہند =

سلطان جلال الدین خلجی

(مہدی حسین صاحب ایم۔اے۔ پروفیسر آگرہ کالج)

نہایت رحم دل، خدا ترس، فیاض اور انصاف پسند تھا۔ بادشاہ ہو کر بھی وہ اپنے قدیم مربی اور محسن غیاث الدین بلبن کو نہ بھولا ہمیشہ اسکا لحاظ کرتا رہا۔ اُس محل میں جو بلبن کا بنوایا ہوا تھا کبھی سوار ہو کر نہ جاتا تھا۔ تخت پر نہ بیٹھتا۔ بلکہ بلبنی دربار میں قدیم سے جو جگہ اُسکے لئے مقرر تھی اُسی پر جاکر کھڑا ہو جاتا۔ جلال الدین بات کا سچا اور معاملے کا صاف تھا۔ ظاہر و باطن اسکا ایک تھا۔ چال ڈھال اسکی سیدھی سادھی تھی۔ تاجپوشی کے بعد بھی وہ اپنے پرانے ملنے والوں سے پہلے کی طرح ملتا رہا۔ اُس نے بلبن کا نام و نشان باقی رکھنے کی بڑی کوشش کی بلبن کے بھتیجے ملک چھجو کو جو حقیقت میں ایک حریف اور دشمن تھا کڑے اور مانک پور کا حاکم بنایا۔ جب چھجو نے بغاوت کی اور بادشاہ کے بڑے بیٹے ارکلی خاں نے اسے شکست دے کر زندہ گرفتار کر لیا تو جلال الدین نے چھجو کو مع اسکے سرداروں کے رہا کر دیا اور کچھ جاگیر بھی دی۔ اور اس کے مددگاروں کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کی بنیاد کمزور ہو گئی اور انتظام میں فرق آگیا۔ ملک میں فساد ہونے لگا۔ راستوں میں لٹیروں نے بدامنی پھیلا دی اور باغیوں نے راہیں بند کر دیں۔ اگرچہ جلال الدین نے کہیں کہیں سرکوبی کی لیکن فسادیوں باغیوں کے ساتھ سخت گیر بادشاہوں کی طرح پیش نہ آیا۔ اس لئے فتنہ و فساد کی چنگاریاں اُسکے بجھائے بجھ نہ سکیں۔

سُلطان جلال الدین کے عہد میں علاء الدین کے کارنامے قابلِ ذکر ہیں۔ علاء الدین سلطان جلال الدین کا بھتیجا اور داماد تھا سلطان نے اُسے کڑے کا حاکم بنایا دیا تھا۔ مگر علاء الدین اپنی بیوی کی مخالفت سے تنگ آگیا تھا۔ اور اپنی خوشدامن ملکۂ جہاں سے بھی عاجز

تھا۔ ان باتوں کو وہ سلطان سے کہہ نہ سکتا تھا۔ رات دن اسی فکر میں رہتا تھا کہ جنگلوں اور پہاڑوں کو طے کرکے کسی دوسری ولایت میں نکل جائے۔ دیوگڑھ کی دولت کی خبریں سُن سُن کر اُسکا حوصلہ بلند ہوا۔ بادشاہ سے اپنا ارادہ مخفی رکھکر چندیری اور مالوے کو فتح کرنے کی اجازت طلب کی۔ بادشاہ نے اجازت دے دی۔ تو ۱۲۹۴ء میں آٹھ ہزار سواروں کو لے کر نکلا اور بندھیاچل پہاڑ کو طے کرکے دیوگڑھ پہونچ گیا۔ دیوگڑھ کا راجہ اُس وقت رام دیو تھا جو دکن کے کل راجاؤں میں بڑا گنا جاتا تھا اور اسی سبب سے مہاراجہ کہلاتا تھا۔ اُس زمانے میں اچانک حملہ کرنے کا دستور نہ تھا اور اچانک حملہ کرنے والے کو بہت بُرا جانتے تھے۔ مہاراجہ رام دیو کو کسی غنیم کے حملے کا گمان بھی نہ تھا۔ نہ وہ جنگ کے لئے تیار تھا۔ جس دن علاءالدین نے اُس پر حملہ کیا۔ رام دیو کے پاس فوج بھی نہ تھی۔ ضیاءالدین برنی کا بیان ہے کہ "مہاراجہ کی کل فوج کو لے کر اس کا بیٹا کسی دوسری سمت چلا گیا تھا۔ علاءالدین دیوگڑھ میں داخل ہوا، تو نئی فوجوں کے آنے سے ایک شور اُٹھا۔ جس کو سُن کر راجہ کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ وقت بہت نازک تھا جس طرح بن پڑا کچھ فوج جمع کی اور شہر کے باہر آکر علاءالدین کا مقابلہ کیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اسکی فوج کا دل چھوٹ گیا اور پاؤں اُکھڑ گئے۔ رام دیو بھاگا۔ اور ایک پہاڑی قلعے میں پہونچ کر پناہ لی۔ دشمن وہیں پہونچ گئے اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ علاءالدین نے یہ خبر مشہور کر دی کہ میں تو تھوڑی سی فوج لے کر بطور ہراول کے آیا ہوں۔ بادشاہ دہلی کا بڑا لشکر پیچھے سے آرہا ہے۔ یہ سُن کر راجہ نے صلح کا پیغام بھیجا۔ علاءالدین نے بہت سی دولت مانگی جس کا ایک تہائی دینے پر راجہ راضی ہو گیا۔ کئی سو من سونا، موتی اور جواہرات علاءالدین کے ہاتھ آئے۔ دولت سے مالا مال ہو کر علاءالدین نے قلعے کا محاصرہ اُٹھا دیا۔ اور کڑے کا رُخ کیا۔

اس وقت سلطان جلال الدین گوالیار میں تھا بھتیجے کے کارنامے سُنے تو دل باغ باغ ہو گیا۔ خوشی خوشی دہلی واپس آیا۔ وزیروں نے سلطان کو یہ رائے دی کہ علاءالدین کو کڑے جانے سے پہلے راستے ہی میں روک لینا چاہئے۔ مگر اُس نے کسی کی نہ سُنی۔ اور علاءالدین کڑے پہونچ گیا۔ وہاں ایک بڑی فوج تیار کرکے خاموشی کے ساتھ بادشاہ کے قتل کی تیاریاں کرنے لگا۔ سلطان جلال الدین کے پاس پیغام بھیجا کہ "اکتیس ہاتھی اور گھوڑے اور بہت کچھ نقدی اور

زیورات وغیرہ دکن سے لایا ہوں اور یہ سب بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن حضور کی بغیر اجازت چلا گیا تھا، اِس سبب جہاں پناہ کی ناراضگی کا خوف ہے۔ اگر حضور ایک معافی نامہ ارسال فرمائیں تو اطمینان ہو جائے"۔ بادشاہ نے اپنے دو خاص درباریوں کے ذریعے علاءالدین کے نام ایک خط بھیجا۔ جس میں اپنے خلوص اور محبت کا اظہار کیا۔ علاءالدین نے خط لے کر اُن دونوں درباریوں کو قید کر دیا۔ اور پھر ایک عرضی بادشاہ کی خدمت میں بھیجی۔ اُس میں تحریر کیا کہ "اگر حضور میرے گناہ معاف کرنے کی نظر سے کڑہ مانک پور تک تنہا تشریف لے آئیں تو میں حضور کی قدمبوسی حاصل کروں۔ ورنہ اسی غم میں جان دے دونگا۔ یا اپنی بدنصیبی پہ روتا ہوا جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف نکل جاؤنگا"۔ جلال الدین بہت ہی سیدھا آدمی تھا اُس نے یہ بھی منظور کر لیا۔ علاءالدین اپنی فوج لے کر کڑے سے چلا۔ دریا کو عبور کیا اور مانک پور پہونچا۔ بظاہر تو اپنے بھائی الماس بیگ کو بادشاہ کے استقبال کے لئے روانہ کیا لیکن تاکید کر دی کہ جہاں تک ممکن ہو بادشاہ کو تنہا میرے پاس لانا۔ اُدھر سے جلال الدین بھی کڑے مانک پور کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ جب گنگا کے کنارے کڑے کے حدود میں پہونچا تو رمضان کی سترہ تاریخ تھی۔ اور سلطان کا سترہواں روزہ تھا۔ علاءالدین کی فوجیں دریا کے دونوں کناروں پر پرے جمائے مسلح کھڑی تھیں۔ مگر جلال الدین ایسا سادہ لوح تھا کہ فوجوں کو دیکھ کر بھی معاملہ کو نہ سمجھا۔ وہ سمجھا تو بس یہ سمجھا کہ میری پیشوائی کے لئے علاءالدین کی فوجیں آئی ہیں۔ اُس وقت الماس بیگ نے بڑھ کر بادشاہ سے عرض کیا "اگر حضور آج اور ادھر تشریف نہ لاتے تو علاءالدین حضور کی ناراضگی کا خوف کھا کر آوارہ وطن ہو جاتا اور اب بھی اُسکا دل حضور کے دبدبے اور غصے کے خوف سے تھرا رہا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ جب اس قدر فوج جو حضور کے ساتھ ہے دیکھیگا تو علاءالدین دہشت کھا کر بھاگ جائیگا۔ میری تو حضور سے درخواست ہے کہ فوجیں یہیں رہیں اور صرف حضور کی کشتی مانک پور چلے۔ بادشاہ اُس وقت قرآن شریف پڑھ رہا تھا۔ الماس بیگ نے جو کچھ کہا، اُس نے فوراً منظور کر لیا۔ چنانچہ سلطان کی کشتی مانک پور کو چلی اور تقریباً چار بجے دن کے مانک پور پہونچ گئی۔ بادشاہ گنگا کے کنارے کشتی ہی میں تھا کہ علاءالدین مع چند ہمراہیوں کے کشتی میں بیٹھ کر قدمبوسی کے لئے بڑھا اور جب بادشاہ کی کشتی کے برابر پہونچا تو بادشاہ کے قدموں پر گر پڑا۔

بادشاہ نے اُٹھا کر پیار کرنا شروع کیا اُسکی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "بیٹا علاء الدین تمہاری محبت میرے دل میں سب عزیزوں اور رفیقوں سے زیادہ ہے۔ کیونکر ہو سکتا ہے کہ میں تم سے ناراض ہوں؟ ابھی تک تمہارے پیشاب کی بو بھی میرے کپڑوں سے نہیں گئی ہے"۔ بادشاہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ علاء الدین نے اپنے ایک سپاہی محمود بن سام ساکن سامانہ کو اشارہ کیا اس نے فوراً سلطان جلال الدین پر تلوار کا وار کیا۔ سلطان کا سر کٹ کر دریا میں گر پڑا اور تن کشتی میں رہ گیا۔

"آئینہ اودھ" نے "ظہور قطبی" اور "ملفوظات خواجہ کرک" کے حوالے سے ایک اور روایت لکھی ہے جسکی تائید "تاریخ فرشتہ" سے بھی ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب علاء الدین دیوگڑھ سے فتح پا کر کڑے واپس آیا۔ تو بادشاہ کے ڈر سے کڑے کے ایک کامل مرشد اور ولی خواجہ کرک اللہ کے پاس اکثر جایا کرتا تھا اور اُن سے مدد چاہتا تھا۔ ایک روز خواجہ نے علاء الدین کو بادشاہت کی مبارکباد دی۔ اور یہ اشعار پڑھے۔

مرحبا اے بادشاہِ دہلوی　　گشت مغلوبِ ترا خصمِ قوی

من ترا دادم سریرِ سلطنت　　بر زدم بر خاکِ تاجِ دشمنت

یعنی اے علاء الدین! تیرا نصیبہ جاگا، تو دہلی کا بادشاہ ہو گیا۔ میں نے تجھے تخت بھی دیا اور حکومت بھی۔ اور تیرے دشمن کے تاج کو میں نے خاک میں ملا دیا۔ اور پھر خواجہ نے دشمن کے قتل ہو جانے کی یوں خبر دی۔

ہر کہ آید بر سرِ جنگ　　تن در کشتی سر در گنگ

یعنی اے علاء الدین جو تجھ سے جنگ کرنے کیلئے آرہا ہے وہ قتل ہوگا۔ اُس کا سر تو کٹ کر دریائے گنگا میں جا پڑیگا اور دھڑ کشتی میں رہ جائے گا[1]۔ جلال الدین کا سر دریا میں بہتا ہوا ایک مقام پہ

---

[1] اگرچہ تاریخ کی اکثر کتابوں میں جلال الدین کے قتل کا واقعہ اس طرح لکھا ہے کہ وہ دریا کے کنارے کشتی سے اُترا اور خشکی میں قتل کیا گیا مگر ہمعصر اور ولی کے اشعار جو اوپر درج کئے گئے ہمارے بیان کو سچا ثابت کر رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ جلال الدین کشتی میں قتل کیا گیا۔ یہ ممکن ہے کہ خواجہ صاحب نے نظم میں جواب نہ دیا ہو اور یہ شعر اُن کے نہ ہوں۔ اور بعد میں بنا دیئے گئے ہوں لیکن خواجہ صاحب نے ایسی پیشین گوئی کی ضرور تھی۔ مجھے خواجہ صاحب کے مفصل حالات معلوم کرنے کی بڑی لگن ہے۔ آئینہ اودھ میں جو کچھ ہے وہ ناکافی ہے۔ چنانچہ گذشتہ ہولی کی تعطیل میں (صفحہ ملاحظہ ہو)

گم ہوگیا۔ اسی وجہ سے اس مقام کا نام گُمسرا پڑگیا جو بعد میں کھمسرا مشہور ہوا اور تاج پانی میں بہتا ہوا دریا کے دوسرے کنارے پر پہونچ گیا۔ اور وہاں چند ملّاحوں کے ہاتھ آیا۔ وہ خوش خوش اُسے علاء الدین کی خدمت میں لے کر آئے۔ علاء الدین نے اُسکے صلے میں گنگا پار کی زمین کو جہاں تاج ملا تھا انہیں ملّاحوں کو معافی میں دے دی۔ اس وجہ سے وہ مقام تاج ملّاح کے نام سے مشہور ہوگیا۔ کھمسرا[1] اور تاج ملّاح دونوں مقام اب بھی موجود ہیں اور انہیں ناموں سے مشہور ہیں۔

اس بات کی تائید امپیریل گزیٹیر[2] سے بھی ہوتی ہے۔ قابل مؤلف نے لکھا ہے کہ سلطان جلال الدین خلجی کھمسیا کے گاؤں میں دفن کیا گیا جو مانک پور سے ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔" معلوم ہوتا ہے کہ کھمسیا وہی جگہ ہے جو اب کھمسرا کے نام سے مشہور ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷) کچھ وقت ملا تو دریافت کرتا ہوا مانک پور پہونچا۔ اور وہاں سے بذریعہ کشتی گنگا کے کچھ حصے کو عبور کرکے کڑے میں داخل ہوا۔ پہلے دریا کے کنارے مزار حضرت خواجگی علیہ الرحمہ کو دیکھا جس سے جناب سید کبیر الدین احمد رئیس کڑہ کا پتہ چلا۔ سید صاحب حضرت خواجگی علیہ الرحمہ کی اولاد میں سے ہیں۔ پھر میں نے خواجہ صاحب کے مزار کی زیارت کی۔ مزار بہت بڑا اور پر رونق ہے۔ تقریباً ۱۰ فٹ لمبا اور ۵ فٹ چوڑا مستطیل بنا ہوا ہے۔ اس پر چھپتا ہے جو سولہ کھمبوں پر قائم ہے۔ قبر مبارک پر ایک چادر پڑی رہتی ہے۔ مزار پر ایک مجاور موجود تھا معلوم ہوا کہ کافی پور اور ترین پور کے گاؤں مزار کے انتظام کے لئے شاہی زمانہ سے معافی میں دئیے گئے ہیں۔ کڑے میں خواجہ صاحب "خواجہ کڑک" مشہور ہیں۔ خواجہ صاحب کا نام نامی سید احمد سبزواری تھا۔ کڑے آنے کے بعد "شاہ کڑک" غالباً اس سبب سے مشہور ہوگئے کہ آپ کی آواز کرخت تھی۔

[1] کھمسرا مانک پور سے دو میل کے فاصلے پر شیخ اظہر حسین صاحب رئیس پریانواں ضلع پرتاب گڑھ کی زمینداری میں ہے۔ اور وہیں دریا کے کنارے قبر بھی ہے جسے کھمسرا کے کسان اب تک بادشاہ کی قبر بتاتے ہیں میں وہاں گیا۔ کڑے اور مانک پور کے درمیان دریا کے کنارے قبر کو دیکھا اور محکمۂ آثار قدیمہ کی توجہ اس طرف مبذول کرا دی۔

[2] Imperial Gazetteer.

سلطان محمد تغلق عادل شاہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

(مشیر احمد صاحب علوی بی اے - (علیگ)

باب پنجم

شہنشاہ کے عمدہ تدابیر

ملک میں بظاہر کوئی بے چینی کے آثار نہ تھے۔ شہنشاہ نے حکم دیا کہ دوآب کا ملک چونکہ بہت زرخیز ہے اس لئے ہنگامی ضرورتوں کے لئے وہاں مزارعین و زمینداروں سے ایک مناسب رقم لے لی جائے۔ آسودہ حال رعایا نے سرکشی کی۔ اور بالخصوص ہندوؤں نے جو مرفہ حال اور اہل دول تھے انہوں نے سرکشی کی۔ عادل سلطان نے پہلے تو چشم پوشی کی لیکن جب ان باغیوں نے افواج سلطانی پر شبخون مارنا شروع کیا تو مجبوراً تادیب و گوشمالی کا حکم دیا گیا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں دہقانوں نے اپنی جبلّی شرارت سے کھلیانوں (خرمنوں) میں آگ لگادی اور خود جنگلوں میں جاکر روپوش ہوگئے اور راہ گیروں کو دق کرنا شروع کردیا۔ اب مجبوراً سلطان نے عنانِ خیال اس طرف موڑی اور امن و امان کی خاطر ان امن سوز افراد کو سزا دینے کا ارادہ کیا۔ جس کے لئے آج وہ بیسویں صدی میں بدنام ہے۔

حکومت کا اولین فرض یہی ہے کہ وہ اپنی رعایا پر حکومت کرے اور امن و امان کی محافظ رہے۔ قطاع الطریق اور باغیوں کو سزائیں دے۔ اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو ایک دن بھی حکومت قائم نہیں رہ سکتی اور خصوصیت سے آٹھویں صدی کے ابتدائی عشرہ میں جبکہ حریت کے جذبات ہنوز

زندہ تھے۔ اور مردہ شخص جو گھوڑے پر سوار ہو کر نیزہ بازی کر سکتا شمشیر چلا سکتا سلطان بنجانے کا اہل تصور کیا جاتا تھا

"ہندوان خرمنہاے غلہ را آتش می زدند و می سوختند۔ و مواشی را از خانہ ہا بیرون می کردند۔ و سلطان ستدارار و فوجداراں را فرمودہ تا دست در نہب و تاراج زدند۔ بعضے فوطان و مقدمان می کشتند و بعضے را کور می کردند۔ و اناں کہ خلاص می یافتند جمعیتہا می کردند۔ و در جنگلہا می خزیدند و ولایت خراب می شد۔ و ہمدراں ایام سلطان محمد تغلق بر طریق شکار در ولایت برن رفت[1]"

یہاں پر ایک لطیف سوال پیدا ہوتا ہے کہ دواب کس کو کہتے ہیں؟ دواب سے ہمیشہ گنگ و جمن کا دوابہ مراد لیا جاتا ہے۔ مگر یہ خیال رہے کہ صوبہ میان دواب کا مفہوم ہر زمانہ میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس زمانہ میں صوبہ میان دواب وہ وسیع علاقہ کہلاتا تھا جو مشرقی جانب گنگا اور مغربی جانب ستلج سے محدود تھا۔ اسکی شمالی حد ہمالیہ اور جنوبی حدود خط تھا جو قنوج سے آگرہ ہوتا ہوا راجپوتانہ کو خشک بے آب و گیاہ ریگستان تک چلا جاتا ہے۔ اس صوبہ میں ہندو راجپوتوں کی آبادی تھی جو اپنے حسن صورت اور شجاعت کے لئے مشہور تھے۔ جنکی خواتین کی بہادری و قربانیوں کے لاثانی افسانوں سے ریگستان کا ذرہ ذرہ شاہد ہے۔ اسی خطہ میں شریر اور خودسر قبائل کی مذکورہ بالا شرارت سے صوبہ میان دواب کا وہ خطہ جو دہلی سے جنوب و مشرق کی جانب برن (بلند شہر) سے قنوج و ڈلموتک پھیلا ہوا ہے زیادہ پامال ہوا۔

دواب میں جو مالگذاری پر اضافہ کیا گیا تھا وہ یہ تھا۔

"خراج ولایت میان دواب یکے بہ دہ و یکے بہ بست میباید شد[2]"

جسکا مفہوم یہ ہے کہ دس گنا و بیس گنا اضافہ ہوا تھا جو قطعاً افترا ہے۔ یہ فقرہ لغو کی حیثیت تک

---

[1] فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

مختصر تغلق نامہ ــــ احمد عمرو قلمی ــــ گیان پور ــــ مسلم سوسائٹی علی گڈھ

[2] فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

پہونچ گیا ہے۔

میرے خیال میں اس کا مقصد یہ ہے کہ یا یا اضافہ ہنگامی ضروریات کے لئے کیا گیا تھا۔ ایلیٹ (Elliot) نے بھی ۵ فی صدی یا زیادہ سے زیادہ دس فی صدی اضافہ تسلیم کیا ہے۔ اور یہ قرین قیاس بھی ہے جو ایک زرخیز ملک کے وسائل آمدنی کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ نہیں ہے اور اس اضافہ سے مزارعین پر کوئی خاص نمایاں اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ اسکے خلاف آج کل سائیکل ٹیکس۔ ٹرمنل ٹیکس۔ کتا ٹیکس۔ جانور ٹیکس۔ گھر وارہ وغیرہ وغیرہ۔ خدا معلوم کس قدر ٹیکس فی کس ادا کرنا پڑتے ہیں اور کوئی مورخ اُن کو بُرا نہیں کہتا بلکہ ملک کی عمرانی اور معاشرتی تعمیر کے لئے ان ٹیکسوں کو لازمی و لابدی تصور کیا جاتا ہے۔

باعظمت سلطان برن سیر و شکار کے لئے گیا ہوا تھا لیکن وہاں جا کر بغاوت کا حال سُنا تو متمردین کی گوشمالی کا ارادہ کیا۔ اور سزا دی۔ ایک طرف بغاوت فرو ہوئی تھی کہ سرکار قنوج میں شورش کے آثار رونما ہوئے لیکن شریر سُن چکے تھے کہ سلطان برن کے جنگلوں میں شکار کھیلنے کے لئے آیا ہوا ہے اور وہیں سرکشوں کو کافی سزائیں بھی دے چکا ہے۔ اس لئے وہ سب جنگلوں میں روپوش ہو گئے جب سلطان قنوج پہونچا تو اس نے باغیوں کی جستجو میں آدمی دوڑائے جب یہ متیقن ہو گیا کہ یہ شریر جنگل میں پوشیدہ ہیں اپنی فوج کو جنگل کے محاصرہ کا حکم دے دیا۔ جو حقیقتاً مجرم تھے اُن کو گرفتار کر کے عدالت میں اُن پر باقاعدہ مقدمات چلائے گئے اور سزائیں دی گئیں۔ اور جو خون و قتل کے مجرمین تھے اُن کو قتل بھی کیا گیا۔ اس میں کسی قسم کی رو و رعایت نہ کی گئی ——— برنی نے اس واقعہ کو بہت مستم بالشان طریقہ سے مختلف رنگ آمیزیوں سے بیان کیا ہے۔ ایک تاریخ میں ایک جگہ یہ اشتباہ بھی پایا جاتا ہے کہ برن اور قنوج کے فسادات میں ضیاءالدین برنی کے اعزہ و احباب نے بھی حصہ لیا تھا۔

باعظمت سلطان شعبان (جون) ۷۴۲ھ میں قنوج و ڈلمو کے مفسدوں کی تادیب واقعی کے بعد دارالخلافت واپس چلا گیا۔ ابن بطوطہ نے بھی اسی قسم کا آدمیوں کے شکار کا افسانہ تراشا ہے۔ جسکی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ جو سراسر لغو اور بے بنیاد ہے۔ کیا آج کل دور حاضرہ کے متمدن اقوام میں مالگذاری وصول کرتے وقت کوئی رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے؟ - اکثر

بدقسمتوں کو باوجود خوشامدوں کے جیل جانا پڑتا ہے۔ جائدادیں نیلام ہوتی ہیں۔ غرض کہ کیا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ اُس دورِ جہالت کے متعلق کچھ بھی کہنا عبث اور لاحاصل ہوگا۔ کیونکہ وہ ہر آئینہ دورِ حاضرہ کے مقابلہ میں لاسلکی ۔ تار ۔ برقی روشنی ۔ نشر الصوت ۔ ہوائی جہازوں اور مشین گنوں کی برکات سے یقیناً محروم تھا !!!

حقیقت یہ ہے کہ اب تک کسی نے اس بدنصیب شہنشاہ پر قلم اُٹھانے کی ہمت ہی نہیں کی اگر کسی نے کچھ لکھا بھی تو اُسکے خلاف ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ابھی تک باوجود اس قدر تحقیقات و انکشافات کے عالمگیر ذوق و شوق کے بھی سلطان محمد تغلق کے حالات زندگی ابھی تک بالکل ظلمت و تاریکی میں ہیں۔ مورخین نے اسکے صفات حمیدہ کی طرف توجہ تک بھی نہ کی۔ بلکہ جب کبھی انہوں نے اسکے زمانہ کی تاریخ پر قلم اُٹھایا تو اُسکو متضاد صفات کا مجموعہ بناکر عوام کے سامنے پیش کردیا کہیں وہ ظالم و بے رحم ہے کہیں دیوانہ اور کہیں اُسکے دماغ میں جنون۔ غرضکہ مختلف عیوب نکالے گئے ہیں۔

سلطان محمد تغلق پر اسکے مہربان مورخین نے جو الزامات عائد کئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اُنکی تشریح سے پہلے میں اس امر کا انکشاف کروں جسکی بنا پر مورخین کو اُسکی شکایت کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آگیا ہے۔

محمد تغلق کے عہد حکومت میں ہندوستانی دو جماعتیں تھیں جو زمام سلطنت کو متضاد سمتوں میں کھینچ رہی تھیں۔ ایک جماعت اُن افراد کی تھی جن کا خیال تھا کہ ہندو یا مسلمان پارسی یا یہودی جو بھی حکومت کے فرائض انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو، اچھے سے اچھے عہدے پر جسکو وہ بخوبی نباہ سکتا ہو مقرر کیا جائے۔ اس جماعت کا سب سے بڑا رکن یا صدر خود سلطان محمد تغلق تھا۔ وہ نہ ہندوؤں کا پرستار تھا نہ مسلمانوں کا غلام، نہ ملکیوں کا طرفدار نہ غیر ملکیوں کا دشمن۔ کابل و ایران کے غیر ملکی اور ہندو اور دکن کے ملکی، خواہ کسی ملت کے پیرو ہوں اسکی نگاہ میں بالکل برابر تھے۔ ہر شخص کو اُسکی استعداد کے مطابق کاروبار سلطنت میں حصہ دیا جاتا اور اُس سے سرکاری خدمت لی جاتی تھی۔ دوسری جماعت اُن غیر ملکیوں کی تھی جو چاہتے تھے کہ جس قدر طرفداری ممکن ہو وہ پردیسی مسلمانوں کے ساتھ برتی جائے اور خطرناک ہندیوں کو ملک کے کسی انتظام میں حصہ دیا جائے۔ اسی جماعت کے ہواخواہوں و نمک خواروں میں سے برنی بھی ہے۔ جو بدقسمتی سے محمد تغلق کے عہد کا سب سے زیادہ معتبر مورخ مانا جاتا ہے۔

"ولیکن قلم درکفِ دشمن است"

(باقی آئندہ)

تعینِ اصطلاحات کا طریقہ

(محمد فخرالزماں صاحب بی۔ اے)

ہماری زبان کی سب سے بڑی کمزوری جیسا کہ عام خیال ہے تکوینی نہیں بلکہ تدوینی ہے۔ دوسرے لفظوں میں علمی اور خالص ادبی نقطۂ نظر سے جو تنگی اُردو میں محسوس کی جاتی ہے اُسکا سبب محض لغات کا قحط نہیں ہے بلکہ اُن میں کسی قسم کے تعین و انتظام کا فقدان۔ الفاظ کے ذخیروں پر نظر کیجیے تو ہماری زبان کچھ ایسی زیادہ مفلس نہیں لیکن مفاہیم کے دائروں میں فکر کو پھرائیے تو یکسر اختلال و بدنظمی سے اکثر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ایک لفظ جو اصطلاحاً صرف ایک خاص مفہوم کے ادا کرنے پر قادر ہو سکتا تھا توڑ مروڑ کر دوسرے معانی کا بھی ترجمان بنایا گیا ہے۔ دوسری طرف اس سے بھی زیادہ ادبی بدسلیقگی "اسراف بیجا" کی صورت اختیار کرتی ہے یعنی ایک ہی مطلب کے لئے مختلف موقعوں پر مختلف لفظوں سے کام لیا جاتا ہے۔ گویا ان میں کوئی فرق کوئی امتیاز نہیں ہے۔ مصنف مترادف الفاظ کا ڈھیر دیکھکر اپنی قوت تمیزی کھو بیٹھتا ہے اور انھیں جا بیجا استعمال کرتے وقت اُسے یہ خیال نہیں رہتا کہ کسی زبان میں دو لفظ حقیقتاً ہم معنی نہیں ہو سکتے خواہ بظاہر کتنے ہی ملتے جُلتے کیوں نہ ہوں۔ دونوں کے معانی میں باریک سہی فرق ضرور ہوگا۔ غرض یہ کہ ہمارے خزانے میں انمول جواہر ریزوں کی کمی نہیں لیکن ہم محل استعمال سے ناواقف ہونے کے باعث اُن کی قدر نہیں جان سکتے۔

اس نقص کا احساس سب سے پہلے اُس شخص کو ہوتا ہے جو اُردو میں کوئی علمی مضمون یا ادبی مضمون علمی اصول سے لکھنے بیٹھتا ہے۔ بیشتر موقعوں پر اصطلاحات معین نہ ہونے سے اُسکا ایک لفظی خلفشار میں مبتلا ہو جانا ناگزیر ہے۔ عموماً اس مشکل کے حل کے دو طریقے ہوتے ہیں۔

(۱) اکثر تو یہ دیکھا گیا ہے کہ وہی غیر ذمہ دارانہ روش جسکا ذکر اوپر آچکا ہے وہ بھی اختیار کرنے پر

مجبور ہو جاتا ہے اور اس طرح ہماری زبان میں وہ اضافہ جو مختلف اصطلاحات کی صورت میں ہونے والا تھا اور جس کی اس ارتقائی دور میں سخت ضرورت ہے اُس کی تصنیف کے ذریعے نہیں ہو سکتا۔

(۲) لیکن جب کبھی اس قسم کا کوئی بڑا کام آ پڑتا ہے تو یہ تدبیر کارگر نہیں ہوتی اور مصنف کو مقبول عوام طرز چھوڑ کر اپنی "لفظ تراشی" کی قابلیت پر اعتماد کرنا ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آج کل جو کتابیں علمی موضوعوں پر لکھی جاتی ہیں اُن کے آخر میں اصطلاحات کی ایک فرہنگ شامل ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس زمانے میں علمبرداران علم و روشنی اہل مغرب ہیں اور ہمارے ماخذ انگریزی اس لئے اس فرہنگ میں ہر لفظ کے سامنے اُس کا انگریزی مرادف لکھ دیا جاتا ہے تاکہ نئے وضع کئے ہوئے لفظ کا اصلی مفہوم سمجھنے میں پڑھنے والے کا ذہن بھٹکتا نہ پھرے۔

اس میں شک نہیں کہ اس طریقے کو رواج دینے والی جماعت اب تک اُردو کی مختلف حیثیتوں سے بہت کچھ خدمت کر چکی ہے اور اُس کا احسانمند نہ ہونا ادبی اور اخلاقی ناسپاسی ہوگی لیکن جہاں تک اس خاص طریقے کا تعلق ہے مجھے کئی وجہوں سے اختلاف کی جرأت ہوتی ہے پہلی وجہ جس پر ہر شخص کی نظر فوراً جاتی ہے یہ ہے کہ کتاب پڑھتے وقت پڑھنے والے کو ہر نئے لفظ کے سمجھنے کے لئے بار بار فرہنگ الٹنی پڑتی ہے جس سے وہ پرسکون فضا اور یکسوئی جو سنجیدہ مطالعے کے لئے ضروری ہے قائم نہیں رہتی۔ برعکس اس کے پریشانی دماغ کا اچھا خاصا سامان ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح بہت سا قیمتی وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس طریقے کی حمایت میں کوئی ذی عقل شخص پڑھنے والے سے اس کی اُمید نہیں کر سکتا کہ ان تکلیفوں سے بچنے کے لئے وہ اصل کتاب شروع کرنے سے قبل فرہنگ کو حفظ کر لیگا۔

ممکن ہے یہ اعتراض اُس صورت میں باقی نہ رہے کہ بجائے آخر میں فرہنگ شامل کرنے کے ہر صفحے کے نئے الفاظ حاشیے پر نیچے لکھ دیئے جائیں لیکن مذکورہ بالا نقائص محض خارجی حیثیت رکھتے ہیں اور اس کا دفعیہ اس اعتراض کو نہیں مٹا سکتا جو اس طریقے کے داخلی پہلو پر عائد ہوتا ہے۔ یہ الفاظ کی ٹکسالی قیمت سے متعلق ہے۔ انجمن ترقی اُردو یا دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ارکان کی قابلیت جانچنا یا اُن کے کارناموں پر فرداً فرداً تنقید کرنا میری بحث سے خارج ہے۔ مجھے صرف اصولی بنا پر اس طریقے سے مخالفت ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ایک شخص کا فیصلہ بہت سے

لوگوں کے فیصلے کی نسبت زیادہ صائب نہیں ہو سکتا۔ اور وضع اصطلاحات کا کام ایسا نہیں جو ایک شخص یا چند اشخاص قابل اطمینان طور پر انجام دے سکیں خواہ وہ آکسفورڈ اور کیمبرج سے کتنی ہی سندیں لیکر نکلے ہوں۔ میرے خیال میں ہر نئی اصطلاح پر اُردو بولنے والی دنیا کے سرآوردہ اہل زبان کی مُہر تصدیق ثبت ہونا چاہیئے۔ الفاظ کے داخل یا خارج کرنے میں مطلق العنانی سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ اسکے لئے ضروری ہے کہ مسلّمہ یا دانوں کے ایک طبقے سے استصواب کیا جائے۔ کیونکہ بغیر اسکے نہ صحت الفاظ کا پورا یقین ہو سکتا ہے اور نہ انکا دائرہ اثر وسیع۔ ہمارے ملک میں اب بھی ایسے افاضل واکابر موجود ہیں جنھیں طنزاً "لکھنوی" یا "دہلوی" کہا جاتا ہے۔ جو "لکیر کے فقیر" یا "دقیانوسی خیال کے لوگ" سمجھے جاتے ہیں۔ اور جن کو اس قسم کے مشورے میں شریک کرنا علوم جدیدہ کی توہین کرنا ہے۔ اگر تعصب کی عینک اُتار کر رکھدی جائے تو اسی گروہ میں وہ حضرات ملیں گے جو علم اللسان کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ زمانۂ حال کی رو سے کافی متاثر ہو چکے ہیں جنھوں نے انگریزی زبان اور جدید علوم میں بھی تھوڑی بہت مہارت پیدا کرلی ہے اور جو ہماری سرگرمیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں لیکن یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ انکی قابلیت سے مستفید ہونا کفر سمجھا جاتا ہے۔

میرے نزدیک بہترین اصول یہ ہوگا کہ اصطلاحات وضع کرنے والے حضرات موضوعہ الفاظ اور انگریزی مترادفات کی فہرست اُردو کے کسی ممتاز رسالے میں شائع کراکے پہلے اہل زبان کی رائے طلب کیا کریں۔ اس موقعہ پر ان مستند ادیبوں اور فاضلوں کا فرض ہوگا کہ اپنے مفید مشورے سے دریغ نہ کریں۔ یہ لوگ اختلاف کی صورت میں اُسکے وجوہ لکھیں گے اور ناپسندیدہ الفاظ کا بدل تجویز کرینگے۔ اس طرح استفسار کرنے والے کے سامنے بہت سے نئے الفاظ آجائیں گے جن میں سے اُسے انتخاب کا اچھا موقع ملیگا۔ وہ سب سے زیادہ موزوں الفاظ چن لیگا۔ پھر اُس کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اپنے فیصلہ کو خواہ انجمن ترقی اُردو کے شعبۂ متعلقہ یا اس نوعیت کے کسی اور بورڈ کے سامنے پیش کردے۔ اُن لوگوں کے نزدیک اگر کوئی لفظ نامناسب یا غلط ہو تو اُس پر واضع اصطلاح سے زبانی یا بذریعۂ خط و کتابت بحث کرلیں اور اسکے مطابق ضروری ردّ و بدل کردی جائے۔ اس کاٹ چھانٹ اور چھان بین کے بعد جو اصطلاح آخری بار مقرر ہو اُس سے آئندہ رسائل کے ذریعے

پبلک کو روشناس کر دینا چاہئیے۔ تاکہ لوگ اُس کا استعمال آزادی کے ساتھ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اسکے بعد پھر فرہنگ کی حاجت باقی نہ رہیگی۔

اس میں کئی فائدے ہیں۔ مثلاً ذمہ داری تمام تر ایک ہی شخص کے سر نہ ہوگی، غلطی کا احتمال کم ہوگا، اور سب سے بڑا فائدہ جو ہمارا مقصود اصلی ہے یہ ہوگا کہ اکثر علماء کی تائید حاصل ہونے کی وجہ سے "زیادہ صحیح ہونے کی وجہ سے اور "عام سلامتی طبع" سے قریب تر ہونے کے باعث ان الفاظ کو عام مقبولیت حاصل ہوجائیگی اور لوگوں کی زبانوں پر وہ حکومت کرنے لگیں گے ہماری زبان کی رفتار ترقی حال سے کہیں زیادہ تیز ہوجائیگی، اور عجب نہیں کہ اس طرح بہت جلد وہ رکاوٹیں جو اردو کے علمی زبان بننے کے راستے میں حائل ہیں دُور ہوجائیں۔

یہاں ایک اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ اس میں بڑی طوالت اور دقت ہے، بیشک یہ طریقہ صبر آزما ہے اور اس میں وقت زیادہ لگے گا لیکن کام کی اہمیت دیکھتے ہوئے اور فوائد کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ اعتراض کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اس تجویز کو کامیاب بنانے کے لئے مدیر رسالہ کے تعاون کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ وسیلہ ہوگا اظہار آراء کا اور ذریعہ ہوگا افراد متعلقہ کے درمیان رشتۂ اتحاد قائم کرنے کا۔

میں اپنی تجویز کی عملی اعانت کے سلسلے میں یہاں مثال کے طور پر چند الفاظ جو ایک حد تک ہم معنی کہے جاسکتے ہیں لکھتا ہوں۔ اُردو میں افسانے سے متعلق بہت سے لفظ ہیں۔ مثلاً قصہ، کہانی، داستان، سرگزشت وغیرہ جنہیں درحقیقت افسانے کی مختلف قسموں کے لئے مقرر ہوجانا چاہئے لیکن ان کے استعمال میں بہت کم امتیاز کیا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگریزی الفاظ فکشن (Fiction) فیبل (Fable) اسٹوری (Story) وغیرہ کے مقابل ہیں۔ ہم کو کوئی مخصوص اور معین لفظ اُردو میں نہیں ملتے میں نے اس طرح کے قریب قریب سب الفاظ یکجا کر دیئے ہیں اور ان کے مفہوم کے تعین و تحدید کے لئے پہلے انگریزی لفظ اور اسی کے سامنے اس کا اُردو مرادف جو میرے ذہن میں سب سے زیادہ موزوں ہوسکتا تھا درج کر دیا ہے۔ امید ہے کہ ملک کے فاضل ادیب ان پر غور کریں گے اور اس طرح

مجوزہ کام کو شروع کر کے اپنی زبان کی خدمت کا فخر حاصل کرینگے۔

(۱) افسانہ		(1)	Fiction
(۲) اساطیر		(2)	Mythology
(۳) حکایت		(3)	Fable
(۴) روایتی قصّہ		(4)	Legend
(۵) کہانی		(5)	Tale
(۶) قصّہ		(6)	Story
(۷) داستان		(7)	Romance
(۸) ناول		(8)	Novel
(۹) مختصر افسانہ		(9)	Short-story

غزل حضرت کوکب شاہجہانپوری

اہلِ ہوس کی تنگیٔ دل دامن میں تھی
دُنیا فریبِ لذتِ کام و دہن میں تھی

گلچیں کا خوف اور نہ اندیشۂ خزاں
یعنی نمودِ فطرتِ اہلِ چمن میں تھی

برباد کر دیا دلِ آوارہ گرد نے
ورنہ نشاطِ روح تو اُس انجمن میں تھی

ظاہر پرست اہلِ خرد کچھ کہیں مگر
معراجِ مستِ عشق تو دار و رسن میں تھی

اب تک وہی ہیں تارِ رگِ جاں کی جنبشیں
کیا بات لحنِ شاہدِ شیریں سخن میں تھی

کس طرح برقرار رہیگا جو رنگ ہے
وہ بات اب کہاں جو دلِ پُر محن میں تھی

گو حاصلِ کشاکشِ باہم تھا آئینہ
کیا کیجئے کہ لذتِ دل دامن میں تھی

محوِ وصال میں اپنی نظر کا قصور تھا
ورنہ نمودِ حُسن تو ہر پیرہن میں تھی

کوکب تمام عمر کٹی اضطراب میں
آشفتگی وہ عرصۂ دار المحن میں تھی

صیغۂ تعلیم کی بے پروائی

(گزشتہ سے پیوستہ)

(مولانا سید سبط الحسن صاحب فاضل ادب سابق لکچرار کرسچین کالج الٰہ آباد)

اساس[1] اردو کی غلطیاں

(۱) صفحہ ۷ میں فعل سے اسمائے کیفیت (حاصل مصدر) بنانے کے طریقوں میں لکھا ہے۔

(۲) امر کے دوسرے حرف کے بعد الف یا ی بڑھا کر جیسے چال، ٹال، میل۔

تنقید۔ امر کے دوسرے حرف کے بعد الف یا ی اگر بڑھائینگے تو مثالوں میں چلا، ٹلا، ملی، ہوگا۔ ان میں سے کوئی اسم کیفیت (حاصل مصدر) نہیں ہے۔ قاعدہ کچھ اور بتایا ہے۔ مثال کچھ اور دی ہے۔

(۲) اسی صفحہ میں اور اسی سلسلے میں اسم سے اسمائے کیفیت (حاصل مصدر) بنانے کے قاعدے میں ہے۔

(۳) اسم پر پن، ی، پا، پنا بڑھا کر جیسے لڑکپن، دوستی، دشمنی، بچپن، دیوانہ پن بچپنا، گنوارپنا، چھٹپنا۔ بڑھاپا۔ مٹاپا۔

تنقید۔ لڑک اور بچ کوئی اسم نہیں ہے جس پر پن بڑھا کر لڑکپن اور بچپن کیا گیا۔ یا پنا بڑھا کر بچپنا کیا گیا اور نہ چھٹ، بڑھا، مٹا کوئی اسم ہیں جس پر پنا بڑھا کر چھٹپنا یا پا بڑھا کر بڑھاپا یا مٹاپا کیا گیا۔

---

[1] یہ کتاب منشی کے امتحان میں بھی داخل ہے اور ہائی اسکول اگزامنیشن میں بھی ۱۲

(۳) صفحہ ۲۰ میں اسم آلہ کے بیان میں اسم سے اسم آلہ بنانے کا طریقہ بیان کیا ہے۔

(۲) اسم سے الف۔ نون۔ یل۔ کے اضافہ سے جیسے ہتوڑا۔ دنون۔ نکیل۔

تنقید۔ ہتوڑ۔ دنو۔ نک۔ کوئی اسم نہیں ہیں۔ جن پر الف۔ ن۔ یل۔ اضافہ ہوکر ہتوڑا۔ دنون۔ نکیل۔ اسم آلہ بنے۔ اصل میں اسم میں کچھ تغیر کرکے اور یہ علامات بڑھا کر اسم آلہ بناتے ہیں۔

(۴) صفحہ ۲۲ میں ہے۔

فائدہ۔ پیشہ وروں کے نام بھی اسم فاعل کہلاتے ہیں۔ جیسے نائی۔ درزی۔ بڑھئی۔ جولاہا۔ کنجڑا۔ کمہار۔ لوہار۔ دھوبی۔

تنقید۔ اسم فاعل مشتق ہوتا ہے اور یہ اسما کسی سے مشتق نہیں ہیں۔ لوہار اور دھوبی میں تو خیر کچھ اشتقاق کی صورت ہوسکتی ہے لیکن نائی۔ درزی وغیرہ مشتق نہیں ہیں۔ عربی میں پیشہ وروں کے نام بیشک اسم فاعل ہیں۔ کیونکہ سب مشتق ہیں اور صیغۂ مبالغہ کے وزن پر ہیں۔ جیسے خیاط۔ حجام۔ صباغ وغیرہ۔ اسی سے عربی میں اسم فاعل کہلاتے ہیں لیکن اردو میں اسم فاعل نہیں ہیں۔

(۵) صفحہ ۲۴ میں اسم مفعول کے بنانے کا یہ طریقہ لکھا ہے کہ ماضی مطلق کے صیغہ واحد مذکر کے آخر میں ہوا۔ ہوے۔ ہوئی۔ ہوئیں۔ لگانے سے بنتا ہے۔ جیسے لکھا ہوا۔ لکھے ہوے لکھی ہوئی۔ لکھی ہوئیں۔

تنقید۔ لکھے۔ لکھی۔ واحد مذکر کا صیغہ نہیں ہیں۔ ماضی کے صیغہ واحد مذکر پر ہوے۔ ہوئی۔ ہوئیں۔ لگانے سے اسم مفعول کے صیغے کیسے بنیں گے۔ وہ تو یوں ہونگے۔ لکھا ہوے۔ لکھا ہوئی۔ لکھا ہوئیں۔ جو بالکل مہمل ہیں۔ قاعدہ کچھ بیان کیا ہے مثال کچھ دی ہے۔

(۶) پھر صفحہ ۲۴ میں ہے

فائدہ۔ اسم مفعول اکثر فعل متعدی سے آتا ہے کبھی فعل لازم سے بھی آجاتا ہے۔ جیسے آیا ہوا۔ گیا ہوا۔ اٹھا ہوا۔ بیٹھا ہوا۔

تنقید۔ اسم مفعول فعل لازم سے آہی نہیں سکتا۔ ورنہ فعل لازم کی تعریف غلط ہو جائیگی۔ کیونکہ فعل لازم وہی ہے جو صرف فاعل کو چاہے جو مثالیں دی ہیں وہ کسی حالت میں اسم مفعول

نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ آیا ہوا یا تو اسم فاعل کے معنی دیگا۔ جیسے آئے ہوے نے کھانا کھایا۔ یعنی آنے والے نے۔ یا ہوا زائد ہو کر ماضی ہوگا۔ جیسے وہ آیا ہوا ہے۔ کیا ہوا لازم نہیں ہے اور اگر یہ گیا ہوا ہے تو اسکی حالت بھی آیا ہوا کی سی ہے۔ اُٹھا ہوا۔ بیٹھا ہوا اسم حالیہ ہیں۔ مصنف نے نقل کرنے میں غلط صحیح نہیں دیکھا۔ چونکہ مصباح القواعد میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی لہذا وہی نقل کردی۔

(۷) صفحہ ۲۵ میں اسم حالیہ کے بنانے کا یہ طریقہ بتایا ہے کہ مصدر کی علامت نا نکال کر ہوا۔ ہوے۔ ہوئی۔ ہوئیں۔ یا تا۔ تے۔ تی تیں۔ یا تا ہوا۔ تے ہوے۔ تی ہوئی تیں ہوئیں زیادہ کر دیتے ہیں۔ اور ہوا۔ ہوے وغیرہ کی مثال میں مرا ہوا۔ مرے ہوے۔ مری ہوئی۔ مری ہوئیں لائے ہیں۔

تنقید۔ مصدر کی علامت نا نکال کر ہوا وغیرہ لگانے سے جو الفاظ بنتے ہیں وہ مہمل ہوتے ہیں۔ اسم حالیہ نہیں ہوتے مثلاً مرہوا۔ مرہوے۔ مرہوئی۔ مرہوئیں۔ سب مہمل ہیں۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ تیں ہوئیں کسی صیغہ میں نہیں لگتا۔ بلکہ جمع مؤنث میں بھی تی ہوئیں لگتا ہے جب کہ خود مثال دی ہے یعنی کھیلتی ہوئی کھیلتی ہوئیں۔

(۸) صفحہ ۲۵ میں ہے۔ **فائدہ** ۔ ہوا۔ ہوے۔ وغیرہ نکالنے سے حالیہ تام بنتا ہے اور تا یا ہوا سے حالیہ ناتام۔

تنقید۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس میں سے ہوا یا تا یا تا ہوا وغیرہ نکالنے سے اسم حالیہ تام یا ناتام بنتا ہے۔ یہ مسئلہ بالکل مہمل ہے۔

(۹) بے جان کی تذکیر و تانیث لکھتے ہوے صفحہ ۴۳ میں لکھتے ہیں۔

۴۔ عربی الفاظ کی جمع جب قواعد کی رو سے آئے تو جمع ہر حالت میں لکھنو والوں کے نزدیک مذکر ہوگی چاہے واحد مذکر ہو یا مونث۔ جیسے شے کیفیت دلیل مؤنث ہیں۔ ان کی جمع اشیا۔ کیفیات۔ دلائل۔ مذکر ہیں۔ جیسے کیفیات سُنے گئے۔ دلائل قائم کئے گئے۔ اشیاء خریدے گئے۔ مگر معرفت حقیقت۔ مودت شفقت۔ مونث ہیں۔ انکی جمع معارف حقائق قویٰ۔ اشفاق۔ مذکر ہیں یہ اس قاعدے سے مستثنےٰ ہیں۔

تنقید۔ اوّل تو شے کی جمع اشیا مذکر نہیں ہے اور نہ کوئی شخص یہ بولتا ہے کہ اشیاء خریدے گئے۔ دوسرے گر سے جو استثنا کیا گیا ہے یہ بالکل مہمل ہے۔ اس لئے کہ جو الفاظ مستثنےٰ کئے گئے ہیں وہ مستثنےٰ نہیں ہیں بلکہ اُس قاعدے کے اندر ہیں۔

(۱۰) صفحہ ۳۵ میں ہے۔ ستاروں۔ سیاروں کے نام مذکر ہیں۔

تنقید۔ زہرہ۔ مشتری۔ برجیس۔ ناہید۔ مؤنث ہیں۔

(۱۱) صفحہ ۳۵ میں ہے۔ گنجفہ کی بازیوں کے نام۔ شراب کے نام سوائے بادہ کے مذکر ہیں۔

تنقید۔ غلط مسائل لکھنے میں مؤلف بہت جسور ہے۔ گنجفہ کی آٹھوں بازیوں کے نام مؤنث ہیں۔ اور شراب کے بھی سب نام مؤنث ہیں سوائے بادہ کے فارسی میں اور بھول کے اُردو میں کہ یہ دونوں مذکر ہیں۔

(۱۲) صفحہ ۳۶ قاعدہ ۲۰ میں۔ عربی مصادر جو مذکر ہیں وہ لکھے ہیں۔ اُسمیں توحید بھی ہے۔

تنقید۔ توحید مؤنث ہے۔

(۱۳) بے جان کی تذکیر و تانیث لکھتے ہوئے صفحہ ۳۲ میں لکھتے ہیں۔

۱۔ جن لفظوں کے آخر میں الف۔ یا ہ ہے۔ وہ اکثر مذکر ہونگے۔ اسکے مستثنیات میں لکھتے ہیں۔ عربی سہ حرفی الفاظ جن کے آخر میں الف ہو جیسے ادا۔ قضا۔ خطا۔ مؤنث ہیں۔

تنقید۔ یہ استثنا بطور کلیہ کے نہ ہونا چاہیے۔ ایسے بہت سے الفاظ مذکر ہیں۔ سُہا[1]۔ غنا۔ ربا۔ عصا۔ طلا۔ سما۔ وغیرہ۔

(۱۴) صفحہ ۱۴ میں ہے۔ ۲۹۔ جس لفظ کے آخر میں۔ ون۔ کار۔ س۔ ن۔ نی۔ ہو وہ مؤنث ہے۔

تنقید۔ لباس۔ قیاس۔ قرطاس۔ وسواس۔ نفس۔ جرس۔ ناقوس۔ جلوس۔ آبنوس۔ مکان۔ احسان۔ ایمان۔ خون۔ شگون۔ جنون۔ کھن۔ سالن۔ آنگن۔ سیکڑوں الفاظ ہیں جن کے آخر میں سین یا نون ہے وہ مذکر ہیں۔ شکار بھی مذکر ہے۔

(۱۵) صفحہ ۴۴ میں ہے۔ اُردو کی جمع کی چھ علامتیں ہیں۔ یائے مجہول۔ واو مجہول

---

[1] نام ستارہ۔ سُہا سُود

وَن - ؤں - آں - یں -

تنقید - چھ نہیں سات علامتیں ہیں - ایک یائے مجہول معہ ہمزہ و نون غنہ (ئیں) بھی ہے - چنانچہ اسی قواعد میں اکثر الفاظ کی جمع اِس علامت سے بنائی گئی ہے - ادائیں - جفائیں - مائیں - وغیرہ -

(۱۶) صفحہ ۵۰ میں - جمع بنانے کے عام قاعدے میں لکھا ہے کہ حروف مغیرہ کے آنے سے جمع واو مجہول اور نون غنہ سے بنتی ہے لیکن اگر اسم کے آخر الف یا ہٰ ہو تو حذف ہو جاتی ہے اس میں استثنا کیا گیا ہے کہ بعض اسم ایسے ہیں کہ ان میں الف یا ہٰ حذف نہیں ہوتی - اور وَن سے پہلے ایک ہمزہ زیادہ کر کے جمع بناتے ہیں - جیسے راجاؤں - دریاؤں وغیرہ -

تنقید - یہ مسئلہ صحیح نہیں ہے ہٰ ہمیشہ حذف ہو جاتی ہے خواہ بالکل حذف ہو جائے - خواہ حذف ہو کر الف سے بدل جائے - ایسی کوئی مثال نہیں دی کہ جس میں ہٰ ہو اور وہ حذف نہ ہوئی ہو - اگر راجا کے آخر میں ہٰ تصور کی جائے اُس وقت بھی مثال میں حذف ہو گئی ہے -

(۱۷) صفحہ ۵۱ میں مذکر کی جمع کے قاعدوں میں ہے -

۱ - جس اسم کے آخر میں الف یا ہٰ حالت فاعلیت میں آئے اُسکو یائے مجہول سے بدل کر بناتے ہیں - جیسے تماشا - تماشے الیٰ آخرہ - اسکے بعد چند مستثنیات لکھے ہیں - پھر لکھتے ہیں اور حالت مفعولیت میں یا جب حرف مغیرہ میں سے کوئی حرف اُسکے بعد آئے تو ہٰ یا الف کو حذف کر کے وَن سے جمع بناتے ہیں جیسے گھوڑوں کو - پردوں کو - نسخوں کو - شہروں میں - مُردوں کے ساتھ - بچوں نے -

تنقید - پہلی غلطی تو یہ ہے کہ حالت فاعلیت کی تخصیص نہیں ہے - حالت مفعولیت میں بھی پہلا قاعدہ جاری ہے مثلاً زید نے گھوڑے بیچے - لڑکے بلائے گئے وغیرہ - دوسری غلطی یہ ہے کہ حالت مفعولیت میں بغیر حرف مغیرہ آئے وَن سے جمع نہیں آتی - جو مثالیں اس ٹکڑے میں دی گئی ہیں وہ سب حرف مغیرہ کے ساتھ ہیں - اور عبارت یہ ہے کہ حالت مفعولیت میں یا جب حرف مغیرہ آئے حالانکہ حالت مفعولیت میں بغیر حرف مغیرہ کے ے کے ساتھ جمع آتی ہے نہ کہ وَن کے ساتھ جیسا کہ مثال سے دی گئی اور اگر ایسا ہوتا تو جمع کا عام قاعدہ

جو مصنف نے صفحہ ۵۰ میں بیان کیا ہے وہ غلط ہو جاتا۔ تیسری غلطی یہ ہے کہ شہر کی جو مثال دی گئی ہے یہ اس قاعدے کے اندر نہیں ہے۔ کیونکہ اسکے آخر میں نہ الف ہے نہ ہ۔

(۱۸) اسی سلسلے میں صفحہ ۵۲ میں ہے۔

۳۔ آخر میں عین ہو تو جمع کی صورت میں صرف عین سے پہلے زبر دیتے ہیں۔ جیسے مطلع۔ مصرع۔ مرقع۔ مطبع۔ حالت مفعولیت میں یا جب حروف مغیرہ میں سے کوئی حرف اسکے بعد آئے تو عین کو برقرار رکھکر اسکی جمع وآن سے لاتے ہیں جیسے مصرعوں کو مطلعوں کو۔

تنقید۔ حالت مفعولیت کی جو مثالیں دی گئی ہیں وہ سب حرف مغیرہ کے ساتھ ہیں۔ کیونکہ کو بھی حرف مغیرہ ہے اور خود مصنف نے بھی صفحہ ۴۸ میں اس کو حرف مغیرہ لکھا ہے۔ یہ مسئلہ بھی صحیح نہیں ہے۔ حالت مفعولیت میں بھی بغیر حرف مغیرہ کے جمع میں یا کسرہ دیدینگے یا اضافہ کردینگے۔ جیسے مطلعے پڑھے گئے۔ مصرعے لگائے گئے۔ دیکھیے مثالوں میں گو مطلع اور مصرع حالت مفعولیت میں ہیں لیکن جمع میں وآن نہیں اضافہ ہوا۔ مصنف کو یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ جمع کے عام قاعدے میں کیا لکھ آئے ہیں اور اب اسکے خلاف کیا لکھ رہے ہیں۔

(۱۹) اسی صفحہ میں اسکے بعد بھی جو مسئلہ بیان کرکے آخر میں یہ لکھا ہے:۔

"مگر حالت مفعولیت میں وہی نون زیادہ کردیتے ہیں" یہ بھی غلط ہے جب کہ اوپر کے مسئلے میں بیان کیا گیا کہ بغیر حرف مغیرہ آئے اسم خواہ حالت فاعلیت میں ہو خواہ حالت مفعولیت میں وآن سے اسکی جمع نہیں بنتی۔

(۲۰) مؤنث کی جمع بنانے کے قاعدے میں صفحہ ۵۳ میں لکھتے ہیں۔

۲۔ جن کے آخر میں یا ہو تو اُس میں صرف نون بڑھاکر جمع بناتے ہیں اور اسکے استثنا میں لکھتے ہیں "کہ غیر زبانوں کے الفاظ جن کے آخر میں یا ہے۔ اسکی جمع اس قاعدے سے نہیں بنتی۔ بلکہ وآن یا ئیں سے بنتی ہے جیسے دریا۔ حیا۔ سے دریاؤں۔ حیاؤں۔ حیائیں۔

تنقید۔ دریا مؤنث نہیں ہے بلکہ مذکر ہے اور یہ قاعدہ جمع مؤنث کے بنانے کا بتایا گیا ہے۔

(۲۱) پھر اسی سلسلے میں اسی صفحہ میں ہے۔

۳۔ اگر آخر میں واو یا الف یا واو یا نون ختم ہو۔ اور اسکے پہلے الف یا واو ہو تو ہمزہ

اور یائے مجہول اور نون غنہ زیادہ کرینگے جیسے خوشبوئیں۔ جوروئیں۔ جوئیں۔ صدائیں۔ بلائیں۔ ادائیں۔ جفائیں۔ فاحشائیں۔

تنقید۔ جتنی مثالیں دی گئی ہیں باستثنا رجوں کے اور کسی لفظ میں حرف آخر کے پہلے نہ الف ہے نہ واو۔ مصنف قاعدہ کچھ بیان کرتا ہے اور مثالیں کچھ دیتا ہے۔ اصل میں یہ دو مسئلے تھے جو ایک میں ملانے سے بالکل غلط ہو گئے۔

۱۔ اگر اسم مونث کے آخر میں واو یا الف یا ہ ہو تو اُس کی جمع ہمزہ مع یائے مجہول و نون غنہ یعنی (ئیں) کے بڑھانے سے بنتی ہے لیکن ہ الف سے بدل جاتی ہے جیسے خوشبوئیں۔ صدائیں۔ فاحشائیں۔

۲۔ اگر آخر میں نون غنہ ہو اور اُسکے پہلے الف یا واو ہو تو اُس کی جمع بھی (ئیں) بڑھانے سے بنتی ہے۔ لیکن نون غنہ اصل لفظ کا حذف ہو جاتا ہے جیسے ماں سے مائیں۔ جوں سے جوئیں۔

(۲۲) مؤنث کی جمع کے قاعدے صفحہ ۲۵ سے صفحہ ۲۶ تک بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے قاعدہ نمبر ۲ تا ۵ اکو مؤنث کی جمع سے کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ ان قاعدوں کی مثالوں میں بھی اکثر الفاظ ایسے ہیں جو مذکر ہیں۔

(۲۳) صفت ذاتی کے بیان میں صفحہ ۱۶ میں ہے۔

تنبیہ۔ بے فارسی اور غیر عربی علامت ہے۔ فارسی علامت فارسی لفظ پر اور عربی علامت عربی لفظ پر لگاتے ہیں۔ ہندی لفظ پر نہیں لگاتے۔

تنقید۔ جس قاعدے کے نیچے یہ تنبیہ لکھی ہے اُسی کی مثالوں میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ بے دھڑک۔ بے سُرا۔ بے جوڑ۔ کیا دھڑک۔ سُرا۔ جوڑ ہندی لفظ نہیں ہیں۔

(۲۴) صفحہ ۲۰ میں صفت ذاتی کے بیان میں ہے۔

۳۔ کبھی فارسی علامت عربی الفاظ پر لگا کر جیسے سعادت مند۔ سمجھ دار۔ لوچ دار۔

تنقید۔ مصنف کے نزدیک سمجھ۔ لوچ عربی الفاظ ہیں جو فارسی لفظ دار پر لگائے گئے ہیں۔

(۲۵) ضمیر اشارہ کے بیان میں صفحہ ۸۲ میں ہے۔

فائدہ۔ ضمیر اشارہ جب آنکھ کے سامنے ہو تو اشارت کرتے ہیں اور کبھی محذوف نہیں

ہوتی مگر یہاں جب ایک بار ذکر کر دی گئی تو کلام میں بار بار نہیں لاتے۔

تنقید۔ ضمیر اشارہ کبھی محذوف نہیں ہوتی۔ مشار الیہ جب سامنے ہوتا ہے تو محذوف ہو جاتا ہے۔ مثلاً بہت سے کپڑے سامنے رکھے ہوں تو کہیں گے کہ یہ اچھا نہیں یہ اچھا ہے۔ اس میں جو کپڑا مشار الیہ ہے وہ محذوف ہوا۔ اور یہ ضمیر اشارہ محذوف نہ ہوئی۔

(۲۶) پھر اسی صفحہ میں ہے۔ **فائدہ**۔ مشار الیہ کبھی مقدم بھی ہوتا ہے۔ جیسے

صبر و سکوں سے ہم کو یہ بھی نہیں میسر نہ دے ۔۔۔ تھوڑی سی رہ گئی ہے اے کاہش نہانی

تنقید۔ مثال غلط ہے۔ اس مثال میں یہ ضمیر اشارہ مقدم ہے اور عمر جو محذوف ہے وہ مشار الیہ موخر ہے۔

اسی طرح سے چھیانوے مسائل اور مثالیں غلط ہیں جن کے نوٹ میرے پاس موجود ہیں بخیال طوالت نہیں لکھے گئے۔ لیکن اس پر حصر نہیں ہو سکتا کہ اسی قدر مسائل غلط ہیں۔ ممکن ہے کہ میری نظر نہ پڑی ہو۔ کیونکہ الٹ پلٹ کر سرسری طور پر کتاب دیکھی گئی ہے۔ بالاستیعاب نہیں دیکھی گئی۔

قواعد اردو جمال الدین حصّہ سوم کی غلطیاں

(۱) کتاب بھر میں جمع غائب کے صیغوں میں وے کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ وے بیٹھے ہیں۔ وے بیٹھے تھے وغیرہ (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۹ سے صفحہ ۱۸۲ تک کی گردانیں) حالانکہ وے اردو میں بالکل مستعمل نہیں ہے۔ جمع غائب کے صیغوں میں بھی وہ مستعمل ہے۔ بجائے اسکے کہ قواعد سے بچوں کی زبان درست کی جائے اور خراب کی گئی ہے۔

(۲) جمع متکلم کے صیغوں میں تذکیر و تانیث کا کوئی فرق نہیں ہوتا اور بالاتفاق لکھنؤ اور دہلی کے فصحا کی زبانوں پر یکساں جاری ہیں یعنی مرد بھی کہتے ہیں کہ "ہم آتے تھے ہم بیٹھے تھے۔ ہم دیکھتے تھے" اور عورتیں بھی کہتی ہیں لیکن اس قواعد میں جمع مؤنث متکلم کے صیغے سب خلاف محاورہ لکھے گئے ہیں یعنی ماضی مطلق میں ہم بیٹھیں۔ ماضی بعید میں ہم بیٹھی تھیں۔ ماضی احتمالی میں ہم بیٹھی ہونگی۔ ماضی استمراری میں ہم بیٹھتی تھیں۔ غرض تمام فعلوں میں غلط صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ جس سے لڑکوں کی زبان خراب ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہوں گردانیں صفحہ ۱۴۹ سے صفحہ ۱۸۲ تک)

(۳) صفحہ ۵۲ میں ہے۔ ضمیر استفہام جس سے سوال کیا جاتا ہے اُسکے لئے دو لفظ موضوع ہیں۔ کون اور کیا۔ پہلا جان دار کے لئے ہے۔ دوسرا بے جان کے لئے۔ جیسے کون آیا۔ کیا مانگتے ہو۔

تنقید۔ اول تو صرف دو ہی لفظ ضمیر استفہام کے لئے موضوع نہیں ہیں بلکہ اور الفاظ بھی ہیں۔ کون سا۔ کاہے۔ کتنا۔ کے۔ دوسرے یہ غلط ہے کہ کون جاندار کے لئے مخصوص ہے بلکہ کون محض آدمی کے لئے مخصوص ہے اور کون سا علاوہ آدمی کے ہر جاندار وغیر جاندار کے لئے آتا ہے جیسے ان دو گلاسوں میں کون سا تمہیں پسند ہے۔ کون سا پیالہ ٹوٹا۔ کون سا گھوڑا لو گے۔ کیا محض غیر معمولی اشیا کے لئے مخصوص ہے۔

(۴) صفحہ ۱۶ میں اسم مصغر بنانے کے قاعدے میں لکھا ہے۔ کبھی اسم کے آخر یا بڑھا کر جیسے لوٹا سے لٹیا۔ آنکھ سے انکھیا۔ ڈبا سے ڈبیا۔ باٹ سے بٹیا۔ ہاٹ سے ہٹیا۔

تنقید۔ اسم کے آخر یا بڑھا کر اسم مصغر نہیں بناتے بلکہ اسم میں کچھ تغیر بھی کرتے ہیں۔ جیسا کہ مثالوں سے ظاہر ہے۔ لٹ۔ ڈب۔ بٹ۔ ہٹ۔ جن کے آگے یا بڑھا کر لٹیا۔ ڈبیا۔ بٹیا۔ ہٹیا۔ بنایا گیا ہے کوئی اسم نہیں ہیں۔

(۵) اسی اسم مصغر کے بیان میں صفحہ ۶۲ میں ہے کبھی اسم کے آخر میں الفاظ ری۔ ڑی۔ وا بڑھا کر جیسے پٹرا سے پٹری۔ پلنگ سے پلنگڑی۔ مرد سے مردوا۔

تنقید۔ پہلی مثال میں لفظ ری نہیں بڑھایا گیا بلکہ الف ی سے بدل گیا ہے اگر ری بڑھتا تو پٹراری ہوتا جو مہمل لفظ ہے۔

(۶) اسی سلسلے میں صفحہ ۶۲ میں ہے کبھی آخر میں یائے معروف بڑھا کر جیسے شیشہ سے شیشی۔ کونڈا سے کونڈی۔ ڈنڈا سے ڈنڈی۔ کڑاہ سے کڑھی۔ پتیلا سے پتیلی۔ پیالہ سے پیالی۔

تنقید۔ مثالوں سے ظاہر ہے کہ محض یائے معروف نہیں بڑھی بلکہ الف یا ہ دونوں حذف بھی ہو گئے ہیں۔

(۷) صفحہ ۵۷ میں صفت نسبتی بنانے کے قاعدے یہ ہیں ہے۔

۲۔ اگر اسم میں تیسرا حرف (ی) ہو تو وہ بھی گر جائیگی۔ جیسے مدینہ سے مدنی۔

تنقید - یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ نگینہ میں بھی آخر میں ہ ہے اور تیسرا حرف ی۔ لیکن ی نہیں گرتی اور صفت نسبتی نگینوی آتی ہے ایسے قاعدے بطور کلیہ نہیں بیان کئے جاتے بلکہ بعض وغیرہ کے الفاظ لگا دیئے جاتے ہیں یا استثنا کر دیا جاتا ہے۔

(۸) صفحہ ۸۴ میں ذی روح کے تذکیر و تانیث کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک حقیقی دوسرے غیر حقیقی۔ اور غیر حقیقی کی مثالوں میں قلم اور کتاب وغیرہ کی مثالیں دی گئی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قلم اور کتاب بھی ذی روح ہے حالانکہ مؤنث و مذکر حقیقی محض ذی روح میں ہوتا ہے مذکر و مؤنث غیر حقیقی ذی روح کی قسم نہیں ہے بلکہ مذکر و مؤنث غیر حقیقی سے مراد بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث ہے،

(۹) صفحہ ۸۷ میں ہے جس اسم مذکر کے آخر میں الف ہوتا ہے اسکی تانیث کرنے میں ین بڑھاتے ہیں۔ جیسے بنیا۔ بنیاین۔ کبتا سے کبتاین۔

تنقید۔ کبتا۔ شاعری یا شعر کے معنوں میں ہے۔ شاعر کے معنوں میں نہیں ہے جسکی تانیث کبتاین شاعرہ کے معنوں میں آئے۔ دوسرے سیکڑوں ایسے اسم ذی روح ہیں جنکے آخر میں الف ہے اور اسکی تانیث ین سے نہیں بنتی۔ مثلاً لڑکا۔ دادا۔ چچا۔ بکرا۔ گدھا وغیرہ۔

(۱۰) مؤنث و مذکر غیر حقیقی کے بیان میں صفحہ ۹۸ میں ہے۔

۲۔ جس اسم کے آخر میں یائے معروف ہوگی وہ مؤنث ہوگا۔ جیسے روٹی۔ ٹوپی۔ الی آخرہ۔ باستثنائے گھی۔ دہی۔ موتی۔ جی۔ ہاتھی۔ پانی۔ کے کہ یہ الفاظ مذکر ہیں۔

تنقید۔ ہاتھی مذکر غیر حقیقی نہیں ہے بلکہ جاندار چیز ہے اس لئے مذکر حقیقی ہے۔

(۱۱) اسی بحث کے سلسلے میں صفحہ ۱۰۹ میں ہے۔ (۱۲) جس مصدر یا حاصل مصدر عربی کے آخر میں الف ہو وہ مؤنث ہوتا ہے۔ جیسے التجا۔ تمنا۔ استدعا۔ دعا۔ جفا وغیرہ۔ تماشا اس سے مستثنیٰ ہے۔

تنقید۔ یہ کلیہ بھی صحیح نہیں۔ علاوہ تماشا کے بہت سے مصادر عربی کے مذکر ہیں۔ مثلاً احیا۔ اخفا۔ اجرا۔ استقرا۔ استہزا۔ غنا وغیرہ۔

(۱۳) اسی سلسلے میں صفحہ ۱۰۹ میں ہے جس لفظ کے آخر میں دراز (ت) ہو وہ مؤنث ہے جیسے قدرت۔ نعمت۔ عزت۔ عنایت۔ شکایت وغیرہ۔

تنقید۔ سیکڑوں لفظ ایسے ہیں کہ جنکے آخر میں ت ہو اور وہ مذکر بولے جاتے ہیں۔ خلعت۔ آیت۔ شربت۔ لغت۔ ثبوت۔ سکوت وغیرہ۔ ایسے مسائل بطور کلیہ لکھنا غلطی ہے۔

شاعری و مصوری

(جعفر مہدی صاحب آزم ردولوی)

تصویر اور شعر دو لفظ ہیں مگر مفہوم ایک ہی ہے۔ ما بہ الامتیاز بعض نازک اور لطیف مواقع ہیں ورنہ کوئی ایسا فرق نہیں ہے۔

کچھ مناظر ایسے ہیں جن کو الفاظ چھو نہیں سکتے۔ مگر کچھ ایسے بھی مناظر ہیں جہاں مصور کی سحر کاریاں مفلوج نظر آتی ہیں۔ اسے شاعر ہی بیان کر سکتا ہے مصوّر اسکی مرقع کشی نہیں کر سکتا۔ شاعر سے میری مراد وہ فرد ہے جو کلام موزوں کے قالب میں ایسی روح پھونک دے کہ سننے والے کے سامنے تصویر کھنچ جائے مصور بھی یہی کرتا ہے۔ ایک نازک سا فرق ہے۔ مادۂ تخلیق دونوں کا ایک ہے۔ خیال کے نمود کی روش یکساں ... طریقہ اظہار بدلا ہوا ہے لامحالہ جو خصوصیات جس صنف کی ہونگی وہ اپنے حدود کے باہر نہیں جا سکینگی۔ چونکہ دونوں کا مرکز ایک ہی ہے۔ لہذا کوئی تعجب کی بات نہیں اگر کوئی شعر تصویر بھی ہو سکے اور کوئی تصویر شعر۔

سامنے کی بات ہے کہ شعر کو سنکر محظوظ ہو سکتے ہیں مگر تصویر نہیں سُنی جا سکتی، جب تک تصویر سامنے نہ آئے بحیثیت مجموعی مصور کے خیالات سے لطف اندوز ہونا معلوم۔ میرا مفہوم چند مثالوں سے واضح ہوگا۔ دیکھئے مصورِ فطرت قاآنی موسم بہار کی منظر کشی کر رہا ہے۔ ؎

نرمک نرمک نسیم زیر گلاں می خزد		غنچۂ این می مکد عارضِ آن می گزد
سنبلِ این میکشد گردن آن می گزد		گہ بہ چمن می چمد گہ بہ سمن می وزد

گاہ بہ شاخِ درخت گہ بہ لبِ جویبار

"نسیم کے نرم و خنک جھونکے پھولوں سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے آئے۔ اس پھول کی ٹھڈی چوس لی، اُس پھول کا منہ چوم لیا، اس سنبل کے بال کھینچ لئے، اسکی گردن کاٹی۔

کبھی چمن میں مستانہ وار آئے کبھی چنبیلی کے پاس جا پہونچے، کبھی شاخ درخت پر جھولے کبھی جوہٹا کے قریب آگئے۔"

مصور اگر ان خیالات کو آب و رنگ سے صفحۂ کاغذ پر ابھار بھی دے پھر بھی جو ترنم الفاظ سے برس رہا ہے کہاں سے لائیگا؟

دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ میر انیس مرحوم فرماتے ہیں۔

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند — دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند — چمکارتے تھے حضرت عباسؑ ارجمند

تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

حضرت عباس علیہ السلام لڑتے ہوئے فرات پر پہونچے فوجیں بھاگ چکی ہیں۔ اس وقت اسد بیشۂ شجاعت ترائی کا تنہا مالک ہے۔ عربی النسل گھوڑا زیر ران ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب حسینؑ کے اطفال دو دن سے العطش العطش کر رہے تھے پانی کہاں کہ سواریوں کو پلایا جائے۔ گھوڑا بھی پیاسا ہے اور سوار بھی۔ پیاسے جانور کی فطرت پر نظر رہے۔ سامنے دریا لہراتا ہوا نظر آیا۔ گھوڑا ہنہنا کے دیکھنے لگا۔ پیاس کی شدت پانی کی قربت نے بے قابو کر دیا۔ اعضا میں تشنجی کیفیت پیدا ہوگئی بند بند کانپتا تھا اور سمٹتا تھا۔ سوار نے بے زبان کی یہ حالت دیکھی چمکارا۔ آبشار کے شور سے گھوڑے نے بیتابانہ سوار کی طرف گردن پھرا کر دیکھا یعنی (بے زبان اپنے مالک کے منشا کو دریافت کرنا چاہتا ہے) تیسرے مصرع میں شاعر جوڑ بند بھی کہہ سکتا تھا مگر تکرار نے جو مزہ دیا ہے اسے ذوق سلیم ہی محسوس کر سکتا ہے۔ ناظرین مجھے معذور سمجھیں اگر اشعار بالا کا مطلب مناسب الفاظ میں نہ بیان کر سکا، لیکن میں دعوی کرتا ہوں کہ اس بند کی لطافت باقی رکھتے ہوئے کوئی شخص نثر میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔

ایک مقام پر فرماتے ہیں" حضرت حرؑ میدان جنگ کو جا رہے ہیں منظر کشی ہے یا اعجاز۔ ملاحظہ ہو۔

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے — دست فولاد دبا جاتا تھا دستانوں سے
برچھیوں اُڑ جاتا تھا دیدبے کے مرزانوں سے — آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

چوتھا مصرع تو جذبات نگاری کے صفحہ پر سنہرے حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے۔ ہے کوئی جو یہ منظر کھینچ سکے۔

ایک بند اور ملاحظہ ہو۔

بھرتا تھا دمِ سرد پریشاں کوئی ہو کے ۔۔۔ دامن سے ہوا دیتا تھا منہ کو کوئی دھو کے
بچتا تھا کوئی لوں سے ردا چہرے پہ رو کے ۔۔۔ رکھ لیتا تھا سر پہ کوئی رومال بھگو کے
پڑتی تھیں جو چھینٹیں تو مزا دیتا تھا پانی
جھک کر کوئی چلّو ہی سے پی لیتا تھا پانی

حسینؑ سفر کر رہے ہیں گرمی کے دن ہیں۔ عربی قافلہ اس عالم میں جا رہا ہے راستہ کے مناظر کھینچتے ہوئے میر صاحب نے قیامت کی مصوری کی ہے ہر مصرع ایک خاص قسم کی کیفیت کا حامل و مظہر ہے۔ ایک ہی موسم کے مختلف اثرات اس خوبی سے بیان ہو گئے ہیں جیسے کوئی "آپ بیتی" کہتا ہے۔ پہلا مصرع، ایک بردبار اور متحمل ضابط شخص کو پیش کر رہا ہے جو گرمی کے تاثرات صرف دمِ سرد کھینچ کر ٹال رہا ہے۔ دوسرا مصرع، ایک جوان شخص کی فطرت دکھاتا ہے جو گرمی کے دفعیہ کی متعدد صورتیں اختیار کرتا ہے۔ تیسرا مصرع، ایک جہاں دیدہ تجربہ کار طبیعت اور مزاج کا مظہر ہے۔ گرمی کے تاثرات جو دقتیں ہیں اسے نظر انداز کر کے لوں کا اثر جو ایک موذی چیز ہے اس کا تحفظ مقدم سمجھتا ہے۔ چوتھا مصرع، نوجوان گرمی سے زچ ہو کر رومال بھگو کر خنکی حاصل کرتا ہے۔ یہ ایک نوجوان ہی کرتا ہے۔ بیت کے دونوں مصرع میں "پانی کی چھینٹیں اور جھک کر چلّو سے پانی کا ذکر کر کے کس قدر بدیع البیانی سے گرمی کی شدت اور طبیعتوں کی بے چینی کی تصویر کھینچی ہے۔ جو آرٹ اس میں پیش کیا گیا ہے وہ شاعر کی شیوا بیانی اور باریک بینی کا یکے وقت ناظر ہے۔ اقرار لے سکتا ہے مصور کے لئے اتنے مختلف مناظر بہ یک وقت پیش کرنا قریب قریب محال ہے۔

میر صاحب کے یہاں ایسے نادرات کمیاب نہیں ہیں جو مرثیہ اٹھا لیجئے کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است"... ابھی اور باکمال ہستیاں باقی ہیں۔ ذرا مرزا دبیر کی قوت مصوری دیکھئے۔ حضرت علی اصغر کو پانی پلانے لے چلے ہیں اس وقت باپ اور حسینؑ ایسے باپ کے دلی خیالات دکھانے کے بعد شاعر یہ بند لکھتا ہے۔ خط کشیدہ الفاظ خصوصیت کے ملاحظہ ہوں۔

پہونچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے　　چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے　　چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے

آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

ان مصرعوں میں مرزائے مرحوم نے ایک داستان کہدی حسین ایسے غیرت مند پر ایسا وقت پڑ گیا ہے جو عالم بیان ہو سکتا تھا وہ ایسے انمول الفاظ میں اعجازانہ انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ سچے فطرتی جذبات میں صرف یہی بند مرزا صاحب کے خدائے سخن ہونے پر نص قطعی ہے۔ مطالب کی عظمت، الفاظ کی برجستگی، اجازت نہیں دیتی کہ میں شرح کروں۔ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں، جو خوبیاں ان چند لفظوں میں جمع کردی گئی ہیں ان کی مرقع کشی مصور کے بس کی بات نہیں۔

دو ایک مثالیں اور ملاحظہ ہوں۔

عرفی کا ایک مشہور قصیدہ ہے جسکا یہ مطلع ہے۔

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم　　گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

یہاں شاہ و گدا کی مسرت متحد طور پر کس قدر خوبی سے بیان کی ہے۔ اس قصیدہ میں دنیا کو خوش و خورم دکھاتے ہیں اور اسی قسم کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ناگہاں ایک مژدہ سنتا ہوں۔ یعنی شہزادہ سلیم بلاتا ہے۔ اٹھے۔ چلے۔ راستے کے اور جلدی کے مناظر کھینچنے کے بعد سامنے آئے۔ یہاں پر دو شعر لکھدیئے ہیں۔

بگفت من بشنیدم ہر آنچہ گفتنی داشت　　کہ در بیان نگہش کرد بر زبان تقدیم
لبش چوں نوبت خود از نگاہ باز گرفت　　فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

یہ دو شعر شاعرانہ مصوری کے امثلۂ عظیم میں سے ہیں۔ اسے عرفی ہی ایسا رموزِ محبت جاننے والا محسوس کر سکتا تھا اور ایسے مناسب الفاظ میں کہنا بھی اسی کا کام ہے۔ صرف یہی دو شعر ہی عرفی کے بقائے دوام کے ضامن ہیں۔ علاوہ ان کے اور اشعار بھی پیش کئے جا سکتے ہیں محبت کے امر کی اس خوبی سے تصویر کشی کی ہے کہ دل وجد کرتا ہے۔ ثانی شہزادہ ادھر تنگ تھی و ابھی [illegible]

دنیا کے سارے مصور "نگفت ومن بشنیدم" کی تصویر نہیں بنا سکتے۔ خود شاعروں میں ان لطیف جذبات کے سمجھنے والے بہت کم ہیں۔ سچ ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست		تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

منوچہری نے ایک مقام پر برسات کا سماں دکھایا ہے۔ پانی برس رہا ہے۔ ایک بوند جو سبزہ پر گرتی ہے اسکی کیا صورت ہو جاتی ہے۔ کلی پر پھول پر پتی پر شاخ پر کیا شکل اختیار کرلیتی ہے۔ غرض نہایت تفصیل و بداہت سے بیان کرتا ہے۔ پھر بھی سب کچھ بہت ہی مختصر الفاظ میں کہتا ہے۔ چند اشعار نقل کئے دیتا ہوں۔

آں قطرہ باراں بیں از ابر چکیدہ		گشتہ سر برگ ازاں قطرہ بہ آثار

آویختہ چوں ریشہ دوستار چہ سبز		سیمیں گرہے بر سر ہر ریشہ دوستار

یا ہیچو زبرجد گوں یک رشتہ سوسن		اندر سر ہر سوزن یک لولوئے شہوار

یوہیں اشارے سے کام لیکر منظر پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ آگے بڑھ کر کہتا ہے۔

واں قطرہ باراں کہ چکید از بر لالہ		گردد طرف لالہ ازاں باراں نیگار

پنداری تبخالہ خرد ک بدمیدست		بر گرد عقیقین دولب دلبر عیّار

واں دائرہ بنگر اندر شمر آب		ہر گہ کہ دراں آب چکد قطرہ امطار

چوں مرکز پرکار ست آں قطرہ باراں		واں دائر آب بسان خط پرکار

اس خاص سین کے کھینچنے کے بعد کہتا ہے کہ اگر زور کی بارش ہونے لگے تو کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے۔

وانگہ کہ خرد بار دباران بہ قوت		گیرد شکن آب دگر صورت آثار

گردد شمرایدوں جو یکے دام کبوتر		دیدار ز یک حلقہ بسے سیمیں منقار

دیکھئے کس قدر سادگی سے سامنے کی باتیں بیان کردی ہیں۔ یہی سہل الممتنع کہلاتا ہے۔ مثالوں کی جدت ایک روح دوڑا رہی ہے۔ اس قدر صاف بندش کے ساتھ مصوری سحر طرازی نہیں تو پھر کیا ہے۔ آپنے دیکھا ہوگا کہ ہد ہد جب سر کو اُٹھاتا اور جھکاتا ہے تو کلغی پھیلتی اور سمٹتی ہے بظاہر معمولی سی بات ہے۔ مگر منوچہری اس خوبصورتی سے نظم کرتا ہے کہ سنتے ہی ایک دلکش تصویر سامنے آجاتی ہے ملاحظہ کیجیے:۔

بوبو یک پیک کہ نامہ زدہ اندر سر خویش　　نامہ گہ باز کند گہ شکند بر شکنا

ایسی مثالیں اردو فارسی اور دوسری زبانوں میں بھی مل سکتی ہیں۔ یہ مناظر ایسے ہیں جنھیں شاعر ہی صفحہ پر آب و رنگ الفاظ سے کھینچ سکتا ہے۔ یہ راستہ اس قدر باریک اور لطیف ہے کہ سب سلامت روی سے نہیں طے کر سکتے۔ ملخص یہ کہ شاعر (جذبات یعنی رنج و خوشی وغیرہ) یا (زخم کی کسک کھٹک چمک وغیرہ) یا آواز کے مختلف انداز کی تصویریں کھینچ سکتا ہے۔ مگر مصور کی بوقلمونی یہاں مفلوج نظر آتی ہے۔ مثلاً یہ مصرع

"ہوئے فریاد کے پہلو عیاں لحن تکلم سے"

لے لیجئے۔

اوّل تو مطلق آواز ہی کی تصویر ناممکن۔ ثانیاً فریاد کا پہلو لئے ہوئے آواز! یہی وہ منزل ہے کہ شاعر کو مصور سے بلند کرتی ہے۔ اور ایسے ہی مواقع کے لئے کہا گیا ہے۔

شاعری جزویست از پیغمبری

متذکرہ بالا مثالوں کو آپ نے خیال کیا ہوگا کہ بعض مقام پر شعر اور تصویر متحد۔ اور بعض مقامات پر شاعر مصور کی سحر طرازی پر ہنستا ہوا آگے نکل گیا ہے یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچکر شاعر فانی زندگی کی قبا اُتار کر بقائے دوام کا خلعت جسم پر آراستہ کر لیتا ہے اور دعوے سے کہ سکتا ہے کہ

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

میر وحید اور اُن کی شاعری

(سید جواد صاحب شکیل)

میر وحید اور اُنکی شاعری کا بیان بہت شرح و بسط کا مستحق ہے۔ اس لحاظ سے ذیل کا مضمون بہت زیادہ ناکافی اور تشنہ ہے پھر بھی اسکی یہ خصوصیت ہے کہ اسکے لکھنے والے خود خاندان میر وحید کے ایک ہونہار فرد ہیں ضرورت ہے کہ لائق مضمون نگار اور دیگر صاحبانِ قلم اس مفید و دلچسپ سلسلے کو قائم رکھیں اور میر وحید مرحوم کو دنیائے ادب کے سامنے اُسی تفصیل و شان سے پیش کریں جسکے وہ مستحق ہیں۔ (مدیر)

ہندوستان کی خاک سے یوں تو بہت سے مرثیہ گو پیدا ہوئے لیکن ان میں چار بڑے باکمال ہوئے ان میں سے ایک ذات سید ہادی صاحب وحید کی بھی تھی۔ یہ میر انس رح کے بیٹے اور میر انیس رح کے بھتیجے تھے۔ ان بزرگواروں کے علاوہ اگر کوئی بام فلک تک پہونچا تو وہ میر وحید ہی کی ذات تھی۔

میر وحید کے کلام کی جس قدر تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ خان بہادر سید امداد امام صاحب اپنی کتاب "بہارستان سخن" جلد دوم کے صفحہ ۴۰ پر یوں تحریر فرماتے ہیں۔ "اگر شعرائے لکھنو رزمی شاعری میں ایسا کمال پیدا نہیں کرتے تو بجز غزل سرائی اور مثنوی نگاری کی بنیاد پر انکو شعرائے دہلی پر کسی طرح کی ترجیح حاصل نہ ہوتی۔ اس صنف شاعری کے فروغ دینے والے میر مونس صاحب بھی تھے پھر میر وحید صاحب نے تو میر انیس کے زمانہ کو زندہ ہی کرنا شروع کیا تھا"

حافظ حاجی حفیظ الدین احمد صاحب اپنی کتاب "میر انیس صاحب مرحوم لکھنوی" میں تحریر فرماتے ہیں۔ "میر انس صاحب کے صاحبزادے میر محمد ہادی صاحب وحید بھی اپنے خاندان میں وحید العصر نکلے ان کا کلام پایہ معراج تک پہونچا اور وہ اپنے خاندان میں خوب چمکے"

اِن حضرات کے بیان سے ظاہر ہے کہ میر وحید مرحوم کی منزلت انکی نظروں میں کس قدر تھی۔
میر وحید مرحوم کی قدرت بیان کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً مرثیہ، سلام، قصیدہ، تاریخ، واسوخت اور غزل وغیرہ۔

اس وقت چونکہ میر وحید کی مرثیہ گوئی پر صرف روشنی ڈالنا مقصود ہے لہذا دیگر اصناف شاعری سے کوئی بحث کرنا ضروری نہیں۔ میر وحید کی شاعری ہر حیثیت سے کامیاب کہی جاسکتی ہے۔ بندش کی چستی، کلام کی صفائی تو اُنکی خاندانی خصوصیت تھی۔ ترکیب کی دلاویزی اور الفاظ کا حُسن وتناسب ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا۔ اُن کا سینہ محاورات، استعارات وتشبیہات کا مخزن تھا۔ سلاست کلام اُنکی نگاہیں دیکھا کرتی اور ربط کلام کی لڑیاں ہر وقت اُنکے سامنے گویا رہتی تھیں۔ جہاں تک اندازہ کیا گیا ہے ہر شاعر کا میلان کسی خاص پیرایۂ نظم کی طرف ہوتا ہے۔ مثلاً اگر قومی نظم کی طرف زیادہ رجحان ہے تو طبیعت اُسی کی طرف متوجہ رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اس قدر رہمار ہوجاتی ہے کہ دیگر صنف شاعری میں اُسکو کوئی افضلیت نہیں ہوسکتی۔ حالی، سرسید، آزاد وغیرہ اس دعوی میں پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن میر وحید کی شاعری کو ہم اس عام قاعدے سے مستثنٰے پاتے ہیں۔ اُنکی ہر صنف شاعری پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک صنف میں وہ ویسے ہی کامل تھے جتنا وہ مرثیہ گوئی میں تھے۔

خاندانی مرثیہ گو ہونے کی وجہ سے میر وحید نے اسی کو اپنا پیشہ مقرر کرلیا تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر خود فرماتے ہیں۔ ؎

کامل اُٹھے دُنیا سے تو پیدا ہوئے اکمل　　　شمشیر فصاحت پہ ہے یہ پانچویں صیقل

اس وقت میر وحید مرحوم کے کسی واقعہ یا اُنکے سوانح سے کوئی بحث منظور نہیں ہے۔ اسکے لئے بہت زیادہ وقت کی ضرورت ہے۔ اس وقت اُنکے کلام کا کچھ انتخاب پیش کرنا منظور ہے۔

حضرت علیؑ کی سیرت کا نقشہ میر وحید نے بہت سے مراثی میں کھینچا ہے۔ ایک مرثیہ میں ایک واقعہ بہت دلاویز اور دلچسپ پیرایہ میں نظم فرمایا ہے۔

حضرت علیؑ کو خلافت ظاہری مل چکی تھی اور شہر کوفہ اپنی پوری جوانی پر تھا۔ شہر کو آپ نے رحم، انصاف وعدل سے بھر دیا تھا ہر شخص خوش وخرم بندگی وعبادت میں مشغول رہتا تھا۔ وہیں

کسی محلہ میں ایک خوش اعتقاد پیرزن رہتی تھی۔ ــ

دن رات عابدہ کو عبادت سے کام تھا   تھا ذائقہ سے شوق نہ لذت سے کام تھا

دنیاوی ذخیرہ سے اُسکے پاس کچھ نہ تھا۔ مال و متاع سے کوسوں دُور، کم مائیگی و بیوگی مصائب۔
غریب کو سوائے شکر پروردگار اور عبادت کسی چیز سے علاقہ نہ تھا

رکھتی تھی دخترِ سمن اندام و نازنیں   لیلیٰ ادا و رشک حسینانِ مہ جبیں

وہ حسنِ دلفریب کہ پریاں ہوں شرمگیں   قتال آنکھ غیرتِ چشمانِ حورعیں

وحشت بڑھے غزال کو گر اشتیاق ہو
دیکھے تو ایک چشم زدن ہجر شاق ہو

تھی ماہ چاردہ ابھی وہ غیرتِ پری   محروم دیکھنے سے مگر چشمِ مشتری

آشوبِ ہر چشم کی گردش سراسری   ہر دم قدم پہ ملتی تھی آنکھوں کو دلبری

مدِ نظر حجاب نگاہِ خیال سے
محفوظ خیرہ چشمیٔ عین الکمال سے

ہر وقت پاک بیں کی نظر تھی سوئے الٰہ   مردم کو شک ہو گر تو ہے عین الیقیں گواہ

رہتی تھی سات پردوں میں شام و سحر نگاہ   مشتاق کو نہ سوجھتی تھی دیکھنے کی راہ

قدغن تھا چشم بد کی رسائی کے واسطے
حاضر حیا تھی چشم نمائی کے واسطے

اک دن قضائے کار وہ دلدار خوش سیر   مادر کے ساتھ جاتی تھی مہماں کسی کے گھر

چادر میں یوں بدن تھا نہاں اُس کا سر بسر   پوشیدہ ابر میں ہو کبھی جس طرح قمر

ظاہر نہ کوئی عضو تھا فرطِ حجاب سے
لیکن عیاں تھے دیدۂ حق بیں نقاب سے

دو چار گام گھر سے چلی جب وہ جانِ جاں   ناگاہ ایک شخص ہوا سامنے عیاں

خوش وضع خوش طبیعت و خوش خلق خوش بیاں   خوش رو و خوش مزاج و طرحدار و نوجواں

اہلِ دوَل تھا خلق سے بے احتیاج تھا
موسم جو تھا شباب کا عاشق مزاج تھا

اسکے بعد دو نو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ ؎

ڈالا قضا نے غیرت یوسف کی چاہ میں		دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں عین راہ میں

وہ جوان عاشق ہوجاتا ہے اسے اس پیرایہ میں لکھتے ہیں

آنکھیں جھکا کے یہ تو ہوئی دل میں شرمسار		اور تیر عشق دل سے ہوا تو جوان کے پار

کوہ الم گرا جگر دردناک پر

اک آہ کر کے بیٹھ گیا فرش خاک پر

اک پل میں زندگی کا چمن خار ہو گیا

نرگس کا پھول دیکھ کے بیمار ہو گیا

لڑکی تو آناً فاناً چلی گئی لیکن وہ جوان دل تھام کر گھر آیا۔ جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو قاصد روانہ کیا۔ جب اُس مہ پارہ کے پاس پہونچا تو کہنے لگا۔ ؎

شیدا ہے تیرا اک گل اندام و لالہ فام		فرقت میں وہ تمام ہے اب اے مہ تمام

اٹکی ہے روح آنکھوں میں دم کا شمار ہے

تیری نگاہ لطف کا امیدوار ہے

جب اُس نے یہ سُنا تو اپنا مُنہ پیٹ لیا اور کہنے لگی۔ ؎

دیکھا کہاں تھا اس نے مجھے وہ میبتلا		کیوں اشک ہیں رواں سبب شور و شر ہے کیا

کس عضو پر ہے شیفتہ مد نظر ہے کیا؟

اسکے جواب میں میر وحید قاصد کی زبانی لکھتے ہیں۔

تقدیر کی نظر سے اُتارا ہوا ہے وہ

سُنتا ہوں میں کہ چشم کا مارا ہوا ہے وہ

بولی اک آہ کھینچ کے وہ رشک آفتاب		آنکھوں سے دیکھ دیتی ہوں اس بات کا جواب

یہ کہہ کے اُٹھ کھڑی ہوئی بادیدۂ پُر آب		پوشیدہ ماں سے پردے میں کی اُس نے بشتاب

کزلک[1] اُٹھا کے چار طرف دیکھ بھال کے

رکھے طبق میں دیدۂ حق بیں نکال کے

[1] کزلک یعنی چھری ۱۲

وہ طبق قاصد کو دیتے ہوئے کہتی ہے۔ ؎

کہنا مرا پیام کہ اے بندۂ الٰہ — آنکھیں یہ وہ ہیں جن پہ پڑی تھی تری نگاہ

دوری میں ایک پل تجھے راحت اگر نہیں

قربان کا آج سے مجھے مدِ نظر نہیں

عینِ خطا ہے حوصلہ اس سے جو ہو زیاد — آنکھوں پہ کہہ انہیں کہ بر آئی تری مراد

آیا اگر پیام مکرر اسی طرح

بھیجونگی تیرے سامنے پھر سر اسی طرح

قاصد اُس طرف کو لیکر روانہ ہوا جب اُس عاشق نامراد کے پاس پہونچا تو وہ ظرف پیش کیا۔

اُسے دیکھتے ہی اُسکی عجیب حالت ہوگئی اُس کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔ ؎

آنکھوں کو مل کے آنکھوں سے کہتا تھا دمبدم — اے چرخ پیر تو نے دکھایا یہ کیا ستم

دردِ فراق یار نہ تھا میرے حق میں کم

واحسرتا کہ آنکھوں سے دیکھوں یہ تازہ غم

اس واقعہ کے بعد وہ عاشق حضرت علیؑ کے دربار میں حاضر ہوا اور اپنا تمام واقعہ حضرت کے سامنے بیان کیا۔ آپ نے اس ضعیفہ اور اُسکی لڑکی کو طلب فرمایا۔ طرفۃ العین میں وہ دونوں حاضر ہوئیں۔ آپ نے اُس لڑکی کو قریب بُلایا اور اُسکی ہمت و عصمت کی بہت تعریف فرمائی۔ پھر خدا کی مدد سے یہ معجزہ دکھایا۔ ؎

حلقوں میں آنکھیں رکھنے لگے جب شہ غیور — پلکوں نے دستِ شوق بڑھایا بصد سرور

عالم تھا ایک چشم زدن میں یہ نور کا — جو رنگ ڈھنگ پہ ہو نگینہ بلور کا

پہلے سے روشنی کہیں ان میں سوا ہوئی — زنہار نگیں ہٹے تھے دوبارہ پیدا ہوئی

اب ہم یہاں میر وحید کے ایک مرثیہ سے انتخاب کرکے ایک ایسی ہستی کی ... پیش کرتے ہیں جو شہید اعظم (امام حسینؑ) کی ہر مشکل کے مددگار و معاون تھی حضرت عباس علیؑ اس ... کے چشم ...

اور شہید اعظم کے قوت بازو تھے۔ بہادری اور اطاعت کا مادہ آپ میں اس قدر تھا جسکی مثال ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔ امام حسینؑ کا سارا اہتمام جنگ آپ ہی کے سپرد تھا۔

اب یہ وہ وقت تھا کہ یزیدی لشکر (جس میں نہ معلوم کس کس شہر اور کن کن قریوں کے لوگ جمع تھے) اِس چھوٹے سے دستہ کو (جس میں بعض اس قدر عمر رسیدہ تھے کہ اُن کی پلکیں آنکھوں پر جُھک آئی تھیں اور بعض ایسے نو عمر تھے جن کے گلزار شباب میں تازہ بہار آئی تھی اور چند ایسے صغیر سن تھے جنھوں نے سوائے ماں کی گود یا گھر کی چوکھٹ کے باہر قدم بھی نہ رکھا تھا) تیروں اور پتھروں سے ڈرا رہا تھا۔ ہر عقیدت مند مجاہد قتل ہو چکا صرف حضرت عباسؑ و حضرت علی اکبرؑ باقی ہیں۔ دوپہر قریب ہے آفتاب منزل نصف النہار سے قریب ہوتا جاتا ہے۔ گویا آگ کے شعلے برس رہے ہیں۔ بچّوں کے ننھے ننھے دل گرمی کی حدت سے جلے جاتے ہیں۔ بچّوں کی بیتابی دیکھ کر حضرت عباسؑ میدان کا ارادہ کرتے ہیں اس مقام کو میر وحید یوں تحریر فرماتے ہیں۔ ؎

عباسؑ سر جھکائے ہوئے گھر میں آئے جب
دیکھا کہ بچے اس و پریشاں ہیں سب کے سب
پیاسی سکینہ تشنہ لبی سے ہے جاں بلب
جھولے میں توڑتا ہے دم اصغر بصد تعب
لب ہیں کبود ضعف سے منکا ڈھلا ہوا
ہیں مٹھیاں بندھی ہوئی اور مُنہ کھلا ہوا

غصہ کی حالت یوں دکھائی ہے۔ ؎

غصہ میں یوں ٹہلتے ہیں جس طرح شیر نر
گہ آستیں چڑھائی کبھی چُست کی کمر
دھیان اپنی ضرب کا بہ تہور کیا کبھی
کشتوں کے لوٹنے کا تصور کیا کبھی
آنسو ٹپک پڑے کبھی غیرت یہ شاہ کی
چابے کبھی لب اور کبھی سر دھن کے آہ کی
گہ تھم کے جھومے شان سے شیر آلہ کی
دشمن کی فوج پر کبھی تن کر نگاہ کی
اُٹھی جو آنکھ پاؤں بھی تھرا کے رہ گیا
دیکھا قوی تنوں کو تو ہاتھ اٹھ کے رہ گیا

حضرت عباسؑ کی تو غصہ میں یہ حالت ہے جب امام حسینؑ انکو دیکھتے ہیں۔ تو از حد قلق ہوتا ہے

حضرت عباس یاس آفریں کلام زبان سے نکال رہے ہیں - امام مطلب سمجھ جاتے ہیں لیکن اجازت نہیں دیتے حضرت عباسؑ چپ ہو جاتے ہیں - اس مقام کو دو مصرعوں میں میر وحید یوں لکھتے ہیں ؂

دُھن ہے وغا کی آپ میں لشکر شکن نہیں

واجب ہے عرض حال پہ تاب سخن نہیں

امام حسینؑ بمشکل اجازت دے دیتے ہیں تب حضرت عباسؑ خیمہ میں حضرت زینبؑ کی خدمت میں رخصت کے لئے آتے ہیں لیکن وہ رخصت نہیں دیتیں بلکہ روتی ہیں اسے یوں تحریر فرمایا ہے - ؂

معصوم جاں بلب ہیں تو ہوں کچھ نہ دھیان اُو　　کیا آب نہر تم سے ہے بہتر ہمیں بتاؤ؟

تلوار کھینچو جان پہ کھیلو وغا کرو

اچھا نصیب میں ہو نہ پانی تو کیا کرو؟

اسکے بعد حضرت زینبؑ تاکید فرماتی ہیں کہ تم اب مجھ سے رخصت نہ مانگنا - اُسکو ایک مصرع میں فرماتی ہیں -

قربان جاؤں کیجو نہ اب مجھ سے یہ سوال

اسکے جواب میں حضرت عباس عرض کرتے ہیں - ع "کی عرض سر جھکا کے جری نے کہ کیا مجال"

بچوں کی تشنگی سے جو تھا دل کو اضطراب　　مشکیزہ لے لیا تھا کہ شاید ہیم ہو آب

مرضی اگر نہیں ہے تو کیا غدر کی ہے تاب　　یہ مشک رکھے دیتا ہوں اے بنت بوتراب

نام وغا بھی مُنہ سے نہ اب لوں جو حکم ہو

تیغ و سپر بھی کھول کے رکھدوں جو حکم ہو

ارشاد ہو تو جاؤں نہتّہ حضور شاہ　　ڈر کر ہٹوں جو سامنے ہو کثرت سپاہ

ٹوکے جو نام لے کے مرا کوئی روسیاہ　　چہرہ ہو زرد سر کو جھکا لوں بانشک و آہ

کہہ دوں عدو ل حکم گوارا نہیں مجھے

رکھ دی ہے تیغ جنگ کا یارا نہیں مجھے

جناب زینبؑ مجبور ہو گئیں اور رخصت دے دی - باہر جاتے وقت جناب سکینہؑ سامنے آجاتی ہیں آپ گود میں اُٹھا لیتے ہیں - وہ رونے لگتی ہیں - آپ یوں سمجھاتے ہیں - ؂

مُنہ چوم کر کہا کہ نہ آہ و بکا کرو

بی بی ہماری فتح کی تم بھی دعا کرو

یہ سُن کے اُتری گود سے وہ پارۂ جگر — سر ننگے رو بہ قبلہ سوئے چرخ کی نظر
ننھے سے ہاتھ اُٹھائے کہا یہ بچشم تر — یا رب میرے چچا کو لعینوں پہ دے ظفر
مشکیزہ بھر کے نہر سے لانا نصیب ہو
پھر گھر میں اُنکو خیر سے آنا نصیب ہو

اسکے بعد حضرت عباسؑ باہر تشریف لے جاتے ہیں اور صبا رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں تشریف لے جاتے ہیں یزیدی لشکر حضرت کی جلالت و رعب دیکھکر کانپ اُٹھتا ہے۔ اس خوف اور ڈر کی حالت کو یوں لکھتے ہیں۔

آتا ہے ضیغمِ اسدِ حق ترائی میں — فوجوں کا رنگ خوف سے ہر فوج ترائی میں
دل کوئی مطمئن نہیں مطلق ترائی میں — شیروں کے ہو رہے ہیں جگر شق ترائی میں
بدلا ہے اضطراب میں دریا کا رنگ بھی
زہرے ہیں آب تہ میں چھپے ہیں نہنگ بھی

اوپر کے بند میں تو ذی روح کے خوف کی حالت دکھائی ہے۔ غیر ذی روح پر جو ہیبت تھی اُسکا خاکہ یوں کھینچتے ہیں۔

ذرے زمیں سے اُٹھتے تھے ہر مرتبہ بہم — مطلب تھا کہ یہاں کی زمیں پر رہیں نہ ہم
خورشید جھک کے کہتا تھا ہر دم یہ دمبدم — غیظ ابن بوتراب کا بیشک نہیں ہے کم
چڑھ آؤ خوف گر ہے بہت اُس شجاع کا
زینہ لگا دیا ہے خطوط شعاع کا

اک سمت الاماں کی چمن میں پکار تھی — اک تازہ انتشار میں فصلِ بہار تھی
بلبل کا دل پھڑکتا تھا دیوانہ وار تھی — مانند نبض ہر رگِ گل بیقرار تھی
تسکیں کسی کلی کو بھی دشوار ہو گئی
نرگس تو مارے خوف کے بیمار ہو گئی

سبزہ تھا پیچ و تاب میں مانند زعفراں — اُڑ اُڑ کے بھاگتی تھیں نہالوں کی پتیاں
سوسن کا رنگ ڈر سے ہوا جاتا تھا دھواں — سہمی ہوئی لطافت گلشن بھی تھی رواں
کچھ کہہ دیا صبا نے جو منہ موڑ موڑ کے
بھاگی شمیم پیالیاں غنچوں کی توڑ کے

میر وحید خاندانی مرثیہ گو تھے اُن کا کام زیادہ تر مرثیہ گوئی تھا لیکن طبیعت کی رنگینی خاندانی حصار کی منزلوں کو طے کر کے اپنے جذبات اور خداداد زور قلم دکھائے بغیر نہ رہی حضرت علیؑ کا معجزہ اور نوجوان عاشق اور کمسن لڑکی کا جو واقعہ نظم کیا ہے وہ ایک مذہبی حد میں متصور ہے لیکن فاضل شاعر نے ایک ایسے واقعہ میں جو سیدھے سادے الفاظ میں بھی بیان ہو سکتا تھا اپنی روانی طبع اور شوخی قلم سے کوٹ کوٹ کے حسن و نزاکت بھردی۔ یہ اُنکی اعلیٰ درجہ کی اُستادی تھی کہ اس واقعہ کو ایسے الفاظ سے سجا ہے کہ موجودہ تہذیب کے دلدادہ اُنکی عقیدت میں جس قدر بھی ارادت کیشی کے ہار پھول چڑہائیں وہ کم ہے حسن و نزاکت کے ساتھ ہی ساتھ ایک بات اور بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ واقعہ کا پلاٹ بالکل اُسی طرح باقی رہا جس طرح سیدھے سادے الفاظ کے ساتھ بیان کرنے میں باقی رہ سکتا تھا۔ اُنکی اس قسم کی نظم میں بھی شوخی اور حسن اُسی طرح قائم ہے جس طرح اُن کے تمام کلام میں یہ باتیں خصوصیات سے ہیں۔

اعلیٰ انشا پردازی و شاعری کا انحصار انتخاب پر ہی ہوتا ہے۔ شاعر کسی واقعہ کو تفصیل سے پیش کرنے کے بجائے صرف ایسا پہلو پیش کر دیتا ہے جس سے تمام واقعہ کی تصویر کھنچ جائے۔ مثلاً یہ بند جس کے آخری دو مصرعے یہ ہیں۔ ؎

لب ہیں کبود ضعف سے منکا ڈھلا ہوا
ہیں مٹھیاں بندھی ہوئی اور مُنہ کھلا ہوا

اس میں میر وحید نے جو کیفیت علی اصغرؑ کی دکھائی ہے وہ حضرت سکینہؑ کی نہیں دکھائی۔ کیونکہ اُن پر اپنے چھوٹے بھائی سے پیاس کی شدت کم تھی۔ اوّل تو ماں کا دودھ خشک ہو گیا تھا۔ دوسرے اُن میں برداشت کا مادہ حضرت سکینہ سے کم تھا۔ لہذا میر وحید نے ایک ایسی فرد کا انتخاب کیا جسکی تکلیف سے دوسری فردوں کی تکلیف کا اندازہ ہو گیا یعنی جب علی اصغر ایسے کم سن بچے کو پانی نہ مل سکا تو طبیعت کو اور زیادہ نہ مل سکا ہوگا۔

اس میں ایک بات اور قابل ذکر ہے وہ یہ کہ حضرت عباس کے لئے رخصت طلب کرتے میں سہولت پیدا ہو گئی کیونکہ جب وہ امام سے یہ کہیں گے کہ "پیاسی سکینہ تشنہ لبی سے ہے جاں بلب" یا (علی اصغر کی بابت) "لب ہیں کبود ضعف سے منکا ڈھلا ہوا ؎ ہیں مٹھیاں بندھی ہوئی اور مُنہ کھلا ہوا"

تو امام یقیناً اس امید پر کہ پانی آنے سے شاید بچوں کی جان بچ جائے رخصت دیدینگے۔ یہی ایسی صناعیاں ہیں جو شاعر کو زبردست شاعر بنا دیتی ہیں۔
متکلم کے کلام کا اثر سامع پر اس وقت زیادہ گہرا پڑتا ہے جس وقت متکلم کلام کی نوعیت سے الفاظ کی ادائیگی کرے یعنی اگر وہ کسی افسوسناک واقعہ کا اظہار کر رہا ہے تو ایسے الفاظ اس میں سموے تا کہ ہر ہر جزو غم کی داستان بن جائے۔ اگر کسی خوشی کا اظہار ہے تو ایسے الفاظ استعمال کرے جس سے مسرت اور خوشی ٹپک رہی ہو۔ اس بند میں ؎

آتا ہے ضیغم اسد حق ترائی میں ۔۔۔ فوجوں کا رنگ خوف سے ہے فق ترائی میں
دل کو کوئی مطمئن نہیں مطلق ترائی میں ۔۔۔ شیروں کے ہو رہے ہیں جگر شق ترائی میں

بدلا ہے اضطراب میں دنیا کا رنگ بھی
زہرے ہیں آب تہ میں چھپے ہیں نہنگ بھی

میر وحید مرحوم نے اسی التزام کا خیال رکھا ہے۔ چونکہ اس بند میں ہیبت دکھانا مقصود تھی لہذا ہیبت ناک الفاظ استعمال کئے ہیں جس سے کلام میں رعب پیدا ہو گیا ہے یہی بلاغت ہے "فوجوں کا رنگ خوف سے فق ہونا"، "شیروں کا جگر شق ہونا"، "نہنگ کا پانی کی تہ میں چھپ جانا" انتہائی ہیبت اور خوف کا نمونہ پیش کر رہے ہیں۔
میر وحید مرحوم نے جس جس مقام پر حضرت عباسؑ کی معرکہ آرائی دکھائی ہے۔ رزمیہ نگاری کو پایۂ معراج تک پہونچا دیا ہے۔ حضرت عباسؑ کی لڑائی کا بسیط تذکرہ رزمیہ نگاری کی بحث سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمیں یہاں پر جنگ کا کوئی خاکہ کھینچنا مقصود نہ تھا صرف فدا کاری اطاعت اور اسی کے ساتھ آپ کے غصہ سے ذی روح و غیر ذی روح پر جو اثر پڑا دکھانا منظور تھا۔ دنیا میں آج ہم کو کوئی ایسی مثال نہیں مل سکتی جس نے اپنی شخصیت کو اس عاشقی اور اطاعت کے ساتھ اپنے بھائی پر نثار کر دی۔ دراصل حضرت عباس نے دنیا والوں کے لئے ایک زندہ جاوید مثال چھوڑی ہے۔ خدا ان پر اپنی رحمت کے سدا بہار پھول برسائے۔

ساون کا جھولا

سیّد ہاشم رضا صاحب

(۱)

ساون کا پہلا دن ختم ہوا اور انپورنا کا جھولا نہ پڑا۔ پچھلے سال تک ساڑھ کے ختم ہونے سے پہلے ہی انپورنا اپنے جھولنے کے درخت تجویز کرنے لگتی۔ اس کا باپ بزار سے رسی لا دیا کرتا تھا، اسکی ماں اس کے ساتھ جا کر برگد یا آم کے ٹہنے میں جھولا ڈال دیتی۔ اسکے ساتھ کی لڑکیاں جمع ہو جاتیں اور انپورنا ہوا کے تھپیڑوں میں ہچکولے لیتی، اسکی ساری کبھی کبھی اونچی ٹہنیوں سے مس ہوتی اور وہ بڑی خوش ہوتی۔ برسات کا انپورنا بے چینی سے انتظار کیا کرتی۔ ساون آ گیا لیکن اب کی بار انپورنا کا باپ رسی نہ لایا، انپورنا کی ماں نے جھولا نہ ڈالا۔

(۲)

انپورنا سارے دن مضمحل رہی۔ دوپہر کو وہ اپنے گھر میں جھاڑو دے رہی تھی۔ کالی گھٹا اٹھی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے سامنے کا دروازہ کھول دیا۔ انپورنا کی نگاہ کھلی فضا میں پھرنے لگی، کھیتوں میں پانی بھرا تھا۔ دور گاؤں کی لڑکیاں جھولے پر لانبے لانبے پینگ لے رہی تھیں کبھی کبھی جھولا روک لیا جاتا اور سب ٹپکے ہوئے آم اٹھانے کے لئے لپکتیں۔ انپورنا دور سے ان کے گیت نہ سن سکی مگر یقیناً ان میں ساون کا خیر مقدم ہوگا۔ ہوا کے جھونکوں نے دروازہ پھر بند کر دیا۔ انپورنا نے جھاڑو رکھدی اور رونے لگی۔ اسکے قطرے پانی میں مل رہے تھے اور وہ بے حس زمین جس میں سیکڑوں ارمان والے دل دفن ہیں انپورنا کے آنسوؤں کو جذب کر رہی تھی۔

(۳)

ماں نے یہ آنسو دیکھ لئے، دور کا جھولا اسے بھی نظر آیا تھا اور وہ سمجھ گئی۔ انپورنا سے کہا "انپورنا! تو کیسی ناسمجھ لڑکی ہے۔ جھولے کے لئے روتی ہے۔ بیج پڑ گئے ہیں۔ انھیں پانی میں کھیلنے دے۔ تیرا بھی جب سن تھا تو تو یوں ہی دن دن بھر جھولے پر رہتی۔ تیرے بیاہ کے تین دن باقی ہیں۔ گاؤں والے آپس میں کہینگے "دیکھو انپورنا کیسی بے شرم ہے۔" میری انپورنا میں یہ کس طرح سن سکونگی۔ آنسو

پوچھ لے گھر کے دھندے میں مشغول ہو جا کہ باغوں میں پھرنے کے دن ہو گئے۔ آنپورنا نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ وہ بچپن کی حدوں سے گزر گئی تھی۔

(۴)

شام کو گاؤں کی لڑکیاں آنپورنا سے ملنے آئیں۔ وہ بہت دیر سے آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن نم ہونے کی وجہ سے لکڑیاں نہ جلتی تھیں۔ ساری لڑکیاں آنپورنا کے گرد جمع ہو گئیں اور پوچھا "آنپورنا آج کیسے بادل اُٹھے تھے۔ ہم سب تمہارا انتظار کرتے رہے اور تم نہ آئیں۔ تمہارے بغیر بڑا سناٹا تھا۔ ہم نے بہت آم چنے، کچھ تمہارے لئے بھی لائے ہیں۔ آنپورنا نے گود پھیلا دی۔ آموں پر آنسوؤں کی بارش ہوئی۔ آنپورنا سب سے لپٹ لپٹ کے رونے لگی۔ ساون کا آخری دن گذر گیا اور آنپورنا کا جھولا نہ پڑا۔

غربت کی مار

سید اعظم حسین مدیر "ادب"

کہنے والے کہتے تھے کہ شریف کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تو اچھا ہوا۔ بچارہ خود ہی غریب ہے لڑکے بالے ہوتے تو انھیں کہاں سے کھلاتا۔ کہاں سے پہناتا۔ سال بھر خون پسینہ ایک کرنے کے بعد تو اتنا اناج ہوتا ہے کہ مشکل سے میاں بیوی جَو کی روٹی اور مٹر کی دال صبح و شام کھالیتے ہیں اور جب کبھی سیلاب آجاتا ہے یا سوکھا پڑ جاتا ہے تو پھر فاقے ہونے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں بھلا دوسروں کی فکر اُن کے سر ہوتی تو کیا کرتے۔ لیکن کوئی ان دونوں سے تو پوچھتا۔ شادی کو پانچ برس ہوگئے تھے مگر اب تک ماں باپ کی گود خالی تھی۔ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا ٹکڑا نہیں تھا۔ ہر گھر میں لڑکے لڑکیاں ہنستے روتے کھیلتے کودتے کھاتے پیتے تھے۔ اُنکے یہاں بالکل اداسی تھی۔

چکّی کی آواز کے سوا اکیلے مکان سے دن اور رات میں کوئی آواز ہی نہیں آتی تھی! گھر ویرانہ معلوم ہوتا تھا! کسے کھلاتے کس سے دل بہلاتے۔ کون "ہوں، ہوں" کرکے اُن سے مچلتا، گاؤں والے الگ طعنہ زن ہوتے۔ طرح طرح کے قصّے مشہور کرتے۔ غرض نہ گھر میں چین تھا اور نہ باہر آرام۔ عجیب مصیبت تھی!

لیکن کچھ ہی دنوں بعد مشیت ایزدی نے کروٹ لی۔ دوا، دعا، تعویذ نہ معلوم کس نے اثر کیا کہ شریف اور شریف بہو کی شاخ اُمید میں ثمر آیا اور انھیں سرخرو ہونے کا موقع ملا!!۔

ماں اور باپ اپنے چاند ہی کا مُنہ دیکھ کر رات کو سوتے اور اپنے آفتاب ہی کا چہرہ دیکھکر صبح کو اُٹھتے تھے کھیت پر ہنسی خوشی جاتے، دل لگا کر ہل چلاتے، پانی بھرتے، گوڑتے، سینچتے، اور پھر خوش خوش واپس آتے تھے۔ راستہ میں کوئی مل جاتا تو دونوں اُنھیں مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے۔ سب ان پر ہنس چکے تھے۔ اب اُنکے ہنسنے کی باری تھی!

غرض غفور کی وجہ سے اُن کے مصیبت کے دن گویا مسرت کے ایام ہوگئے تھے۔ دونوں

دن رات محنت کرتے، خود روکھی سوکھی کھاتے لیکن اپنے بچے کو کوئی تکلیف نہ ہونے دیتے۔ اُسے دودھ دہی کھلاتے!!

——— ۲ ———

آج تک کسی کو نہ معلوم ہوا کہ قدرت کو ان فقیروں کا اپنی کملی میں مست رہنا کیوں پسند نہ آیا غفور دس برس کا مشکل سے ہوا تھا کہ موضع میں طاعون آیا اور شریف اور اُسکی بیوی یکے بعد دیگرے اپنے دلبند پر حسرت و یاس کی نگاہیں ڈالتے ہوئے دنیا سے چلے گئے!

دس برس کی جان، نہ کوئی بزرگ اور نہ کوئی سرپرست! گاؤں میں مارا مارا پھرنے لگا۔ چار دن اِنکے گھر رہتا، چار دن اُنکے گھر۔ جو کھانے کو دیتا جان توڑ محنت بھی لیتا۔ بھلا اتنا فارغ البال اور پُرخلوص کون تھا جو اسے بٹھا کر ماں باپ کی طرح کھلاتا اور خوش ہوتا؟

غفور بڑی مصیبتوں سے سال بھر تک گاؤں میں رہا۔ آخر ایک دن پریشان ہوکر وہاں سے نکلا۔ ٹھوکریں کھاتا ہوا لکھنؤ پہونچا۔ شہر میں اس کا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ وہاں کی ہر چیز اسکے لئے اجنبی تھی۔ غریب در یتیم عجب بیکسی کا عالم تھا! کہاں جاتا، کیا کرتا؟ ادھر اُدھر پھر رہا تھا کہ ایک بوڑھا یکہ بان ایک بڑے مکان کے پاس اپنا یکہ درست کرتا ہوا دکھائی دیا۔ غفور نے اس سے بڑی لجاجت سے پینے کے لئے پانی مانگا۔ یکہ بان نے اُسے بغور دیکھا، قریب بلایا اور پانی پلا کر بہت سے سوال کئے۔ بوڑھے کے چہرے سے شک کے آثار آہستہ آہستہ زائل ہوے اور اطمینان کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں! اس نے نرم آواز میں غفور سے کہا "تم میرے یکے پر رہو۔ ہانکنا سیکھو اور خود چلاؤ۔ محنت و ایمان داری سے کام کرو۔ میرے کوئی لڑکا نہیں ہے۔ اگر تم نے مجھے خوش رکھا تو میں تمہیں جیتے جی اپنے یہاں سے نہ جانے دونگا"

غفور کے لئے یہ سامان غیب سے ہوگیا تھا۔ اُسکی نگاہوں میں یکہ بان فرشتۂ رحمت تھا وہ اپنے مہربان سے وفاداری کا اقرار کرکے اسکے ساتھ رہنے لگا۔

——— ۳ ———

شہر کے اور لڑکوں کی طرح غفور کو گلی کوچوں میں گھومنے کی فرصت نہ تھی۔ وہ ہر وقت کام کرتا۔ گھر سے یکہ لیکر علی الصباح نکل جاتا اور رات نو بجے رات تک واپس آتا۔ روزانہ معلوم شہر کے

کن کن حصوں میں جاتا اور کیسے کیسے لوگوں سے ملتا۔

کچھ دنوں بعد مشاہدے اُسکے دماغ پر اثر ڈالنے لگے۔ اور تجربے اسکے دل کو ملول کرنے لگے۔ جب بھلے آدمی صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے آتے اور اُسکے یکے پر بیٹھ جاتے تو اسے اُس وقت اُنکے پاس بیٹھکر یکہ ہانکتے ہوئے حجاب و غصہ معلوم ہوتا۔ وہ انھیں دیکھتا اپنی چھوٹی سی مَیلی کچیلی دھوتی اور پھٹی ہوئی بنڈی پر نظر کرتا اور پھر دل ہی دل میں کہتا "یہ لوگ اپنے کپڑے اور جسم مجھ سے الگ کیوں رکھتے ہیں؟ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں مجبور ہوں"۔ وہ بہت سے ایسے لوگوں کو بھی دیکھتا جو اسکے یکے پر بیٹھنا اپنی ذلت خیال کرتے تھے۔ اور جو صرف تانگے پر سوار ہوتے تھے اُسے کچھ ان سے بھی زیادہ بڑے آدمی معلوم ہوئے جو موٹر کے علاوہ کسی دوسری سواری کی طرف رُخ بھی نہ کرتے تھے۔ اُن کے لئے تانگے پر بیٹھنا بھی ذلت تھا غفور یکہ ہانکتا اور دن دن بھر یہی سوچتا۔ کوئی اتنا امیر، کوئی اس قدر غریب! دیکھنے میں سب ایک ہی طرح کے انسان ہیں ایک ہی طرح پیدا ہوتے اور ایک ہی طرح مرتے ہیں۔ ایک ہی شہر میں بستے اور ایک ہی طرح سے کھاتے پیتے سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے اور ہنستے روتے بھی! بارہا رئیسوں کو دیکھا اُنکے بھی دو پاؤں دو ہاتھ ناک کان غرض سارے عضو ویسے ہی تھے جیسے ایک غریب کے ہوتے ہیں۔ وہ دیہات کا بسنے والا تھا کھیتوں میں باغوں میں اور چراگاہوں میں گھوما تھا۔ اُس نے ہزاروں سرسبز و شاداب خوشوں کو ایک ساتھ ہوا کے جھونکوں سے جھکتے اور اُٹھتے دیکھا تھا۔ اُس نے گائے بھینس، بیل، بکری سب کو ایک ساتھ کلیلیں کرتے اور چرتے چگتے دیکھا تھا۔ اُس نے جھُنڈ کی جھُنڈ چڑیوں کو ایک ہی درخت پر چہچہاتے اور بسیرا کرتے دیکھا تھا۔ وہ جاہل تھا۔ غیر تعلیم یافتہ تھا۔ نہ تو اس اختلاف و افتراق کے فلسفہ کو سمجھتا تھا اور نہ یہ جانتا تھا کہ اسے اس قدر حقیر و ذلیل کیوں بنایا گیا۔ وہ صرف اپنے آس پاس کی دنیا دیکھتا، دل ہی دل میں کُڑھتا اور سائیسی کے فرائض انجام دیتے وقت اپنے بے زبان رفیق کی پیٹھ پر دو آنسو گرا کر کچھ دل ٹھنڈا کر لیتا!۔

(۴)

غفور کو شہر میں سال ہی بھر گزرا تھا کہ بوڑھے بھٹیارے کو ایک مہینہ کے بخار نے دنیا سے رخصت ہونے پر مجبور کیا۔ مرتے وقت اس بوڑھے نے اپنا پرانا یکہ اور دُبلی پتلی گھوڑی

جو اُسکی کائنات تھی غفور کے سپرد کر دی۔ غفور نے جو کچھ کما کر جمع کیا تھا سب میاں بھٹیارے کی دوا علاج میں خرچ کر دیا کفن دفن کے لئے بیس روپیے ایک دوسرے یکہ بان سے لینا پڑے۔ اور دوسرے روز سے یہ حالت ہوگئی کہ جب دن بھر دھوپ اور لوئیں ادھر اُدھر سے کما کر لاتا تو شام کو کچھ خرید کر کھاتا۔ اب اسکے اور اسکے یکہ گھوڑی کے رہنے کا کہیں ٹھکانا بھی نہ تھا اس لئے کہ بھٹیارے کے مرجانے کے بعد اس مکان کے مالک نے اِس سے خالی کرا لیا۔ دن کی دھوپ اور رات کی اُدس میں غفور صرف اس اُمید پر پڑا رہتا کہ وہ ایک مہینے میں کما کر وہ کہیں کرایہ کا مکان لیگا۔

لیکن ایک ہفتہ ہی بعد سے اُسکی مصیبتوں میں ناقابل برداشت اضافہ ہونے لگا شہر کے ایک "لکھپتی" کی ہوس زر اور بڑھی۔ اب تک اس شہر میں یکے تانگے کے علاوہ موٹر کرایہ پر نہیں چلتی تھی۔ اُنھوں نے موقع کو مناسب سمجھ کر سیکڑوں "ٹیکسیاں" ولایت سے منگوالیں اور کرایہ یکے سے کم کر کے سڑکوں پر دوڑادیں۔ پھر کیا تھا؟ ساری پبلک وقت، پیسے اور آرام کے خیال سے یکہ، تانگا چھوڑ کر موٹر ہی پہ بیٹھنے لگی۔

غفور پہلے ہی دن سرمایہ داروں کی یہ اُپج دیکھ کر بہت متوحش ہوا۔ اسکی پریشاں حالی بالکل اُس مسافر کی سی تھی جو کسی چٹیل میدان میں تنہا جارہا ہو کہ دفعتًہ اسے ایک طرف سے بہت سخت سیاہ آندھی آتی ہوئی دکھائی دے۔ دنیا اسکی نظروں میں اندھیر تھی!

جیسے جیسے دن بڑھتے گئے اُسی طرح موٹروں میں زیادتی اور غفور کی آمدنی میں کمی ہوتی گئی بھلا برق رفتار سواریوں کے آگے یکے کو کون پوچھتا۔ اور پھر یکوں میں وہ یکہ، جسکا چلانے والا عمر طبعی کو پہونچ کر مرچکا تھا۔ نہ ہال درست نہ بم ٹھیک، جوت ٹوٹا ہوا۔ ساز جگہ جگہ سے رسی سے بندھا ہوا۔ اس پر اتنی ہی عمر کی گھوڑی، وہ بھی بے داشت۔ عجب بے سروسامانی تھی۔ سواریاں دُور ہی سے دیکھ کر آنکھیں پھیر لیتیں!۔

آمدنی ایک روپیے سے بارہ آنے، اور بارہ آنے سے آٹھ آنے ہوگئی۔ مفلس غفور کے لئے یہ امارت کی چیرہ دستی ناقابل برداشت ہونے لگی اور وہ دنیا اور ایسی ناانصاف دُنیا سے مایوس رہنے لگا!

موٹر کے ساتھ غفور کا ٹوٹا پھوٹا یکہ بمشکل دو ماہ تک چلا۔ آخر ایک روز غفور یکہ لیکر دن بھر

مارا مارا پھرا، لیکن شام تک کچھ نہ ملا۔ وہ تمام دن خود بھی بھوکا رہا اور اُسکی گھوڑی بھی۔ اب کیا کرتا ؟ سر پکڑکر بیٹھ گیا۔ تھک کر چُور ہوگیا تھا۔ جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ نیم کے درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں بہت سخت بخار آگیا اور وہ بےخبر ہوگیا!

خیال تھا کہ صبح تک بخار جاتا رہیگا لیکن صبح کو بخار رات سے زیادہ ہوا اور طبیعت خراب ہی ہوتی گئی۔ نہ علاج تھا اور نہ تیمار دار۔ اُسے اپنی بیماری سے زیادہ اس بےزبان کی بھوک پیاس کا رنج تھا جو اپنے بےبس مالک کے ساتھ بےموت مَر رہا تھا!۔

تیسرا دن اتوار کا تھا۔ وہ صبح سویرے اُٹھا۔ گھوڑی اور یکّے کو لیکر گرتا پڑتا نخاس پہونچا۔ اب اُسکے گاہک بھی بازار میں بہت کم تھے۔ دوپہر تک دھوپ میں پڑے رہنے کے بعد ایک خریدار پیدا ہوا اور کسی نہ کسی طرح گھوڑی یکہ سب بیس روپیہ میں فروخت ہوا۔

غفور روپیے لیکر اُٹھا ہی تھا کہ سامنے سے اُس کا قرض خواہ کیہان آیا اور اپنے بچّوں کے بھوک سے مرنے کی مصیبتیں بیان کرکے روپیے کا طالب ہوا۔ غفور نے اسے دیکھا کچھ سوچا ـــــ اور کل روپیے چُپکے سے دیدیئے!

وہ وہاں سے دامن جھاڑکر اُٹھا۔ بخار بہت تیز تھا۔ اُفتاں و خیزاں ایک طرف کو چلا۔ سر جُھکا ہوا تھا اور قدم ٹیڑھے سیدھے پڑ رہے تھے۔ کچھ دُور چل کر جب وہ بیچوں بیچ چوراہے پر پہونچا تو اُسے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے موٹر کی کرخت آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔ اُس نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ سامنے سے تین ٹیکسیاں آدمیوں سے بھری ہوئی تیزی کے ساتھ چلی آرہی تھیں۔ اُس نے پیچھے مُڑکر دیکھا۔ ایک رئیس بغل میں ایک حور وش لئے موٹر بھگائے چلے آرہے تھے۔ غفور کا سر چکر کھانے لگا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا۔ قدم آگے بڑھے، پھر پیچھے ہٹے اور وہ ابھی اسی کشمکش میں تھا کہ دونوں طرف کی موٹروں نے بڑھکر اُسکا کام تمام کردیا!!

تبصرہ

شاہکار افسانے

جناب مولوی عبدالقادر سروری صاحب ایم اے - ایل ایل بی اُردو کے اُن نئے محسنوں میں ہیں جو ہر وقت اسی فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اس زبان کے دامن کو دنیا کے جواہر پاروں سے بھر دیا جائے اور اسے جلد سے جلد مغربی زبانوں کے دوش بہ دوش کھڑا کر دیا جائے۔ مولوی صاحب کی اسی سعی مشکور کا نتیجہ یہ افسانوں کا سلسلہ ہے جو "دنیا کے شاہکار افسانے" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے - اس سلسلے کے چودہ حصے ہیں اور دنیا کی تمام زبانوں کے منتخب افسانے اس میں شامل ہیں۔ ہمیں اس سلسلہ کے دو حصے یعنی "قدیم افسانے" اور "چین و جاپان کے افسانے" ریویو کے لئے موصول ہوئے ہیں۔ "قدیم افسانے" مولانا سروری نے خود ہی انتخاب و ترجمہ فرمائے ہیں - "چین اور جاپان کے افسانے" میں افتخار الدین و خواجہ معین الدین صاحبان کی اعانت بھی شریک ہے -

دونوں مجموعے بہترین فسانوں کے حامل ہیں اور مولانا اپنی اس کامیاب سعی پر مبارکباد کے مستحق ہیں - ہمیں امید ہے کہ شائقین اُردو ادب اس سلسلہ کو ضرور ملاحظہ فرمائینگے - اُردو کے فسانہ نویسوں کے لئے مولانا سروری کی اور تصنیفات کی طرح "دنیا کے شاہکار فسانے" کا مطالعہ بھی ضروری ہے - جب تک کہ دوسری زبانوں کے شاہکار نظر سے نہ گزرے ہوں اُردو میں فسانہ نویس بن بیٹھنا عام طور سے دستور ہو چلا ہے - مگر حقیقت میں یہ بڑی جسارت ہے - مولانا سروری ہمارے مصنفوں سے اسی عیب کو دور کرنے کی سعی فرما رہے ہیں اور یہ چودہ حصوں کا سلسلہ اسی سعی کی ایک کڑی ہے -

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سروری اپنی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے افتخار الدین و خواجہ معین الدین صاحبان کے ترجمہ کردہ فسانوں کو خود نہیں ملاحظہ فرما سکے ہیں - ان تراجم میں زبان و محاورہ کی غلطیاں بھی ہیں اور کتابت کی بھی - ایک دوسرا عیب یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ ترجمے میں اصل مصنفوں کی شخصیت اور ان کا انفرادی طرز تحریر غائب ہو گیا ہے - اور تمام مترجم

فسانے ایک ہی مصنف کی تصنیف معلوم ہونے لگے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ مولانا سروری زیر طبع حصص کو خود بغور ملاحظہ فرمائینگے تاکہ چین اور جاپان کے افسانے کے سے معائب اُن شہ پاروں کو برباد نہ کر سکیں اور یہ سلسلہ اُردو ادب میں ایک مستقل اضافے کی صورت اختیار کرے۔

مجموعی حیثیت سے کتابت وطباعت دیدہ زیب اور سلسلہ قابل تعریف ہے۔ ہم ناظرین "ادب" سے متدعی ہیں کہ وہ "دنیا کے شاہکار افسانے" کو اپنے کتبخانوں میں ضرور جگہ دیں۔

قیمت "قدیم افسانے" عہ، ۔ "چین اور جاپان کے افسانے" ۹ر

ملنے کا پتہ :۔ "انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

زنگاری بیگم (منظوم ڈراما)

مصنفۂ مرزا جعفر علی خاں صاحب آثر بی اے لکھنوی پاکٹ سائز حجم ۶۸ صفحے مجلد قیمت ۸ر
مطبوعۂ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔

یہ تین سین کا ایک مذاقیہ ڈراما ہے جسکو ڈاکٹر ایس، ایس، نہرو۔ ایم اے ۔ پی ایچ ڈی۔ آئی، سی، ایس ۔ نے فرانسیسی زبان سے انگریزی زبان میں ماخوذ کیا۔ اور ہمارے محترم جناب نواب جعفر علی خان صاحب بی اے ڈپٹی کلکٹر نے اسے انگریزی سے اُردو نظم میں منتقل کرکے "مئے دو آتشہ" بنایا ہے۔ حضرت آثر نے شروع میں ڈرامے کا پلاٹ اور تینوں سینوں کا خلاصہ نثر میں لکھ دیا ہے۔ جسکے مطالعے سے منظوم حصہ کا مطلب واضح اور لطف دو چند ہو جاتا ہے۔

نظم کی خوبیوں کے لئے حضرت آثر کا نام کافی ہے۔ سلاست و روانی۔ روزمرہ محاورے۔ زندہ دلی اور خوش طبعی کے بہترین نمونے اس مجموعے میں موجود ہیں۔ حضرت آثر جس طرح شرفا کی زبان اور اُنکے محاوروں پر قدرت رکھتے ہیں۔ اُسی طرح وہ ارذال کی بول چال اور پھبتیوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ یہ ڈراما اُنکی اس خصوصیت کو نمایاں طور پر واضح کرتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ حضرت آثر مغربی ڈراما کے شاہکاروں کے ترجمے کی طرف جلد سے جلد توجہ فرمائیں گے۔ نظم و نثر اور زبان و محاورے پر اس طرح کی قدرت حاصل ہونے کے بعد مغربی ادب کے شاہکاروں کا اُردو میں منتقل نہ کرنا اپنی بے مایہ زبان پر ظلم کرنا ہے۔ خدا کرے ہماری بات بے اثر نہ نکلے!

"تعریفِ قلم"

(حضرت شادؔ عظیم آبادی مرحوم)

صورت گرِ لیلائے سخن ہے قلم اپنا　　ہے قوتِ بازو یہی معنی رقم اپنا
یہ سخت مراحل میں رہا ہم قدم اپنا　　اک عمر سے ہمدم ہے یہ والا ہمم اپنا
اس دوست نے چھوڑا نہ کبھی ساتھ ہمارا
لغزش میں پکڑتا ہے یہی ہاتھ ہمارا

اک عمر سے ہے حاملِ الفاظ و معانی　　باقی ہے یہی اگلے بزرگوں کی نشانی
پیری میں لہو ہوتا ہے جوں جوں کم پانی　　بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور اسکی جوانی
ہمت کے علاوہ مجھے طاقت بھی سوا دی
بجھنے لگی جب شمع تو لو اور بڑھا دی

شان اسکی سوا سب سے ہیں انداز نرالے　　اکثر یہی لکھ دیتا ہے جنت کے قبالے
ہم راز نہ جس وقت تلک اپنا بنالے　　کیا منہ جو زباں سے کوئی اک حرف نکالے
طینت کو جو پوچھو تو عجب نیک ہے اسکی
دہری تو زبانیں ہیں یہ بات ایک ہے اسکی

سرمایۂ عزت اسی ساتھی کی معیت　　سرمایۂ دولت اسی منعم کی بدولت
قائم کیے رکھتا ہے یہی شانِ شرافت　　بے اسکی مدد کے نہیں آتی ہے نجابت
بے بس ہے وہی اس سے جو منہ موڑ کے بیٹھا
رو ئیگا لکھے کو جو اسے چھوڑ کے بیٹھا

تابع اسی قوی قد کے ہیں غرب تا شرق　　تیزی ہے یہ ایسی کہ سر افگندہ ہے برق
یہ تہ کی خبر لاتا ہے جس وقت ہوا غرق　　سر کردۂ قلم پاتے ہیں تو کچھ نہ ہوا فرق
دنیا میں کسی کار نمایاں کو نہ چھوڑے
کٹ جائے پہ چھٹتے نہ یہ میداں کو نہ چھوڑے

خالص اُردو

(حضرت آرزو لکھنوی)

جھٹلاتے ہیں جو مجھکو بات اپنی وہ مکر کے
منہ اُنکا دیکھتا ہوں اک ٹھنڈی سانس بھر کے

مرنا کبھی ہے جی کے جینا کبھی ہے مر کے
پھاندا ہے چاہ میں جو ڈوبا اُبھر اُبھر کے

جینا ہی تھا وہ کتنا سب جسکے تین دن تھے
ادھیا چلے ہیں وہ بھی سونے میں رات بھر کے

برسوں کی ترسی آنکھیں پیاسی تھیں دیکھنے کی
اک سانس میں پئے ہیں وہ دو کٹورے بھر کے

کہنے میں بھی جھجک تھی چُپ رہنے میں بھی اُلجھن
سکتے میں آگیا ہوں اک ٹھنڈی سانس بھر کے

آنکھیں بدل کے تو نے اندھیر کر دیا ہے
راتیں یہ ٹہر چلی ہیں دن بیتے ہیں ڈر کے

گر جانے پر گڑھے میں جو پوچھتے تھے مٹی
مٹی وہ بھر رہے ہیں مجھکو گڑھے میں دھر کے

بیچینیوں کے ہاتھوں پارا بنا ہوا ہوں
مرنے کا ڈر ہی کیا ہے پھر جی اُٹھونگا مر کے

بڑھنا او بال جی کا کیا جانے کب رُکیگا
اب تک تو کوئی چھالا بیٹھا نہیں اُبھر کے

او جی جلانے والے مُنہ تمتما اُٹھا کیوں
چُپ ہو رہا تھا میں تو اک ٹھنڈی سانس بھر کے

رونے کو رات دن کے آنسو کہاں سے آئیں
دو ایک بوندیں گرنا وہ بھی ٹھہر ٹھہر کے

بس **آرزو** کہ ملنا اُنکا ہے اُن کے بس کا
جتنے بڑھے تم آگے پیچھے وہ اور سر کے

غزل مرزا جعفر علی خاں صاحب آثر بی اے ڈپٹی کلکٹر

بھول کر اُس نے اک نگاہ نہ کی
پرسشِ حالتِ تباہ نہ کی

کیا ہوا عرش تک گئے نالے
سنگدل تیرے دل میں راہ نہ کی

نہیں انسان وہ، ملک ہے تو ہو
معصیت جس نے گاہ گاہ نہ کی

یہ خلافِ اُمید اُس سے ہوا
بیکسی پہ مری نگاہ نہ کی

گزری ہم غمزدوں پہ جو گزری
شکوہ کیسا اثر کہ آہ نہ کی

غزل نواب حیدر یار جنگ صاحب نظم طباطبائی

ایک دم کو حسنِ گل سے گلشن آرائی ہوئی — اک نظر اس باغ میں شبنم تماشائی ہوئی
اک قدم ہے اندرونِ خانہ اک بیرونِ در — سانس قالب میں جو آئی بھی تو گھبرائی ہوئی
مُڑ کے میں دنیا و عقبیٰ کی طرف کیا دیکھتا — مانعِ وہمِ دو عالم تیری یکتائی ہوئی
باز آئے کب سیہ کاری سے ہم مثلِ قلم — مُدتوں سجدے رہے برسوں جبیں سائی ہوئی
کوئے رسوائی تک آنے کو نہ اُٹھتا تھا قدم — دستگیر آخر کمندِ ناشکیبائی ہوئی
شام سے سوزِ شبِ غم نے مجھے دہلا دیا — شمع کے مُنہ پر جو دیکھی مُردنی چھائی ہوئی

ہے وہی علت عدم کی جو ہے علت کا عدم
باعثِ ہنگامہ اپنی ناشناسائی ہوئی

غزل سیّد مسعود رضا صاحب جذب

کیا کریں گے لے کے ہم نام و نشانِ زندگی — بے نشانی خود بنی جاتی ہے شانِ زندگی
موت نکلی ہے عدم سے پیشوائی کے لئے — آ رہا ہے سوئے منزل کاروانِ زندگی
رحم کر اے یاس ضبطِ عشق کی ہمت نہ توڑ — اور کچھ دن ہے جوانی میہمانِ زندگی
کشمکش میں زندگی بدتر بنی ہے موت سے — موت پر مجھ کو گزرتا ہے گمانِ زندگی
پے بہ پے ناکامیوں پر شکر کے سجدے کروں — کوئی بتلا دو کدھر ہے آستانِ زندگی
وقت سے پہلے اجل آئے تو آ سکتی نہیں — زندگی اپنی ہے گویا پاسبانِ زندگی
دفعتہً پھر بڑھ گئیں دنیا کی دل آویزیاں — کیا ابھی باقی ہے کوئی امتحانِ زندگی
رفتہ رفتہ بے نیازِ زندگی ہو جاؤں گا — ہوتے ہوتے ہو چلا ہوں رازدانِ زندگی

آؤ پھر اک بار دنیا سے بڑھائیں رسم و راہ
بھول جاؤ جذب پچھلی داستانِ زندگی

غزل چودھری سید نظیر الحسن صاحب رضوی فوقؔ مصنف "المیزان" اسپشل مجسٹریٹ جہان

ہمارے حالِ دل کی اُس ستمگر کو خبر کیا ہو
جو نالے بے نتیجہ ہوں تو پھر دل میں اثر کیا ہو

خدا نے جن کو اپنے فضل سے دولت قناعت کی
اُنھیں پروائے عز و جاہ و قدرِ مال و زر کیا ہو

نہ ہووے درمیاں جس وقت تارِ رشتہ محبت کا
کسی کے دل میں مثلِ دانۂ تسبیح گھر کیا ہو

نہیں ہر صبح سے تا شب بھروسہ زندگانی کا
نہیں ہے یہ خبر شب کو کہ ہنگامِ سحر کیا ہو

جگہ باقی نہیں رکھی ہے کچھ رنج و تفکر نے
دلِ محزوں میں جذباتِ مسرت کا گزر کیا ہو

ملا دیتا ہے دانہ آپ کو خاکِ مذلت میں
بھلا پھر سربلندی کے سوا اس کا ثمر کیا ہو

کیا پردہ میں سجدہ سیکڑوں کو حسنِ جاناں نے
جو ہووے بے پردہ روئے غیرتِ شمس و قمر کیا ہو

کھنچی ہے تیغ بھی تیار ہے شمشیرِ ابرو بھی
نہیں معلوم مقتل میں اُنھیں مدِ نظر کیا ہو

نبی کی آل خود جس کشتیٔ ایماں کی حافظ ہو
اُسے اے فوقؔ پھر گردابِ عصیاں کا خطر کیا ہو

غزل حضرت علی بھپرسری مرحوم

در بے اثری دعائے خویشم
فریادیٔ نالہ ہائے خویشم

در روز وصال ہمسر سیما
با خندہ چو صبحہائے خویشم

در ہجر تو ہمچو شمع بزمت
بے شمع رخت غذائے خویشم

عریانیٔ من لباس گردید
چوں تازہ گلے قبائے خویشم

چوں نے کہ بہ نالہ زندہ گردد
دلدادۂ نالہائے خویشم

کس گوش نمی دہد بہ حرفم
شرمندۂ ماجرائے خویشم

در شوق لقائے آں پریرو
نالہ بر خصمہائے خویشم

شد حشر و منم بہ نیمہ راہے
منت کش یارہائے خویشم

مانند ظہیر من علیاً
خار خودم بپائے خویشم

(ماخوذ از دیوان زیر طبع)

غزل مولوی غضنفر علی صاحب غضنفر زیدی

بلبل از چشم کشاید بہ گلِ رخسارش هر سحر چوں مژہ ام خوں چکد از منقارش

بہ قیامت نبود وعدۂ دیدار مگر مطلب آنست قیامت بکند دیدارش

وائے بر غمزدۂ خانہ خراب اے ناصح کہ ز بدبختیِ او چوں تو بود غمخوارش

شیخ در دل ہوسِ دیرِ برہمن دارد هست در دانۂ تسبیح نہاں زنارش

بوالہوس در چمنم گو ہوسِ گل نہ کند نیشتر بر جگر و دل بزند ہر خارش

مقصد و مطلبم از نالۂ شبگیر اِیں ست بخت خفتہ ست بخواہم کہ کنم بیدارش

مرد را تجربہ تنہا نہ بگفتار کند بلکہ سنجند بمیزانِ خرد کردارش

یوسفِ من کہ بود روح و روانِ تنِ پیر ہر کجا ہست الٰہی بسلامت دارش

چوں غضنفر بہ دربارگہِ دوست رسید گلہ نیست دگر از ستمِ اغیارش

رباعیات ممدوح صدر

آزادی و ذکر نیکنامی خوشتر ہر شے کہ کند قدر گرامی خوشتر

بر ہمتِ پستِ تو دو صد نفریں است میگوی ذلت و غلامی خوشتر

آتش بہ حریم خرد و فرہنگ مزن بر شیشۂ ناموس خرد سنگ مزن

با ہر کس و ناکس بردِ صلح برو با مومن و برہمن در جنگ مزن

ہر برہمنی ز بت پرستی بگذشت ہر بادہ کشی از سر مستی بگذشت

ہر کس در سیل زر پرستی غرق است از سر طوفان تنگدستی بگذشت

زیں گونہ کہ دُر ریزہ زبانِ گویاست حقا کہ ہمہ عطیۂ فضل خدا ست

با پستیِ من شعر بلندم بہ مثل گوہر بصدف، صدف بقعرِ دریاست

آثارِ ادبیہ

(۱۰)

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے۔

میر مہر علی اُنس لکھنوی کی ایک مثنوی

میر حسن اور اُنکے بیٹے، پوتے، پروتے اُردو کے نامی گرامی شعرا گزرے ہیں۔ لیکن میر حسن کے سوا اور سب کی شہرت صرف مرثیہ گوئی میں ہوئی۔ اس صنف سخن میں انیس اور اُنکے دونوں بھائیوں یعنی اُنس و مونس نے خاص امتیاز حاصل کیا۔ آثار ادبیہ کے تجسس میں ان حضرت کے مرثیوں کے علاوہ شاعری کی دوسری صنفوں کے نمونے بھی خوش قسمتی سے مجھکو دستیاب ہوگئے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ یہ خانوادہ شاعری ہر طرح کی نظموں پر قدرت رکھتا تھا۔ فی الحال حضرت اُنس مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ نظم پیش کی جاتی ہے۔ یہ نظم کسی کمشنر اور اُسکی کوٹھی اور بنگلے کی تعریف میں کہی گئی ہے اور مثنوی کی شکل میں ہے۔ اہل نظر دیکھیں کہ مثنوی سحر البیان کے مصنف کا پوتا مثنوی نگاری میں کیا درجہ رکھتا ہے۔

اس نظم کا اصل مسودہ خود مصنف مرحوم کے قلم کا لکھا ہوا اُنکے پرنواسے سید محمد جواد صاحب شکیل لکھنوی کے پاس موجود ہے۔ اور اُنہیں کی عنایت سے اُسکی نقل مجھ کو بھی ملی ہے۔

اس نظم کے درمیانی چند شعر رسالہ "مبصر" بابت جولائی و اگست ۱۹۳۰ء میں شائع ہو چکے ہیں ذیل میں مکمل نظم نقل کی جاتی ہے۔

ادیب

مدح کمشنر صاحب

دلا کر مدح اُس والا حشم کی	جہاں میں دھوم ہے جسکے کرم کی
فلک رفعت قمر طلعت حق آگاہ	کمشنر صاحب ذی قدر و ذی جاہ
وہی ہے رونق گلزار اقبال	وہی ہے طرۂ دستار اقبال
رعیت پرور و یکتائے دوراں	عدالت گستر و ذی فیض و ذیشاں
نگین خاتم ملک جہاندار	امین گوہر یکتائے اسرار
شراب فیض سے جسکی ہیں سب مست	نہیں گلشن میں کوئی گل تہی دست
خوشا گلگشت زہے انکی سواری	جلو داری میں ہے باد بہاری

عیاں ہے اسمیں یوں روئے منور — کہ جیسے چاند ہو بدلی سے باہر
نہیں پاتی سواری کو جو صرصر — تو کہتی ہیں پریاں ہو کے ششدر
چلی ہے بوئے گل دوشِ صبا پر — سواری ہے سلیماں کی ہوا پر

تعریف کوٹھی

درِ دولت کی ہے تعظیم واجب — ادب درباں ہے اور اقبال حاجب
بنائی ہے وہ کوٹھی فیض بنیاد — زمانہ جسکے سائے میں ہے آباد
دیا ہے طاق کسرا برتری میں — فلک ششدر ہے اس بارہ دری میں
جو کمرہ ہے وہ اک برجِ شرف ہے — سپیدی بخت کی چاروں طرف ہے
منہ اس میں دیکھ لے بنائے خوش کار — کہ آئینہ ہے ایک ایک اسکی دیوار
زمیں کا نور آنکھوں کی ضیا ہے — غبارِ صحن عالی توتیا ہے
لئے ہے آسماں جاروب زریں — مصفا تر ہے صحن خوش آئیں
سجی ہے کیا قرینہ با قرینہ — بھرا ہے یہاں سلیماں کا خزینہ
کروں کس منہ سے اس کوٹھی کے اوصاف — زمیں جسکی ہے آئینہ سی شفاف
مصفا اس قدر کوٹھی کا ہے فرش — کہ جس پر لوٹ جاتا ہے دلِ عرش
ہر اک شے یوں دھری ہے با قرینہ — جڑا خاتم پہ ہو جیسے نگینہ
رکھے ہیں کس لطافت سے دل آویز — کہیں دنگل کہیں کوچ اور کہیں میز
کہیں ارگن کہیں گھڑیاں عیاں ہیں — ولایت کی کہیں المایاں ہیں
پئے اجلاسِ معشوقانِ مے نوش — برابر کرسیاں رکھے ہیں آغوش
وہ آئینے ہیں دیواروں میں چسپاں — سکندر دیکھ کر ہو جن کو حیراں
لگے ہیں ہر طرف رنگیں جو یہ اوٹ — زرِ گلہائے احمر کے ہیں یہ نوٹ
یہ تصویریں نہیں ہر سو نمایاں — تماشے کو اتر آئی ہیں پریاں
ثنا جھاڑوں کی کیا ہو چشم بد دور — ہر اک یہ جھاڑ ہے گلدستۂ نور
کنول گلدار ہیں وہ رشکِ گلشن — جنھیں دیکھے سے دل ہو جائے روشن
چھتوں پر بھی وہ گلکاری ہے خوش رنگ — کہ جسکو دیکھ کر مانی بھی ہو دنگ
یہ پردے ہیں رخِ عصمت سے آگاہ — چھپے چلمن کے [illegible] ہوا خواہ

ہر اک شے یہاں ہے نایابِ زمانہ　　نہیں دیکھا کہیں یہ کارخانہ

در تعریف بنگلہ

کرو بنگلے کی جانب اب نظارا　　عجب خوبی سے ہے اُسکو سنوارا
رفیع الشان وہ بنگلہ بنا ہے　　کہ جس سے گنبدِ گردوں دبا ہے
زہے شان اس مکانِ خوشنما کی　　یہ بنگلہ ہے کہ ہے قدرت خدا کی
اُدھر ہے مثل کوٹھی کے عمارت　　اِدھر بنگلہ ہے کتنا خوبصورت
منبت کار ہے کیا سقف خوش کار　　ہر اک پٹری ہے جسکی رشکِ گلزار
عجب بیلیں عجب گلکاریاں ہیں　　چمن میں ایسی کب گلکاریاں ہیں
یہ پھول اک پیچ میں جو ہے طلائی　　ثنا خواں جسکی ہے ساری خدائی
بھلا دیجے اُسے کس شے سے نسبت　　بھٹکتی پھرتی ہے ہر سو طبیعت
نئی تشبیہ سوجھی ہے یہ فی الحال　　کہ اس بنگلے کا ہے یہ نجم اقبال
نہ کیوں ہو تازگی باغ سخن میں　　گلِ خورشید پھولا ہے چمن میں
ارم کا در ہے بنگلے کا ہر اک در　　ہوا ٹھنڈی چلی آتی ہے فر فر
کرو چشم بصیرت سے ذرا غور　　تکلف ہے ہر اک کمرے میں اک اور
کہ جس کمرے میں ہو جو چیز درکار　　اُسی جاگہ وہ شے رکھی ہے تیار
زمانے کی وہیں چیزیں دھری ہیں　　تمام اسباب سے میزیں بھری ہیں
کروں اوصاف اُن کمروں کے تا کے　　طلب کرنی نہیں پڑتی کوئی شے
تکلف یہ نیا دیکھا ہے یہاں آج　　نہیں کمرہ یہ اُس کمرے کا محتاج
بس اے اُلفت اب دعا کر با صد اصرار　　کہ ہے عیبِ فصاحت طول گفتار
دعا اس فیض گستر کی ہے واجب　　کہ یہ سلطانِ لندن کا ہے نائب
رہیں آفاق میں شادان و خورسند　　باقبال و حشم صاحب کمشنر
فزوں ہو احتشام و رعب و اجلال　　سدا روشن رہے خورشید اقبال

جہاں میں مرتبہ اُنکا ہو دہ چند
عدو پامال ہوں اور دوست خورسند

"ریختہ"

اس زلفِ جانگزا کو ستم کی بلا کہو
افعی کہو سیاہ کہو اژدہا کہو

ٹک واسطے خدا کے مرا عجزِ جا کہو
عاجز کہو غریب کہو خاکپا کہو

بخشا ہی تیغ زن نے مرے دل کو یہ خطاب
بسمل کہو شہید کہو جاں فدا کہو

عاشق کے دردِ دل کو نہیں صلاح
ہنس کر کہو پکار کہو برملا کہو

شاہِ نجف کے نام کو توں آبرو سے سیکھ
ہادی کہو امام کہو رہنما کہو

تضمین

حیف کیا دن تھے کہ کچھ غم کا نہ تھا مجھ پہ نشاں
حیرت آتی تھی جو کوئی کرتا تھا ہجراں کا بیاں

صدق اس بیت کے ہر لحظہ پہ ناطق ہے زباں
کہ ہمیشہ نہیں رہتا ہے زمانہ یکساں

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

رباعی

دل دِوانہ ہوگیا زلفوں سے اپنی پوچھ لو
ہوش کچھ باقی نہیں آنکھوں سے اپنی پوچھ لو

زخم پیکاں سے جگر دیکھو مرا سب چاک ہے
گر نہیں باور نہیں مژگوں سے اپنی پوچھ لو

"مناقب در راگنی از متخلص بہ یار"

میں اپنے سب مطالب سیدِ ابرار کو سونپا
متاعِ دین و دنیا حیدرِ کرار کو سونپا

مرے سب کام کے مختار جو چاہیں سو کر دیویں
علیِ مشکل کشا کے دونوں برخوردار کو سونپا

مری یہ ناتوانی بیکسی اور بے بسی میری
شہیدِ کربلا کے عابدِ بیمار کو سونپا

حوالے کر دیا ناموس سب خاتونِ جنت کے
میں اپنا خانماں یہ فاطمۃ الاطہار کو سونپا

گدا ہوں تیرے در کا میں ازل سے یا شہِ مرداں
قضا نے ہاتھ لے میرا ترے دربار کو سونپا

مرے ان سب مطالب کا مرا مولا ہی ضامن ہے
بجا ہے دل جو اپنا فی سبیل اللہ کو سونپا

مری آرزوؤں کا علی اللہ مالک ہے
سرِ دشمن اسد اللہ کی تلوار کو سونپا

پھنسا ہوں غم کے دریا میں بنے قاسم خبر لو تم
ہمیں سے ان گنہگاروں کو لے غفار کو سونپا

خدا کی بات سن کر یار شک لائے سو کافر ہو
حشر کا معاملہ سب احمدِ مختار کو سونپا

سمن بغرض قرارداد امور تنقیح طلب

ابتدائے مقدمہ نمبری ۱۵۰ سنہ ۱۹۳۰ء

عدالت جناب سید حسن ارشاد صاحب بہادر منصف مقام اکبر پور

ہری کشن پانڈے وغیرہ مدعیان بنام دیو کی نندن وغیرہ مدعا علیہم

ہری کشن پانڈے ولد ۔۔۔۔ ساکن موضع قبول پور پرگنہ اکبر پور ضلع فیض آباد۔

بنام { ۱- بال گوبند مصر ولد ٹھاکر مصر ساکن موضع قبول پور پرگنہ اکبر پور ضلع فیض آباد۔
۲- بدل پانڈے } پسران بندیسری پانڈے ساکن موضع سید پور عمر ان گنہ اکبر پور ضلع فیض آباد
۳- سہدیو پانڈے } مدعا علیہم

واضح ہو کہ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت دخلیابی کے دائر کی ہے لہٰذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ ۷ ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء وقت دس بجے دن کے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امورات اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جسکے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعوی مذکور کی کرو۔ اور تم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ جملہ دستاویزات کو جن پر تم بتائید اپنی جوابدہی کے استدلال کرنا چاہتے ہو پیش کرو۔

مطلع رہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ تمہاری غیر حاضری میں مسموع اور فیصل ہوگا۔

آج بتاریخ ۱۵ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

مہر عدالت دستخط حاکم بخط انگریزی

نقل عرضی دعوی یا مختصر بیان نوعیت دعوی یا جیسی صورت ہو (حسب قاعدہ ۲ - آرڈر ۵ - مجموعہ ضابطہ دیوانی) وقت حاضری بدفتر منصفی اکبر پور ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک۔

وظلمت سے نکال کر علم و حکمت، دولت و عزت کی شاہراہ پہ گامزن کر دے۔ اکبر، اقبال، چکبست، حفیظ اور جوش نے اُردو شاعری کو بہت کچھ سنبھال لیا ہے۔ اسکا مستقبل پھر بھی بہت افزا ہے۔ مگر ناول نویسی کا فن ابھی تک عہد طفلی سے آگے نہیں بڑھا۔ اسکے لئے بہت زیادہ عمیق نظر اور وسعت مطالعہ درکار ہے۔ ہمارے ناول نویس اسی سے گریزاں ہیں۔ نہ تو وہ فن کی کتابوں کو پڑھتے ہیں اور نہ دوسری زبانوں کی غیر فانی تصنیفات سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ موجودہ تصانیف کا معیار حد درجہ پست ہے۔ اور اس بے اعتنائی و بے پروائی کا ہر طرح مستحق جو اہل علم اس صنف ادب کے ساتھ برتتے ہیں۔

بیگم شاہ نواز راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں مسلم خواتین کی نمائندہ بنا کر بھیجی گئی ہیں۔ آپ نے اخبار "ڈیلی ہیرالڈ" میں ہندوستانی طبقہ نسواں کے متعلق جو مضمون لکھا ہے۔ اسکے بعض مقامات سے گو ہمیں اختلاف ہے تاہم بعض حصے ہم ناظرین کے سامنے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ "بعض حیثیتوں سے ہماری ہندوستانی عورتیں مغرب کی عورتوں سے اچھی حالت میں ہیں۔ اس لئے کہ ہندوستان کی عورتوں نے ہمیشہ سے ملکی تاریخ میں معتدبہ حصہ لیا ہے۔ اگرچہ انکے کام منظر عام پر نہ آئے ہوں مگر انکا اثر بہت زیادہ رہا ہے۔ وہ ہمیشہ سے گھر کی حاکم رہی ہیں .... اسی لئے ہمیشہ شوہروں نے بیویوں سے صلاح لی اور اُن سے نہایت آزادی سے اپنے کاروبار کے متعلق گفتگو کی ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ مغرب کی اکثر بیویوں کو اسکا علم نہیں ہے کہ انکے شوہروں کی آمدنی کیا ہے۔ ہماری عورتوں کو اس قسم کی لاعلمی صرف اس معمولی سی وجہ سے نہیں ہو سکتی کہ وہی خاندان کی دولت کی خزانچی ہوتی ہیں ...... وراثت و جائداد کے معاملات میں میرا خیال ہے کہ ہندوستانی عورتیں مغربی عورتوں سے کہیں اچھی حالت میں ہیں ...... اسلام میں وراثت کے قوانین چودہ سو برس سے معین ہیں۔ ان قوانین کی رُو سے لڑکی کو ایک تہائی اور لڑکے کو دو تہائی باپ کی جائداد سے ملتا ہے ہندوؤں میں بھی عورت ہمیشہ سے موت تک میت کی مستحق رہی ہے۔ یہ ہمیشہ کا رواج ہے کہ لڑکیوں کی شادی کے بعد بھی انکی جائداد انہیں کے نام سے رہے"

"حال ہی میں ہماری عورتوں نے یہ مغربی طریقہ اختیار کیا ہے کہ باپ اور شوہر کے نام سے پکاری جائیں۔ ورنہ وہ ہمیشہ سے اسی نام سے پکاری جاتی تھیں جو پیدائش کے وقت رکھا جاتا تھا۔ ان ناموں میں "بیگم" اور "دختر" کا لفظ بڑھا دیا جاتا تھا۔ خیال یہ تھا کہ زندگی بھر ایک عورت اپنی شخصیت باقی رکھتی ہے ...... اس میں شک نہیں کہ ہمارے یہاں بعض قابل حل معاشرتی مسائل ہیں۔ ان میں رسم پردہ ہے (جس نے عورتوں کو اس امر پر مجبور کر دیا ہے

کہ وہ دنیا کو سوراخوں سے جھانک کر دیکھیں اور سوائے اپنے اعزا کے کسی کو اپنا چہرہ نہ دکھائیں۔ بچپن کی شادی ہے (جسکی تعداد روز بروز تیزی سے کم ہوتی جاتی ہے مگر جسکا وجود اب بھی باقی ہے) اور تعدد ازدواج ہے جو اب تک متروک نہیں ہوا ہے"۔

"بہت سی اصلاحیں کی جا رہی ہیں۔ پردہ بہت تیزی سے اٹھ رہا ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس رسم کی پابند عورتیں خوش نہیں ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ ترقی کے لئے نقصان دہ ہے بچپن کی شادی کو قانون ممنوع قرار دیتے والا ہے...... اور تعدد ازدواج بھی کم ہوتا جاتا ہے...... ہمیں تعلیم کو لازمی قرار دینا ہے۔ یہ جتنا جلد ہو سکے اتنا ہی بہتر ہے ہماری اکثر عورتیں اپنی زبانوں میں لکھ سکتی ہیں اور شریف بیویاں عربی و فارسی بھی پڑھتی ہیں (؟) لیکن ہم اپنی مشرقی تہذیب کی بہترین معنوں میں پورے طور پر تکمیل چاہتے ہیں........"

موقر ہمعصر "معارف" نے اکتوبر کے شذرات میں صوبۂ بہار کی اس "لعنت" کا ذکر کیا ہے جو سرزمین ٹکڈ المد کے زمانہ سے سندبادی بڈھے کی طرح اس صوبے کی گردن پر مسلط ہے۔ اور جسکی وجہ سے غریب اردو اس صوبے کی عدالتوں اور دفتروں سے خارج کر دی گئی ہے۔ ہمارے ہمعصر سے یہ امر غالبًا پوشیدہ نہ ہوگا کہ "ادب" کے محترم محسن اور پچھلی تین کونسلوں کے سب سے سرگرم مسلمان ممبر نواب سید مبارک علی صاحب نے کوئی امکانی کوشش اس "لعنت" کو دور کرنے کی اٹھا نہیں رکھی تھی۔ وہ متواتر دس برس تک اس مسئلہ کو حکومت اور "اکثریت" کے سامنے لاتے رہے۔ انھیں کی کوششوں کا یہ نتیجہ تھا کہ پارسال اتنی بات منظور کر لی گئی کہ امتحانًا اردو خط پٹنہ کمشنری میں جاری کیا جائے۔ نواب صاحب اس کامیابی پر بیحد مسرور تھے اور اس فکر میں تھے کہ وہ ہر صورت سے اپنی مادری زبان کی اہمیت تسلیم کرا کے چھوڑینگے اور قانون بنوا دینگے کہ سارے صوبے میں اردو کو ہندی کے مساوی حقوق حاصل ہو جائیں۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بہار کے سے مرحوم صوبے میں بھی سر علی امام کی صدارت میں پہلی دفعہ لکھنؤ اور دور دور کے ادیبوں کو مدعو کر کے جلسہ کیا گیا اور "ہماری ہندوستانی اکاڈمی" کی سی جماعت ترتیب دی گئی لیکن افسوس یہ ہے کہ نواب صاحب کے تمام خدمات نظرانداز کر دیئے گئے اور زبان اردو کے اتنے زبردست حامی کی ممبری امسال انتخاب کونسل کے موقع پر نذر تعصب ہو گئی۔

ہمیں امید قوی ہے کہ ہمارے محترم نوابزادہ سید محمد مہدی رضوی صاحب اس مسئلہ کو اپنی ممبری کا خاص موضوع بنا لینگے۔ وہ اردو کے ایک دقیقہ رس اور سلیم المذاق قدردان بھی ہیں اور نواب مبارک علی صاحب ہی اردو کے عزیز قریب بھی۔ وہ ہر دلعزیز بھی ہیں خلیق بھی ہیں اور نیکنام بھی۔ انکے لیئے یہ آسان ہے کہ وہ سر علی امام، سر سلطان احمد اور

حوالہ جات

اس کتاب کی تالیف میں حسب ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے

۱ تاریخ تاج المعاصر مصنفہ حسن نظامی۔ مشمولہ
1. Elliot and Dowson History of India as told by its own historians: Vol. II (1867)

۲۔ (الف) طبقات ناصری (منہاج السراج) مصنفہ ابو عمر منہاج الدین عثمان ابن سراج الدین۔
(ب) تاریخ سلاطین شمسیہ ہندوستان۔
2. (a) (b) Elliot and Dowson: Vol. II مشمولہ

3. John Briggs: History of the Rise of the Mohammadan Power in India till A.D. 1612 Calcutta: 1908 Vol. I. PP. 217-22.
۳۔ ترجمہ تاریخ فرشتہ۔

4. Sullivan (Sir Edward) The Princes of India an Historical Narrative of the Principle events from the invation of Mahmud of Ghaznie to that of Nadir Shah: 2nd. edition 1875

5. Stanely Lanepoole: The Story of Nations Series. Mediaeval India Under Mohammadan Rule (A.D. 712-1764)

6. E. Thomas: Chronicles of the Pathan Kings.

7. V.A. Smith: Oxford History of India: Oxford: 1919.

8. Meadows Taylor: A students manual of the History of India.

9 Elphinstone: History of India 5th edition

10 ۱۰۔ محمد طاہر محمد بن عماد الدین حسن نبروازی

یہ کتاب سید جالب صاحب دہلوی مرحوم سابق مدیر روزنامہ ہمت لکھنؤ کے کتبخانہ میں ہے۔ سرورق موجود نہیں۔ اتنا پتہ چلتا ہے کہ کتاب عہد اکبری میں خود شہنشاہ کے ایما سے تصنیف کی گئی ہے میں نے صفحہ ۱۷۵ سے مدد لی ہے۔

مقدّمہ

لین پول (Lane poole) نے کیا خوب کہا ہے:-

"مشرق میں تاریخ کا مفہوم چند سربرآوردہ سلاطین اور مشاہیر فاتحین
کے کارناموں کے تذکرے اور انکے وقائع حیات کا اعادہ ہے اور بس"

لیکن جسکو بمشکل تین سال کامرانی نصیب ہوئی ہو اسکے کارنامے کیا ہونگے اور وقائع حیات کیا؟
سلطان رضیۃ الدین جسکا نام اس کتاب کے سرورق کی زینت ہے کچھ کم چار سال سنہ ۱۲۳۶ء سے
سنہ ۱۲۴۰ء تک تخت دہلی پر متمکن رہی، ایسی سلطنت جسکی بنیاد ہی "فوجیت" کے اصول پر ہو،
اور جو محض فوج کے بل پر قائم اور طاقتور خودسر مطلق العنان ترکی امرا کی تائید پر برقرار اور اُنکی سرکشی
وسرتابی پر زیروزبر ہوجاتی ہو اس کا وجود اور عدم وجود ہی کیا؟ نظام حکومت کے قیام کے لئے
ضرورت ہے کہ حاکم ومحکوم کی قوتوں کا توازن اس طرح سے رہے کہ حکومت کا پلّہ بھاری ہو اور
رعایا کا پلّہ ہلکا، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دونوں پلّے برابر رہیں۔ ورنہ سوتے فتنے بیدار، بغاوتیں دنگا،
شورشیں برپا ہونگی اور بدامنی وطوائف الملوکی کی موج شیرازہ سلطنت کے اجزا کو منتشر کرکے
اپنے گرداب میں لے لیگی۔

کہنے کو تو شمس الدین التمش کا دور ایک عہد زریں تھا جس میں ملک مالا مال، خزانہ پُر،
رعایا سرسبز، وسائل وسیع۔ فتوحات کثیر۔ امن کا راج تھا اور پھر حکومت کی بنیادیں مستحکم اور
غیر متزلزل تھیں لیکن اس استحکام کا راز صرف یہ تھا کہ اسکی عنان ایک محکم گیر ہاتھ میں تھی۔ اور
ایسا شخص برسر حکومت تھا جس میں قرون وسطی کے تمام ضروریات حکومت موجود تھے لیکن مسلمانوں
کے عہد اولیں میں وہ اُن بدقسمت ہندوستانی ترکی سلاطین میں تھا جو اپنی سیاست وتدبیر اپنے
ساتھ لے گئے۔ اور جو جانشین چھوڑ گئے ان میں نہ کسی کے پاس ایسا دماغ تھا جو تدبیر سے حکومت
کی گتھیوں کو سلجھا سکے، نہ بازوؤں میں اتنی قوت کہ ہر آن وہر دم سیف زنی کرسکے۔ اور نہ اتنی جرأت

کہ منچلے بات بات پر بپھر جانے والے رفقا کو ٹھنڈا کر سکے۔ اسکی آنکھ بند ہونا تھی کہ ہندوستان[1] کی قبائے امن کا دامن چاک چاک ہوگیا۔ دس سال تک اسکی اولاد یکے بعد دیگرے تخت دہلی پر متمکن ہوتی رہی لیکن سلطنت کے اعضا و جوارح کا اضمحلال بڑھتا گیا۔ اور دہلی ایک ایسے مستقل بھیانک ڈرامہ کا اسٹیج بن گئی جس میں امرا کا ایکٹ نمایاں تھا جو گمنامی کے پردوں سے نکال کر کبھی ایک شہزادے کو تخت پر بٹھاتے تھے اور جب وہ طائر بے بال و پر کی طرح پھڑپھڑانے لگتا تھا تو اسکو معزول کرکے دوسرے شہزادے کے سر پر تاج رکھ دیتے تھے۔ اس سلسلہ کا پہلا حکمراں فیروز ایک خوش رو، رحم دل، کریم النفس، ناتجربہ کار سادہ لوح نوجوان تھا جس نے صاحب اقتدار ہوتے ہی امرا پر کرم کی وہ بارش کی کہ التمش کا معمور خزانہ خالی ہوگیا۔ اور جب ارکان حکومت کے دامن کو اس طرح بھر چکا تو اپنے گمان فاسد میں نچنت ہوکر امور سلطنت سے آنکھ بند کرکے لہو و لعب میں مستغرق ہوگیا۔ معاصر مورخ لکھتا ہے:-

"خدا کی پناہ! بے حسی، عیش پرستی۔ سفلوں اور نا اہلوں کی صحبت، قاروں کا خزانہ ہو تو خالی کرادے۔ سکندر اعظم کی سلطنت ہو تو نیست و نابود کرادے"

فیروز کی ماں حکومت کرتی تھی اور مدہوش بیٹا سلطنت سے بے پرواہ غفلت کے نشہ میں سرشار تھا۔ بمشکل سات ماہ گزرے ہونگے کہ امرا نے دونوں کا خاتمہ کرکے تاج اسکی بہن رضیہ کے سر پر رکھ دیا جو ہندوستان کی سلک سلاطین میں واحد سلطانہ ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مشرق کی دنیائے اسلام میں صرف تین عورتیں سر برآرا ہوئی ہیں اور تینوں تیرھویں صدی عیسوی میں۔

شجر الدر سلطان صلاح الدین کے بھتیجے کی ملکہ جس نے لوئی نہم (Louis IX) کی صلیبی سپاہ کے دانت کھٹے کئے تھے ۱۲۵۰ء میں ممالک مصر کے تخت پر جلوہ افروز تھی، شیخ سعدی کے مربی خاندان کی آخری تاجدار عبیش کم و بیش ربع صدی تک اس ہنگام میں جب کہ مغلوں کا سیل فتوحات بلاد شرق میں تلاطم برپا کرتا ہوا بڑھ رہا تھا حکمراں تھی اور ہندوستان میں التمش کی دختر سلطانہ رضیۃ الدین نے کچھ کم چار سال تک کامرانی کی تھی۔

اس اعتبار سے کہ ہندوستان کے مسلمان سلاطین نے جنہوں نے ۱۲۰۶ء سے

---

[1] ہندوستان سے مراد شمالی ہندوستان اور بالخصوص قلمرو سلطنت دہلی۔ معاصر مورخین نے بھی ہندوستان سے یہی مراد لی ہے۔

سنہ ۱۸۵۷ء تک تقریباً ساڑھے چھ سو برس دہلی کو زیرنگیں رکھا۔ رضیہ واحد سلطانہ ہے۔ اور اس نظر سے بھی کہ باوجود صنف نازک کی خلقی کمزوریوں کے ساڑھے تین سال کے عرصہ میں اُس نے اپنی استعداد و قابلیت، تدبر و سیاست، شجاعت و دلیری سے جو مردانگی کے جوہر ہیں۔ اس امر کا نمایاں ثبوت دیا کہ اگر ہندوستان کے قرون وسطی کی سیاسی فضا اور حالات اسکو موقع دیتے تو وہ اپنے بڑے باپ کی بُری جانشین نہ ہوتی، اسکی مختصر زندگی شوق و دلبستگی کے ساتھ مطالعہ کی مستحق ہے ورنہ قرون وسطی کی اسلامی سلطنت ترکیہ اپنے عناصر کی یکسوئی کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اس کے خونیں عبرت خیز مناظر کو بار بار پیش نظر کیا جائے، نہ ساڑھے تین یا کچھ کم چار سال کا وقفہ اتنی وسعت رکھتا ہے کہ اسکے واقعات کے تنگ دامن کو پھیلایا جا سکے۔

شہنشاہ حسین رضوی

ارشاد منزل، وکٹوریہ اسٹریٹ
لکھنؤ
ستمبر سنہ ۱۹۲۹ء

ہندوستان ۱۲۳۶ء میں

وفات التمش وجلوس رضیہ

غور
افغانستان
غزنی
ملتان
راوی
پانی پت
دہلی
راجپوتانہ
اجمیر
مارواڑ
گوالیار
کالنجر
سلطنت اسلامیہ
تبت
بنگال
دکن
خلیج بنگال
بحیرہ عرب
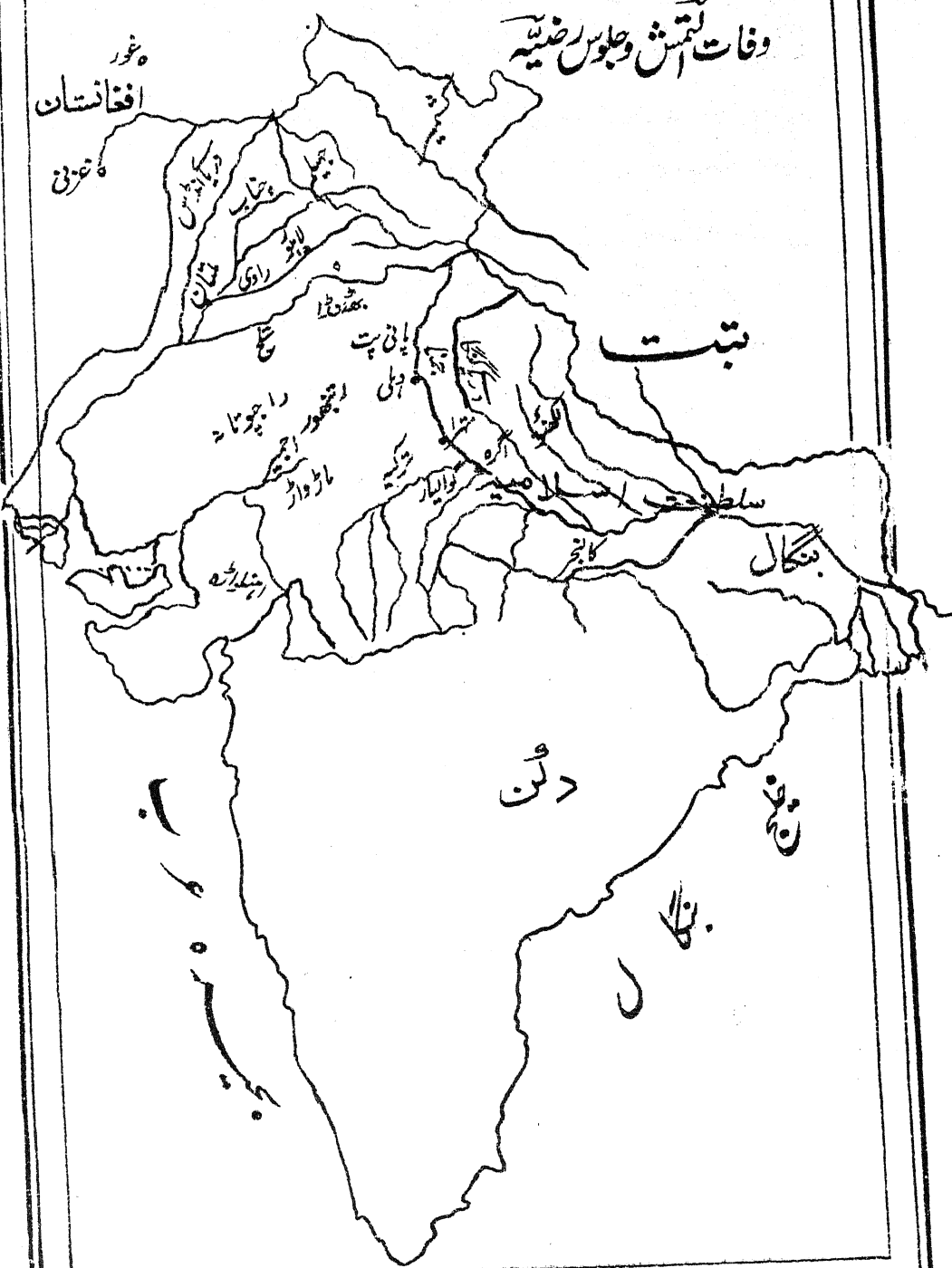
سلطان رضیۃ الدین

باب اوّل

مسلمان ہندوستان میں

ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ ۷۱۲ء سے شروع ہوتی ہے اور یہ اُس زمانہ سے جبکہ نوجوان مگر بدنصیب جنرل محمد بن قاسم کے زیر کمان عربوں کے ایک غارت گر گروہ نے بلاد مشرق کو زیر وزبر کر کے سندھ کی زرخیز وادی پر اسلام کے علم کا پرچم لہرایا مگر دہلی میں اسلامی سلطنت کا آغاز ۱۲۰۶ء سے ہوتا ہے اور یہ اس وقت جبکہ شہاب الدین محمد غوری کے نائب سلطنت قطب الدین ایبک نے ہندوستان کی آب و گل پر فریفتہ ہو کر آخر کار دہلی کو پایۂ تخت قرار دے کر اپنی سلطنت غلامان کی بنیاد ڈالدی۔

غلاموں نے چوراسی سال تک حکومت کی اور اُنکے متعدد سلاطین یکے بعد دیگرے سر برآرا ہوئے۔ وہ ترکی النسل تھے اور اسلامی فتوحات کی موج کے بڑھنے اور ترکستان کے مسلم فاتحین کے زیر نگیں ہونے کے بعد ہی رسول عربی کا کلمہ پڑھنے لگے تھے اور اب اُس ہمہ گیر اخوت اسلام کی آغوش میں آگئے تھے جس میں آقا و غلام ایک درجہ رکھتے تھے۔

اسلام اور غلامی اسلام میں غلامی کی مذموم رسم ملامت و نفرین کا تودہ ہے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مشرق میں غلامی نے بڑی بڑی شخصیتیں پیدا کی ہیں؟ - اگر ایک لائق باپ کے نااہل فرزند نے پسر نوح کی طرح بدوں کی صحبت میں بیٹھکر خاندان نبوت گم کر دیا ہے تو اُس کا غلام آقا کی رفاقت کے صدقہ میں اُسکا ہمسر ہو گیا ہے - اسباب ظاہر ہیں - باپکے اوصاف حمیدہ بیٹے میں پیدا ہو بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی - یہ فطرت کا قانون ضرور ہے لیکن مستثنیات کے ساتھ، اس طرح اگر ہنر اپنے پدر کے عادات و خصائل ورثہ میں پائے تو سو محروم بھی لے ہے - مزید براں باپ کی بیکراں شفقتیں اور لاڈ اکثر اولاد کی تعلیم و تربیت میں مزاحم بھی ہوتے ہیں لیکن دوسری طرف نہ لاڈ ہے نہ پیار، بلکہ

ایک قہری فطرت، جو غلام کی ہر ہر قدم پر معلم ہے اور مربی، اسکی زندگی کا نصب العین آقا کی خوشنودی اور رفاقت ہے۔ اور بس، لہذا اگر آقا نے غلام کے حال پر ترس کھایا۔ اور اُس کے ساتھ پدرانہ شفقتوں سے پیش آیا تو پھر غلام کے تربیت یافتہ اور ہونہار ہوتے ہیں کوئی شبہ ہی نہیں۔ اور بلاتامل کہا جاسکیگا کہ جس قدر آقا کی شفقتوں سے رفاقت کا میدان وسعت ڈھونڈھیگا اسی قدر جاں نشینی کے انعکاس کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جائیگا اسپر بھی اگر غلام غلام ہی رہا تو اسکی قسمت پر مہر

مسلم فاتحین کی زندگی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے ہزاروں سرکیفت رفقا پیدا کرلئے تھے جن میں اکثر کی اصل غلامی سے شروع ہوتی ہے۔ سلجوقیہ خاندان کی عظیم سلطنت شاہد ہے کہ صرف شخص واحد کی مساعی سے غلام سلاطین کا ایک طویل سلسلہ عرصۂ شہود میں آیا سلطان ملک کے مملوک گارڈ (پاسبان) نے غلام سلاطین کا ایک اسکول، تیار کیا جس نے اسلام کی تاریخ میں ممتاز جگہ پائی۔ اور اپنے دامن کو دنیا پاک کیا کہ غلامی کا دھبہ نابود ہو گیا۔

اسلام میں غلامی کبھی کلنک کا ٹیکا یا بدنما داغ نہ تھی بلکہ فاتحین اسلام کے ہاتھوں میں پہنچکر وہ ایک طغرائے امتیاز ہوگئی تھی۔ اور اگر مبالغہ نہ ہو تو بلاتامل کہا جاسکتا ہے کہ غلامی درحقیقت مفتوح یا قوم مسلم کے لئے ایک نیا میدان زندگی تھی جسمیں مستقبل کے تیرہ و تار ہونے کے خوف سے زیادہ اُسکے چمک جانے کی توقعات تھیں۔ ملک شاہ کا غلام ہونا ایک بڑا اعزاز تھا یہی وجہ ہے کہ سلاطین سلجوقیہ اپنی اصل پر ہمیشہ ناز کرتے تھے اور جب ایک کے بعد دوسرے کے ہاتھ میں عنان حکومت جاتی تو وہ ورثہ میں اپنے مورث کی وہ روایات پاتا جو اُسکے کیرکٹر میں چار چاند لگا دیتیں۔

قریب قریب یہی حالت تیرھویں صدی عیسوی میں مملوک سلاطین مصر کی تھی اور اسی سے ملتی جلتی شہاب الدین محمد غوری کے غلام سلاطین ہند کی،

جب کوئی شخص اُسکے (شہاب الدین محمد غوری) کے لاولد ہونے پر اظہار تاسف کرتا تو وہ برافروختہ ہو جاتا اور بے اختیار کہتا

"کیا میرے ترکی غلام میری اولاد نہیں ؟"

غوری کے چار غلاموں نے ہندوستان میں شہرت پائی اور بڑے نام کئے۔ یلدوز افغانستان کے کوہستان میں۔ قباچہ انڈس کی وادی میں۔ بختیار بنگال میں اور ایبک دہلی میں۔

قطب الدین ایبک
سنہ ۱۲۰۶ء تا سنہ ۱۲۱۰ء

اوّل الذکر تین غلام ہمارے موضوع سے بے تعلق ہیں اور آخر الذکر ایبک ہی وہ شخصیت ہے جس سے خاندان غلامان کا سلسلہ چلتا ہے اور جس کی نسل[1] میں تو نہیں لیکن تخت میں التمش اور رضیہ کی حکومت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

'ایبک' کے معنی "مہرو" ہیں اور وہ تھا بھی غضب کا حسین۔ وہ ترکستان سے خراسان میں بچہ لایا گیا تھا اور اپنے آقا قاضی نیشاپور کے دامن عاطفت میں تربیت پا رہا تھا۔ جب جوان ہوا تو بخارا کے کارواں کے ساتھ غزنی کی بردہ بازار میں بھیج دیا گیا جہاں طالع کی یاوری سے شہاب الدین غوری نے اس کو پسند کر کے خرید لیا۔ اُس دن سے ایبک کے بھاگ جاگ گئے اور اُس نے چمکنا شروع کر دیا۔

ایبک بہادر اور دلیر تھا اور اپنے آقا کا بڑا رفیق تھا۔ تھوڑے ہی زمانہ میں اُس نے اپنے آقا کے دل کو مسخر کر لیا اور اعتماد قائم کر کے اپنی وفاداری و رفاقت کا وہ سکہ جمایا کہ جب پرتھی راج کی شکست کے بعد ہندوستان فاتح کے زیر تسلط ہو گیا تو شہاب الدین نے ایبک کو اپنا نائب سلطنت مقرر کر کے ہندوستان کی طرف سے رخ پھیر لیا۔

حسن نظامی معاصر مورخ[2] نے قطب الدین ایبک کے دور نیابت کے فتوحات اور کارناموں پر مفصل تبصرہ کیا ہے لیکن ہم کو اس بحث سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم ایبک کے صرف اُس عہد سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو شہاب الدین محمد غوری کی وفات کے بعد سے شروع ہوتا ہے یعنی جب وہ سنہ ۱۲۰۶ء میں دہلی میں ایک اسلامی مرکزی حکومت کی بنیاد ڈالتا ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کا سرورق ہے۔ ایبک کی سلطنت ہی وہ خشت ہے جس پر عمارتیں بنیں بھی اور بگڑیں بھی، لیکن ان کے آثار سنہ ۱۸۵۷ء تک کسی نہ کسی طرح ضرور قائم رہے۔

قطب الدین ایبک نے آقا کے مرنے کے چند سال بعد گھوڑے سے گر کر سنہ ۱۲۱۰ء میں وفات پائی۔ اور دہلی کی نوخیز سلطنت کی قسمت کو ایک نا اہل فرزند کے ہاتھ میں چھوڑا۔ جو اسکے بعد گدی کا

---

[1] التمش کو ایبک کی دختر منسوب تھی، اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے کہ رضیہ اور التمش کی دوسری اولادیں جو دہلی کے تخت پر متمکن ہوئیں۔ قطب الدین کی نسل سے تھیں صحیح ہوگا۔ لیکن جو خاندان کہ التمش سے شروع ہوتا ہے وہ منہاج السراج میں "خاندان سلاطین شمسیہ ہند" کے نام سے موسوم ہے۔

[2] تاریخ تاج المعاصر مصنفہ حسن نظامی

متحمل نہ ہو سکا۔ لیکن ایبک کے غلام التمش نے جو اپنے آقا کے دامن عاطفت میں تربیت یافتہ تھا اور ہندوستانی سیاسیات کے نشیب و فراز دیکھے ہوئے تھا آرام کو معزول کر کے سر بر آرا ہو گیا۔ اور تقریباً ربع صدی تک اس آن بان سے حکومت کرتا رہا کہ استحکام سلطنت کا اہم کام جو ایبک کی ناوقت موت سے ناتمام رہ گیا تھا تکمیل کو پہونچ گیا۔ اس اعتبار سے اگر یہ کہا جاوے کہ قطب الدین ایبک نہیں بلکہ شمس الدین التمش ہی سلطنت غلامان کا بانی تھا تو بیجا نہ ہوگا۔

شمس الدین التمش
سنہ ۱۲۱۲ء تا سنہ ۱۲۳۶ء

التمش کے لغوی معنی "دست گیر" ہیں۔ سر ایڈورڈ سیلون (Sir Edward Sullivan) لکھتا ہے[1]۔

"التمش تاتار کے ایک بڑے سردار[2] کا لڑکا تھا۔ یوسف کی طرح اسکے بھائیوں نے شکار کے بہانہ سے اسکو لیجا کر بردہ فروشوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ جنھوں نے اسکو والی بخارا کے ہاتھ بیچا۔ والی نے التمش کو اپنی اولاد کی طرح پالا اور تعلیم و تربیت کی۔ چند سال بعد شفیق آقا کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور وہ پھر بکا۔ جن تاجروں کے ہاتھ میں وہ پہونچا تھا وہ اسکو جنس گراں خیال کر کے غزنی کے بازار میں لائے۔ جہاں اسکے حسن و جمال کا چرچا سلطان محمد غوری کے کانوں تک پہونچا لیکن قیمت طے نہ ہوئی اور وہ پھر بخارا پہونچا دیا گیا۔ ایبک نے التمش کو دیکھا تھا اور اسکے شکل و شمائل، سیرت و خصائل کا گرویدہ ہو گیا تھا لیکن آقا کے خوف سے جرأت نہ کرتا تھا۔ جب سلطان سے معاملہ طے ہونے کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اس نے بصد ادب عرض کیا کہ غلام کو خریدنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ سلطان نے اجازت دی اور پچاس ہزار[3] سکہ رائج الوقت میں التمش خرید کیا گیا۔"

التمش نے قصر سلطانی میں نشو و نما پائی اور شہزادوں کی طرح اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ فنون جنگ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اس کو میدان عمل میں لایا گیا۔ اور

---

[1] Sullivan: The Princes of India P. 116

[2] التمش کا باپ بالم خاں قبائل البری ترکستان سے تھا۔ منہاج السراج صفحہ ۳۲۰ Elliot and Dowson

[3] یہ قیمت سر ایڈورڈ سیلون نے لکھی ہے۔ میں نے کسی دوسری تاریخ میں نہیں دیکھی۔ معلوم نہیں سر ایڈورڈ نے کس شہادت پر وثوق کیا۔

ابتداءً سپہ سالار[1] ایماندار کی فوجی خدمت پر مامور کیا گیا۔ لیکن جب اُس نے اپنی استعداد و قابلیت سے بہت جلد ثابت کر دیا کہ وہ بالاتر اعزاز کا مستحق ہے، تو ۵۹۶ھ میں گوالیار کا والی مقرر کیا گیا۔ رفتہ رفتہ سلطان کے دل میں اعتماد بڑھتا گیا۔ اور التمش سلطنت میں نمایاں ہونے لگا۔

لین پول (Lane poole) نے آقا و غلام کا کیا خوب توازن کیا ہے۔ اگر شہاب الدین محمد غوری نے ایبک سا خوش رو بہادر، وفادار غلام پایا تھا۔ تو قطب الدین ایبک کو بھی التمش سا حسین و جمیل، شجاع و جری، باصفا و باوفا غلام مل گیا جس نے اسکے نام کو اُسی قدر روشن کیا جس قدر ایبک نے اپنے آقا کا۔

صاحب منہاج السراج التمش کا تعارف حسب ذیل الفاظ میں کرتا ہے:۔

"التمش اپنے حسن ظاہر و باطن میں اپنی آپ مثال ہے۔ تاریخ میں ایسے افراد شاذ ہیں جنہوں نے محض اپنی دیانت و صداقت، شجاعت و سخاوت سے سند شاہی حاصل کی ہو۔"

التمش نے طبقۂ امرا میں اقتدار حاصل کر لیا تھا اور اس قدر محبوب ہو گیا تھا کہ جب اسکے آقا کی وفات کے بعد اسکے فرزند نے اپنی بے استطاعتی سے ثابت کر دیا کہ وہ حکومت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا تھا تو امرا نے ہم آہنگ و ہمزبان ہو کر تاج شاہی اسکے سر پر رکھ دیا۔

التمش نے ایبک کی قائم کردہ جدید سلطنت کے دست و بازو کو تقویت دی۔ اُس کے مردہ قالب میں تازہ روح پھونکی۔ رقیب ہمسر ریاستوں کو سرنگوں کیا۔ فتوحات کئے۔ ملک کو وسعت دی۔ مغلوں کے سیل گراں کو روکا لیکن وہ ایبک کی طرح اپنا سا اہل جانشین نہ پیدا کر سکا۔ اس اعتبار سے ایبک کو التمش پر ضرور فوقیت تھی کیونکہ اگر ایبک سلطنت غلامان کی بنیاد ڈال کے اسکو مستحکم نہ کر پایا تھا۔ تو اُس نے اپنا جانشین ایسا چھوڑا تھا جو اسکا ہمسر تھا اور اُسکے دامن سے جاتی دُنیا کی تمام آرزوئیں وابستہ تھیں لیکن التمش کی کثیر اولاد[2] باپ کے اوصاف سے محروم تھی نہ اُسکے غلاموں کی تربیت آقا کی طرح ہوئی تھی اور نہ اُنکو امور سلطنت میں عملی حصہ لینے کا موقع ملا تھا

---

[1] صاحب منہاج السراج کی رائے میں وہ قصر سلطانی کے نگہبان دستہ کا سردار مقرر کیا گیا۔
صفحہ ۳۲۲ Elliot and Dowson

[2] (Sullivan) سلیوان نے التمش کی بیس اولادیں تحریر کی ہیں۔

یہی تو وجہ تھی کہ التمش کی شمع حیات کے گل ہوتے ہی سلطنت دہلی کی بنیادیں متزلزل ہو کر سراب نظر آنے لگیں۔ رکن الدین فیروز باپ کا متضاد تھا یعنی التمش کو جن مشاغل سے قلبی تنفر تھا وہی فیروز کا شغف، حکومت کو تعیش سے بیر ہے سات ماہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ "سلطان کش و سلطان گر" امرا نے بیٹے کو گھڑی گھر میں سلا دیا اور وہ دختر جو التمش کی جان و روح تھی۔ اور جس پر باوجود صنف نازک کی فطری کمزوریوں کے باپ کی نظر انتخاب اٹھ اٹھ کر رہ گئی تھی، دہلی کے تخت پر جلوہ گر ہو گئی۔

سر ایڈورڈ کے قول کے مطابق شمس الدین التمش نے اپنی حیات ہی میں سر دربار رضیہ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا، اور امرا سے حسب ذیل الفاظ میں خطاب کیا تھا۔

"یاد رکھو حکومت کا بار بہت گراں ہے، میرے بیں لڑکے ہیں لیکن سب نا اہل، ان میں ایک بھی اس بار کو سنبھال نہیں سکتا، رضیہ میری دختر ہے لیکن باوجود عورت ہونے کے اپنے بھائیوں سے ہر اعتبار سے فوقیت رکھتی ہے۔ اور مجھے وثوق ہے کہ جو کام اُس کے تمام بھائیوں سے انجام نہ پا سکتا تھا وہ تنہا اس کو انجام دے سکتی ہے"۔

بابِ دوم

قرون وسطی میں سلطنت اسلامیہ دہلی

قرون وسطی میں ہندوستان کی اسلامی ترکی سلطنت دنیائے اسلام کی دوسری سلطنتوں سے اپنی نوعیت میں کسی طرح جداگانہ نہ تھی اور اسکی ترکیب اُن ہی عناصر سے ہوئی تھی جو مشرق کی چھوٹی بڑی سلطنتوں کے نظام حکومت کے ستون تھے۔ اس مقام پر چند سوالات خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ سلطان کی حقیقت کیا تھی اور اُسکے اختیارات کے حدود کیا تھے؟ حاکم و محکوم میں تعلق کیا تھا؟ ان میں ارتباط کا رشتہ کن وجوہ کے ماتحت قائم تھا اور کیوں ٹوٹ جاتا تھا؟ حکومت کا قیام کن اسباب سے ظہور میں آیا تھا اور اسکے بقا کی کیا توقعات تھیں؟

امراء کی قوت کا راز کیا تھا اور کیونکر ان کو حکومت کا آلہ بنایا جا سکتا تھا؟ —

ہم ان سوالات پر تفصیلی نہیں تو مجمل بحث کرینگے۔

سلطان | قرون وسطی کے مشرق اور بیسویں صدی کے مشرق میں مشرق و غرب کا فرق ہے
یہ وہ زمانہ تھا جبکہ نہ نظام اساسی کا کوئی خیال پیدا ہوا تھا، نہ آزادی کا خواب پریشاں کسی نے
دیکھا تھا۔ نہ جمہوریت کی داغ بیل پڑی تھی، نہ حقوق مدنیت کا کسی کو احساس تھا۔ یہ سب جدید
تحریکات ہیں جن سے ہمارا قدیم مشرق ناآشنا تھا، مشرق کی حکومت یا نظریہ سلطنت کی تعبیر سلطان تھا،
وہ ایک ایسی خود مختار شخصیت تھی جسکے آگے خدا کا نام تھا، اُس وقت نہ کوئی ضابطہ تھا نہ
قانون، بلکہ ملک کا آئین اگر کوئی تھا تو خود سلطان کا لب قانون ساز، اسی طرح قرون وسطی کے
سلاطین کے غیر محدود و غیر متناہی اختیارات قوانین اور ضوابط کی زنجیروں میں پابند نہ تھے۔ جو
سلطان کی زبان سے نکل جاتا وہ پتھر کی لکیر تھا اور اگر اسکی تنسیخ یا کم از کم ترمیم ممکن تھی تو سلطان ہی کے
نظر کرم پر۔

کہنے کو تو وزارت بھی تھی اور وزرا بھی، لیکن وزرا کسی مفہوم میں نائب یا مشیر سلطنت
نہ تھے، بلکہ وزارت درحقیقت اُس جلیل المنزلت عہدہ کا نام تھا جسکے متعلق احکام و فرامین سلطانی
کی تعمیل و نشر کی خدمت تھی، اس اعتبار سے قرون وسطی کی سلطنت خالص شخصی حکومت تھی
جو کسی نظام کی محتاج نہ تھی۔

حاکم و محکوم کا تعلق | حاکم و محکوم میں اگر کوئی رشتہ ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ارتباط فاتح کی قوت کی فوقیت
اور مفتوح کے ساتھ مساوات و رواداری برتنے سے قائم تھا، جب کوئی فاتح کسی ملک کو فتح کر لیتا
تو رعایا بلا چون و چرا اسکے سامنے سر اطاعت خم کر دیتی تھی۔ اور یہ اطاعت اس وقت تک قائم رہتی
جب تک کہ سلطان کے دست و بازو میں بزور شمشیر حکمرانی کی قوت تھی، دوسرے الفاظ میں قرون
وسطی کی سلطنت اسلامیہ دہلی کی بنیاد محض "فوجیت" کے اصول پر تھی۔ اور اسکی پشت پناہ ایک
جرار سپاہ تھی، جسکے بل پر وہ حکمرانی کرتا تھا، لیکن اگر سلطان کی قوت میں اضمحلال رونما ہوتا تو حکومت
کے اعضاء و جوارح پر تشنج طاری ہو جاتا تھا اور سلطنت کے قدم ڈگمگانے لگتے تھے۔ ایسے حالات میں
امن کا قیام اعجاز تھا۔ یہ خیال کرنا چاہیے کہ بیشتر سلاطین کے عہد میں بغاوت و سرکشی کا جو عنصر شر انگیز

انجام ہوتا رہا تھا اُس کا خوف یا ہندوستان کی ضرب المثل نمک حلالی کی روایات اور قدیم وفاداری کا جذبہ اضطراب کی آگ کو مشتعل ہونے سے مانع تھا۔

مساوات و رواداری | قرون وسطیٰ کے سلاطین دہلی کا مذہب اسلام تھا اور رعایا جس پر وہ حکومت کرتے تھے اپنے فرسودہ روزگار قومی مذہب ہنود کو سینہ سے لگائے ہوئے تھی۔ اس اختلاف کے باوجود جب تک رعایا اپنے سلطان کی مطیع تھی اسکو اپنے مذہبی جذبات کے مضروب ہونے کا ذرا بھی اندیشہ نہ تھا، نہ حکومت ہی کو رعایا کے مذہب سے کوئی سروکار تھا۔ اور حکومت بے حس و حرکت دیوتاؤں کی عبادت سے چشم پوشی اور اصنام پرست خلقت سے مساوات برتتی تھی۔ مشہور ہے کہ مسلم فاتحین نے ہندو معابد کی بے حرمتی کی اور بُت توڑے لیکن اس دعویٰ کی تائید میں معاصر مورخین کی تصانیف سے مثالیں نہیں مل سکتیں۔ بلکہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مسلم سلاطین دہلی کے دل میں ہندوؤں کے مذہبی حسیات کی اتنی ہی وقعت تھی جتنی اپنے اسلامی جذبات کی۔ جو چیز کہ سلاطین دہلی کو مشتبہ نظروں سے دکھلاتی ہے اسکا راز حقیقت یہ ہے کہ اسلام اس وقت ایک نیا مذہب تھا۔ "جہاد" یا "جنات النعیم" کی للکار ہی ایسا راگ تھا جو مسلم فاتحین کے علم کے نیچے ہزاروں سرفروش مجاہد جمع کر دیتا تھا۔ اگر یہ تحریص نہ ہوتی تو ایک آواز پر لشکر کے لشکر فراہم کر لینا ممکن نہ تھا۔ مجاہدین کے قلوب جذبۂ اسلامی سے ضرور مملو تھے لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے ہم تو یہی کہیں گے کہ محمود غزنین اور محمد غوری کے غارت گر حملوں کا نصب العین محض زر و جواہر کی طمع تھی۔ اور انکا مقصد نشر و اشاعت اسلام یا شعائر اسلامیہ کی ترویج نہ تھا۔ اگر مسلمان ہندوستان میں صرف اسلام پھیلانے آتے اور ملک گیری سے مقدم تبلیغ قرار دیتے تو یہ ناممکن تھا کہ وہ مفتوح اقوام کے ساتھ کسی طرح سے رواداری برتتے۔ اگر محمود و محمد کے حملوں میں بفرض محال اسلامی جذبے کی جھلک مان بھی لیجائے تو قطب کا سر پر تاج رکھ کر تخت دہلی پر بیٹھ جانا ہمارے نظریہ کو واضح کر دیتا ہے کہ اُن فاتحین اسلام کا مقصد نشر اسلام ہو یا غارتگری لیکن ایبک کے بعد تمام سلاطین دہلی کی فتوحات، فوج کشیاں، کسی تعبیر میں مذہبی آڑ میں نہیں تھیں۔ ذرا بھی شک و شبہہ نہیں کہ اسلام کی نگاہ میں اُن بتوں کو پوجنا جن کو انسان کے ہاتھ نے پتھر سے تراشا ہو نفرین تحقیر فعل تھا لیکن اسکے ساتھ ہی اسلام ہی کا ہمہ گیر فلسفہ ہندو مسلم کو بلا امتیاز اپنے دامن عاطفت میں لئے ہوئے تھا۔

شیخ نظام الدین اولیاء دہلی کے قطب الاقطاب اپنی خانقاہ کی سقف سے مظاہر قدرت کا مشاہدہ فرما رہے ہیں یکایک نظر چند ہندوؤں پر پڑتی ہے جو اپنے اصنام کی پرستش کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں

"ہر قوم راست راہِ دینے وقبلہ گاہے"

ہر قوم اپنے مسلک پر چلنے اپنے مذہب کی اتباع کرنے اور اپنے معابد میں عبادت کا مساوی حق رکھتی ہے۔ یہی درحقیقت ازمنہ وسطی کا مذہبی مفاہمہ تھا اور ایسا مفاہمہ تھا جسکو بڑے دماغوں نے بشرف قبول دیا تھا۔ اگر ہمارے لئے ہمارا مذہب راہ راست پر اور بہترین مسلک تھا تو ہندوؤں کے لئے بھی ان کا مذہب بہترین روحانی مسلک تھا۔

امرا | علاء الدین خلجی کے عہد سے قبل امرا قرون وسطی کی سلطنت دہلی میں نمایاں ترین طبقہ تھا۔ اسکی طاقت سلطان کی طاقت کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ اگر حکومت کی عنان محکم گیر ہاتھ میں تھی تو اسکا اثر امرا کی قوت پر یہ تھا کہ وہ دبے ہوئے رہتے اور اُبھرنے نہ پاتے تھے لیکن جب سلطان ہی شاہ شطرنج تھا تو امرا کا اقتدار حکومت پر حاوی ہوجاتا تھا۔ گویا دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ حکومت امرا کی تھی اور سلطان انکے نظر کرم پر تھا۔ جو اسکو اس وقت تک برسر حکومت رکھتے جب تک انکے اغراض کے پورا ہونے میں اسکا وجود مزاحم نہ ہوتا تھا لیکن جب وہ کسی قسم کی بندش یا مزاحمت محسوس کرتے تو اپنی تمام قوت سے اسکا استیصال کرنے پر جھک جاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومت کی تمام کنجیاں اور وسیلے امرا کے ہاتھ میں تھے۔ وہ جاگیردار تھے اور جاگیروں کے کل محاصل اُن ہی کے ہاتھ میں رہتے تھے۔ مرکزی حکومت کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اپنی اپنی ریاست، جاگیر یا صوبہ میں کامل بااختیار تھے۔ انکے پاس سپاہ تھی جو صرف اُن ہی کی تابع تھی۔ مرکزی حکومت کے پاس ایسی سپاہ بہت کم رہتی تھی جسکی تنخواہ خزانہ عامرہ سے دی جاتی ہو۔ امرا کی سپاہ سلطانی سپاہ کہلاتی تھی۔ اور ضرورت کے وقت طلب کر لی جاتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں سلطان کی فوجی طاقت امرا کی مجموعی فوجی طاقت پر مشتمل تھی ایسے حالات میں سلطان بالکل بے دست و پا تھا۔ امرا ہی اسکے دست و بازو تھے۔ اور جب دست و بازو ہی سرتابی پر آمادہ ہوجاتے تھے تو اسکو اپنے پوزیشن کو سنبھالنا دشوار ہوجاتا تھا۔ اُمرا سلطان کے تابع اس وقت تک رہ سکتے تھے جبتک اُس میں انکو تابع رکھنے کی قدرت تھی۔

مرکزی حکومت کے شیرازہ کی ابتری کے ساتھ امرا کے حوصلے بڑھ جاتے تھے اور وہ اپنی اپنی ریاستوں میں مطلق العنان حکمران بن بیٹھتے تھے۔ یا اپنی مجموعی قوت سے مرکزی حکومت کی سیاست پر حاوی ہوجاتے تھے۔ اور فرمانروائے وقت کا خاتمہ کردیتے تھے سلطنت دہلی کی تاریخ اس اعتبار سے درحقیقت ایک ایسی تاریخ ہے جسمیں امرا سلاطین سے زیادہ نمایاں حصہ رکھتے ہیں اور صرف چند اعیان فرمانروایان کے علاوہ کثیر تعداد اُن ہی حکمرانوں کی ہے جو شاہ گر امرا کے بنائے ہوئے تھے یا انکی حرص و آز کا نشانہ بنے۔

امرا کے اقتدار کی تاریخ سلطنت دہلی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوتی ہے قطب کے بعد آرام امرا کا پہلا صید ہے۔ اسکے بعد التمش سر آرا ہوتا ہے جسکے آہنی دور میں امرا کی قوت کچلی ہوئی رہتی ہے لیکن اسکے بعد ہی وہ حالات پر قابو پاکر مرکزی حکومت کے سیاسیات پر چھا جاتے ہیں اور بلبن کے عہد تک اپنی بازیگری کے متعدد شعبدے دکھلاتے رہتے ہیں۔ فیروز، رضیہ، بہرام وغیرہ وغیرہ۔ سب امرا کی کمک سے تخت دہلی پر متمکن ہوتے ہیں اور امرا ہی کی سازشوں سے آخرکار یکے بعد دیگرے ختم ہوجاتے ہیں۔

باب سوم

جلوس۔ اور اسکے بعد، جدید انصرام

جلوس باپ کی حیات میں رضیہ بڑی آن بان سے رہتی تھی اور اس کو خود سلطان کے مزاج میں اس قدر دخل ہوگیا تھا کہ سلطان امور سلطنت میں بھی بعض اوقات اپنی دختر کے مشورے پر عمل پیرا ہونے پر مجبور ہوجاتا تھا۔ اسکی ماں سلطان سعید شمس الدین کی خاص محل تھی اور بادشاہ ہی کے ساتھ "کوشک فیروزی" میں رہا کرتی تھی۔

جیسا کہ ہم اشارہ کرچکے ہیں سلطان رضیہ کی تمکنت، خودداری، عقل و فہم سے اس کے مستقبل کے متعلق نہ معلوم کیا کیا خواب دیکھا کرتا تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ جب وہ فتح گوالیار سے لوٹ کر آیا تو اس نے اپنے سکریٹری تاج الملک محمود کو حکم دیا کہ رضیہ کا نام وارث اور ولی عہد

سلطنت کی حیثیت سے تحریر کر لیا جائے لیکن فرمان کی تعمیل سے قبل امرا و ارکان سلطنت میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور سب نے متفق ہو کر عرض کیا کہ

"شہزادے موجود ہیں۔ ایک عورت کو جانشین بنانے میں کیا راز ہے۔ اور اس سے کیا فوائد متصور کئے جاتے ہیں؟"

سلطان نے جواب دیا

"میرے لڑکے سب نشۂ شباب میں سرشار ہیں اور حکمرانی کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتا لیکن میری دختر سلطنت کے بار گراں کو اٹھا سکتی ہے"

امرا خاموش ہو گئے لیکن اس سکوت نے ظاہر کر دیا کہ سلطان کا انتخاب بہترین تھا۔

بہر کیف وقت گیا بات گئی۔ التمش کی آنکھ بند ہوئی اور شاہ گر امرا کی قوت سے رکن الدین تخت پر متمکن ہو ہی گیا۔ رضیہ گمنامی کے پردوں ہی میں رہی لیکن وہ ایک دبی ہوئی چنگاری تھی جو انظار عالم سے مستتر دہلی کے سیاسی اسٹیج کے پیچھے سلگ رہی تھی اور ایک دن شعلہ بنکر بھڑکنے والی تھی۔

رکن الدین کی ماں سلطان کی دوسری بیگمات سے خار کھاتی تھی۔ التمش کی حیات میں وہ بے دست و پا تھی لیکن جب اس کا لڑکا سر آرا ہوا تو اسکے اقتدار کا ذکر ہی کیا، انتقام کا یہی وقت تھا اور یہی موقع۔ لہذا سب سے پہلے اس نے شہزادہ قطب الدین کی آنکھیں نکلوا کر تہ تیغ کرا دیا۔ اسکے بعد یکے بعد دیگرے بیگمات کی طرف دست بیداد بڑھایا کئی بیگمیں قتل کر ڈالی گئیں۔ ان مظالم نے ملک کے ہر گوشے میں آگ لگا دی۔ ملک غیاث الدین محمد شاہ جو التمش کا لڑکا اور صوبہ اودھ کا گورنر تھا باغی ہو گیا، اس نے وہ خزانہ جو لکھنوتی سے آ رہا تھا لوٹ لیا اور قرب و جوار کے چند قصبات کو تخت و تاراج کر دیا۔ ملک عزالدین محمد سلاری والی بداؤں نے بغاوت کر دی۔ ملک عزالدین کبیر خاں گورنر ملتان ملک سیف الدین کوچی گورنر ہانسی ملک علاء الدین والی لاہور نے سازش کی۔ اور نوجوان سلطان کو معزول کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ادھر رکن الدین اپنی سپاہ لے کر دہلی سے برآمد ہوا لیکن وزیر نظام الملک محمد جنیدی نے کیلوگھری میں اس کو چھوڑ دیا۔ اور

Elliot and Dowson: History of India as told by its own historians Vol II PP. 330-333.

عزیز الدین محمد سلاری سے جا ملا۔ رکن الدین کہرام تک بڑھتا آیا۔ نتیجہ اس مہم کا بالآخر یہ ہوا کہ منصور پور اور نراین کے درمیان تاج الدین محمد سکریٹری، بہاء الملک حسین اشعری، کریم الدین، ضیاء الملک خلف جنیدی، نظام الدین شرمی، خواجہ رشید الدین اور امیر فخر الدین نے مل کر سلطان کو گہری گور میں میٹھی نیند سلا دیا۔

اس ہنگام میں شاہ ترکان مادر رکن الدین نے رضیہ کو گرفتار کرنا چاہا لیکن رضیہ کو خبر ہو گئی اور اُس نے دلیری سے اپنی مدافعت کی، چھیڑ چھاڑ ہو گئی۔ سلطان کو اطلاع پہونچی لیکن قبل اسکے کہ وہ امراء کی شورش کو اسکی حالت پر چھوڑ کر مراجعت کا کوس بجوائے خبر آئی کہ سپاہ رضیہ سے مل گئی۔ قصر پر رضیہ کا تسلط ہو گیا۔ مادر سلطان پابزنجیر کر لی گئی۔ گویا رضیہ بلا تکسیر پھوٹے تخت دہلی کی مالک بن بیٹھی۔

سلطان رکن الدین کی موت | معاصر مورخین رکن الدین کی موت کے باب میں مختلف الخیال ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ وہ منصور پور اور نراین کے درمیان امرا کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ کیلی گہری میں وہ گرفتار ہو گیا۔ اور مقید کر کے رضیہ کے سامنے لایا گیا جس نے اُسکو محبس بھیج دیا اور وہیں اُس نے ۱۸ ربیع الاول ۶۳۴ھ مطابق نومبر ۱۲۳۶ء داعی اجل کو لبیک کہا۔

جلوس کے بعد | جلوس کے بعد وزیر نظام الملک جنیدی، ملک جانی، ملک کوچی، ملک کبیر خاں، ملک عزیز الدین محمد سلاری نے باب دہلی پر یورش کی۔ لیکن رضیہ کا طالع اقبال اوج پر تھا، سلطانہ جرار لشکر لیکر شہر پناہ سے برآمد ہوئی اور جمنا کے کنارے خیمہ زن ہوئی۔ چند معرکے ہوئے جن میں باغی ٹوٹ گئے۔ کچھ امرا ادھر آ ملے۔ جو رہ گئے اُنھوں نے مصلحت اسی میں دیکھی

سلہ رضیہ کے نام سے پہلے 'سلطان' یا 'سلطانہ' کی لفظ نے ایک دلچسپ بحث پیدا کر دی ہے Elliot and Dowson لفظ 'سلطان' لکھتے ہیں اور سلطان کے معنی حکمراں لیتے ہیں۔ مورخین مذکور کے خیال میں حکمراں کے لئے تذکیر و تانیث کی خصوصیت کا اظہار عبث ہے۔ بعض کی رائے ہے کہ چونکہ رضیہ نے مردوں کی طرح حکومت کی اس وجہ سے اسکو سلطان رضیہ کہنا اسکے وقار کو دوبالا کرتا ہے۔ تیسری رائے مترجم تاریخ فرشتہ برگس (Briggs) اور مشہور مورخ الفنسٹون Elphinstone کی ہے جو سلطان کی لفظ کا استعمال غلط اور 'سلطانہ' کا استعمال صحیح قرار دیتے ہیں۔ ہم نے اول الذکر رائے سے اتفاق کر کے 'سلطان' کا استعمال کیا ہے۔

کر سلطانہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے اپنی خطاؤں کی معافی کے خواستگار ہوں سلطانہ نے جان بخشی کی۔ اُنکا اعزاز کیا، اُنکو خلعت دیئے۔ کوچی اور اُسکا بھائی فخر الدین مقید کر کے مجلس میں ڈال دیئے گئے۔ جنیدی کا جام عمر لبریز ہو گیا۔ جانی کسی معرکہ میں کام آ گیا۔

جدید انصرام | باغیوں کی سرزنش کے بعد ہی سلطان رضیۃ الدین انصرام و تنظیم حکومت کی طرف متوجہ ہو گئی۔ قلمدانِ وزارت نائب[1] وزیر کو "نظام الملک" کے خطاب کے ساتھ دیا گیا

رئیس عساکر ملک سیف الدین ایبک مقرر کیا گیا اور قتلغ خاں کے خطاب سے سربلند ہوا۔ کبیر نے اطاعت قبول کر لی اور اُسکو لاہور کی صوبہ داری واپس دی گئی۔ ملک ایبک اسی اثنا میں مر گیا اور ملک قطب الدین کا قائم مقام حسن غوری کا ہو گیا۔ غوری نے اپنی سپہ سالاری کا پہلا اور آخری کارنامہ یہ دکھلایا کہ رنتھنبور پر جس پر ہندوؤں نے تسلط کر لیا تھا چڑھائی کر کے مسخر[2] کیا۔ ملک اختیار الدین "لارڈ چیمبرلین" کے عہدہ پر مامور ہوا، اور امیر جمال الدین ایتگین امیر اصطبل مقرر کیا گیا۔

ان انتظامات اور جدید وزارت کی تنظیم کے ساتھ سلطان رضیۃ الدین نے اپنی دورِ کامرانی کا آغاز کیا۔ جدید سلطان کا انتخاب کیسا تھا؟ اس پر بحث ہی عبث ہے۔ دورِ وسطیٰ کے سلاطین نے اپنے وزرا اور مشیروں کے انتخاب کا اصول بظاہر یہ رکھا تھا کہ جو لوگ سلطنت میں زیادہ نمایاں یا با اقتدار تھے اور جن کی مخالفت قوت رکھتی تھی انکو جلیل القدر عہدوں پر ممتاز کر کے ہوا خواہ بنا لیا جاتا تھا۔ یہ لوگ سلطان کے ساتھ اپنا پیمانِ وفا اس وقت تک نبھاتے تھے جب تک سلطان میں اپنا اقتدار برقرار رکھنے کی قوت رہتی تھی۔ اُدھر اس کی قوت میں اضمحلال پیدا ہوا اُدھر ارکان حکومت نے اطاعت کے جوے کو پھینک کر علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ کچھ رضیہ ہی پر منحصر نہیں، دورِ وسطیٰ کا کوئی عہد اس سے مستثنیٰ نہیں۔ لہٰذا ہم رضیہ کے عہد کو بھی اسی نظریہ کے تحت میں مطالعہ کرینگے۔

---
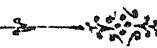
[1] نائب وزیر کا نام خواجہ مہدی غزنوی تھا۔ (فرشتہ)

[2] تسخیر رنتھنبور یا تسلط رنتھنبور جو کچھ بھی کہا جائے رضیہ کے عہد مختصر کا واحد کارنامہ ہے۔ اور اسی پر اس کے فتوحات پر تبصرہ

باب چہارم

تعلیم و کیرکٹر۔ شکل و شمائل۔ لباس

تعلیم و کیرکٹر | رضیہ میں تمام وہ جواہر خداداد موجود تھے جو فرمانروائی کا زیور ہیں لیکن اگر کوئی نقص تھا تو یہ کہ قدرت نے اُسکو عورت پیدا کیا تھا، اسکی تعلیم کا مبلغ کیا تھا؟ اسکے متعلق معاصر مورخین ساکت ہیں۔ صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنی ضرور پڑھی ہوئی تھی کہ قرآن کی تلاوت بآسانی کر سکتی تھی۔ زیر تنقید زمانہ میں شہزادیوں کی تعلیم کا اُسی قدر خیال کیا جاتا تھا جس قدر شہزادوں کی تعلیم کا۔ ابتدائی مذہبی تعلیم جس میں اصول دین سے واقفیت، صوم و صلوٰۃ، زکوٰۃ و خمس، حج وغیرہ کے ارکان سے آگاہی شامل تھی۔ قرآن اور احادیث کی تعلیم ضروری تھی۔ اور جو اصولاً تعلیم نسواں کے خلاف تھے وہ بھی قرآن اور احادیث کی تعلیم دینا اپنا فرض اولین متصور کرتے تھے۔ شہزادیوں کو فارسی عربی اور ترکی لٹریچر میں بھی کافی دستگاہ ہوتی تھی۔

رضیہ باپ کے عہد میں بھی امور سلطنت میں دخیل تھی اور سلطان بجائے ایک عورت کو جو ناقص العقل تھی سیاسیات سے باز رکھنے کے اسکی حوصلہ افزائی کرتا تھا، اور آخرکار اسکو شہزادی کے تدبر پر اس قدر وثوق ہو گیا تھا کہ جب اُس نے بنفس نفیس قلعہ گوالیار پر فوج کشی کی ہے تو دہلی میں رضیہ کو اپنا نائب سلطنت مقرر کر دیا تھا۔

اس سے ہم دو نتیجوں پر پہونچتے ہیں اول یہ کہ رضیہ کو سربرآرا ہونے سے قبل ہی حکمرانی کی عملی تعلیم ہو گئی تھی۔

دوئم یہ کہ اگر رضیہ کی تعلیم مکمل نہ ہوتی تو التمش ایسا مدبر ایک عورت کو اپنا نائب سلطنت بنانے اور اپنا ولی عہد نامزد کرنے میں سبقت نہ کرتا اور اس طرح اُس سلطنت کو جسکی بنیاد "توجیتاً" پڑ چکی اور جو طاقتور امرا کی پشت پناہی پر قائم تھی معرض خطر میں نہ ڈالتا۔

شکل وشمائل | رضیہ غضب کی جمیلہ بھی تھی، ملک جنید بھی اسکے حسن وجمال کو شاعرانہ تخیلات کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ

اگر اسکے رخ روشن کے مقابل کلی ہو تو کھل جائے
بالی ہو تو گرمی حسن سے پک کر دانہ ہو جائے
وہ ایک نگہ ناز سے مردوں کو جلا سکتی ہے
اور زندوں کو مار سکتی ہے"

لیکن ہندو[1] (Band) اُسکے حسن وجمال کو نظرانداز کرکے جبل کرکہتا ہے۔

"وائے ہو اُس ملک پر جس پر عورت حکومت کرے"

لباس | رضیہ نے تخت شاہی پر جلوس کے بعد ہی اپنا زنانہ ترکی لباس ترک کرکے مردانے کپڑے زیب تن کرنا شروع کردیئے۔ اور اس طرح لباس کے پردے میں اپنے فطری نقائص کو چھپانا چاہا۔ اولاً وہ نقاب پوش تھی لیکن کچھ عرصہ کے بعد بے نقاب ہوگئی۔ رضیہ کا بے نقاب ہونا غالباً تمام اُن مسلم عورتوں میں جنھوں نے کامرانی کی ہے پہلی مثال ہے اور ازمنہ وسطی کی پرآشوبی کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت بڑی جسارت۔

وہ گھوڑے پر سوار ہوتی تھی اور اسلحہ لگاتی تھی۔ فوج کی کمان کرتی تھی۔

وہ ہر روز دربار عام میں بیباکانہ اجلاس کرتی تھی اور نہایت دلیری سے احکام وفرامین نافذ کرتی تھی۔

اسکے اسٹاف میں عورتوں سے زیادہ مرد تھے۔ اور قصر سلطانی میں بھی مردانہ رکھ رکھاؤ سے رہتی تھی۔

وہ سر پر تاج رکھتی تھی جس میں اپنی طویل زلفوں کو چھپا لیتی تھی، اسکے جسم میں عورتوں کی نزاکت تھی تو مردوں کی چستی اور مستعدی، مردانہ لباس اس پر کچھ ایسا کھپتا تھا کہ ناواقف اسکے مرد ہونے میں مطلق شبہہ نہ کرسکتا تھا۔

---

[1] چند۔

باب پنجم

ملک یاقوت اور اضطراب

ملک یاقوت | رضیہ کی تاریخ میں ملک یاقوت ایک نمایاں شخصیت ہے۔ یاقوت ایک حبشی غلام تھا لیکن سلطان پر اُسکا جادو کچھ ایسا چل گیا تھا کہ آخر کار ایک ادنیٰ درجہ (اصطبل سلطانی کی خدمت) سے امیر الامراء کے عہدہ پر فائز ہوگیا تھا۔ اعیان و اکابر سلطنت کو سلطان کی سفلہ نوازی شاق ہی نہیں گزری بلکہ یاقوت کے روزبروز سلطان کے مزاج میں دخیل ہوتے جاتے اور منہ چڑھنے سے آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور دلوں میں شک جاگزیں ہوگیا

اس میں شبہ نہیں کہ سلطان اور یاقوت میں بہت زیادہ بے تکلفی بڑھ گئی تھی اور وہ اختلاط کے حدود کی طرف سبقت کر رہی تھی، ادنیٰ سی بات ہے کہ جب رضیہ گھوڑے پر سوار ہوتی تھی تو یاقوت ہی بغلوں میں ہاتھ دے کر اس کو پشت زین پر بٹھلاتا تھا۔ یہ کچھ کم بات نہ تھی۔ رضیہ بہرکیف عورت تھی، اور قانون قدرت سے مستثنیٰ ابھی نہیں، یہ بے تکلفی، یہ خسروانہ عنایات یہ بندہ نوازیاں ــ دیکھنے والوں کی نظروں میں بے معنی نہ تھیں۔ اور ایک نہ ایک دن گل کھلائے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔

اس افسانہ کے انجام پر کیا خوب کسی نے کہا ہے :-

"ایک چیز جس نے رضیہ کو بے تاج کردیا وہ یاقوت نوازی تھی اور بس"

ہم اس ریمارک پر اپنے خاتمہ میں بحث کرینگے۔

اضطراب | خود سر امراء جن کے ذاتی اغراض دہلی کے تخت پر کبھی بیدار مغز فرمانروا کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اور جو ہمیشہ موقع و محل کے منتظر رہتے تھے۔ یاقوت کا بہانا پکڑ کر سامنے آگئے اور پہلا وہ امیر جس نے علم بغاوت بلند کیا ملک کبیر خاں والی لاہور تھا، جس کی جان بخشی کے بعد اسکی صوبہ داری اسکو واپس دی گئی تھی مگر دل میں رضیہ کے خون کا پیاسا تھا۔ کبیر کی غداری کی خبر

پاتے ہی رضیہ سپاہ لیکر اُسکے سر پر آموجود ہوئی۔ کبیر کو کچھ بن نہ پڑی اور اطاعت قبول کرکے دوبارہ جان بخشی کا خواستگار ہوا۔ کریم النفس سلطان نے اس موقع پر پھر اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیا اور کبیر کی خطاؤں کو دل سے محو کرکے نہ صرف اُسکا ملک اُسکو واپس دیا بلکہ اسکی دلجوئی کے لئے ملتان کی بھی صوبہ داری دے دی۔

یہ دفع الوقتی تھی کیونکہ آگ بجھی نہیں بلکہ اگر وہ ایک طرف سرزنش کے چھینٹے سے دب گئی تو دوسری طرف بھٹنڈہ سے بھڑک اُٹھی، اور ملک التونیا جو بھٹنڈا کا والی تھا یاقوت نوازی کی آڑ پکڑ کر قرب وجوار کے چھوٹے چھوٹے امرا کو ہمساز بناتا ہوا بے دھڑک دارالسلطنت کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔ رضیہ نے اپنی سپاہ کو سمیٹا اور دشمن کے اقدام کی مزاحمت کرنا چاہی لیکن وہ بھٹنڈا تک ہنوز پہونچنے بھی نہ پائی تھی کہ سلطان عساکر کے ترکی افسروں نے بغاوت کردی۔ اس ہنگامہ میں یاقوت تو کام آگیا۔ لیکن رضیہ بھی مقید ہوکر غنیم کے دست بیداد میں پہونچ گئی۔ بے سری فوج کیا جنگ کرتی۔ اس کو جب کچھ نہ بن پڑی تو دہلی واپس آئی اور رضیہ کے بھائی شہزادہ بہرام کو تخت پر بٹھلا دیا۔

التونیا تخت وتاج کی ہوس میں تھا لیکن باوجود ظفریاب ہونے کے وہ محروم ہی رہا۔ یہاں پر وہ ایک اور چال چلا یعنی معزز قیدی کے ساتھ عقد کرکے اُسکے بہانہ سے پھر سلطنت کے لئے قسمت آزمائی کے لئے آمادہ ہوگیا۔ رضیہ اور التونیا کی متحدہ سپاہ دہلی کی طرف بڑھتی ہے۔ دوسری طرف بہرام کی فوج جو نسبتہً تازہ دم اور زیادہ ترتیب یافتہ ہے اسکی پیشقدمی میں مزاحم ہوتی ہے سلطان عساکر کی کمان ملک عزالدین بلبن المعروف بہ الغ خاں[1] کے ہاتھ میں ہے جو پہلے ہی معرکہ میں اتحادی لشکر کے دانت کھٹے کرکے انکے چھکے چھڑا دیتا ہے لیکن رضیہ اپنی منتشر سپاہ کی دلجوئی کرکے ایک بار پھر میدان قتال گرم کرتی ہے۔ اس مرتبہ پھر اسکو ہزیمت نصیب ہوتی ہے جو اُسکے دست وباز وکو شکست کرکے اسکے دو سال آٹھ ماہ کے طوفانی دور کا خاتمہ کردیتی ہے التونیا اپنی جان لیکر بھاگتا ہے لیکن گرفتار ہوجاتا ہے۔ دوسرے روز رضیہ بھی مقید ہوجاتی ہے اور موت کے گھاٹ اُتار دی جاتی ہے۔

---

[1] الغ خاں بھی کہتے ہیں۔

باب ششم

سلطنت ترکیہ دہلی کی وسعت ۱۲۳۶ء میں

التمش کی وفات کے وقت اسکے جانشینوں نے ایک وسیع سلطنت ورثہ میں پائی تھی جسکے حدود شمال مغرب میں کشمیر اور افغانستان میں ملتے تھے۔ مشرق میں بنگال کو اسکی قلمرو میں شامل کرتے ہوئے خلیج بنگال سے ملحق ہوتے تھے۔ جنوب میں دکن کی سلطنتیں تھیں جن میں انہلواڑہ ممتاز تھی ۱۱۹۶ء میں قطب الدین ایبک نے گجرات وانہلواڑہ پر یورش کی تھی۔ اسکے دارالسلطنت کو مسخر کیا تھا لیکن تسلط قائم نہ کر سکا تھا۔ مغرب میں بحیرۂ عرب و سندھ تھے۔

کسی تاریخ سے صحیح تعداد صوبہ جات کی معلوم نہیں ہو سکتی۔ مگر جہاں تک پتہ چلتا ہے وہ یہ ہے کہ ملتان اور لاہور سرحدی صوبے تھے اور طاقتور امرا کے ماتحت رہتے تھے۔ دہلی مرکز تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے قرب وجوار کے اضلاع سب مرکزی حکومت کے زیرنگیں تھے اور اُن کا انصرام براہ راست مرکزی حکومت کرتی تھی۔ بھٹنڈا ایک چھوٹے صوبہ کی شان رکھتا تھا۔ متھرا، اٹاوہ، قنوج ممتاز مقامات تھے۔ ان میں کون صوبہ تھا یہ مطلق نہیں کہا جا سکتا۔ اودھ صوبہ تھا۔ اور بڑا صوبہ، بہار و بنگال اپنی جگہ پر خود مختارانہ حیثیت رکھتے تھے اور کبھی مرکزی حکومت کے جوئے کو پھینک دیتے تھے اور کبھی سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔ یہی حالت تمام اُن صوبہ جات و ممالک کی تھی جو مرکزی حکومت سے بعد رکھتے تھے۔

کالنجر ۱۲۰۲ء میں مسخر ہو چکا تھا لیکن اسکی فوجی اہمیت ہنوز باقی تھی۔ فاتح اور اُسکے جانشینوں نے اپنے اپنے عہد میں اسکے استحکام میں کافی توجہ کی تھی۔ کالنجر میں کافی توجہ کی تھی۔ کالنجر میں جرار سپاہ کا ایک دستہ رہتا تھا اور قلعہ ایک پختہ کار جنرل کے سپرد تھا۔

راجپوتانہ کے اقبال کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ اجمیر، مانڈواڑ، رنتھمبور، گوالیار رفتہ رفتہ سب مرکزی حکومت کے زیرنگیں ہو چکے تھے لیکن راجپوت فطرتاً جنگجو اور سپاہی تھے اور مقامی حکمرانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں رہتے تھے۔ تاہم اُن کا بندھن کھل چکا تھا۔

شیرازہ ابتر ہو چکا تھا اور بہ حیثیت قومیت کے انکی قوت میں اضمحلال پیدا ہو گیا تھا کسی تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ راجپوتانہ میں راجپوت سرداروں میں سے ازمنہ زیر بحث میں کوئی حکمران تھا یا نہیں۔ بہرکیف گوالیار اور رنتھنبور صوبوں یا باج گزار ریاستوں کی شان رکھتے تھے۔

دکن کی دنیا الگ تھی۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ مسلمان وہندیا کی دیوارِ قہقہہ میں روزن کر کے کرشنا و گوداوری کی مقدس وادی میں قدم رکھتے اور اسلام کے پرچم کو ورنگل و دیوگڑھ کے کنگروں پر لہراتے۔

اس وقت سلطنت دہلی کتنے صوبوں پر منقسم تھی اسکا جواب بھی آسانی سے نہیں دیا جا سکتا تمام معاصر مورخین کی مدد سے بھی تعیین اعداد ممکن نہیں۔

یہ امر نہایت تحیر خیز ہے کہ باوجودیکہ دہلی طوائف الملوکی کا گہوارہ تھا جہاں چند سال کے اندر نہ معلوم کتنے انقلابات ظہور پذیر ہو جاتے تھے اور اکثر ایک ہی سال کے اندر کئی کئی سلاطین بدلتے رہتے تھے تاہم مرکزی حکومت کی دھاک اور فاتحین کی تلوار کی ہیبت دور دراز صوبوں اور باجگزار ریاستوں کے قلوب پر اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ سرکشی کا حوصلہ بہت بڑی جرأت تھا۔ کوئی بھی حکمراں ہو، کوئی بھی سلطان تخت پر متمکن ہو، انکو اطاعت میں عذر نہ تھا۔ گذشتہ تلخ تجربات اور سرتابی کے عبرت انگیز نتائج نے انکو دہلا دیا تھا۔ اس اعتبار سے دہلی کے سلطان کو تمام قلمرو سلطنت ترکیہ میں اپنا تسلط قائم کرنے میں بہت دشواری نہ ہوتی تھی اور ہندوستان کے عرض و طول میں اسکا سکہ رائج ہو جاتا تھا۔

باب ہفتم

محاکمہ

ہم نے رضیہ کے کیرکٹر کا ایک مختصر خاکہ گذشتہ ابواب میں پیش کیا ہے لیکن ہنوز وہ کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے وہ مستعد تھی، جری تھی، بہادر تھی، شجیع تھی، اس سے کسکو انکار ہو سکتا ہے؟ وہ مدبر تھی اور عاقبت اندیش۔ جہاں تک کہ رضیہ کے تدبر کا تعلق ہے اسمیں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کہ صرف ایک مثال اسکو

تسلیم کرانے کے لئے کافی ہے۔

ابتدا عہد ہے سلطان کو تخت پر متمکن ہوئے چند ہی روز گزرے۔ طاقتور امرا جنکے ذاتی اغراض دہلی کے تخت پر کسی بیدار مغز فرمانروا کو نہیں دیکھ سکتے تھے اضطراب پھیلا رہے ہیں۔ ملک کے ہر گوشہ میں شورش سر اٹھا رہی ہے اور قومی مدافعت کا مطالبہ کر رہی ہے ایسے ہنگام میں تائید کس کی؟ اور کمک کی توقع کس سے؟ تمام ارکان حکومت مخالف ہیں۔ سازشیں ہو رہی ہیں۔ دعوت نامے جا رہے ہیں اِس وقت رضیہ ایک ایسی چال چلتی ہے کہ پانسہ پلٹ جاتا ہے بساط اُلٹ جاتی ہے۔ وہ حلفا میں ایک دوسرے کے خلاف بے اعتمادی کی تخم ریزی کرتی ہے جسکا نتیجہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جتھے ٹوٹ جاتے ہیں غنیم کے کیمپ میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جو سپاہ سلطان کے خون کی پیاسی آئی تھی وہ اُلٹے پاؤں واپس جاتی ہے لیکن رضیہ کا تدبر صرف یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا ہے بلکہ وہ سرکشوں کی سرزنش پر متوجہ ہوتی ہے۔ سلطان عساکر تعاقب کرتے ہیں اور یکے بعد دیگرے تمام باغیوں کو چنوں کی طرح بھون لیتے ہیں یا انکو فرار ہونے اور کبھی سرتابی کی جرأت نہ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ملک علاء الدین جانی وزیر نظام الملک سب کام آجاتے ہیں اور سلطان کے لئے سکون کے ساتھ اپنا دور حکومت آغاز کرنے کے لئے میدان صاف ہو جاتا ہے۔

ملک التونیا کے ساتھ عقد بھی اسکے تدبر کی دوسری مثال ہے کیونکہ پیہم ہزیمتوں کے بعد اسکے دست و بازو شکستہ ہو چکے تھے۔ وسائل مفقود ہو گئے تھے۔ ایسی حالت میں التونیا جو تازہ دم تھا اور جسکے پاس جرار سپاہ بھی اُسکے لئے تخت کو دوبارہ حاصل کرنے کی آخری توقع ہو سکتا تھا۔

جرأت و جسارت، دلیری و شجاعت سب مسلم لیکن صنف نازک کی فطری کمزوریاں اُس کے کارناموں پر مہر کر رہی تھیں۔ ملک یاقوت کو منہ چڑھانا امرا کے لئے بہانہ تھا لیکن اگر صرف اس بہانہ کی مدافعت کرنا پڑتی تو یقیناً سلطان کے لئے اپنے پوزیشن کو سنبھالنا زیادہ دشوار نہ تھا۔ مگر ملک کی سیاسی فضا اور مسلمانوں کے لئے مذہبی جذبات و حسیات کا مقابلہ آسان نہ تھا، پھر اگر کسی نے حالات کا مطالعہ کر کے کہا کہ "ایک حبشی جس نے رضیہ کو بے تاج کر دیا وہ یاقوت نوازی تھی" تو کیا غلط کہا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب

(علی مہدی خاں صاحب جونپوری ایم اے)

ساقی بیار بادہ کہ رمزے بگویمت　　از سیر اختران کہن سال و ماہِ نو

(۱)

مولانا محمد حسین آزاد نے جب عالم رویا کی سیر کی اور بقائے دوام کے دربار میں پہونچے تو یہ دیکھا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے آتے ہی بڑے زور سے نقارہ بجایا۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ واہ کرنے لگے۔ واہ واہ کرنا، یا کسی بات سے خوش ہونا ایک فطری فعل ہے جسکا مبدا کوئی فطری جذبہ ہوتا ہے نفسیات کے علما جانتے ہیں کہ کسی جذبہ کی تحریک کے لئے ایک مخصوص اضافی محرک درکار ہوتا ہے۔ یہ واہ واہ کرنا اور بالاتفاق واہ واہ کرنا بتلاتا ہے کہ مرزا غالب کے نقارے میں کوئی خاص بات ضرور تھی جس نے لطف پیدا کرکے خوشی کے جذبہ کی تحریک کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر اثر تو سب نے لیا۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے فہم کے مطابق کچھ نہ کچھ تو ضرور سمجھا ہوگا اور ہر شخص کے قلب پر اسکے ظرف کے موافق کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑا ہوگا۔

دنیائے شاعری میں غالب کی سی شہرت کسی کو کم نصیب ہوئی۔ ان کے اشعار زبان زد خلائق ہیں اور ان کا نام بچے بچے کی زبان پر ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر ہمارے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اردو میں بہت سے باکمال شعرا گزرے۔ اب غالب میں کون سے ممتاز خصوصیات ہیں اور اس ہر دل عزیزی کا باعث کیا ہے۔ سہولت پسند طبائع بول اٹھیں گی کہ

ایں سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مگر زمانہ حاضرہ کا فن تنقید اور اسکے اصول تحقیقات علمیہ اس جواب کو ناکافی قرار دیکر ایک دوسرے سوال کے حل کی جانب متوجہ کردینگے کسی چیز کو خدا کی دین کہہ دینا آسان ہے مگر واقعی اور علمی

ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر چیز کی غایت اور علت دریافت کی جائے۔ خدا کے فضل و
کرم کا کوئی موحد منکر نہیں ہوسکتا۔ مگر خدا کو عادل ماننے والے اصحاب کا مقولہ ہے کہ ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

دنیا عالم اسباب ہے اور خدا مسبب الاسباب پس ہر چیز کی ایک وجہ ہوتی ہے اور خدا کے انعام
کا ہمیشہ ایک سبب ہوا کرتا ہے۔

(۲)

ہر دل عزیزی کے مسئلہ پر جب ہم اس علمی نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں تو ہمکو صاف صاف
معلوم ہوجاتا ہے کہ اسکا راز عام فطرت کا صحیح اندازہ کرنا اور ہر شخص کے مذاق کے موافق بات کرنا
ہے ہمارے احباب میں سے ہمیں وہی پسند ہوتا ہے جو آپ بیتی اور جگ بیتی ہماری بیتی کے موافق
بیان کرے۔ اگر ہم غمگین ہیں تو شب فراق کی داستان سنائے اور اگر ہم خوش بیٹھے ہیں تو روز
وصال کا تذکرہ چھیڑ دے۔ پھر وہ ہم کو اپنا گرویدہ بنا لیگا اس لئے کہ ہم سمجھیں گے کہ ؎

دیکھیے تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

برخلاف اسکے اگر ہمارا دل بجھا جاتا ہے اور کسی نے مذاق کرنا شروع کردیا تو پھر ہم مجبوراً یہی عرض کرینگے کہ ؎

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

لطف تکلم کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ایک شخص کی طبیعت سے واقف ہوں اور اسکے مذاق کے موافق
سلسلۂ گفتگو جاری رکھیں۔

یہ اس حالت کا ذکر ہے جب صرف دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔ مگر اس عالم میں ایسی
صحبتیں کمیاب ہیں اور بزم خلوت کا اغیار سے خالی رہنا دشوار ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ اگر
ایک بڑا مجمع ہو جہاں عالم بھی ہیں اور جاہل بھی۔ بچے بھی ہیں اور بوڑھے بھی۔ غریب بھی
ہیں اور امیر بھی۔ غمگین بھی ہیں اور خوش بھی۔ عاشق بھی ہیں اور معشوق بھی۔ وفادار بھی ہیں
اور بے وفا بھی۔ الغرض جتنے آدمی ہیں اتنے ہی خیالات ہیں، اتنی ہی طبیعتیں اور اتنی ہی
صورتیں ہیں۔ تو اس مجمع میں ایک دلچسپ تقریر کی کیا صورت ہونی چاہیے؟ ایسی دلچسپی نہیں
[illegible]

کہ وہ دلچسپی نہیں جو بیرونی اثرات کا نتیجہ ہو۔ بلکہ ایسی دلچسپی جو دل سے پیدا ہو جسکا دل اثر لے۔ اور جسکو ہم اپنی ذات سے علیحدہ نہ کر سکیں۔ یا یوں کہئے کہ جسکے حاصل کرنے کے لئے ہمارا دل بیچین ہو اور ہمکو مجبور کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسی دلچسپی کے لئے صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارا کلام عام فطرت انسانی کے معیار کے اس قدر موافق ہو اور باوجود اس عمومیت کے اپنے اندر کثیر اختلافات اس طرح سمیٹے ہوے ہو کہ ہر شخص اپنے فہم اور اپنی بساط کے مطابق اس سے لطف اُٹھا سکے اور یہی سمجھے کہ اس کلام نے اسکے حقیقی جذبات اور اسکے راز ہاے سربستہ کی ترجمانی کی ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر قابل غور ہے۔

ہم سے کھُل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن ورنہ ہم چھیڑینگے رکھکر عذرِ مستی ایک دن

اس شعر کو ایک رند خرابات اپنے خیالات کا ترجمان سمجھ کر بہت پسند کریگا۔ اس لئے کہ اس کی ظاہر بیں نگاہ کو یہی نظر آئیگا کہ شراب پی کر معشوق کو پریشان کرنے اور چھیڑ چھاڑ شروع کرنے کا ذکر خوب کیا گیا ہے۔ مگر ایک نکتہ سنج حقیقت آشنا صوفی اس شعر پر یوں بول اُٹھیگا کہ "وہ شاعر صاحبِ مقام معلوم ہوتا ہے" اور وہ اس شعر کے معانی کسی اور ہی رنگ میں سمجھیگا۔ بہر صورت اپنے مقام پر دونوں خوش ہونگے اور لطف اُٹھائینگے۔ ہاں ایک ایسا گروہ بھی ہوگا جو یہ کہیگا کہ معانی کتنے ہی عالی سہی مگر بازاری الفاظ میں کیوں ادا کئے گئے۔ ظاہر ہے کہ اس گروہ کو خوش کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ شعر کی صورت بدل دی جائے۔ اس کل بحث کا حاصل یہ ہوا کہ ہر دل عزیزی کے لئے ایسے کلام کی ضرورت ہے جس سے ہر شخص لطف اُٹھا سکے اور اگر ایک ہی فقرہ یا ایک ہی جملہ میں یہ بات پیدا کرنا دشوار ہو تو مختلف فقروں اور جملوں کی ترتیب اس طرز پر دی جائے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہر فرد کوئی جملہ سن کر وجد میں آجائے۔ مگر یہاں پر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ حصہ خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو حصہ ہے اور وہ کبھی کل کے برابر ہو نہیں سکتا اس لئے کہ جزو جزو ہی ہے۔ اس میں اور کل میں ہمیشہ فرق رہیگا۔ لہذا اگر کثرت رائے کا خیال کیا جائیگا اور اسی پر کلام کی بنیاد رکھی جاے گی تو کلام بڑے حصہ کی طبیعت کے موافق تو ضرور ہوگا۔ مگر کچھ افراد ایسے بھی باقی بچینگے جو لطف نہ اُٹھا سکیں گے۔ تو پھر ہر شخص کو لطف اندوز اور بہرہ یاب کرنے کے لئے یقینا وہی صورت اختیار کرنا ہوگی جسکا ذکر اوپر ہوا۔ یعنی

بروئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے　　　یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

(۳)

یہ کیفیت بھی ایک محدود مقام۔ محدود وقت اور محدود گروہ کی ہے۔ اب اگر کوئی ایسا کام کرنا ہو جو قیدِ مکان و زمان سے آزاد ہو۔ قوموں اور ملکوں کے حدود کو توڑ دے۔ سیلابِ عالم کو عبور کر جائے۔ دماغ اور تہذیب کی تدریجی ترقی کو مدنظر رکھے اور عالمِ فطرتِ انسانی اور رازِ ہستی کو اپنے قبضہ میں لے آئے تو ایسا کام کرنے کے لئے افرادِ انسانی کے طبائع کا خیال کرنا محال ہوگا لہذا افراد کو غیر محصور سمجھکر انواع کی طرف نظر کرنا ہوگی۔ یعنی ہم اس کا نہ خیال کرینگے کہ کسی شخص کی کیفیاتِ دماغی روحانی اور نفسانی دم بدم کس طرح متغیر ہوا کرتی ہیں بلکہ ہمیں یہ امر مدنظر رکھنا ہوگا کہ بحیثیتِ کلی خیالاتِ انسانی کتنے اقسام کے ہوا کرتے ہیں اور اس بڑے درخت کی کتنی شاخیں ہیں۔ انھیں اقسام اور انھیں شاخوں کو ہم اپنا مطمح نظر بنائینگے اور اسی داغ بیل پر ہماری ہمیشہ قائم رہنے والی عمارت کی بنیاد رکھی جائیگی۔ یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ علوم مختلفہ خیالِ انسانی کے تغیرات کا بہترین آئینہ ہیں۔ کسی شخص کو سوانح زندگی کی چھان بین کی خواہش ہوتی ہے۔ کسی کو تحقیقاتِ نسب کا فطری مرض ہوتا ہے۔ کسی کو یہ عادت ہوتی ہے کہ سر اٹھائے رات بھر انجم شماری کیا کرے اور کسی کا "اسکے مرنے کے بعد" وہ ہر اک بات پر کہتا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا" یاد آتا ہے۔ اسی قسم کے افراد کے خیالات کے مجتمع ہو جانے سے۔ سیر و تاریخ، علم الانساب، منطق اور فلسفہ کی بنیاد پڑی تھی۔ لہذا ایک عالمگیر اور ہمیشہ محبوب رہنے والے ہر دلعزیز مقرر محرر یا شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تقریر یا تحریر یا شعر میں تمامی علوم کا انحصار کرے۔

(۴)

لیکن اسکے ساتھ ایک بات کا اور خیال رکھنا چاہیے کہ یہ کثرت آرائی کہیں جمالِ وحدت کو نقاب پوش نہ کر دے شعر میں تمام علوم کے عناصر کا ہونا لازمی ہے مگر نہ یوں کہ شعر فہرست مضامین یا معجون مرکب علوم ہو بلکہ اس طرح کہ تمام مختلف خیالات ایک اصول کے تحت میں ہوں اور سب کے ظاہر کرنے کے بعد بھی خیال کی وحدت، شاعر کا خاص طرز تخیل اور شاعر کی منفرد ذات صاف صاف معلوم ہوتی رہے۔ اسکے لئے ضروری ہے کہ مختلف علوم میں دستگاہ ہو، جذبات انسانی سے آگاہی ہو اور

طرز ادا پر پورا قابو ہو۔ تمام مضامین قبل نظم ہونے کے اچھی طرح دماغ میں پختہ ہو کر مل جائیں اور مناسبت اختیار کرلیں۔

۵

دیوان غالب پر ایک نظر غائر ڈالنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر پورا پورا نہ سہی تاہم کافی حد تک انکے یہاں ہر قسم کے مضامین ہر رنگ میں اور ہر طرز سے ادا کئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زاہد خشک ہو یا رند مشرب فلسفی ہو یا متکلم، صوفی ہو یا پیرو شریعت۔ سادے الفاظ سے خوش ہونے والے ہوں یا دقت و پیچیدگی کے دلدادہ، سب کے لئے دیوان غالب میں ارمغان موجود ہے۔ غالب کو ہر شخص دل سے عزیز رکھتا ہے اس لئے کہ ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

زاہد خشک اس شعر پر وفقک اللہ کہیگا۔ ؎

مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

رند مشرب اس شعر سے لطف اندوز ہوگا۔ ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

یا

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب
دے بط مے کو دل و دست شنا موج شراب

فلسفی اِس شعر کی تعریف کریگا۔ ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ فصل بہاری کا

یا

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اسکو دم ایجاد نہیں

متکلم اس شعر کو پسند کریگا۔ ؎

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

صوفی کو اس شعر پر وجد آجائے گا اور شاعر کو عارف کامل کا خطاب دیگا۔ ؎

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

یا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل — جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

صاحبِ شریعت اِس شعر پر خوش ہوگا۔

غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست — مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

یا

مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان — نافِ زمیں ہے یہ نہ کہ نافِ غزال ہے

یا

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

سادہ الفاظ سے خوش ہونے والے ان اشعار کو پڑھینگے۔

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے — یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے
چاہنے کو تیری کیا سمجھا تھا دل — بارے اب اُس سے بھی سمجھا چاہیئے

دقّت پسند طبیعتیں ان اشعار سے لطف اُٹھائینگی۔

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن — چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے
صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر — تغیرِ آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

یہ مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے گئے۔ بغیر کسی قسم کا انتخاب مدنظر رکھتے ہوے۔ آگے چل کر اس مسئلہ پر بحث کی جائے گی۔

غالب کے اشعار کی ہمہ گیری جسکی مثال اوپر گزری ایک ظاہر بیں نظر کو محوِ تماشا کر دینے کے لئے غالباً کافی ہوگی۔ مگر بارِیک بیں نگاہیں متحیر ہو سکتی ہیں کہ پھر صرف اتنی ہی بات پر غالب میں خصوصیات کا اقرار کرنا ناروا معلوم ہوتا ہے۔ اور بھی بہت سے شعراء ہیں اور انکے کلام میں بھی بہت سے متفرق مضامین ملتے ہیں پھر غالب کس حیثیت سے ممتاز ہیں۔ ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس حیثیت سے غالب دوسرے شعراء سے ممتاز نہیں ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ یہ بات انکے اشعار میں زیادہ پائی جائے۔ یہ ضرور ہر دلعزیزی کا ایک سبب ہے۔ مگر صرف ایک محدود سبب۔ جس حد تک دوسرے شعراء اس صفت کے رکھنے میں غالب کے ہمزبان ہیں اس حد تک وہ ہر دلعزیزی میں بھی انکے شریک ہیں۔

۶
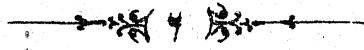
مگر جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ غالبؔ نے اس مسئلہ کے باطنی اور اندرونی رُخ میں کمال پیدا کیا ہے یعنی نہ صرف یہ کہ انکے اشعار سے ہر مذاق کے اصحاب لطف اندوز ہو سکتے ہیں بلکہ انکے اشعار اپنے مضامین کی حیثیت سے جس اصول کے تحت میں آتے ہیں وہ اصول خود ہمہ گیر اور نہایت وسیع ہے۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ ہر شاعر کے یہاں ایک وحدت طرز تخیل ضرور ہوتی ہے جس سے اسکے خاص طرز تحریر اور اُسکی ذات کا پتہ چلتا ہے۔ اگر میر تقی میرؔ آہ کرتے ہیں تو سوداؔ واہ۔ اور اُنکے ہر شعر میں آہ اور واہ کا فرق عموماً موجود رہتا ہے جسکو دیکھکر ایک بار ایک میں بتلا سکتا ہے کہ یہ میرؔ ہیں، اور یہ سوداؔ۔ آتشؔ و ناسخؔ کے یہاں بھی فرق نمایاں ہے۔ اور انیسؔ و دبیرؔ کے یہاں بھی امتیاز ظاہر ہے۔

یہی طرز بیان اور اصولی وحدت شاعر کی ذات کو برقرار رکھتی ہے اور شعر کی روح رواں ہے، رونے والا ہنسنا اچھی طرح نہیں جانتا اور اسی وجہ سے جب ہم میرؔ ایسے قادر الکلام اُستاد کے قصائد کا سوداؔ سے مقابلہ کرتے ہیں تو میرؔ کی کمزوریوں کا پتہ خوب چل جاتا ہے سعدیؔ ایسا اُستادِ غزل جب قصیدہ کے میدان میں آتا ہے تو مجبوراً اُسکو دوسروں کی اُستادی ماننا پڑتی ہے۔ لہذا ہر شاعر اور ہر باکمال اپنے حدود کو مدنظر رکھتا ہے اور اپنے احاطۂ مذاق سے زیادہ باہر قدم نہیں رکھتا۔ اِس لئے کہ ع "ہر کسے را بہر کارے ساختند" اور دوسرے کے کام میں دخل دینا مُنہ چڑھانا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ طرز ادا اور اصول بیان شعر کی جان ہے۔ ایک فرانسیسی ادیب کا قول ہے کہ "انسان کا طرز بیان خود اُسکی ذات ہے" اور افلاطون ایسے فطرتِ انسانی کے نبض شناس نے اپنی کتاب "الجمہوریت" میں صاف صاف بیان کر دیا ہو کہ "انسان کا شعر یا بیان اسکے عادات و اخلاق و اعتقادات و علوم و خیالات کا صحیح آئینہ ہے" ہم اس بحث میں زیادہ پڑنا نہیں چاہتے اِس لئے کہ یہ مسئلہ بہت صاف ہے۔ اگر انسان کے اشعار اسکے خیالات و کیفیات روحانی کا صحیح آئینہ ہیں تو ظاہر ہے کہ دل طول کے اشعار درد انگیز، اور خوش طبع کے اشعار ظرافت آمیز ہونگے۔ فلسفی کے اشعار دقیق، اور صوفی کے اشعار معرفت سے مملو ہونگے۔ اور ان میں سے ہر ایک کے اشعار اسی کے ہم خیال گروہ کو پسند آئیں گے۔ اس لئے کہ

اس گروہ کے جذبات و خیالات کی صحیح ترجمانی کرینگے۔ اب اگر کوئی شخص ہر قسم کی قابلیت اور گرم و سرد زندگی کا کافی تجربہ رکھتا ہو، تصوف کی چاشنی بھی چکھے ہوئے ہو اور فلسفہ سے بھی بہرہ یاب ہو تو ایسے شخص کے اشعار ایک خاص نوعیت رکھیں گے بشرطیکہ مضامین الفاظ کا صحیح جامہ پہن لیں۔ ان اشعار کی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ ان میں ہر رنگ کا اثر ہو اور اسکا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ ایسے اشعار ہر دلعزیز ہو جائیں۔ اس لئے کہ وہ ہر شخص کے جذبات و خیالات کی ایک حد تک ترجمانی کرینگے۔
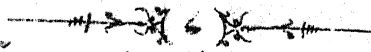
یہ ہے وہ باطنی اور اندرونی رخ جسمیں غالب کو کمال ہے۔ غالب کا ایک خاص طرز خیال ہے جو سب سے جداگانہ ہے۔ اور جو مرکب ہے فلسفہ و جذبات و تصوف و مسائل علمیہ و مذہب وغیرہ سے۔ ان سب کے عناصر موجود ہیں مگر باوجود اسکے اس کثرت آرائی نے وحدت اور باہمی ارتباط کو خراب نہیں ہونے دیا ہے۔ اگرچہ ایسی ترکیب و بنا خود بذاتہ ایک کمال ہے مگر غالب نے اس کمال کو اوج عالیہ پر پہونچا دیا ہے۔ غالب کا تصوف نہ تو رسمی تصوف ہے اور نہ فلسفہ رسمی فلسفہ ہے۔ انکے پاس جو کچھ ہے وہ تقلیدی اور عاریتی نہیں بلکہ خود ساختہ ہے اور ذاتی ہے۔ خود فرماتے ہیں۔ ؎

غیر کی منت نہ کھینچونگا پئے توقیر درد　　زخم مثل خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

بوجہ ذاتی ہونے کے غالب کو ان تمام ترکیبی عناصر پر اتنا قابو ہے کہ سبھوں کو آپس میں شیر و شکر کر دیا ہے۔ اور یہی غالب کا خاص کمال ہے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے عموماً شعرائے باکمال میں وحدت تخئیل پائی جاتی ہے۔ مگر ان کا میدان تخئیل محدود ہے اور صرف ایک خاص شعبۂ زندگی یا علم سے تعلق رکھتا ہے بعض شعراء ایسے ضرور ہیں جنکا میدان تخئیل وسیع اور ہمہ گیر ہے اور انھوں نے زندگی اور علم کے اکثر شعبوں سے بحث کی ہے۔ مگر ان میں وحدت تخئیل پانا مشکل ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ مثل متقدمین متاخرین کے اجتماع ضدین کرنا اپنا فخر سمجھتے ہیں اور صرف قوت تخئیل اور زبان پر قابو ہونے کی وجہ سے ہر ایک مضمون نظم کر دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ ان کا دیوان خیالات مختلفہ کی فہرست مضامین ہوتا ہے۔ غالب کے اشعار میں متضاد باتیں نہیں ہیں۔ ان کے یہاں وحدت خیال بھی ہے اور وسعت میدان تخئیل بھی انکا میدان تخئیل صرف وسیع ہی نہیں بلکہ ہمہ گیر ہے اور انکے تخئیلات نیز الفاظ میں مخالفت کا

ملنا دشوار ہے یہی سبب ہے کہ ؎

اگرچہ حسن فروشاں بہ جلوہ آمدہ اند — کسے بہ حسن و لطافت بیار ما نہ رسد

اس خصوصیت کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے مختلف علوم اور زندگی کے شعبوں پر غور کر کے سب کی اپنے دماغ میں تحلیل و ترکیب کر لی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئیے کہ انہوں نے ہستی اور حیات کے مسائل کو ایک ہمہ گیر اور کلی نقطۂ نظر کے تحت میں لا کر یوں حل کر لیا ہے کہ تمام مسائل زندگی اور علوم اسکی شاخیں نظر آتی ہیں۔ ایسے اشعار کہنا مشکل ہے۔ ؎

ایسا آساں نہیں لہو رونا — دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

اور ایسے اشعار کے حقیقی مفہوم تک پہونچنا اور پوری وسعت نظر سے انکے مطالب کا سمجھنا بھی دشوار ہے ؎

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد — کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

ہماری رائے ہے کہ غالب کا پورا دیوان منتشر موتیوں کا ایک ڈھیر نہیں بلکہ گوہرہائے شاہوار کی ایک منسلک لڑی ہے جو اس خوبی سے گوندھی گئی ہے کہ نظم و ترتیب نے بحیثیت خود ایک خاص حسن اختیار کر لیا ہے۔ موتی بذات خود قیمتی ضرور ہیں اور ہر ظاہر بیں جوہری انکا قدر دان ہو جاتا ہے مگر وہ رشتہ جو اندر سے ان میں آب دے رہا ہے خود نظر سے مخفی ہے اور صرف باطن بینوں پر اپنا راز منکشف کرتا ہے ؎

ناظر روئے تو صاحب نظرانند ولے — سر گیسوئے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

غالباً یہی وجہ ہے کہ اگرچہ غالب کے اشعار کا ہر شخص دلدادہ ہے مگر عام طور پر انکے اشعار انفرادی حیثیت سے بطور معمہ کے سمجھے جاتے ہیں اور مختلف شارحین و مفسرین میں بسا اوقات علم مخالفت بلند ہو جاتا ہے۔ حقیقت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ فطرت انسانی نادانستہ غالب کے خیالات کی ہمہ گیری اور حسن انتظام سے متاثر ہوتی ہے مگر بوجہ دقت کے اس اصول اور انتظام کو صاف صاف نہیں سمجھ سکتی۔ اس مسئلہ پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ اتنے بڑے باکمال شخص کا حق ہے کہ اس کے خیالات صاف صاف اصولی حیثیت سے واضح کر دیئے جائیں تاکہ آیندہ اشعار کی توضیح و تشریح آسانی سے ہو سکے۔ اور اسی کے ساتھ غالب کے خیال کے مختلف عناصر بھی علیحدہ علیحدہ بیان کر دیئے جائیں تاکہ اس کل کے اجزا کا پورا پورا حال معلوم ہو جائے۔ لہذا ہم نے ارادہ کیا ہے کہ

غالب کے کلام نثر و نظم کا باہم تقابل و توازن کر کے استقرائی اصول کی بنا پر اُس کلی نقطۂ نظر تک پہونچ جائیں جس سے غالب اشعار کہتے تھے اور اُس تصور نظام عالم و نظام حیات کو دریافت کرلیں جس کو غالب صحیح سمجھتے تھے۔ اِس استقراء کے ساتھ ایک اور بات بڑی مدد دیگی۔ وہ یہ کہ غالب کے ماحول، کوائف زندگی، اور حدود علیّت وغیرہ پر غور کیا جائے اور اُس طرح پر اُن عناصر کا پتہ لگایا جائے جن سے غالب کے خیالات مرکب ہیں۔ ہر شخص اپنے زمانہ کا مخلوق ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غالب ایسا باکمال اپنائے روزگار سے سبقت لے جائے گا۔ مگر پھر بھی زمانہ کی حالت سے متاثر ہونا پڑیگا اور بہت بڑی حد تک اس اثر کو قبول کرنا ہوگا۔

ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ صرف ہم ہی اس کام کو کرینگے یا کرسکتے ہیں۔ مگر غالبًا یہ اپنی طرز کا ایک نیا کام ہے اور زبان اُردو میں اس قسم کے مضمون پر جو کچھ روشنی ڈالی گئی ہے وہ صرف ضمنًا نہ کہ بہ حیثیت خود ایک بحث قرار دے کر۔ مگر اُردو زبان میں ایسے کام کی ضرورت ہے اور ہمارے اُردو شعرا اور ادیب بھی اس قابل ہیں کہ مثل (Wordsworth) اور Shelley وغیرہ کے انکے خیالات سے بحث کی جائے۔ میں اور حضرات سے بھی التجا کرونگا کہ وہ اس طرف اپنی توجہ مبذول کریں اس لئے کہ نہ تو میں اس کا اہل ہوں اور نہ مجھے اتنی فرصت کہ اس بڑے کام کو انجام دوں۔ اگر کسی باہمت نے میری التجا پر اعتنا کی تو میرا یہ مضمون نقش اول کا کام دیگا۔ ورنہ چار و ناچار میں اس بحث پر جب کبھی موقع ملیگا روشنی ڈالتا رہونگا۔ اور اگر مدیر "ادب" صاحب کی عنایت شائع کرنے میں میرے شریک حال رہی تو انشاء اللہ کبھی یہ سلسلہ ختم ہو جائیگا۔

(باقی آیندہ)
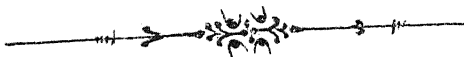
یادگار نسیم کے اعتراضات اور انکے جوابات

(سراج الحق صاحب مچھلی شہری)

جناب سراج الحق صاحب مچھلی شہری کا مضمون "یادگار نسیم" پر اعتراضات کے جواب میں ستمبر میں موصول ہوا تھا لیکن وہ اس قدر ذاتیات سے پُر تھا کہ اسکی اشاعت "ادب" کے معیار کے منافی تھی۔ جناب مدیر نے اسی لئے مضمون نگار سے بذریعۂ مکتوب یہ گزارش کی تھی کہ اگر مضمون سے وہ غیر متعلقہ حصہ جو ذاتی حملوں پر مبنی ہے حذف کر دیا جائے تو مضمون شائع کیا جاسکتا ہے لیکن مضمون نگار صاحب نے جناب مدیر کی اس معقول گزارش کی سماعت کی زحمت نہ گوارا کی بلکہ یہ خواہش کی کہ انکا مضمون بجنسہ شائع کر دیا جائے ورنہ واپس کر دیا جائے۔ اسی زمانہ میں جناب مدیر بہت زیادہ علیل ہوگئے اور راقم سطور کو بہت سے فرائض بہ یک وقت انجام دینا پڑے۔ اس انتشار کے عالم میں سراج الحق صاحب کا مضمون تعجیل کے ساتھ واپس نہ کیا جاسکا۔ بہر حال مزید یاددہانی پر مضمون واپس کیا گیا مگر اس گزارش کے ساتھ کہ اب بھی اگر مضمون ذاتی حملوں کی آمیزش سے پاک کر دیا جائے تو "ادب" میں شائع کیا جاسکتا ہے۔ اسکے جواب میں ذیل کا مضمون بہت کچھ حذف و اسقاط کے بعد مضمون نگار صاحب کی اس بدگمانی کو ساتھ لئے ہوئے آیا ہے کہ "شاید اس اثنا میں انہوں (مدیر ادب) نے بعض حلقوں سے یہ مشورہ کیا ہو کہ یہ مضمون فلاں کے خلاف ہے اسے شائع کیا جائے یا نہیں"۔

ہم مضمون نگار صاحب کو اس سے پیشتر یقین دلانے کی کوشش کر چکے ہیں کہ جناب مدیر ادب کچھ زمانہ سے سخت علیل ہیں۔ مگر موصوف اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر کسی طرح تیار نہیں ہیں معلوم نہیں مضمون نگار صاحب کو کارکنان "ادب" کے خلاف یہ سوء ظن کیوں ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ "ادب" کسی خاص شخص یا جماعت کا مخالف یا طرفدار نہیں ہے اور ہمارا طرز عمل اس دعوے کی دلیل ہے لیکن بے بنیاد بدگمانیوں کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔ اگر مضمون نگار صاحب بُرا نہ مانیں تو ہم یہ عرض کرنے کی جرأت کریں کہ یہ مجادلانہ مذاق اور جماعتی تنگ نظری خادمان "ادب" کے لئے زیبا نہیں۔ منیجر

رسالہ ''ادب'' کے جولائی نمبر میں جناب اصغر گونڈوی کی ایک کتاب یادگار نسیم پر جو ابھی شائع بھی نہیں ہوئی کسی صاحب نے اعتراضات کئے تھے۔ میں نے اس کا جواب لکھا اور جواب کے سلسلہ میں تین/چار بحثیں بھی کیں۔ ایک یہ کہ جناب اصغر کے متعلق جو عرصہ سے لوگ شور و غل مچا رہے ہیں اور اُنکی ذات پر بیجا حملے کر رہے ہیں۔ تو میں اپنے خیالات بھی جناب اصغر کے بارہ میں پبلک کے سامنے پیش کروں۔ دوسری بحث یہ تھی کہ یادگار نسیم پر جو اعتراضات نکل رہے ہیں کیا فی الحقیقت یہ یونیورسٹی کے طلباء کے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر معترض میرے نزدیک کون ہے۔ اُنکا تعین اور اُسکے وجوہ و دلائل۔ تیسری بحث یہ تھی کہ آج کل تنقید کی روش یہ ہو رہی ہے کہ کسی ادیب و شاعر سے اگر قواعد و عروض کی ذرا بھی لغزش ہوئی، تو قواعد پرست حضرات اُنکی ذات، اُنکے کارنامے، اُنکی لیاقت، سب پر پانی پھیر دینا چاہتے ہیں۔ گویا اصولاً اس بحث کی صورت یوں ہوتی ہے۔ کیا ہر ادیب و شاعر کے لئے ماہر عروض و ماہر قواعد ہونا ضروری ہے؟ تین یا اور چوتھی بحث جوابات اعتراضات کی لکھکر ۱۰ ستمبر میں میں نے اڈیٹر ''ادب'' کے پاس بغرض اشاعت اپنا مضمون بھیجا۔ انہوں نے لکھا کہ اس سے قشری مباحث چھڑ جائینگے کہو تو صرف جوابات کا ٹکڑا شائع کیا جائے۔ میں نے لکھا مجھے منظور نہیں میرا مضمون واپس بھیج دیجئے۔ اسکے بعد دفتر ''ادب'' نے خاموشی اختیار کر لی اور میرا مضمون بھی دھر رکھا، شاید اس اثنا میں اُنھوں نے بعض حلقوں سے مشورہ کیا ہو کہ یہ مضمون فلاں کے خلاف ہے شائع کیا جائے یا نہیں۔ اسکے بعد خدا خدا کرکے ۲۷ / اکتوبر کو وہ مضمون واپس آیا۔ اس دعوت کے ساتھ کہ اب بھی اگر صرف جوابات کا حصہ شائع کرانا چاہو تو ''ادب'' میں شائع ہو سکتے ہیں۔ میں نے ''ادب'' کو صرف اس لئے منتخب کیا تھا کہ اعتراضات سب سے پہلے اُسی میں شائع ہوئے تھے اور میں نے وہی پرچہ پہلے دیکھا تھا۔ لہذا گو پورا مضمون دوسری جگہ بھیج چکا تھا پھر بھی صرف حصہ جوابات علیحدہ کرکے ''ادب'' میں حسب حکم بھیجتا ہوں۔ یہ سب کچھ عرض کیا گیا محض تاخیر کی وجہ عرض کرنے کی غرض سے۔

اعتراضات و جوابات

کسی شخص کی تصنیف پر اعتراض کرنے سے پہلے معترض کو اصولاً دو باتیں لازم ہیں۔

(۱) چونکہ وہ دوسرے پر اعتراض کرتا ہے اور گویا اپنے کو زیادہ واقف کار اور ذی علم بتانا چاہتا ہے اس لئے ضرور ہے کہ غور سے کتابوں سے رجوع کرے اور صحیح اعتراض کرے۔ ورنہ اُلٹی آنتیں گلے پڑتی ہیں۔ یہی ہمارے معترض یادگار نسیم کو بھی چاہیے تھا لیکن ناظرین کس قدر حیرت سے سنیں گے کہ معترض نے [illegible] اعتراضات کرتے ہیں اکثر مقامات پر اپنی بدلیاقتی کا ثبوت دیا ہے اور غلط اعتراضات کئے

ہیں۔ یہ غلطیاں طالبعلموں سے بھی اور قواعددانوں سے بھی، دونوں سے قابل افسوس ہیں۔

(۳) اگر تصنیف زیربحث کا مقصد تصنیف، اور مصنف کا نقطۂ نظر اور میلان طبع بھی معلوم کرلیا جائے تو اکثر غلط فہمیاں دُور ہوجائیں اور اکثر باتیں جو بظاہر قابل اعتراض معلوم ہوتی ہیں ان کی اصل حقیقت سامنے آجائے۔ اگرچہ کتاب یادگارنسیم میں التماس اور مقدمہ کے الفاظ نیز حواشی کے طرز سے یہ بات بالکل ظاہر تھی کہ آصغر صاحب نے دراصل مقدمہ پر زیادہ زور دیا ہے نہ کہ حواشی اور تقسیم صنائع پر۔ مقدمہ میں اُنھوں نے تنقید اعلیٰ کا نمونہ پیش کیا ہے نسیم کے حالات زندگی اور اُنکے خصائص لکھے ہیں۔ نیز اس عہد کی شاعری اور عام میلان طبع کے بارہ میں بہت خوبی سے بحث کی ہے یہی وہ مباحث ہیں جن سے "شعر و ادب کے بارہ میں طلبہ کی نظر بلند ہوسکتی اور ان میں صحیح بصیرت اور صالح ذہنیت پیدا ہوسکتی ہے"۔ صحیح بصیرت کا حصول اعلیٰ تنقید سے ہوا کرتا ہے نہ کہ قواعد کی تفصیل و تقسیم سے۔ صنائع لکھنا اس میں ضمنی سی بات تھی۔ اصغر صاحب نے نہ تو تفصیلی طور پر صنائع کو لکھنا چاہا ہے اور وہ اُسکو مذاق ادب کے نکھار کے لئے اچھا سمجھتے ہیں۔ وہ صنعتوں کی طرف اشارات کردینا چاہتے ہیں کہ طلبا کو فی الجملہ صنائع کلام سے واقفیت و شناسائی ہے۔ اُنکا مطلب ہرگز بحرالفصاحت رٹانا نہیں۔ یہی مطلب تھا ان کے ان الفاظ کا کہ "کوشش کی گئی ہے کہ فٹ نوٹ اور حواشی سے ان (طلبا) کو کافی مدد مل سکے"۔ فٹ نوٹ اور حواشی سے وہ طلبا کو صرف صنعت لفظی و معنوی کے مواقع اور حسن کلام کے چند نمونے بتا کر گزرجانا چاہتے ہیں چنانچہ اُنھوں نے ہر شعر کی تمام صنعتیں نہیں لکھیں اور یہ عام روش ہے شارحین متون کی یعنی اتنا لکھ دینا کہ اس میں تضاد یا تناسب ہے۔ یا فلاں لفظ، فلاں لفظ کا تلازمہ ہے' کافی ہے اس امر کے جاننے کے لئے کہ اس میں کوئی صنعت ہے اور غالبًا اتنا اشارہ طلبہ کی مدد کو کافی ہے۔ اسکے بعد جسکو بحرالفصاحت دیکھنی ہو وہ اسکی طرف رجوع کرے۔ یادگار نسیم قواعد کی کتاب نہ تھی۔ صنائع کا ذکر اس میں محض ضمنًا ہے۔ اور ضمنی امور سے کوئی شخص ہرگز اسکا مدعی نہیں ہوسکتا کہ وہ مدد دینے سے بڑھ کر یہ کرے کہ اُس فن میں پوری طرح مہارت اور عبور حاصل کرادے۔ اسکی مثال سنئے۔ وقائع نعمت خان عالی کی سطر اول کے حواشی میں لکھا ہے "تناسب الفاظ و رعایت معنی پر ظاہر" حالانکہ سطر اول میں ایہام تناسب بھی ہے' ایہام اشتقاق بھی ہے' استعارہ و تشبیہ بھی ہے۔ بحرالفصاحت میں صفحہ ۱۰۰ پر ایک شعر ہے مومن خاں کا ۔

ہمراہ کہ لب پہ ہے شرر ریز
دیباچہ کا ہے نغمۂ جنوں خیز

اس کے بعد لکھتے ہیں "اس میں علم موسیقی کی اصطلاح کو ذکر کیا ہے"۔ ہمارے معترض کو یہاں یہ کہنے کا موقع حاصل ہے کہ "دیکھئے صاحب بحر الفصاحت کیسا جاہل تھا کہ اصطلاح موسیقی کے نام کا تعین، راگ راگنی کی قسم در قسم نہیں لکھی اور طلبہ کی استعداد کچھ نہ بڑھائی"، لیکن کیا یہ اعتراض صحیح ہے ؟- اس امر کو بھی نظر انداز نہ کر دینا چاہئے کہ اگر اصغر صاحب کو قواعد و صنائع پر زور دینا ہوتا یا وہ اپنی قواعد دانی کا ثبوت دینا چاہتے تو بحر الفصاحت وغیرہ کمیاب نہ تھیں۔ اصغر صاحب اُن سے رجوع کر سکتے تھے لیکن معترض صاحب ایک ادبی کتاب سے بھی یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ کیوں نہ بحر الفصاحت اور حدائق البلاغت ہوئی ؟-

این سخن را چہ جواب ست تو ہم می دانی !!

اس تمہید کے بعد ہم سلسلہ وار اعتراضات پر بحث کرتے ہیں اور ہر اعتراض پر اپنا فیصلہ بھی لکھتے جائینگے کہ کس کے حق میں ہوتا ہے۔

مثال اول | جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے مرکز پہ کشش مری پہونچ جائے

اصغر صاحب - نکتہ، حرف، مرکز، کشش، میں مراعات النظیر ہے۔ (ملخصاً)

معترض صاحب - چونکہ حرف سے مراد حروف تہجی، اور مرکز سے مراد ک گ کا مرکز نہیں۔ بلکہ حرف آنا سے مراد بے عیب ہونا (؟ الزام آنا) اور مرکز پہ کشش پہونچنے سے مراد کامیاب ہونا ہے اس لئے مراعات النظیر نہیں مشاکلہ ہے (ملخصاً)

سراج عرض کرتا ہے کہ اگر اس تحقیق انیق کو اگر آپ اپنے گھر ہی دھرے رہتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ کہاں مشاکلہ، اور کہاں مراعات النظیر!! اس شعر میں ان (حرف، لکھنا، مرکز، کشش) الفاظ کا ایک جا ہونا یقیناً مراعات النظیر ہی ہے۔ اور چونکہ حرف آنا سے الزام آنا اور مرکز پہ کشش پہونچنے سے مراد کامیاب ہونا مراد ہے، اِس لئے اس میں ایک دوسری صنعت بھی ہے، جسکا نام ایہام تناسب ہے، نہ کہ جناب کی مشاکلہ۔ آپ شاید میرے کہنے کو سچ نہ جانیں لہٰذا آئیے بحر الفصاحت کو دیکھیں۔ (بحر الفصاحت نولکشوری صفحہ ۹۳۲) "مراعات النظیر یعنی ایسے الفاظ استعمال کرنا جن کے معنے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نسبت تضاد کے کچھ مناسبت رکھتے ہوں"۔ اسکے بعد اسکی متعدد مثالیں لکھی ہیں۔ ہم اُن میں سے صرف دو مثالوں پر اس جگہ اکتفا کرتے ہیں

(۱) "اتنا کہا جو ٹرا چودھواں مجھکو تپھا کہنے لگی چلئے مری جوتی جانے"

[غور کیجئے۔ جوتی جانے سے مراد یہ کہ "دور ہو میں نہیں جانتی"۔ لیکن پھر بھی اسمیں مراعات النظیر

ہی ہے۔ جوڑا، چودھواں، پنہا، جوتی، میں یقیناً مراعات ہے۔

(۲) کس کمان ابرو پہ تو قربان ہوا نالے سر کرتا ہے جو تو تیر سے

[ملاحظہ ہو۔ نالے سر کرنا میں گو سر کرنا محاورہ ہے مگر سر اور ابرو میں مراعات ہے۔ نیز، کمان قربان، تیر، میں مراعات ہے]

صفحہ ۹۳۵ پر ایہام تناسب کے بیان میں لکھتے ہیں "یعنی دو لفظ ایسے بیان کریں کہ انکے معنی میں کچھ مناسبت مقصود نہو...... لیکن اُن میں سے ایک لفظ کے اور معنی ایسے بھی ہیں کہ دوسرے لفظ کے معنی سے مناسبت رکھتے ہوں جیسے ایک کلام میں لیلیٰ و مجنوں دونوں لفظ مذکور ہوں۔ اور مجنوں، دیوانے اور بٹرہی کے معنی میں لایا گیا ہو، پس ظاہر ہے کہ وہاں لیلیٰ و مجنوں کے معنی میں کچھ مناسبت نہ ہوگی لیکن مجنوں کے ایک معنی اور بھی ہیں یعنی قیس عاشق لیلیٰ کا لقب بھی مجنوں ہے اس معنے کو لیلیٰ کے معنے سے مناسبت ہے...... یہ صنعت مراعاۃ النظیر کے ملحقات سے ہے چنانچہ مثال مذکور میں مجنوں کا ذکر لیلیٰ کی مناسبت سے مراعات النظیر ہے اور اس وجہ سے کہ یہاں اُس سے دیوانہ کے معنے مراد ہیں نہ کہ قیس، ایہام تناسب ہے"

اِس عبارت سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) ایہام تناسب بھی مراعات النظیر ہی کی ایک قسم ہے۔ لہذا جسکو تفصیل اقسام بیان کرنی منظور نہو اسکا اتنا لکھدینا کافی ہے کہ اسمیں مراعات النظیر ہے۔ (۲) ایک ہی مثال میں ایک لفظ میں دو صنعتیں پائی جاسکتی ہیں دوسرے دوسرے الفاظ کی رعایت سے۔ (۳) اگر کوئی لفظ کسی دوسرے لفظ کے مناسبات سے بیان کیا گیا ہو۔ پھر چاہے اُس سے معناً کوئی دوسری بات مراد ہو۔ اور اس طرح وہ ایہام تناسب کے ذیل میں بھی آسکتا ہو لیکن محض ان مناسبات کی وجہ سے اسکے ذکر کو مراعات النظیر ہی کہینگے۔

اب آیئے لگے ہاتھوں آپ کی مشاکلہ کو بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ بحر الفصاحت صفحہ ۹۸۱ پر ہے "دو چیزیں ذکر کریں اور ان دونوں کو ایک جگہ مذکور ہونے کی مناسبت سے "ایک ہی لفظ" سے تعبیر کریں۔ مثال میر۔

ہے میں رونے والا جہاں سے چلا ہوں جسے ابر ہر سال روتا رہیگا"

اپنے رونے کی مناسبت سے ابر کے برسنے کو بھی رونے کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

"حدائق البلاغۃ" میں اسکی تعریف اور مثالیں زیادہ صراحت سے ہیں جیسے "وَمَکَرُوا وَمَکَرَ اللّٰہُ"

میں اللہ کے لئے کڑکا لفظ محض پہلے لفظ "کڑوا" کے ذکر کی مناسبت سے لائے ہیں مگر مراد ہیں سزا۔
تینوں صنعتوں کی تعریفیں اور مثالیں ہم نے لکھدیں، اب معترض صاحب خود ہی فیصلہ کریں کہ "نکتہ" اور "حرف" اور "لکھنے" وغیرہ میں مشاکلہ ہے یا مراعات ہے۔ اس مثال میں اصغر صاحب حق بجانب ہیں۔

مثال دوم | پایا جو سفید چشم صفحا الخ

اصغر صاحب - چشم صفحہ (فارسی ترکیب کے ساتھ) کا قافیہ صحیح نہیں (ملخصاً)

معترض صاحب - چشم صفحہ میں ترکیب نہیں ہے بلکہ سفید چشم میں ترکیب مقلوب ہے۔ گویا نثر یوں ہوگی "صفحہ کو جو سفید چشم یا چشم سفید پایا۔ آپنے خود مصرع کو غلط پڑھا چشم صفحہ ہوتا تو پایا کا فعل پائی ہوتا (ملخصاً)

سراج - ایک لحاظ سے اعتراض صحیح ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو اصغر صاحب نے بھی غلط نہیں پڑھا تھا۔ جب وہ میل قلم کہ رہا ہے تو یقیناً چشم صفحہ میں بھی ترکیب اضافی ہوگی۔ رہا فعل کا مؤنث ہونا تو اسکا قدامی زمانہ میں بھی چنداں لحاظ نہیں کیا جاتا تھا، آج بھی لوگ "روٹی کھایا" بول جاتے ہیں۔

مثال سوم | ہر چند کہ تھا وہ دیو کڑوا		حلوے سے کیا منہ اُس کا میٹھا

اصغر صاحب - کڑوا اور میٹھا میں تضاد یا طباق ہے۔

معترض صاحب - چونکہ کڑوے سے مراد تندمزاج ہے اس لئے اسمیں ایہام تضاد ہے نہ کہ تضاد۔

سراج - میرے خیال میں یہاں معترض کو ایک اعتراض اور بھی کرنا چاہئے تھا۔ وہ یہ کہ حلوا، منہ، میٹھا، میں صنعت تناسب بھی ہے۔ اور اصغر صاحب نے اسے نہیں گنایا لیکن جب میں اوپر کہ آیا ہوں کہ نہ اصغر صاحب تمام صنائع کا استقرار کرنا چاہتے ہیں اور نہ قسم در قسم کی تفصیل۔ اس صورت میں اگر انھوں نے ایہام تضاد کو (یکجا) تضاد کہدیا تو کیا برائی ہوئی۔ آخر ایہام تضاد بھی تو تضاد ہی کی ایک قسم ہے۔ بحر الفصاحت صفحہ ۹۳۲ پر ہے "دو معنی ایسے جمع کئے جائیں جسمیں باہم تضاد و تقابل نہ ہو لیکن جن الفاظ کے ساتھ انکو تعبیر کی جائے انکے حقیقی معنی کے اعتبار سے تضاد پایا جائے اور یہ عام ہے اس سے کہ معنی مجازی دوسرے کے معنی حقیقی کے ساتھ جمع کئے جائیں اور ان مجازی معنی کو حقیقی معنی کے ساتھ تضاد ہو۔ یا دونوں کے معنی مجازی کو جمع کیا جائے اور دونوں کے حقیقی معنی کے اعتبار سے تضاد ہو اور اس صنعت کا شمار بھی اقسام تضاد میں ہے۔" اسکے آگے کئی مثالیں ہیں۔ مگر ہم صرف دو مثالیں لکھتے ہیں۔ ــ

(۱) بن تیرے سیر چمن کو نہ گئے ہم ورنہ		خندۂ گل سے ہمیں خون ٹپکتا پایا ہوتا

گل کے کھلنے کو ہنسنا قرار دیا ہے اس لئے ہنسنے اور رونے میں تضاد واقع ہوگا۔ پہلے معنے مجازی ہیں۔ دوسرے حقیقی"

(۲) "چار دیواری سو جگہ سے خم — تر ذرا ہو تو سوکھتے ہیں ہم"

اس پر نوٹ یہ ہے کہ "خوف کھانے کو سوکھنے سے تعبیر کیا ہے۔ اس لئے تر ہونے میں اور اسمیں تضاد ہوگیا" حدائق البلاغۃ کی عبارت بھی سن لیجئے۔ (صفحہ ۴۸) "نوعے از طباق ست کہ آنرا ایہام تضاد نامند و تعریفش چنانست کہ دو معنی غیر مقابل را بہ دو لفظ تعبیر کنند کہ در معنی حقیقی آں ہر دو لفظ تقابل و تضاد متحق باشد و ازیں قبیل ست ایں بیت سنائی ؎

ہست شایستہ گرچہ آید خشم — طاق ابرو برائے جفتِ چشم

طاق اینجا برائے طاق عمارت ست امّا چوں طاق ضد جفت ہم می آید نظر براں معنی تقابل و تضاد ہم رسانید۔ غور کیجئے بحر الفصاحت اور حدائق البلاغۃ والے قواعد ہی لکھنے بیٹھے ہیں لہذا قواعد کے مسائل میں انکو ذرا بھی مبہم الفاظ سے کام نہ لینا چاہیئے تھا لیکن وہ لوگ بھی (۱) ایہام تضاد کو تضاد ہی کی ایک قسم بتاتے ہیں۔ (۲) بیان ایہام تضاد کا۔ تعریف اور مثال ایہام تضاد کی لیکن نوٹ میں صرف تضاد لکھا" "ایہام تضاد" نہیں لکھا۔ ہمارے معترض کو خبر ہو تو یقیناً لٹھ لیکر دوڑیں کہ "یارو غضب ہوگیا۔ دیکھو یہ دونوں ایہام تضاد کی مثال دیکر نوٹ میں صرف تضاد لکھ گئے"! اس مثال میں بھی یقیناً اصغر صاحب حق بجانب ہیں۔

مثال چہارم	(۴) ہے پیر یہ نوجواں ہمارا۔
پنجم۔ ہشتم	(۵) روشن ہے جو کچھ کیا ہے اندھیر۔
	(۸) ٹھنڈی ہوئیں تھا جنھیں جلاپا۔

اصغر صاحب۔ ان میں طباق یا تضاد ہے (ملخصاً)

معترض صاحب نہیں ان سب میں ایہام تضاد ہے (ملخصاً)

سراج۔ معترض کو غالباً اعتراضات کی فہرست بڑھانی مقصود ہے اس لئے انھوں نے ان مثالوں کو الگ الگ بیان کیا ہے۔ حالانکہ ان میں بھی ٹھیک وہی اعتراض ہے جو مثال ۲ میں ہے اور وہی اسکا جواب بھی ہے جو مثال ۲ کے ذیل میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ اصل یہ ہے کہ ان مثالوں میں

تضادہی ہے اس وجہ سے بھی کہ تضادہی کی ایہام تضاد (قسم) ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ خود قواعد نگار بھی ایہام تضاد کی مثالوں میں "تضاد" لکھدینا کافی سمجھتے ہیں۔ ان مثالوں میں بھی یقیناً اصغر صاحب حق بجانب ہیں۔

مثال ششم	(۶) کودے نہ کنوئیں میں باؤلی ہو۔
و نہم	(۹) جھنجھلا کے پلنگ سے اُٹھا شیر۔

اصغر صاحب۔ کنوئیں اور باؤلی میں تجنیس ہے اور پلنگ اور شیر میں تجنیس خطی (ملخصاً)

معترض صاحب۔ .... ان میں ایہام ہے۔ (ملخصاً)

سراج۔ ہمکو خود بھی سخت حیرت ہے کہ اصغر صاحب کیا سمجھ کر ان مثالوں میں تجنیس لکھ گئے۔ اگر کتاب میں اسی طرح ہے (کیونکہ ہم نے وہ کتاب خود نہیں دیکھی) تو یقیناً یہ دونوں اعتراضات صحیح ہیں۔ اور اصغر صاحب نے فاش غلطی کی ہے۔ تمام اعتراضات میں صرف یہی دو اعتراضات ہیں جو صحیح طور پر اصغر صاحب پر وارد ہوتے ہیں۔

مثال ہفتم	(۷) بجلی سے لہرے تھا ہم آغوش۔
و یازدہم	(۱۱) ہمسایہ تھے کشیدہ داماں۔

اصغر صاحب۔ معرکہ چکبست و شرر میں یہ مصرعے یوں لکھے ہیں۔

(۱) تھا بجلی سی لہرے ہم آغوش

(۲) ہمسایہ تھے سب کشیدہ داماں

معترض صاحب۔ جب چکبست نے مصرعے صحیح کر دیئے تھے تو آپنے صحیح مصرعے کیوں نہ لکھے؟ اصل چیز کتاب کی صحت ہے۔ (ملخصاً)

سراج۔ "بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست" سراج حیران ہے کہ اسکے متعلق کیا عرض کرے۔ یہ اعتراضات اگر اعتراض کرنے کے شوق میں نہیں کئے گئے ہیں تو پھر اور کیا ہے؟۔ اگر بالمثل اصغر صاحب چکبست کے صحیح کردہ مصرعے لکھدیتے تو سب سے پہلے میں اعتراض کرتا کہ اصغر صاحب "نسیم" کی "گلزار نسیم" شائع کر رہے تھے نہ کہ چکبست کی۔ پھر انھوں نے چکبست کے الفاظ کیوں لکھے؟۔ معترض اتنا تو جانتے نہیں کہ چکبست نے شرر کا مُنہ بند کرنے اور نسیم پر سے اعتراض اُٹھانے کے لئے

خود چند مصرعوں میں ترمیم و صلاح تغیر و تبدل - تقدیم و تاخیر کر دی تھی اور یہی وجہ تھی کہ چکبست نے ایمانداری سے یہ صلاحیں حاشیہ پر لکھیں نہ کہ اصل متن میں - جب معترض اس نکتہ کو نہ سمجھ سکے تو اُن سے اور کس بات کی توقع ہو سکتی ہے ؟ - نسیم نے یہ مصرعے یونہیں کہے ہیں اب چاہے صحیح ہوں یا غلط -

مثال ۷ کے متعلق یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ نسیم ہندو تھے اور وہ اس مثنوی میں اکثر ہندی الفاظ نظم کر گئے ہیں مثلاً لہر، بالی، کنیا، اور ہندی تلفظ ہی کے ساتھ نظم کر گئے ہیں - اس لئے ممکن ہے کہ انھوں نے "لہر" کو بھی ہندی تلفظ کے ساتھ نظم کیا ہو - کیونکہ ہندی میں لہر کی ہ متحرک ہی ہے -

مثال ۱۱ میں معترض کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ آپ کو عروض نہیں آتی (۱) آپ جس طرح اپنی "نشاط روح" میں دو مصرعے غلط موزوں کئے ہیں یعنی ارنی کی (ر) کو اور متبسم کی (ت) کو جو دراصل متحرک ہیں آپ ساکن نظم کر گئے ہیں - اسی طرح آپ نے "ہمسایہ تھے کشیدہ داماں" کو بھی موزوں سمجھ لیا - (۲) ہمسایہ کی آخر کی ہ سے پہلے جو فتحہ ہے اسکو کھینچنا ناجائز ہے - (۳) ابتدا میں مفعولن کا رکن لانا چاہئے -

جواب میں عرض ہے کہ اکثر مخالفت میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک بات کو اگر انصاف سے دیکھا جائے تو وہ صحیح معلوم ہو گی لیکن محض بر بنائے اسکو غلط بتایا جاتا ہے - ان تینوں اعتراضات کے جواب بالترتیب یہ ہیں -

(۱) اصغر صاحب کو چاہے عروض آتی ہو یا نہ آتی ہو، لیکن نسیم نے یہ مصرعے یونہیں کہے ہیں - ارنی کی (ر) ساکن بھی جائز ہے اور اساتذہ کے کلام میں اسکی مثال ہمکو ملتی ہے - چنانچہ مخزن الفوائد مولفہ فائق اکبر آبادی میں نظامی کا ایک شعر لکھا ہے -

موسیٰ ازیں جام تہی بود دست　　شیشہ بکُہ پایۂ ارنی شکست

آنند راج میں سالک کا ایک شعر ہے -

مرغ ارنی گو ز شوقے لن ترانی می کند　　پیش موسیٰ خار خار وادی ایمن گل است

ایک شعر کسی اور کا ہے -

صد ہزاراں ہمچو موسیٰ مست در ہر گوشۂ　　ربِّ ارنی گوش وہ دیدار جویاں آمدہ

رہا لفظ متبسم تو اسکی سند تو میں نہیں پا سکا لیکن لفظ ارنی کی متحرک (ر) کو ساکن کرنے سے اس کی مثال بھی سمجھ میں آ جاتی ہے -

(۲) ہائے مختفی سے قبل کا فتحہ کھینچا جا سکتا ہے - چنانچہ اسی مثنوی سے اسکی مثالیں ملاحظہ ہوں -

"سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجئے"
"بندہ ہوتا پیدا ہوا تھا"
"صدمہ ہوا درد سے کہا ہائے"
"سایہ بھی نہ اُس پری پہ ڈالا"
"بارہ دری واں جو سونے کی تھی"

(۳) ایسا ابتدا میں مفعولن کا رکن آنے کی مثالیں سنئیے۔
"یعنی تاج الملوک مضطر"
"وعدہ کر آیا ہوں، کہا خیر"
"چاروں شہزادے مسکرا کے"
"چاروں شہزادے کے ہمراہ"

ان مصرعوں میں برابر مفعولن کا رکن ابتدا میں آیا ہے۔ ہائے مختفی سے قبل کا فتحہ بھی کھینچا گیا ہے۔ اب جناب کو جو کچھ اعتراض ہو براہ راست نسیم کی روح پر کیجئے اور عالم برزخ میں جا کر کیجئے۔

یہ سب اعتراضات غلط تھے۔ اصغر صاحب ان میں حق بجانب ہیں۔

مثال دہم | (۱۰) وہ نقش وفا عمل میں پائی۔

اصغر صاحب۔ نقش تعویذ کو بھی کہتے ہیں۔ اس لئے نقش اور عمل میں مراعات نظیر ہے (ملخصاً)

معترض صاحب۔ جس طرح نقش اور عمل میں تناسب ہے اُسی طرح تعویذ اور عمل میں بھی تناسب ہے پھر اسکے کیا معنے کہ نقش تعویذ کو بھی کہتے ہیں اس لئے دونوں میں مراعات نظیر ہے۔ اور اس شعر میں مراعات نظیر ہے بھی نہیں مشاکلہ ہے۔ (ملخصاً)

سراج۔ ہم اس مثال کو بھی مثال اوّل میں لکھدیتے مگر یہاں ایک امر کی توضیح مقصود تھی اس لئے اسکا الگ درج کرنا مناسب تھا۔ معترض صاحب کا اعتراض میری سمجھ میں تو آیا نہیں معلوم نہیں کیا کہنا چاہتے ہیں لیکن اصغر صاحب کا مطلب یہ ہے کہ نقش کے دو معنی ہیں ایک بمعنی شکل حروف، گل بوٹا، نقش ونگار یعنی قلم کی آڑی ترچھی لکیریں، جیسے غالب کے اس مصرع میں ہے۔

"نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا"

دوسرے بمعنی تعویذ۔ چونکہ یہاں دوسرے معنے مراد ہیں اور اس میں اور عمل میں تناسب ہے اس لئے مراعات نظیر ہے۔ معترض صاحب غالباً نقش کے دو معنے نہیں جانتے اس لئے انکی سمجھ میں اسکے معنے نہ آئے کہ "نقش تعویذ کو بھی کہتے ہیں"۔ یقیناً اس میں مراعات ہے۔ مشاکلہ اس لئے نہیں ہے کہ مشاکلہ میں ایک ہی لفظ دوبار بیان کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اسی وجہ سے کہ اس میں لفظ کا بھی گونہ اعتبار ہوتا ہے اسکو صنائع لفظی میں داخل کیا ہے۔ اور اگر عمل میں پانسے اپنے کام میں آنا مراد ہو تو اس میں ایہام تناسب بھی ہے جو مراعات ہی کی قسم ہے۔ بہرحال اسمیں بھی اصغر صاحب حق بجانب ہیں۔

یہ تھے گیارہ مشترک اعتراضات رسالہ "ادب" و "مبصر" کے جن میں سوا دو کے باقی سب اعتراضات پیچ ہیں۔ ناظرین خود ہی معترض صاحب کی لیاقت علم بدیع اور واقفیت فن عروض اور ذہینت کا فیصلہ اسکے بعد کر لینگے۔

رسالہ "مبصر" میں ایک شعر کے نوٹ پر اعتراض اور بھی ہے۔ ؎

"وہ راگ کا دیکھنے لگا رنگ یاں پردے میں چھیڑ تھی خوش آہنگ"

اصغر صاحب۔ اس میں مراعات ہے۔

معترض صاحب۔ نہیں ایہام تناسب ہے۔

سراج ۔ راگ، پردہ، چھیڑ، آہنگ، میں یقیناً مراعات ہے تفصیل ہم اوپر لکھ آئے ہیں لیکن پردہ سے آڑ مراد ہونا، اور چھیڑ سے مذاق مراد ہونے میں ایہام تناسب بھی ہے۔

اسکے بعد مقدمہ کے اشعار امانت و نسیم پر اعتراض ہے۔ کہ اصغر صاحب نے ان میں مراعات بتائی ہے لیکن ایک میں بھی مراعات نظیر نہیں۔

ہم ذیل میں "مبصر" و "ادب" دونوں کے تمام اشعار یکجا نقل کر کے بتاتے ہیں کہ کتنے اشعار میں مراعات نظیر ہے۔

از "ادب"

(۱) دل پھنسانے کو لکھا اُنے ہما جال پہ خط جعل سازی کی طرف پھر مرا صیاد آیا

(صیاد، جال، پھنسانا، میں مراعات ہے۔ گو اس شعر میں دیگر صنائع بھی ہیں)

(۲) تری جالی کی کرتی کے تصور میں یہ حال ہوں مبصر دیکھ کر آنکھوں کو کہتے ہیں کہ جالا ہے

(مبصر، آنکھ، جالا، میں یقیناً مراعات ہے)

(۳) میری تربت پر لگایا نیم کا اُسنے درخت بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی
(۴) قصہ کہنے میں نظر جب آ گیا وہ شاخ گل گھانس کاٹی عارض رنگیں کا سبزہ دیکھ کر

گل، گھانس، سبزہ، میں مراعات ہے۔

(۵) یہ کسکی زلف کی ناگن نے اے دل ڈالا ہے کہ کوسوں تک مری تربت پہ پھیلا کوڑیالا ہے
(۶) تو وہ ہی صید فگن دشت میں رکھے جو قدم آنکھیں آ آ کے ملیں بھیڑیے گرگابی پر

صید، دشت، بھیڑیے میں اور قدم اور گرگابی میں مراعات ہے۔

(۷) ترے گانے سے یہ حالت اے صنم ہو جائیگی عاشق ناساز کو ہر تال سم ہو جائیگی

گانا، ساز، تال، سم، میں مراعات ہے۔

از "مبصر"

(۸) کہا ہے ان دنوں میری طرح ہر گلعذار عطر اسکی کفش کے گل کا اب اے عطار کھینچ

گل، عطر، عطار، میں مراعات ہے۔

(۹) داغا تو چلے تفنگ سے وہ چھوٹے قید فرنگ سے وہ

داغا، تفنگ، چھوٹے، چلے، میں مراعات ہے۔

(۱۰) واں دھن کہ صنم سے کہتا خدا ہوں یاں دھیان کہ بت کا پارسا ہوں

بُت، دھیان، پارسا، خدا، میں مراعات ہے۔

(۱۱) ان مختصروں نے جب یا طول بولی وہ بکاؤلی کہ معقول
(۱۲) پانی کے جو بلبلوں میں تھا گل پہونچا لب حوض سے نہ چنگل

حوض، بلبلا، پانی، میں۔ اور اگر مانیے تو گل اور بلبلوں میں مراعات ہے۔

(۱۳) پریوں نے ہوا سے تخت اُتارا ثابت ہوا ٹوٹتا ستارا

پری، ہوا، تخت، میں اور ثابت، ستارا، ٹوٹتا ہوا میں مراعات ہے۔

(۱۴) سختی سہی یا کڑی اُٹھائی افتاد تھی جو پڑی اُٹھائی
(۱۵) اس چاہ میں کام ہو نہ جائے یہ ماہ تمام ہو نہ جائے

ماہ، اور تمام، میں مراعات ہے۔

(۱۶) وہ طفل بھی گر پڑا زمیں پر مانند سرشک چشم مادر

طفل اور مادر میں، اور چشم و سرشک میں مراعات ہے۔

(۱۷) حاجت کے گماں سے جب ہوئی دیر جھنجھلا کے پلنگ سے اُٹھا شیر

(۱۸) سودا ہے مری بکاؤلی کو ہے چاہ بشر کی باؤلی کو

سودا، باؤلی، میں مراعات ہے۔

(۱۹) مجنوں ہو اگر تو فصد لیجے سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجے

مجنوں اور فصد میں مراعات ہے۔

اب ناظرین خود ہی انصاف کرلیں کہ اصغر صاحب نے (جو نہ قواعد پر زور دینا چاہتے تھے، نہ وہ خود کسی قواعد کے مؤلف ہیں اور نہ قواعد دانی کو مذاق ادب کے لئے مفید سمجھتے ہیں) ان ۱۹ اشعار کے نوٹ میں جو کچھ اشارات سرسری علم بدیع کی طرف کئے تھے وہ ۱۴ مثالوں میں بالکل ٹھیک ہیں۔ اور معترض صاحب جو قواعد داں بھی ہیں، لکھتے ہیں کہ ایک میں بھی مراعات نظیر نہیں ہے۔ صرف ۵ مثالوں میں اگرچہ مراعات نظیر نہیں ہے، پھر بھی اس سے تو غالباً کسی کو انکار نہ ہوگا کہ تلازمہ اور لفظی رعایت سے تو کوئی شعر خالی نہیں۔ پھر کیا ہم اسکے بعد یہ نہیں کہہ سکتے کہ اصغر صاحب علم بدیع سے واقف ہیں اور کم سے کم معترض سے زیادہ واقف ہیں۔ گو اس پر زیادہ زور دینا پسند نہیں کرتے۔ اور کیا اسکے بعد اسکے حاسدین ان پر ناواقفیت فن کا الزام لگائیں گے۔

آخر میں انصاف سے کہنا پڑیگا کہ قواعد و عروض یقیناً بقول اکبر "مغز سر کا آماس ہیں، گورکھ دھندے ہیں، اور ذوق ادب کے راستہ کے راہزن ہیں۔" اور پھر اُس شخص کے لئے کہ

اِس سے بھی کچھ بلند ملی ہو نظر جسے

تو یہ چیزیں بالکل باعث ننگ ہیں۔ ؎

راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید آنچہ در گفتار فخر تست آں ننگ منست

ڈھارس

(سید مقبول حسین صاحب احمد پوری، بی، اے)

میں موجود ہوں میں نے سنا تم مجھ کو ایسے وقت پکارتے تھے جب رنج و غم کے بادل تمہارے امن و سکون والے دل پر چھا گئے تھے۔ تم نے "تکمیل آرزو" میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی مگر ناکامی نے آس توڑ دی۔ لو میں پھر موجود ہوں۔

کوشش کی خوب کیا لیکن تمہاری آرزو محض خواب تھی جسکی تعبیر الٹی ہوئی۔ لو اب مجھکو اپنی امیدوں اور تمناؤں سے وابستہ کر دو۔ تم بھولے جاتے تھے میں نے رہنمائی کی، تم ڈوبے جاتے تھے میں نے سنبھالا۔ تم مایوس ہو گئے تھے میں نے تمہارے دل کو پھر کاشانۂ امید بنا دیا۔

تمہاری خوں گشتہ آرزوؤں میں بھی میں ہی پوشیدہ تھی، مگر تم نے میرے وجود پنہاں کو اپنے بیچپن خیالات سے معدوم کر رکھا تھا جن طریقوں سے تم حصول مقصد کے خواہاں تھے انکی نمود خواب سے زیادہ نہ تھی۔ نہ ان میں کوئی جان تھی نہ تم ان پر سرگرمی سے کاربند تھے۔ تم خواہ مخواہ "تکمیل جستجو" میں مشغول تھے، تم بیکار ان سے بھڑے ہوئے تھے یہاں تک کہ میں نے ان طریقوں کو خود تمہارے ہاتھ سے توڑ مروڑ کر نیست و نابود کر دیا گو انکے ساتھ تم بھی کسیقدر شکستہ خاطر ہو گئے تھے اور ہاتھ ملتے تھے کہ افسوس ناکام ہے۔ مگر بمصداق

"کفِ افسوس ملنا عہد تجدید تمنا ہے"

میں نے عروس امید کی طرح مسکرا مسکرا کر روٹھی ہوئی تمناؤں کو پھر منا لیا اور تم خود کہنے لگے ؎

"ایّھا النّفس اجملی جزعا فان ما تحذرین قد وقع"

یہ ظاہر ہے کہ جتنی ہی سخت درد کی تکلیف ہوتی ہے اتنی ہی مشغولیت دوا کی تیاری میں بھی بڑھ جاتی ہے، اور جتنی ہی زیادہ مایوس کن ناامیدی ہوتی ہے اتنی ہی زبردست اور مضبوط آرزو اسکی شکست کا ذریعہ ہے۔ تو پھر اس نئی آرزو کی تکمیل ہی اصل کامیابی ہے کیونکہ حقیقی کامیابی تو وہی ہے جو ناکامیوں کے بعد حاصل ہو۔

تم خود کہو۔ اب میری موجودگی میں تمہاری کیا حالت ہے؟ کیا تمہارے قلب کو اطمینان نہیں؟ غور کرو تمہارے دل کی کیا کیفیت ہے؟ کیا تمہارے دل کو سکون نہیں؟ میں نے تمہارا دل امیدوں سے بھر دیا تم پھر کوششوں میں مشغول ہو گئے اور اب تم اپنی منزل مقصود کے قریب بھی آ گئے ہو مگر یہ بھی یاد رکھنا کہ ؎

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا تم کو
وگرنہ تم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے

غریب کی آہ

(صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ)

لڑکی۔ تم کون ہو، کیوں آئے ہو، اور یہ فوج کس کی ہے۔ کہاں جا رہی ہے۔

سپاہی۔ میں ایک سپاہی ہوں۔ فوج روس کی ہے۔ طہران کو جا رہی ہے۔ مجھے پیاس معلوم ہوئی جو ادھر آ گیا۔ تھوڑا ٹھنڈا پانی دے دو۔

لڑکی۔ سچ سچ کہو۔ طہران میں فوج کس لئے جا رہی ہے۔ برائے خدا مجھ سے سب کیفیت کہہ دو۔ میرے عزیز وہاں ہیں اس لئے میں پریشان ہوں۔

سپاہی۔ ہمارے شہنشاہ روس کا حکم ہے کہ ہم طہران کے بڑے بڑے مولویوں، مجتہدوں اور درویشوں کو قتل کر ڈالیں اور تمہارے امام رضا علیہ السلام کے روضہ پر گولے برسائیں اور امام کا تمام خزانہ لوٹ کر لے جائیں۔

لڑکی (کانپ کر۔ تھرا کر۔ روتی ہوئی آواز میں دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے) یا خدا تو نے ہمارے وطن کو برباد تو کر دیا، اب صرف نیم جاں ہے۔ کچھ دم باقی ہے۔ کیا اسکو بھی یہ لوگ برباد کر دینگے۔ ہائے ایران تو کیا تھا اور اب کیا ہو گیا۔ ایک دن وہ تھا کہ ایران کے شہنشاہ نادر نے ہندوستان کو ہلا دیا تھا۔ ایک دن وہ تھا کہ ہندوستان کے بادشاہ ہمایوں کو ایران کے بادشاہ طہماسپ نے اپنے یہاں پناہ دی تھی۔ اور اسی ایرانی بادشاہ کی مدد سے ہمایوں ہندوستان کا پھر حکمراں ہو گیا تھا۔ کیا وہ ہندوستان آج ہماری مدد نہیں کریگا۔ ہائے ایران تو کیا تھا کیا ہو گیا۔ اچھا اگر مجھ میں کچھ قوت ہے تو میں اپنے ملک کو بچا لونگی، ضرور بچا لونگی۔ یا اللہ کیا تو میری مدد نہیں کریگا۔

سپاہی۔ اے نادان لڑکی تو کس طرح بچا سکتی ہے۔ اگر تمام ایران کے باشندے بھی فوجی سپاہی بن جائیں تو بھی روس کی فوج کی برابری نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس اتنی فوج ہے کہ دنیا میں کوئی سلطنت اسکی برابری نہیں کر سکتی۔ تو یہ بتا کہ تو کس طرح اپنے ملک کو بچائیگی۔ تیرے پاس

کون سا حربہ ہے؟ کون سے آلات جنگ ہیں؟ تو ایک غریب فقیر کی لڑکی ہے۔ تیرے پاس ایک وقت کے کھانے کو تو ہے نہیں۔ تو جھونپڑے میں رہتی ہے اور خواب دیکھتی ہے محلوں کا۔ اچھا سچ بتا، تو ایران کو کیونکر بچائیگی۔

لڑکی۔ میری دعا سے میرا ملک بچیگا۔ اور میری آہ سے تیری سلطنت تباہ و برباد ہو جائیگی۔ چند روز جو ظلم کرنا چاہتے ہو کر لو، پھر موقع نہ ملیگا۔ انشاء اللہ تمہارا دشمن ایسا زبردست پیدا ہو جائیگا کہ جو تمہارے بادشاہ مع اُسکے خاندان کے مثل ایک مچھر کے مسل ڈالیگا۔ دیکھنا مجھ غریب کی آہ کیا کرتی ہے۔

سپاہی۔ (ایک قہقہہ لگاکر) واہ رے تیری آہ! اچھا ہم دیکھینگے، تیری آہ کا کیا اثر ہوتا ہے۔ لڑکی کیوں دیوانی ہوئی ہے۔ روتی کیوں ہے۔ جا میرے لئے پانی تو لا دے میں پیاسا ہوں۔

لڑکی۔ آنسو پونچھتی ہوئی گئی۔ ایک ہاتھ میں پانی دوسرے ہاتھ میں چھاج (اسکو فارسی میں دوغ کہتے ہیں) لاکر دیا اور کہا "لے اسے پی کر ہمارے گلے پر خنجر چلا، ہمارے ملک پر حملہ کر، مگر یاد رکھ کہ تجھ سے ایک دن تیرا دشمن اسکا بدلہ لیگا اور تیری سلطنت برباد ہو جائیگی اور ہمارا جھنڈا کھڑا رہیگا اور تم لوگ ہم سے پناہ مانگوگے۔

دو شخص اندر داخل ہوئے۔ اُنھوں نے تعجب سے غیر مرد کو اندر دیکھ کر اپنی لڑکی سے دریافت کیا۔ یہ کون شخص ہے جو مکان کے اندر چلا آیا ہے۔

لڑکی (اپنے باپ سے) بابا میں اسکو نہیں جانتی، پانی مانگنے آیا ہے اور کہتا ہے طہران کو جا رہا ہوں۔ فوج آگے چلی گئی ہے۔ یہ پیاسا تھا اس لئے ادھر آگیا۔

قلی خاں (لڑکی کا باپ) سپاہی سے کہا، نکل باہر جا، تو تو ہمارا دشمن ہے۔ ہمارے مکان کے اندر کیوں آیا۔ طہران میں روس کی جو فوج جا رہی ہے اسکی کم کیا ہے۔ یہ فوج کشی کیوں ہو رہی ہے۔ مجھے اس کا سبب بتا کر جانا ہوگا۔

سپاہی۔ جنگ اس لئے چھڑی ہے کہ ایران نے چند معزز آدمیوں کو امریکہ سے بلایا ہے اور بڑے بڑے عہدے انکو دیے ہیں تاکہ ایران کی ترقی ہو، فوج وغیرہ درست ہو۔ اور بھی بہت سی باتوں میں ترمیم کی گئی ہے ہمارے شہنشاہ کا حکم تھا کہ امریکن آدمیوں کو ایران سے

نکال دو۔ مگر ایرانی حکومت نے نہیں مانا۔ ایران کی عورتوں نے بھی جنگ کے لئے کمر کسی ہے۔
بس یہی قصور ہے۔ لو میں اب جاتا ہوں۔ دیر ہو رہی ہے۔ ہماری فوج آگے گئی ہے۔

قلی خاں ۔ تمہارا نام کیا ہے۔

سپاہی ۔ میرا نام "لیٹوناف"۔ اس لڑکی کے پانی پلانے کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

لڑکی ۔ بابا جان، میں اب میدان جنگ میں جاتی ہوں جو خدمت مجھ سے ہوسکیگی میں ادا کرونگی۔
اور اپنے ملک کے لئے جان دے دونگی۔ اب ایک منٹ بھی میں نہیں ٹھہر سکتی۔

قلی خاں ۔ بیشک جا، ضرور جا، میں بھی چلتا ہوں۔ اپنی ماں اور بہنوں کو بلا، ان لوگوں کو
ہمراہ لے، اپنے محلہ میں جا، لوگوں کو ترغیب دے، تقریر کر، ان لوگوں کو ہموار کر، تاکہ ہماری
ایک فوج ہو جائے اور ہم اپنے ملک کی خدمت کرسکیں۔

لڑکی فوراً گئی، تمام دیہات میں کھلبلی پڑ گئی۔ ہر شخص لڑنے اور مرنے پر مستعد ہوگیا۔
اور اس طرح چار ہزار کا ایک پورا قافلہ تیار ہوگیا۔ مرد، عورت، جوان، بڈھے، سب ہی
شریک ہوگئے۔ کسی نے تلوار لی، کسی نے بندوق، کسی نے برچھا۔ غرض جسکے پاس جو تھا
ہاتھ میں لیکر چل کھڑے ہوئے۔ طہران میں جاکر فوج میں شریک ہوگئے۔ خوب دل کھول کر لڑے
مگر روس کے مقابلہ میں جیت نہ سکے۔ آخر ایران نے شکست کھائی۔ بڑے بڑے وطن کے شیدائی
شہید کئے گئے۔ اور خوب خوب اُن کے خون سے ندی نالے بہے۔ جو لوگ میدان سے بچ گئے
وہ اپنے اپنے گھر واپس آئے۔ قسمت سے یہ لڑکی زندہ رہی اور اسکے باپ بھائی بھی بچ گئے۔ وہ بھائی
اور چند عزیز مارے گئے۔ یہ لوگ جب واپس اپنے گاؤں میں آئے تو دیکھا پورے گاؤں کو روسی
فوج نے برباد کردیا ہے۔ مکانات لوٹ لئے ہیں۔ یہ لڑکی اور اُسکے عزیز پریشان ہوئے۔ اُسی جنگل میں
ایک کنواں کھودنا شروع کیا۔ اتفاق سے اسی جگہ ایک دفینہ نکل آیا۔ بہت سی اشرفیاں وغیرہ
نکلیں، اب کیا تھا، جلد سے جلد مکان تیار ہوگیا۔ یہ سب آرام سے رہنے لگے لیکن لڑکی کی آزردگی
کسی طرح کم نہ ہوتی تھی۔ چند سال بعد اسکی شادی ایک امیر سے ہوگئی، دو بچے بھی ہوئے لیکن اپنے
ملک کا خیال اور اسکی ترقی کی دعا ہر وقت اُسکی زبان پر رہتی۔

ایک روز یہ لڑکی اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ باغ میں ٹہل رہی تھی کہ ایک شخص گھوڑے پہ

سوار پریشاں حال روتا ہوا اسکے قریب آیا اور بے اختیار ان دونوں کے پاؤں پر گر پڑا "مجھے پناہ دو"۔ مجھے بچالو، میں مصیبت میں ہوں۔

لڑکی۔ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو۔ متوحش کیوں ہو۔ پریشان ہونے کا سبب۔ کیا کسی کو مار ڈالا ہے؟

نو وارد۔ میں روس کا ایک افسر ہوں۔ شہنشاہ روس کے عزیزوں میں ہوں۔ کل روس کے شہنشاہ مع اسکے عزیزوں کے قتل کئے جانے کا حکم ہے چونکہ میں بھی اسکے عزیزوں میں ہوں اس لیے میرے قتل کا بھی حکم ہوا ہے۔ اس لئے بھاگ کر نکل آیا ہوں۔ میرے لڑکے وغیرہ سب جنگ میں مارے گئے۔ صرف میں ایک کمبخت بچ گیا ہوں۔

لڑکی۔ تمہارا نام کیا ہے۔ تمہاری صورت میں نے کہیں دیکھی ہے کیا تم کبھی اس دیہات میں آئے تھے۔

سپاہی۔ میرا نام لیٹوناف ہے۔ چھ برس کا زمانہ ہوا میں اس زمین پر آیا تھا اور روس کی فوج کے ہمراہ تھا۔ یہاں ایک غریب کا مکان تھا پانی پینے گیا تھا جس لڑکی نے مجھے پانی دیا تھا اس نے مجھ سے کہا تھا "میری آہ تیرے ملک کو برباد کردیگی اور میری دعا سے ایران بچ جائیگا"۔ وہ سچ ہوا خدا جانے وہ لڑکی اب کہاں ہے۔ مجھے اس وقت پناہ دو۔

لڑکی۔ جس لڑکی کا ذکر کر رہے ہو وہ میں ہی ہوں۔ یہ میرا گھر ہے۔ یہ میرے شوہر ہیں اور یہ دونوں بچے میرے ہیں۔ میرے باپ بھی زندہ ہیں۔ تھوڑی دیر میں آئینگے۔ ان کو بھی دیکھ لینا۔ دیکھا خدا کا غضب انسان کے ہاتھوں سے کس طرح نازل ہوتا ہے۔ دیکھا ہم غریبوں کی آہ نے آخر اثر کیا۔ اسکا کبھی خیال بھی نہ ہونا چاہیے کہ بڑی سلطنت کو چھوٹی سلطنت دبا سکیگی۔ تم لوگ خدا کو بھول گئے تھے۔ ناانصافی پر کمر باندھ کر کھڑے ہوئے تھے۔ جہاں تک تم سے ہو سکا تم نے غربا کو اپنی زبردستیوں سے دبایا اور تکلیف دی ہمارے مذہب کے پیشواؤں کو بیگناہ بے قصور قتل کیا۔ شکر ہے خدا کا کہ آج تم مجھ سے پناہ مانگ رہے ہو۔ میں مسلمان ہوں تم عیسائی لیکن میں تم کو پناہ ضرور دونگی۔ تم جانتے ہو میں سید نعمت اللہ ظہیر الدین جو بہت بڑے درویش تھے انکے خاندان سے ہوں۔ جو میری زبان سے نکلتا ہے وہ خدا پورا کرتا ہے۔ جا فلاں کمرے میں ٹھہر۔ پناہ مل جائیگی۔

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از در حق بہر استقبال می آید

نقد و تبصرہ

تاریخ نثر اُردو
حصۂ اوّل

اُردو نظم کی تاریخ کی کتابیں پہلے بھی لکھی جا چکی ہیں اور اب بھی کچھ نہ کچھ صاحبانِ قلم اس طرف متوجہ رہتے ہیں۔ اس لئے ہمارے پاس اس ذخیرہ کی چنداں کمی نہیں ہے۔ البتہ نثر اُردو کی تاریخ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی۔ ہاں اس سے کچھ پہلے محمد یحییٰ صاحب تنہاؔ نے سیر المصنفین لکھکر اس کمی کو پورا کرنا چاہا تھا۔ اور ابھی حال میں اُردو کے مشہور خدمتگزار جناب احسن صاحب مارہروی نے تاریخ نثر اُردو تالیف فرمائی ہے جسکا پہلا حصہ ہمارے پیش نظر ہے۔ کتاب کی تقطیع اوسط درجہ کی ہے اور ۶۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

مفصّل فہرست کے بعد جس سے کتاب کے مضامین پر اجمالی اطلاع ہو جاتی ہے۔ لائق مؤلف نے ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں مصنف نے اُردو زبان کے متعلق یہ تاریخی واقعات بتلائے ہیں کہ "اُردو زبان کا بیج کس سرزمین پر بویا گیا اور کس وقت اُس میں کونپلیں پھوٹیں، کس کے سینچنے سے شاخ در شاخ ہوتا ہوا کونپل سے پودا، اور پودے سے ایک تناور درخت بن کر چاروں طرف پھیل گیا"۔

فاضل مولف نے اس مقدمہ میں یہ بحث بھی چھیڑی ہے کہ "اُردو کی ابتدا نظم سے ہوئی یا نثر سے" اس سلسلہ میں لائق مؤلف نے "آبِ حیات" کے یگانۂ دہر مصنف جناب آزادؔ مرحوم کی یہ تحقیق کہ "۱۲۱۳ھ سے پہلے نثر اُردو کی کوئی کتاب نہیں ملتی" مشکوک بتلائی ہے۔ جناب احسن کو آبِ حیات کے اس فقرہ سے "کہ یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کہے پھر بات کرنا سیکھے" اور زیادہ اُلجھن پیدا ہوئی ہے۔ جناب احسن ہمیں معاف فرمائیں گے۔ اس مقام پر اُنکا انداز بحث مولویانہ سا ہو گیا ہے۔ آپکے یہ سوالات کہ سب سے پہلے کوئی زبان مقفیٰ اور موزوں بن کر کس طرح بولی جا سکتی ہے اور کیا نو وارد مغلوں اور ایرانیوں نے سودا سلف کے لین دین میں جب ہندیوں سے بات چیت کی ہوگی، تو کوئی برجستہ مصرعہ پڑھا ہوگا" ہمیں غیر متعلق معلوم ہوتے ہیں۔

مولانا آزاد کا منشا صریحی طور سے یہ ہے کہ اُردو زبان میں باقاعدگی کے ساتھ نظم کا نثر سے پہلے لکھنا شروع ہو گیا تھا۔ انکا یہ مقصد نہیں ہے کہ اُردو الفاظ بھی موجود نہیں تھے۔ خود ان کا

اُردو کو بچہ سے تعبیر کرنا ہی اس مقصد پر دلالت کرتا ہے۔

لائق مؤلف نے مقدمہ کے بعد اصل کتاب شروع کی ہے جس میں ابتدائے ترویج اُردو سے عہد حاضر تک جس قدر انداز بیان اُردو زبان نے پیدا کئے ہیں اُن سب کے نمونے اصل کتابوں سے اقتباس کرکے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ اِس سلسلہ میں مذہب، تراجم، فلسفہ، تاریخ، تفسیر، قانون، تقاریظ، ریویو، مراسلات اخبار، تجاویز عدالت، پروانجات، فنون لطیفہ اور پھر ہر سوسائٹی اور طبقہ کی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ اور یہ سب نمونے جُدا جُدا عنوانوں میں دکھائے گئے ہیں۔ اور ہر نمونہ کے ساتھ اُس عہد کے مستعملہ الفاظ کا حوالہ دیتے ہوئے آخر میں بطور تبصرہ وکیفیت قابل ترک اور لائق اختیار انداز بیان اور رفتار زبان کو حواشی کے تحت میں دکھایا گیا ہے۔ لائق مؤلف نے اُن تبصروں میں نہایت اعتدال اور متانت سے رائے زنی کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ تر قابل قبول ہے۔

اُردو داں طبقہ کو جناب احسن کا ممنون ہونا چاہئے کہ اُنھوں نے اس قدر کاہش اور کاوش سے اتنی مفید تالیف ملک کے سامنے پیش کی ہے۔ خدا جانے اس خرمن کے جمع کرنے میں کس کس زمین سے اور کن کن دشواریوں سے دانے چنے گئے ہونگے۔ کتاب کی جامعیت کے متعلق ہم اپنی تفصیلی رائے اسکے دوسرے حصہ کی اشاعت تک محفوظ رکھتے ہیں لیکن ہمارا یقین ہے کہ یہ تالیف نہایت مفید ہے اور اُردو کے قدر دانوں کو اسے نہایت ذوق و شوق سے خریدنا چاہیے۔ کتابت و طباعت اچھی ہے املا کی غلطیاں کہیں کہیں ہیں۔ قیمت فی جلد چار روپیہ۔ علاوہ محصول ڈاک ہے۔

کتاب جناب احسن صاحب مارہروی اُردو لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے مل سکتی ہے۔

تابشِ خیال

جناب افسر مرہوی نے حال میں تابش خیال کے نام سے اپنے کلام کا مجموعہ شائع کیا ہے رسمی انتساب کے بعد خود آپ کے قلم کا لکھا ہوا دیباچہ ہے۔ اور پھر جناب اسرار احمد صاحب کریوی الہ آبادی کا تحریر کردہ مقدمہ ہے جسمیں سطحی عنوان سے جناب افسر کے کلام کی خوبیاں سے قارئین کو متاثر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ خود جناب افسر نے دو صفحہ کے نثری دیباچہ میں بعض ایسی ادبی غلطیوں کا ارتکاب فرمایا ہے جنکی ہمیں ایک پڑھے لکھے شاعر سے توقع نہیں ہوسکتی تھی۔ "لغزش کی جمع لغزشات"

بالکل غلط ہے۔ افسر صاحب کو اس سے احتراز کرنا چاہیئے تھا۔ اسرار احمد صاحب کے مقدمہ میں بھی بعض ادبی مسامحے ملتے ہیں۔ آپنے ایک جگہ "قدح پیمائی" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن لطف یہ ہے کہ اس مقام پر قدح سے ساغر شراب مقصود نہیں ہے بلکہ رد و قدح مقصود ہے۔ دوسری جگہ نفس شعر کو معرفت شناس بنا دیا ہے اور "بے کیت" کی جگہ "غیر کیت" استعمال کیا ہے۔ یہ تمام باتیں اردو محاورات سے بے خبری کی نشانیاں ہیں۔

افسر صاحب کی غزلوں کا مجموعہ صفحہ ۴۱ سے شروع ہوتا ہے غزلوں کی ترتیب سنوں کی ترتیب کے لحاظ سے رکھی گئی ہے۔ کلام مجموعی طور سے صاف و رواں ہے۔ البتہ تخئیل کی بلند پروازی اور ندرت خیال کے آثار بہت کم نظر آتے ہیں۔ انکی غزل گوئی میں ایسی امتیازی خصوصیتیں نہیں ہیں جو انھیں شاعروں کی بھری مجلس میں کسی ممتاز نشست کا مستحق بنا سکیں۔ انھوں نے تغزل کے پرانے جادہ ہی پر چلنا اپنی غزل گوئی کا مسلک قرار دے لیا ہے۔ کچھ چیدہ شعر درج ذیل ہیں۔

جوانی نے بھرا ہے اب نیا روپ — ترے چہرہ کا یہ نقشا کہاں تھا!
فرخندہ نصیبی ہے کہ تم پوچھنے آئے — میں ہجر میں جیتا رہا احسان خدا کا
دل پاش پاش ہوتا ہے ہر درد مند کا — ٹکڑے کچھ ایسے بھی ہیں ہمارے فسانے میں
کسکے وہاں بیجائیگی معلوم نہیں — موت نے کیوں نئی پوشاک یہ لوائی ہے
بس اسی کا نام ہے نظم جہاں — ایک اجڑے دوسرا آباد ہو

امید ہے کہ اردو شاعری کے قدر دان اس مجموعہ کو شوق سے خریدینگے۔ کتابت طباعت بری نہیں ہے۔ املا کی غلطیاں بہت کم ہیں۔ البتہ صفحہ ۴۴ ایس ع فلک کو دیکھکر میں قید میں چیخ نہ رہجاؤں" کا دوسرا مصرعہ لکھنے سے رہ گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ) ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ کراچی۔ رام سوامی۔ جناب افسر صدیقی امروہوی

شیر پنجاب

ہمارے محترم جناب سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی ان ادبی افراد میں سے ہیں جنھیں فطرت کی ستم ظریفی نے پیشہ وکالت کی الجھنوں میں مبتلا کر رکھا ہے لیکن چونکہ آپ کو ادبیات اور تاریخ سے خاص لگاؤ ہے اور آپ میں پہلے ہی سے یہ علمی و ادبی ذوق پورے طور سے پختہ ہو چکا ہے اس لئے جب کبھی آپ کو اپنے پیشہ کی مصروفیتوں سے کچھ وقت مل جاتا ہے تو ادبی و علمی مضامین

لکھ ڈالتے ہیں۔ حال ہی میں آپ کے قلم سے "شیر پنجاب" نامی رسالہ نکلا ہے جسمیں مہاراجہ رنجیت سنگھ بانی سلطنت سکھ کی زندگی اور عہد کے حالات محققانہ طور سے سلیس اردو میں لکھے گئے ہیں۔ ہندوستان کے نامور اشخاص کے سوانحی حالات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس رسالہ کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔

رسالہ چھوٹی تقطیع کے ۵۵ صفحات پر ختم ہوا ہے۔ کتابت و طباعت بری نہیں ہے کہیں کہیں املا کی غلطیاں ضرور ملتی ہیں مثلاً صفحہ ۶ پر فارسی کی اس مثل میں "چاہ کن را چاہ درپیش" چاہ کن کی جگہ چاہ کندہ بن گیا ہے۔ رسالہ کی قیمت کہیں درج نہیں ہے۔

کتاب "حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ" دہلی سے مل سکتی ہے (ذاتف دہلوی)

فدائے شوہر نمبر ۲

اسکے قبل جو حصہ اس دلکش نظم کا "ادب" میں شائع کیا گیا تھا بہت پسند کیا گیا۔ جناب مصنف نے ہمیں دوسرا حصہ بھی اشاعت کے لئے ارسال فرمایا ہے جو شکریہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔
پوری نظم باتصویر زیر طبع ہے جناب مصنف سید کاظم صاحب نشتر سے مٹیا برج کلکتہ کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

شوہر کا جواب

اے چراغِ پارسائی شمعِ تنویرِ وفا — عورتوں کی قابلِ تقلید تصویرِ وفا
زندگی تو نے مصیبت ہی مصیبت میں گنوائی — اوڑھنے کو اک پھٹا کمبل بچھانے کو چٹائی
سیکڑوں دنیا کے دکھ جھیلے محبت کے لئے — چھوڑا ماں اور باپ کو بھی میری الفت کے لئے
یاد آتے ہیں مجھے تیری وفا کے واقعات — مایۂ صد ناز ہے نیک عورتوں میں تیری ذات
ساتھ تو میرے پھری میدان و کوہستان میں — بھوک میں اور دھوپ میں برسات میں طوفان میں
دشتِ غربت کا مجھے یاد آگیا اک ماجرا — تھی مرے ہمراہ تو پیدل سفر تھا دور کا
تھا جو کچھ سامان میرے پاس چوری ہو گیا — اک پھٹا کمبل فقط سارے اثاثہ میں بچا
شام کو آئی بلا آندھی چلی طوفاں اٹھا — ہر طرف کوہ و بیاباں میں اندھیرا چھا گیا
ہو گئے سب کھیت سوکھے ابرِ رحمت سے ہرے — چھا گئی کالی گھٹا برسات سے جل تھل بھرے
وہ کھلا میدان وہ سنسان جنگل سائیں سائیں — وہ جگو میں تھرتھری سی ڈالنے والی ہوائیں
اپنی حالت سے ہوئی بالکل فراموشی مجھے — آگئی تپ اور تپ سے چھائی بیہوشی مجھے
تن مرا کمبل سے ڈھانکا اور خود عریاں رہی — سخت جاڑوں کی ہوا میں رات بھر لرزاں رہی
صبح کی آمد ہوئی مشرق سے نکلا آفتاب — میں کئی ساعت رہا فرشِ زمیں پر محوِ خواب
اس بیاباں میں نہ سایہ کا کوئی سامان تھا — پیڑ کوسوں تک نہ تھے بالکل کھلا میدان تھا
سرو قد نے تیرے ڈالا سایہ مجھ پر دھوپ میں — فرق پر میرے رہی تو چتر بن کر دھوپ میں
دے رہی تھی اپنے گیسوئے عنبر کی ہوا — دشت میں پھیلی ہوئی تھی مشکِ اذفر کی ہوا
میں تو محوِ خواب تھا حالت سے اپنی بے خبر — تھا پسینہ پر پسینہ سے گلِ رخسار تر
ہو گئے گھنٹوں کھڑے رہنے سے تیرے پاؤں شل — یہ نہیں چاہا کہ میری نیند میں آئے خلل
زلفِ شبگوں کی سیہ چادر پڑی تھی دھوپ میں — میں ترے سایہ میں تھا اور تو کھڑی تھی دھوپ میں

(باقی دارد)

خالص اُردو

(حضرت آرزو لکھنوی)

سچ بھی بُرا وہ جسکو سُن کے لوگ کہیں تو جھوٹا ہے
جسکا لُٹایا سب نے پایا مجھ کو اُسی نے لوٹا ہے

پتا کیسا، بوٹا کیسا، جڑ تو ایک ہے دونوں کی
کہنے کو ہم بھی کہہ دیتے ہیں یہ پتا وہ بوٹا ہے

تارا ٹوٹتے دیکھا سب نے یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی
کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کسکا سہارا ٹوٹا ہے

گرنا ٹپ سے اچانک آنسو چونک کے اُنکا ہنس پڑنا
بوند ذرا سی تھی پانی کی جس سے بھانڈا پھوٹا ہے

ہم بھی اُسکی دہائی دینگے ایک دن ایسا آئے گا
اوڑھ کے کالی رات میں کملی جس نے ہمکو لوٹا ہے

جی کا اپنے بھید نہ جانو یہ چھالا ہے پتھر کا
جو نہ بٹھائے بیٹھا اب تک اور نہ پھوڑے پھوٹا ہے

سُن لو آرزو ایسوں کی بھی جنکے مُنہ پر آنکھ نہیں
جانچنے والے جانچ ہی لیں گے کیا سچا کیا جھوٹا ہے

غزل

(مائل صاحب لکھنوی)

آغاز ہی آغاز اچھا جس کا کہ ہو انجام بُرا
اس دُنیا کی تکلیف اچھی، اس دُنیا کا آرام بُرا

پہلے تو بنایا خوگرِ غم اب ظلم سے بھی محروم ہیں ہم
پھر چھیڑ کے کہتا ہے ظالم ہو لطف کشِ آلام بُرا

یوں دنیا کا ہر وقت اچھا، ہر وقت میں اک کیفیت ہے
ہم ہجر نصیبوں کو لیکن، ہے منظرِ صبح و شام بُرا

تقدیر بُرائی پر ہو جب مشکل سے بھلائی ہوتی ہے
اچھا بھی جو کرتا ہے انساں ہو جاتا ہے وہ کام بُرا

آزاد ہی [illegible] سکتا کیونکر قسمت میں اسیری لکھی تھی
تقدیر بُری تھی اصل یہ ہے، صیاد بُرا، نہ دام بُرا

بے سوچے سمجھے عشق کیا، ویسا ہی نتیجہ بھی نکلا
میں اپنے کو بُرا کس منہ سے کہوں میرا ہی دل ناکام بُرا

جو آج سنا کل دیکھیں گے، فطرت کا یہی دستور ہے جب
آغازِ محبت کا اچھا پھر کیوں نہ کہوں انجام بُرا

دیکھیں [illegible] دیتا ہوں تم سے تم [illegible] سے ہٹ جانا
[illegible] ہے صبح کا یہ ہنگام بُرا

[illegible]
[illegible] مائل [illegible] اچھا [illegible] نام بُرا

قوتِ برداشت

مقبول حسین صاحب مقبول احمد پوری بی اے۔

اے مسیحائے مصیبت اے جمالِ بے بسی ۔ مجھ سے ہے ایماں کو قوت تو ہے وضعِ بیکسی
جسم پر قابو ہے تیرا روح تجھ سے شاد ہے ۔ آتشِ غیظ و غضب پر حکمرانی ہے تری

اوّل اوّل زہر کا سا گھونٹ ہے ساغر ترا
بعد میں دیتا ہے لیکن جامِ کوثر کا مزا

ظلم کا دستِ تعدی جب کسی پر ہو دراز ۔ دل تری سرکار میں ہوتا ہے آ کر نالشی
تو مٹا دیتی ہے غصہ اور جوشِ انتقام ۔ تجھ سے دشمن کو خجالت بد زباں کو خامشی

تو ملامت اور لعنت کا نہیں کرتی خیال
اور ان باتوں سے بڑھتا ہے ترا حسن و جمال

تجھ سے قومیں متحد، تجھ سے تعصب کو حجاب ۔ تو گھرانوں میں محبت، انجمن میں دوستی
تو غریبوں کی مربی اور امیروں کی رفیق ۔ عیش میں خوفِ خدا ہے اور غریبی میں خوشی

علم والے تجھ سے خوش ہیں اور جاہل منفعل
تجھ سے راضی اہلِ ایماں اہلِ تقویٰ اہلِ دل

عشق کو تجھ سے ہے قوت، حسن کا زیور ہے تو ۔ ہے محبت تیری ہمدم صبر ہے طاقت تری
قوتِ برداشت تجھ سے ہر بشر ہے ملتجی ۔ دل میں الفت ہو کے رہ آنکھوں میں دل کی روشنی

سچ بتا تو کون ہے؟ - کیا شاہدِ غربت ہے تو ؟
لوگ سچ کہتے ہیں بیشک - جوہرِ الفت ہے تو

نعت

اقبال الدین احمد خاں صاحب فاضل ادب۔ تحصیل لاتور۔ (دکن)

تھیں عشق و محبت کی اللہ رے کیا باتیں ۔ معراج کے پردہ میں ہوتی تھیں ملاقاتیں
رحمت کی گھٹائیں تھیں غفران کے تھے بادل ۔ کیا وادیِ بطحا کی دلچسپ تھیں برساتیں
وہ نالۂ شیون تھا اور گریۂ پیہم تھا ۔ اے غارِ حرا تجھ کو سب یاد ہیں وہ باتیں
فردوس کی بخشش ہو انعام ہو جنت کا ۔ مجھ بندۂ عاصی کی ایسی ہوں مداراتیں
اقبال یہ کیا کھلتے اسرار حقیقت کے ۔ ہیں ساقیِ کوثر کی یہ ساری کراماتیں

اشکالِ ادبیہ

(۱۱)

(پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب، ایم اے)

مرزا طپش کی ایک مثنوی

رنگ بدلا طرفہ چرخِ نیلگوں — روز ہی وحشت نے کی وحشت فزوں
اور کی تمہید رقت کی بنا — اور دی وحشت ہمیں سرتا بپا
ان دنوں میں کیا کہوں اوقات کی — جب سے آئی ہے (یہ رت) برسات کی
اشک حسرت ہیں ٹپکتے زار زار — اضطرابِ دل کو ہے بے اختیار
ہر طرف تبدیل موسم نے کیا — کچھ کا کچھ عالم..... رت کا کیا
قطعہ قطعہ ہوگئے میدان سبز — ہے زمیں کا اب سر و سامان سبز
جھیل اور تالاب اور ڈبرے تمام — بھر گئے ہوں جس طرح لبریز جام
پر ہے اپنا اب تلک ساغر تہی — کیا کریں ساقی کی مرضی ہے یہی
تازہ و تر ہوگئے اجزائے خاک — فیضِ علوی نے کیا عالم کو پاک
ہوگیا جل تھل زمین و آسماں — ڈھونڈھایا سربسر رنگِ جہاں
آب جوئیں چار سو بہنے لگیں — جا بجا مرغابیاں رہنے لگیں
ہر طرف چشمہ ہے اور سیلاب ہے — سبزہ کو ہر جا کمر تک آب ہے
نتھری نتھری اسمیں پانی کی جھلک — رکھتی ہے آب گہر جیسی چمک
بھر گئے ہر سو کول وہ سر بسر — ہوگئے برپا مثال نیلوفر
جوش زن ہر گام پر ہوکے زمیں — پھٹ گئے ایک بار سوتے ہر کہیں
بلبلیں ہر سو اُبلتی ہیں پڑی — فرطِ شادی سے اُچھلتی ہیں پڑی
حلقہ حلقہ جتنے نخلستان ہیں۔ — تازہ و شاداب ہر ایک آن ہیں

بن گئے نخلِ زمرد سے تمام | لہلہاتے ہیں کھڑے ہر صبح و شام
بھر گیا جوبن سا کچھ ایک ایک پہ | جھومتے ہیں مثلِ میکش سر بسر
ڈالیوں میں گونجے ہے کوئل کی کوک | درد دل سے جیسے ایک اُٹھتی ہے ہوک
سبز ہے شاخِ بریدہ تک بھی اب | پھر رہے ہیں کھوٹلوں میں اپنے سب
ہو گئے یکسر ہرے جنگل کے روکھ | جو خزاں میں رہ گئے تھے سوکھ سوکھ
ہیں جہاں جھومر درختوں کے عیاں | مور اُن میں کر رہے ہیں مستیاں
ہر طرف بیٹھی ہے بگلوں کی قطار | سو طرح کے جانور کی ہے پکار
دیکھیے جس جا پرندے کے تئیں | بال و پر بھیگے ہوئے ہیں ہر کہیں
ہو گئے دشت و بیاباں لہلہے | کرتے ہیں بن کے پکھیرو چہچہے
جا بجا گلہائے صحرائی تمام | کھل رہے ہیں خود بخود ہر صبح و شام
ہے جو وہ بیساختہ مجموعہ بو | عطرِ مجموعہ کا بھی ایسا نہ ہو
گہری گہری بدلیاں خاکستری | آتی ہیں بے اختیار اُمڈی ہوئی
ہو رہا ہے یہ دھواں دھار آسماں | ابر کے غلظت سے با صد عز و شاں
منعکس ہے رنگ یہ اس قدر | سایہ سا ہے کچھ زمیں پر جلوہ گر
پر گھٹا چھائی ہوئی گھنگھور ہے | بادلوں کا اور مینہ کا شور ہے
کہیے اس عالم میں اب ہم کیا کریں | کس طرح ضبطِ دلِ شیدا کریں
بے طرح رہ رہ کے گھبراتا ہے جی | سخت بیتابانہ اُچھلاتا ہے جی
بے قراری ہے طبیعت کے تئیں | دمبدم قوت ہے وحشت کے تئیں
اس طرح شدت قلق کی ہے کہ بس | کب تڑپتا ہوگا یوں مرغِ قفس
دم اُلٹتا ہے نفس تنگی میں ہے | لاکھ صورت کی تباہی میں ہے
دل کی ہے ہر آن کچھ خواہش نئی | دم بدم کرتا ہے فرمائش نئی
کیا کہیں اور کس طرح سمجھائیں اسے | نا سمجھ ہے کچھ کہ بہلائیں اسے
سخت مشکل اب ہے ضبطِ اضطراب | ہو سکے اس برسات کا خانہ خراب

ایک تو آگے ہی تھے ہم بیقرار — دوسرے اس نے کیا اور اشکبار
چرخ سنگین دل کے ہیں سارے یہ کام — رنگ بیتے ہے جو یہ اب صبح و شام
دیکھ کر محبوس اور بیکس ہمیں — جان کر محبوس و ربے بس ہمیں
یوں ہمارے سر پہ برپا کی ہے دھوم — آتی ہیں کالی گھٹائیں جھوم جھوم
وائے قسمت مینہ کا جھمکا لگے — اور ہم بے دست و پا یوں ہوں پڑے
یہ ترشح یہ اندھیری رات ہے — ..... کر یوں بیتی اوقات ہے
خانۂ تاریک اور ہُو کا مقام — بیکسی کا کیجئے کس سے کلام
گھن گرج جو رعد کی آواز ہے — وہی نالوں کی ہماری ساز ہے
چپکے دیکھا کرتے ہیں ہم گوشہ گیر — شور سے برسے ہے جب ابر مطیر
دیدۂ تر ہیں ٹپکاتے بہار؟ — روتے ہیں حالت پہ اپنی زار زار
دیکھئے یہ کب تلک جھڑ نا جھڑے — آخر اپنے حق میں دیکھیں کیا کرے
جب ہوا چلتی ہے یہ نمناک سرد — اور اشک و آہ ایک دیتے ہیں درد
کوندنا بجلی کا تس پر ہے غضب — پھر سدا رم جھم و سیر ہے غضب
زندہ ایک ہے برق اودھر متصل — ہے ادھر ہمکو رولاتا درد دل
پہروں پہروں ٹکٹکی باندھے ہوئے — دیکھتے رہتے ہیں اور روتے ہوئے
کون سمجھاوے پپیہے کے تئیں — کہ کے پی پی مت کرے ہم کو غمیں
مت دلاوے یاد ہم کو اپنا پی — جس کے ملنے کی ہمیں ہے تشنگی
ہم بچارے قید میں ہیں خستہ جاں — حسب ظاہر ہم کہاں اور پی کہاں
کوند جب لگتا ہے کوئی بے اختیار — ہم یہ اپنے غم کی گاتے ہیں ملار
دامنی دمکے ہے کالی رین ہے — پی بنا جیوڑا نپٹ بے چین ہے
یاد جب آتی ہیں اگلی صورتیں — تھیں میسر جب کبھی کچھ حالتیں
ہے تماشا سے جہاں خواب و خیال — کہتے ہیں جس کے تئیں ہجر و وصال
بس طپش اب ختم کر دے مثنوی — خوب ہے نام اس کا ..... بیکسی

"تمام شد مثنوی مرزا طپش ۲ ذی الحجہ تاریخ ۶ ذی الحجہ ۱۲۳۹ھ مطابق ۳ اگست ۱۸۱۵ء روز جمعہ شروع و تمام ہوئی"

عیشی کی تین غزلیں

کسی گل کی رہی ہے بس کہ مجھکو جستجو برسوں
صبا کی طرح آوارہ پھرا ہوں کو بکو برسوں

تبسم سے نہیں لب آشنا اپنے کبھو برسوں
ہنسے تھے زخم ساں گاہے سو روتے ہیں لہو برسوں

وہ میکش ہوں کہ توڑا محتسب نے جب کہ میخانہ
بغل میں میں پھرا دابے صراحی کا گلو برسوں

نئے دیوانہ پن ہر روز دکھلایا کروں تجھ کو
مرے پہلو میں گر بیٹھا رہے اے قیس تو برسوں

نہ اپنے نے مجھے پوچھا نہ بیگانے نے وحشت میں
برنگِ گل رہا چاکِ گریباں بے رفو برسوں

جلایا ہے ہمیں اُن گلرخوں کے داغ نے عیشی
ہماری خاک سے آیا کرے گی گل کی بو برسوں

میں نخلِ حنا ہوں کہ یہاں سر بھی جو کٹ جائے
خوں دست بدست اپنا حسینوں ہی میں بٹ جائے

اس کی نگہ مست کی تقصیر سے کیا دور
تمثال کا گر آئینہ میں پاؤں رپٹ جائے

یاں بادِ خزاں نے کئے پژمردہ گلِ تر
بلبل سے یہ کہدو کہ قفس ہی کو پلٹ جائے

اے بادِ صبا جائیو گلشن میں .....
صدمے سے جگر مرغِ گلستاں کا نہ پھٹ جائے

آہستہ ہنسے گل سرِ بالیں پہ ہمارے
تنہائی کی شب ہے نہ کہیں نیند اُچٹ جائے

کس کی فغاں کا باغ میں یارب گذر ہوا
جو بوئے گل سے آج مجھے دردِ سر ہوا

وہ دل کہیں نہ شاد ہوئے باغِ دہر میں
گر گل ہنسا تو مرغِ چمن نوحہ گر ہوا

ہو گوشہ گیر چاہئے گر تجھ کو آبرو
قطرہ صدف میں بند ہوا جب گہر ہوا

گل کوچہ کوچہ پھرتا ہے اور ماہ شہر شہر
تو اپنے بام پہ نہ کبھی جلوہ گر ہوا

عیشی کے دو مطلع

اُسے آتے جو دیکھا بلبلوں نے سیرِ گلشن کو
کئے سو شکر کے سجدے بچھا کر گل کے دامن کو

جگہ گلچیں نے دی طرفِ چمن میں میرے مدفن کو
کفن کے واسطے بلبل نے پھاڑا اپنے دامن کو

رضا علی مایوس کا ایک مطلع

جگہ اس بت نے بتلائی جو آ کر میرے مدفن کو
زمیں نے کھول کر آغوش ڈھانکا اپنے دامن کو

سمن بغرض انفصال مقدمہ

حسب آرڈر ۵ قاعدہ ۲۰ ضابطہ دیوانی

مقدمہ نمبری ۲۰۷ سنہ ۱۹۳۰ع

بعدالت جناب سید حسن ارشاد صاحب بہادر منصف مقام اکبر پور ضلع فیض آباد۔

بابو چیت نرائن سنگھ ولد بابو بھروت سنگھ تعلقدار مرحوم وغیرہ ۲ بابو جنیت اندر موہن سنگھ ولد بابو اندر بکرم سنگھ ساکنان موضع منسور پرگنہ ٹہہر ضلع فیض آباد مدعیان ۔ بنام شیو برن سنگھ وغیرہ مدعا علیہم

بنام سر جو سنگھ ولد جگیشر سنگھ ساکن موضع رام پور پرگنہ انگلی تحصیل شاہ گنج ضلع جونپور ۔ مدعا علیہ ۲

ہرگاہ مدعیان نے تمہارے نام ایک نالش بابت ساللعہ ؎ کے دائر کی ہے لہذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ اٹھارہ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ع بوقت دس بجے دن اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعوی مدعی مذکور کی کرو اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمہارے حضار کے لئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس تم کو لازم ہے کہ اپنے جواب دعوی کی تائید میں جن گواہوں کی شہادت پر یا جن دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو اسی روز ان کو پیش کرو۔ مطلع رہو کہ اگر روز مذکور تم حاضر نہ ہو گے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہو گا۔

آج بتاریخ ۱۳ ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۰ع میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

دستخط حاکم بخط انگریزی۔ مہر عدالت

وقت حاضری بدفتر منصفی اکبر پور دس بجے دن

آدب

(مرتبۂ)

سیّد اعظم حسین

جلد ۲ بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء نمبر ۱۵

پنڈت برج نراین چکبست

بحیثیت ایک نثر نگار کے

(جناب مولانا سید اختر علی صاحب تلہری)

کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کی سرزمین میں نثر نگاروں سے زیادہ شاعروں کے پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس نام آور خطہ کی خاک سے جو ہستیاں اُبھرتی ہیں وہ زیادہ تر ایک شاعر کا دل و دماغ لیکر۔ یہاں کی پُر بہار آب و ہوا کو موزونی طبع سے کچھ خاص خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ نے انیس سا زبردست شاعر (جس کی شاعرانہ اعجاز نمائیوں نے اُردو کو اس قابل بنا دیا کہ وہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے برابر جگہ پا سکے) تو پیدا کر دیا لیکن اُسکے سایہ میں کوئی آزاد سا نثر نگار پروان نہ چڑھ سکا۔ اُسکا دامن شاعری کے ایک سے ایک خوشاب جواہر سے تو مالا مال ہے لیکن یہاں کہیں سے "نثر نگاری" کا کوئی ایسا چشمہ نہیں پھوٹا جس سے "آب حیات" کے چند گھونٹ ہی دستیاب ہو سکیں۔ شاعری کے خوش رنگ "ساغر و مینا" تو اُسکی بغل میں نظر آتے ہیں لیکن "نیرنگ خیال" کی طلسم کاریوں سے اُسکی نگاہیں ناواقف ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کی نثر نگاری کا پلہ نظم کے مقابلہ میں بہت ہلکا ہے۔ اور یہاں ادبیات کی اس ضروری صنف کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے اور یہ بھی قطعی ہے کہ آزاد سا بات بات میں پھول بکھیرنے والا لکھنؤ کو نصیب نہیں ہوا۔ آتش کی "شعلہ بیانیوں" نے دلوں میں گرمی پیدا کرنے کا سامان تو بہت کچھ مہیا کر دیا لیکن "قند پارس" کے کوزہائے نبات سے وہ محروم ہے۔ مگر اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ لکھنؤ کی "ادبی کائنات" میں غیر فانی نثر کا کوئی ذخیرہ ہی نہیں ہے۔ لکھنؤ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ ایسے صاحبانِ قلم رہے ہیں جنھوں نے نثر نگاری کی طرف پورے طور سے توجہ کی ہے۔ اُن کے قلم کی روانیوں کی یادگاریں اب بھی موجود ہیں۔ اُن میں آزاد کی زبان کی لطیف نفاستیں، طرز ادا کی مہذب شوخیاں، نادر سے نادر استعاروں اور تشبیہوں کی آمیزشیں

موجود نہ سہی لیکن تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ کے "نثری ذخیرہ" کو بھی اُردو کبھی اپنی نگاہوں کے سامنے سے ہٹا نہیں سکتی۔

آنشا۔ سرور۔ سرشار۔ منشی سجاد حسین۔ یہ سب اردو انشا پردازی کے آسمان کے درخشاں ستارے تھے۔ اُن کی تحریریں اُردو کے روداربنانے میں پورے طور سے حصہ لیتی رہی ہیں۔ اُنھوں نے اُردو نثر کی کافی "چمن بندی" کی ہے۔

اس زمانہ میں بھی اُردو نثر نگاروں کی صف میں حضرت رسوا، حضرت آثر، ومریادہ شیخ کی کُرسیاں کسی سے نیچی نہیں ہیں۔ انکے علاوہ رنگ زمانہ دیکھکر اور دوسرے نوجوان بھی اس طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بہتوں میں آگے چل کر ممتاز اہل قلم بننے کی صلاحیت ہے۔

لیکن میں اس وقت ان میں سے کسی صاحب کے متعلق کوئی تذکرہ نہیں کرنا چاہتا۔ بالفعل مجھے لکھنؤ کی ایک ایسی "ادبی ہستی" کا ذکر کرنا ہے جسے دنیا ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے ضرور جانتی ہے لیکن اُسے یہ بہت کم معلوم ہے کہ اُسکی اُردو نثر کا پایہ بھی بہت اونچا ہے۔

اُسکی فطری موزونی طبع نے اگر ایک طرف اُردو شاعری کے چمنستان میں بہت سے خوشبودار اور خوش رنگ پھولوں کا اضافہ کیا ہے، تو دوسری طرف نثر کی وادیوں میں بھی اُسکا قلم موتی اور جواہر ہی بکھیرتا چلا ہے۔ نظم و نثر اُسکی روانی طبع کی بارشوں سے یکساں سیراب ہوتے رہے ہیں۔

اُردو سے ذوق رکھنے والی دُنیا پنڈت برج نراین چکبست سے ناواقف نہیں ہے۔ اُس نے چکبست کی اُن نظموں سے جو دلوں کو وطن کی محبت کے نورانی جذبہ سے لبریز کر دیتی ہیں، ایک مرتبہ نہیں بیسیوں مرتبہ لطف اُٹھایا ہوگا۔ خود "ادب" کے کسی سابق نمبر میں پنڈت جی کی شاعری کے متعلق ایک مقالہ شائع ہو چکا ہے۔

یہاں میں صرف یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ اُنکی نثر نگاری کا مرتبہ کیا ہے

چکبست کے ۲۰ مضامین کا مجموعہ اچھے کاغذ پر خوش سلیقگی سے "انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد" نے شائع کیا ہے۔ اُس میں اُن کے قریب قریب وہ تمام قلمی کارنامے درج ہیں جو اُنھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے پیشہ وکالت کی مصروفیتوں کے باوجود مختلف اخبارات اور رسائل میں لکھے ہیں۔ افسوس ہے کہ گلچین اجل نے چمنستان ادب کے اس تر و تازہ پھول کو عین عالم بہار میں چُن لیا۔

اس میں شک نہیں کہ اگر چکبست کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو "اردو نثر نگاری" کے تاج میں بہت سے لعل و جواہر اور ٹک جاتے۔

ابتدا اً اردو نثر میں اچھی خاصی قافیہ پیمائی ہوتی تھی۔ مسجع و مقفےٰ عبارتیں ہی انتہائے قابلیت کا معیار سمجھی جاتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طرز جو غیر فطری تکلفات کا حامل ہے۔ علمی مباحث کا بار نہیں اٹھا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علمی تحریروں کا دامن جتنا پھیلتا گیا ان تکلفات و تصنعات کا دامن اتنا ہی سمٹتا گیا۔ علم بدیع کی غیر ضروری صنعتوں کے "دردِ لے پن" کے بجائے اردو تحریر میں گھلاوٹ پیدا ہوتی گئی۔

چکبست اسی دورِ جدید کے پیداوار تھے۔ اور پھر مشرقی علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھیں مغرب کی ادبیات سے بھی روشن ہو چکی تھیں اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کی انشا پردازی اُن خصوصیات کی مالک نہ ہوتی جو کسی زبان کی رفعت و علو کا سامان ہوتی ہیں۔

وہ بالعموم خشک سے خشک مسائل کو شگفتہ اور لطیف پیرایہ میں ایک عجیب ساحرانہ بے تکلفی سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ انھیں زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ جن مباحث پر قلم اٹھایا ہے اُن سے آشنا بن کے اور جن مضامین پر طبع آزمائی کی ہے اُن پر قدرت حاصل کر کے۔ وہ جن خیالات کو ادا کرنا چاہتے ہیں اُنکی واضح تصویریں پہلے سے دماغ میں موجود ہوتی ہیں اور وہ انھیں ایک کامل مصور کی طرح کاغذ پر اتارتے چلے جاتے ہیں۔

اُردو انشا پردازی کے جو خاص اساطین سمجھے جاتے ہیں اُن میں سے آزاد دہلوی کا طرز بیان اُنھیں زیادہ پسند ہے۔ اسی لئے ان کے ادبی پیمانوں میں اُسی بادۂ کہن کی سرمستیوں کی جھلک دکھلائی دیتی ہے۔ اور اُردو انشا پردازی کے افق پر "آبِ حیات" و "دربارِ اکبری" کے قالب میں جو بجلیاں چمکی تھیں اُن کے ہلکے ہلکے جلوے مضامین چکبست میں بھی موجود ہیں۔ وہی صاف و شستہ زبان، وہی مبتذل الفاظ اور سوقیانہ محاوروں سے پرہیز اور وہی لطیف استعاروں اور تشبیہوں کا محاورہ کے سانچے میں ڈھلا ہوا استعمال۔

چکبست محض لفظوں ہی کے چمن بند نہیں ہیں۔ صرف عبارت آرائی ہی اُنکا خاص جوہر نہیں ہے۔ اُنکی طبع رسا اور اُنکے ذہن خداداد کا شانۂ معانی کی زلفیں بھی اسی خوبی سے سلجھاتا ہے۔

اُنکے یہاں حسن معنی حسن الفاظ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اُنکی رائیں اور اُنکے فیصلے نکتہ رسی اور اصابت فکر کے خصوصیت سے آئینہ ہوتے ہیں

چکبست کے مضامین کا رقبہ علمی ادبی تاریخی معاشرتی اور سیاسی تمام اہم موضوعوں پر پھیلا ہوا ہے۔ میں جہاں تک سمجھتا ہوں بہترین انشا وہی ہو سکتی ہے جو زیر نظر مسائل کو اس عنوان سے بیان کرے کہ سننے والوں اور پڑھنے والوں کے دماغوں میں اُن کی واضح تصویریں آ جائیں اضافت کی بے عنوانیوں، ترکیب کی اُلجھنوں، لاحاصل مشکل پسندیوں اور غیر فطری صنعتوں کی نمائشوں سے پاک ہو اور جس پر سوقیت اور بازاری پن کی چھاؤں تک نہ پڑی ہو۔ گویا بیان صاف، سُلجھا ہوا، شگفتہ اور دلپذیر ہو۔ اور "علمی سادگی" اور "ادبی شگفتگی" کے ڈانڈے ملے ہوئے ہوں۔

چکبست کے مضامین اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ اُنکی انشا پردازی میں ان تمام خصوصیتوں کی جلوہ گری موجود ہے۔ ذیل کے اقتباسات سے اسکا صحیح اندازہ ہو گا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار پر جو فاضلانہ مضمون لکھا ہے اُسکے ضمن میں لکھتے ہیں۔

"اس فسانہ (فسانۂ آزاد) کی دلچسپی کا انحصار اُسکی داستان کے مسلسل ہونے پر نہیں ہے۔ حضرت سرشار نے اس میں لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کی اس مٹی ہوئی حالت پر بھی ایک عالم ہے۔ اس شہر مرحوم کے باشندوں کا طرز معاشرت اُنکی گزشتہ عظمت کی یاد دلاتا ہے اور دل میں درد محبت پیدا کرتا ہے۔ ہاں نگاہ عبرت کا ہونا لازمی ہے۔ میرے دوستو! یہاں کی خاک کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہ کبھی امیروں اور شہزادوں کی آنکھ کا سُرمہ تھی۔ یہاں کی عالی شان گرشکستہ عمارتوں کے ٹوٹے پھوٹے در و دیوار زمانہ کے نشیب و فراز کی تصویریں بنے ہوئے ہیں۔

اُنکی تقریر و گفتگو شستگی و پاکیزگی کا معیار ہے۔ اُنکی نشست برخاست کا طریقہ سلیقہ و امتیاز کا دستور العمل ہے ...... سرشار نے جو کہ شاعر کا دماغ اور مصور کی آنکھ اپنے ساتھ لایا تھا فسانۂ آزاد میں اس تہذیب کا مرقع کھینچا ہے مگر صرف اس تہذیب کا خوشنما پہلو ہی نہیں دکھاتا ہے بلکہ اسکے وہ عیوب بھی جو اسکے جوہروں کو چھپائے ہوئے ہیں۔ اور جو اس تہذیب کے زوال میں ظاہر پذیر ہوتے ہیں ظرافت کے پیرایہ میں بیان کئے ہیں خصوصاً محلّات کے طرز معاشرت اور بول

چال کا وہ رنگ دکھایا ہے کہ بایدو شاید۔ بیگمات کی نستعلیق چال ڈھال اور شستہ و پاکیزہ تقریر کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نوخیز اور کمسن لڑکیوں کی شوخی اور طراری کا عالم دل پر بجلی گراتا ہے۔ ہر ایک بادۂ جوانی سے سرشار ہے۔ رگ رگ میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایک ایک بات سے ہزار رنگینیاں پیدا ہیں۔ قدم قدم پر ناز و انداز قربان ہوتے ہیں مگر ایسی حیا پرور کہ فرشتے اُن کے دامن پر نماز پڑھیں۔ مامائیں مغلانیاں ہیں کہ ہوا سے لڑتی ہیں۔ ضلع جگت میں طاق ہیں۔ زبان تڑاق پڑاق چلتی ہے۔ رستے چلتے لوگوں پر پھبتیاں کستی ہیں۔......

غرضکہ اس صورت پر اس نگار رنید معانی نے مختلف تصویریں مانی و بہزاد کے قلم سے کھینچی ہیں اور بیچ بیچ میں ظرافت نے ایسی گلکاری کی ہے کہ جس طرح اتنی بڑی داستان لکھنے میں مصنف کا قلم نہیں تھکا ویسے ہی پڑھنے والا نہیں تھکتا۔ جہاں خوجی کی قرولی میان سے نکلی کہ پڑھنے والوں کی باچھیں کھل گئیں۔"

اسی مضمون میں دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"حضرت سرشار کی پوری وقعت کا اندازہ حضرت حالی کی حالت پر غور کرنے سے ہو سکتا ہے اُنھوں نے اُردو شاعری کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہا تھا جو کہ سرشار نے اُردو نثر کے ساتھ کیا مگر چونکہ دل و دماغ اس کار عظیم کے انجام دینے کے لئے موزوں نہ تھا ؟ لہذا ناکامیاب رہے۔ حضرت حالی نے اُردو شاعری کے آئینہ پر انگریزی خیالات کی تصویر اُتارنا چاہی مگر چونکہ باریک فہمی کا قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا، لہذا تصویر کا ہر اک جگہ سے چہرہ بگاڑ دیا۔ برخلاف اسکے حضرت سرشار نے اُردو کی عروس زیبا شمائل کو انگریزی زیور پہنایا مگر کسی مقام پر بے عنوانی کا سایہ نہ پڑنے دیا۔ گلہائے مضامین کے قدر دان جانتے ہیں کہ نثر اُردو کے باغ نے اس چمن بند کی رنگ آمیزیوں سے جو رونق پکڑی اُسکی ثنا و صفت احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ ایک جانب تو پُرانے تختے اور شاخیں کاٹ چھانٹ کر چمن کو از سرِ نو آراستہ کیا۔ نئی روشیں نکالیں۔ دوسری طرف نثر انگریزی کے گلبن سے چند ایسی قلمیں لایا جو کہ ہندوستان کی آب ہوا میں نشو و نما پا سکتی ہیں اور اُنکے پیوند اپنے چمن کے پودھوں میں لگائے جن سے ایسے خوشنما پھول پیدا ہوئے کہ لوگ رجب علی سرور کے لگائے ہوئے باغ کو بھول گئے۔ حضرت حالی نے بھی زمین شعر میں جو پُرانا چمن لگا تھا اُسکی درستی کرنا چاہی

مگر بجائے اسکے کہ برگ خزاں رسیدہ یا مرجھائے ہوئے پھول باغ کی روشوں سے ہٹائیں، سارا چمن اُجاڑ ڈالا۔ اور بلالحاظ موافقتِ آب ہوا چند ٹہنیاں نظم انگریزی کے باغ سے کاٹ کر اس سرزمین میں لگا دیں۔ ان ٹہنیوں نے جڑ نہ پکڑی اور چند روز میں مرجھا کر رہ گئیں۔ اس انوکھے باغبان نے اپنی محنت کو بھی ڈبویا اور پرانے باغ کی رونق کو بھی کھویا۔ مراد یہ ہے کہ پرانی روش کا ترک کرنا اور نئی وضع کا فروغ دینا بڑی طباعی اور عالی دماغی کا کام ہے۔ آج کل اکثر اصحاب نئے خیالات کی تلقین کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی جملوں کی ترکیبیں اردو نثر میں الفاظ کو توڑ مروڑ کر کسی صورت سے داخل کیجائیں اور ہربرٹ اسپنسر اور اگسٹ کانٹ کے فلسفیانہ تحقیقات کے نتائج موقع بے موقع لولی لنگڑی عبارت میں لکھ دیئے جائیں۔ چاہے پڑھنے والا سمجھے یا نہ سمجھے۔ یہ حضرت سرشار ہی کو فخر حاصل ہے کہ پرانے شیشوں میں اچھوتی ترکیبوں اور نئے خیالات کی بادہ فرحت انگیز اس خوبصورتی سے بھری، کہ پرانے اور نئے رنگ کی طبیعتوں کو یکساں کیفیت حاصل ہوئی"۔

سطور بالا میں جو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں ان سے چکبست کا مرتبہ انشاپردازی اچھی طرح متعین ہو جاتا ہے۔ انکی تحریروں میں بیان کا سلجھاؤ زبان کی روانی استعاروں اور تشبیہوں کی شستگی اور پاکیزگی سب کچھ موجود ہے۔ پہلے اقتباس میں چکبست نے ماماؤں اور مغلانیوں کے متعلق لکھا ہے "زبان تڑاق پڑاق چلتی ہے"۔ تڑاق پڑاق میں فی الجملہ سوقیت ہے لیکن دیکھئے کہ چکبست نے اُسے کس موقع پر صرف کیا ہے۔ اس جگہ تڑاق پڑاق کے سوا کوئی دوسرا لفظ رکھ کر دیکھو سارا لطف خاک میں مل جائیگا۔ بات یہ ہے کہ مقتضائے مقام کے مطابق اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ اسی لئے اس لفظ پر سوقیت کی جو تہ چڑھی ہوئی تھی وہ دور ہو گئی۔

دوسرے اقتباس میں چکبست نے حالی اور سرشار کا مقابلہ کیا ہے۔ اس مشکل مقام کو جس نفیس اور شگفتہ پیرایہ میں لکھا ہے اسکی داد نہ دینا "ادبی کفر" ہے۔ حسن انشا کے لئے جتنی چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود ہیں۔

چکبست نے داغ پر جو مضمون لکھا ہے وہ تنقیدی نقطۂ نظر سے آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے۔ داغ کی شاعری کے متعلق جو کچھ لکھدیا ہے وہ اس مبحث پر ایک حد تک "آخری لفظ" کہے جانے کا استحقاق رکھتا ہے۔

پوری تنقید میں حضرت داغ کا ادبی احترام ملحوظ رکھا گیا ہے اور پھر اُنکی شاعری کے متعلق جو صحیح رائے ہو سکتی ہے وہ صفائی کے ساتھ ظاہر کر دی گئی ہے۔ پورے مضمون میں کوئی جملہ ایسا نہیں ملتا جس میں دہلی اور لکھنؤ کی چشمکوں کی جھلک نظر آتی ہو۔ یا شبلی اور پیروان شبلی کی تنقیدوں کی طرح مذہبی تعصب کی بو آتی ہو۔

اس مضمون کی تمہید یوں لکھی گئی ہے۔

"کیا افسوس کا مقام ہے کہ اُردو شاعری کے آخری دور کا آخری شاعر قدردانان سخن کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گیا۔ مدت ہوئی کہ نظم اُردو کے شباب کی تاروں بھری رات ڈھلتے پر آ چکی تھی۔ یہ پچھلے پہر کا ایک تارا باقی رہ گیا تھا جسکی روشنی دمبدم گھٹتی جاتی تھی۔ آخر کار یہ تارا بھی ہماری نظروں سے نہاں ہو گیا اور اسی کے ساتھ قدیم مذاق سخن کا "چراغ سحری" بھی گل ہو گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دکن ہی کی خاک پر چمنستان نظم اُردو کی داغ بیل ڈالی گئی تھی اور اس چمن کا آخری پھول دکن ہی کی خاک کا پیوند ہوا۔ یہ آخری پھول دہلی مرحوم کا رنگین مزاج اور شوخ طبع شاعر تھا جسکی روح آج فردوس میں کسی حور کے گیسو میں بو کی طرح سمائی ہو گی"

اسی مضمون میں دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

"اب دیکھنا چاہیے کہ شاعری کا اصلی مفہوم کیا ہے۔ شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے جسکا کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات اور احساسات اُسکے جذبات دلی کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں اور ایک عالم تصویر پیدا کر دیتے ہیں اور چونکہ شاعر کی کانوں کی فضا میں سلاست بیان کا نغمہ قدرتی طور پر سمایا ہوا ہوتا ہے لہذا وہ اپنے الفاظ کو اس خوبی سے ترتیب دیتا ہے کہ ان میں علاوہ عالم تصویر کے ایک تاثیر موسیقی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کا کلام ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں اُس کے اُن خیالات اور احساسات کا عکس نظر آتا ہے جو اسکے جذبات دلی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے اُسکی زبان سے نکلتے ہیں غرضکہ جذبات شاعری کے روح رواں ہیں۔ اور چونکہ دل کو دل سے راہ ہے لہذا جس قسم کے جذبات کے رنگ میں شاعر کا کلام ڈوبا ہوا ہو گا وہ اسی قسم کے جذبات سامع کے دل میں بھی جوش میں لائیگا"

آگے چل کر داغ کی شاعری کو اسی معیار پر جانچا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ اُنکی شاعری سے کس قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

آخر میں اپنا فیصلہ یوں دیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بالکل سچ دیا ہے۔

"داغ کی شاعری کے لئے سب سے موزوں لقب "عیاشانہ شاعری" ہے۔ اکثر حضرات فرماتے ہیں کہ داغ کا کلام دل میں چٹکی لیتا ہے، یہ بات آتش و ذوق و غالب وغیرہ کو نصیب نہیں۔ مگر ان حضرات کو یہ خیال کر لینا چاہئے کہ داغ کا کلام کس قسم کی چٹکی لیتا ہے یعنی کس قسم کی تاثیر پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی حسین و حیا پرور صورت نظر آئے یا کسی شاداب چمن یا دلفریب منظر کی سیر نصیب ہو تو انسان کے دل کو ایک روحانی سرور حاصل ہوتا ہے۔ اسکا نام بھی تاثیر ہے اور میں کہونگا کہ ذوق و آتش وغیرہ کی شاعری اسی قسم کی تاثیر سے مالامال ہے۔ برعکس اسکے اگر کوئی چھریا بانکی عورت بانکا دوپٹا اوڑھ کر سامنے سے نکل جائے تب بھی ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو بھی تاثیر کہیں گے۔ داغ کا کلام سُننے سے اسی قسم کی تاثیر دل میں پیدا ہوتی ہے۔"

دیکھو فیصلہ کی پختگی اور رائے کی متانت کو زبان کی شیرینی اور بیان کی لطافت نے کس قدر دلپذیر بنا دیا ہے۔ حُسن انشا کے یہی وہ نادر نمونے ہیں جن پر ہر زبان ناز کر سکتی ہے۔

چکبست کا ایک مضمون اُردو شاعری پر ہے جو خصوصیت سے قابل توجہ ہے۔ اُسکے فقرہ فقرہ سے مغربی و مشرقی خیالات کی لطیف آمیزش کے آثار موجود ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مضمون نگار کا قلم جادۂ اعتدال سے کسی جگہ منحرف نہیں ہوا ہے۔

اس مضمون کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"نفس شاعری کے جوہر لطیف کا زبان یا قلم کی مدد سے خاکہ کھینچنا دشوار ہے۔ یہ ویسا ہے کہ سُریلی آواز کے سُننے سے یا دریا کی لہروں پر چاند کی روشنی دیکھنے سے انسان کے دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اُسکے بیان کرنے کی کوشش کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری و زبان کے جادو کی تشریح و تعریف زبان و قلم کے اختیار سے باہر ہے۔ مگر بادی النظر میں شاعری کے دو پہلو ہیں۔ ایک کا تعلق خیالات سے ہے دوسرے کا زبان سے جسکو خیالات کا پیرہن یا لباس سمجھنا چاہیئے۔ خیالات کا اظہار پاکیزہ اور سلیس نثر میں بھی لطافت کے ساتھ ہو سکتا ہے مگر شاعر کے خیالات دلی جذبات کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نکلتے ہیں اور زبان میں خاص اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ شاعرانہ خیالات کے پھولوں کی نشو و نما محض دماغ کی پھلواری تک محدود نہیں رہتی ہے۔ شاعر کے دلی جذبات کی برقی حرارت ان پھولوں کا عطر کھینچ لیتی ہے۔ اسی کا نام شاعرانہ تاثیر و لطافت ہے۔ اس

شاعرانہ لطافت و تاثیر کے عام کرنے کا ذریعہ شاعرانہ زبان ہے۔ شاعر بھی وہی الفاظ استعمال کرتا ہے جو اُسکے ہم وطنوں کی زبان پر ہوتے ہیں مگر انھیں الفاظ کی اُلٹ پھیر سے وہ اپنے بیان میں عالم تصویر پیدا کر دیتا ہے اور محض عالم تصویر ہی نہیں پیدا کر دیتا ہے بلکہ اُسکے الفاظ میں ایک آگ کی تاثیر نمایاں ہو جاتی ہے جو فن موسیقی کی راگ راگنی سے الگ ہے۔ اگر انگریزی شاعری کو اس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہو جائیگا کہ ہمارے تعلیم یافتہ مغربی نظم کے پڑھنے سے دماغی حظ ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن نہ انداز کلام کی شاعرانہ لطافت اُنکے دلوں میں برقی حرارت پیدا کرتی ہے نہ زبان کی مصوری کا اُنھیں حس ہوتا ہے نہ الفاظ کا راگ اُنکے کانوں کی فضا میں سماتا ہے۔ اُنکا دماغ یہ خوب پہچان لیتا ہے کہ کس قسم کے خیالات نظم کئے گئے ہیں مگر اُن کا دل جسے جذبات کا ذخیرہ خیال کرنا چاہئے یہ محسوس نہیں کرتا کہ ان خیالات کے ادا کرنے کا شاعرانہ انداز کیا ہے۔ اُن کے کان یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ شاعر نے معمولی الفاظ میں کیا جادو بھر دیا ہے۔"

اتنے اچھے خیالات کا اتنی اچھی زبان میں ادا کر دینا ہر ادیب کا کام نہیں ہے جس روانی اور سلاست کے ساتھ چکبست اپنے خیالات لکھتے ہیں اُس سے نثر نگاروں کی موجودہ جماعت کو سبق لینا چاہیئے۔

انشا پردازی درحقیقت اسی کا نام ہے یہی وہ نثر کے نمونے ہیں جن سے اُردو کی عزت بڑھتی ہے۔ اُردو انشا پردازی اُس چیستانی طرز تحریر کا نام نہیں جس میں بلا ضرورت عربی کے غیر مانوس لفظوں، اُلجھی ہوئی ترکیبوں اور بے معنی استعاروں اور تشبیہوں کا انبار لگا دیا جاتا ہے۔

چکبست کے تمام مضامین ان ادبی لطافتوں سے مالا مال ہیں۔ ہم نے اُنکے مضامین سے یہ اقتباسات نہایت سرسری طور سے کئے ہیں۔ بہر حال جتنے بھی اقتباسات دیئے گئے ہیں ان سے یہ اندازہ اچھی طرح ہو جاتا ہے کہ چکبست کی نثر نگاری کا مرتبہ بہت بلند ہے اور اُنکی انشا پردازی ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیگی۔

اس "ادبی چمن" میں ہمیں کچھ کانٹے بھی ملے۔ بعض بعض مقامات پر الفاظ کے استعمال میں مسامحہ ہو گیا ہے۔

"پنڈت تربھون ناتھ سپرو" کے حالات میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "اور اکثر غلبۂ ذکاوت سے

خبط اور مہمل بھی بک جاتے تھے"۔ یہاں خبط کا لفظ بے محل صرف ہوا۔ صرف "مہمل بکنا" کافی تھا۔ "خبط بکنا" کوئی محاورہ نہیں ہے۔

سرشار کے حالات میں "اندازاً" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے "اندازاً" غلط ہے۔ عربی کی تنوین غیر عربی لفظ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ عوام میں اسکا استعمال ضرور رائج ہے لیکن حکیم جیسی ذات عوام میں محسوب نہیں کی جاسکتی۔

اُس سے آگے چل کر "دستور قدیمہ" استعمال کیا ہے۔ یہاں "قدیمہ" کے بجائے "قدیم" صحیح ہے۔ اودھ پنچ پر جو مضمون ہے اُس میں آپ کے قلم سے ایک جگہ "تصنع وبناوٹ" نکل گیا ہے۔ ظاہر ہے عربی اور ہندی لفظ میں بقاعدہ فارسی عطف صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح ایک جگہ "رنگ و روپ" استعمال کیا ہے یہ عطف بھی درست نہیں ہے کہیں کہیں بلا ضرورت انگریزی الفاظ بھی استعمال کر گئے ہیں۔ سیاسی کی جگہ پولٹیکل کا لفظ آپکی تحریروں میں زیادہ نظر آتا ہے۔

اسی قسم کی اور بھی بعض لغزشیں ہیں لیکن ظاہر ہے ان معمولی خردہ گیریوں سے اُن کے اُس ادبی وقار میں کوئی کمی نہیں آسکتی جس کے وہ جائز طور سے مالک بن گئے ہیں۔ اعلیٰ انشاپردازی کی جو اصلی روح ہے وہ اُن کے ہر جملہ میں موجود ہے۔ ان لفظی حرف گیریوں کی وہاں تک رسائی نہیں ہوسکتی۔

حضرت میر کی اولاد

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب - ایم - اے

میر کا کلیات پڑھیئے تو صدہا شعر ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کی فکری قوتیں انکی ذات کے گرد گردش کیا کرتی تھیں - اُن کے خیالوں کا مرکز خود انھیں کی ہستی تھی لیکن جن شعروں میں اُنھوں نے اپنی شاعری کی تعریف کی ہے یا اپنی زندگی کا کوئی واقعہ نظم کیا ہے اُنکو چھوڑ کے اس طرح کے باقی شعروں کو ذرا گہری نظر سے دیکھئے تو یہ نکتہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ میر خود بیں نہیں خود شناس تھے اور گو کہ اپنی شاعری کا موضوع وہ خود ہی تھے لیکن ذاتی اور انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ انسانیت کا ایک نمایندہ ہونے کی حیثیت سے -

جو لوگ میر کی انانیت کی صحیح نوعیت سے واقف نہیں ہیں وہ "ذکر میر" پڑھیں اور دیکھیں کہ وہی میر جس کو غلط فہمی خود بینی کا مجسمہ جانتی ہے اپنے اور اپنے زمانے کے حالات لکھنے کے ارادے سے بیٹھتا ہے لیکن پوری کتاب حالات زمانہ کی نذر کر دیتا ہے اور اپنا ذکر صرف اُتنا کرتا ہے جتنا بعض حالات کے ضمن میں ناگزیر طور پر آجاتا ہے - کس قدر حیرت کی بات ہے کہ میر سا شاعر "ذکر میر" میں اپنی شاعری کے متعلق بھی ایک لفظ نہیں کہتا - "نکات الشعرا" میں بھی اپنے متعلق صرف چند لفظ لکھے ہیں -

"ذکر میر" اور "نکات الشعرا" یہی دو کتابیں ایسی ہیں جن میں میر اور انکے آبا و اجداد اور اولاد احفاد کا حال خود میر کے قلم کا لکھا ہوا مل سکتا تھا لیکن میر نے جب اپنا ہی حال نہیں لکھا تو اسلاف و اخلاف کا کیا ذکر - بہر حال مختلف تذکروں کی ورق گردانی سے میر کی اولاد کا جو کچھ حال معلوم ہو سکا ہے وہ بیان کیا جاتا ہے -

میر کے ایک بیٹے میر فیض علی تھے جو فیض تخلص کرتے تھے - شیخ مصحفی فیض سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے، اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں - کہ "فیض ایک صلاحیت شعار جوان ہیں اپنی موروثی موزونی طبع کے تقاضے سے کبھی کبھی اپنے خاندان کی وضع کے مطابق غزل سرائی کرتے ہیں اپنے باپ کی نخوت کا کچھ حصہ بھی پایا ہے -

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کا بیان ہے کہ میر تقی مرحوم کے بیٹے میر فیض علی فیض وزیر الممالک کی سرکار میں اپنے باپ کے ساتھ بسر کرتے تھے - لوگ کہتے ہیں کہ انکو اپنی سخنوری کا بہت غرور تھا لیکن ان کا کوئی شعر میری نظر سے نہیں گزرا جو ان کے دعوے کا ثبوت ہوتا - شاید انکی نازش باپ کی شاعری کی بنا پر ہو -

عبد الغفور خاں نساخ نے انکے متعلق صرف یہ چند لفظ لکھے ہیں :-

"فیض تخلص میر فیض علی خلف میر تقی میر مقیم لکھنؤ"

بعض دوسرے قلمی تذکروں میں بھی میر فیض علی کا کچھ حال درج ہو گا مگر وہ تذکرے اس وقت میری دسترس سے باہر ہیں -

حضرت میر نے ایک مختصر فارسی رسالہ خاص کر میر فیض علی کے لئے لکھا تھا اور اُن کے اور اپنے ناموں کی رعایت سے اُس کا نام "فیض میر" رکھا تھا۔ اس رسالے کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میگوید فقیر حقیر میر محمد تقی متخلص بہ میر کہ دریں ایام فیض علی پسر من ذوق خواندن ترسل پیدا کردہ بود لہذا حکایات خمسہ متضمن فوائد بسیار را باندک فرصت نگاشتم و مراعات اسم او نمودہ نام نسخہ "فیض میر" گذاشتم"

فیض کے چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

نہ مانی تو نے میری اپنی ہی ضد بے وقار کھی
کہیں اب کس سے ہم جا کر ہماری تو نے کیا رکھی

شب وصل آئی تھی یار وسو اس بے لطفی سے کاٹی
ہمارے اپنے اُن نے درمیاں تلوار لا رکھی

کدورت جب تب انداز سے نکلا ہی کی تیرے
ہماری خاک اس کوچے میں تجھ نے کب صبا رکھی

بنائے صانع قدرت نے کیا کیا پھول و گل یوں تو
مرے اس گلبدن میں کچھ ادا سب سے جُدا رکھی

دور میں ساقی ترے آنکلے ہیں مے نوش ہم
جام خالی دے ہے کیا، اتنے نہیں مدہوش ہم

سر فرو لاتے نہیں ژولیدہ مویان عشق کے
سایۂ بال ہما پر ماریں ہیں پاپوش ہم

بے زبانی کی نہ پوچھو وجہ ہم سے کوفت....
چوٹ کچھ ایسی لگی دل پر کہ ہیں خاموش ہم

شوق میں تیرے کنار و بوس کے اے بحر حسن
موج کے مانند ہو جاتے ہیں سب آغوش ہم

دل نہیں رہتا کہ چھپ کر دیکھ لیں ہیں ورنہ فیض
عمر گذری تا کسی سے اپنی ہیں روپوش ہم

گل کھا موئے جنھوں کے لئے جسم زار پر
دو پھول بھی نہ لائے گئے وہ مزار پر

یاری کی مت اُمید رکھا کر رقیب سے
اک میں ہی ناتواں موں بھاری ہزار پر

کیا کیا طیور آ کے سر تیر پھر گئے
کچھ ان دنوں نہیں ہے ترا دل شکار پر

یہ فیض ساری صورتیں ہیں مٹنے والیاں
مت بھول آہ یاں کے تو نقش و نگار پر

روش بھائی ہے کیا ان خوبصورت گلعذاروں کو
لئے آئینہ دیکھا کرتے ہیں اپنی بہاروں کو

نہیں معلوم کس رشک قمر کی راہ تکتے ہیں
کہ ساری رات آنکھوں میں کٹا کرتی ہے تاروں کو

خدا جانے کہ تجھ سے فیض کیا اسکو ہے بیزاری
جہاں دیکھا تجھے اس نے پکارا اپنے یاروں کو

میر کے ایک بیٹے میر عسکری تھے۔ اُن کا عرف میر کلو اور تخلص عرش تھا لکھنؤ میں رہتے تھے۔ ناسخ کا قول ہے کہ ان کا تخلص پہلے زار تھا پھر عرش ہوا۔ عرش ناسخ کے شاگرد تھے مگر خود رتبہ اُستادی رکھتے تھے۔

حضرت آزاد دہلوی نے لکھنؤ میں میر عرش کی زیارت کی تھی۔ اُن کا چشم دید بیان ہے کہ "باپ کے برابر نہ تھے مگر بدنصیبی ہیں فرزند خلف تھے۔ ایک پیر مرد بے پروا مستغنی المزاج تھے"۔

عرش صاحب دیوان تھے لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار اخبار "کارنامہ" کے نام سے نکلتا تھا اسی اخبار میں ستمبر سنہ ۱۸۷۴ء سے فروری سنہ ۱۸۷۵ء تک ضمیمے کے طور پر دیوان عرش کے چار صفحے ہر ہفتے میں نکلا کرتے تھے۔ دیوان کی تصحیح انکے شاگرد رشید شیخ محمد جان شاد لکھنوی سے متعلق تھی۔

دیوان عرش میں ۳۱۶ غزلیں، ایک واسوخت، اور ایک فارسی قصیدہ حمد میں ہے۔ اشعار کی مجموعی تعداد تقریباً چار ہزار ہے۔ اکثر زمینوں میں دو دو تین تین غزلیں کہی ہیں۔

عرش اپنے اُستاد کی تقلید میں لفظوں اور محاوروں کی صحت، اور نحوی اور عروضی قاعدوں کی پابندی کا مضمون کی لطافت اور بیان کی شعریت سے بھی زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے انکا کلام بھی زیادہ تر بے اثر اور بے کیف ہے لیکن اُن کی زبان آج تک مستند سمجھی جاتی ہے۔ اور انکا دیوان لفظوں اور محاوروں کا بامحل صرف سیکھنے کے لئے ایک مستند لغت کا کام دے سکتا ہے۔

حضرت شاد نے دیوان عرش کے خاتمے میں لکھا ہے:-

"جناب میر کلو صاحب عرش فرزند جناب میر تقی میر نے اپنے کلام کو جملہ عیوب سے پاک رکھا اور جس لفظ کو خلاف محاورۂ فصحائے حال دیکھا اُس کو ترک کیا ...... عروض میں سوائے حرف الف مضاعفی، یائے ہندی کا گرنا معیوب جانا۔ اور قوافی میں خیالوں اور نوالوں وانگاروں وبہاروں وجانوں وپروانوں کا لانا عیب تصور کیا۔ کہیں قافیۂ ہندی کے ساتھ فارسی کا لفظ مستعمل نہ رکھا۔ ارباب نظر دیکھیں گے کہ کلام حضرت عرش عیوب سے مبرا، الفاظ ثقیل سے خالی ہے۔ حسن بندش سے پیدا ہے کہ فکر عالی ہے"۔

حضرت عرش کو اپنی زبان کے مستند ہونے کا خود بھی دعویٰ تھا، فرماتے ہیں:۔

ہم ہیں اُردوئے معلیٰ کے زباں داں اے عرش مستند ہے جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں

عرش کے ایک شعر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے میر کے طرز کی تقلید کی بہت کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ کہتے ہیں۔

لاکھ تقلید کیجیے اے عرش پھر کب انداز میر آتا ہے

عرش کے دیوان سے منتخب کرکے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:۔

کون آئیگا جو تو بے سروساماں ہوگا ورنہ ہوگا تو نہ اندیشہ درباں ہوگا

مر گئے پر سوز دل سے دوست دشمن ہوگیا جب گری بجلی چراغ قبر روشن ہوگیا

اچھا ہوا شباب کا عالم گزر گیا اک جن چڑھا ہوا تھا کہ سر سے اُتر گیا

جو زیر پائے گدا اُڑتے ہیں کاسہ سر کہیں کرتی ہیں شاہوں کی ہڈیاں فریاد

دل ماتم حسین سے اے عرش داغ ہے ہے مُہر مغفرت مری فرد حساب پر

کیا بلا آئی ہے ساقی خانۂ خمار پر ہے جو خمیازہ کا عالم روزن دیوار پر

ہے مرا تار نفس تار قفس رشتہ برپا ہوں گرفتار قفس

زندگی سے قید میں بھی ہوں سبک گاہ بار دام گہ بار قفس

موسم گل میں نہیں عزت و شان اغطا کون اس فصل میں سنتا ہے بیان اغطا

ہم نام پہ مرمٹے یہاں تک باقی نہیں قبر کا نشاں تک

کس کو نہیں گردش زمانہ چکر میں یہاں ہیں آسماں تک

مجھ سے بیکس کا دادخواہ ہے کون خون ناحق کا انتقام نہیں

عرش کے آگے ہے خدا کا نام عرش کس جا علیؑ کا نام نہیں

عالم شب وصال کا میں کیا بیاں کروں ہو بادشاہ کوئی گدا جیسے خواب میں

نہ گریباں چھٹے نہ دامن دشت جب تلک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں

آتش حسن جب بھڑکتی ہے کوہ مانند کاہ جلتے ہیں

امید مغفرت ہے اک تری پروردگاری سے دعا کا مانگنا بھی چھٹ گیا ہے شرمساری سے

لایا کوہ سے ہوا شا بہت ... خوا... ... [illegible]

تراہیسمار ایسا ناتواں ہے — کہ تن میں جان بھی بارگراں ہے
دمبدم ہو صدمۂ جانکاہ پر نکلے نہ دم — ہجر میں رہنا سلامت ہمت مردانہ ہے
آسیا کہتی ہے ہر صبح بآواز بلند — رزق سے پھرتا ہو رزاق وہن تپھر کے
بیاں کرتے ہیں جس سے حال اپنا — سناتا ہے وہ اپنی ہی کہانی

تذکرہ "شمیم سخن" سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کی ایک بیٹی بھی تھیں جو صاحب دیوان شاعرہ تھیں اور بیگم تخلص کرتی تھیں معلوم نہیں کہ مؤلف تذکرہ کا یہ بیان کہاں تک صحیح ہے۔

میر کی کسی اولاد کی تاریخ پیدائش تو معلوم نہیں لیکن قرینوں سے پتہ چلتا ہے کہ میر فیض علی فیض - میر عسکری عرش سے سن میں بڑے تھے - یہ قرینے حسب ذیل ہیں:-

۱- جن تذکروں میں فیض کا حال لکھا گیا ہے وہ اُن سے زیادہ قدیم ہیں جن میں عرش کا حال ملتا ہے۔

۲- عرش کے دیکھنے والے لکھنؤ میں اب بھی موجود ہیں لیکن فیض کا جاننے والا ابھی کوئی نہیں ہے۔

۳- فیض کی زبان میں قدامت اور عرش کی زبان میں صفائی زیادہ ہے۔

۴- عرش کا ناسخ سے اصلاح لینا ظاہر کرتا ہے کہ اُن کو میر کی صحبت نصیب نہیں ہوئی - غالباً اُن کے بچپن ہی میں حضرت میر کا انتقال ہو گیا تھا۔

بہر حال اتنا یقینی ہے کہ میر کی اولاد میں عرش کا انتقال سب کے بعد ہوا - عرش خود لکھتے ہیں:-

تا زیست ہے نام روشن اے عرش — پھر گل ہے چراغ دودماں تک

مرے دم تک عرش روشن ہے چراغ دودماں — پھر نہیں کوئی جناب میر کی اولاد میں

ان شعروں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خود عرش نے یقیناً اور اُن کے بھائی بہنوں نے غالباً لاولد انتقال کیا۔

عرش کو افسوس تھا کہ اُنکے انتقال سے خاندان میر کا چراغ گل ہو جائے گا لیکن حقیقت میں میر کا نام اُنکی اولاد صلبی سے نہیں بلکہ اولاد معنوی سے روشن ہے اور رہتی دُنیا تک روشن رہیگا۔

سلطان محمد تغلق عادل شاہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

(مشیر احمد صاحب علوی بی۔اے، (علیگ)

باب ہفتم

ملک عزیز خمار کا حاکم مالوہ مقرر ہونا

ظل اللہ نے اپنے دورِ حکومت میں مساوات کا وہ دور شروع کیا جو قرونِ اولیٰ کے لئے وقف تھا۔ ہر وہ شخص جو کلمۂ لا الہ الا اللہ کہتا تھا وہ جملہ مناصب و مراتب کا اہل تصور کیا جاتا تھا۔ ظل اللہ نے اپنے عہدِ حکومت میں ابتدائی عشرہ کے چند سال دار الخلافت میں بسر کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ پرچہ گزرا کہ نگرکوٹ کا قلعہ فتح ہو گیا۔ فوراً درباری شاعر نے ایک طویل قصیدہ[1] پیش کیا اور انعامات حاصل کئے۔

---

[1]

چو بادشاہ جہانگیر عالم بالا — سوار خامہ سرو در زمین شد تنہا
زبانِ تیغ بخونِ حسود شد لب تر — دہانِ فتح بہ شکر جمال شہ گویا
ابو الربیع سلیمانِ عہد مستکفی — مدار شرع نبی شمع دودۂ خلفا
اگر حصار گشا ید بنام امام — دگر بہ مہینہ طراز بود کسان درآ
بساط بارگہت صد بطلسِ گردوں — غلام پایگہت چو بادشاہ خطا
سلاح دار سہیل و کلاہ دار قمر — سپاہ دار سپہر نگاہ دار خدا
بدان خدائے کہ ہر صبح از فیض قیت — نہاد بر سر این چرخ لاجوردی قبا
بجز جناب شہنشاہ بدر چاچی را

کشاد حصن نگرکوٹ را کہ نگین بود — شد زمانہ بتاریخ ادخلوفیہا
بہ تن متابع شرع محمد مرسل — بدل مطاوع امر و خلیفۂ دنیا
امام حق کہ شد او را محمد تغلق — بدل غلام بہ تن چاکر بجان مولا
ہزار سال بقا بادشاہ عالم را — ولیک ساعت آن سال جفت روز جزا
فروغ سایہ چتر سیاہ تو خورشید — فرود پایہ تخت بلند تو جوزا
سنان کشید عطارد کہ لے ملک سجدہ — زبان کشادہ بابا کہ بے زیادہ دعا
زدہ رحیق بہ دران شاہ میخواہم — کہ پیش بدنہ گردد ز آفتاب جدا
بحق حق کہ بتا شد ہیچ جا ملجا

۱۳۳۲ء میں ورنگل کے فتح ہونے کے بعد ہرہرا اور بکا جو پرتاب دیو حاکم ورنگل کی
خدمت میں موجود تھے مفرور ہو کر کنپلہ میں ظاہر ہوکر انھوں نے سکونت اختیار کرلی۔ راجہ کنپلہ
نے اُن بھائیوں کو وزیر اور خزینہ دار مقرر کیا۔ جب سلطان محمد تغلق نے کنپلہ کو فتح کیا تو یہ مفرورین
دوبارہ روپوش ہوگئے لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سلطان نے ہری ہر کو کنپلہ کا حاکم مقرر کیا
اُس نے دریائے تنگ بھدرا کے جنوبی ساحل پر ایک جدید شہر وجیانگر کے نام سے آباد کیا
اور کنپلہ کے بجائے اس نوآباد شہر کو اپنا پائے تخت بنایا جب سلطان کو دکن میں نصرت خاں کے
باغی ہونے کی اطلاع ملی اور ظفر شاہ کے برادر زادہ علی شاہ کے گلبرگہ میں باغی ہونے کی اطلاع موصول
ہوئی تو سلطان نے ان فسادات کے انسداد کے لئے اپنے اُستاد قتلغ خاں حاکم دیوگیر کو اس مہم
پر نامزد کیا۔ قتلغ خاں نے بیدر کا محاصرہ کیا اور نصرت خاں اور علی شاہ کو بہ لطائف الحیل خدمت
سلطان میں پیش کردیا۔ اسی عرصہ میں سلطان نے گورنروں کا تغیر و تبدل مناسب سمجھا۔ قتلغ خاں کو
دار الخلافت میں بھیجا اور نظام الدین عالم الملک کو حاکم دیوگیر اور عزیز خمار (کلال) کو عزیز الملک
کے خطاب سے سرفراز کرکے مالوہ کا حاکم مقرر کیا[1]۔

پاک نہاد سلطان نے اصلاحات کے جاری کرنے کی کوشش کی لیکن قتلغ خاں اور بہت سے
ذی مرتبت امرا بھی ایک سنگین سازش سلطان کے خلاف کرنے پر تیار ہوگئے۔ اسی زمانہ میں
سلطان کو معزول کرنے اور شہزادہ فیروز کو تخت نشین کرنے کی بھی ناکام کوشش کی گئی۔ وجہ یہ
تھی کہ بدعات شیعہ بہت رائج ہوگئی تھیں اُنکے استیصال کے لئے سلطان نے سخت از سخت
فرامین نافذ کئے۔ جو اکثر طبائع پر گراں گزرے۔ اس لئے کہ سب برگشتہ اور پریشاں افراد
نے ایک منظم سازش کرنا چاہی۔ اسی زمانہ میں ایک واقعہ یہ بھی ہوا کہ سلطان نے حضرت خواجہ
نصیر الدین اودھی چراغ دہلوی کو اپنی مصاحبت کے لئے مجبور کیا حضرت چراغ دہلوی نے
پہلے تو مصلحتاً انکار کیا لیکن بعدہ منظور کرلیا۔ اس واقعہ سے بھی تنگ نظر علما نے سازش میں
حصہ لیا۔ ان سب نے قتلغ خاں کو ایک عرضداشت بھیجی جو خلافت عباسیہ کی سلطنت سے

---

[1] فرشتہ، جلد اول، صفحہ ۱۰۲، نولکشور پریس لکھنؤ، کتبخانہ حضرت قبلہ امام الحاج مولوی امیر احمد صاحب علوی بی اے
پی سی ایس۔ کاکوروی، امیر محل لکھنؤ۔

خوش نہ تھا۔ سازش زیادہ منظم ہوئی لیکن شہنشاہ وقت کا اقبال عروج پر تھا۔ سازش کا راز افشا ہو گیا اور یہ سنگین سازش کامیاب نہ ہو سکی۔ سلطان نے قتلغ خاں کو معاً دار الخلافت میں واپس بلا کر کارِ خاص پر متعین کر دیا اور اُسکے ماتحت حکام کو دیگر مقامات پر تبدیل کر دیا۔ سلطان نے مروّت و اخلاق کی وجہ سے علانیہ اپنے اُستاد قتلغ خاں کو کسی قسم کی کوئی سزا نہیں دی۔

"شرائط تعظیم قتلغ خاں کہ پیش او در عنفوان شباب چیزے خوانده بود چناں
محافظت نمودے و مبالغت کردے کہ ہیچ شاگردے را از ہیچ اُستادے میسر نہ شود"[۱]

سنہ ۷۴۴ھ میں سلطان نے قتلغ خاں کی واپسی کے بعد ہی اُسکے بھائی نظام الدین کو بھڑوچ سے دولت آباد کا حاکم مقرر کیا اور مفسدانِ فتنہ پرداز کو خوب سزائیں دیں جن کا مرثیہ برنی نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے۔

سلطان نے سنہ ۷۴۹ھ میں قوام الملک (کنّو) نومسلم کو جو اس سے قبل ملتان کا گورنر رہ چکا تھا بدایوں کی سرکار سے طلب کر کے خانجہاں کا خطاب عطا کیا اور گجرات کی حکومت اُسکو تفویض کی۔ عرصہ سے بہت کلال (خمّار) شراب فروش مسلمان ہو گئے تھے۔ اُن میں سے ایک شخص عزیز الدین کی سلطان نے مخصوص طور سے تربیت کی تھی۔ اسکو ملک عزیز الدین کے لقب سے سرفراز کر کے عزیز الملک کا خطاب دے کر دھار کی حکومت تفویض کی اور مجد الملک تھانیسری کو دولت آباد کا عامل مقرر کیا۔ اور عماد الملک کو دولت آباد کے مضافات۔ اور مخلص الملک یوسف بغرا خوربگی مرہٹ کی ولایت میں مقرر کیے گئے۔

عامل بنا کر دہلی سے بھیجا۔ عزیز الملک کے تقرر پر برنی نے ایک بہت طویل داستان مرتب کی ہے اور اپنی مایوسیوں و ناکامیوں کا رونا رویا ہے۔ عزیز الملک کے تقرر پر برنی نے سلطان کو کمینہ پرست اور سفلہ پرور کا خطاب عطا کیا۔ جب عزیز الملک دھار پہونچا تو اُس نے امیران بندہ کو بے حد پریشان کیا۔ سلطان کو اطلاعات برابر ملتی رہتی تھیں تو ایک مرتبہ سلطان نے کہا

"عزیز طریقہ حرب نہ داند عجب نباشد کہ از دست آں باغیاں تلف شود"[۲]

---

[۱] فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ
[۲] " " " " "

عزیز الملک کے متعلق ایک باکمال مورخ کا تبصرہ غور طلب ہے ۔

"درآخراں سال کہ قتلغ خاں را از دیوگیر در دہلی آوردند، سلطان محمد عزیز خمار (کلال) کم اصل را ولایت دھار[1] و تمامی مالوہ بدو تفویض کرد و چند لاک تنکہ از جہت آنکہ کرا او با قوت و شوکت بود در حق او مرحمت شد و در وقت رواں شدن آں بدبخت بے سعادت در پرداخت مصالح آں ولایت کہ بس طویل و عریض است سلطان او را ہر چیزے بدراہ میکرد و می فرمود و دراں معرض از زبان سلطان بیروں آمد کہ اے عزیز می بینی کہ ہر طرفے چہ گونہ بلغاک پیدا می آید و فتنہ ہا می زاید و من می شنوم کہ ہر کہ بلغاک می کند از قوت امیر صدگاں می کشد و امیر صدگاں از برائے غصب و غارت با ما او می شوند آنگاہ بلغاکی را بلغاک کردہ میسر می گردد، و تو دانی و امیر صدگاں دھار ہر کرا امیاں ایشاں شریر و فتنہ انگیز بینی چنانچہ دانی و توانی دفع کنی با چنانچہ در کارہائے آں عرصہ بدراہ شدہ بفراغ دل آں را بپرداخت توانی رسید آں خاکسار بچہ از دہلی بہ تمثیت تمام رواں شد بہ امرائے حند کہ بہ دردار آمدہ بودند و مقرب کار دار او شدہ بودند در دھار رفت و بجائے اشراف مادر زاد در پرداخت مصالح دھار مشغول شد و روزے ان بد اصل زاینہ زادہ را در خاطر افتاد و بقیاس مساد داند از امیران صدہ معارف قسم دھار را گیرانید[2]"

---

[1] دھار مالوہ کا قدیم شہر اور موجودہ ریاست دھار کا صدر مقام ہے۔ یہاں بہت سے پیران عظام آسودہ خاک ہیں اسی سے اس مقام کو پیران دھار کہتے ہیں۔ ہمارے سلسلہ قلندریہ قادریہ کے سرگروہ حضرت سید نجم الدین غوث الدہر جن کے شجر معرفت کی شاخیں جونپور، اعظم گڈھ، الہ آباد، لہرپور وغیرہ میں موجود ہیں۔ مدتوں کی سیر و سیاحت کے بعد آپ نے قلعہ شاہی سے پانچ میل جانب شمال قصبہ پانجر کے قریب ایک خوش سواد تالاب کے کنارے پر سکونت اختیار کی۔ صاحب نے آپکی وفات کا سن ۸۳۳ھ تحریر کیا ہے۔ آپ کی ریاضیات کی مہک تمام ہندوستان میں پھیلی اور دور دراز سے فقراس چشمۂ معرفت سے فیضیاب ہوئے۔ خاکسار کو بھی اس صاحب فضل و عطا کے سلسلہ میں منسلک ہونے کا شرف حاصل ہے۔ گر چہ دلم و لے نسبتے است بزرگ۔

[2] فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی - ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

امیرانِ صدہ ہمیشہ سرکشی پر آمادہ رہتے تھے لیکن سلطان کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ عزیز الملک
اس مفید اور باکار ترکوں کی جماعت کو آسانی سے ضایع کر دے لیکن عزیز الملک نے ایک دعوت کے
بہانہ سے امیرانِ صدہ کے ستر ممتاز سرداروں کو قتل کر دیا۔ عزیز کے اس غیر ذمہ دارانہ رویہ
سے مرہٹ گجرات اور دولت آباد کے امیرانِ صدہ میں بے چینی کے آثار رونما ہو گئے۔ عزیز کی
ناتجربہ کاری کا علم سلطان کو تھا لیکن اسکی گذشتہ وفاشعاریوں اور خدمت گزاریوں کا صلہ یہی
ہو سکتا تھا کہ اسکو مالوہ کی خدمت پر فائز کیا جائے۔ اس قتل عام نے جملہ باغیوں کو میدان میں
آنے کا موقعہ دیا اور یہ آگ بیک وقت گجرات تک منتقل ہو گئی جسکا بجھانا آسان نہ تھا۔ خانجہاں
گجرات سے قیمتی تحائف و خزانہ شاہی گھوڑے وغیرہ لیکر دہلی جا رہا تھا اسکی ہمراہی میں بہت سے سوداگر
بھی تھے کہ ناگہاں بڑودہ کے امیرانِ صدہ نے علانیہ بغاوت کا اعلان کر دیا اور رسالہ پر شبخون مارا۔
خزانہ شاہی لوٹ لیا۔ سوداگروں کا مال چھین لیا۔ ظاہر ہے اس غیبی امداد سے امیرانِ صدہ کے
حوصلے بلند ہو گئے اور معاً کنبھات پر قابض ہو کر گجرات میں شورش پھیلا دی۔ یہ خبر ۷۴۵ھ ہجری کے
ماہ رمضان میں دار الخلافت پہونچی۔ سلطان شیخ معتبر الدین (پسر علاء الدین اجودھنی) کو ایک ہزار
منتخب سواروں کے ساتھ گجرات روانہ کیا اور رمضان المبارک کی سولھویں کو تراویح میں کلام پاک
ختم کر کے گجرات کی جانب روانہ ہو گیا۔ اسی عرصہ میں عزیز الملک کا عریضہ ملا۔ کہ وہ بھی گجرات
امیرانِ صدہ کی گوشمالی کے لئے روانہ ہو گیا۔ سلطان نے اسکی ناتجربہ کاری پر افسوس کیا۔
لیکن جب تک سلطان جواب دیتا۔ عزیز الملک دھار سے گجرات پہونچا اور باغیوں نے موقع تلاش
کر کے دعوت کا بدلہ لے لیا۔ اور عزیز الملک کو قتل کر دیا۔ سلطان نہروالہ میں مقیم ہوا جہاں خانجہاں
اسکا منتظر تھا۔ سلطان نے شیخ معتبر الدین کو باغیوں کے استیصال پر مامور کیا اور وہ بہ نفس نفیس
کنبھات کی جانب چل کھڑا ہوا۔ اقبال سلطانی سے معتبر الدین نے باغیوں کو شکست دی۔ کچھ تو
گرفتار ہوئے اور بقیہ مفرور ہو کر دیوگیر چلے گئے اور وہاں ایک جدید فساد کا سنگ بنیاد رکھا۔
دریائے نربدا کے ساحل پر خان جہاں نے بہت سے باغیوں کو قتل کر دیا لیکن پھر بھی ایک کثیر
تعداد دیوگیر جا کر امیرانِ صدہ کو بغاوت پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور دھار کے خون ناحق
کا بدلہ لینے کے لئے ایک منظم و خوفناک سازش کی بنیاد رکھی۔ گجرات میں بظاہر امن و امان ہو گیا

لیکن دولت آباد کی حالت خطرناک ہوگئی۔ باغیوں نے حاکم دولت آباد محمد الدین تھانیسری کو قتل کیا۔ سلطان نے قتلغ خاں کے بھائی نظام الملک امیر حسین عالی بھروچ کو دیوگر کا گورنر مقرر کیا۔ لیکن نظام الملک بغاوت کو فرو کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ باغیوں نے اُسکو گرفتار کر کے نظربند کر دیا لیکن وہ بعد کو رہا ہو کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عارضی سکون بھی ہوگیا۔ سلطان نے عماد الملک کو گلبرگہ کی جانب روانہ کیا۔ ملک قبول اور عماد الملک نے زیر حالات اور بھروچ کے منتخب امیران صدہ کو باغیوں کے تعاقب میں روانہ کیا۔ عماد الملک نے دریائے نربدا تک اُنکا تعاقب کیا۔ سلطان کو چونکہ یہ علم ہو چکا تھا کہ بغاوت و سرکشی کا اصلی سبب یہی امیران صدہ ہیں۔ اس لئے سلطان نے ملک علی سرجاندار اور ملک احمد لاچین کو عالم الملک سپہ سالار دکن کے پاس یہ فرمان لیکر روانہ کیا کہ کہ ایک ہزار پانچ سو سوار اور مشہور و معروف امیران صدہ کو ان ایلچیوں کی ہمراہی میں بھروچ روانہ کرو۔ عالم الملک نے رائچور، مدگل، گلبرگہ، بیجاپور اور گنجوتی کے امیران صدہ کو نہایت کوشش سے دولت آباد کے قلعہ میں جمع کیا اور اُن کو ملک احمد لاچین کی معیت میں خدمت سلطانی میں بھیجا۔ جب وہ مانک دول کے مقام پر پہونچے تھے تو سلطان کے خوف سے لرزاں و ترساں ہو کر سب نے مشورہ کیا اور علم بغاوت بلند کر دیا۔ ملک احمد لاچین نے مخالفت کی امیران صدہ نے اُسکو قتل کر دیا اور اُسکا مال اسباب لوٹ لیا اور دولت آباد واپس آکر قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور مال غنیمت آپس میں تقسیم کر کے اسمٰعیل فخ کو اپنا جدید بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اور اُسکو ناصر الدین شاہ کا خطاب دیکر سر پر چتر لگایا اور حسن گانگوئی کو

لہ سلطنت بہمینہ کا پہلا بادشاہ یہی حسن گانگوئی ہوا۔ حسن گانگوئی کے حسب و نسب کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ تحفۃ السلاطین، سراج التاریخ، بہمنی نامہ کنی میں حسن کو بہمنی شاہ ایرانی نسل سے بتایا اور شجرہ بھی لکھا ہے۔ فرشتہ نے اسکے بہمنی کہلانے کے متعلق ایک برہمن کی کہانی تصنیف کی ہے معلوم نہیں کہ یہ کہانی محض فرضی ہو یا دوسرے مورخین نے خوشامد کی راہ سے اس کا سلسلہ نسب شاہ ایران سے ملا دیا ہے

حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رضی اللہ عنہ نے تو کھلے لفظوں میں علاء الدین کو دکن کے تاج شاہی کی بشارت دیدی تھی۔ چنانچہ حضرت کی خانقاہ شریف میں ایک دفعہ شہزادہ محمد تغلق فقیرانہ لباس میں لنگر کا کھانا کھانے آیا اور جب شہزادہ کھانا کھا کر خانقاہ شریف سے جانے لگا تو اتفاق سے اسی وقت حسن گانگوئی داخل ہوا۔ حضور محبوب الٰہی نے فرمایا کہ "سلطانے رفت و سلطانے آمد" "ایک سلطان گیا اور دوسرا سلطان آیا۔" (صفحہ ۹ سم ملاحظہ ہو)

ظفر خاں کے خطاب سے سرفراز کیا جس نے بھیرن رائے حاکم گلبرگہ کو جو ہوا خواہ سلطانی تھا قتل کر کے گلبرگہ پر تسلط جما لیا۔ گجرات اور بڑودہ کے امیران صدہ نے بھی آخر اس باغی کے پرچم میں پناہ گزیں ہوئے۔ اب قوت بڑھنا شروع ہوئی۔ اس جدید طاقت سے دکن میں نئی دلچسپیاں او پیچیدگیاں پیدا ہونا شروع ہوئیں اور اس طاقت نے ایک فتنۂ عظیم کی شکل اختیار کر لی۔ جب سلطان کو بھروچ میں اسکی اطلاع ہوئی تو وہ یلغار کرتا ہوا دولت آباد پہونچا اور ناصر الدین کو مقابلہ کے لئے نکلا تھا شکست فاش دی۔ اب امیران صدہ کی قلعبندی مناسب سمجھی۔ چنانچہ اسمٰعیل فتح دھارا گر کے قلعے میں بند ہو گیا اور بقیہ امیران صدہ بھی اپنی اپنی جاگیروں کو چلے گئے اور حسن گلبرگہ کی طرف روانہ ہوا۔ اسی عرصہ میں گجرات میں نائب السلطان کے قتل کی اطلاع ملی تو سلطان قوام الدین اور دیگر امرا ء کبار کو محاصرہ پر نامزد کر کے گجرات کی جانب روانہ ہوا۔[۵۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۴) حضرت نے خادم کو بھیجکر حسن کو اپنے پاس بلایا اور نہایت شفقت سے اپنی خاص روٹی کا ٹکڑا اسکو دے کر فرمایا کہ یہ شاہی کا تاج ہے حضرت سلطان المشائخ کی بشارت پر اسکو دلی یقین ہو گیا کہ ضرور مجھ کو سلطنت ملیگی۔

۱۳۴۷ء میں حسن گانگوئی کی تاجپوشی ہوئی، اور اُسکے نام کا سکہ و خطبہ جاری ہوا حسن نے علاء الدین حسن گانگوئی بہمنی" کا لقب اختیار کیا علاء الدین حسن کے سر پر جو چھتر رکھا گیا اسکا رنگ سیاہ تھا اور تبرک کے خیال سے اس پر خلفائے عباسیہ کا نشان بنایا گیا تھا۔ گلبرگہ میں پانی اور صفائی کی بہت کمی تھی لیکن علاء الدین حسن اس مقام کو مسعود و بابرکت خیال کرتا تھا۔ اسی لئے اس نے یہاں سے پایۂ تخت کو تبدیل نہیں کیا اور اسکا نام گلبرگہ کے بدلے حسن آباد کر دیا۔

علاء الدین حسن جیسا بہادر تھا ویسا ہی مدبر بھی تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی سلطنت کا حلقہ وسیع کرنا شروع کیا اور دکن کے جس قدر ممالک تھے سب پر قبضہ کر لیا۔

تلنگانہ کا راجہ عرصہ سے سرکش ہو رہا تھا لیکن عماد الملک ترکمان کے مقابلہ میں پندرہ ہزار فوج سے حسن کی مدد کر چکا تھا اس لئے وہ اسکی گستاخی کو ٹال جاتا تھا۔ آخر علاء الدین حسن کے حسن سلوک سے نادم ہو کر راجہ تلنگ نے اطاعت قبول کر لی اور دہلی کی حکومت کے زمانہ میں جو خراج دیا کرتا تھا حسن کو دینے لگا۔

۷۵۸ھ میں حسن نے پچاس ہزار فوج مالوہ پر حملہ کرنے کے لئے دولت آباد سے روانہ کی۔ اسی درمیان میں اہل گجرات نے حسن کو بلایا۔ اس لئے اس نے بجائے مالوہ کے گجرات کا قصد کیا۔ اپنے بیٹے محمد کو آگے روانہ کیا۔ پیچھے خود بھی چلا، قصبۂ "نوساری" میں پہونچ کر شہزادہ محمد نے کثرت سے شکار کے جانور دیکھے اس لئے خود بھی وہاں ٹھہر گیا اور بادشاہ کو بھی وہیں بلا لیا۔ یہاں سلطان ہیضہ میں مبتلا ہو گیا۔ بیماری نے طول کھینچا۔ چھ مہینے تک بیمار رہ کر ۱ ربیع الاول ۷۵۹ھ مطابق ۱۰ فروری ۱۳۵۸ء کو ۶۷ سال کی عمر میں مر گیا۔ ۱۱ سال ۲ مہینے سات روز سلطنت کی

۵۲ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۰۳ ۔ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی صفحہ ۱۶ ۔ ۱۵ ۔ ۵۱۴ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔

سلطان کے گجرات جاتے ہی امیران صدہ کو کافی موقع مل گیا حسن گانگوئی ایک جرار لشکر لیکر بیدر کی جانب روانہ ہوا۔ یہاں عماد الملک لشکر سلطانی کے ساتھ مقیم تھا۔ تلنگانہ کے راجہ نے بھی حسن کی امداد کی اور بیدر کے قرب و جوار میں بہت سخت کشت و خون کی نوبت آئی اور عماد الملک بھی اس جنگ میں کام آیا۔ سارا لشکر منتشر ہو گیا۔ اس فتح کے بعد حسن ناصر الدین شاہ کی امداد کے لئے روانہ ہوا۔ سلطان کی جانب سے جو امرا محاصرہ کئے ہوئے تھے حسن کے خوف سے دہلی اور گجرات چلے گئے اور حسن اطمینان سے شہر میں داخل ہوا۔ حاکم مالوہ بھی اس اجتماع جدید میں شریک ہوا اور اسمٰعیل فتح نے عقلمندی سے کام لیکر خود ہی سلطنت سے دست برداری کی اور ناصر الدین کی صلاح کے مطابق جملہ امیران صدہ نے حسن کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا اور ۷۴۸ھ میں مبارک شاہ خلجی کی دولت آباد کی مسجد میں حسن کے سر پر تاج شاہی رکھا گیا اور تیمناً و تبرکاً چتر سیاہ (خلفائے عباسیہ کا علم) کو لوازم شاہی میں داخل کیا۔ ملک دکن میں برائے نام اسکا خطبہ پڑھا گیا۔ حسن نے گلبرگہ کو اپنا پایۂ تخت مقرر کیا اور اسکا نام حسن آباد تجویز ہوا جو سلطنت بہمنی کے بعد رائج نہ ہو سکا۔ اس وقت پاک نہاد سلطان گجرات کی مہم پر تھا۔ دکن کے وقائع نگار نے یہ خبر وحشت اثر لکھی لیکن سلطان نے تعجب ہے (خدا معلوم کیوں) گجرات و کرنال کی تسخیر کو بدستور قائم رکھا۔ عزیز الملک کی غلطی کا نتیجہ بہمنی سلطنت کے قیام کی شکل میں نکلا۔ سلطان نے اسکا احساس کیا لیکن تاریخ کے صفحات خاموش ہیں کہ سلطان نے اس موقعہ پر حسن کو شکست کیوں نہ دی۔

شہنشاہ گجرات میں مقیم ہوا اور چند دنوں تک اس امر کا انتظار کیا کہ شورش کے آثار مٹ جائیں۔ جب اسکو یہ متیقن ہو گیا کہ بقیۃ السیف امیران صدہ نے دولت آباد کو مرکزی مقام بنا کر شورش کی ہے اور اسمٰعیل فتح کو نصیر الدین کا خطاب دیکر بادشاہ بنایا ہے اور امیران صدہ بغاوت پر تیار ہیں۔ شہنشاہ معاً بجلی کی طرح گجرات سے دولت آباد آ گیا اسکے اقبال سے یہ بے چینی خود بخود فرو ہو گئی لیکن جو چنگاریاں خس و خاشاک کے دامن میں پوشیدہ ہو گئی تھیں کسی کے دبائے نہ دب سکتی تھیں۔ سلطان دولت آباد کے باغیوں کے استیصال میں مصروف تھا تو دفعتاً گجرات میں امیران صدہ نے بغاوت شروع کی۔ اور سازباز کرکے ملکی طغی نے نہروالہ میں ملک مظفر نائب شیخ معز الدین حاکم گجرات کو قتل کر دیا۔ سلطان نے عنان خیال گجرات کی طرف

موڑی - اب حسن گانگو کو موقع مل گیا - اور تلنگانہ و مالوہ کے حکام کی امداد سے وہ بادشاہ بن گیا

"دریں اثنا از دہلی خبر رسید کہ طغی نام غلامے جماعتے از اوباش و اجلاف بر خود جمع آوردہ دہراہ مخالفت و طغیاں سپردہ بعزم گجرات بتعجیل ہر چہ تمام تر روانہ شدہ است سلطان محمد تغلق شاہ چون این خبر شنید متوجہ گجرات شد"[1]

سلطان نے دیوگیر کی تسخیر جہاں دیدہ امرا کو تفویض کی اور خود گجرات پہونچا باغیوں کو شکست دی لیکن ملک طغی بھڑوچ سے عساکر سلطانی کے خوف سے اساول (احمد آباد) بھاگ گیا - شہنشاہ نے سایہ کی طرح اسکا ساتھ نہ چھوڑا - اتفاق سے اس سے اس قدر تیز بارش ہوئی کہ سلطان کو مجبوراً احمد آباد میں خیمہ زن ہونا پڑا اسی اثنا میں ملک طغی نہروالہ میں ایک لشکر جرار لیکر لڑنے کے لئے تیار ہو گیا مگر اسکو شکست فاش نصیب ہوئی وہ اپنی جان کی خیر مناتا ہوا ٹھٹہ مفرور ہو کر پوشیدہ ہو گیا سلطان طغی کے فرار ہو جانے کے بعد نہروالہ پہونچا اور حوض سہلنگ کے چبوترے پر قیام کر کے گجرات کے انتظام میں مصروف ہوا اور اقبال سلطانی سے گجرات میں مکمل امن کی صورت رونما ہو گئی -

"سلطان در نہروالہ آمدہ در چبوترہ حوض سہلنگ نزول فرمودہ در پرداخت مصالح ولایت گجرات مشغول شد و مقدمان - اگاں و مہنتگان گجرات در بندگی درگاہ دری آمدند و خدمتہامی آوردند و جامہ و انعام می یافتند چنانکہ مدت نزدیک قلق فراہم آمدہ از تشتت و از تفرق بدست رعایا از غصب و غارت طغاۃ خلاص شد"[2]

سلطان نے ایک تازہ دم لشکر دارالخلافت سے منگوایا لیکن جب تک لشکر دولت آباد پہونچتا - علاءالدین کے قدم زیادہ مضبوط ہوتے گئے - اس لئے سلطان نے مزید لشکر کو دولت آباد نہ بھیجا بلکہ گجرات کی مہم سے انفراغ کلی حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور جوناگڑھ کو فتح کرنے کے ارادہ لشکر کو گجرات بھیج دیا تاکہ اطمینان سے حسن گنگو سے نبرد آزمائی کی جائے لیکن یہ راہتیں

---

[1] فرشتہ جلد اول - ذکر سلطان علاءالدین حسن گنگو - نولکشور پریس لکھنؤ -
[2] فیروز شاہی، ضیاءالدین برنی، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

علاء الدین کی اقبال مندی کی دلیلیں ثابت ہوئیں اور بجائے لشکرکشی کے اُسکو اپنا قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ قضا و قدر کے دفاتر میں دکن کی حکومت حسن گانگو کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی اور حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ نے محمد تغلق اور حسن کو بادشاہت کی بشارت دی تھی۔

اولوالعزم شہنشاہ کا اشہب اقبال اب آرام کا خواہاں تھا۔ اس ہمایوں بخت شہنشاہ کے عہد فیروزی میں دریائے سندھ کی شرقی جانب تک مسلمانوں کی وسیع اور بسیط سلطنت قائم تھی۔ یہ سلطنت اس قدر بڑھ گئی کہ کسی دوسرے بادشاہ کو بیک وقت نصیب نہ ہوئی۔ علاء الدین خلجی سکندر ثانی نے دیوگری تک حملہ کیا لیکن اقبال مند سلطان محمد تغلق کے عہد ہمایوں میں دہلی، آگرہ، زبت (تغلق پور) دولت آباد، ورنگل (سلطان پور) لکھنوتی، ست گاؤں (بنگال) تک اُسکے نام سکہ و خطبہ رائج تھا اُسکے نام کا خطبہ ہندوستان کے ۲۳ صوبوں میں پڑھا جاتا تھا۔ اس کے سلطنت بے حدود شمال میں لاہور دوار سمدر تک ساحل مالابار میں جنوب تک گجرات سیوستان رچھ ملتان تک مشرق میں اور جاالج نگر و اُڑیسہ) لکھنوتی تک مغرب میں تھے۔ اس قدر وسیع سلطنت سوائے سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کے کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کی جملہ طاقتیں اس باعظمت شہنشاہ کے مدمقابل نہ تھیں۔

باعظمت سلطان محمد تغلق کی سلطنت میں اسلامی حکومت ہندوستان میں ایسی وسیع تھی کہ اس سے پہلے یہ دن دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوا تھا لیکن اسکے عہد کے مختلف حصص میں جداگانہ سلطنتیں قائم ہونا شروع ہوئیں۔ وہ اکبر اور اورنگ زیب کے عہد تک دہلی کا جزو نہ بنائی جا سکیں۔

(باقی آئندہ)

نومبر کے رسالے مین باوجود شدید احتیاط کے اغلاط رہ گئے جنکا ہمین سخت افسوس ہے انہین سے چند ناظرین یون صحیح فرمالین۔ صفحہ ۳۶ سطر ۴ "عالم" غلط ہے۔ صحیح "عام" سطر ۱۳ "اخفا کر دے" غلط ہے "کے عناصر لئے رہے" صحیح ہے صفحہ ۴۲ سطر ۹ مین "مقمون" غلط ہے۔ "مضمون" صحیح ہے۔

شاعر کی نگاہ میں

(جمیل مظہر کاظمی صاحب بی اے)

۱

حامد مجھے گرمیوں کی چھٹی میں اپنے گھر لے گئے - ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس کے اطراف میں جنگل، پہاڑ اور دریا غرض فطرت کے وہ تمام مناظر یکجا تھے جو ایک خشک سے خشک آدمی کو بھی بآسانی شاعر بنا سکتے ہیں - مگر میرے لئے سب سے دلچسپ چیز جو وہاں نظر آئی "ایک آدمی تھا" جسے لوگ دیوانہ کہتے تھے صرف اس جرم پر کہ اُس نے بہت سی ٹھیکریاں چن چن کر جمع کر رکھی تھیں جنہیں وہ اپنے زعم میں چاندی اور سونے کے سکے سمجھ رہا تھا - اسکی راتوں کا بیشتر حصہ اس خوف سے آنکھوں آنکھوں میں کٹ جاتا کہ کہیں چور آکر اُس کی اس لازوال دولت پر ڈاکہ نہ ڈالیں - بجز اس مخصوص اعتقاد کے اور کوئی آثار جنون اس میں نہ تھے - بلکہ جو لوگ اسے دن رات چھیڑا کرتے تھے اُنھیں وہ ایک ایسا مدلل جواب دیا کرتا تھا جو عام طور پر ایک ممسک سرمایہ دار ہی دے سکتا ہے - یعنی جب کوئی اس سے پوچھتا کہ تم انھیں خرچ کیوں نہیں کرتے تو وہ بگڑ کر جواب دیتا کہ "دولت خرچ کرنے کی چیز نہیں .... پھر بھی لوگ اُسے دیوانہ سمجھتے تھے - میں نے لوگوں کو سمجھایا کہ وہ خدا کے لئے اس مبارک غریب کو اُس سے چھین لینے کی کوشش نہ کریں - کیونکہ اسی ذریعہ سے اُسکو وہ آسودگی، وہ اطمینان، وہ سکون حاصل ہے جسکو ایک سرمایہ پرست اشرفیاں جمع کر کے حاصل کرتا ہے .... نظام عالم ایک مسلسل تلاش سکون سے قائم ہے - زاہد اسے سجدوں میں ڈھونڈھتا ہے - رند شراب کے پیالوں میں، شاعر حرف و معانی میں، اور مہاجن چاندی اور سونے کے انبار میں .... پھر بھی پانے کا جو حق ہے نہیں پا سکتا - خوش نصیب ہے وہ شخص جسے لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں کہ اس نے اس نایاب شے کو کس آسانی کے ساتھ پا لیا - اسے لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں اس لئے کہ وہ فریب خوردہ ہے اپنی سادگی کا - حالانکہ اس

دنیا میں کون ہے جو فریب کھائے بغیر جی سکتا ہے ہماری زندگی اور اُس کی ساری مسرتیں، ساری
خوشیاں اور ساری لذتیں بس اسی وقت تک ہیں جب تک کہ ہم فریب کھا سکتے ہوں۔ غم کیا ہے
زندگی کی وہ سخت ترین صبر آزما گھڑی جب آدمی فریب بھی نہ کھا سکتا ہو۔

لوگ اُسے دیوانہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ اس نے ایک ایسی جنس ناقص کو دولت کیوں سمجھ
رکھا ہے جسے وہ کسی طرح مصرف میں نہیں لا سکتا۔ حالانکہ مصرفیت کا سوال تو اس وقت پیدا
ہو سکتا ہے جب صرف کرنے کا خیال ہو یقیناً دولت کا کام ہے، ضروریات زندگی کو رفع کرتے
رہنا لیکن کیا اس دُنیا میں بہت سے لوگ ایسے نہیں ہیں جو دولت کو رفع حاجت کے لئے نہیں سمیٹتے
بلکہ "تسکین نظر" اور اطمینان قلب کے لئے پس اگر یہ شخص دیوانہ ہے تو اُس کے ساتھ دنیا کی وہ لاتعداد
ہستیاں بھی دیوانی ہیں جنھوں نے دولت کو منجمد کر رکھا ہے پتھر اور دھات کے ٹکروں میں فریب
دینے کے لئے یا فریب کھانے کے لئے .... حالانکہ سرمایہ کا وجود دنیا میں
اُسی وقت تک ہے جب تک کہ وہ بازاروں میں دوڑتا پھرے

یہ سنہرے اور روپہلے سکے کیوں جاذب نظر ہیں۔ انکی ساحرانہ کھنکھناہٹ کیوں بھلی
ہوتی ہے۔ انکی ایک نظر فریب جھلک انسان سے اسکی خودداریاں کیوں چھین لیتی ہے!۔
اس لئے کہ وہ مجبور ہے اپنی ضرورتوں سے۔ اور ضرورتیں کیا ہیں وہ پُرانا فریب جسے آدم
کی اولاد ابتدائے آفرینش سے کھاتی آرہی ہے اور ـــــ کھاتی رہیگی۔ کیونکہ اسی فریب
پیہم میں اسکی عبدیت کا راز مضمر ہے ـــــ اور میرے بھائی! یہ فریب مرنے کی چیز
ہے تم بھی کھایا کرو۔ کیونکہ اس کا کھانا تمہاری بقا کے لئے غذا کی طرح ناگزیر ہے ...."

۲

موسم بہار کی ایک رنگین صبح تھی اور میں عالم سکون میں لب ساحل خاموش بیٹھا تھا۔ طلوع
سحر کی جذبات آفریں کرنیں گنگا کے پانی میں آگ لگا رہی تھیں اور دریا کی مست لہریں ترنم صبح کا
وہ خاموش نغمہ گا رہی تھیں جسے صرف شاعر کے کان سُن سکتے ہیں۔ مجھے ساری فضا مطمئن نظر
آرہی تھی .... اس لئے کہ آج میرے دل میں بھی اطمینان تھا۔ میرا امتحان ختم ہو چکا
تھا، اور وہ بھی یونیورسٹی کا وہ آخری امتحان جسکے بعد طالب العلم اپنے زعم میں یہ سمجھتا ہے کہ میں نے

علمی زندگی کے سامنے مدارج طے کر لئے............ میرے دل و دماغ پر مستقبل کا ایک رنگین خواب اپنی ساری کیفیتوں کے ساتھ طاری تھا۔ خواب ہمیشہ شیریں ہوتا ہے مگر میں اس شیرینی کے ساتھ اُس ملی ہوئی تلخی کو بھی محسوس کر رہا تھا جسے ہر مسافر منزل پر پہونچنے کے بعد جستجو کی لذتوں کو وداع کرتے ہوئے محسوس کرتا ہے مگر چند لمحوں کے بعد منزل کی رنگینیوں میں اُلجھ کر بھول جاتا ہے، بھلا دیتا ہے۔ اور وہ بھلا دینے پر مجبور بھی ہے۔

میں غیر معمولی طور پر ذکی الحس ہونے کی وجہ سے اس لذتِ جستجو کو آسانی کے ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ تھا۔ حالانکہ میں دیکھ رہا تھا کہ آگے راستہ بند ہے۔

میں اپنے خیال کی گتھیوں میں اُلجھ رہا تھا اور دریا کی موجیں ساحل تک آ آکر پچھلے پاؤں لوٹ رہی تھیں............ میرے دل نے کہا............ کاش میں بھی اس آزادی کے ساتھ پیچھے کی طرف پلٹ سکتا............ مگر نہیں آدمی ضرورت سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے۔ اس لئے بعض اوقات اسکی ساری اُمنگیں سارے حوصلے اور سارے عزائم عقل کی بھول بھلیاں میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں............ اور میں گم ہو رہا تھا............ کہ اچانک میرے فکر کے متلاطم سمندر سے خیال کی ایک دوسری موج اُٹھی جس نے میری نگاہ کو متوجہ کیا۔ ساحل کی طرف جس کے کناروں کو دریا کے تھپیڑوں نے جابجا سے کاٹ دیا تھا شاید اس لئے کہ آگے بڑھنے کا راستہ نکلے اور جستجو کا دائرہ کچھ اور وسیع تر ہو جائے۔ اس نظارے نے میرے ارادہ میں ایک نئی روح پیدا کی۔ اور میں یہ کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا کہ اگر منزل پر پہونچ کر بھی مسافر کا ذوقِ سفر نہ ختم ہو تو وہ منزل کی کھچی ہوئی دیواروں کو بھی سامنے سے ہٹا کر آگے بڑھنے کی گنجائش پیدا کر سکتا ہے............ اور میرے بھائی! تم بھی پیدا کرو............ کیونکہ منزل دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ مگر وہاں جہاں پہونچ کر چلنے والے کی طاقت جواب دیدے اور وہ تھک کر بیٹھ جائے۔

قاآنی کی مضمون آفرینی اور رنگین بیانی

عبدالقوی صاحب فانی، ایم اے

قاآنی کی مضمون آفرین طبیعت میں ایک خاص بات یہ ہے کہ جب وہ کسی دقیق مسئلہ پر قلم اٹھاتا ہے تو باتوں باتوں ہی میں سادگی سے اس طرح ادا کرتا ہے گویا کچھ تھا ہی نہیں۔ ایک قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ مطلع ہے ؎

عاشق کی دنیا اور نور و ظلمت اُسکے نقطۂ نظر سے

کشودی زلف قیر آگیں جہاں را قیرواں کردی
نمودی چہر مہر آئیں زمیں را آسماں کردی

اس شعر میں شاعر دو متضاد حالتوں نور و ظلمت کو عشق کی روشنی میں دکھاتا ہے اور معشوق کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ جب تو نے اپنی سیاہ زلفیں کھول دیں اور اُن کے بکھرنے سے تیرا چہرہ چھپ گیا تو جہان بھر میں تاریکی چھا گئی اور عاشق کی نظر میں تو ساری دنیا اندھیر ہو گئی لیکن جب تو نے زلفوں کو ہٹا کر اپنا منور چہرہ دکھایا تو زمین کو آسمان بنا دیا یعنی زمین کو اسی طرح منور کر دیا جس طرح سورج آسمان کو منور کرتا ہے اور عاشق کی تو بالخصوص ساری دنیا روشن ہو گئی۔ مطلب یہ کہ اگر معشوق نظروں سے اوجھل ہے عاشق کے لئے دنیا اندھیر ہے اور اگر وہ سامنے ہے تو اُسکے لئے جہاں روشن ہے گویا معشوق ہی عاشق کی ساری دنیا ہے۔

ایک دوسرا شعر ہے۔

معشوق کی دلربائی اور خنجر آزمائی

بداں فتراک گیسو نرم نرمک پائے دل بستی
وزاں شمشیر ابرو اندک اندک قصد جاں کردی

اس شعر میں شاعر نے اپنے خاص دلکش انداز میں یہ دکھایا ہے کہ عاشق کیونکر معشوق کو اپنا دل دیدیتا ہے اور کس طرح معشوق کے ہاتھوں اُسکی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں معشوق کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اپنی زلفوں کے شکار بند میں تو نے کیسی آہستگی اور ملائمت سے عاشق کے مرغ دل کو شکار کر کے اسکے پاؤں باندھ دیئے کہ اس غریب کو خبر تک نہ ہوئی اور پھر اپنی خمدار بھوؤں کی تلوار سے کس طرح سہج سہج ہاتھ بڑھا کر اُسکے ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ یہاں نرم نرمک اور

اندک اندک کے الفاظ نے علی الترتیب معشوق کی دلربائی اور خنجر آزمائی کی صحیح تصویر پیش نظر کردی ہے۔ یہ مضمون آفرینی حسن خیال اور حسن بیان قابل داد ہے۔

پھر کہتا ہے

جور فلک۔ معشوق کے مظالم اور عاشق کی مظلومی

زبس نامہربانی با من اے آرام جاں کردی فلک را با ہمہ نامہربانی مہرباں کردی

یہ ایک شاعرانہ خیال ہے کہ دنیا کی ساری مصیبتیں آسمان کی گردش سے واقع ہوتی ہیں۔ اسی طرح عشق کی دنیا میں تمام بلاؤں کی ذمہ دار معشوق کی حرکتیں ہوتی ہیں اور چونکہ عاشق کی ساری دنیا صرف معشوق ہے۔ لہذا اگر عاشق کے حال پر معشوق کی نظر عنایت ہے تو وہ نہ تو جور فلک کی پروا کرتا ہے اور نہ دنیا و مافیہا کی۔ لیکن اگر معشوق کی نظریں پھری ہوئی ہیں تو وہ اس قدر انتہائی تکلیف محسوس کرتا ہے کہ نہ صرف جور فلک کو ہیچ بلکہ آسمان کو اپنے حال پر مقابلتہً مہربان سمجھتا ہے گویا وہ بھی اسکی بیکسی پر رحم کھا رہا ہے۔ چنانچہ شاعر اس شعر میں یہی کیفیت دکھاتا ہے اور کہتا ہے۔ اے راحت جان تو نے میرے اوپر اتنے مظالم کیے کہ آسمان بھی جو اپنے جور کے لئے مشہور ہے مجھ پر مہربان ہوگیا اور میری مظلومی پر ترس کھا رہا ہے۔

اس کے بعد کہتا ہے

مدارج محبت اور عاشق کی بے نشانی

نگارا دلبرا یارا دلآرا ما وفادارا خجل زیں نامہربانی کہ مارا بے نشاں کردی

شاعر نے اس شعر میں تو مضمون آفرینی اور معجز بیانی کا کمال ہی کر دیا ہے جس طرح قمری مہینہ کا ہلال بڑھتے بڑھتے چودھویں شب میں درجہ کمال کو پہونچکر بدر بنتا ہے۔ ننھا سا تخم رفتہ رفتہ بڑھ کر پودا ہوتا ہے اور پودے سے درخت بن کر بتدریج برگ و بار لاتا ہے۔ چھوٹا سا بچہ آہستہ آہستہ جسمانی اور دماغی نشو و نما کی تکمیل کرکے جوان بنتا ہے۔ اسی طرح عشق بھی بتدریج کمال کو پہونچتا ہے۔ ماہران مذہب عشق نے ان مدارج کمال کو چھ درجوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) استیناس۔ (۲) مودت۔ (۳) خلت۔ (۴) عشق۔ (۵) شہود۔ (۶) ولہ۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی خوبصورت چیز نظر پڑتی ہے تو اچھی معلوم ہوتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ اسے دیکھا کرے۔ یہ ابتدائی درجہ "استیناس" ہے۔ اور قاآنی یہاں معشوق کو "نگار" کہتا ہے یعنی خوبصورت۔ دوسرے درجہ میں جب عاشق کے دل میں معشوق کی صورت

بس باقی ہے تو عاشق یہ چاہتا ہے کہ اسکی کوئی بات معشوق کی مرضی کے خلاف نہ ہو، یہ درجہ "مودت" ہے - یہاں عاشق پیکر تسلیم و رضا بن جاتا ہے - اور قاآنی کی اصطلاح میں معشوق "دلبر" ہوتا ہے تیسرے درجہ میں بمصداق "دل را بدل رہیست" عاشق و معشوق میں یگانگت اس حد تک ترقی کر جاتی ہے کہ عاشق نہ صرف معشوق کا ہم خیال اور ہم مذاق ہو جاتا ہے بلکہ دونوں کی خواہش ایک ہو جاتی ہے - جو عاشق چاہتا ہے وہی معشوق چاہتا ہے - اور جو معشوق چاہتا ہے وہی عاشق کی خواہش ہوتی ہے - یہ درجہ "خلت" ہے - قاآنی یہاں معشوق کو "یار" کے لقب سے مخاطب کرتا ہے - چوتھے درجہ میں یہ شیفتگی یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ معشوق کے صرف خیال اور تذکرے سے عاشق کو سکون اور آرام دل حاصل ہوتا ہے - خود اسکے جذبات اور ارادے محبت کی اس بڑھتی ہوئی آگ میں جل کر فنا ہو جاتے ہیں ہجر و وصال کا امتیاز اٹھ جاتا ہے اور دونوں میں اسکو یکساں لذت حاصل ہوتی ہے یہ عشق کا درجہ ہے اور یہاں شاعر معشوق کو "دل آرام" کہتا ہے - پانچویں درجہ میں یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ ؎

رہتے ہو نگاہوں میں خیالوں میں دلوں میں — پھر اس پہ یہ کہتے ہو کہ ہم پردہ نشیں ہیں

معشوق کبھی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتا - اسکی خیالی تصویر عالم تصور میں ہر وقت پیش نظر رہتی ہے یہاں عاشق کو درجہ شہودی[۱] حاصل ہو جاتا ہے - قاآنی اس درجہ میں معشوق کو "وفادار"[۲] کے

---

[۱] تصوف میں توحید کی دو بڑی اہم قسمیں ہیں - ایک توحید شہودی اور دوسری توحید وجودی - اوّل الذکر یہ ہے کہ سالک کی دید ایک ہوتی ہے یعنی وہ بجز ایک ذات (الٰہی) کے کسی کو موجود حقیقی نہیں سمجھتا - اسی ایک کو جانتا ہے اور اسی ایک کو دیکھتا ہے - یقین کی تین قسموں میں سے دوسری قسم عین الیقین سے متعلق ہے - توحید وجودی یہ ہے کہ ایک کو موجود جاننا اور اسکے ماسوا کو نیست یا معدوم سمجھنا یعنی ماسوائے ذات الٰہی کی نفی کرنا - یقین کی پہلی قسم علم الیقین کے متعلق ہے - توحید وجودی کا سبب غلبۂ محبت محبوب ہے جس نے ماسوائے محبوب کو نظروں سے چھپا دیا ہے اور جب بجز ذات محبوب سالک کو کچھ نظر ہی نہیں آتا ہے وہ محبوب کے علاوہ کسی وجود کو موجود نہیں جانتا ہے - اسکا تعلق غلبۂ حال سے ہے جس میں سالک اپنے کو اور ماسوائے حق کو یعنی حق کے علاوہ سب کو نیست سمجھتا ہے اور صرف ذات حق کو موجود جانتا ہے - نعرۂ انا الحق (میں خدا ہوں) کا یہی مفہوم تھا کہ میں نیست ہوں اور موجود فقط حق ہے یعنی بجز ذات حق کے کوئی موجود نہیں ہے -
(مکتوبات امام ربانی، صفحہ ۴۱ - ۵۷، جلد اوّل صفحہ ۱۱ جلد ثانی - مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ -)
(اندر نظر کمّل ارباب فہوم ۔ خالق مشہود و خلائق موہوم ۔ و اندر نظر طائفۂ محجوباں ۔ خلق است کہ ظاہر است خالق مکتوم)
(نقد النصوص شرح فصوص الحکم - مولانا جامی صفحہ ۶۰ - مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۳۰۶ھ)

[۲] یہ فنافی المحبوب کا مرتبہ ہے جسے فنافی اللہ کہتے ہیں - سالک کو یہاں بجز محبوب کے کچھ نظر نہیں آتا - وہ جدھر دیکھتا ہے محبوب ہی محبوب دکھائی دیتا ہے - حتیٰ کہ خود اسکا وجود محو ہو کر صرف محبوب کا وجود رہ جاتا ہے اور یہ غلبۂ حال اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنے اور محبوب میں کچھ فرق نہیں سمجھتا - نعرۂ انا الحق کا یہی مفہوم ہے - اسکی مثال اس لوہے کی سی ہے جو آگ میں تپانے سے انگارہ کی طرح سرخ ہو جائے اور دہکنے لگے - اس وقت اس میں اور آگ میں کچھ فرق نہ ہوگا - اور اس حالت میں لوہا خود آگ ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے - کیونکہ وہ آگ کے کل اوصاف سے متصف ہے -

لقب سے یاد کرتا ہے۔ چھٹے درجہ میں نہ تو عاشق عاشق رہتا ہے اور نہ معشوق معشوق بلکہ مصداق۔ ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی ۔ تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

یہاں عاشق فنا فی المحبوب ہو جاتا ہے۔ خودی اور انانیت کافور ہو جاتی ہے۔ عاشق کا وجود محو ہو کر معشوق ہی معشوق رہ جاتا ہے۔ یہی وہ درجہ ہے جس میں پہونچ کر قیس[1] عامری انا لیلیٰ اور منصور[2] حلاج اَنَا الحق کہہ اٹھے تھے۔ یہاں قاآنی "بے نشان" کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

---

[1] قیس عرب کے قبیلہ بنی عامر کے سردار اور شیخ ملوح کا بیٹا تھا۔ نہایت خوش رو اور حسین تھا۔ اپنے قبیلہ کی ایک بنت عم لیلیٰ بنت مہدی عامریہ پر فریفتہ ہو گیا تھا عرب میں اپنے قبیلہ کی ہر لڑکی کو بنت عم کہتے ہیں وہ اپنے سچے عشق و محبت کی بدولت دنیائے عشق میں مجنوں کے لقب سے مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ بچپن ہی میں جب دونوں ساتھ کھیلتے کودتے تھے اور اپنے قبیلہ کی بھیڑیاں چراتے تھے۔ مجنوں لیلیٰ کا عاشق تھا۔ خود اسکے اشعار سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے قیس کا دیوان بہت مشہور ہے۔ دوسرا بیان یہ ہے کہ زمانۂ شباب میں جب وہ ایک مرتبہ اپنے قبیلہ کے خیموں کے سامنے سے گزر رہا تھا لیلیٰ کے رخ زیبا کا فریفتہ ہو گیا اور خود وہ بھی اس کے تیر عشق کا نشانہ بن گئی۔ کوشش کی گئی کہ اسکی شادی لیلیٰ سے ہو جائے مگر اسمیں کامیابی نہیں ہوئی اور اسکی بیتابیاں بڑھتی گئیں۔ آخر اس جوش عشق نے جنون کی کیفیت پیدا کر دی اور پھر تو مجنوں کی یہ حالت ہوئی کہ یاد لیلیٰ میں روتا۔ آہ و نالے کرتا، اٹھتے بیٹھتے شعر خوانی کرتا۔ اسکے تصور میں جیتا اور ہر وقت اسکا نام جپتا لیلیٰ او ر ذکر لیلیٰ کے سوا دنیا و ما فیہا سے اسکو کچھ مطلب نہ تھا وہ آبادی سے بھاگتا۔ بیابانوں پہاڑوں اور ریگستانوں میں مارا مارا پھرتا اور لیلیٰ کے عشق میں اپنے اشعار پڑھا کرتا۔ آخر میں اسکی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ وہ اَنا لیلیٰ (میں لیلیٰ ہوں) کہہ اٹھتا تھا۔ اسی دشت نوردی میں ایک دن دنیا سے نامراد رخصت ہو گیا۔ اور موافق حدیث نبوی مَنْ عَشِقَ فَعَفَّ وَمَاتَ فَهُوَ شَهِيدٌ (جو عاشق ہوا، عفت کی زندگی بسر کی اور مر گیا وہ شہید ہے) وہ شہید ہوا لیلیٰ کا انتقال مجنوں سے پہلے ہوا۔ مجنوں کی زندگی ہی میں اسکے عشق کا چرچا ہوتے ہی لیلیٰ کی شادی بنی ثقیف میں ایک شخص کے ساتھ کر دی گئی تھی مجنوں کا سال وفات ۸۰ھ کہا جاتا ہے عبد الملک بن مروان کے عہد تک اسکی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "افسانۂ قیس" مولانا عبد الحلیم شرر مطبوعہ دلگداز پریس لکھنؤ ۱۹۲۹ء)

[2] ابو مغیث حسین بن منصور حلاج آتش پرستوں یا مجوسیوں کی نسل سے تھے۔ انکے والد اسلام لائے تھے۔ یہ اپنے والد کے نام سے مشہور تھے۔ انکا لقب حلاج ہے جسکے معنی دھنیے کے ہیں۔ ایک دن منصور کسی ضرورت سے ایک دھنیے کے پاس گئے اور اسکو اپنے کسی کام سے باہر بھیجا۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ ساری روئی دھنکی رکھی ہے اور خود منصور بھی سراپا روئی کے بنے ہوئے ہیں۔ اس واقعہ کی شہرت کے ساتھ یہ حلاج مشہور ہو گئے۔ ایران کے ایک مقام بیضا میں پیدا ہوئے تھے، اٹھارہ برس کے سن میں بغداد آئے اور حضرت جنید بغدادی کی فیض صحبت سے مستفید ہوئے۔ تین حج کئے۔ شوستر میں عالمانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اکثر ممالک میں سیاحت کی تھی آخر زمانہ میں جوش توحید اس درجہ بڑھا کہ خودی سے گزر گئے اور دعویٰ انا الحق (میں خدا ہوں) کر بیٹھے۔ مقتدر باللہ عباسی کا زمانہ تھا انکے قتل کا فتویٰ دیا گیا۔ گو وہ اپنے اسلام اور اہل سنت و الجماعت ہونے کا اعلان کرتے رہے۔ مگر دعوائے انا الحق سے (صفحہ ۳۵ ملاحظہ ہو)

فلسفۂ عشق و محبت کے ایسے بڑے بڑے اہم مسائل حیرت ہوتی ہے کہ شاعر نے کس طرح اس ایک شعر میں کس شان تغزل کے ساتھ چند لفظوں میں ادا کر دیئے ہیں۔ کہتا ہے۔ اے میرے محبوب! میرے دلبر! میرے دلآرام! میرے باوفا! تجھے ان ناموں سے شرمانا چاہیئے کیونکہ تو نے مجھے بے نشان کر دیا اور کہیں کا نہ رکھا۔

اس کے بعد کا شعر ہے

پری اور لوہا | پری بگریزد از آہن تو اے ماہ پری چہرہ چرا یکپارہ آہن را نہاں در پرنیاں کردی

مشہور ہے کہ لوہے سے پری بھاگ جاتی ہے۔ ہندوستان کے طبقۂ جہلا میں بھی اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کے گلے میں لوہے کی کوئی چیز یا اسکا ٹکڑا ڈال دیتے ہیں مریض کے سرہانے بھی رکھ دیتے ہیں کیونکہ اُن کا اعتقاد یہ ہے کہ لوہے کی وجہ سے آسیب یا پری کا سایہ نہیں ہوتا۔ شاعر کہتا ہے۔ لوہے سے تو پری بھاگ جاتی ہے اور پھر حیرت سے پوچھتا ہے۔ اے میرے پری چہرہ محبوب! تو نے اپنے اس خوبصورت ریشم ایسے ملائم جسم کے اندر لوہے کا ٹکڑا کیوں چھپا رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے ایسے لطیف اور نازک بدن والے محبوب کے دل کو لوہا ایسا سخت نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہ لطافت اور یہ نزاکت ایسے ہی اوصاف کا دل بھی چاہتی تھی۔ بھلا پری کو لوہے سے کیا تعلق! یہ تو اجتماع ضدین ہے۔ یہاں آہن سے مراد سخت دلی ہے جسے شاعر نے پری کے ساتھ استعمال کر کے ایک نہایت ہی پُرلطف مضمون پیدا کر دیا ہے۔

اب ایک دوسرے قصیدہ کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔ پہلا شعر ہے۔

عاشق کی نگاہ کی سچی تصویر | چہ رمز است ایں نمی دانم کہ چوں بینم رخ و زلفش بہ چشمم سر دو گیتی گاہ روشن گاہ تار آید

شاعر متحیر ہے اور کہتا ہے میں اس راز کو حل نہیں کر سکتا کہ جب میں اُسکا چہرہ اور اُسکی زلفیں دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں دُنیا و عقبیٰ دونوں کبھی روشن اور کبھی تاریک نظر آتے ہیں۔ اس شعر میں بہت ہی لطیف معنی آفرینی کی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ جب میری نگاہیں معشوق کے رخ روشن پر پڑتی ہیں دونوں جہان میری نگاہ میں روشن ہو جاتے ہیں لیکن جب معشوق کا چہرہ سیاہ زلفوں میں چھپ جاتا ہے تو میری نگاہ میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴) بازنہ آئے نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۰۹ھ کے ماہ ذیقعدہ کی ۲۳ یا ۲۴ تاریخ کو اس شرعی جرم کی پاداش میں منصور کو باب الطاق میں جو مجرموں کا قتل گاہ تھا لائے۔ پہلے دو ہزار کوڑے مارے گئے پھر اُنکے ہاتھ پیر کاٹ کر سر تن سے جدا کر کے انکی لاش جلا دی گئی۔ خاک دجلہ میں بہا دی گئی اور سر دجلہ کے پل پر لٹکا دیا گیا۔ تفصیلی حالات کے لئے علامہ ابن خلکان کی تاریخ۔ اور قاضی نور اللہ شوستری کی کتاب مجالس المومنین ملاحظہ ہو۔

دونوں جہان تاریک ہو جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ عاشق جو کچھ دیکھتا ہی معشوق کے رخ روشن کی روشنی میں دیکھتا ہے اور جب یہ نہیں تو اسکی نظر میں اجالا ہی نہیں۔ اور دنیا و مافیہا جو کچھ بھی ہو اسکی نظر میں اندھیر ہے۔ دیکھئے کس حسن ادا کے ساتھ کیسی لطیف مضمون آفرینی کی گئی ہے اور عاشق کی فطرت کی کیسی سچی تصویر کھینچی گئی ہے۔ دوسرا شعر ہے۔

معشوق کے وصف حسن کے اظہار کی بابت عاشق کی حیرانی

گُلت خوانم مہت دانم بہ ہیچت وصف نتوانم
کہ حیرانم نمی دانم چہ وصفت سازگار آید

شاعر اس شعر میں عاشق کے جذبات عشق کی ترجمانی کرتا ہے اور اسکے دل میں معشوق کے وصف حسن کے اظہار کی بابت جو کشمکش ہے اسکو کس خوبصورتی سے ادا کرتا ہے۔ کہتا ہے میں تجھ کو پھول یا چاند سمجھوں، میں تو تجھکو کسی وصف سے نسبت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میں سخت حیران ہوں اور نہیں جانتا کہ کون سا وصف تیرے لئے موزوں ہوگا۔ یہاں شاعر کے انداز بیان کا حسن اسلوب دیکھئے کہ کس لطافت کے ساتھ دلی جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔

اب ایک مسمّط کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

عاشق کا اظہار محبت

بہشت را چہ میکنم بہشتِ من توئی
بہار و باغ من توئی ریاض و کشتِ من توئی
بکن ہر آنچہ میکنی کہ سرنوشتِ من توئی
بدل نہ غائبی زمن کہ در سرشتِ من توئی
نہفتہ در عروق من چو پود ہا بتار ہا

شاعر نے اس مخمس میں عشق کے اس درجہ کمال کو دکھایا ہے جہاں عاشق کا حاصل مقصود جو کچھ ہے وہ معشوق ہے۔ دنیا و مافیہا کی لذتیں عاشق کے لئے ہیچ ہیں۔ اگر کوئی چیز اسکو لذت بخش ہو سکتی ہے تو وہ محبوب کی محبت ہے جو عاشق کی رگ رگ میں سما چکی ہے۔ شاعر اپنے خاص انداز میں اسی حالت کی تصویر کھینچتا ہے اور وہ بھی خود عاشق کی زبانی۔ کہتا ہے میں بہشت کو لیکر کیا کروں۔ میری بہشت تو اے محبوب تو ہے۔ تو ہی میری بہار ہے اور تو ہی میرا باغ۔ تو ہی میری پھلواری ہے اور تو ہی میری کھیتی۔ تیرا جو جی چاہے کر، اس لئے کہ میرا نوشتۂ تقدیر بھی تو ہی ہے۔ تو میرے دل میں ہر وقت موجود ہے کیونکہ تو میرے خمیر میں داخل ہے۔ میری رگوں میں تیرا جلوہ اس طرح چھپا ہوا ہے جس طرح کپڑے کا بانا تانے میں۔ شاعر کی یہ مضمون آفرینی اور رنگین بیانی کس درجہ دل آویز اور دلکش ہے۔

کلام فارسی شور

یعنی

مسٹر جارج پیش صاحب متخلص بہ شور مرحوم کے فارسی کلام کا انتخاب۔

(عابد مسیح صاحب بی-اے)

شور مرحوم ہندوستانی نہیں بلکہ فرانسیسی نژاد تھے۔ اُن سے کئی دیوان اُردو میں، اور ایک مختصر دیوان فارسی میں یادگار ہے۔ فارسی دیوان کا نام "گلشن فرنگ" ہے۔ یہ دیوان سنہ ۱۸۹۰ء میں چھپا تھا۔ اور شور صاحب نے سنہ ۱۸۹۴ء میں انتقال کیا۔ باوجودیکہ دیوان مذکور کچھ زیادہ پرانا نہیں، پھر بھی اس وقت عسیر الحصول ہے۔

جناب شور کسی خاص طرز کے مالک نہیں تھے اور کلام بھی معمولی ہے لیکن اُنکا کلام اور بالخصوص فارسی کلام ہم ہندوستانیوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہونا چاہیئے۔

روزے کہ کشادیم بہ حمد تو دہاں ہا — گشتیم چو سوسن ہمہ تن صرف زباں ہا

عاشق سر تعمیر نہ دارد کہ ز داغش — در قصر دل زار بنا کرد مکاں ہا

بیان از بس کہ دشوار است احسان الٰہی را — زباں در حمد میخواہد دہانِ عذر خواہی را

بر صفحۂ حمدت چو رواں شد قلم ما — حقا کہ برافزود فروغ رقم ما

چوں بحر کہ معمور ز امواج و حباب است — پیدا است ز حکم تو وجود و عدم ما

پا زود کش از بند گرفتاری دنیا — خود را نہ فروشی بہ خریداری دنیا

جز جور و جفا ہیچ نہ دیدیم نہ دیدیم — معلوم نمودیم وفاداری دنیا

آمد بہ جہاں ہر کہ بکار آمدہ ہشیار — پیدا دل من شد پئے بیکاری دنیا

دل از ہجر تو بیمار لیست گویا — نفس در سینہ آزار لیست گویا

جدا از گردنِ مینا نہ گردد — خطِ پیمانہ زنّار لیست گویا

رخت مہرِ درخشانے ست گویا — لبت لعلِ بدخشانے ست گویا
گِل داغ است از ہر چاک پیدا — گریبانم خیابانے ست گویا
خلاب بروے او در دیدۂ من — نگہ خارِ مغیلانے ست گویا
ز زلفش بر نہ دارم شورِ دل را — مرا ایں کفر ایمانے ست گویا

بس کہ افتادہ ست بانرگس چیانے کارِ ما — می شود آشفتہ مثل بوئے گل دستارِ ما

از دلم عکس رخِ یار نماید خود را — مہر در ذرّہ نمودار نماید خود را
غافل از خویش محال است کہ ہشیار شود — خفتہ دشوار کہ بیدار نماید خود را
بردرِ میکدہ آں بہ کہ نہ گردد زاہد — خارِ خشک است بہ دیوار نماید خود را

دل ہمہ خوں شد از جدائی ہا — داد از دست آشنائی ہا
دستِ کوتاہ و دامنِ تو بلند — وائے بر حالِ نارسائی ہا

بس کہ ترسم ز بیوفائی ہا — می گریزم ز آشنائی ہا

دمے اے شعلہ رحمے کہ در کوے تو افتادم — بہ تنگ گاہ ہمراہِ صباطے کردہ منزلہا
خمارِ بادۂ شیراز در سر شورہا دارد — "الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا"

چساں از قیدِ گیسوے پری بیروں کشم پارا — کہ دامِ طائرِ دل کردۂ زلفِ چلیپا را
بہ تنگ آوردم از ہر زہ دویہا کوہ و صحرا را — خداوندا کہ آخر تا کجا وحشت برد ما را

اگر دل دردِ خود گوید کہ می سازد شمارِ او؟ — وگر تن داغ بنماید کہ می داند حسابش را؟

سیرم از سیرِ چمن جلوۂ یار است اینجا — دیدِ گل را چہ کنم باغ و بہار است اینجا
حاجتے نیست بہ مے نوشی و بدمست شدن — بہ خیالِ نگہش طرفہ خمار است اینجا

خونِ ہم در جگرِ نہ ماند مرا — چہ خورم ما حضر نہ تماند مرا
مردم از تیزِ رفتنِ تیرش — کہ چرا در جگر نہ ماند مرا
داشتم مُردن آرزو مردم — آرزوے دگر نہ ماند مرا

چوں اشک فتادم از نظرہا — زیں بیش من و خبرہا و بترہا
آں جا کہ منم کجاست آمنے — واں جا کہ توئی کجا خطرہا
اے شوقِ رسائے وداعے — [illegible]

سر نعش آمدہ نگار مرا — آمد اندر خزاں بہار مرا

کارم آہ است و بارم اندوہ است — گر نہ پرسی ز کار و بار مرا

خاطر جمع بیار دز کجا عاشق زار — زلف شد سلسلہ جنبان پریشانیٔ ما

از عشق بتاں تو بات اصلا نہ بود سہل — یار دگر ایں حرف مگو شور خدا را

زتیغ او کہ می دارد کرامت — نہ خواہم چوں علاج درد سر را

لعل سیرابی کہ زد آتش درون جاں مرا — می چکد آب عقیق از دیدۂ گریاں مرا

از شگاف سینہ برق آہ چشمک می زند — گرمیٔ خوئے کہ زد آتش بدل پنہاں مرا

بیروں نہ شد ہوائے قدت از غبار ما — روید نہال سرو ز خاک مزار ما

شمشاد محو قامت محشر ادائے تست — قمریست ہم صفیر دل داغ دار ما

سایۂ تیغ بتاں اوج سعادت ارد — سر بتاب از خم او بال ہما را در باب

ذکر شور آمدہ چو با اغیار — گفت او ہم امیدوار من است

بوئے یاری یہ گلشن دنیا — از یکے تا ہزار پیدا نیست

در مذہب ما جفا روا نیست — در دین تو جان من وفا نیست

داد ستم تو از کہ خواہم — فریاد رسے بجز خدا نیست

سرت گردم بیا و خوش بکش زود — اگر پروائے جان عاشقاں نیست

شور گر خواہی کہ باشی بندۂ توحید ذات — از ہمہ اقرار و ہم انکار می باید گذشت

از ازل ہم شکستہ دل بودم — غمت آمد تمام تر بشکست

با سبکروحی بسر کن زندگانی در جہاں — از نسیم صبحدم بر خاطر کس بار نیست

از بہار باغ دنیا رنگ آسایش مجو — بلبلے بے نالہ زار و گلے بے خار نیست

کافر و مومن بہ دیر و کعبہ می آرند رو — عاشقاں را بیناز سبحہ و زنار نیست

فرہاد کار خویش بسر انجام کرد و رفت — در جاں کنی برنگ نگیں نام کرد و رفت

شب کہ آں بت زمن جدا بودہ است — بر زبانم خدا خدا بودہ است

غمزۂ ناز نگاہے بر شور — طائر ہوش بہ پر محتاج است

ہر کجا از خودی گریختہ ام — بے خودی ہم عنانِ من شدہ است

چشمِ مستِ یار را ہشیار کردن خوب نیست — فتنۂ خوابیدہ را بیدار کردن خوب نیست

قاصدا اشک رواں خواہم ساخت — حالِ دل جا بہ بیاں خواہم ساخت

از تماشا چشم باید دوختن — شش جہت مشتِ غبارے بیش نیست

دادہ است اسم مرا و دوا را بہانہ ساخت — بے جرم خوں نمود و قضا را بہانہ ساخت

تن بہ تقدیر چو دادم ہمہ تدبیر عبث — بستۂ زلفِ ترا حلقۂ زنجیر عبث

بے بال و پر ز جور تو صیاد ماندہ ایم — ہیہات ایں تکلفِ دام و قفس عبث

ایں قدر با من مشو اے زلفِ عنبربار کج — کز خم و پیچ تو ام باشد سراسر کار کج

دلِ من است کہ با تو وفا و دیگر ہیچ — ترا ہمیشہ عتاب و جفا و دیگر ہیچ

ایں دانہ کشد بہ دامِ آخر — زنہار مشو شکارِ تسبیح

از بادہ بود وقتِ سحر نور در قدح — افتادہ بود عکسِ رخِ حور در قدح

رنگِ حسرت ہر گلِ گلزار کثرت یافتہ — شد ز نورش دیدۂ جلوہ شناساں سرخ سرخ

گر روئے تو بے نقاب بیند — گل از تہِ پیرہن برآید

خود فراموش از توقعیت امید — کہ مرا یاد می توانی کرد

رخت رنگیں ترا ز گلزار باشد — بہ پیشِ جلوہ ات گلزار باشد

غیر ہمراہ یار می آید — ہم خزاں ہم بہار می آید

بے جرم و گناہ قتلِ عاشق — در مذہبِ او ثواب باشد

گاہ گاہے بہ مہر کن نگہے — قہر ہر بار خوش نمی آید

گہ عشقِ بتاں و ارم و گہہ حسرتِ کعبہ — از مشربِ من گبر و مسلماں گلہ دارد

نے لبم بود آگہ نے زباں خبر دارد — یاد تو کنم جاناں دیگرے نمی داند

گر طرب رفت غم سلامت باد — ور تمنا نماند حسرت باد

آں قیامت کہ قامتت دارد — بر سرم باد و تا قیامت باد

ایں چنیں حسن و ادائے کہ تو داری اللہ — نہ ملک داند و پری داند نہ بشر یا دارند

رحمتے جز خدا کہ می آرد — اے بتاں از شما کہ می آرد

در دیر اگر گزر نہ می شد — مارا ز خدا خبر نہ می شد

دل بسے بے قرار یم می داد — خوب شد خوب شد اگر گم شد

حنائیست رنگِ دُرِ اشک دردم — نہ دانم بہ پاسے کہ غلطیدہ باشد

چہ ممکن است رود داغ بندگی ز جبیں — زمیں فلک نہ شود آدمی خدا نہ شود

چہ دہم شرحِ غمِ سوزِ جگر در کاغذ — کس نہ پیچید بہ تدبیر شرر در کاغذ

عاشقاں را در قیامت خیر جا لش کاریست — دیدۂ وحدت نمی بیند تماشائے دگر

ہادیٔ ما مرشد ما پیر ماست — ہر کہ دارد فکر عقبےٰ در نظر

چیزے کہ عاریت بود از شے چہ خرمی — اے شوردوش خویش سبک کن بار عمر

مُہر شد داغ محبت بر دلم — ایں سند کافیست از محضر چہ کار

یا رہا کن ز بندِ دامِ فراق — یا بیا تیغ آب دار بیار

کے مرا کردی عطا یک جام مے از دست خویش — یار جانی گویمت یا دشمن جانی ہنوز

قیامت جز ازیں دیگر چہ باشد — نہ می پرسد کسے را ایں ماں کس

چوں غبارے ز خاکساری خویش — بر مقامے رسیدہ ام کہ مپرس

تو گبر باش کہ ترسا و یا مسلماں باش — بہ ہر طریق کہ باشی درست ایماں باش

گیرم کہ سرِ وفا نہ داری — انداز جفا مکن فراموش

تو بد معاملہ شاید بر آمدی بلبل — کہ گل نہ داد ترا زر دریں گلستاں قرض

راہِ دل را می کند آں شوخ بے پروا غلط — لیک نتواں کرد راہِ خانۂ خود را غلط

گفتم ایں تیغ حافظ سر باد — گفت سر می رود خدا حافظ

جنوں گر دریں کلبہ تشریف آرد — نمایم گریبان و داماں تواضع

شدم از خویش و از بیگانہ فارغ — نشستم بر درِ مے خانہ فارغ

کردم چو قطع ہوس کار دو عالم شد تمام — اُمیدِ نالاں یک طرف خونِ تمنا یک طرف

بر عیش دو روزہ دل چہ بندیم — مارا غمِ جاوداں مبارک

نیست اربابِ فنا را ہیچ از دنیا غمے
کے نظر آید بہ چشمِ مردہ خوابِ زندگی

اند کے اندیشہ از کیفِ خمارِ مرگ دار
ایں قدر نتواں شدن مستِ شرابِ زندگی

گرفتم بودہ رشکِ مسیحا
بہ دردِ انتظارِ من چہ کردی

برائے زیبِ بدن نیلگوں قبا داری
نہاں بہ پردۂ شب صبحِ دل کشا داری

ازاں دمے کہ مرا کشتۂ تو خاموشی
خدا غلط نہ کند فکرِ خوں بہا داری

فدائے جورِ تو باشم کہ خوش ادائے ہست
سرم بریدی و ہم دعوئ وفا داری

تو چوں با غیر پیماں تازہ کردی
دلم را داغِ حرماں تازہ کردی

طبیبِ من جزاک اللہ خیرا
کہن دردے بہ درماں تازہ کردی

پیری و ہزار ناتوانی
سوگند بہ حسرتِ جوانی

من یوسفِ ثانیت نہ گویم
دانم کہ ترا کجاست ثانی

نرگسی چشم سرمہ سا کردی
ایں بلا در بلا چرا کردی

چشم را سرمہ چوں عطا کردی
صاد بر دفترِ حیا کردی

من نعرہ زدن نمی گزارم
تو تیغ زدن نمی گزاری

گوئی کہ گزاشتم جفا را
ایں حیلۂ دفن نمی گزاری

رنجہا دادہ و رنجیدہ ہی
چہ خطا باز گو ز من دیدی

گہ شکوہ نہ کردم بتو از حال تباہے
رفتم ز خود و بہ نہ زدم نالۂ آہے

گفتم کہ بیایم بدرت باز بگفتا
غم نیست بیائی مگر ایں شرط کہ گاہے

ہم چو من صد دل گرفتار کسے
جاں فدائے چشمِ خوں خوارے کسے

تا کجا گریہ کنی در یادِ او
چشم تر رحمے بہ دیوارے کسے

جناب شورؔ کے مختصر دیوانِ فارسی میں دو مسلسل غزلیں بھی ہیں ان میں سے ایک ملاحظہ ہو ـ

نہ در گل نہ در نو بہار است رونق
نہ در نغمہائے ہزار است رونق

نہ بر چہرۂ صبح و شامے صفائے
نہ بر عارضِ گل عذار است رونق

نہ کیفیتِ لطفِ مے خانہ دارد
نہ در مستئ بادہ خوار است رونق

نہ از لعلِ خنداں چکد رنگ شادی
نہ در دیدۂ اشک بار است رونق

نہ در ناز و انداز معشوق لطفے — نہ بر عاشق بے قرار است رونق

نہ در کاکل تاب دار است تابے — نہ بر طرۂ مشک بار است رونق

نہ آں دل نہ مردم نہ آں شور وحشت — نہ روزے نہ در روزگار است رونق

"گلشن فرہنگ" یعنی دیوان شور میں صرف غزلیں ہیں۔ البتہ آخر میں چند رباعیاں ہیں۔ ان میں سے پانچ رباعیاں نذر ناظرین کی جاتی ہیں۔ ؎

پیوستہ خدائے را اطاعت می کن — جان و دل خویش صرف طاعت می کن

تا صاحب آبرو شوی چوں خورشید — با نان جویں شور قناعت می کن

شاد از عدم آمدیم و محزوں رفتیم — با دیدۂ زار دل پرخوں رفتیم

واضح نہ شدہ شور دریں دار فنا — از بہر چہ آمدیم و پس چوں رفتیم

در راہ رضا خیال رہ بر کفر است — افزوں طلبیدن از مقدر کفر است

سنگ ستم است و خواہ شمشیر جفا — سر باز زدن ز حکم داور کفر است

ہاں از روش خلق جدا می گریم — گر بیند کسے چناں کہ ما می گریم

یک بہر پدر گریہ و یک بہر پسر — بر غفلت این و آں بسا می گریم

دیدیم بسے بہ دیدۂ آخر بیں — ہیچ است ہمہ چہ آسمان چہ زمیں

اے شور چہ پرسی از ثبات عالم — دنیا نفسے و اہل دنیا کم ازیں

شور صاحب نے اپنے دیوان فارسی کا قطعۂ تاریخ بھی لکھا ہے۔ ؎

کلام فارسی شور چوں شدہ مطبوع — زبان بہ وصف کشاوند ماہران فن

ز ملک تا بہ فلک رفت غلغل تحسین — نوید ہاتفی آمد چہ بے نظیر سخن

۱۸۸۹ء

جیسا کہ قاعدہ ہے دیوان کے آخر میں تاریخ طبع کے وہ قطعات شامل ہیں جو شور صاحب کے احباب نے کہے ہیں اور ایک تقریظ نثر بھی ہے۔ صرف ایک قطعہ یہاں لکھا جاتا ہے۔ ؎

چو شد فارسی طبع دیوان شور — کلام سخن دان عالی مقام

درا فتاد شورے بہ اہل جہاں — بہ وصفش کشادند لب خاص و عام

بہ فکر آمدہ ایں ندائے سروش — بگو چہ عجائب غرائب کلام

۱۳۰۷ ہجری

دوسری جگہ کسی دل چلے نے اُسے وہاں جانے کی ہدایت کی جہاں ابتدائے آفرینش سے آج تک کبھی سردی کا موسم نہیں آیا اور نہ کبھی آئیگا - اسکے ساتھ ہی ساتھ لحاف اور توشک کے پردوں سے نکلی ہوئی ایک حسین آواز نہایت طعن آمیز لہجہ میں یہ سوال بھی کرتی ہوئی سنائی دی گئی کہ اے پہلے سے کہاں سو رہے تھے جو اب آدھی رات گذرتے چلے ہیں - ہمارے ہیرو کا بہت جی چاہا کہ جواب میں کہدے کہ وہیں جہاں آپ ہیں یعنی نرم گدّے اور گرم لحاف کی شفیق تہوں میں - مگر خدا جانے کیا سمجھ کر وہ خاموش ہو رہا - کچھ دور چل کر تیسری مرتبہ پھر قسمت آزمائی کی - یہ کوشش کارگر ثابت ہوئی - منزلِ مقصود یہیں تھی - تھا صلے انتظار کے بعد ایک خمیدہ کمر بڑھیا بے وقت جگائے جانے کا وظیفہ پڑھتی ہوئی ڈیوڑھی تک آئی - ہمارے ہیرو نے امکانی خوشامد کے لہجہ میں عرض حال کیا - بڑھیا نے پہلے تو وظیفہ کے باقی بول دم کئے - اور پھر گھر میں جا کر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کسی مستی آپ کو جگانا شروع کیا - اِدھر ہمارے ہیرو پر ایک ایک لمحہ بھاری تھا اور اُدھر بے فکری کی نیند تھی مگر بڑھیا بھی قیامت تھی - وہ صور پھونکا کہ آخر جگا ہی کر چھوڑا - قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ اب "وہ" بیدار ہو چکی ہیں اور تیاری میں مصروف ہیں - ہمارے ہیرو کا ڈیوڑھی والا دوسرا سگرٹ بھی ختم ہونے کو تھا کہ کسی کے گھر سے باہر نکلنے کی آہٹ کان میں آئی - پردہ ہٹا، سبز شال، سفید لہنگا اور اونچی ایڑی کا جوتہ باہر نکلے - اور مختصر سی گفتگو کے بعد ہمارے ہیرو کے ساتھ ہو لئے -

۳

برسات کی راتیں بھی عجب دلچسپ راتیں ہوتی ہیں - سر شام سے بارش کا سلسلہ جاری - سڑکوں پر کیچڑ پانی کی افراط - ہر گلی کوچے جاناں کی طرح پھسل پڑنے کے قابل جنتری کے اعتبار سے چاندنی راتیں - آسمان پر کالی گھٹاؤں کا ہجوم - میونسپل بورڈ کی بچت اور شہر میں اندھیرا - چھتیں اپنے مُوشِ اعلیٰ کی تاسّی پر مائل - بوسیدہ دیواریں زمین بوسی کی مشتاق - ہر طرف نالے جاری - باہر مینڈکوں کا شور گھر میں مچھروں کی للکار - جس شاعر کے گھر کو دیکھئے میر کا گھر بنا بیٹھتا ہے - شاہراہوں اور گذرگاہوں پر برساتی کوٹوں اور چھتریوں کی نمائش ہے - امیر تکلف سے اور غریب بے تکلف بھیگتے چلے جا رہے ہیں -

اگست کا مہینہ تھا - بارش بوندی کی رات نصف سے زیادہ "برس" چکی تھی کہ ہمارا ہیرو چھتری ہاتھ میں لئے، برساتی زیبِ تن کئے، پاجامہ کو "نکر" بنائے خدا جانے کس فراق میں گھر سے نکل کھڑا ہوا؟

پانی موسلا دھار برس رہا تھا۔ بجلی کڑک رہی تھی اور بادل گرج رہا تھا۔ آگے آگے ایک لڑکا ٹمٹماتی لالٹین ہاتھ میں لئے۔ سر پر پرانی کریچ کا ٹکڑا اوڑھے۔ ایک مختصر سی لنگوٹی کے سوا پورا جسم قدرتی "واٹر پروف" سے ڈھکے۔ راستہ دکھانے کی بیکار کوشش میں کیچڑ اچھالتا چلا جا رہا تھا۔ اس موہوم امید پر کہ شاید کوئی سواری مل جائے۔ ہمارا ہیرو گاڑی اڈے کی طرف سے ہوتا ہوا بالآخر پاپیادہ ہی سول لائنز کی طرف گامزن ہوا۔ شہر کی آبادی سے باہر نکلتے نکلتے کئی مرتبہ پھسل کر سنبھلنے اور سنبھل کر پھسلنے کی نوبت آئی۔ مگر چونکہ کوئی قدر دان موجود نہ تھا اس لئے ہمارے ہیرو کو ان قیمتی برساتی ورزشوں میں کوئی خاص لطف نہ آیا بلکہ یوں کہیے کہ ساری محنت اکارت گئی۔ بہرحال شہر سے باہر کی کشادہ سڑکوں پر پہنچکر کیچڑ پانی سے نجات ملی اور ذرا کھل کر بھیگنے کا لطف ملا۔ فوجی پریڈ کے وسیع میدان تک پہنچا تھا کہ ہمارے ہیرو اور ہوا کے تیز جھونکوں کے مابین چھتری کی ملکیت کے بارے میں جنگ عظیم چھڑ گئی۔ ڈانواڈول موٹر کی طرح چھتری کبھی ادھر جھکی اور کبھی ادھر۔ اور آخر کار اس کشمکش سے تنگ آکر اس نے یکبارگی ایسا رُخ بدلا کہ مزید بحث کی گنجائش باقی نہ رہی۔ سر پوش بن کر گھر سے چلی تھی، پیالہ بن کر رہ گئی۔

بارش اور اندھیرے کی وجہ سے سڑکوں اور راستوں کا پہچاننا دشوار تھا۔ مگر جوئندہ یابندہ۔ بجلی کی چمک بنگلے کی پہچان میں مددگار ہوئی (اس لئے کہ لالٹین تو پہلے ہی تشریف لے جا چکی تھی) اور ہمارے ہیرو نے بھی کڑاکر کے چوکیدار! چوکیدار!! کے کئی ایرشکن نعرے لگائے۔ جواب میں پہلے تو کتوں نے اپنی وفادار شب بیداری کا ثبوت دیا۔ پھر میم صاحب کی آنکھ کھلی۔ انھوں نے "بیرے" کو پکارا۔ بیرے نے چوکیدار کو جگایا۔ چوکیدار نے لالٹین اٹھائی، ڈنڈا سنبھالا، اور کھانستے کنکھارتے پھاٹک کے قریب آکر ہمارے ہیرو سے کیفیت طلب کی پھر اس پیغام کو بیرے کے حوالے کیا۔ بیرے نے میم صاحب سے "بولا"۔

الغرض ادھر یہ سب لوازمات پورے ہو رہے تھے اور اُدھر ہمارے ہیرو کا دل امید و بیم کے جذبات کا آماجگاہ بن رہا تھا۔ مضطرب تھا کہ دیکھئے میم صاحب کیا جواب "بولتی" ہیں۔ کہ اتنے میں بیرے نے آکر خبر دی کہ میم صاحب سلام بولتی ہیں۔ "ڈریس" کر رہی ہیں۔ ابھی باہر آتی ہیں۔ اس خاطر خواہ جواب کو سن کر ہمارے ہیرو کے دل کو خاصی تسکین ہوئی۔ چوکیدار کے بجائے اس مرتبہ

بیرے کا خود اُس تک آنا معنی خیز تھا۔ امید بندھی کہ میم صاحب بھی آ ہی جائینگی۔ اسی تصور میں راستہ کی پریشانیاں دل سے محو ہونے لگیں اور وہ بڑے اشتیاق سے برآمدہ تک بڑھکر میم صاحب کے برآمد ہونے کی راہ دیکھنے لگا۔

(۴)

گرمی، جاڑے یا برسات کی رات ختم ہونے کو تھی کہ ہمارے ہیرو کے یہاں ایک غیر معمولی چیخ پکار اور ہنگامے کے بعد گھر کی چہار دیواری میں سکون کی صورت پیدا ہوئی اور متفکر چہروں پر طمانیت قلب کے آثار نمایاں ہوئے۔ ہمارے ہیرو نے اطمینان کی لمبی سانس لی ہی تھی کہ تماشائیوں نے اسکے سامنے انعام کے لئے ہاتھ پھیلا دئے۔ ان میں سب سے لمبا ہاتھ "پمپ شو" کا تھا۔ انھوں نے اپنی "قابلیت" کی تصدیق میں وہ لچھے دار تقریر کی کہ سب کو کامل یقین ہو گیا کہ آج کی کامیابی کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ ورنہ خدا جانے "کیا سے کیا ہو جاتا"۔ رہیں میم صاحب تو انکی اُردو، ان کی وضع قطع کی طرح ولائتی تھی۔ کچھ سمجھ میں آئی اور کچھ نہ آئی مگر ماحصل یہ تھا کہ "ہم برا مشکل کام کیا ہے۔ ہمارا بہت برا اپ ہو گیا!" اب اس پھڑکتی ہوئی اُردو کے بعد انکی بات کیسے رد کی جا سکتی تھی۔ ہمارے ہیرو نے وہی کیا جو ایسے موقع پر ایک وفادار ہندستانی کر سکتا تھا یعنی خود خالی ہو کر ٹھگیا مگر ان کی مٹھی پورے طور سے گرما دی۔

کچھ دیر بعد ایک مرقع پیش نظر تھا جس کے گول چہرے، بند آنکھوں اور غیر متعین نقشہ میں ہمارا ہیرو مشابہت کے پہلو ڈھونڈھنے لگا۔ اس جستجو میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہا۔ اس لئے کہ دنیا میں کسی شے کے دیکھنے کے لئے اسکا واقعی نظر آنا لازمی شرط نہیں ہے۔ بلکہ اصل چیز ہے خوش اعتقادی، اگر یہ ہے تو انسان کی نظر موجودات کی پابند نہیں رہتی۔ ادھر شہنشاہ دماغ نے کہا کہ "دیکھو رات ہے"۔ اور ادھر وفا شعار آنکھیں بول اُٹھیں۔ "ہاں جہاں پناہ، چاند بھی ضو فشاں ہے اور تارے بھی دمک رہے ہیں"۔ لہذا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہمارے اپنی بدصورتی کے سارے جلوے اور اپنی حماقتوں کے مکمل آثار اس چھوٹے سے پیمانہ میں اپنی جھلک دکھانے لگے۔ ہاں۔ اگر کچھ شکوک باقی تھے تو وہ بھی اس وقت رفع ہو گئے۔ جب "پمپ شو" نے ناک سے ناک، آنکھ سے آنکھ اور منہ سے منہ ملا کر فرما دیا کہ "ہو بہو تمہارا!"

ہی نکسان ہے!" اور میم صاحب نے مسکرا کر اس قیافہ شناسی کی داد دیتے ہوئے دست قدرت کی کیرتگی قلم پر اظہار تعجب کیا۔ کامل یقین کی نوبت اس وقت آئی کہ جب خود نووارد نے ہمارے ہیرو کے وقتی شکوک کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے اور پردوں میں چھپی ہوئی ہیروئن (جسے رسم و دنیا کے مطابق ہم اب تک بالکل بھولے ہوئے تھے) کی پرجوش حمایت کرنے کے لئے اپنے چہرے کی مختصر سی تختی پر اقلیدس کی سب شکلیں حل کرتے ہوئے پوری قوت سے ایک پرجوش نعرہ لگایا۔ اس وقت مشابہت تام تھی اور شکی المزاج طبائع کے لئے بھی کسی شبہہ کی گنجائش باقی نہیں تھی۔ ہمارا ہیرو اس نقشہ کو دیکھ کر الہامانہ (جنتی) سادگی سے مسکرایا اور باربرداری کے فرائض سے فراغت پاتے ہی ایسی بے فکری کی نیند سویا گویا ایک مدت کے بعد اسے ایک بار عظیم سے سبکدوشی حاصل ہوئی تھی۔

مارخیم یا فلسفۂ ضمیر

(محمد مقبول حسین خاں صاحب تیر فتحپوری)

میرے یہاں مختلف قسم کے خریدار آتے ہیں اگر نا تجربہ کار ہوا تو میں اپنے تجربے کی وجہ سے نفع اُٹھاتا ہوں اور" اس قدر کہنے کے بعد تاجر نے شمع اونچی کی تاکہ اُسکے مخاطب کے چہرہ پر کافی روشنی پڑے۔ " اور کبھی کبھی دغاباز لوگ بھی آجاتے ہیں اور اُس وقت میں اپنی ایمانداری کی وجہ سے فائدہ حاصل کرتا ہوں" مارخیم ابھی ابھی سڑک سے دوکان میں داخل ہوا تھا اور اُسکی آنکھیں تیرگی آمیز روشنی سے آشنا ہوئی تھیں۔ تاجر کے یہ الفاظ سن کر اور شمع کے قرب کی وجہ سے اُسکی آنکھیں جھپک گئیں اور تاجر سے نگاہ چار نہ کرسکا۔ یہ دیکھ کر تاجر مسکرایا "تم آج دیوالی کی رات کو میرے پاس آئے ہو کیونکہ آج میں اکیلا ہوں۔ حالانکہ تمھیں معلوم ہے کہ آج کی رات میں خرید و فروخت بالکل نہیں کرتا اور تمام سال کا حساب کتاب آج ہی کی رات میں کرتا ہوں۔ تم نے آج میرا اس قدر حرج کیا۔ اسکا ذمہ دار کون ہوگا؟ اور اسکے علاوہ تمہارا چہرہ کچھ ایسے خیالات فاسد کا مظہر ہے جو تمہارے دل کو کشمکش میں ڈالے ہوئے ہیں۔ میری یہ عادت نہیں کہ میں کسی سے بیجا و بیجا سوالات کروں۔ ہاں اگر کوئی شخص مجھ سے بددیانتی کرتا ہے تو میں بھی اُسکی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتا ہوں" یہ کہہ کر تاجر کرسی پر بیٹھ گیا وہ بار بار مارخیم پر ایسی تجسس نگاہیں ڈالتا تھا گویا اُسکا دل ٹٹول رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد تاجر کھڑا ہوا اور مارخیم سے طنزاً پوچھنے لگا " کہیے آج آپ کیا چیز فروخت کرنے لائے ہیں؟۔ کیا حسب معمول آج بھی اپنے چچا جان کی الماری سے کوئی چیز اُڑا لائے ہیں۔ آپ کے چچا جان کے پاس بڑا ذخیرہ ہے؟۔

تاجر باتیں کرتا جاتا تھا لیکن اُسکے ہر فقرہ اور حرکت سے بے اعتباری ٹپک رہی تھی۔
(مارخیم نے اس مرتبہ تاجر سے اپنی خفی نگاہیں چار کیں اور نگاہ ترحم سے اُسے بغور دیکھکر اس طرح ہمکلام ہوا۔ "تم ابھی تک غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہو میں اس وقت کچھ فروخت کرنے نہیں آیا بلکہ خریدنے آیا ہوں، ایک تو چچا جان کی الماری بالکل خالی ہوگئی ہے، اور اگر اُس میں کوئی چیز ہوتی بھی تو فروخت نہ کرتا مجھے اپنی محبوبہ کے واسطے ایک تحفہ کی ضرورت ہے، میں نے تمہارا حرج کیا اسکی معافی چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں بالکل مجبور تھا۔ تم خود سمجھتے ہو کہ محبوب کی خاطرداری کے واسطے انسان کیا نہیں کرتا" یہ کہکر مارخیم خاموش ہوگیا۔ تاجر اس بیان کو جھوٹ اور سچ کی کسوٹی پر پرکھ رہا تھا، اور مارخیم نگاہیں پھیر پھیر کر دوکان کے تاریک حصوں کو بغور دیکھ رہا تھا صرف انواع و اقسام کی گھڑیوں کی آوازیں اور سڑک پر گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ اس خاموشی میں مخل ہوتی تھیں کچھ دیر کے بعد دونوں میں پھر گفتگو شروع ہوئی۔

تاجر "خیر۔ تم ہمیشہ میرے یہاں آتے رہتے ہو اس وجہ سے مجھے تمہارے معاملات میں دخل دینے کی کوئی وجہ نہیں میں تحفہ کے واسطے ایک چیز دیتا ہوں" یہ کہکر تاجر الماری کے پاس گیا۔
"یہ آئینہ قریب تین سو برس کا ہے اسکی خوبیاں دیکھنے سے معلوم ہونگی" تاجر الماری سے آئینہ نکالنے کے واسطے جھکا۔ مارخیم کے دل میں نہیں معلوم کیا خیالات آئے کہ اُسکا تمام جسم اس طرح کانپ گیا جیسے ہوا کے ایک جھونکے سے رُکے ہوئے پانی پر لہر آئے اور نکل جائے۔ اُسکے لبوں کو جنبش ہوئی اور تمام چہرہ سُرخ ہوگیا لیکن تاجر کے مخاطب ہونے سے پیشتر یہ حالت رفع ہوگئی۔
اُس نے تاجر کے ہاتھ سے آئینہ لے لیا۔

مارخیم۔ (آئینہ دیکھکر بھرّائی ہوئی آواز میں) "آئینہ! تحفہ کے واسطے یہ آئینہ!" ؟

تاجر۔ (مسکرا کر) "کیوں" ؟

مارخیم۔ پھر مجھ ہی سے پوچھتے ہو کیوں! دیکھو اس میں تم خود اپنے آپ کو دیکھو۔ کیا تم اسمیں اپنی صورت دیکھنا پسند کروگے؟ کبھی نہیں، نہ میں پسند کرونگا اور نہ کوئی پسند کریگا" اس وقت مارخیم کے لہجہ سے کچھ ایسی دہشت اور اُسکے چہرہ سے ایسی وحشت نمایاں تھی کہ تاجر ایک بے اختیاری کی حالت میں پیچھے ہٹا۔ "بولو۔ جواب دو۔ تحفہ اور یہ آئینہ" یہ جبر بھولے ہوئے قصوں کو یاد دلاد

فراموش غلط کاریوں اور گزری ہوئی ضمیر فروشوں کے دبے ہوئے نقش دامن خیال پر اُبھار دے!
آخر اس سے تمہارا مقصد کیا ہے۔ اور تم کن غلط فہمیوں میں مبتلا ہو۔؟ دیکھو تم میری طرف سے
بدگمانیوں کو دور کردو۔ میں تمہیں بہت صاف دل انسان سمجھتا تھا" تاجر نے مارخیم کو بغور
دیکھا لیکن اُسکے چہرہ پر بنوٹ یا مسکراہٹ کا کہیں نام نہ تھا۔ ہاں اُسکی آنکھوں سے اُمید کے
آثار ضرور نمایاں تھے۔

تاجر۔ آخر اس گفتگو سے تم کس نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہو۔

مارخیم۔ وہ نتیجہ۔ جس کا کوئی نتیجہ نہیں۔ مکر، دغا، خودغرضی، ناانصافی، بے مہری،
حصول دولت کے واسطے خون بھرے ہاتھ۔ روپیہ رکھنے کے واسطے ایک محفوظ مقام بس
اسی قدر؟ اے خدا کیا انسان اسی کا نام ہے؟

تاجر اس قسم کی گفتگو سُننے کا عادی نہ تھا مارخیم کے یہ الفاظ سُن کر اُسے نہایت درجہ غصہ آیا
"دیکھو میں بتاتا ہوں کہ انسان کس کا نام ہے" پھر کچھ سوچ کر نرم لہجہ میں مارخیم سے مخاطب ہوا
"شاید تم پر عشق کا جنون طاری ہے"

مارخیم۔ تمھیں بھی کسی سے عشق ہوا ہے۔

تاجر۔ "ہا ہا ہا۔ میں اور عشق۔ مجھے نہ کسی سے محبت ہوئی اور نہ ان فضول مشاغل کے
واسطے میرے پاس وقت ہے۔ بہرحال یہ آئینہ خریدو گے یا نہیں؟

مارخیم۔ تمہیں اس قدر جلدی کیوں ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر آپس میں گفتگو کرنا کس قدر خوشگوار ہے
زندگی کا کیا اعتبار۔ نہ معلوم کہ اس زنجیر کی کڑیاں کس وقت ٹوٹ جائیں۔ لہذا میں کسی خوشگوار چیز
سے یہاں تک کہ اس وقت کی دلچسپ گفتگو سے بھی مُنہ موڑنا نہیں چاہتا۔ انسان کو لازم ہے
کہ دنیا میں جو کچھ ممکن ہو حاصل کرے۔ اور اس زندگی کا دامن اس قدر مضبوطی کے ساتھ پکڑے جس طرح
پہاڑ سے گرتا ہوا شخص پتھر کی چٹان کو مضبوطی کے ساتھ پکڑتا ہے۔ ہماری زندگی کا ہر لمحہ ایک اونچی
چٹان کی طرح ہے۔ ادھر وہ ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہمارا نام و نشان صفحہ ہستی سے اس طرح
مٹ گیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں لہذا جو وقت بھی ہاتھ آئے اُسے ہنسی خوشی گزار دو اور میری رائے
ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کھُل جائیں"

تاجر۔ "مجھے صرف تم سے اس قدر کہنا ہے کہ اگر کچھ خریدنا ہو تو خرید لو۔ ورنہ اپنا راستہ لو۔"

مارخیم۔ "بہتر ہے۔ اس آئینہ کے سوا اور کچھ دکھاؤ۔"

تاجر الماری میں آئینہ رکھنے کے واسطے جھکا، مارخیم آہستہ سے آگے بڑھا اور اس نے ایک ہاتھ اپنا کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ اس وقت گوناگوں جذبات خوف و دہشت، ضمیرکشی، پست ہمتی، عزم اور اضطراب کے آثار اُسکے چہرہ سے نمایاں تھے۔

تاجر۔ "دیکھو۔ شاید اسے تم پسند کروگے اور ...."

تاجر ابھی اسی قدر کہنے پایا تھا اور سیدھا ہونا ہی چاہتا تھا کہ مارخیم نے اُس پر حملہ کیا۔ خنجر کی چمک، خون کی دھار، تاجر کی ایک دردبھری آواز اور اُسکے بعد وہ چلتی پھرتی مشین مارخیم کے سامنے خاموش پڑی تھی۔

دوکان میں مختلف قسم اور زمانہ کی گھڑیاں موجود تھیں جو ایک ساتھ بجنے لگیں اُنکی آوازوں نے اور قرب و جوار کی دوکانوں میں آدمیوں کی بول چال نے اُسکو خواب دہشت سے بیدار اور ماحول سے خبردار کیا! مارخیم نے ہر طرف وحشت سے دیکھا، شمع میز پر جل رہی تھی اور اسکی لَو خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی جس سے کمرہ کی فضا میں سایہ اس طرح حرکت کر رہے تھے گویا کہ کشتیاں طوفان خیز سمندر کی آغوش میں لوریاں لے رہی ہوں۔ اس دہشت ناک نظارہ سے مارخیم نے نگاہ پھیری اور تاجر کے مُردہ جسم کو دیکھا۔ خاک و خون میں غلطاں اُسکی لاش مضغۂ گوشت کی طرح زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ یہ ظاہر تھا کہ تاجر ہمیشہ کے واسطے خاموش ہوگیا لیکن مارخیم کی نگاہ اُس پر پڑی اور کچھ ایسے وحشت ناک خیالات اُسکے سر میں بجلی کی طرح کوند گئے کہ اسکا تمام جسم کانپ گیا۔ اُس نے یہ محسوس کیا کہ ابھی یہ لاش خاموشی کے پردہ میں ہنگامہ خیز صدائیں بلند کریگی۔ یہ مانا کہ اب کسی میں یہ قدرت نہیں کہ اس قدرتی مشین کو پھر چلا دے۔ وہ لاش اسی مقام پر پڑی رہیگی یہاں تک کہ پولیس اُسے برآمد کریگی اور اس وقت تمام ملک اُس مردہ جسم کے قصاص کی صداؤں سے گونج اُٹھیگا، اور یہی بے جان اور مجبور مقتول حکومت کی رگوں میں تعاقب کا خون دوڑا دیگا مردہ یا زندہ ابھی اُسکا دشمن موجود تھا اور یہی وقت جس نے مقتول کو قید ہستی سے آزاد کیا تھا۔ قاتل کو خوف و دہشت، امید و بیم اور فتح و شکست کے شکنجہ میں جکڑے ہوئے تھا۔

مارخیم ابھی انھیں خیالات میں محو تھا کہ گھڑیوں نے انواع و اقسام کی آوازوں میں اُسکو تین بجنے سے مطلع کیا۔ رات کا سفر قریب ختم تھا اور مارخیم کو ساحل صبح کے نمودار ہونے سے پیشتر اپنی کشتی حیات کو عدم کے خطرناک گرداب سے بچانے کے واسطے عقل کے بادبان اور ہمت کی تیز ہواؤں کی ضرورت تھی۔ مارخیم نے شمع ہاتھ میں لی اور دوکان کی تلاشی لینے لگا لیکن سایہ سے اُسے وحشت ہوتی تھی۔ مقابل کے آئینوں میں بیشمار عکس اُسے جاسوسوں کے گروہ معلوم ہوتے تھے اور خود اُسی کی نگاہ اُسکو لعنت کرتی تھی وہ اپنی جیبیں انواع و اقسام کی اشیاء سے بھرتا جاتا تھا اور اپنی کوتاہ بینی پر نفرین کرتا جاتا تھا۔ ہر بار وہ خیال کرتا تھا کہ کاش ہیں کسی اور وقت آیا ہوتا۔ یا کسی دوسرے مقام پر اپنی موجودگی کا ثبوت میں نے پیشتر سے فراہم کر لیا ہوتا۔ خنجر نہ استعمال کیا ہوتا۔ رومال ہی سے گلا دبا دیا ہوتا۔ الغرض اسی قسم کی لاحاصل پشیمانی، فضول خیالات اور بے اثر ارادے زمین سے ناگزیر الزام کو رد اور قدرتی قصاص کو مسترد کرنا چاہتا تھا ان خیالات کے ساتھ جان کا خوف اُسے اور بھی بے چین کئے دیتا تھا، کانسٹبل کا ظالم ہاتھ، ہتکڑی، عادل کی خونی نگاہیں، سرکاری وکیل، قید خانہ کی تاریک کوٹھری، پھانسی کی رسی اور سیاہ کفن اُسکے پیش نظر تھے سڑک پر چلنے والوں کا خوف اُسکے دل کو محصور کئے تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اُسکے جرم کی اطلاع لوگوں کو ہو گئی ہے۔ اور ہر بار یہ خیال ہوتا تھا کہ لوگ اپنے اپنے مکانوں میں سنجیدہ مائیں خاموش اور بچے سہمے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ہر دل مجرم کی گرفتاری کا خواہاں اور ہر نظر قاتل کے قتل کی منتظر، اور ہر ہاتھ اُسکی پھانسی کی رسی بٹنے میں مصروف ہے۔ گھڑیوں کی آوازیں اُسے خطرناک معلوم ہوتی تھیں لہٰذا اُس نے مجبوراً اُن سب کو خاموش کر دیا، لیکن اب دوکان کا سناٹا بھی اُسے منحوس معلوم ہوا۔ کیونکہ یہی ہیبت ناک خاموشی راہ چلنے والوں کو شک میں ڈال سکتی تھی۔

مارخیم ہر مرتبہ اپنے گرد و پیش دیکھتا تھا۔ کیا وہ دوکان میں تنہا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ تاجر کا ملازم سیر و تفریح کرنے گیا تھا۔ ہاں وہ تنہا تھا لیکن ہر گوشہ میں اُسے وہمی مجسمے نظر آتے تھے او ابھی انھیں خیالات میں محو تھا کہ تاجر کے ایک دوست نے دق الباب کیا۔ اور مذاقیہ لہجہ میں تاجر کو پکارنے لگا۔

اُس نے تاجر پر نگاہ کی لیکن وہ زمین پر اُسی حالت سے پڑا ہوا تھا وہ ہر آواز سے کوسوں

دور ہو چکا تھا اور خاموشی کے بیشمار سمندر پار کر چکا تھا۔ اُسکا نام جو ہزاروں آدمیوں کے ہنگامہ میں اُسکو مخاطب کر سکتا تھا اس وقت ایک لفظ بے معنی تھا کچھ دیر کے بعد تاجر کا دوست مایوس ہو کر چلا گیا لیکن مارخیم کو سبق دے گیا کہ جو کچھ کرنا ہو کر لو۔ اور اس جرم گاہ سے نکل کر شہر کے دوسری طرف اپنی امن گاہ یعنی بستر میں سکون و اطمینان کے ساتھ چھپ رہو۔ ایک دوست آیا تھا ممکن ہے کہ دوسرا آئے اور اندر آنے پر مصر ہو گناہ کرنا اور اُس سے فائدہ نہ اُٹھانا کسقدر حسرت انگیز بات ہے۔

اب مارخیم نے روپیہ اور کنجیاں تلاش کرنا شروع کیں اُس نے ڈرتے ڈرتے تاجر کے جسم پر ہاتھ رکھا۔ طائر روح قفس خاکی سے پرواز کر چکا تھا اب سوا اُس حصۂ کثیفت کے جو فانی ہے شئے لطیف کا نام نہ تھا اُسکا چہرہ مثل کافور کے سفید تھا اور اُس پر کسی قسم کے جذبہ کا اثر نہ تھا ہاں آنکھوں سے کچھ ایسی حسرت ٹپک رہی تھی کہ سخت سے سخت دل انسان کو بھی رحم آجاتا، مارخیم بھی یہ حالت دیکھ کر لرز گیا۔ اس مرقعہ پر اُسے اپنے بچپن کا خیال آیا اُسے وہ وقت یاد آیا جبکہ وہ بالکل بچہ تھا اور کس مپرسی کے عالم میں تھا۔ اُسے خوب یاد تھا کہ ایک مقام پر اُس نے چھپ کر بائسکوپ میں چلتی پھرتی تصویریں دیکھی تھیں۔ اُن میں بے گناہوں کا قتل، مقتولین کی بیکسی اور قاتلوں کا انجام دیکھ کر وہ رو دیا تھا۔ آج بھی وہی نقشہ عملی حیثیت میں اُسکے پیش نظر تھا۔ اُس نے پھر مقتول کو بغور دیکھا کچھ دیر پیشتر وہی مُرجھایا ہوا چہرہ ہر قسم کے جذبات کا اظہار کر سکتا تھا وہی سوکھے ہوئے لب پرجوش گفتگو کر سکتے تھے اور وہی بے جان جسم کمال جوش و خروش کے ساتھ حرکت کر سکتا تھا لیکن مارخیم کے ہاتھوں وہ مشین اس طرح رُک گئی جیسے کہ گھڑی ساز ایک اشارے میں بال کمانی کو روک کر کسی گھڑی کو خاموش کر دے اور وہی مارخیم جو کبھی بائسکوپ میں بھی مصنوعی مقتول کو نہ دیکھ سکتا تھا خود خون میں ہاتھ رنگے ہوئے تھا۔ بہرحال اُس نے تاجر کی جیب سے کنجیاں نکالیں اور دوکان کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

مارخیم آگے بڑھا تو لیکن اُسکو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی شخص اُسکے آگے آگے چل رہا ہے اُس نے اپنے دل پر قابو کر کے دروازہ یکدم کھول دیا سامنے زینہ تھا اور اُس پر موتیں زرہ بکتر پہنے دو رویہ کھڑی تھیں۔ اسی اثنا میں بارش نہایت تیزی کے ساتھ ہونے لگی اور اُس کے شور میں مارخیم نے قدموں کی آہٹ، رونے کی آوازیں، پولیس افسروں کی چیخ پکار اور روپیہ کی کھنکھناہٹ

محسوس کی جس قدر وہ آگے بڑھتا تھا اُسے یقین ہوتا جاتا تھا کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ وہ ہر مورت کو انسان، اور ہر سایہ کو جاسوس تصور کرتا تھا۔ زینہ پر چڑھتے وقت اُسے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص آگے آگے جارہا ہے اور کوئی پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ چوبیس زینوں پر چڑھنا اُسکے واسطے چوبیس مراحل طے کرنا تھے چھت پر پہنچکر اُسے اطمینان ہوا کہ اب وہ سب کی نظروں سے اوجھل ہوگیا بس ایک خدا اُسکا دیکھنے والا ہے۔ خدا کا خیال آتے ہی وہ ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہوگیا۔ اب اُسے وہ بڑے بڑے قاتل یاد آئے جو محض خدا کی قدرت سے گرفتار ہوگئے ورنہ کسی کو اُن پر گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا اُسے یہ بھی خوف پیدا ہوا کہ قدرت اپنے قانون کے مطابق دوکان اور مقتول کے قاتل اور اُس پر خود قتل کا نشان نہ ڈال دے یا کہیں ایسا نہ ہو کہ قوانین قدرت اپنی قدیم روش کو ترک کردیں جیسا کہ نیپولین کے ساتھ حملہ ماسکو میں ہوا تھا کہ موسم سرما ڈیڑھ مہینہ قبل آگیا تھا۔ یا ممکن تھا کہ کسی آس پاس کی دوکان میں آگ لگ جائے اور لوگ اس دوکان میں گھس آئیں۔ یا چھت گرجائے اور قاتل و مقتول ایک ہی مقام سے برآمد ہوں اور یہی وہ حربے ہیں جنکو خدا کی لاٹھی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن خدا کے متعلق اسکے خیالات جداگانہ تھے۔

بہرحال مارخیم بالاخانہ پر کمرہ میں داخل ہوا اور اُس نے دروازہ اندر سے بند کردیا کمرہ نہایت آراستہ پیراستہ تھا۔ قدآدم آئینے، نایاب تصاویر، میز کرسیاں سب اپنی اپنی جگہ پر باقاعدہ تھیں مارخیم نے کنجیوں کا گچھا نکالا اور الماری کی کنجی ڈھونڈنے لگا۔ ابھی تلاش میں مصروف تھا کہ یکایک زینہ پر آہٹ معلوم ہوئی قفل خودبخود رک گیا۔ اور دروازہ کھلا۔ رنجیت کا چہرہ سفید اور خون خشک ہوگیا۔ تمام جسم میں تھرتھری پڑگئی اور ہزار ہا قسم کے خیالات اسکے دماغ میں آنے لگے۔ کبھی وہ خیال کرتا تھا کہ پولیس کو اطلاع ہوگئی اور کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ قدرت نے کسی کو گواہ بنانے کے واسطے یہاں اتفاقیہ بھیجا ہے یکایک ایک شخص نے دروازے سے گردن نکال کر جھانکا۔ کمرہ میں چاروں طرف دیکھکر مارخیم کو دیکھا اور مسکرا کر واپس ہوگیا۔ مارخیم کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن آواز نے کام نہ دیا اور ایک صدائے بے معنی نکل کر رہ گئی۔ یہ آواز سُن کر اجنبی واپس آیا!" کیا تم نے مجھے پکارا ہے؟ یہ کہکر وہ کمرے کے اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کردیا۔ مارخیم حیرت سے اُس اجنبی کو دیکھ رہا تھا اور یہ محسوس کررہا تھا کہ اُسکا چہرہ برابر تبدیل ہورہا ہے کبھی اُسے

خیال ہوتا تھا کہ وہ اُسے جانتا ہے۔ کبھی بغور دیکھنے پر اسے یقین ہوتا تھا کہ وہ اجنبی اُس کا ہمشکل ہے لیکن مارخیم کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ اجنبی انسان نہیں ہے۔

اجنبی - کیا روپیہ ڈھونڈھ رہے ہو؟ اور اُسکے لہجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مارخیم کو مدد دینے کی غرض سے آیا ہے لیکن مارخیم خاموش کھڑا رہا۔ اجنبی نے پھر کہنا شروع کیا "دیکھو مارخیم میں تمھیں بتلائے دیتا ہوں کہ تاجر کا ملازم سیر و تفریح سے واپس آرہا ہے اور اگر اُس نے آکر تمھیں یہاں پایا تو جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔

مارخیم - کیا تم مجھے جانتے ہو۔

اجنبی - (مسکرا کر) بہت اچھی طرح سے اور میں تمہاری مدد کو ہر طریقہ سے تیار ہوں۔

مارخیم - تم کون ہو! شیطان!؟

اجنبی - میں کچھ بھی ہوں لیکن اُسکا اثر اُن خدمات پر جو میں تمہارے واسطے انجام دونگا کچھ نہیں ہو سکتا۔

مارخیم - اثر ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے میں اور تم سے مدد لوں کبھی نہیں۔ تم مجھے نہیں جانتے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ تم میرے دلی جذبات سے بالکل ناواقف ہو۔

اجنبی یہ سُن کر ہنسا اور کہنے لگا۔ "میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں"

مارخیم - "میری رگ رگ کو پہچاننا غیر ممکن ہے، تم سے کیا کسی سے ممکن ہی نہیں۔ میری ظاہری زندگی میرے باطن کی ضد ہے میں نے آج تک اپنے ضمیر کے خلاف کیا اور ہر شخص یہی کرتا ہے۔ اگر واقعات کی موجودہ پوشاک اُتار لی جائے تو ہر شخص مجھ سے بہتر نظر آئے گا۔ محض واقعات اور ماحول انسان کے افعال کے ذمہ دار ہیں اگر ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کی قدرت رکھتا تو یہی لوگ جنکو کہ ایک زمانہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے آج فرشتوں سے افضل نظر آتے میرا بھی یہی حال ہے۔ فرق یہ ہے کہ مجھے واقعات نے زیادہ گناہ کرنے پر مجبور کیا۔ اور وہ واقعات یا میں جانتا ہوں یا خدا جانتا ہے لیکن پھر بھی میں اپنے میں اعتراف گناہ کی قوت پاتا ہوں"

اجنبی - میرے سامنے؟

مارخیم - ہاں تم سے ہر شخص سے - میں سمجھتا تھا کہ تم دل کی بات جانتے ہوگے لیکن افسوس ہے کہ تم میرے افعال سے میرے دل کا فیصلہ کرتے ہو۔ تم خود انصاف کرو کہ میں دیوزادوں کے ملک میں

پیدا ہوا اور اس وقت تک انھیں میں بسر کی، اور انھیں دیوزادوں کے قبضہ میں ہوں۔ وہ دیوزاد کون؟ طمع، حرص، ناامیدی، ناکامی، افلاس اور مجبوری۔ اور پھر بھی تم میرے افعال سے میرے دلی جذبات کا فیصلہ کرتے ہو لیکن تمہیں کسی کے دل کا حال کیا معلوم۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے برائی سے نفرت نہیں ہے۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ میرے دل میں نیکیاں نہیں ہیں؟ ضرور ہیں میں نے کوئی برا کام اچھا سمجھ کر نہیں کیا۔ بلکہ ان دیوزادوں نے مجھے مجبور کیا۔ میں مجرم ہوں مگر ناکردہ گناہ۔

اجنبی۔ بالکل ٹھیک ہے لیکن مجھے اس سے کیا مطلب۔ سبب اور مسبب میرے احاطۂ عمل سے باہر ہے۔ مجھے اس سے کیا غرض کہ کن مجبوریوں کے تحت تم سے یہ فعل سرزد ہوا۔ مجھے تو اس سے غرض ہے کہ تم برے راستے سے ہٹنے نہ پاؤ لیکن وقت تنگ ہے۔ تاجر کا ملازم جابجا کی آرائش دیکھنے میں مصروف ہے لیکن وہ پھر بھی قریب ہوتا جاتا ہے اور یہ سمجھ لو کہ جس قدر دیر ہو رہی ہے اُسی قدر پھانسی کا تختہ خود بخود تم سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ اور اگر کہو تو میں بتادوں کہ روپیہ کہاں ہے۔

مارخیم۔ اور اسکا معاوضہ۔

اجنبی۔ میں کرسمس کے تحفہ میں یہ روپیہ تمہیں دیدونگا۔

مارخیم۔ (نہایت حقارت سے اجنبی کی طرف دیکھ کر) نہیں، میں تم سے کسی قسم کی امداد نہیں چاہتا۔ اگر مرنا بھی ہوگا تو تمہارے ہاتھ سے دو بوند پانی نہ پیونگا۔ اس کو غرور سمجھو یا خودداری۔ مگر ہوگا یہی۔

اجنبی۔ مجھے بستر مرگ پر شرمساری سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مارخیم۔ کیونکہ تم اسکی خوبیوں سے منکر ہو۔

اجنبی۔ ہرگز نہیں بلکہ میرا اور انسان کا محض اسی زندگی تک ساتھ ہے۔ انسان نے اس دنیا سے منہ موڑا اور میں نے کنارہ کشی اختیار کی۔ میں انسان کی خدمت نہیں کرتا بلکہ انسان میری خدمت کرتا ہے۔ میرے واسطے وہ مذہب کے بھیس میں الحاد کے بیج بوتا ہے۔ نیکی کا لباس پہن کر بدی کی اشاعت کرتا ہے اور ظاہری نور سے باطنی تاریکی پھیلاتا ہے۔ جیسا کہ تم اپنے خواہشات کے بندے ہو کر ہر قسم کے برے کام کرتے ہو۔ میں کسی پر سختی نہیں کرتا بلکہ ہر شخص کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں۔

لہذا مجھ پر اعتبار کرو۔ میری مدد قبول کرو اور اس گناہ سے کچھ فائدہ اٹھاؤ۔ خالی پشیمانی سے کیا حاصل

مارخیم ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھ میں اب کوئی نیکی باقی نہیں؟ کیا میں برائی کا پتلہ ہو گیا ہوں؟ کیا انسان کے متعلق تمہارا یہی تجربہ ہے۔ یا چونکہ میں اس وقت ایک جرم میں گرفتار ہوں اس وجہ سے تم اس قدر ذلیل خیالات میری طرف سے اپنے دل میں لائے ہو اور کیا قتل کرنا اس قدر سخت جرم ہے کہ تمام نیکیوں کو انسان سے دور اور سرچشمۂ انسانیت یعنی دل کو بالکل خشک اور گندلا کر دیتا ہے؟

اجنبی ۔ قتل میرے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ۔ ہر قسم کا گناہ قتل کے برابر ہے۔ زندگانی جنگ کا نام ہے۔ میں تم انسانوں کو دیکھتا ہوں کہ بھوکے کتوں کی طرح ایک دوسرے کے ہاتھ سے روٹیاں چھین کر اپنا پیٹ بھرتے ہو۔ میں گناہوں کا ساتھی نہیں بلکہ گناہوں کے نتائج کا ساتھی ہوں ۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ نیکیوں کا بھی ساتھی ہوں۔ کیونکہ نیکی اور بدی ایک چیز ہے اور یہ دونوں فانی ہیں۔ بدی جس پر میری زندگی کا دارومدار ہے وہ افعال میں نہیں بلکہ انسان میں ہے۔ مجھے بدانسان پیارا ہے نہ کہ بدی، کیونکہ اگر صفحۂ عالم کی ورق گردانی کیجائے اور ہستی کے خوفناک منازل طے کئے جائیں تو بدی کے اثرات بھی نہایت خوشگوار ثابت ہونگے۔ میں تمہیں مدد دینے اس لئے نہیں آیا کہ تم نے قتل کیا ہے بلکہ اس لئے کہ تم مارخیم ہو۔

مارخیم ۔ اچھا میں اپنے دل کی بات تم سے کہتا ہوں، آج کا قتل میرا آخری گناہ ہے، آج مجھے کافی سبق مل گیا ہے اور اسے ہمیشہ یاد رکھونگا۔ اب تک میں اپنی خلاف مرضی وہ باتیں کرنے پر مجبور تھا جنھیں میں برا سمجھتا تھا آج تک مجھ پر افلاس کا غلبہ تھا، میرا نفس مجھ پر حاوی تھا میں عیش کا بندہ تھا لیکن آج کے قتل سے مجھے دولت بھی ملی اور سبق بھی۔ آج سے میں اپنے بازوؤں میں قوت اور دل میں استقلال پاتا ہوں .... اور

اجنبی ۔ (مارخیم کی بات کاٹ کر) تم یہ روپیہ صرافہ میں لگاتے اتنی دیر میں تم نے اپنا کئی ہزار کا نقصان کیا۔

مارخیم ۔ خیر! اب آیندہ تو فائدہ ہوگا۔

اجنبی ۔ اس مرتبہ بھی نقصان اٹھاؤ گے۔

مارخیم ۔ کچھ تو ملیگا۔

اجنبی — کچھ بھی نہ ملیگا۔

مارخیم — نہ ملے۔ یہی تو ہوگا کہ میں پھر مفلس ہوجاؤنگا لیکن کیا ہمیشہ میری یہی حالت رہیگی دوسروں کی طرح نیکی اور بدی مجھ میں بھی موجود ہیں اور دونوں اپنی اپنی طرف کھینچنا چاہتی ہیں میں نیکی کو زیادہ پسند کرتا ہوں اور نفس کشی، شہادت اور ایثار کا تہ دل سے معترف ہوں۔ حالانکہ میں نے یہ قتل کیا ہے لیکن رحم سے بیگانہ نہیں ہوں میں غریبوں پر رحم کرتا ہوں یتیموں کو دیکھکر رو دیتا ہوں۔ کیا میری زمام حیات ہمیشہ بدی کے ہاتھ میں رہیگی اور کیا میری نیکیاں ہمیشہ ساکت و مجبور رہینگی؟ نہیں، اب تک مجھ پر بدی نے حکومت کی اور آج سے نیکی میری رہبر بنے گی۔

یہ سُن کر اجنبی مسکرایا، اور کہنے لگا "تم کو اس دنیا میں آئے چھتیس برس ہوگئے عروج ہو یا زوال، رنج ہو یا خوشی۔ بہر صورت میں نے تم کو پستی ہی میں گرتے پایا۔ آج سے پندرہ برس پیشتر تم چوری سے نفرت کرتے تھے تین برس ہوتے ہونگے کہ تم قتل کے نام سے تھراتے تھے لیکن آج وہ کون سا جرم ہے جسکے کرنے پر تم تیار نہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ قتل تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگیا ہے۔ یاد رکھو کہ آپ جسقدر ہستی کے منازل طے کروگے اُسیقدر پستی میں گرتے جاؤگے۔ اب صرف موت تمہیں بدی کے شکنجے سے آزاد کرسکتی ہے۔ یہ سُن کر مارخیم کے آنسو نکل آئے اُسنے بحسرت اپنے مخاطب کو دیکھا، اور کہا، سچ ہے میں نے آج تک بدی کے اشارے پر عمل کیا لیکن ہر شخص کا یہی حال ہے میں تو میں بڑے بڑے فرشتہ خصلت لوگ اپنے ماحول سے متاثر ہوکر راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

اجنبی — میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں اگر اسکا جواب دوتو میں تمہارا اخلاقی زائچہ تمہارے سامنے پیش کردوں۔ ہر شخص میں نیکی اور بدی ہوتی ہے لیکن تم نے "آج تک کوئی نیک کام کیا ہے؟"

مارخیم — تم بالکل سچ کہتے ہو۔ میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا۔

اجنبی — بس، تو تم جیسے اب ہو ویسے ہی ہمیشہ رہوگے تم میں کوئی تغیر نہیں ہوسکتا۔ بدی نے تمہارے صفحۂ تقدیر کو سیاہی سے رنگ دیا ہے۔

مارخیم یہ باتیں خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ یاس حرماں سے اسکے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا، کچھ دیر کے بعد اُس اجنبی نے پھر گفتگو شروع کی۔ "تم کو دولت کی راہ بتا دوں؟"

مارخیم — اور نیکی؟

اجنبی - کیا تم نے اُسکے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی؟

مارخیم - بیشک میں نے ضرور کی لیکن ...." ابھی اسقدر کہنے پایا تھا کہ ملازم نے دق الباب کیا - اجنبی گویا اسی انتظار میں تھا آواز سُنتے ہی اُسکے چہرہ پر تبدیلی واقع ہوئی - اُسنے مارخیم سے پھر گفتگو شروع کی "دیکھا جو میں نے کہا تھا وہی ہوا - ملازم آگیا - اب تمہارے سامنے ایک دشوار منزل اور ہے - وہ یہ کہ جاؤ ملازم سے جاکر کہو کہ تاجر سخت بیمار ہوگیا ہے - اسے اندر بلا لو - اور پھر وہی چھُری اور ہمت جس نے تاجر کا کام تمام کیا اس ملازم سے بھی تمکو آزاد کردیگی اسکے بعد تم ہو اور عیش لیکن جلدی کرو - اس وقت تمہیں زندگی اور موت کے درمیان فیصلہ کرتا ہے -

مارخیم یہ سُن کر کانپ گیا اُس نے ایک آہ سرد بھری اور کہا "اگر اس بدی نے مجھے گرفتار کر رکھا ہے اور اگر میری زندگی کا زیاں کاری کے سوا اور کوئی مقصد نہیں تو اب بھی آزادی کا ایک راستہ میرے سامنے کھلا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ میں یہ قصہ ہی تمام کردوں اگر نیکی پر مجھے قابو نہیں تو اپنی زندگی پر ضرور ہے - نیکی کی محبت نے مجھے کوئی فائدہ نہیں بخشا خیر نہیں سہی لیکن میں اب بھی بدی سے نفرت کرتا ہوں اور اگر تم واقعی شیطان ہو تو میں وہ کام کرتا ہوں جس سے تمہیں ہمیشہ حسرت رہیگی - یہ سُن کر اُس اجنبی میں تغیر پیدا ہوا - وہ مسکرایا مثل روشنی کے پھیلا اور شفق کی طرح آہستہ آہستہ غائب ہوگیا لیکن مارخیم پر اسکا کوئی اثر نہ ہوا - وہ آہستہ آہستہ نیچے اُترا - اُسکے گزشتہ حالات کے نقشے اُسکی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے - اُسکو اپنی تمام زندگی بدی کے ہاتھوں شکست کھائی ہوئی بے ربط اور ناہموار دکھائی دی - یہ قید ہستی اُسے گراں معلوم ہو رہی تھی اور بحر فنا کے اُس طرف ساحل بقا اُسکی خوش آمدید کے واسطے بڑھا چلا آرہا تھا - راہ میں وہ تاجر کی لاش کے پاس رُکا - اُسے سیدھا کرکے میز پر لٹا دیا اور آہستہ آہستہ نہایت خاموشی سے آکر دوکان کا دروازہ کھولا، اور ملازم سے کہا "جاؤ پولیس کو اطلاع دو میں نے تمہارے مالک کو قتل کردیا" ؎

قید حیات مختصر لذت زیست پُرخطر
بزم جہاں میں ہر بشر جام نشاط پائے کیوں

تیمر

(ماخوذ از اسٹونس)

غریب رشتہ دار

(مترجم)
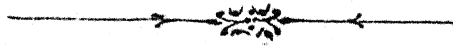
غریب رشتہ دار ؟ !

مخلوق میں نہایت غیر ضروری وجود، گستاخانہ ارسال و ترسیل کا سبب - اور وقعت و وجاہت کے راستہ کا خار ہے -

امیر لوگو ! - وہ تمہیں نامناسب مواقع پر بھائی، چچا وغیرہ کہہ کر پکارتا ہے ---------

مہمل اور لغو سایہ جو تمہاری سرسبزی کی بہار میں تصویر خزاں دکھلاتا ہے ---------

خوش نہ آنے والی یاد جو تمہیں رہ رہ کر ستاتی ہے ---------- بار بار آنے والی تکلیف جو تمہارے کیسۂ زر کی کمی کا باعث ہے -

وہ تمہارے پندار - اور تمہارے امیرانہ غرور پر برداشت کا متقاضی ہے ---------

تمہاری کامیابیوں پر نقص، تمہاری ترقیوں پر ملامت، تمہارے خون میں داغ، تمہارے "آرام تکیہ" پر دھبہ، تمہارے لباس میں پھٹا ہوا حصہ، تمہارے راستہ میں شیر، تمہارے بستر کا مینڈک، تمہارے دودھ کی مکھی، تمہاری آنکھوں کا تنکا ---------

تمہارے دشمن کی کامیابی، تمہارے دوستوں کا عذر - غرض ایسی چیز ہے جس کی مطلق ضرورت نہیں -

بیشک تم اس کو اپنی شیرینی میں تلخی سمجھتے ہو - ! !

(ماخوذ از چارلس لیمب)

"قیدی"

(سید ہاشم رضا صاحب)

"میرے اسیر کرنے والے! مجھے چھوڑ دے۔ کل شاما میرے پنجرے پر آبیٹھی اور کہنے لگی کہ میرے بچوں کے پر نکل آئے ہیں چھوڑ دے میرے صیاد کہ میں اپنے بچوں کو پہلے پہل اُڑتا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں"
صیاد ہنسا اور مُنہ پھیر کر چلا گیا۔

"مجھے نہ ستا! مجھے چھوڑ دے۔ ابھی ابھی فاختہ انار کے درخت کے نیچے آبیٹھی بڑے مزے سے گانے لگی۔ میں نے پوچھا "کہو بی بی میرے چمن کا کیا حال ہے۔ اُڑ کر میرے پاس آئی اور بولی "تمہارے چمن کا کیا کہنا۔ خوب پھول کھلے ہیں۔ تمہارا آشیانہ اب تک اُسی طرح آم کے درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر قائم ہے۔ آموں میں بور آچلا۔ کوئل باغ بھر میں کوکتی پھرتی ہے۔ بڑی بہار ہے"، چھوڑ دے مجھے قید کرنے والے کہ میرے چمن میں بہار آئی ہے"
صیاد بگڑ گیا۔

"نادان چڑیا! کیا میں نے تجھے چھوڑنے کے لئے اتنی محنت کی۔ دس دن تک میں تیرے لئے سرگرداں رہا۔ کیسے خوشنما رنگ کے پر ہیں اور تیری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ تیری آواز کتنی سُریلی ہے؟ بارہ برس سے اتنا اچھا شکار میرے ہاتھ نہ آیا تھا۔ مجھے بڑی قیمت ملیگی"
چڑیا چپ ہو گئی۔

"جانے دے میرے ظالم صیاد۔ پپیہا کہ گیا کہ میرا ساتھی شکاریوں کا نشانہ بن گیا۔ یہ لوگ کیسے بے درد ہوتے ہیں۔ مجھے جانے دے کہ میرے بچے اکیلے ہونگے اور بھوک سے تڑپ رہے ہونگے"
صیاد نے اِس کان سنا اور اُس کان اُڑا دیا۔

بہار گزر گئی۔ چڑیا کے دام خاطر خواہ مل گئے۔ صیاد سمجھا کہ محنت ٹھکانے لگی۔ بڑا خوش ہوا۔ جلدی سے اندر دوڑا ہوا گیا کہ پنجرہ اٹھالائے اور خریدار کے حوالے کر دے۔
خوبصورت پروں والی چڑیا رہائی کا انتظار کرتے کرتے مر چکی تھی

خالص اُردو

حضرت آرزوؔ لکھنوی

چاہ میں جس کو پھانس کے رکھا ہائے کیا تانس تانس کے رکھا
بوجھ ساجی پہ دھیان نے تیرے ساتھ ایک ایک سانس کے رکھا
ایسی بھائی کھٹک کہ جی میں سدا ٹوٹے ٹکڑے کو پھانس کے رکھا
چاہ کا بوجھ جانچتا تھا ہمیں بھاری پتھر ہمانس کے رکھا
چٹکیاں لے کے جی کیا بے چین کتنا نے پہ تانس کے رکھا
تھا یہاں کیا کہ سانس نے برسوں کچے تاگے میں پھانس کے رکھا

آرزو پھول کیسے جب تُو نے
نہ ہرے پن کو گھانس کے رکھا
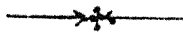
غزل شیخ محمد یوسف صاحب کنعاںؔ۔ کلکتہ

ہو چکے ہیں اس قدر مجبور اپنے دل سے ہم خونبہا بھی ہائے لے سکتے نہیں قاتل سے ہم
ٹھوکریں کھاتے تو پہنچے ہیں بڑی مشکل سے ہم اب کہاں جائینگے اُٹھ کر آپ کی محفل سے ہم
جب وہ رک جاتا ہے کھنچ کھنچ کر ہمارے قتل سے خود گلے مل لیتے ہیں بڑھ کر خنجر قاتل سے ہم
چھوڑ بھی چٹکی سے ناوک ہاتھ سے رکھ بھی کماں اس ادا سے تو نے دیکھا ہو گئے گھائل سے ہم
رکھتی ہے ناکام حسرت انتہائے شوق بھی بیخودی یہ تھی کہ آگے بڑھ گئے منزل سے ہم
قہر کا طوفاں تھی دنیا جس سے چھٹکارا نہ تھا عمر کی کشتی ڈبو کر جا ملے ساحل سے ہم
بیٹھنے سے طے ہو کیونکر زندگی ہے اک سفر جا کے دم لینگے قبر میں آئے ہیں خجل سے ہم

بیدلی کا غم نہیں الفت میں اے کنعاںؔ ہمیں
آتے ہی دل ہاتھ دھو بیٹھے تھے اپنے دل سے ہم

؎ ریشۂ سخت۔

جستجو تیری

(جمیل مظہر کاظمی صاحب بی اے)

مجھے تلاش ہے اے یار کو بکو تیری
خمار بادۂ عرفاں ہے آرزو تیری
مری حیات کا مقصد ہے جستجو تیری

تنک رہی ہے نسیم سحر بیاباں میں
درخت جھوم رہے ہیں کھڑے گلستاں میں
مگر کھلی ہے کہیں لٹ مشکبو تیری

تری نوائے محبت ہے شاعری میں مری
ترے فراق کے شکوے ہیں بانسری میں مری
مرے رباب نفس میں ہے گفتگو تیری

ہر ایک رنگ میں عریاں ہے تیرا رازِ جمال
بھٹک رہی ہیں نگاہیں بھٹک رہے ہیں خیال
گناہگار بناتی ہے جستجو تیری

نگاہِ شوق ہماری کہاں کہاں پہنچی
جہاں حسینوں کا جھرمٹ ملا وہاں پہنچی
مگر کھلا کہ کسی میں نہیں ہے خو تیری

چمن میں رنگ اڑا لائی تھی بہار ترا
بڑھا گلوں کی طرف پنجۂ جنوں میرا
جو سونگھتا ہوں تو بالکل نہیں ہے بو تیری

نظر گئی طرفِ شمع انجمن افروز
جلا رہی تھی گر خود بھی تھی سراپا سوز
کہا یہ دل نے کہ جلنا نہیں ہے خو تیری

شراب نور فلک سے بہا رہا تھا قمر
پکارنے لگی یوں ہمتِ بلند نظر
کہ ہو نہ ہو وہیں پنہاں ہے آرزو تیری

بشر ہوں بارِ عناصر سے گرچہ ہوں مجبور
نثارِ جذبِ محبت فلک ہے کتنی دور
اڑیگی لے کے کبھی مجھ کو جستجو تیری

ابھی جوان ہوں یعنی ہے ابتدائے فراق
وہ دن بھی آئیگا مل جائیگی دوائے فراق
کبھی پھری جو نگاہِ بہانہ جو تیری

آثارِ ادبیہ

(۱۲)

(پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے)

قطعات تاریخ مصنفہ مرزا دبیر مرحوم

مئی، جون اور جولائی کے پرچوں میں "آثار ادبیہ" کے تحت میں جو تحریریں شائع کی جا چکی ہیں اُن سے منشی مرزا علی اکبر الہ آبادی اور جناب مرزا دبیر مغفور کے باہمی دوستانہ تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہے ان میں منشی صاحب کے "کوئی" بھانجے تھے جنکی شادی ۱۲۶۴ھ میں ہوئی تھی۔ اُنکی بیوی نے ۱۲ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ مرزا دبیر صاحب نے اس حادثے کی تاریخ کہی جو ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

سہ شنبہ یازدہم از ربیع آخر بود — کہ شد سہی سکینہ بہ کنج قبر مکیں
حروف معجمہ بشمردہ حور سالش گفت — سکینہ یافت بجنت سکینہ خلد بریں

نوٹ۔ آخری مصرعے کے صرف نقطہ دار حرفوں کے عدد جوڑنے سے سال وفات ۱۲۷۰ھ نکلتا ہے۔

"کوئی" ڈھائی سال کے بعد منشی صاحب کے چھوٹے بھائی مرزا علی اصغر کی بیوی مہدی خانم عرف فضل النسا خانم نے ۲۵ ذیقعدہ ۱۲۷۲ھ کو انتقال کیا۔ مرزا دبیر مرحوم نے اس واقعے کی بھی تاریخ کہی جو درج ذیل ہے۔

حیف چوں خادمۂ فاطمہ مہدی خانم — شد ز حسرت کدۂ دہر بجانِ رنجور
صالحہ متقیہ زاہدہ و عابدہ بود — زیں سبب شد ز غمش قلبِ عزیزاں ناسور
جناں حور بہ دل گفت سپئے تاریخش — قصر فردوس لحد باد و کفن حلۂ نور

نوٹ:۔ آخری مصرعے میں "دل" کے عدد جوڑ دینے سے ۱۲۷۲ھ نکلتے ہیں۔

مرزا علی اکبر کے نام مرزا دبیر صاحب کا ایک خط

مرزا دبیر صاحب نے منشی علی اکبر صاحب کو جو خط لکھے تھے اُنکے القاب آداب اور بعض خطوں کے ابتدائی حصے منشی صاحب کے بیٹے سردار حسین ... نے ایک کتاب پر نقل کر لئے تھے وہ جون اور جولائی کے ادب میں

شائع ہو چکے ہیں مگر اتفاق سے ایک خط چھپنے سے رہ گیا تھا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"جناب منشی صاحب معنی مصاحب لوح صحیفۂ خلاق بعنوان انشائے اشفاق قائم بنیا لکم العالی مادامت الایام واللیالی۔ بعد خامہ تراشی بامید سامعہ خراشی۔ اظہار مطالب ضروریہ می نماید کہ دو قطعہ سحاب رحمت واحسان اعنی دو الطاف نامہ مکرمت تواماں یکے عید فطر بابشارت ودیگرے نوروز دربشارت مقدم و موخر سراپا منتظر دیدۂ مہجور را نورے و دل رنجور را سرورے بخشیدہ۔ دو اسلے این و مکرمت نامہ حرفے داخل فرد وصول نگردیدہ ورنہ ممکن نہ بود کہ این سراپا اشتیاق جواب الطاف نامجات تحریر نمی نمود۔"

مولوی سعید الدین خاں کے دو شعر

اپنی خاطر میں کب آتی ہے گلستان کی بو — ہم نے سونگھی ہے گلے لگ کے گریبان کی بو

بزم میں اپنی مجھے دیکھ وہ گل ناک چڑھا — بولا آتی ہے کہیں سے دل بریان کی بو

جرأت کا مطلع

عزیزو سوچیو یہ کچھ عجب اٹھکیل آہٹ ہے — کہ جس کے ہر قدم کے ساتھ یہ جی کو لگاوٹ ہے

سلیماں شکوہ کا جواب

کڑے ڈھیلے ہیں پاؤوں میں (پڑے) اور کس کی آہٹ ہے — جو آتی ہر قدم پر یہ صدائے جھنجھناہٹ ہے

منتظر کا مطلع

رہے منتظر منتظر یار کے — یہ دیدے نہ دیدے ہیں بیدار کے

غیر معلوم شاعروں کے چند مطلعے

شب فراق کے صدموں کی گر نہ خو کرتا — تو روز وصل کی کس منہ سے آرزو کرتا

جسکے گھر کے میں پیدہ ترا بیٹھ گیا — روتے روتے مرے آخر کو وہ گھر بیٹھ گیا

جان جاتے ہو تو مت ہم سے تم بیدل جاؤ — گرچہ جانا ہے ضروری تو گلے مل جاؤ

اے گل و بلبل بہار آئی دلوں کو کھول لو — چار دن فرصت غنیمت جان کر ہنس بول لو

جب کہ وہ ماہ رخ دکھاتا ہے — حسن دل کی سب بھاتا ہے

کسی کے دو شعر

دو دن سے وہ شکل اپنی دکھاتا نہیں مجھ کو — اس بن کیسے دیکھوں کوئی بھاتا نہیں مجھ کو

گردش میں مرادو فلک ساتھ تو دیتا　　　پر کیا کرے بیچارہ کہ پاتا نہیں مجھ کو

کسی شاعر کی ایک غزل

گئے جی سے تو فائدہ اتنا ہوا، غم عشق کا رنج و محن نہ رہا
دلے کا وش دشت جنوں یہ رہی، کہ موے پہ بھی تار کفن نہ رہا

کہا ایک نے میں نے سنا ہے ابھی، دم گرم سے قیس کے آگ لگی
وہاں جاتی بھی دو گھڑی لگتا تھا جی، یہ غضب کہ وہ نجد کا بن نہ رہا

یہی چاہ تھی سب کی کہا سو کیا، سبھی کرتے تھے وعدے پہ اپنے وفا
وہ چلن جو زمانِ قدیم میں تھا، ترے عہد میں عہد شکن نہ رہا

تری زلف کی بو کو جو لے کے صبا، گئی دشت ختن میں زراہ خطا
انھیں شوق جو دید کا تیرے ہوا، کوئی آہو بدشت ختن نہ رہا

کوئی مونس و ہمدم جب نہ رہا، تو غزال رمیدہ سے اُنس کیا
مجھے بے وطنی نے دیا یہ مزا، کہ ذرا بھی خیال وطن نہ رہا

"غزل سدا سکھ جی کاک"

مست و قم در خراباتِ مغاں جائے من است　　　دل صراحی، دیدہ ساغر، گریہ صہبائے من است
ناز پروردِ تغافل بیقرار یہا (بہ بیں)　　　آب در چشم، آہ در دل، جاں بہ لبہائے من است
مسند آرائے بیا بانم کہ در دیوانگی　　　خشت بالیں، خار قالیں، خاک دیبائے من است
از صفائے طینتم جوہر شناساں آگہ اند　　　طبع جیحوں، موج مضموں، در تنہائے من است
بادشاہِ ملک نخرم (کاظم) در عہد خویش　　　تخت ہاموں، چتر گردوں، نالہ شہنائے من است
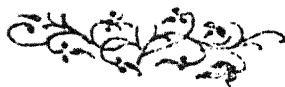
بزمِ ادب

اس نمبر پر "ادب" کی دوسری جلد ختم ہوتی ہے اور سال نو کے ساتھ ادب کے دور جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم ان کاموں کی لمبی چوڑی فہرست شائع کرنا جو ادب نے اس پندرہ ماہ کی مدت میں انجام دیئے ہیں ادبی سبک ظرفی سمجھتے ہیں لیکن ہم اتنا ضرور عرض کرینگے کہ ادب نے اس قلیل مدت میں جسقدر گرانبہا نظمیں اور بلند پایہ مضامین شائع کئے ہیں اتنے ملک کے اکثر جرائد کو پوری پوری زندگی میں نصیب نہیں ہوئے۔ دوسرے مضامین سے قطع نظر کر کے محض حضرت آرزو کی خاص اردو میں غزلیں، اور جناب ادیب کے "آثار ادبیہ" کا مستقل سلسلہ ہمارے اس دعوے کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

یہ تو ماضی کا تذکرہ تھا۔ مستقبل کے بارے میں پوری تفصیل سے گفتگو کرنے کے لئے ایک بزم ادب میں گنجائش نہیں بالفعل اتنا عرض کیا جا سکتا ہے کہ تیسری جلد کا پہلا نمبر "خاص نمبر" ہوگا۔ جو صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے ہر طرح فرد ہوگا۔ اسکی حقیقی اہمیت کا اندازہ مندرجہ ذیل انشا پردازوں کے اسماء گرامی سے ہوگا۔ جنھوں نے اس نمبر کے لئے خاص طور سے بلند پایہ مضامین لکھنے کی زحمت اٹھائی ہے:۔

(۱) جناب حکیم عیش امروہوی صاحب۔
(۲) جناب حسن برنی صاحب ایڈوکیٹ۔
(۳) جناب پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب۔
(۴) جناب پروفیسر سید محمد احمد صاحب تجود۔
(۵) جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی۔
(۶) جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر۔
(۷) جناب پروفیسر خواجہ اطہر حسین صاحب۔
(۸) جناب مولانا اختر علی صاحب تلہری
(۹) جناب حامد اللہ صاحب افسر۔
(۱۰) جناب سید علی عباس صاحب حسینی۔
(۱۱) جناب رفیعی صاحب اجمیری۔
(۱۲) جناب حکیم سید محمد کاظم صاحب مہوہانی۔
(۱۳) جناب امیر احمد صاحب علوی۔
(۱۴) جناب حنیف ہاشمی صاحب حنیف۔

حصہ نظم میں حضرت صفی۔ حضرت ثاقب۔ حضرت تجود۔ حضرت آرزو۔ جناب اثر۔ جناب سراج۔ جناب آشفتہ وغیرہ وغیرہ کی دلکش نظمیں اور پر مغز غزلیں ہونگی۔ ان کے علاوہ بہت سے ایسے اساتذہ کا غیر مطبوعہ کلام ہوگا جو اس دار فنا سے دار بقا کی طرف کب کے جا چکے ہیں۔ ان میں سے دو اسمائے جلیل یہ ہیں۔

(۱) جناب مفتی میر محمد عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ۔ (۲) حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم۔

کیا اس اہتمام کے بعد بھی ہماری یہ امید بیجا ہوگی کہ ہمارے معزز ناظرین اپنے اعزا و احباب میں اس امر کی کوشش بلیغ فرمائیں گے کہ وہ "ادب" کے مستقل خریدار بن کر "خاص نمبر" مفت حاصل فرمائیں؟

سمن بغرض انفصال مقدمہ

ابتدائی مقدمہ خفیفہ نمبر ۲۷۳ سنہ ۱۹۳۰ء

بعدالت جناب حسن ارشاد صاحب بہادر بی اے ایل ایل بی جج خفیفہ مقام اکبر پور ضلع فیض آباد۔

رام پیارے پانڈے ولد رام لال پانڈے ساکن موضع کاشی پور پرگنہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد مدعی

بنام

سید منظور حسین ... ... مدعاعلیہ

بنام سید منظور حسین ولد فضل حسین ساکن موضع اوتریتھو پرگنہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد

ہرگاہ کہ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت ناپانے مبلغ ... روپیہ کے دائر کی ہے لہذا تمکو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ دوسری ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء بوقت ۱۰ بجے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حالات سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جسکے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو ایسے سوالات کا جواب دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعویٰ مذکور کی کرو اور ہرگاہ یہی تاریخ جو تمہارے حضار کے لئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس تمکو لازم ہے کہ اپنے جواب دعویٰ کی تائید میں جن گواہوں کی شہادت پر یا جن دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو اُسی روز انکو پیش کرو۔

مطلع رہو کہ اگر روز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہوگا۔

آج بتاریخ ۵ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

دستخط حاکم بخط انگریزی   مہر عدالت   وقت حاضری بدفتر منصفی اکبر پور ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک